بین الاقوامی تعلّقات

نظریّہ اور عمل

محمد اعظم چوھدری

طاھر سنز۔ کراچی

بی اے، ایم اے (بین الاقوامی تعلقات و سیاسیات) اور سی ایس ایس کے لیے

محمد اعظم چوہدری

لیکچرار شعبۂ سیاسیات، وفاقی گورنمنٹ اردو کالج، کراچی

طاہر سنز اردو بازار کراچی

اپنے عظیم المرتبت اساتذہ کرام

پروفیسر مختار احمد خان صاحب

صدر شعبہ انگریزی وائس پرنسپل وفاقی گورنمنٹ اردو کالج کراچی

اور ان کی اہلیہ

پروفیسر زاھدہ بیگم یوسفی صاحبہ

صدر شعبہ تاریخ اسلام وفاقی گورنمنٹ اردو کالج، کراچی

کے

نام

لِکُلِّ امْرِءٍ ثَلَاثَۃُ آبَاءٍ اَبُوْکَ مَنْ وَلَدَکَ وَاَبُوْکَ مَنْ زَوَّجَکَ

وَاَبُوْکَ مَنْ عَلَّمَکَ وَخَیْرُ الْآبَاءِ مَنْ عَلَّمَکَ (حدیث نبوی)

ترجمہ: ہر شخص کے تین باپ ہیں ایک وہ جس کے صلب سے تو پیدا ہوا تیرا باپ ہے، اور وہ بھی تیرا باپ ہے جو تیرے زوج کا باپ ہے، اور وہ بھی تیرا باپ ہے جس نے تجھ کو پڑھایا یعنی تیرا استاد اور ان تینوں میں بہتر باپ وہ ہے جس نے پڑھایا

ضمیمہ جات

تقریظ

جب میں اپنے نوجوانوں کے ہاتھ میں کتاب وقلم دیکھتا ہوں تو میری روح تازہ ہو جاتی ہے اور مجھے اپنی قوم کا مستقبل روشن اور شاندار دکھائی دیتا ہے۔ محمد اعظم چوہدری ایک ایسے باصلاحیت اور ہونہار نوجوان ہیں جو اپنے زمانہ طالب علمی میں ایک طرف غیر نصابی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے اور ساتھ ہی ساتھ تعلیمی سرگرمیوں میں بھی پیش پیش رہے ہیں۔ زمانہ طالب علمی میں ان کی دو کتابیں "مقامی حکومتیں" اور "بین الاقوامی تعلقات دو عالمگیر جنگوں کے مابین" شائع ہوئیں اور اب بحیثیت لیکچرار شعبہ سیاسیات وفاقی گورنمنٹ اردو کالج بین الاقوامی تعلقات نظریہ اور عمل ان کی تیسری ضخیم کتاب بجلد شائع ہو رہی ہے میں نے اس کتاب کو دلچسپی سے پڑھا اور ان کی محنت ان کے جذبۂ علم اور ان کی تصنیفی صلاحیت سے حد درجہ متاثر ہوا۔ یہی وہ نوجوان ہیں جو علم وعمل کے غازی ہیں اور اپنی خداداد صلاحیتوں سے روح پاکستان کو منور کر رہے ہیں۔ اپنے موضوع کے اعتبار سے یہ ایک باصلاحیت اور ذہین طالبعلم کی وہ کامیاب کوشش ہے جس سے نہ صرف طلباء وطالبات استفادہ کریں گے بلکہ اساتذہ بھی اسے پسند کریں گے اعظم چوہدری نے جو کچھ اپنے فاضل اساتذہ سے سیکھا اور حصول علم کے لیے جن کتابوں سے استفادہ کیا اسے اس کتاب میں سلیقے سے اس طور پر سمو دیا ہے کہ یہ اپنے موضوع پر ایک اچھی اور کامیاب کتاب بن گئی ہے۔ اس کتاب کی ترتیب میں اعظم چوہدری نے اپنے موضوع کو اس طرح پھیلایا اور سمیٹا ہے کہ کتاب پڑھ کر بین الاقوامی تعلقات کے علم کی ایک واضح تصویر سامنے آجاتی ہے اور پڑھنے والا اس موضوع سے اچھی طرح متعارف ہو جاتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ تصنیف وتالیف کے اس سلسلے کو جاری رکھیں گے اور ان کی ہر کتاب پہلی کتاب سے بہتر اور علم میں اضافہ ثابت ہوگی۔ اس کتاب کی تالیف پر میں اعظم چوہدری کی پیٹھ تھپک کر شاباشی دیتا ہوں۔

۱۲ ردسمبر ۱۹۸۵ء

جمیل جالبی
ڈاکٹر جمیل جالبی
شیخ الجامعہ
جامعہ کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وفاقی گورنمنٹ اردو کالج

بابائے اردو روڈ ۔ کراچی

تعارف

وفاقی گورنمنٹ اردو کالج کے لیکچرار شعبہ سیاسیات اور میرے عزیز شاگرد جناب محمد اعظم چوہدری کی گراں قدر تصنیف "بین الاقوامی تعلقات نظریہ اور عمل" کے تفصیلی مطالعہ کے بعد میں یہ کہنے کی جرأت کروں گا کہ جواں ہمت، صاحب قلم کی کتاب بین الاقوامی تعلقات کے موضوع پر ایک مفید اضافہ ہے۔

یہ کتاب واقعی اس لائق ہے کہ اسے جامعہ کراچی کے بی۔ اے کے نصاب میں داخل کرلیا جانا چاہئے ان لوگوں کے لئے جو نوجوان نسل کے اندر فکر و نظر سے مایوسی کا اظہار کرتے ہیں اعظم چوہدری صاحب کی تصنیف یقیناً ایک فال نیک ہے بین الاقوامی تعلقات پر قومی زبان میں کتابوں کا فقدان ہے اعظم چوہدری صاحب نے قومی زبان میں ایک مبسوط کتاب لکھ کر ایک اہم ضرورت کو پورا کیا ہے جس کے لئے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اردو دنیا اسے ہاتھوں ہاتھ لے گی اور اہل علم ان کی اس کاوش کو قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے۔

(دستخط)

پروفیسر محمد خلیل اللہ
پرنسپل وفاقی گورنمنٹ اردو کالج
و
رئیس کلیہ قانون جامعہ کراچی

۲۵ دسمبر ۱۹۸۵ء

Prof. Mohammed Ahsen Chaudhri
A. B. (California) M.A. (Oregon)
Ph D (Duke)
DEAN, FACULTY OF ARTS

Phone 462011/60
464286

UNIVERSITY OF KARACHI
KARACHI 32 PAKISTAN

دیباچہ

بین الاقوامی تعلقات کے مضمون نے جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد بحیثیت ایک نصابی مضمون کے کافی ترقی کی ہے۔ جامعہ کراچی پاکستان کی جامعات میں سے پہلی جامعہ ہے جس میں بین الاقوامی تعلقات کو بحیثیت ایک مضمون پوسٹ گریجویشن کی سطح پر متعارف کرایا گیا۔ اساتذہ، دانشوروں اور محققین نے اس ضمن میں تحقیقی مقالے اور کتابیں لکھ کر اس مضمون کو وسعت دینے کی کوشش کی لیکن پھر بھی زیادہ تر مواد انگریزی میں ہے۔ اردو زبان میں کسی نے بھی بین الاقوامی تعلقات پر ایک جامع کتاب لکھنے کی کوشش نہیں کی سوائے اعظم چوہدری کے زیر نظر اردو تصنیف پر موصوف مبارک باد کے مستحق ہیں۔

کتاب ہذا میں بین الاقوامی تعلقات کے اصولوں اور کئی اہم واقعات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ کتاب کا اسلوب اچھا ہے۔ بین الاقوامی تعلقات کے مفکرین نے جو اصطلاحات انگریزی میں استعمال کی ہیں۔ اعظم چوہدری نے انہیں بڑی عمدگی سے اردو کے قالب میں ڈھالا ہے۔

اب جبکہ بین الاقوامی تعلقات کے مضمون کی تدریس کا آغاز گریجویشن کی سطح تک ہو چکا ہے۔ لہٰذا یہ کتاب اساتذہ اور طلبہ کے لئے کئی اعتبار سے بے حد مفید و مددگار ثابت ہوگی۔

Mohammed Ahsen Chaudhri

پروفیسر ڈاکٹر محمد احسن چوہدری
صدر شعبہ تعلقات بین الاقوام و رئیس کلیہ فنون
جامعہ کراچی

۲۰ دسمبر ۱۹۸۵ء

Phone Off: 462011/83

Department of Political Science
University of Karachi

UNIVERSITY ROAD
KARACHI-32 (Pakistan)

اردو ہماری قومی زبان ہے اور اردو ادب کا شعری و نثری سرمایہ قابلِ فخر ہے۔
تاہم سائنسی و عمرانی علوم و فنون اور ٹیکنالوجی سے متعلق اردو زبان میں مستند نصابی و تحقیقی کتب بہت کمیاب ہیں۔ حیدر آباد دکن اور پاکستان میں انجمن ترقی اردو اور دیگر اداروں نے مغربی مصنفین کی کتابوں کے تراجم شائع کئے ہیں۔ لیکن جب سے ہمارے ملک میں اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ نصابی کتب شائع ہو رہی ہیں۔ لیکن ان میں سے اکثر غیر معیاری اور اغلاط سے پُر ہوتی ہیں۔ اس لئے نصابی کتب کی تالیف و ترتیب میں بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ علوم عمرانی مثلاً معاشیات، سیاسیات، سماجی بہبود اور نفسیات وغیرہ کے مضامین میں اب بھی اچھی کتابوں کی کمی ہے۔

جناب محمد اعظم چوہدری نے "بین الاقوامی تعلقات۔ نظریہ و عمل" کو مرتب کرکے بڑی حد تک اس کمی کو پورا کیا ہے۔ ملک کی جامعات کے طلبا و طالبات کے لئے خاصہ مواد جمع کر دیا ہے۔ یہ کوشش قابل قدر ہے۔ "بین الاقوامی تعلقات" کے موضوعاتی وسعت کے پیش نظر اعظم چوہدری صاحب نے "قلزم کو کوزہ" میں بند کرنے کی سعی کی ہے۔ چونکہ یہ ابتدائی کوشش ہے اس لئے عین ممکن ہے کہ بہت سے پہلو تشنہ کام رہ گئے ہوں یا زبان اور اصطلاحات کی خامیاں غیر شعوری طور پر

سرزد ہوگئی ہوں۔ تاہم چوہدری صاحب کی کاوش کی قدر کرنا چاہیئے۔

کتاب کی ترتیب و تالیف میں چوہدری صاحب نے "بین الاقوامی تعلقات" پر بعض مستند تصانیف سے استفادہ کیا ہے۔ جس کی وجہ سے کتاب کی افادیت میں اضافہ ہوگیا ہے۔ دوسری خوبی کتاب کی یہ ہے کہ اس میں مضمون کے نظری و عملی پہلوؤں کا بہت ایجاز و اختصار کے ساتھ جائزہ لیا گیا ہے اور سارے ممکنہ جہات احاطہ تحریر میں لانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ علوم عمرانی میں بین الاقوامی تعلقات نے دوسری جنگ عظیم کے بعد ایک باقاعدہ جداگانہ علم کی حیثیت اختیار کرلی ہے۔ اس سے پیشتر یہ مضمون علم سیاسیات کا ذیلی موضوع تھا۔ اور پہلی جنگ عظیم سے قبل یہ تاریخ عمومی کا جزو تھا۔ اس میں ۱۹۴۵ء کے بعد سے بہت ترقی ہوئی ہے اور مختلف پہلوؤں پر کثیر تعداد میں کتابیں لکھی گئی ہیں اس مضمون کو جداگانہ علمی حیثیت دو اہم اسباب کی وجہ سے حاصل ہوئی ہے۔ پہلے تو یہ کہ عالمی سیاسیات میں انقلابی تغیرات ہوئے ہیں۔ اور بین الاقوامی تعلقات کا دائرہ بہت وسیع ہوگیا ہے یہ صرف یورپ یا شمالی امریکہ تک محدود نہیں رہا بلکہ اس نے صحیح معنوں میں عالمی حیثیت اختیار کرلی ہے۔ دوسرے یہ کہ عمرانی علوم میں عمومیت کی بجائے تخصیص SPECIALISATION کا رجحان پیدا ہوا۔ جس کی وجہ سے علوم کی تقسیم موضوع کے اعتبار سے ہوئی اور اس رجحان کے تحت نئے علوم نے جنم لیا۔ ساتھ ہی ساتھ ایک نیا رجحان یہ پیدا ہوا کہ ان میں علوم کی نظری بنیادوں کی تلاش کا آغاز ہوا اور طریقہ تحقیق METHODOLOGY کے اصول مرتب کئے گئے ان رجحانات کے پیش نظر، بین الاقوامی تعلقات کے ماہرین نے جزوی یا عمومی تشریحات کرنے کی غرض سے اس میں نئی راہیں پیدا کیں اور مختلف زاویوں سے بین الاقوامی تعلقات کا جائزہ لیا۔ اس سلسلہ میں ان ماہرین نے دوسرے عمرانی علوم سے بھی استفادہ کیا۔ نفسیات، معاشیات اور سماجیات سے متاثر ہو کر ان زاویوں سے بین الاقوامی تعلقات" کا تجزیہ پیش کیا۔ اس طرح عمرانی علوم میں عمومی انضمام کا رجحان پیدا ہوگیا ہے اور اس رجحان کے تحت "بین الاقوامی تعلقات" کے مطالعہ

میں جامعیت نمایاں ہو رہی ہے - ان علمی تحریکات و رجحانات کے زیر اثر "بین الاقوامی تعلقات" کے مطالعہ کی نظری بنیادیں استوار ہو گئی ہیں اور اس نے علمی حیثیت حاصل کر لی ہے - تیسری دنیا کے ممالک میں بالعموم اور پاکستان میں اکثر جامعات میں بین الاقوامی تعلقات کے علیحدہ شعبے قائم ہیں یا اسے علم سیاسیات اور تاریخ عمومی کے نصاب میں شامل کیا گیا ہے - لیکن بدقسمتی سے ابھی تک اس مضمون پر تخلیقی تصانیف نہیں شائع ہوئیں - گو کہ انگریزی زبان میں بعض محققین نے پاکستان کی خارجہ پالیسی، عالمی امور میں اس کے کارناموں پر اچھی کتابیں لکھی ہیں لیکن اردو میں ایسی کتابیں کمیاب ہیں - جناب پروفیسر محمد خلیل اللہ پرنسپل وفاقی گورنمنٹ اردو کالج و رئیس کلیہ قانون جامعہ کراچی نے پاکستان کی خارجہ پالیسی پر یقیناً ایک اچھی کتاب لکھی ہے - بہرکیف اب اس بات کی ضرورت ہے کہ اس مضمون پر انگریزی زبان میں لکھی ہوئی کتب سے مواد جمع کر کے اردو میں کتابیں لکھنے کی بجائے ملک کے مخصوص نظریاتی رجحانات، روایات، داخلی علاقائی اور عالمی سطح پر رونما ہونے والے حالات و کوائف کی روشنی میں ٹھوس علمی بنیادوں پر تخلیقی کتب لکھی جائیں - امید ہے کہ جناب اعظم چوہدری صاحب اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے آئندہ بھی اپنی علمی کاوشوں کو جاری رکھیں گے اور "بین الاقوامی تعلقات" پر مزید تحقیقات جاری رکھیں گے اور نئی کتابیں لکھیں گے - طلباء طالبات کی نصابی ضروریات کے پیش نظر چوہدری صاحب کی کتاب زیر نظر بہت مفید ہو گی اور اساتذہ بھی استفادہ کر سکیں گے عام قاری کے لئے بھی بین الاقوامی تعلقات کے افہام میں مدد ملے گی -

منظور الدین احمد

پروفیسر ڈاکٹر منظور الدین احمد
صدر شعبہ سیاسیات
جامعہ کراچی

۱۸ / دسمبر ۱۹۸۵ء

Phones : 46 55 98 / 46 20 11/69

STUDENTS' GUIDANCE COUNSELLING & PLACEMENT
BUREAU
UNIVERSITY OF KARACHI

DIRECTOR

تاثرات

بین الاقوامی تعلقات کا مضمون اور اس کے موضوعات موجودہ دور میں غیر معمولی اہمیت اختیار کر چکے ہیں۔ ایک عام آدمی سے لے کر بڑے بڑے اسکالر اور دانشور اس مضمون سے دلچسپی کا اظہار کر رہے ہیں اور اس کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنے کی خواہش رکھتے ہیں اس موضوع پر جتنی کتابیں اور مضامین حالیہ دور میں لکھے گئے اور چھپے ہیں شاید ہی کسی اور موضوع پر لکھے گئے ہوں لیکن پھر بھی تشنگی باقی ہے۔

جناب محمد اعظم چوہدری صاحب لیکچرار شعبہ سیاسیات وفاقی گورنمنٹ اردو کالج کی زیر نظر کتاب اس تشنگی کو دور کرنے کی ایک اچھی کوشش ہے۔ ان کی اس کتاب کے مختلف ابواب طلبہ کے مطالعاتی ضرورت کے پیش نظر تیار کیئے گئے ہیں۔

اردو میں ان موضوعات پر اچھی مطالعاتی کتب کا فقدان ہے۔ جس کے سبب بیشتر اوقات طلبہ حراساں رہا کرتے ہیں۔ کتاب ہذا کے افق پر نمودار ہونے سے بین الاقوامی تعلقات کے طالب علم کی تشنگی بڑی حد تک دور ہو سکے گی۔

چوہدری صاحب نے بڑی محنت اور لگن کے ساتھ اس کتاب کو ترتیب دیا ہے ان کی یہ کاوش قابل مبارک باد اور لائق ستائش ہے۔

ڈاکٹر احمد عبد القدیر

ڈائریکٹر

ادارہ برائے رہنمائی، مشاورت وملازمت طلبہ

جامعہ کراچی

۱۴ دسمبر ۱۹۸۵ء

عرضِ مصنّف طبع پنجم

اللہ رب العزت کے فضل و کرم سے بین الاقوامی تعلقات نظریہ اور عمل کا پانچواں ایڈیشن پیش خدمت ہے۔ میں اپنے عزیز طلبۂ، واجب الاحترام اساتذہ کرام اور عام قارئین کا بے حد مشکور ہوں جنہوں نے میری اس تصنیفی و تالیفی کاوش کو میری توقعات سے بڑھ کر سراہا۔ کتاب کا موجودہ ایڈیشن ضروری تراہیم اور اضافوں کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے۔ غیر ضروری عنوانات کو حذف کر کے کچھ نئے عنوانات شامل کئے گئے ہیں اور بعض ابواب کو از سر نو مرتب کیا گیا ہے تاکہ طلبہ بہتر طور پر مستفید ہو سکیں۔ کتاب سے متعلق ہر تنقیدی رائے اور مفید مشوروں کا خیر مقدم کیا جائے گا۔

محمد اعظم چوہدری

یکم نومبر ۱۹۹۳

عرضِ مصنّف طبعِ اوّل

بین الاقوامی تعلقات و قانون کے بارے میں یہ تصور عام ہے کہ ان کی نشو و نما یورپ میں ہوئی۔ جرمی بینتھم بین الاقوامی تعلقات اور ہیوگو گروٹیئس قانون بین الاقوام کا بانی ہے۔ بین الاقوامی تعلقات کی ترقی و ترویج موجودہ صدی کی عالمی جنگوں کی مرہونِ منت ہے۔ ان جنگوں سے قبل بین الاقوامی تعلقات کا فقدان تھا اور عوام الناس علاقائی احساس سے آگے نہیں جاتے تھے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ دورِ قدیم میں یونان کی تین سو کے لگ بھگ شہری ریاستوں کے مابین تعلقات موجود تھے۔ ان میں احساسِ انفرادیت اور احساسِ آزادی بھی موجود تھا۔ بین الاقوامی تعلقات کے بیشتر بنیادی تصورات اور اصول مثلاً اجتماعی تحفظ، توازنِ طاقت، سفارتکاری، قومی طاقت اور ثالثی کا طریقہ کار وغیرہ ہمیں یونانیوں سے ورثے میں ملا ہے۔

بے شک بعد کا دور بین الاقوامی تعلقات کے نقطہ نگاہ سے زیادہ اہمیت کا حامل نہیں رہا۔ مگر اسلام نے اپنے ہمہ گیر پیغام کے ذریعے بین الاقوامی تعلقات میں جو وسعت پیدا کی اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ بلادِ اسلامیہ بین الاقوامی تعلقات میں اہم کردار ادا کیا۔ شارحِ اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں میثاقِ مدینہ، صلح حدیبیہ، عہد نامے، سفیروں و قاصدوں کی مراعات اور خطبہ حجۃ الوداع ایسی مثالیں ہیں جو بین الاقوامی تعلقات میں اساسی حیثیت رکھتی ہیں۔

اردو کالج اور اردو تحریک سے وابستگی کی وجہ سے یہاں میں اردو زبان کے بارے میں چند الفاظ کہنا چاہتا ہوں۔ اردو زبان کرۂ ارض کی واحد زبان ہے جو کسی بھی غیر زبان کے الفاظ کو قبول کر کے اسے اس طرح اپناتی ہے کہ پھر وہ لفظ خود اپنی زبان کی محفل میں جاتے ہوئے اجنبیت محسوس کرتا ہے۔ اس میں معنویت کی گہرائی کے ساتھ ساتھ اظہار مافی الضمیر اور ابلاغ فکر کی بھرپور توانائی اور مکمل سلیقہ موجود ہے۔ میرے خیال میں ہماری فلاح اس میں ہے کہ ہم جلد از جلد اردو زبان کو عملی طور پر اس کا جائزہ حق دلوا دیں۔ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ اس میں

ہماری یگانگت کا راز مضمر ہے۔ بقول پروفیسر پریشان خٹک "پاکستانی اردو وہ ہو گی جس کے مزاج میں سرحد پنجاب سندھ اور بلوچستان کی خوشبو رچی بسی ہو گی اس حقیقت کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ جغرافیائی اور معاشرتی حالات کا زبان پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ ان کے لہجے محاورے اور تشبیہات کو گلدستہ اردو میں سجانا ہو گا۔

زیر نظر کتاب میں بی اے بین الاقوامی تعلقات اور ایم اے سیاسیات کی نصابی ضروریات کو مدنظر رکھا گیا ہے جامعہ کراچی کے علاوہ جامعہ اسلامیہ بہاولپور، جامعہ بہاؤ الدین ذکریا ملتان، جامعہ بلوچستان کوئٹہ، جامعہ پنجاب لاہور، جامعہ پشاور، جامعہ سندھ جامشورو اور جامعہ قائد اعظم اسلام آباد کی بھی نصابی ضروریات کا کسی حد تک احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

میری اس کاوش کو پروان چڑھانے میں میرے اساتذہ کرام کا بہت بڑا حصہ ہے۔ جن کا فرداً فرداً شکریہ ادا کرنا یہاں ممکن نہیں لیکن بعض شخصیات ایسی ہیں جن کا شکریہ ادا کیے بغیر نہیں رہ سکوں گا۔ ان میں جناب پروفیسر محمد خلیل اللہ صاحب جناب پروفیسر ڈاکٹر محمد احسن چوہدری صاحب جناب پروفیسر ڈاکٹر منظور الدین احمد صاحب جناب پروفیسر ڈاکٹر احمد عبد القدیر صاحب جناب پروفیسر سید اظہر علی اظہر صاحب جناب پروفیسر شبیر حسین قریشی صاحب جناب پروفیسر مختار احمد خان صاحب محترمہ مہر النساء صاحبہ محترمہ تنویر خالد صاحبہ کا بے حد مشکور و ممنون ہوں کہ ان صاحبان نے اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود مجھے اپنے قیمتی مشوروں سے نوازا اور میری رہنمائی فرمائی۔

اپنے چھوٹے بھائیوں عارف جاوید، تحمل محمود اور گل شہزاد کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جنہوں نے کتاب مرتب کرنے میں ہر لحہ ساتھ دیا۔ جس سے میری بہت ساری مشکلات آسان ہو گئیں۔ کتاب کے ناشر جناب طاہر محمد صاحب اور ان کے بیٹے عثمان غنی طاہر بھی خصوصی شکریے کے مستحق ہیں جن کی ذاتی دلچسپی سے ایک ضخیم کتاب قلیل عرصہ میں منظر عام پر آئی۔

محمد اعظم چوہدری

یکم جنوری ۱۹۸۶ء کراچی

بابِ اوّل

تعارف بین الاقوامی تعلقات

INTRODUCTION To INTERNATIONAL RELATIONS

۱۔ بین الاقوامی تعلقات کا مفہوم

۲۔ بین الاقوامی تعلقات کی اقسام

۳۔ بین الاقوامی تعلقات اور سیاسیات عالم میں فرق

۴۔ داخلی سیاست اور عالمی سیاست میں فرق

۵۔ بین الاقوامی تعلقات کے مطالعے کی اہمیت

۶۔ بین الاقوامی تعلقات کا تاریخی تناظر

۷۔ بین الاقوامی تعلقات کا ارتقاء بحیثیت نصابی مضمون

۸۔ بین الاقوامی تعلقات پر اثر انداز ہونے والے عوامل

۹۔ بین الاقوامی تعلقات کے نظریات

تمہید

انسان حیوانِ ناطق ہے بغیر گفتگو کے نہیں رہ سکتا۔ اس لئے انسانی بقاء کے لئے معاشرے کا قیام ضروری ہے۔ افراد کے مجموعہ کا نام معاشرہ ہے اس کی اہمیت علامہ اقبال نے یوں بیان کی ہے۔

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں!

بین الاقوامی معاشرہ اقوام اور مملکتوں کے مجموعہ کا نام ہے۔ بالکل افراد کی طرح ایک مملکت بھی دوسری مملکتوں کے ساتھ تعلقات قائم کئے بغیر قائم نہیں رہ سکتی کیونکہ

"افراد کے مسائل ریاستوں کے مسائل سے مختلف نہیں ہوتے"

جس طرح قومی معاشرہ کے افراد کے مابین تعاون ضروری ہے۔ بالکل اسی طرح عالمی معاشرہ کے اراکین کے لئے بھی ایک دوسرے کے ساتھ تعاون لازمی ہے کرۂ ارض پر کوئی مملکت تنہا نہیں رہ سکتی چاہے اس کے پاس بے پناہ وسائل ہوں مملکتیں اپنی ضروریات کی تکمیل صرف اپنے وسائل کو بروئے کار لاکر پوری نہیں کر سکتیں۔ کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی شعبہ حیات میں تشنگی رہ جائے گی۔ ہر کوئی مملکت ہر شعبہ زندگی میں خود کفیل نہیں ہو سکتی غرض کہ وسائل کی کمی یا زیادتی دو مملکتوں کو ایک دوسرے کا محتاج بنا دیتی ہیں۔ اسی انحصار اور پابندی کے سبب اقوام ایک دوسرے کے قریب آجاتی ہیں۔

معاشی، مالی اور تکنیکی ضروریات کے علاوہ مملکتوں کی اور بھی ضروریات ہوتی ہیں ہر مملکت اپنی علاقائی سالمیت اور آزادی کو برقرار رکھنا چاہتی ہے۔ اپنی سالمیت اور آزادی کا دفاع و حفاظت ہر مملکت کا بنیادی فرض ہے۔ اس کیلئے دفاعی انتظامات اور ٹیکنالوجی کا حصول ضروری ہے۔ دنیا میں شائد کوئی مملکت بھی ایسی نہ ہو جس کے سارے ممالک دوست ہوں۔ قومی معاشرہ کی طرح مملکتوں کے درمیان

بھی ہیجان کشیدگی اور تاریخی و موقعی دشمنیاں موجود رہتی ہیں۔ جس کے سبب ان کے باہمی تعلقات نشیب و فراز کا شکار ہوتے رہتے ہیں۔ ایسے حالات کی موجودگی میں مملکتوں کو تعلقات کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ جہاں ضروری ہو وہاں تعلقات کو بہتر بنایا جاتا ہے۔ جھگڑوں کو نمٹایا جاتا ہے مخالفین کے خلاف محاذ بنائے جاتے ہیں۔ غرض یہ ایک مسلسل اور دائمی عمل ہے جس میں مملکتیں الجھی رہتی ہیں۔ بین الاقوامی تعلقات مسائل اور معاملات کا ایک نہ ختم ہونے والا لامتناہی سلسلہ ہے۔ کوئی مملکت اس سے بچ کر نہیں رہ سکتی۔

مختصر یہ کہ بین الاقوامی تعلقات کا موضوع ہر چیز پر محیط ہے۔ ہر شعبہ زندگی کو متاثر کرتا ہے ہمیں اس مضمون کے ساتھ انصاف کرنے کے لئے بڑی فراخدلی اور وسیع النظری سے کام لینا ہوگا۔

۱۔ بین الاقوامی تعلقات کا مفہوم:۔ MEANING

فرد کے تعلقات کی طرح بین الاقوامی تعلقات کا قیام بھی تفاوت DIVERSITY کے اصول کے تحت عمل میں آیا ہے اس کی وضاحت یوں کی جاسکتی ہے کہ کوئی فرد یا مملکت تنہا زندگی نہیں گزار سکتے بلکہ انہیں کچھ لینے اور کچھ دینے کے اصول پر عمل پیرا ہونا پڑتا ہے مثال کے طور پر ایک شخص کے پاس ریڈیو، دوسرے کے پاس گاڑی اور تیسرے کے پاس ٹیلی فون ہے تو انہیں ایک دوسرے کی اشیاء پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ اس طرح مملکتوں کے وسائل میں بھی اختلاف یا فرق پایا جاتا ہے۔ کئی ممالک زرعی ہوتے ہیں۔ بعض معدنیات کی دولت سے مالا مال اور بعض صنعت و حرفت میں بہت زیادہ آگے نکل چکے ہوتے ہیں اس لئے ان تمام ممالک کو ایک دوسرے کے ساتھ تعلقات قائم کرنے پڑتے ہیں۔ یہ تضاد ہی درحقیقت بین الاقوامی تعلقات کا محور ہے۔

۲۔ بین الاقوامی تعلقات کی اقسام:۔ KINDS

بین الاقوامی تعلقات کی عموماً دو اقسام ہیں۔

(۱) نجی بین الاقوامی تعلقات :- PRIVATE INTERNATIONAL RELATIONS

ایسے تعلقات جو دو یا دو سے زائد ملکتوں کے شہریوں اور اداروں کے مابین پائے جائیں انہیں نجی بین الاقوامی تعلقات کہتے ہیں۔ یہ تعلقات شہریوں کے تجارتی صنعتی اقتصادی علمی تمدنی، فنی اور دیگر معلومات سے متعلق ہو سکتے ہیں ان میں ایسے امور بھی شامل ہوتے ہیں جیسے شہریت ترک وطن توطن، نسل کشی وغیرہ۔ یہ تعلقات عام طور پر مختلف بین الاقوامی اداروں، جماعتوں کے ذریعے پروان چڑھتے ہیں۔ مثلاً کمیونسٹ پارٹیاں، ٹریڈ یونین، مالیاتی ادارے، اوپیک تیل خریدنے والے ممالک ریڈ کراس اور مذہبی جماعتیں مثلاً پاکستان کی جماعت اسلامی اور مصر کی اخوان المسلمین وغیرہ ان تعلقات کا براہ راست اثر قومی تعلقات پر پڑتا ہے۔ اور اس سے خارجہ حکمت عملی متاثر ہوتی ہے۔ قانون بین الاقوام ان معاملات کے بارے میں بھی اصول وضوابط وضع کرتا ہے۔

۲۔ سرکاری بین الاقوامی تعلقات :۔

PUBLIC INTERNATIONAL RELATIONS

دو یا دو سے زائد ریاستوں کے مابین جو تعلقات ہوتے ہیں انہیں سرکاری بین الاقوامی تعلقات یا سیاسیات عالم کہتے ہیں۔

ان تعلقات میں امن اور سلامتی دفاع اور دفاعی معاہدے بین الاقوامی تجارت اور زرمبادلہ، جنگ اور جنگی تیاریاں۔ معاہدے، امور خارجہ سفارت کاری غیر جانبداری، بین الاقوامی رسل و رسائل، مواصلات، بین الاقوامی تنظیمیں، غیر ملکی پروپیگنڈا اور جاسوسی وغیرہ شامل ہیں۔

۳۔ بین الاقوامی تعلقات اور عالمی سیاسیات عالم میں فرق

عام طور پر یہ دونوں اصطلاحیں ہم معنیٰ ہی استعمال ہوتی رہی ہیں سفارت کاران کے فرق کو واضح کرنے میں خاصے کامیاب نہیں ہوئے لیکن وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ ان دونوں اصطلاحوں میں خاصہ فرق کیا جانے لگا ہے۔

عالمی سیاسیات کی اصطلاح عالمی برادری میں محدود معنوں میں استعمال ہوتی ہے اور اس کا تعلق صرف ڈپلومیسی اور ریاستوں کے درمیان تعلقات کے سیاسی معاملات سے ہوتا ہے جبکہ بین الاقوامی تعلقات کا لفظ عالمی سطح پر گروہوں اور مملکتوں کے تعلقات لئے مشترکہ استعمال ہوتا ہے جس میں وہ تمام قوتیں اور طریقے زیر بحث آتے ہیں جن کے تحت انسان سوچتا ہے اور عمل کرتا ہے اس طرح بین الاقوامی تعلقات کی اصطلاح عالمی سیاسیات کے مقابلے میں وسیع معنیٰ میں استعمال ہوتی ہے۔

تسخیر خلا کے بعد عالمی سیاست اور تعلقات میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا ہے اب سیاست یا تعلقات صرف کرۂ ارض تک ہی محدود نہیں رہے بلکہ اس کی بازگشت خلا اور محاصرہ خلا تک پہنچ چکی ہے۔

سیاسیات عالم کی تعریفیں:۔

بین الاقوامی سیاسیات کی تعریف کے سلسلے میں ماہرین سیاسیات میں اختلاف پایا جاتا ہے اور ہم ان مفکرین کو دو مکتبہ ہائے فکر میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

ا۔ پہلا مکتبہ فکر جو ریاستوں کو حقیقی اخلاقی اور سیاسی تنظیم کی بنا پر ایک دوسرے سے تعلقات استوار رکھنے پر زور دیتا ہے۔

ب۔ دوسرا مکتبہ فکر جو دنیا کو نامکمل سمجھتا ہے اور اس کی تکمیل صرف قوت کے استعمال اور اس کے حصول سے کرنا چاہتا ہے اس طبقے کا خیال ہے کہ مختلف قوتیں انسانی معاشرے کے خلاف برسرپیکار ہیں اور کوئی ان کے خلاف کام نہیں کر سکتا۔ بلکہ انہیں ان عوامل کے ساتھ مل کر کام کرنا ہوتا ہے۔ قوت کے مقابلے میں قوت اور طاقت ہی سے کام چلتا ہے۔

ا۔ ایچ جے مارگن تھیو H.J. MARGENTHAU نے اپنی کتاب "اقوام کے مابین سیاست" POLITICS AMONG NATIONS میں لکھا ہے۔

۱۔ بین الاقوامی سیاست صرف قوت کے حصول کی جنگ ہے

۲۔ بین الاقوامی سیاست کا مقصد زیادہ سے زیادہ قوت کا حصول ہے

۳۔ بین الاقوامی سیاست وہ انسانی کردار ہے جو انسان عالمی برادری میں سرانجام دیتا ہے۔

۲۔ میکاولی :۔ MACHIAVELLI کہتے ہیں

"طاقت کے حصول کے لئے طاقت کا استعمال ایسے ہی ہے جیسے سرمائے کے حصول کے لئے سرمائے کا استعمال۔"

۳۔ جارج سوارزن برگ GEORGE SCHWARZENBERGER اپنی کتاب "طاقتی سیاست" POWER POLITICS میں طاقت کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ اول طاقت کی دھمکی دوئم طاقت کا حقیقی استعمال۔ اس طرح سوارزن برگ کا خیال ہے کہ طاقت کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ اسے خارجہ تعلقات میں اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے ضرور استعمال کیا جائے بلکہ اس کا خیال یہ ہے کہ طاقت کے تصور کو اپنے ملک کی ترقی خوشحالی اور دفاع کے لئے استعمال کرنا چاہیئے۔ مختصراً تعریف یوں بیان کرتے ہیں کہ :۔

"قوت کی سیاست ریاستوں کے عام طریقوں مثلاً ہتھیاروں کی دوڑ، ڈپلومیسی کی قوت، معاشی طاقت توازن طاقت، اتحاد اور جنگ وغیرہ کو واضح کرتی ہے۔"

۴۔ گراسن کریک GRAYSON KRIK

"بین الاقوامی سیاست کا تعلق ان قوتوں سے ہے جو قومی ریاست کی خارجہ پالیسیوں کو بدل دیتی ہیں۔ جن طریقوں سے اور جن حدود میں اس کے بہتر استعمال پر عمل درآمد کیا جاتا ہے"

۵۔ پروفیسر کیونسی رائٹ PROFESSOR QUINCY RIGHT اس علم کو بہت وسعت دیتے ہوئے کہتے ہیں :۔

"یہ علم اُن تمام امور سے متعلق ہے۔ جو بین الاقوامی مسائل کے حل کا موجب بنیں کیونکہ تاریخ عالم سیاسی جغرافیہ خطوں کا معاشی مطالعہ نفسیات و عمرانیات سب ہی اس علم کے احاطے میں شامل ہوتے ہیں۔ وہ اپنی تحقیق ROOT DISCIPLINE کی وضاحت یوں کرتے ہیں۔

قانون بین الاقوام، سفارتی تاریخ، ملٹری سائنس، بین الاقوامی ادارے، بین الاقوامی تجارت اور خارجہ تعلقات بھی اس مضمون کے دائرہ مطالعہ میں شامل ہیں

ان تعریفوں میں سب سے بہتر تعریف مارگن تھیو کی تعریف ہے کہ :-

"عالمی سیاست وہ انسانی کردار ہے جو انسان بین الاقوامی برادری میں سرانجام دیتا ہے۔"

اس کے معنی یہ ہوئے کہ عالمی سیاست ہمیں ان قوتوں کو سمجھنا اور ان کی نشاندہی کرنا ہے جو قوموں کے درمیان باہمی تعلقات قائم کرتی ہیں اور کن طریقوں سے یہ قوتیں سیاسی تعلقات اور عالمی اداروں پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ علاوہ ازیں اس میں عالمی امن و سلامتی کا جائزہ بھی لیا جاتا ہے۔ عالمی امن کی خواہش ہر ریاست کی ہے مگر اس سلسلے میں جو کام انجام دیا جا رہا ہے اور جن مسائل و مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اس کا مطالعہ بھی بین الاقوامی تعلقات و سیاسیات کے باب میں داخل ہے۔

مختصراً سیاسیات عالم ریاستوں کے باہمی تعاون و تصادم کے مطالعہ کا نام ہے

۴۔ داخلی سیاست اور عالمی سیاست میں فرق :-

داخلی سیاست سے مراد ایسی حکمت عملی ہے جو مملکت کی سرحدوں کے اندر تشکیل دی جاتی ہے اور اس پر عمل درآمد کیا جاتا ہے۔ داخلی سیاست کا محور مملکت کے فلاحی کام ہوتے ہیں۔ اس طرح داخلی سیاست کے اہم مقاصد حسب ذیل ہیں۔

۱۔ بہتر معیار زندگی ۲۔ بنیادی حقوق کا تحفظ ۳۔ جہالت کا خاتمہ

۴۔ سماجی انصاف ۵۔ ترقی و اصلاحات ۶۔ صنعت و حرفت کی ترقی

۷۔ علاقائی تعصبات کا خاتمہ ۸۔ اقلیتوں کا تحفظ ۹۔ جمہوری، بلدیاتی اداروں کی ترقی ۱۰۔ منصفانہ معاشی نظام ۱۱۔ جذبہ حب الوطن ۱۲۔ سیاسی امن و سکون۔

دنیا کے سبھی ممالک اپنے اپنے حالات کے مطابق حکمت عملی مرتب کرتے ہیں عالمی سیاست مجموعہ ہے آزاد ممالک کی قومی پالیسی کے اُس حصے کا جسکا اثر باہر عمل درآمد کرداتے ہیں۔ اس قومی اور بین الاقوامی سیاست میں صرف درجہ کا فرق ہے نوعیت کا فرق نہیں ہے۔

اس طرح عالمی سیاست کے اہم مقاصد حسب ذیل ہیں

۱۔ علاقائی سالمیت ۲۔ سیاسی آزادی ۳۔ قومی مفادات ۴۔ قومی طاقت میں اضافہ ۵۔ دفاعی معاشی اور ثقافتی معاہدے ۶۔ قومی وقار و نظریات کی بالادستی

قومی سیاست :۔

داخلی اور عالمی سیاست کو سمجھنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ داخلی و عالمی سیاست میں قومی سیاست قدر مشترک ہے اس لحاظ سے قومی سیاست ایک منبع کی طرح ہے جس سے دو سوتے پھوٹتے ہیں۔ جو مختلف راہوں سے گزرتے ہوئے بحر ذخار میں جا ملتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر ملک کی قومی حکمت عملی کی دو شاخیں ہوتی ہیں ان میں ایک داخلی اور دوسری خارجی حکمت اور ان دونوں میں ہم آہنگی ہوتی ہے جب کبھی کسی ریاست کی قومی پالیسی میں تبدیلی آتی ہے تو اس سے عالمی سیاست متاثر ہوتی ہے جیسے امریکہ نے اپنی قومی پالیسی کے تحت پاکستان پر دباؤ ڈالا کہ افغانستان کا ساتھ دو اس طرح سے امریکہ کی قومی پالیسی نے ہماری قومی پالیسی کو متاثر کیا اور روس ہمارے خلاف ہو گیا۔ اس کا کبھی کبھی عالمی امن پر بھی زبردست اثر پڑتا ہے جیسا کہ ۱۹۵۰ء میں امریکہ کی کوریا میں مداخلت سے تیسری عالمگیر جنگ چھڑنے کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔

(۱) داخلی حکمت عملی کا دائرہ اختیار ریاست کے اندرونی مسائل اور عوام کی فلاح و

بہبود سے شروع ہوتا ہے حکومتوں کی تبدیلی شاذونادر ہی داخلی پالیسیوں پر اثر انداز ہوتی ہے لیکن کبھی کبھی جب مختلف نظریات کی پارٹی جیت جاتی ہے۔ یا پھر انقلاب آجاتا ہے۔ تو پھر داخلہ پالیسی پر گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ مثلاً پاکستان میں عوامی دور ۷۷-۱۹۷۲ء اور روس میں ۱۹۱۷ء کے بعد اشتراکی حکومت نے اندرون ملک بیشمار تبدیلیاں کیں۔ لیکن ان تبدیلیوں میں قومی مفادات کے ان اصولوں کو مدنظر رکھا گیا۔ جن پر عمل درآمد ضروری ہوتا ہے مگر اس کے برعکس خارجہ حکمت عملی بوقت ضرورت، مصلحت، حکومت کی تبدیلی اور شخصیت کی تبدیلی سے عموماً متاثر ہوتی رہی ہے۔ (۱)

قومی سیاست اور رائے عامہ

قومی سیاست کا سب سے اہم عنصر عوامی رائے عامہ ہے۔ یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ ترقی پذیر ممالک میں عوام کی اکثریت ناخواندہ ہے۔ لہذا انہیں سیاسی شعور کیسے حاصل ہو سکتا ہے۔ اور ان کی رائے سیاسی پالیسیاں تشکیل دینے میں کیسے معاونت کر سکتی ہیں۔ اب یہ سوال مبہم اور غیر ضروری ہے کیونکہ اب عوامی رائے کے اجتماعی فیصلوں کو کوئی بھی حکومت نظر انداز نہیں کر سکتی۔ جنوب مشرقی ایشیاء کے اکثر ممالک میں رائے عامہ کے مطابق قومی سیاست تشکیل نہیں دی گئی۔ جس کی وجہ سے انقلاب برپا ہوئے۔ انڈونیشیا میں اکثریت آبادی اسلامی نظام کی داعی ہے لیکن سوکارنو حکومت کمیونسٹوں کی حامی تھی جس کی وجہ سے ملک میں سیاسی انتشار پھیلا اور فوج نے اس کا تختہ الٹ دیا۔

پاکستان ایک ترقی پذیر ملک ہے اس وجہ سے اس کی قومی سیاست بھی بڑی طاقتوں کے اثرات سے بے بہرہ نہیں رہ سکتی۔ لیکن پاکستانی عوام کی رائے کے خلاف کوئی حکومت قومی سیاست مرتب نہیں کر سکتی۔ مثال کے طور پر ۱۹۶۵ء میں پاک بھارت جنگ میں پاکستانی عوام میں بھارت کے خلاف جنگ کرنے کا بڑا جوش و خروش تھا۔ جس کی وجہ سے اعلان تاشقند نے عوام کے جذبات کو زبردست دھچکا دیا۔ کیونکہ یہ بات داخلہ پالیسی کے خلاف تھی اس سے مسٹر بھٹو نے فائدہ اٹھایا اور عوام کے اس غیض و غضب کا

نتیجہ یہ نکلا کہ صدر ایوب خان کو اقتدار سے ہاتھ دھونا پڑے اور یحییٰ خان کے بعد مسٹر بھٹو نے خارجہ پالیسی میں دور رس تبدیلیاں کیں ۔ ۱۹۷۱ء کی پاک و بھارت جنگ میں داخلی محاذ بھارت کے خلاف مسلسل جنگ پر مصر تھا لیکن یحییٰ خان نے نہ صرف بنگال میں افواج پاکستان کو ہتھیار ڈالنے کا حکم دیا ۔ بلکہ مغربی محاذ پر بھی فوج کی پیش قدمی روک دی اور جنگ بندی کا اعلان کر دیا ۔ جبکہ جنرل یحییٰ خان کے رویے کے برعکس مسٹر بھٹو نے عوامی رجحانات کی نمائندگی کرتے ہوئے اقوام متحدہ میں قرارداد کو پھاڑ دیا اور بھارت کو کھلم کھلا جارح قرار دیا روس کو بھارت کا معاون و مددگار بتایا ۔ جنگ کے بعد مسٹر بھٹو نے اقتدار سنبھالنے پر عوامی رجحان کی عکاسی کرتے ہوئے ان ممالک سے تعلقات منقطع کر لئے جنہوں نے بنگلہ دیش کو تسلیم کیا تھا ان میں بلغاریہ پولینڈ ، منگولیا ۔ برما ۔ نیپال اور یوگوسلاویہ کے علاوہ ہنگری قبرص ، چیکوسلواکیہ بھی شامل تھے دولت مشترکہ کو خیر آباد کہہ دیا گیا ۔ یہ خارجہ پالیسی داخلہ پالیسی سے ہم آہنگ تھی بنگلہ دیش کو منظور یا نامنظور کرنے کی مہم چلی تو حکومت نے یہ فیصلہ عوام پر چھوڑ دیا ۔ ظاہر ہے کہ بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے سے خارجی محاذ پر دور رس نتائج نکلنے تھے اس وجہ سے رائے عامہ کو ہموار کرنے کے لئے مسٹر بھٹو نے زبردست پروپیگنڈا کیا اور بالآخر اسلامی سربراہی کانفرنس میں اسے تسلیم کر لیا ۔

مسٹر بھٹو پاکستان کو امریکن بلاک سے نکال کر روسی بلاک میں لے جانا چاہتے تھے اس مقصد کے حصول کے لئے مسٹر بھٹو نے حکومت کی مشینری کو رائے عامہ ہموار کرنے کے لئے استعمال کیا ۔ لیکن داخلی محاذ پر مسٹر بھٹو شکست کھا گئے اور اقتدار پر ایک دفعہ پھر فوج قابض ہو گئی ۔ اور پاکستان روسی بلاک میں نہ جا سکا ۔

پس ثابت ہوا کہ کسی ملک کی فوجی پالیسی براہ راست عالمی سیاست کو متاثر کرتی ہے ۔

بین الاقوامی تعلقات کے مطالعے کی اہمیت

IMPORTANCE OF THE STUDY OF INTERNATIONAL RELATIONS

زمانہ حال میں بین الاقوامی تعلقات کی اہمیت بدرجہ اتم بڑھ گئی ہے اس کی

وجہ یہ ہے کہ آج دنیا سکڑ کر ایک خاندان کی تشکل میں تبدیل ہو گئی ہے سائنس اور میکنالوجی کی ایجادات اور انکشافات نے جغرافیائی فاصلے اور رکاوٹوں کو ختم کر دیا ہے نقل و حمل کے ذرائع اتنے تیز رفتار ہو گئے ہیں کہ آج ہم مہینوں اور دنوں کا سفر چند گھنٹوں میں ختم کر لیتے ہیں۔ مواصلات کے ذرائع اتنے سرعت انگیز ہو گئے ہیں چند منٹوں بلکہ سیکنڈوں میں خبریں اور اطلاعات دنیا کے کونے کونے میں پہنچ جاتی ہیں اور ایک انسان کی آواز اور تصویر چند لمحوں میں ساری دنیا میں سنی اور دیکھی جا سکتی ہے

ان ترقیوں سے اگر ایک طرف قوموں اور ریاستوں کی جنگ پرستی اور عناد پروپیگنڈہ اور منافرت کو بڑھا دیا ہے تو دوسری طرف ان کے باہمی میل ملاپ، دوستی آشتی آگاہی اور امداد و تعاون کے مواقع بھی زیادہ کر دیئے ہیں۔ آج انسانی زندگی کی ضروریات، تمنائیں، امیدیں اور خواہشات یکساں ہوتی جا رہی ہیں۔ ہر ملک کی ترقی و خوشحالی کی تمنا اور کوششیں بڑھ رہی ہیں اور کسی ملک کی حکومت ان بڑھتی ہوتی توقعات اور امیدوں کے انقلاب کو نہیں روک سکتی اور اپنے اردگرد مخالفت کی دیواریں نہیں کھڑی کر سکتی زندگی کے ہر شعبے میں خوشحالی، اقتصادی بہبودی علم و سائنس آرٹ اور فن وغیرہ میں ترقی ہوتی ہے۔ صنعت و حرفت زراعت اور تجارت خوب پھلتی ہے اور اس سے ہر شہری کو زندگی کی نت نئی راہیں اور امنگیں نصیب ہوتی ہیں انسانی بھائی چارے اخوت اور محبت پھیلتی ہے جس کی وجہ سے آج ایک ملک اپنے ہمسایہ ممالک اور دوسری قوموں سے الگ تھلگ نہیں رہ سکتا۔ جبکہ پہلے کسی حد تک ایسا ممکن تھا جیسے مسلمانوں کی سلطنت مغلیہ، سلطنت عثمانیہ وغیرہ اپنے گرد و نواح کی دنیا سے بے خبر رہتے تھے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یورپی سامراجی ملکوں مثلاً برطانیہ فرانس وغیرہ نے ان سلطنتوں کو تہس نہس کر کے ان پر قبضہ جما لیا۔ اور ان کا وجود صفحہ ہستی سے مٹا دیا۔

موجودہ صدی میں دو عالمگیر جنگیں لڑی گئیں جن میں کروڑوں انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا، کھربوں ڈالر کا نقصان ہوا۔ اس تباہی کا ذمہ دار خود انسان

تھا۔ ان جنگوں کی تباہی کی وجہ سے بین الاقوامی تعلقات کی اہمیت میں اور بھی اضافہ ہو گیا ہے آج دنیا میں ہر طرف افراتفری پھیلی ہوئی ہے۔ اقوام متحدہ جیسا عالمی ادارہ دن رات عالمی امن قائم کرنے کے لئے کام کر رہا ہے اس پر امریکہ کی حکمرانی ہے۔ جس کی وجہ سے دنیا میں یہ ادارہ بھی منصفانہ نظام حیات قائم کرنے سے قاصر ہے۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ ذاتی اور قومی مفاد کو پس پشت ڈال کر بین الاقوامی مفادات کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنی قومی پالیسیاں مرتب کی جائیں۔

بین الاقوامی تعلقات کے مطالعے کی اہمیت کا اندازہ حسب ذیل باتوں سے لگایا جا سکتا ہے۔

۱۔ بین الاقوامی معاشرہ :۔

آج بین الاقوامی تعلقات میں انسان کا یہ قدیم خواب کہ کل بنی نوع انسان ایک ہو جائے گا شرمندہ تعبیر ہوتا ہوا نظر آ رہا ہے۔ ایسے حالات پیدا کئے جا رہے ہیں جن کی بدولت ساری دنیا کی طرز زندگی ایک تہذیب اور ایک طرز خیال میں منسلک ہوتی جا رہی ہے۔ اغلب ہے کہ کل دنیا میں ایک ریاست قائم ہو جائے لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ سامراجی قوتوں کو غلبے کے بجائے جمہوریت مساوات اور اخوت کے اصولوں پر قائم ہونا چاہیئے اور ہر ریاست کو بھی ایسا طریقہ کار اختیار کرنا چاہیئے جو جمہوریت، اخوت اور مساوات کا سبق دیتا ہو

۲۔ عظیم طاقتوں کی خارجہ پالیسیوں کا مطالعہ :۔

مقتدر ریاستوں کی خارجہ پالسیاں بھی بین الاقوامی تعلقات کے مطالعے میں آتی ہیں۔ اس وجہ سے اس میں قوت کے حصول کی دوڑ اور ریاستوں کے مفادات دونوں ہی زیر بحث آتے ہیں۔ قوموں کے مفادات دوسری اقوام سے تعاون و اتحاد قائم کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ تاہم اس میں پیچیدگیاں ہیں چونکہ ریاستوں کے مفادات وقت کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں جس سے ریاستوں کی خارجہ پالسیاں تبدیل ہوتی رہتی

ہیں۔ اگرچہ آج کل مقتدر ریاستوں کے درمیان ان اختلاف کے پُرامن تصفیہ کے لئے انجمن اقوام متحدہ اور دوسرے عالمی ادارے موجود ہیں لیکن ریاستوں کی مقتدرانہ حیثیت بہرحال قائم ہے۔ اور قانون بین الاقوام بھی اس کے درمیان واقع ہے نہ کہ اُوپر ہے۔

۳۔ قومی مفاد کی برتری :۔

تمام ریاستوں کے قومی مفادات ایک جیسے نہیں ہوتے اس لئے وہ دوسری ریاستوں سے تعلقات قائم کرتے وقت سیاسی نظریات، معاشی و معاشرتی مفادات جیسے عوامل کو مدنظر رکھتی ہیں اور بین الاقوامی سطح پر کوئی اہم کردار ادا کرنے کے لئے ریاستوں کو ایسی ذمہ داریاں قبول کرنی پڑتی ہیں۔ جن سے ان کے مفادات کو تحفظ حاصل ہو اور امن کی فضا قائم ہو اور اگر مفادات کا ٹکراؤ ہو رہا ہو تو گفت و شنید کے ذریعے یہ مسئلہ حل کیا جا سکتا ہے۔

۴۔ بحرانی دنیا کی رہنمائی :۔

آج کی دنیا بحرانوں کی دنیا ہے ہر طرف جنگ و جدل کا بازار گرم ہے۔ ہر ملک و قوم پر جنگ اور جارحیت کے بادل چھا رہے ہیں۔ بڑی طاقتیں مثلاً امریکہ اور روس ہلاکت خیز ہتھیاروں اور اسلحۂ جنگ سے لیس ہیں اور بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر دوسرے ملکوں اور قوموں پر دباؤ ڈالنے اور جنگ مسلط کرنے کی تیاریوں میں مشغول ہیں جنگی ہتھیاروں کی دوڑ، سامراجی سازشوں اور ہتھکنڈوں نے آج کی دنیا میں طرح طرح کے بحران پیدا کر دیے ہیں۔ ایسے حالات میں عالمی سیاسیات کا ایک اہم مقصد ان تمام بحرانوں کے عوامل و محرکات، عزائم اور مقاصد کا تجزیہ اور مطالعہ کرنا ہے اس لحاظ سے بین الاقوامی تعلقات کا مطالعہ ہی ایک فرد اور مملکت کی سلامتی کا ضامن ہو سکتا ہے

۵۔ قومی طاقت میں اضافے کا رجحان :۔

ہر ریاست اپنی قومی طاقت میں اضافے کا رجحان رکھتی ہے اور پھر

مزے کی بات یہ ہے کہ تمام ریاستیں اپنی قومی طاقت کا مقابلہ اپنی سے بڑی ریاست یا پھر عظیم ریاستوں کے ساتھ کرتی ہیں۔ اس طرح سے انہیں ایک تو اپنی حریف ریاست کی قومی قوت کا اندازہ ہوتا ہے اور دوسری طرف عظیم طاقتوں سے موازنہ کرنے میں سہولت رہتی ہے۔

قومی طاقت میں مسلسل اضافے کا رحجان بھی بین الاقوامی تعلقات و سیاسیات کا موضوع ہے۔

۶۔ مختلف نظام ہائے حکومت کا مطالعہ :۔

بین الاقوامی تعلقات کے مطالعہ کی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ اس میں اقوام عالم کے نظریات، دساتیر اور سماجی و معاشی نظاموں کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ ترقی یافتہ ممالک کے اچھے اصولوں کو ترقی پذیر ممالک اپنا کر اپنے ہاں بھی انقلاب لا سکتے ہیں۔ اس میں جہاں ایک طرف اشتراکیت اور سرمایہ دارانہ نظام معیشت کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے تو دوسری طرف جمہوریت آمریت آنادیت، انفرادیت اور انراجیت کا مطالعہ بھی کیا جاتا ہے۔

۷۔ عالمی انسانی حقوق سے واقفیت :۔

بین الاقوامی تعلقات کے مطالعے سے انسان بلکہ تیسری دنیا کے ترقی یافتہ ممالک اپنی آواز حق بلند کر سکتے ہیں اور اس طرح سے انسان اپنے عالمی انسانی حقوق سے واقفیت حاصل کرتے ہیں۔

۸۔ بین الاقوامی تعلقات کے مطالعے کی اکائیاں :۔

اس کے مطالعے کی بنیادی اکائیاں اقوام متحدہ اور ریاستیں ہیں لیکن ثانوی طور پر اس میں وہ تمام اکائیاں شامل کی جا سکتی ہیں۔ جو بین الاقوامی تعلقات پر اپنا اثر چھوڑتی ہیں

مثلاً ناٹو، وارسا پیکٹ، یورپین کامن مارکیٹ، افریقی اتحاد کی تنظیم اسلامی سربراہی کانفرنس، ناوابستہ ممالک کی تحریک اور اس کے علاوہ سیاسی جماعتیں، مذہبی گروہ۔ معاشی گروہ موثر گروپ اور پریس وغیرہ

بین الاقوامی تعلقات ان تمام مسائل کا تجزیہ اور مطالعہ کرنے کا علم ہے اس لئے اس کے مطالعے کا مقصد یہ ہے کہ دنیا میں امن و اتحاد اور تعاون کے جذبے کو عام کیا جائے لیکن اس کے لئے ضروری ہے۔ کہ عالمی برادری میں مفادات کے نام پر جو اختلافات موجود ہیں یا جن کے وقتاً فوقتاً پیدا ہونے کا امکان ہے ان کا مطالعہ کیا جائے اور ان کے حل کے لئے مناسب طریقہ کار وضع کر دیا جائے ورنہ دوسری صورت میں مفادات کے پردے میں انسانی خودغرضی آخرکار پوری انسانیت کو تباہی کے کنارے لے جائے گی۔ دنیا کے ۱۰۰ سے زائد ممالک اور بے شمار عالمی اداروں کے مفادات ایک جیسے نہیں ہیں۔ اس لئے عالمی برادری میں ان سب کے کردار میں بہت فرق ہے۔ بعض ریاستیں اپنی جغرافیائی حیثیت اور دشمن پڑوسیوں کے خوف سے مسلسل اپنی قوت میں اضافہ کی فکر میں رہتی ہیں۔ مشرق وسطیٰ میں اسرائیل اور اس کے پڑوسی ممالک مصر اردن اور شام جنوبی ایشیا میں پاکستان اور بھارت اپنی دشمنی کی بنا پر اپنی قوت میں مسلسل اضافہ کر رہے ہیں۔ ترقی پذیر ریاستیں بھی بڑی طاقتوں سے اپنی دفاعی ضروریات کی تکمیل اور اپنے تحفظ کی ضمانت کے عوض اپنے وسائل و آزادی کا سودا کر لیتے ہیں اس صورت حال سے نپٹنے کے لئے جہاں ریاستیں اپنے قومی مفادات کے تحفظ میں لگی رہتی ہیں۔ وہاں عالمی امن کو قائم رکھنے کے لئے ان اداروں کے قیام کی کوششوں میں بھی مصروف ہیں جن سے عالمی سطح پر محبت و اخوت اور امن و امان کو تقویت پہنچے اس طرح بین الاقوامی تعلقات کے مطالعے کا مقصد عالمی سطح پر طاقتور ریاستوں کے درمیان پیچیدہ اور خطرناک تعلقات اور امن کے خطرناک عزائم کی موجودگی میں دنیا کے لئے امن اتحاد و تعاون کے جذبہ کو تلاش کر کے "امن عالم" کی طرف پیش قدمی کرنا ہے

بین الاقوامی تعلقات کے تاریخی تناظر

HISTORICAL SETTINGS OF INTERNATIONAL RELATIONS

ابتداء :۔

زمانہ قدیم میں مذہب قانون اور رسم و رواج میں کوئی فرق نہیں تھا۔ لوگ انہیں طور طریقوں پر چلتے تھے جن پر انہیں مذہب چلنے کی اجازت دیتا تھا۔ اور حاکم کی حیثیت مذہبی سردار کی ہوتی تھی۔ قبائل کے افراد کے مابین لڑائی اور جھگڑوں کا فیصلہ سردار ہی کیا کرتا تھا۔ ابتداء میں ان قبائل کی حیثیت خانہ بدوشوں کی سی تھی یعنی وہ کسی ایک جگہ صرف اُسی وقت تک رہتے تھے جب تک اُن کے مویشی وہاں چراگاہوں سے پیٹ بھر سکتے تھے۔ چراگاہوں کے ویران ہوجانے یا پانی ختم ہوجانے کی صورت میں یہ قبائل دوسری جگہ منتقل ہوجاتے تھے۔ جب انسان نے زراعت کرنی سیکھ لی تو پھر یہ قبائل ایک جگہ آباد رہنا شروع ہوگئے اور وہیں کھیتی باڑی کرنے لگے اس سے چھوٹی چھوٹی مملکتوں کا آغاز ہوا جن کی حیثیت موجودہ دور کے گاؤں کی طرح تھی ان قبائل یا قبیلوں میں مسلسل لڑائیاں ہوا کرتی تھیں۔ طاقت ور اور قوی قبیلے دوسرے قبیلوں کی بستیوں کو فتح کرلیا کرتے تھے اور مفتوح قبیلوں کے افراد کو اپنا غلام بنالیا کرتے تھے یہاں سے ہی غلامی کے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ اس کے بعد مملکت صرف ایک بستی یا گاؤں تک محدود نہ رہی بلکہ اس میں بہت ساری بستیاں شامل ہوگئیں۔ رفتہ رفتہ ان مملکتوں میں وسعت آتی گئی۔ ان مملکتوں کے درمیان صلح اور جنگ کے تعلقات قائم ہوئے۔ صلح شرائط کے ماتحت ہوتی تھی اور ان کی ایک حد تک پابندی کی جاتی تھی اس کے علاوہ لین دین اور تجارت کے تعلقات بھی قائم ہوئے۔

ان مملکتوں میں قدیم مصر، بابل، فارس، چین، ہندوستان اور ریُر شبا

قابل ذکر ہیں۔

۲۔ عہد یونان و رُوما

قدیم یونان میں چھوٹی چھوٹی شہری مملکتوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ یہ شہری مملکتیں پہاڑی تھیں اور بے شمار جزیروں پر مشتمل تھیں مگر ان سب شہری ریاستوں کی روائتیں مشترک تھیں۔ سب باشندے ایک ہی نسل کے تھے اور ایک ہی زبان بولتے تھے ان کے رسم و رواج یکساں تھے زندگی کا رہن سہن اور بود و باش کا طرز ایک سا تھا۔ ضرورت پڑنے پر یہ مملکتیں معاہدے کے ذریعے مشترک دشمن کے مقابلے میں متحد ہو جایا کرتی تھیں۔ ویسے ایک دوسرے سے برابر برسرپیکار رہا کرتی تھیں ان بے شمار شہری مملکتوں میں اسپارٹا اور ایتھنز خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ان دونوں میں شدید ترین باہمی مخالفت تھی۔ اور ان میں سے ہر ایک کی کوشش یہ تھی کہ دوسری یونانی مملکتوں کی قیادت اس کے ہاتھ میں آجائے۔ لیکن یونان پر کوئی بیرونی طاقت حملہ آور ہوتی تھی تو ساری یونانی مملکتیں انہیں دونوں مملکتوں (ایتھنز اور اسپارٹا) کے پرچموں کے نیچے صف آراء ہو کر مشترکہ دشمن کا بڑی بے جگری اور بہادری سے مقابلہ کرتی تھیں ویسے اسپارٹا اور ایتھنز میں مسلسل جنگ ہوا کرتی تھی اور دوسری مملکتیں بھی ان کا ساتھ دیا کرتی تھیں۔ جہاں تک سلطنت روما کا تعلق ہے تو روم اٹلی میں پہلے پہل ایک چھوٹی سی شہری ریاست تھی لیکن رومیوں نے اپنے قرب و جوار کی شہری ریاستوں پر فتوحات حاصل کیں۔ اٹلی و مغربی یورپ کو فتح کرتے ہوئے شمالی افریقہ اور ایشیا کے کافی بڑے حصے پر چھا گئے اس کی حدود میں کئی قومیں و نسلیں آگئیں۔ اس کے علاوہ سلطنت روما نے دوسری اقوام کے ساتھ بھی تعلقات قائم کیے۔ چنانچہ اہل روم نے قانون بین الاقوام LAW OF NATION کی تدوین کی۔ اتحاد اور قانون کی حکمرانی قائم کی۔ اتحاد اور قانون کی حکمرانی کے بارے میں رومیوں کے خیالات اتنے عظیم تھے کہ عہد وسطیٰ کے لوگوں نے ان سے متاثر ہو کر عالمگیر مملکت کا خواب دیکھا

۳۔ قرونِ وسطیٰ:۔

عہدِ قرونِ وسطیٰ ۴۷۶ء سے ۱۵۰۰ء تک محیط ہے۔ اس عرصے کے شروع میں رومیوں نے مسیحی مذہب قبول کر لیا تو دین و دنیا میں تفریق کی جانے لگی۔ یہ عرصہ یورپ کے لیے افراتفری کا دور تھا۔ رومن کیتھولک چرچ اور بادشاہت کے درمیان جنگ نے اس افراتفری کو جنم دیا تھا۔ جنگ میں بادشاہت کو فتح نصیب ہوئی۔ مگر بعض صورتوں میں پوپ بھی برسرِاقتدار نظر آتا ہے۔ اسی دوران مشرقِ وسطیٰ اور مشرق و مغرب میں ایک مضبوط اسلامی ریاست قائم ہو چکی تھی۔ ظہورِ اسلام کے بعد بین الاقوامی تعلقات پر بہت زور دیا گیا۔ پوری دنیا کے مسلمانوں کو بھائی بھائی ٹھہرایا گیا۔ اس طرح ملتِ اسلامیہ مذہب اسلام کی وابستگی اور وفاداری سے پیدا ہوئی اور یہ جغرافیائی نسلی اور لسانی حد بندی سے بالاتر رہی۔

۱۰۰۰ء سے ۱۵۰۰ء تک کے عرصہ میں معاشی و سیاسی ترقی وسیع پیمانے پر ہوئی۔ اس عرصہ میں بادشاہ و کلیسا کے درمیان قوت کی جنگ ہوتی رہی اور اس جنگ نے دونوں کی قوت کو مخصوص سرحدوں تک محدود کر دیا۔ پاپا کی قوت اٹلی میں چھوٹی سی پاپائی ریاست VATICAN CITY میں مقید کر دی گئی پاپائے روم کو یہ حق حاصل رہا کہ وہ دوسری ریاستوں میں اپنے نمائندے مقرر کرے۔ تاہم بادشاہ کو پاپا کی طرف سے تاج پوشی کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ اس طرح اٹلی بھی روم کی عظیم سلطنت کے زوال کے ساتھ یونان کی طرح چھوٹی چھوٹی شہری ریاستوں میں تقسیم ہو گیا جن میں تجارتی سیاسی اور سفارتی تعلقات کے وجود کا بھی پتہ چلتا ہے۔

۴۔ قومی ریاست:۔

قومی سیاست کا ظہور ۱۵۰۰ء کے بعد انگلستان میں ہوا۔ لیکن مزے کی بات ہے کہ یہاں اس جذبے نے کبھی بھی انتہا پسندی اختیار نہیں کی۔ قومی ریاست کے تصور

کو مزید تقویت صد سالہ جنگ ۱۴۵۳ - ۱۳۳۷ء میں ملی۔ جو انگلستان اور فرانس کے مابین لڑی گئی۔ اس جنگ کے بعد برطانیہ فرانس اور سپین کی مضبوط قومی ریاستیں ابھر کر سامنے آئیں۔ اسی طرح جرمنی کی بادشاہت بھی سلطنت روما کی تباہی کے بعد قائم ہوئی۔ پولینڈ میں فیوڈل لارڈز اور روس میں زار ایوان چہارم نے مغربی بادشاہوں کی طرح سلطنتیں قائم کیں۔

۱۶۴۸ء میں معاہدہ ویسٹ فلیا THE TREATY OF WESTPHALIA طے پایا۔ اس معاہدے کی رو سے خاندان زار کی حاکمیت اور اقتدار جو کئی یورپی ممالک پر مسلط تھا ختم ہو گیا اور اس معاہدے کے علاوہ یورپی بادشاہوں نے روم کی پاپائی سلطنت کے احکامات ماننے سے انکار کر دیا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس معاہدے کے بعد یورپ میں جدید ریاستی نظام کے تحت ریاستوں کے مابین تعلقات قائم ہونے لگے۔

انقلاب فرانس ۱۷۸۹ء سے پہلے تقریباً سبھی قومی ریاستوں میں بادشاہت تھی۔ بادشاہ اپنے اقتدار کو خدا کا عطیہ سمجھتا تھا اور صرف خدا کے سامنے جواب دہ خیال کرتا تھا۔ اس نظریے کو بادشاہوں کا حق خداداد کا نظریہ (THEORY OF DIVINE RIGHT OF KINGS) کہتے ہیں۔

اس زمانے میں معاشی استحکام اور خوشحالی کا اندازہ ریاست کے سونے اور چاندی کے ڈھیروں سے لگایا جاتا تھا۔ سونے اور چاندی کی حرص ہی نے دوسری ریاستوں کو غلام اور نو آبادیات بنانے کا خواب دکھایا۔ اس وجہ سے یورپ میں سن ۱۵ء سے ۱۷۸۹ء تک سیاسی قوت کی برتری کے لئے مقابلہ ہوتا رہا۔ اس میں فرانس برطانیہ اور اسپین کا کردار نمایاں رہا۔ ۱۲۸۳ء کے بعد سلطنت عثمانیہ کا زوال شروع ہوا اس کے کئی یورپی علاقے اور آسٹریا وغیرہ روس میں شامل ہو گئے۔ اس کے دوران روس کے زار حکمران پیٹر اول اور کیتھرین دوئم (۱۷۶۲ تا ۱۷۹۶ء) کے جدید ترقیاتی نظام و انتظام کی وجہ سے روس مشرقی یورپ کی عظیم طاقت

بن گیا۔

۱۷۸۹ء سے ۱۹۰۰ء کا عرصہ سیاسی اور معاشی اعتبار سے انتہائی اہم رہا قومی ریاست کا نظریہ کسی نہ کسی طرح جمہوری قومیت کی طرف منتقل ہو گیا اور دوسرا سرمایہ دارانہ نظام کے بجائے سوشلزم کے نظریات ترقی پانے لگے۔ بہرحال حکومت کے کنٹرول کو بڑھانے کی یہ سیاسی تجدید تھی بنیتھم اور گرڈسٹش کی تحریروں کی وجہ سے بھی بین الاقوامی تعلقات کی فکر میں اضافہ ہوا۔ سفارتی تعلقات اور فوجی حکمتِ عملی بین قانون بین الاقوام نے اہم کردار ادا کیا۔ کیونکہ اب ریاستی تصفیوں کے لئے ایک ضابطہ اخلاق مہیا ہو گیا تھا۔

ویانا کانگریس :-

یورپی حکمرانوں نے یہ اسمبلی ۱۸۱۴ء میں قائم کی اور ۱۸۱۵ء تک اس کے اجلاس ہوتے رہے۔ یورپی ریاستوں کی یہ پہلی اجتماعی نشست تھی۔

اسی کانگریس میں تمام ریاستوں کے نمائندے شامل تھے جنہوں نے اُس وقت کی جنگوں میں شرکت کی تھی۔ ان نمائندوں نے طے پایا کہ انہیں جمہوری قومیت کے علاوہ کسی سے خطرہ نہیں اس کانگریس میں بین الاقوامی دریاؤں میں جہاز رانی کے قواعد اور سفارتی نمائندوں کے عہدے و فرائض وغیرہ کا بھی تعین کیا گیا۔

امن کے استحکام کے لئے روس برطانیہ پرشیا اور آسٹریا نے ایک اتحاد معاہدہ کوارڈ ریپٹ QUARDRUPT ALLIANCE کیا۔ ۱۸۱۸ء میں معاہدے کو دست دیتے ہوئے فرانس کو بھی اس میں شامل کر لیا گیا۔ اس اتحادی معاہدے نے تقریباً ۳۰ سال تک (۱۸۴۸ء) جمہوری قومیت کی تحریکوں کو ناکام بنایا برطانیہ اور فرانس میں وسیع پیمانے پر انتخابی سلسلہ شروع ہونے کی وجہ امریکی خانہ جنگی، جرمنی اٹلی اور جاپان کی ترقی سلطنت عثمانیہ کے زوال کی وجہ سے کئی چھوٹی چھوٹی خود مختار ریاستیں جمہوری قومیت کی بنیاد پر وجود میں آچکی تھیں

روس برطانیہ آسٹریا اور ہنگری کے درمیان جو اختلافات تھے اُس سلسلے میں ۱۸۷۸ء میں برلن شہر میں ایک کانگریس بلائی گئی۔ اس میں متفقہ طور پر ترکوں کو بلقان کا کچھ علاقہ رکھنے کی اجازت دے دی گئی۔ لیکن بعض علاقوں میں نئی ریاستیں وجود میں آئیں جن میں رومانیہ بلغاریہ، مانٹی نیگرو، البانیہ اور یونان وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ بعد کے عرصہ میں جو ریاستیں حق خود اختیاری کی بنیاد پر قائم ہوئیں تھیں بڑی طاقتوں کی بلقانی پالیسیوں کا موجب رہیں۔ جن میں خاص طور سے آسٹریلیا ہنگری اور روس قابل ذکر ہیں ان ریاستوں کے آپس کے تعلقات اچھے نہیں رہتے تھے اس کی وجہ یہ تھی کہ کئی ریاستیں دوسری ریاست میں لبنے والے افراد کا بھی اپنے ہم نسل ہونے کا دعویٰ کرتیں تھیں۔

۵۔ نوآبادیاتی نظام :-

صنعتی انقلاب کے بعد خام مال کا حصول اور منڈیوں کی تلاش بڑی اہمیت اختیار کر گئی۔ اس کی دوسری وجہ غالباً یہ تھی کہ یہ طاقتیں اپنے علاقوں کو اپنے مقبوضات میں شامل رکھنا چاہتی تھیں جہاں سرمایہ لگانے سے زیادہ سے زیادہ نفع کمایا جا سکے۔ اس طرح پچھلی صدی میں یہ نوآبادیاتی بادشاہتیں افریقہ، ایشیا اور بحرالکاہل کے جزائر میں قائم ہوگئیں۔ افریقہ میں برطانیہ اور فرانس پیش پیش رہے۔ جرمنی اور اٹلی اس دوڑ میں بعد میں شامل ہوئے۔ چنانچہ انہیں صرف افریقہ کے چند علاقے ملے برطانیہ ہندوستان، برما اور ملایا پر قابض ہوا۔ چین اگرچہ نوآبادیاتی نظام میں شامل نہیں تھا۔ مگر وہ برطانیہ فرانس جرمنی روس اور جاپان کے مفادات کے اثرات کے دائرہ میں تھا۔ ان عالمی طاقتوں میں اختلافات ان نوآبادیوں کو چھوڑنے پر ہوئے۔ ان کی افرادی قوت قدرتی وسائل صنعتی مراعات اور دفاعی اڈوں کی اہمیت کے باعث ان طاقتوں کے درمیان اختلافات وسیع ہوئے۔ قیصر ولیم جرمنی کو جلد از جلد ایک عظیم سلطنت دیکھنا چاہتا تھا۔ ان اختلافات کی وجہ سے بسمارک کو ۱۸۹۰ء میں استعفیٰ دینا پڑا جس سے تمام ممالک میں نئی گروہ بندیاں ہونا شروع ہوگئیں۔ جرمنی کے خلاف ایک زبردست نفرت

ثلاثہ TRIPLE ENTETE تشکیل دیا گیا جس میں برطانیہ روس اور فرانس شامل تھے۔ حالانکہ سنہ ۱۹۰۰ء سے قبل ان ممالک میں زبردست اختلافات موجود تھے اس کے مقابلے میں جرمنی نے اتحاد ثلاثہ TRIPLE ALLIANCE قائم کیا جس میں جرمنی اٹلی اور آسٹریا شامل تھے۔

۶۔ موجودہ دور:۔

موجودہ صدی شروع ہونے کو تھی کہ سنہ ۱۸۹۹ء میں زار روس نکولاس دوئم کی کوشش سے پہلی ہیگ کانفرنس منعقد ہوئی سنہ ۱۹۰۷ء میں دوسری ہیگ کانفرنس منعقد ہوئی۔ ان کانفرنسوں کا مقصد بین الاقوامی تعلقات کے لئے قانونی ضابطے مرتب کرنا تھے: تاکہ عالمی تنازعات کا تصفیہ پرامن طریقوں سے کیا جا سکے۔ اس سلسلے میں ایک "مستقل عدالت برائے بین الاقوامی ثالثی" کا قیام عمل میں لایا گیا۔ دوسری طرف یورپ میں سنہ ۱۹۰۷ء سے ۱۹۱۴ء تک مسلسل جرمنی اور اتحادیوں کے درمیان کش مکش میں اضافہ ہوتا رہا۔

پروفیسر شومٹ کہتے ہیں۔

" سنہ ۱۹۰۷ء میں محوری اور اتحادی برابر کھڑے تھے لیکن سنہ ۱۹۱۴ء میں دونوں ایک دوسرے کے سامنے آگئے۔"

پہلی عالمی جنگ سنہ ۱۹۱۴-۱۹ء کے بعد مجلس اقوام کا قیام عمل میں لایا گیا "تاکہ دنیا کو جنگ کی مزید تباہ کاریوں سے بچایا جائے لیکن ابھی پہلی عالمی جنگ کو ۲۰ سال کا عرصہ ہی گزرا تھا کہ ۳ر ستمبر ۱۹۳۹ء کو دنیا کو دوسری عالمگیر جنگ کی ہولناکیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ جنگ میں تمام بین الاقوامی قوانین روایات و اخلاقیات کو بالائے طاق رکھ کر انتہائی بربریت کا مظاہرہ کیا گیا۔ اس جنگ میں زہریلی گیسوں سے لے کر ایٹم بم تک استعمال کئے گئے جس سے سمندروں، ہواؤں اور سطح زمین پہ اتنا زہر پھیلا کہ مدتوں اس کے اثرات دنیا میں بسنے والے انسانوں پر مرتب ہوتے رہے۔ جنگ عظیم دوئم ۱۹۳۹-۴۵ء کے خاتمے پر انجمن اقوام متحدہ کا قیام عمل میں آیا۔ انجمن کا منشور مرتب کرنے والوں نے جارحیت

کے مفہوم کو بالکل واضح کر دیا۔

اس منشور کے (قانون بین الاقوام) کسی بھی ضابطہ کی خلاف ورزی کو غیر قانونی اقدام قرار دیا گیا اور اقوام متحدہ کے رکن ممالک کے لئے قوت کے استعمال کی ممانعت کر دی گئی۔ دوسری جنگ کے بعد دوسری اہم تبدیلی عالمی سیاست میں یہ ہوئی کہ روس اور امریکہ دو عظیم طاقتوں کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آئے۔ روس اشتراکی نظام معیشت کا اور امریکہ سرمایہ دارانہ نظام کا علمبردار بن گیا۔ دونوں نے اپنا اپنا حلقۂ اثر بڑھانے کے لئے کوششیں تیز کر دیں۔ روس نے سب سے پہلے مشرقی یورپ کو اپنے حلقۂ اثر میں لیا اور اس کے بعد ۱۹۴۹ء میں پہلا ایٹمی دھماکہ کر کے ۱۹۵۵ء تک امریکہ کا ہم پلہ ہوگیا۔

امریکہ نے اس کے جواب میں ٹرومین پروگرام اور مارشل پلان ۱۹۴۷ء میں شروع کئے۔ دفاعی پوزیشن کو مضبوط کرنے کے لئے اپریل ۱۹۴۹ء میں ناٹو کا قیام عمل میں لایا گیا جس سے دونوں ممالک کے مابین سرد جنگ شروع ہوگئی ۱۹۵۰ء میں کوریا کے بحران کی وجہ سے سرد جنگ میں شدت پیدا ہوئی اور یہ جنگ یورپ کی سرحدوں سے باہر نکل کر ایشیا تک پھیل گئی۔ جینوا کانفرنس ۱۹۵۵ء میں امریکہ روس اور برطانیہ کے نمائندوں کو مشترکہ گفت وشنید کا موقع ملا۔ اور اس کے بعد دونوں ملکوں نے آپس میں پرامن بقائے باہمی کی پالیسی POLICY OF PEACEFUL CO-EXISTENCE کا آغاز کیا۔

چین کے عالمی طاقت بن جانے کے بعد یہ دو قطبی سیاست سہ قطبی سیاست میں تبدیل ہوگئی اور اس طرح چین نے بھی اپنا دائرہ اختیار بڑھانا شروع کر دیا چین نے امریکہ کے ساتھ ۱۹۶۹ء میں مفاہمت کی پالیسی کا آغاز کیا۔ امریکی چینی مفاہمت میں پاکستان نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ ۱۹۵۳ء تک چین کے تعلقات روس سے بہت اچھے رہے۔ لیکن خروشیف ۱۹۵۳ء-۶۴ء کے برسر اقتدار آنے کے بعد دونوں ممالک کے درمیان سیاسی اختلافات پیدا ہونے شروع ہو گئے۔ جو

ہنوز برقرار ہیں۔

حال ہی میں بین الاقوامی تعلقات میں سہ قطبی نظام کے بجائے کثیر قطبی نظام وجود میں آرہا ہے۔ یورپ فیصلوں کے مرکز کی حیثیت سے ابھر رہا ہے۔ تیسری دنیا کے ممالک، اسلامی دنیا، ناوابستہ ممالک کی تحریک افریقی ممالک کی تنظیم اپنی الگ الگ حیثیت سے ابھر رہے ہیں اور اقوام عالم میں ایک بار پھر واشنگٹن اور ماسکو کے بجائے یورپ کی حیثیت ثالثی ہوتی جارہی ہے۔

بین الاقوامی تعلقات کا ارتقاء بحیثیت ایک نصابی مضمون

DEVELOPMENT OF INTERNATIONAL RELATION

AS AN ACADEMIC DISCIPLINE

جنگ عظیم اول سے پہلے بین الاقوامی تعلقات کے مضمون کو سیاسیات کے ایک ذیلی موضوع بحث کے طور پر بھی علیحدہ مقام حاصل نہ تھا لیکن آج یہ ایک باقاعدہ اور جداگانہ مضمون کی حیثیت اختیار کرچکا ہے اور دنیا بھر کی جامعات میں اسے ایک علیحدہ اور باقاعدہ مضمون کی حیثیت سے پڑھایا جارہا ہے اس مضمون کے سلسلے میں سب سے زیادہ کام امریکہ برطانیہ فرانس جرمنی اور سوئٹزرلینڈ میں ہوا ہے وہاں ایسے ادارے قائم ہیں جو عالمی سیاسی امور اور تعلقات پر تحقیق کرتے ہیں۔

چند مشہور ادارے حسب ذیل ہیں

۱۔ بین الاقوامی تعلقات کا شاہی ادارہ (لندن)

۲۔ کونسل برائے خارجہ تعلقات (نیویارک)

۳۔ خارجہ پالیسی ایسوسی ایشن (نیویارک)

۴۔ ادارہ مطالعہ بین الاقوامی تعلقات (جنیوا)

۵۔ ادارہ بین الاقوامی تعلقات (پیرس)

دراصل سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی نے جہاں بے شمار مسائل حل کئے ہیں وہاں مسائل کا انبار بھی لگا دیا ہے۔ جن کے حل کے لئے انسان دن رات کوشاں ہے۔ جدید مسائل اور ان کے حل کے لئے تحقیقات کے نتیجے میں بہت سے نئے علوم وجود میں آئے۔ عالمی جنگوں نے بھی انسانی مسائل میں اضافہ کیا ہے جس سے آج کا انسان پیچیدہ سے پیچیدہ تر زندگی کی طرف گامزن ہے وہ مسائل و افکار کے انبار میں گھبرا ہوا ہے امن و سکون کا طالب اور متلاشی ہے۔ امن و سکون کے دیرپا قیام کے لئے عالمی مسائل کو بین الاقوامی اشتراک و تعاون کے ذریعے خالص انسانی بنیادوں پر حل کی ضرورت ہے۔

ارسطو نے کہا تھا کہ انسان معاشرت پسند ہے اس کے مطابق کوئی بھی فرد سماج کے بغیر زندگی نہیں گزار سکتا۔ آج معاشرت اور معاشرہ کا دائرہ وسیع ہو کر اقوام عالم پر محیط ہو گیا ہے۔ چنانچہ آج کا شخص عالمی معاشرہ کا رکن ہے اور بین الاقوامیت پسند ہے۔ اس کے حقوق و فرائض صرف معاشرے یا مملکت تک محدود نہیں رکھ سکتے بلکہ اس کے حقوق و فرائض کی نوعیت عالمی ہو گئی ہے

دو عالمی جنگوں کے بعد دنیا افلاس، بے روزگاری، بیماری اور قحط جیسے مسائل سے دوچار ہوئی تو بین الاقوامی تعلقات، عالمی امن کا استحکام اور بین الاقوامی تعاون و اتحاد کی ضرورت میں اضافے کا رجحان پیدا ہوا۔ سیاسیات کی اس ذیلی شاخ "بین الاقوامی تعلقات" نے بہت جلد اپنی جداگانہ حیثیت کو بہت جلد تسلیم کروالیا ہے۔ علم سیاسیات کی طرح علم بین الاقوامی تعلقات کا مقصد بھی ایک باشعور اور ذمہ دار شہری پیدا کرنا ہے۔ بین الاقوامی تعلقات میں عالمی انسانی مسائل کا صرف جائزہ ہی نہیں لیا جاتا بلکہ ان مسائل کو حل کرنے کے لئے بھی تحقیقات کی جاتی ہیں۔ آج کوئی واقعہ مقامی نوعیت کا نہیں ہوتا بلکہ پوری دنیا پر اس کے اثرات مرتب ہوتے ہیں کیونکہ مواصلات

کی ترقی کی بدولت دنیا سکڑ کر ایک معاشرے کی مانند ہو گئی ہے۔

بین الاقوامی تعلقات کو ہم تین مراحل میں تقسیم کر سکتے ہیں پہلا مرحلہ جنگ عظیم اول سے پہلے کا عرصہ ہے اس عرصہ میں بین الاقوامی تعلقات و سیاسیات کے مطالعے پر سفارتی نمائندوں و ماہرین کا قبضہ رہا ہے جو عوام کے سامنے روزمرہ کے مسائل بیان کرنے سے گریز کرتے تھے۔ اس لئے اس دور کے نظریات یا کام کے بارے میں زیادہ نہیں لکھا گیا۔

دوسرا مرحلہ دو عالمگیر جنگوں کے مابین کا عرصہ ہے اس عرصہ میں حالات حاضرہ سے متعلق خیالات و نظریات کا پتہ چلتا ہے اس عرصہ میں بین الاقوامی تعلقات کے قانونی پہلو کو اجاگر کیا گیا۔ مجلس اقوام کی تشکیل اسی سلسلہ کی ایک کڑی تھی تمام ریاستوں کو اس بات کی یقین دہانی کرائی گئی تھی کہ مجلس اقوام کے وجود سے اُن کے تمام مسائل حل ہو جائیں گے۔

بین الاقوامی تعلقات کا تیسرا مرحلہ دوسری عالمگیر جنگ کے بعد شروع ہوتا ہے۔ جنگ عظیم دوئم کے تباہ کن نتائج نے ماہرین و مفکرین کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ ایسا مواد مہیا کریں کہ آئندہ بنی نوع انسان کو جنگ کی تباہ کاریوں و ہولناکیوں سے بچایا جائے۔ اس کے بعد سے آج تک بین الاقوامی تعلقات پر زبردست تحقیقی کام ہو رہا ہے۔

۱. کیونسی رائٹ	بین الاقوامی تعلقات کا مطالعہ
۲. فوکس	بین الاقوامی تعلقات کا نظریاتی پہلو
۳. ہوفمین	بین الاقوامی تعلقات کا معاصرانہ نظریہ
۴. کلاس نور	متصادم تعلقات کا مجموعہ
۵. ای ہاں اور رلے ویکیلی	بین الاقوامی تعلقات کے محرک
۶. جے ایچ ہیرز	ایٹمی دور میں بین الاقوامی سیاست
۷. ایچ جے مارگن تھیو	قوموں کے درمیان سیاست
۸. ایچ سپروٹ اور ایم سپروٹ	بین الاقوامی تعلقات کی بنیادیں
۹. لسکا	بین الاقوامی توازن

۱۰۔ ربرٹو کیلاسس — بین الاقوامی سیاست کا نظام عمل

۱۱۔ جارج ماسکی — خارجہ پالیسی کا نظریہ

۱۲۔ جان ڈبلیو برلی اوٗ — نظریہ امن و تخفیف اسلحہ کی پیشن گوئی

۱۳۔ لسکا — سیاسیات و تنظیمی سلامتی کے نظریاتی خطوط

۱۴۔ شولنگ — تصادم کی مہارت

یہ تمام تصانیف تحقیقی معیار رکھتی ہیں۔ اس سے بین الاقوامی تعلقات کے نظریے اور تمام پہلوؤں پر تفصیل سے روشنی پڑتی ہے۔ علم سیاسیات کی طرح بین الاقوامی تعلقات کے مضمون کو بھی دیگر عمرانی علوم کے مطالعہ کے بغیر صحیح معنی میں سمجھا نہیں جا سکتا۔ کیونکہ بین الاقوامی تعلقات پر بہت ساری دوسری قوتیں اور عناصر اثر انداز ہوتے ہیں۔ مثلاً جغرافیائی حالات معاشی نظام تاریخی اور ثقافتی اثرات وغیرہ۔

بین الاقوامی تعلقات کے موضوع بحث میں مندرجہ ذیل مباحث کو شامل کیا گیا ہے

۱۔ بین الاقوامی سیاست

۲۔ بین الاقوامی ادارے

۳۔ سفارتی تاریخ

۴۔ بین الاقوامی قانون و تنازعات

۵۔ بین الاقوامی تعلقات میں طاقت کا کردار

۶۔ بین الاقوامی تجارت وغیرہ

- - -

پاکستان میں بین الاقوامی تعلقات کا مضمون :۔

پاکستان میں سب سے پہلے جامعہ کراچی میں ۱۹۵۸ء میں بین الاقوامی تعلقات کے مضمون کا اجراء ہوا۔ تقریباً ۴ سال تک یہ شعبہ تاریخ عام کے شعبہ سے منسلک رہا بعد ازاں ایک باقاعدہ الگ شعبہ قائم کر دیا گیا۔ اب پاکستان کی دیگر جامعات جیسے جامعہ قائداعظم، جامعہ پنجاب جامعہ سندھ، جامعہ پشاور اور جامعہ بلوچستان وغیرہ میں بھی بین الاقوامی تعلقات کا شعبہ قائم کیا جا چکا ہے

بین الاقوامی تعلقات پر اثر انداز ہونے والے بنیادی عوامل

BASIC FACTORS EFFECTING INTERNATIONAL RELATIONS

بین الاقوامی تعلقات پر اثر ڈالنے والے عوامل میں کچھ قدرت کے پیدا کردہ ہیں اور کچھ انسان کے مگر قدرتی عوامل بھی کم و بیش انسان کے قابو میں ہیں۔ انسانی عقل و تدبر ان کو اپنی بھلائی یا تباہی کے لئے سازگار بنا سکتی ہے۔ ان عوامل کا انسانی قابو میں آنا بھی زمانے اور حالات کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ جیسا کہ ان عوامل کی وضاحت سے ظاہر ہوگا۔

(۱) قدرتی وسائل NATURAL RESOURCES
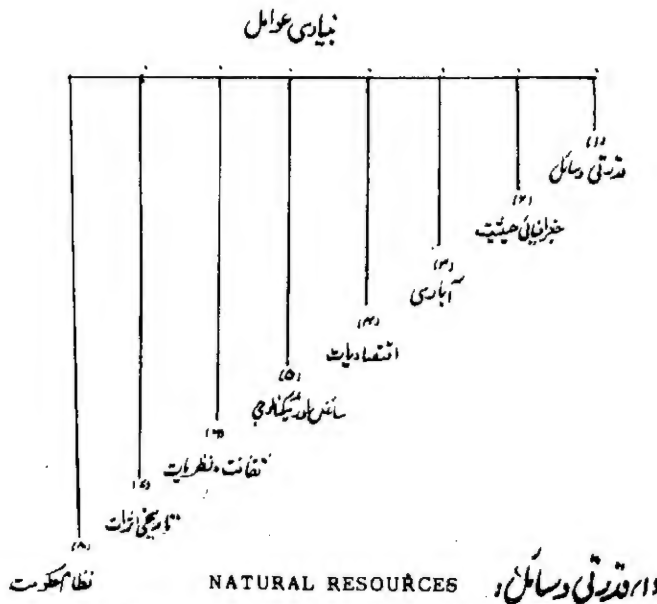
ہر اک ریاست میں قدرت نے چند وسائل اور خوبیاں پیدا کی ہیں۔ جو دوسری

سیاستوں میں ناپید یا کم ہوتی ہیں۔ ان وسائل میں معدنیات، زرخیز مٹی اور جنگلات وغیرہ شامل ہیں یہ وسائل قدرتی طور پر ملک میں موجود ہوتے ہیں انسانی فعل ان کو گھٹا یا ضائع کر سکتا ہے اس طرح ریاست کی طاقت اور خوشحالی کا دارومدار بڑی حد تک ان قدرتی وسائل کی موجودگی ان کے استعمال اور استفادے پر منحصر ہوتا ہے ان وسائل کا داخلہ حکمت عملی کے علاوہ خارجہ حکمت عملی پر بھی گہرا اثر پڑتا ہے اگر کسی ریاست میں بہت زیادہ قدرتی وسائل موجود ہوں اور ان کے باشندوں کو ان کا استعمال نہ آتا ہو تو بیرونی ریاست اس پر حملہ کر کے اس کو فتح کر لے گی اور اس کے قدرتی وسائل سے خود استفادہ حاصل کرنے لگے گی۔ اس طرح موجودہ دور میں سامراجیت اور روسی سوشل سامراجیت کا آغاز ہوا۔

پچھلی دو صدیوں سے انگریز فرانسیسی روسی اور دیگر یورپین ریاستوں نے ایشیا، امریکہ اور افریقہ کے بے شمار ممالک کو مغلوب کر کے ان کے قدرتی وسائل سے خوب فائدہ اٹھایا۔ جس کے باعث آج دنیا دو حصوں میں بٹی ہوئی ہے ایک طرف دولت مند ممالک ہیں۔ جو جنوبی امریکہ، افریقہ اور ایشیا کی دولت کی لوٹ کھسوٹ سے مالا مال ہو گئے ہیں اور دوسری طرف ان کے برعکس افلاس زدہ اور پس ماندہ ممالک ہیں۔ جو ماضی قریب تک اپنی قدرتی دولت سے کچھ استفادہ نہ کر سکے۔ اس ضمن میں عرب ممالک کے تیل کی قدرتی دولت خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اسی تیل کی وجہ سے ان ملکوں کو برطانیہ فرانس امریکہ اور ہالینڈ نے اپنا محکوم بنا یا تھا۔ آج بھی ان ممالک کی قدرتی دولت ان غیر ممالک کی خوشحالی اور ترقی کا باعث بنی ہوئی ہے جبکہ کئی عرب ممالک افلاس زدگی اور پس ماندگی کا شکار ہیں۔ یہ تیل کی سفارت کاری OIL DIPLOMACY کا نتیجہ ہے جس کا جال انگریزوں اور امریکیوں نے ان ممالک میں بچھایا ہوا ہے یہی کیفیت ماضی قریب میں انگریز فاتحین نے "ہندوستان سونے کی چڑیا" میں کر رکھی تھی۔

گویا قدرتی وسائل بین الاقوامی تعلقات پر گہرے اثرات مرتب کرتے ہیں۔ سامراجیت، نوآبادیاتی نظام، ملکوں کی خارجہ پالیسیاں اور ڈپلومیسی وغیرہ ان سے پیدا

ہوتے یا متاثر ہوتے ہیں۔

۲۔ جغرافیائی حیثیت :۔ GEOGRAPHICAL POSITION

ریاستوں کے تعلقات پر جغرافیائی حیثیت سے بھی اثر پڑتا ہے کہ وہ کرۂ ارض کے کس مقام پر واقع ہیں اس سے اس کا اپنا جغرافیائی مقام (محل وقوع) کا تعین ہوتا ہے نپولین نے ایک دفعہ کہا تھا۔

"کسی ملک کی خارجہ پالیسی کا تعین جغرافیہ کرتا ہے"

اس سے ملتے جلتے خیالات کا اظہار جون ۱۹۰۶ء میں مسٹر ایچ جے موچینار MR. H.J. MUCHINAR نے رائل جیوگرافک سوسائٹی لندن THE ROYAL GEOGRAPHIC SOCIETY LONDON کے ایک اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا۔

"تاریخ عالم بڑی حد تک جغرافیہ سے متاثر ہے"۔

سوئیٹزرلینڈ کے RUDOEF KJELLEN کا خیال ہے کہ ریاست کی طاقت کا دارومدار انسان اور اس کے ماحول MAN AND HIS ENVIRONMENT پر ہے۔ ماحول سے مراد انسان کے چاروں طرف پھیلی ہوئی وہ اشیاء اور جغرافیائی حالات ہیں جو بلواسطہ یا بلا واسطہ طور پر انسان کے معاشی افعال کو متاثر کرتے ہیں، اس طرح ماحول صرف فرد کی معاشی زندگی کو ہی متاثر نہیں کرتا بلکہ ماحول بڑی حد تک اقوام کی تقدیر کا تعین بھی کرتا ہے اور اس کی وجہ سے دنیا کے مختلف ممالک کی اقتصادی حیثیت مختلف ہے۔

ماحول کی اقسام :۔ KINDS OF ENVIRONMENT

ا۔ طبعی ماحول :۔ PHYSICAL ENVIRONMENT

ب۔ ثقافتی ماحول :۔ CULTURAL ENVIRONMENT

ا ۔ طبعی ماحول میں وہ تمام اشیاء شامل ہیں جنہیں قدرت نے پیدا کیا ہے مثال کے

طور پر محل وقوع اور طبعی ساخت (جغرافیائی حیثیت) اور ثقافتی ماحول میں انسان کی فنی مہارت رسم و رواج اور نظریات بھی شامل ہیں۔

یہاں ہمارا موضوع صرف طبعی ماحول ہے لیکن ثقافتی ماحول کو صرف سمجھنے کے لئے ایک مثال پیشِ خدمت ہے ثقافتی ماحول (فنی مہارت) کے اطلاق کرنے کا طریقہ کار کا انحصار مذہبی عوامل سیاسی ثقافتوں اور متعلقہ انسانوں کے معاشی اور دیگر اقدار پر ہے۔ کوئی خاص مذہب کسی خاص انسانی سرگرمی پر قدغن لگا سکتا ہے۔ لہٰذا اس مذہب کے پیروکار اپنی تمدنی و اقتصادی سرگرمیوں کو اسی رنگ میں ڈھال لیتے ہیں مثال کے طور پر ساحلی علاقوں کے ممالک جیسے شمالی افریقہ ترکی البانیہ گو کہ شراب کی پیداوار کے لئے بڑی مفید علاقے ہیں۔ لیکن یہاں اس صنعت نے صرف اس لئے ترقی نہیں کی کہ اسلام شراب پر قدغن نافذ کرتا ہے۔ آج ترقی یافتہ ذرائع حمل و نقل کی بدولت دُور دراز علاقوں سے خام مال جمع کرنا اور تیار شدہ اشیاء کو دُور دراز واقع منڈیوں تک پہنچانا آسان ہو گیا ہے۔ لہٰذا انسانی افعال پر تمدنی ماحول کی مادی اشیاء کا اثر غالب ہے

۱۔ طبعی ماحول:۔

PHYSICAL ENVIRONMENT

طبعی ماحول میں کسی ملک کی جغرافیائی حیثیت یعنی محل وقوع اور طبعی ساخت TOPOGRAPHY شامل ہیں۔ طبعی ساخت میں حسب ذیل عناصر شامل ہیں۔

۱۔ پہاڑ	۲۔ سطح مرتفع
۳۔ آب و ہوا	۴۔ میدان
۵۔ مٹی	۶۔ نباتات
۷۔ ساحل سمندر	۸۔ معدنیات
۹۔ دریا	۱۰۔ نہریں ندی نالے
۱۱۔ کرۂ ہوائی	۱۲۔ خلائے بسیط: OUTER SPACE

قدرتی وسائل اور جغرافیائی حالات میں فرق صرف اتنا ہے کہ جغرافیائی یا قدرتی

حالات پر انسان کو کم و بیش کچھ اختیار حاصل نہیں ہوتا جبکہ قدرتی وسائل کو انسان کم یا ختم کر سکتا ہے تاہم سائنس اور ٹیکنالوجی کی ایجادات کے ذریعے انسان جغرافیائی حالات اور عوامل کو بھی سازگار بنا سکتا ہے تسخیر قدرت کا عمل انسان کو ان پر زیادہ سے زیادہ عبور اور قابو عطا کر رہا ہے اس اسباب و عوامل سے بھی بین الاقوامی تعلقات میں روز بروز تبدیلیاں واقع ہو رہی ہیں

گزشتہ زمانوں میں جب انسان کی ایجادات کم تھیں تو یہ دریا اور پہاڑ ریاستوں کو ایک دوسرے سے دور رکھتے ہیں۔ مگر کبھی کبھی ان پہاڑوں، دریاؤں اور درّوں کی بدولت فتوحات ہوئیں۔ سکندر اعظم ، اہل روما ، عرب فاتحین ترک اور منگول حملہ آوروں نے وسیع سلطنتیں قائم کیں جدید دور میں جب انسان نے نت نئی چیزیں ایجاد کر لی ہیں۔ تو یہ جغرافیائی رکاوٹیں بھی کم ہو گئی ہیں۔ جدید سامراجیت نے جنم لیا ہے اور مغربی دنیا نے تقریباً سارا کرہ ارض مغلوب و محکوم بنا لیا ہے۔ روس سوشل سامراجیت نے چھ سال سے افغانستان پر قبضہ جمایا ہوا ہے تاکہ جغرافیائی محل و وقوع کا سہارا لے کر جنوبی ایشیاء خلیج فارس اور عرب ممالک کو فتح کر سکے۔ یہ ارض سیاست کی بدترین مثال ہے ۔

ارض سیاسیات :۔

GEO-POLITICS

جغرافیائی حالات اور عوامل کا ریاستوں کے باہمی تعلقات پالیسی اور سیاست پر اثر اندازی کو ارض سیاست کہتے ہیں۔ مثال کے طور پر کسی ملک کے تعلقات بڑی حد تک اس کے محل وقوع پر منحصر ہوتے ہیں۔ مثلاً برطانیہ ، جاپان ، ایران ، مصر ، اٹلی ، سوئٹزرلینڈ جزیرائی ممالک ہیں۔ لہٰذا ان کی خارجہ پالیسی سیاست اور بیرونی تعلقات پر ان کے جائے وقوع کا گہرا اثر پڑتا ہے۔ اس کے برعکس افغانستان نیپال اور آسٹریا وغیرہ دنیا کے اہم بری اور بحری راستوں سے فاصلے پر واقع ہونے کی وجہ سے ان کے تعلقات مختلف نوعیت کے ہیں۔ اسی طرح اگر ایک ملک براعظمی وسعت کا ہو تو اس کے تعلقات اپنے

چھوٹے چھوٹے ہمسایوں سے مختلف ہوں گے۔ مثلاً امریکہ برطانیہ روس وغیرہ کے اپنے ہمسایوں سے تعلقات دست پذیر EXPANSIONISTIC رہے ہیں۔

موجودہ زمانے میں بھارت کا یہ خواب کہ وہ جنوبی ایشیا کے ممالک مثلاً پاکستان نیپال، لنکا برما وغیرہ کو فتح کر کے اکھنڈ بھارت بنائے گا۔ یہ ارض سیاست کی ایک بدترین کوشش ہے اسی طرح اسرائیل کا عرب ممالک کے بیچوں بیچ قائم کرنا اور قبرص کے واقعات امریکہ اور برطانیہ کی ارض سیاست کی چالیں ہیں۔ بھارت اور عوامی جمہوریہ چین کے مابین سرحدی جھگڑا ابھی تبت اور ہمالیائی سلسلے کی جغرافیائی جائے وقوع سے پیدا ہوا ہے۔ یاد رہے کہ جغرافیائی سیاست پر قدرتی دسائل کا بھی گہرا اثر پڑتا ہے۔ مثلاً تبت صدیوں تک چین کا حصہ رہا۔ مگر عام خیال یہ ہے کہ اس میں قدرتی ذخائر بہت زیادہ ہیں۔ اس لئے بھارت اس کو برطانوی حکمرانوں کی طرح اپنے دائرہ اختیار میں لانا چاہتا ہے۔ جو بھارتی چینی جھگڑے کا ایک سبب بن گیا ہے ارض سیاست کی ایک مثال موجودہ دور میں ہند چینی کے واقعات سے بھی ملتی ہے۔ جہاں سوویت سوشل سامراج اور عوامی جمہوریہ چین برسرپیکار ہیں۔ سوویت یونین ہند چینی کے ممالک کو چین کے خلاف جنگی تختہ SPRING BOARD بنانے کے لئے اپنے دائرہ اثر میں لانا چاہتا ہے۔ جیسا کہ وہ افریقہ میں انگولا، ایتھوپیا اور ایشیا میں جنوبی یمن، افغانستان اور بھارت وغیرہ کے ہمسایہ ممالک میں اپنا اثر و رسوخ بڑھانے اور نوآبادیاتی قبضہ کرنے کے لئے مداخلت کر رہا ہے۔

ارض سیاست کا نظریہ:۔ GEO-POLITICAL CONCEPT

ارض سیاست میں ہمیں دو نظریات ملتے ہیں ان میں ایک کا تعلق بری قوت اور اس کی حیثیت سے ہے اور دوسرا مکتبہ فکر سمندری راستوں پر کنٹرول کی اہمیت پر زور دیتا ہے۔ یہاں دونوں نظریات کا الگ الگ جائزہ لیا جاتا ہے

ا۔ مہان کا نظریہ:۔ CONCEPT OF MAHAN

اس نظریے کو امریکی ایڈمرل الفریڈ تھائر مہان نے ۱۸۹۰ء میں پیش کیا۔ اس کے مطابق بحری اور بری ذرائع آمدورفت پر کنٹرول کر کے دوسری ریاستوں پر برتری حاصل کی جا سکتی ہے۔ مہان اس سلسلے میں برطانیہ کی بحری قوت کی مثال پیش کرتا ہے جس زمانے میں یہ نظریہ پیش کیا گیا تھا اس وقت زمینی ذرائع آمدورفت زیادہ بہتر نہیں تھے۔ سائنس اور صنعتی ترقی کی بدولت اب بحری اور بری راستوں سے فضائی راستوں کی اہمیت بڑھ گئی ہے اس وجہ سے مہان کا نظریہ آج کی دنیا کے لئے کوئی قابل ذکر بات نہیں رہا۔

اا۔ میکانڈر کا تصور:۔ MACKINDER'S IDEAS

برطانوی ماہر جغرافیہ السفورڈ میکانڈر (۱۸۶۱ء - ۱۹۴۷ء) نے ۱۹۰۴ء میں وسطی خطہ HEART LAND کا نظریہ پیش کیا۔ اس کا کہنا ہے کہ پوری دنیا میں ۴/۳ حصہ پانی ہے اور ۴/۱ حصہ خشکی اس نے یورپ ایشیا اور افریقہ کے مشترکہ جزیرے کو عالمی جزیرہ WORLD ISLAND کہا ہے۔ لیکن ایک SEA MAN اسے ایک جزیرہ نہیں کہہ سکتا کیونکہ وہ اس کے ارد گرد چکر نہیں لگا سکتا۔

وسطی خطہ کی میکانڈر نے تین خصوصیات بیان کی ہیں:۔

۱. ایک وسیع ترین میدانی اور سطح مرتفع PLATEAU علاقہ ہے۔

۲. اس علاقے میں لاتعداد دریا بہتے ہیں ان میں سے کچھ گرم سمندروں میں اور بعض بحرہ منجمد شمالی میں جا کر برف بن جاتے ہیں۔

۳. اس علاقے کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایک سرسبز شاداب علاقہ ہے جو مشرق سے مغرب میں واقع ہے۔

میکانڈر کا موقف ہے کہ وسطی خطہ کی خوابیدہ طاقت POTENTIAL STRENGTH پوری دنیا کو کنٹرول کرنے کے لئے کافی ہے اس نے اس کی درجہ بندی یوں کی ہے

جو مشرقی یورپ پر حکومت کرے گا۔

WHO RULES EAST EUROPE

اس کی وسطی خطہ پر حکمرانی ہوگی

COMMANDS THE HEART LAND

جو وسطی خطہ پر حکومت کرے گا

WHO RULES THE HEART LAND

اس کی عالمی جزیرے پر حکمرانی ہوگی

COMMANDS THE WORLD ISLAND

جو عالمی جزیرے پر حکومت کرے گا

WHO RULE THE WORLD ISLAND

اس کی پوری دنیا پر حکمرانی ہوگی

COMMANDS THE WORLD

میکانڈر نے وسطی خطہ کے فوری اطرافی علاقے کو اندرونی ہلال INNER CRESCENT کہا ہے جس میں جرمنی آسٹریا ترکی ، ہندوستان اور چین شامل ہیں۔ یہاں مجھے لینن کی ایک بات یاد آرہی ہے کہ اس نے ایک دفعہ کہا تھا کہ پیرس جانے کا راستہ ہندوستان سے جاتا ہے۔

برطانیہ جنوبی افریقہ آسٹریلیا ریاست ہائے متحدہ امریکہ کینیڈا اور جاپان کو بیرونی ہلال OUTER CRESCENT یا بقیہ ممالک REMAINING COUNTRIES کہا ہے۔ یہ وسطی خطہ آج کل روس کے قبضے میں ہے یہی وجہ ہے کہ علاقائی اعتبار سے کمیونسٹ ساری دنیا میں پیش قدمی کر رہے ہیں۔ اور

مغرب پیچھے ہٹ رہا ہے۔

لیکن اس کے باوجود ہم اس نظریے کو قبول نہیں کر سکتے کہ سیاسیات جغرافیہ کی غلام ہے اور انسان کو جغرافیائی حالات میں ارتقاء اور ترقی کی آزادی حاصل نہیں پرانے مفکرین کی یہ رائے کہ گرم ممالک میں ہمیشہ استبدادیت کی حکومت ہو گی اور سرد ممالک میں عوام کی رائے اور جمہوریت کا راج ہو گا غلط ثابت ہو چکا ہے جیسا کہ گزشتہ نصف صدی کے تجربہ سے صاف ظاہر ہے کہ ایشیا اور افریقہ کے گرم ممالک میں جمہوری حکومتیں وجود میں آئیں۔ اس طرح آزادی اور جمہوریت کا انحصار جغرافیہ پر نہیں بلکہ انسان کی سیاسی جد و جہد اور تنظیم پر ہے بلکہ جوں جوں انسان فطرت پر کنٹرول حاصل کر رہا ہے۔ اتنا ہی وہ جغرافیائی اثرات کی محتاجی سے بھی آزاد ہوتا جا رہا ہے۔ اس بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ سیاسیات جغرافیہ کی غلام نہیں ہے۔

۳۔ آبادی کے عوامل :- POPULATION FACTORS

آبادی سے بھی ریاست کی اندرونی ساخت اور طاقت اور بیرونی تعلقات اور پالیسی پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ آبادی کی اصطلاح دراصل اضافی اصطلاح ہے۔ کیونکہ آبادی کا زیادہ یا کم ہونا لوگوں کی تعداد اور اقتصادی وسائل کی دستیابی پر موقوف ہے۔ اگر لوگوں کی تعداد اتنی ہو کہ اقتصادی وسائل گزارہ فراہم نہ کر سکیں تو ملک کو زیادہ آبادی والا OVER POPULATED ملک کہتے ہیں اور اگر تعداد اتنی ہو کہ اقتصادی وسائل سے سب کو مناسب آمدنی حاصل ہو تو اس کو کم آبادی والا UNDER POPULATED ملک کہتے ہیں۔ زیادہ آبادی والے ملک کی خارجہ پالیسی اور حکمت عملی جارحانہ وسعت پذیر اور ملک گیر ہوتی ہے ایسا ملک سامراجی اور جنگجو یانہ بن جاتا ہے اور وہ دوسرے ممالک اور علاقوں کو مغلوب کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر ایسا ملک صنعتی ہو تو وہ اپنی نوآبادیوں سے خام مال حاصل کرتا ہے اور اپنی مصنوعات کی منڈی بنا لیتا ہے جیسا کہ جدید زمانے میں مغربی ممالک اور امریکہ وغیرہ

بن گئے ہیں۔ لہٰذا انہوں نے وسیع سلطنتیں قائم کیں۔ بڑی بڑی جنگیں کیں۔ ایسے ممالک اسی لئے نوآبادیاں تلاش کرتے ہیں تاکہ ان کی فالتو آبادی کے لئے خالی علاقے دستیاب ہوں۔ کم آبادی والے ممالک اکثر غریب ہوتے ہیں اسی لئے وہ اپنے طاقتور ہمسایوں کی ہوس کا نشانہ بنتے ہیں۔ جیسا کہ حال ہی میں روس کے ہاتھوں ہنگری چیکوسلواکیہ اور پولینڈ جیسے کمزور ہمسایوں کا حشر ہوا ہے۔ غرض یہ کہ آبادی کی کمی یا زیادتی دونوں صورتوں میں بین الاقوامی تعلقات پر اثر انداز ہوتی ہے۔ انسانیت نے ابھی تک کوئی ایسا حل نہیں نکالا کہ آبادی کے بڑھنے یا گھٹنے سے بین الاقوامی تنازعہ اور فساد نہ پیدا ہوں۔ بیرونی خلشوں کے باعث بعض ممالک اپنی آبادی کو بڑھانے پر زور دیتے ہیں۔

۴۔ اقتصادی عوامل: ECONOMIC FACTORS

اقتصادی عوامل میں اقتصادی حالات، اقتصادی ترقی اور خوشحالی وغیرہ شامل ہیں۔ یوں تو اقتصادی حالات اور عوامل نے بین الاقوامی تعلقات خارجہ پالیسی ڈپلومیسی اور بیرونی رشتوں پر ہمیشہ اپنا اثر ڈالا ہے مگر موجودہ زمانے میں یہ اثر بدرجہ اتم ہوگیا ہے۔ یہ انسان کی بدقسمتی اور سیاست کی بدترین مثال ہے۔ کہ اکثر ایک ملک کی اقتصادی خوشحالی اور ترقی دوسرے ملک کے لئے مصیبت اور لعنت ثابت ہوتی ہے۔

اس کا ایک اچھا پہلو صرف یہ ہے کہ دوسرے ممالک اسی کو ایک چیلنج تصور کر کے اپنے اپنے ملک کو بھی اقتصادی ترقی اور خوشحالی کے اس ہی معیار اور درجہ تک پہنچانے کی کوشش کریں جیسا کہ گزشتہ صدی میں جاپان نے امریکہ اور یورپین ممالک کی ہوس گیری کے جواب میں کیا تھا اور آج کئی ممالک کر رہے ہیں۔ بین الاقوامی اقتصادی تعلقات دوستانہ تعاون یا معاندانہ مخالفت اور بائیکاٹ پر مبنی ہو سکتے ہیں۔

عموماً ہر ایک ریاست اپنے اقتصادی مفادات کے تحفظ کے لئے ایک مخصوص، بین الاقوامی تجارتی پالیسی اختیار کرتی ہے۔ جس کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں۔ مثلاً

اٹھارویں صدی میں متعدد یورپین ممالک تحفظ زر کی پالیسی MERCANTILE پر گامزن تھے۔ اس کے بعد چند ممالک نے آزاد بین الاقوامی تجارت کی پالیسی FREE TRADE POLICY اختیار کی جس کے تحت انہوں نے اپنی ملکی صنعت کے تحفظ کے لئے غیر ملکی مصنوعات پر بھاری امتناعی محصولات لگا دیئے تاکہ غیر ملکی مصنوعات درآمد نہ ہو سکیں۔

اب یہ پالیسی تقریباً تمام ممالک نے اختیار کر لی ہے۔ بعض اوقات چند ممالک اقتصادی تعلقات کو اتنا بڑھا لیتے ہیں کہ ایک اقتصادی اتحاد قائم ہو جاتا ہے۔ اس کی بہترین مثال موجودہ مغربی ممالک کی مشترکہ منڈی EUROPEAN COMMON MARKET ہے۔ جس میں فرانس مغربی جرمنی اٹلی ہالینڈ بلجیم اور لکسمبرگ وغیرہ شامل ہیں۔ مشترکہ منڈی کی اسکیم اتنی کامیاب ثابت ہوئی ہے۔ کہ حال ہی میں کئی اور ممالک بھی اس میں شامل ہو گئے۔ مثلاً برطانیہ دنیا کے دوسرے علاقوں میں بھی اپنی مشترکہ منڈیوں کا اتحاد قائم کرنے کی تجاویز پیش کر رہا ہے بعض اوقات اقتصادی تعلقات بہت معاندانہ اور مخالفانہ ہوتے ہیں جن کے باعث اکثر دو یا زیادہ ممالک میں اقتصادی یا تجارتی جنگ ECONOMIC OR TRADE WAR شروع ہو جاتی ہے علاوہ ازیں موجودہ دور میں دنیا دو معاشی حصوں میں تقسیم ہو چکی ہے۔ ایک طرف مغرب کے متمول ممالک ہیں جو اپنی اقتصادی ترقی اور خوشحالی کے لئے عالمگیر استعمار اور لوٹ کھسوٹ کی پالیسی پر عمل پیرا ہیں۔ دوسری طرف پسماندہ اور غیر ترقی یافتہ ممالک ہیں جو اقتصادی ترقی کے لئے کوششیں کر رہے ہیں جن کو سرمائے کی سخت ضرورت ہے اسی فرق کے باعث اقتصادی امداد کی ضرورت پڑتی ہے مگر بعض اوقات اقتصادی امداد دینے والے ممالک چند سیاسی شرائط عائد کر دیتے ہیں جیسے امریکی امداد کا مقصد اشتراکیت کو روکنا اور غیر اشتراکی ممالک کو اشتراکی تسلط سے آزاد رکھنا ہے اور اس کے برعکس روسی امداد کا مقصد سرمایہ دارانہ نظام کا خاتمہ اور اشتراکی نظریات کا پھیلاؤ ہے اس طرح امداد یافتہ امداد دینے والے ممالک کے محتاج اور حواری بن جاتے ہیں۔ اس وجہ سے بین الاقوامی تعلقات میں سیاسی رسہ کشی شروع ہو جاتی ہے جس کو عام زبان میں ڈالر ڈپلومیسی DOLLAR DIPLOMACY یا نئی نو آبادیت NEO-COLONIALISM کہتے ہیں۔

۵۔ سائنسی اور ٹیکنولوجیکل عوامل:۔

یہ حقیقت ہے کہ سائنس اور انجینئرنگ ٹیکنالوجی کی ہر بڑی ایجاد اور دریافت بین الاقوامی تعلقات پر اثر ڈالتی ہے۔ یہ بات گزشتہ زمانوں میں بھی تھی مگر جدید زمانے میں خاص کر صنعتی انقلاب ۱۷۶۰-۱۸۳۰ء کے بعد یہ ایک مکمل حقیقت بن گئی ہے۔ مگر یہ ایجادیں اور دریافت دو دھاری تلوار کی طرح ہیں۔ ان سے بین الاقوامی میل جول بڑھتا ہے اور بعض اوقات بگڑتا ہے۔ مثلاً ریلوں جہازوں ٹیلی گراف اور ٹیلی فون ریڈیو وغیرہ کی ایجادوں نے ملکوں اور قوموں میں میل ملاپ اور تعاون کو بڑھایا ہے اور انہیں قریب تر کر دیا ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ جنگ اور کشیدگی میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ یہ دوسرا رجحان موجودہ وقتوں کی ایجادوں اور انکشافات مثلاً ریڈیو ٹیلی وژن راکٹ اور خلائی جہازوں کی ایجاد اور دریافتوں کی وجہ سے ہوا ہے اب دنیا کے تمام ممالک اتنے قریب ہو گئے ہیں کہ دنیا سکڑ کر ایک خاندان کی مانند ہو گئی ہے جس کے افراد ممالک ہیں۔ اس وجہ سے ریاستوں میں میل جول و تعاون اور جنگ کشیدگی و تنازعے سبھی میں اضافہ ہوا ہے۔ ان وجوہات سے بین الاقوامی تعاون اور تنظیم اور ایک عالمی ریاست WORLD STATE: جیسے تصورات ذہن میں پیدا ہوتے ہیں۔

۴۔ تمدن اور نظریات:۔ CULTURE AND IDEOLOGY

تہذیب و تمدن رنگ نسل مذہب اور نظریات نے ہمیشہ بین الاقوامی تعلقات اور انسانی زندگی پر گہرے اثرات ڈالے ہیں۔ تاریخ عالم میں بارہا مذہب کی وجہ سے جنگیں ہوئیں اور مملکتوں کے تعلقات کشیدہ رہے۔ زبان رنگ اور نسل کی وجہ سے بھی بین الاقوامی جھگڑے اور تنازعات پیدا ہوئے مثلاً گزشتہ ایک سو سال میں یورپ کے ممالک میں جرمن اطالوی پولستانی اور دیگر ریاستوں کی زبانوں اور نسل کے بارے میں فسادات اور جنگیں ہوئی۔ آج کل بھارت اور سری لنکا کا جھگڑا بڑی حد تک بھارتی آباد کاروں اور تامل زبان بولنے والوں کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ جنوبی افریقہ کی نسلی علیحدگی APARTHIED کی پالیسی کی وجہ سے تمام افریقی و ایشیائی ممالک میں ہیجان پیدا ہوا ہے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی نسل اور رنگ کی منافرت کے باعث نہ صرف وہاں کے نیگرو باشندوں کی بلکہ دوسری رنگدار اقوام کے سفارتی اور سیاحی غیر ملکیوں کی بھی مار کٹائی ہو جاتی ہے۔

گزشتہ ایک صدی سے جرمنی میں جرمن تمدن کے تحفظ کی زبردست تحریک چلی

رہی ہے۔ اس کے تحت سب غیر جرمن تہذیب و تمدن کے خلاف جرمنی میں جہاد جاری ہے۔ موجودہ زمانے میں مذہب اور نسل کے نام پر سب سے بدترین منصوبہ اسرائیل کا قیام ہے۔ جو یہودیوں عربوں کی نسلی بیخ کنی کے لیے فلسطین میں پورا کیا جا رہا ہے۔ علاوہ ازیں زبان کی بنا پر بھی کئی ممالک میں تعاون اور اشتراک عمل کی تحریکیں جاری ہیں مثلاً عرب ممالک کے موجودہ اتحاد کی تحریک، عربی زبان کی وجہ سے ہے۔ برطانیہ میں انگریزی بولنے والی اقوام کے اتحاد کی تحریک جاری ہے۔

بعض اوقات مذہب نسل یا زبان کی وجہ سے پیدا شدہ اقلیتوں کی وجہ سے بھی دو یا زائد ممالک میں ناچاقی ہو جاتی ہے۔ مثلاً بھارتی مسلمانوں پر ظلم و ستم کی وجہ سے پاک بھارت تعلقات عموماً کشیدہ رہتے ہیں۔ موجودہ زمانے میں نظریاتی فرق بھی عالمی کشیدگی کا بہت بڑا سبب بنا ہوا ہے۔

۷۔ تاریخی عوامل:

HISTORICAL FACTORS

گزشتہ تاریخ بھی موجودہ بین الاقوامی تعلقات پر اثر انداز ہوتی ہے مثلاً پاک بھارت تعلقات آزادی سے لے کر آج تک خوشگوار نہ ہونے کی ایک بڑی وجہ ان دونوں ملکوں پر انگریز حکمرانوں کی شر پسندی تھی۔ جس کے باعث انگریزوں کے عہد حکومت میں اکثر و بیشتر ہندو مسلم فسادات اور ناچاقی رہتی تھی۔ جو آج تک چلی آ رہی ہے۔

اس طرح جدید ترکی اور سوویت یونین میں ناچاقی بھی سابقہ زار روس اور سلطنت عثمانیہ کے تنازعے ہیں۔ جس کی وجہ سے یہ دونوں ممالک آج بھی ایک دوسرے سے پرخاش رکھتے ہیں۔ صدیوں تک فرانس برطانیہ اور فرانس جرمنی میں تاریخی وجوہات کی بنا پر دشمنی رہی ہے۔ تاہم گزشتہ تاریخ کا اثر رد بھی کیا جا سکتا ہے۔ اکثر جب نئے حالات اور تقاضے پیدا ہوتے ہیں تو گزشتہ تاریخ کی رنجشیں اور دشمنیاں فراموش کر دی جاتی ہیں۔ جیسا کہ آج مغربی یورپ کے اتحاد سے ظاہر ہوتا ہے۔ جرمنی فرانس اور برطانیہ آپس میں جنگیں بھی کر چکے ہیں اور

آج روس کے خلاف متحد ہو گئے ہیں۔ اس کی وجہ سیاسی تقاضے اور ...

ہے۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ پس ماندہ ممالک پر ان کی گزشتہ تاریخ کی گرفت ترقی یافتہ ممالک کی نسبت زیادہ سخت ہوتی ہے۔ وہ ہمیشہ گزرے ہوئے زمانے کی باتوں کو دل سے لگائے رکھتے ہیں، اپنی پرانی عداوتوں یا دوستوں کو جاری رکھتے ہیں۔ مگر ترقی یافتہ ممالک وقتی تقاضوں اور تجربوں کے مطابق دشمنی یا دوستی کرتے ہیں۔ جیسا کہ امریکہ آج بھارت چین اور پاکستان کے معاملے میں کر رہا ہے۔

۸۔ حکومتی عوامل:۔

GOVERNMENT FACTORS

ریاست اور حکومت کی ساخت اور نوعیت بھی بین الاقوامی تعلقات پر بہت گہرا اثر ڈالتی ہے کیونکہ حکومت کی خارجہ پالیسی اور تعلقات اس کے سیاسی نظریات پر مبنی ہوتے ہیں اور دوسری حکومتوں کا اس سے سلوک بھی نظریات پر ہی منحصر ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر گزشتہ زمانوں میں جب تقریباً ساری دنیا میں بادشاہت کا دور دورہ تھا۔ اگر کبھی ان کے درمیان کوئی جمہوریہ REPUBLIC وجود میں آجاتی۔ تو فوراً بین الاقوامی تناؤ اور تناز شروع ہو جاتا تھا۔

جیسا کہ انقلاب فرانس ۱۷۸۹ء کے واقعات سے ظاہر ہے۔ موجودہ صدی میں ۱۹۱۷ء کے انقلاب روس کے بعد ۱۹۴۸ء میں چین میں کمیونسٹ حکومت قائم ہوئی تو فوراً ان غیر کمیونسٹ حکومتوں میں زبردست کھچاؤ اور دشمنی شروع ہو گئی۔ ساری بین الاقوامی برادری جنگجویانہ نعروں سے گونج اٹھی۔

غیر اشتراکی ممالک نے اشتراکی ممالک کے اردگرد حفاظتی گھیرا CORDON SANITAIRE ڈال دیا تاکہ ان ممالک کے انقلاب انگیز اثرات دوسرے ممالک میں نہ پھیلیں۔ انقلابیوں نے دنیا کو نئے ترقی پسندانہ نعروں سے ہمکنار کیا تمام لوگوں کو ان کی ضرورت کی ضمانت، دولت کی مساوی تقسیم محنت کشوں کی حکومت کا پروپیگنڈا کیا اپنے مخالفین کو سرمایہ دار اور بورژوا وغیرہ کے خطاب سے نوازا اور انہیں عالمی مسائل کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ عوام میں اتحاد اور جدوجہد کے لئے تمام طبقوں کے خاتمے کا تصور اس قدر حسین بنا کر پیش کیا جس نے پوری دنیا کے غریب عوام پر گہرے اثرات مرتب کئے۔ دوسرے ملکوں میں بھی اشتراکی پارٹیاں بننے لگیں۔ اس کے علاوہ روس

نے اپنے اردگرد آہنی پردہ IRON CURTAIN ڈال دیا تاکہ غیر کمیونسٹ خیالات اس کے عوام تک نہ پہنچیں۔ ان نظریات کی بدولت دو بلاکوں میں سرد جنگ COLD WAR شروع ہو گئی۔ جو ہر لمحہ گرم جنگ بننے کو تیار رہتی ہے۔

تاہم پچھلے چند سالوں سے جوہری جنگ کی تباہی کے ڈر سے بڑی طاقتوں میں مفاہمت پیدا ہوئی ہے اس کو پُرامن بقائے باہمی PEACEFUL CO-EXISTENCE کی پالیسی کہتے ہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ سیاسی معاشرتی اور دیگر اختلافات کے باوجود مختلف قسموں کی ریاستوں اور معاشروں کو پُرامن طور سے ساتھ ساتھ زندہ رہنا چاہیئے۔ اس غرض سے آج کل جنگ کے خطرے کو کم کرنے کے لئے تخفیف اسلحہ کی تجاویز پر بھی غور ہو رہا ہے۔ تاکہ جنگی اسلحہ ختم کر کے دنیائے انسانی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جنگ سے نجات دلائی جائے۔ اور ابدی امن قائم کیا جائے۔

بین الاقوامی تعلقات کے نظریات

THEORIES OF INTERNATIONAL RELATION

افلاطون PLATO سے برٹرنیڈ رسل BERTRAND RUSSEL تک سیاسی افکار و نظریات کا مطالعہ ہم ایک تسلسل کے ساتھ کر سکتے ہیں مگر بین الاقوامی تعلقات کے نظریات کا مطالعہ کرنے کے لئے ہمیں کوئی تاریخی تسلسل نہیں ملتا۔ دوسری عام بات یہ ہے کہ پچھلی صدی تک ایسی کوئی کتاب منظر عام پر نہیں آئی تھی جس میں بین الاقوامی تعلقات کی اساس اور نظریات سے تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی ہو۔ چنانچہ موجودہ صدی میں عالمی جنگوں اور مواصلات کی ترقی کی وجہ سے بین الاقوامی تعلقات کی اہمیت میں اضافہ ہوا تو اس مضمون میں بھی تحقیق ہونا شروع ہوئی۔ یہاں ہم بین الاقوامی تعلقات کے پرانے اور نئے نظریات کا جائزہ لیں گے۔

۱۔ مثالیت پسندی کا نظریہ :- THEORY OF IDEALISM

ریاستوں کے درمیان تعلقات کے سلسلے میں مثالیت پسندی کا نظریہ قدیم سمجھا جاتا ہے۔ اس مکتبہ فکر کے لوگ ریاستوں کے درمیان تصادم کا حل بین الاقوامی قانون اور عالمی اداروں کے ذریعے چاہتے ہیں۔ مثالیت پسندوں نے اس طرح بین الاقوامی مسائل کو حل کرنے کے لئے قانونی اور اخلاقی طریقہ کار پہ زور دیا ہے۔ مثالیت پسند جنگ کو گناہ قرار دیتے ہیں۔ لیکن اتفاقیہ جنگ کے قائل ہیں۔ دلیل یہ دیتے ہیں کہ بین الاقوامی اداروں کے فعال نہ ہونے کی وجہ سے جنگ کا نعم البدل مفقود ہو جاتا ہے بہرحال جنگ انسانی فطرت کے منفی پہلو کی پیداوار ہے۔ حتہ المکان اس سے گریز کرنا چاہیے۔

اس مکتبہ فکر کے پیروکاروں میں حسب ذیل مفکرین سرفہرست ہیں۔

۱۔ ایریح ۔ ڈی سینٹ سائمن
۲۔ ولیم لارڈ رچرڈ کا بڈین
۳۔ الڈوس ھکسے
۴۔ مہاتما گاندھی
۵۔ وڈرو ولسن
۶۔ برٹرینڈ رسل

مثالیت پسند حقیقت پسندوں کی طرح طاقتی سیاست POWER POLITICS پر بھروسہ نہیں کرتے۔ ان کا خیال ہے کہ سیاست اچھی حکومت کرنے کا فن ہے نہ کہ طاقت کے ذریعے حکومت قائم رکھنے کا۔"

ان کے نزدیک کوئی رویہ ایسا نہیں جو تبدیل ہونے والا نہ ہو خواہ یہ رویہ فرد کا ہو یا ریاست کا جس طرح ایک فرد کے پاس اپنے رویے پر قابو پانے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ اسی طرح ایک ریاست بھی اپنے رویے پر کنٹرول کر سکتی ہے۔

مثالیت پسندی کی خاص خاص باتیں مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ بین الاقوامی سیاست کو صرف تاریخ اور قانونی سیاسی اداروں کے مطالعہ کے ذریعے ہی سمجھنا چاہیے۔

۲. بین الاقوامی تعلقات میں نفسیات کی اہمیت کو مدنظر رکھنا چاہیے۔ خاص طور سے فرد کے طرز عمل کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ کیونکہ افراد اور ریاستوں کے مسائل ایک دوسرے سے مختلف نہیں ہوتے۔

۳. فطرت انسانی دائمی نہیں ہے بلکہ اس میں کوشش کر کے ترمیم کی جا سکتی ہے اس سے یہ خیال جنم لیتا ہے کہ ریاستوں کو اخلاقی معیار اپنانا چاہیئے۔

۴. مملکت کو صرف ایسے اقدامات اٹھانے چاہیئں جن سے افراد کی بھلائی ممکن ہو نہ کہ ایسے اقدامات جو ممکن ہوں اور ان سے انسانیت کی تباہی ہو۔

۵. مثالیت پسند خطرناک اور جارحانہ پالیسیوں سے اتفاق نہیں کرتے اس وجہ سے وہ طاقت اور تشدد کے خلاف ہیں۔

۲۔ حقیقت پسندی کا نظریہ :۔

THEORY OF REALISAM

مثالیت پسندوں کے برعکس حقیقت پسند طاقتی سیاست پر یقین رکھتے ہیں اس مکتبہ فکر کے پیروکاروں میں مندرجہ ذیل مفکرین بہت مشہور ہیں۔

۱. میکاولی
۲. میکس ویبر
۳. ایچ جے مارگن تھیو
۴. فریڈرک شومین
۵. نکولاس سپائک مین
۶. کے ڈبلیو تھامپسن
۷. ارنولڈ ولفرس اور کئی دوسرے مفکرین شامل ہیں۔

ان کے نزدیک عالمی سیاست کا واحد مقصد "جدوجہد برائے طاقت" ہے۔

پروفیسر ایچ جے مارگن تھیو نے کہا۔

"مفاد اور طاقت دونوں بین الاقوامی سیاسیات کے بنیادی منظم نظریات ہیں۔ سیاسیات اور طاقت ہمیشہ سے ایک دوسرے کے ساتھ پیوستہ ہیں۔"

اس نظریے کی خاص خاص باتیں حسب ذیل ہیں۔

۱. ریاستوں کے درمیان قومی مفاد کے سلسلے میں کوئی ہم آہنگی نہیں پائی جاتی۔ اور تمام ریاستیں اپنے اپنے مفادات حاصل کرنے کی کوشش میں لگی رہتی ہیں۔

۲. ریاست کے طرز عمل میں اس کی استعداد CAPABILITIES کا بڑا عمل دخل ہے۔ یہ استعداد یا لیاقت فوجی اور غیر فوجی دونوں قسم کی ہو سکتی ہے

لیکن حقیقت پسند اس میں ٹیکنالوجی، آبادی، جغرافیائی حیثیت، نظریات اور قیادت کو بھی شمار کرتے ہیں۔

۳۔ فطرت انسانی خود جائز و ناجائز طریقے سے اقتدار حاصل کرنا چاہتی ہے۔ اس وجہ سے بین الاقوامی سیاست میں اخلاقیات کا کوئی ایسا معیار نہیں جس پر بین الاقوامی تعلقات کے نظریہ کی بنیاد رکھی جا سکتی۔

۴۔ یہ سیاست دانوں کا کام ہے کہ وہ ریاستوں کے مابین توازن طاقت کو برقرار رکھیں کیونکہ توازن طاقت کے بگڑنے سے جارحیت کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے۔ مثالیت پسند بھی توازن طاقت کے قائل ہیں۔ حقیقت پسندوں کا خیال ہے کہ توازن طاقت کا صرف اخلاقی معیار قائم کیا جا سکتا ہے۔

ریاستوں کی خارجہ پالیسیاں بڑی حد تک جغرافیہ سے متاثر ہوتی ہیں۔ عالمی ادارے اور قانون بین الاقوام دنیا میں امن و امان قائم رکھنے کے لئے کارآمد ثابت ہوتے ہیں۔ مگر ان کے پاس قوت نافذہ نہ ہونے کی وجہ سے ان کی حیثیت کمزور ہو گئی ہے۔ اس لئے اصل چیز قومی مفادات کا ذماغ ہی باقی رہ جاتا ہے۔

مثالیت پسندی اور حقیقت پسندی کے نظریات کی وجہ سے بین الاقوامی تعلقات میں کافی وسعت پیدا ہوئی ہے اور اس مضمون کو باقاعدہ یونیورسٹیوں میں بڑھایا جانے لگا ہے۔ مثالیت پسند طلباء میں ایک مخصوص قسم کی فکر پیدا کرنا چاہتے ہیں مثال کے طور پر اقوام متحدہ کو ہر حال میں مضبوط کرنا چاہیئے۔ دوسری طرف حقیقت پسندوں کا خیال ہے کہ طلباء کو اپنی رائے قائم کرنے پر چھوڑ دیا جائے کہ سیاسی زندگی کی اصل حقیقت کیا ہے۔ میرے خیال میں بہتر یہی ہے۔ اس سے موجودہ مسائل کو بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔

۱۹۶۰ء کے بعد بین الاقوامی تعلقات میں کئی نئے نظریات آئے۔ یہ نئے تصورات APPROACHES۔ بین الاقوامی سیاست کے علاوہ تاریخ معاشیات قانون روحانی سائنس مثلاً سائیکالوجی، عمرانیات، انسانیات سے بھی ہے۔

یہاں ان نئے تصورات کا مختصراً ذکر کیا جا رہا ہے۔

۲۔ نظاموں کا نظریہ :۔ SYSTEMS APPROACH

بین الاقوامی تعلقات میں یہ ایک نیا نظریہ ہے جس میں بین الاقوامی تعلقات کے کئی نظاموں مثلاً توازن طاقت کا نظام ۔ دو قطبی یا کثیر قطبی نظام ۔ مذہبی پیشواؤں کی حکومت کا نظام اور عالمگیر نظام وغیرہ کو شامل کیا گیا ہے ۔ رائمنڈ آرن ROYMOND ARON کا خیال ہے کہ کبھی بھی ایک بین الاقوامی نظام قائم نہیں ہوا سوائے جنگ کے بعد کے دور میں جبکہ پوری انسانیت ہنگامی دنیائی نظام کی شاہد ہے علاوہ ازیں سیاسی نظاموں پر جغرافیائی اور معاشی حالات بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔

۴۔ کھیل کا نظریہ :۔ GAME THEORY

جس طرح ایک کھیل میں قواعد وضوابط کی پابندی کھلاڑیوں پر لازمی ہوتی ہے۔ اسی طرح خارجہ پالیسی بنانے والے کرداروں ACTERS کو بھی اس کے قواعد و ضوابط کی پابندی کرنی پڑتی ہے اس نظریے پر تنقید اس دلیل پر کی جاتی ہے کہ بین الاقوامی تعلقات کوئی کھیل نہیں ہے ۔

۵۔ مواصلات کا نظریہ :۔ COMMUNICATION THEORY

سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی سے نظام مواصلات کو زبردست تقویت پہنچی ہے اس سے بین الاقوامی تعلقات میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا ہے ۔ ریڈیو ٹیلیویژن اور پریس کے وسیع استعمال نے ریاستوں کے سیاسی تعلقات اور انسانوں کے سماجی تعلقات قائم کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے یہ کہا جاتا ہے کہ مواصلات کی اہمیت کسی طرح بھی جوہری توانائی سے کم نہیں ہے ۔ ترقی یافتہ ممالک مواصلات کو تعلیم پراپیگنڈا اور اپنے قومی مفاد کی ترقی وحصول کے لئے استعمال کرتے ہیں اور بین الاقوامی تعلقات میں موثر کردار ادا کرتے ہیں۔

۶۔ طاقت کا نظریہ :۔ THEORY OF POWER

طاقت کے تصور کو بین الاقوامی تعلقات میں اہم مقام حاصل ہے ۔ کیونکہ ہر

ریاست کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ طاقت حاصل کر کے عالمی برادری میں نمایاں کردار ادا کیا جائے۔ یہ ایک الگ موضوع بحث ہے کہ ریاست اپنے اس مقصد میں کہاں تک کامیاب ہوتی ہے۔

۷۔ بین الاقوامی تنظیم کا نظریہ :۔ THE THEORY OF INTERNATIONAL ORGANISATION

بین الاقوامی تعلقات میں عالمی اداروں اور تنظیموں کا نظریہ بھی اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ ان تنظیموں میں اقوام متحدہ، سب سے اہم ہے اس کے زیر اثر ادارے اور دفاعی تنظیمیں ناٹو، وارسا پیکٹ وغیرہ بھی قابل ذکر ہیں۔ ریاستوں کے درمیان تعلقات کو بہتر بنانے کے لیے یہ تنظیمیں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ ریاستوں کے درمیان تصادم کے بجائے گفت و شنید سے مسائل حل ہوتے ہیں۔ ماہرین کا خیال ہے کہ تصادم اور پھر اس کا حل بین الاقوامی تعلقات کے لیے ضروری ہے۔

۸۔ تصورات کا نظریہ :۔ THE THEORY OF IDIOLOGY

دوسری عالمی جنگ کے بعد نظریات کے تصور نے بڑی اہمیت اختیار کر لی ہے ان میں روس اشتراکی اور امریکہ سرمایہ دارانہ نظام کا علمبردار بن کر سامنے آئے۔ ان دونوں نظریات کے علاوہ اسلامی نظریات، غیر وابستہ تحریک اور تیسری دنیا کے نظریات نے بھی تعلقات میں کشیدگی پیدا کی ہے یا اثر انداز ہوئے ہیں
ماہرین کا خیال ہے کہ تمام بین الاقوامی جھگڑے نظریاتی تضاد کی پیداوار ہیں

۹۔ قومیت کا نظریہ :۔ THE THEORY OF NATIONALISM

آج کے دور میں بین الاقوامی تعلقات میں قومیت کا نظریہ ایک طاقت ور حیثیت رکھتا ہے۔ دوسری عالمگیر جنگ ۱۹۳۹۔۴۵ کے بعد آزاد ہونے والی بیشتر ریاستوں کی بنیاد اسی نظریہ پر تھی۔ مثلاً پاکستان اسلامی قومیت کی بنا پر معرض وجود میں آیا۔ متحدہ ہندوستان میں ہندو اور مسلم دو الگ الگ قومیں تھیں۔

۱۰۔ قومی کردار کا نظریہ:۔ THE THEORY OF NATIONAL CHATACTER

بین الاقوامی تعلقات کے ماہرین اس بات پر سختہ یقین رکھتے ہیں کہ بین الاقوامی تعلقات میں قومی کردار اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ریاست کا قومی کردار مخصوص اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ یہ قومی کردار براہ راست سیاسی کردار پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اس نظریے میں بین الاقوامی تعلقات کی نفسیات پر زور دیا گیا ہے۔

۱۱۔ جنگ اور امن کا نظریہ:۔ THE THEORY OF WAR AND PEACE

جنگ اور امن بین الاقوامی تعلقات کے دو اہم عنوان ہیں۔ عالمی سطح پر ریاستوں کے مابین تصادم اسی نظریہ پر مبنی ہوتا ہے۔ ماہرین اس تصور کو بڑی اہمیت دیتے ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ "امن" کے لئے کوششیں کی جائیں اور جنگ کو روکنے کے لئے تخفیف اسلحہ و افواج کا کنٹرول ضروری ہے۔

۱۲۔ قومی مفاد کا نظریہ:۔ THE THEORY OF NATIONAL INTEREST

قومی مفاد کا نظریہ بین الاقوامی تعلقات میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ ہر ریاست اپنے قومی مفادات کو اولیت دیتی ہے۔ قومی مفاد کی نوعیت اور اس کے ضروری اجزاء کے لئے ماہرین بین الاقوامی تعلقات ہر وقت مطالعہ میں مصروف رہتے ہیں۔ اس حقیقت کو بھی تسلیم کیا جا چکا ہے۔ کہ خارجہ پالیسی کا مقصد قومی مفاد کی بہتری ہوتا ہے

۱۳۔ ریاستوں کے درمیان تصادم اور حل کا نظریہ:۔

THE THEORY OF CONFLICT AND CONFLICT RESOLUTION

بعض ماہرین کا خیال ہے کہ ریاستوں کے درمیان تصادم اور اس کا حل بین الاقوامی تعلقات کا ایک اہم پہلو ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ اس تصادم کی وجوہات کا جائزہ لیا جائے اور پھر اس مسئلے کے حل کے طریقے تلاش کئے جائیں تاکہ اقوام عالم امن و سکون کے ساتھ

زندگی بسر کر سکیں۔ اس سلسلے میں نفسیات اور انسانیات کے ماہرین مدد گار ثابت ہوتے ہیں۔

۱۴۔ ایٹمی ہتھیاروں کی دھمکی کا نظریہ: THE THEORY OF ATOMIC WEAPONS ULTIMATUM

ایٹمی ہتھیاروں کے استعمال کی دھمکی بھی بین الاقوامی تعلقات میں اہم کردار ادا کر رہی ہے۔ دو بڑی طاقتیں روس اور امریکہ اس سلسلے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لئے کوشاں ہیں۔ لیکن ایٹمی ہتھیاروں کا استعمال صرف اس لئے نہیں کر رہے کہ دونوں طاقتیں یہ جان چکی ہیں کہ ایک دوسرے کو شکست نہیں دے سکتیں۔ اس وجہ سے صرف ایٹمی ہتھیاروں کے استعمال کی دھمکی دیتی ہیں۔

۱۵۔ فیصلہ سازی کا نظریہ: THEORY OF DECISION MAKING

یہ مختلف ریاستوں کی خارجہ پالیسی میں فیصلہ سازی کے عمل کا نظریہ ہے عظیم طاقتوں میں اس نظریے نے بڑی اہمیت اختیار کر لی ہے اس نظریے میں اس بات کا مشاہدہ کیا جاتا ہے کہ رائے عامہ PUBLIC OPINION مقننہ کے کردار اور ریاست کے مختلف محکموں سے خارجہ پالیسی کے فیصلہ سازی کے عمل پر کیا اثر پڑتا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ عوام خارجہ پالیسی پر کہاں تک اثر انداز ہوتے ہیں۔

۱۶۔ معاشی عناصر کا نظریہ: THE THEORY OF ECONOMIC FACTORS

یہ تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ معاشی عناصر بین الاقوامی تعلقات میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ جو فرد ملکی اور بین الاقوامی معاشی مسائل سے واقفیت نہیں رکھتا وہ بین الاقوامی تعلقات کو صحیح معنوں میں نہیں سمجھ سکتا۔ اس لئے مختلف موضوعات مثلاً معاشی منصوبہ بندی، تجارتی توازن، ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک میں معاشی ترقی کے بارے میں بین الاقوامی تعلقات کے طالب علم کا جاننا ضروری ہے

بین الاقوامی تعلقات کا عام نظریہ :

GENERAL THEORY OF INTERNATIONAL RELATION

بین الاقوامی تعلقات کے مندرجہ بالا تمام نظریات کا مطالعہ کرنے سے جو بات سامنے آتی ہے ۔ وہ یہ ہے کہ بین الاقوامی تعلقات کے تصورات میں نظریاتی تضادات پایا جاتا ہے THE VARIETY OF THEORIES اور یہ سب نظریات مخصوص حالات کی پیداوار ہیں ۔ اس وجہ سے بین الاقوامی تعلقات کے عام نظریے کا وجود عمل میں لایا گیا ہے ۔

اس نظریئے کا سب سے اہم مقصد یہ ہے کہ عام لوگ بین الاقوامی تعلقات کو سمجھ سکیں تاکہ دنیا میں باہمی تعاون و اعتماد کی فضا سازگار ہو بعض ماہرین کسی ایک نظریہ کی موجودگی اور اس کے قابل عمل ہونے سے اتفاق نہیں کرتے ۔ ان ماہرین کا خیال ہے کہ ریاستوں کے درمیان کے تعلقات مسائل اور حالات وقت کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتے رہتے ہیں ۔

اس سلسلے میں پروفیسر قیونسی رائٹ QUINCY WRIGHT کہتے ہیں ۔

"بین الاقوامی تعلقات کا ایک نظریہ ایسا ہونا چاہیئے جو وسیع اور عام قابل قبول ہو ۔ جو نہ صرف مربوط ہو بلکہ ایسے علم کا مجموعہ ہو ۔ جو ریاستوں کے مابین تعلقات کے تقاضوں اور عالمی حالات کے لئے معاون ثابت ہو ۔"

پروفیسر قیونس رائٹ صاحب نے اس نظریئے کے تین ماخذ بیان کئے ہیں ۔

۱۔ بین الاقوامی تعلقات کے بعض مخصوص شعبوں سے متعلق قواعد ایک ماخذ کی حیثیت رکھتے ہیں ان کو ترقی دے کر مزید بہتر بنایا جا سکتا ہے ۔ اس کے خیال میں جس طرح جغرافیائی حدود مثلاً پہاڑ دریا اور دیگر وسائل تعلقات کا سبب بنتے ہیں ۔ اس طرح نفسیاتی عمرانی اور دوسرے نظری تقاضے اور عوامل بھی شامل ہیں ۔ جو ریاستوں کے درمیان باہمی تعلقات قائم کرنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں ۔

۲۔ ماضی کے تاریخی واقعات اور اثاثے ، حال کے تجربات بھی بین الاقوامی تعلقات کے عام نظریہ کے ماخذ کا کام سرانجام دیتے ہیں ۔ زندگی کے حقائق ریاستوں کے درمیان

تعلقات کو استوار کرنے اور قریب لانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں جغرافیائی محل و وقوع عظیم شخصیتوں کی جغرافیائی و نظریاتی وابستگی ریاستوں کے تعلقات پر اثر انداز ہوتی ہے۔ ماضی وحال کا یہ سرمایہ بین الاقوامی تعلقات کے نظریہ کا ماخذ بن جاتا ہے

۳۔ دنیا میں مختلف نظریات و خیالات کے لوگ بستے ہیں۔ انسان کے یہ خیالات نہ صرف انسان کی اپنی ذات تک محدود رہتے ہیں بلکہ دوسروں انسانوں بلکہ معاشروں پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔ کیولنسی رائٹ ایسے لوگوں کو پانچ درجوں میں تقسیم کرتا ہے

۱۔ فلسفیوں کا طبقہ جن کے نزدیک دنیا ایک خیال ہے۔

۲۔ مدبرین اور سفارت کاروں کا طبقہ جن کے نزدیک دنیا توازن طاقت کا ترازو ہے۔

۳۔ بین الاقوامی سول ملازمین اور اقوام متحدہ کے کارندے جن کے نزدیک دنیا ایک تنظیم ہے۔

۴۔ مذہبی مبلغین جن کے نزدیک تمام انسان بھائی بھائی ہیں۔

۵۔ مادہ پرست طبقہ جن کے نزدیک دنیا ایک لامحدود چیز ہے اور اس میں ہر چیز ضرورت کے مطابق پیدا کی گئی ہے۔

ان پانچوں طبقوں کے خیالات و نظریات بین الاقوامی تعلقات و سیاسیات کے ماخذ کا کام دے رہے ہیں۔ جو ساری دنیا کے لئے یکساں اور عام نظریہ کے طور پر قابل قبول ہیں۔

باب دوم

قومی ریاست

NATIONAL STATE

١۔ قومی ریاست اور اس کے عناصر ترکیبی

٢۔ ریاستی نظام کا ارتقاء

٣۔ قوم پرستی

٤۔ قومی طاقت

٥۔ قومی خارجہ پالیسی

قومی ریاست اور اس کے عناصر ترکیبی

افلاطون نے کہا تھا کہ ریاست کسی درخت یا چٹان سے نہیں پیدا ہوتی بلکہ یہ آدمیوں کے کردار سے بنتی ہے جو اس میں رہتے ہیں۔ ریاست معاشرے کی ایک ایسی تنظیم ہے جو امن و امان اور فلاح و بہبود کی خاطر بذریعہ طاقت اور قانون قائم کی جاتی ہے۔ ریاست کی تعریف سادہ اور عام فہم لفظوں میں یوں کی جا سکتی ہے

"ریاست افراد کی ایک ایسی جماعت ہے جو کسی خاص علاقے میں رہتی ہو جس میں ایک منظم حکومت ہو جو اس علاقے کے تمام افراد اور اجتماعات پر اقتدار رکھتی ہو اور وہ کسی بیرونی طاقت کی مطیع نہ ہو۔"

ریاست کے عناصر ترکیبی :۔

آبادی علاقہ حکومت اور اقتدار اعلیٰ ریاست کے چار لازمی عناصر ہیں ایک اکائی میں سے اگر ان میں سے ایک بھی کم ہو جائے تو وہ اکائی ریاست نہیں کہلا سکتی۔

۱۔ آبادی :۔

POPULATION

آبادی کے بغیر ریاست کا تصور ہی ناممکن ہے کیونکہ ریاست انسانی اجتماع کی مخصوص معاشرتی تنظیم کا نام ہے۔

ریاست کی آبادی کی تعداد کے بارے میں ہمیشہ ماہرین سیاسیات میں بحث و مباحثہ ہوتا رہا ہے۔ افلاطون کا خیال ہے کہ ۵۰۴۰ افراد پر مشتمل ریاست ہونی چاہیئے ارسطو کی رائے میں دس ہزار سے ایک لاکھ تک افراد کافی ہیں۔ زمانہ جدید میں روسو نے بھی کم آبادی پر زور دیا ہے۔ اس کے نزدیک ۱۰۰۰۰ افراد کی آبادی موزوں ہے۔ مگر یہ تمام اعداد و شمار موجودہ زمانے میں بہت کم ہیں۔ موجودہ دور میں ریاستوں کی آبادی لاکھوں سے لے کر کروڑوں کی تعداد میں ہے۔ اس وقت دنیا میں تقریباً

۲۰۰ کے الگ بھگ ریاستیں ہیں ۔ ان میں بعض ریاستوں کی آبادی ہزاروں لاکھوں اور بعض ریاستوں کی آبادی کروڑوں تک محیط ہے ۔ کم آبادی والی ریاستوں میں ویٹی کن سٹی اسٹیٹ، ناؤرو، ٹوالو اور منا کو وغیرہ سرفہرست ہیں ۔ ان ریاستوں کی آبادی بالترتیب ایک ہزار ۵ سو ، ۸ ہزار ۲ سو، ۱۰ ہزار اور ۳۰ ہزار ہے ۔ زیادہ آبادی والی ریاستوں میں چین کی آبادی ایک ارب ۱۵ کروڑ، بھارت ۸۷ کروڑ، امریکہ ۲۵ کروڑ، انڈونیشیا ۲۰ کروڑ اور برازیل ۱۶ کروڑ ہے ۔

اگر ریاست کی آبادی کا فرداً فرداً جائزہ لیا جائے تو اس میں تین قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں ۔

- شہری : جنہیں ریاست کے تمام حقوق مراعات اور فرائض حاصل ہوتے ہیں ۔
- قومیے یا رعایا NATIONALS ریاست کے مسلمہ شہری جنہیں مخصوص حقوق حاصل ہوتے ہیں
- غیر ملکی : کسی ریاست کا شہری جو عارضی طور پر ریاست میں قیام پذیر ہو ۔

۲۔ علاقہ : TERRITORY

ریاست کا دوسرا طبعی عنصر علاقہ ہے ۔ مملکت کی تشکیل کے لئے ضروری ہے کہ آبادی کسی مخصوص خطہ اراضی پر آباد ہو کر قیام پذیر ریاست بنائے ۔ خانہ بدوشوں کی زندگی بسر کرنے والے لوگ مملکت کی تشکیل نہیں کر سکتے ۔

یہودیوں کی مثال لیجئے ۔ جب بخت نصر نے اہل یہود کو بیت المقدس سے نکال دیا تو وہ دو ہزار سال تک دربدر پھرتے رہے ۔ ان کی مذہبی تنظیم تو قائم رہی مگر اپنا مخصوص علاقہ نہ ہونے کی وجہ سے سیاسی تنظیم قائم نہ ہو سکی ۔ حتیٰ کہ ۱۹۴۸ء میں برطانیہ امریکہ روس اور فرانس کی مدد سے اہل یہود نے عربوں کو نکال کر فلسطین پر قبضہ کر لیا اور وہاں مملکت اسرائیل قائم کر لی ۔

اس کے برعکس چنگیز خان کے زمانے میں منگولوں نے دہلی سے لے کر ماسکو تک کے

تمام ممالک فتح کر لئے مگر خانہ بدوش منگولوں نے کسی ملک میں بھی مستقل قیام نہ کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چنگیز خان کے مرنے کے چند سالوں بعد منگول سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا اور منگول قبائل کوئی ریاست قائم نہ کر سکے۔ بعد وہ دوسری اقوام میں مدغم ہو کر اپنے وجود کو بھی کھو بیٹھے۔ تاریخ اسلام میں خلافت بنوامیہ بھی پائیدار ثابت نہ ہوئی اگرچہ خانہ بدوش عرب قبائل نے سندھ سے لے کر سپین تک ایک وسیع سلطنت قائم کر لی۔ مگر اس کو مستحکم نہ بنا سکے کیونکہ انہوں نے ابھی خانہ بدوش قبائلی زندگی کو ترک نہ کیا تھا۔

آبادی کی طرح علاقے کی وسعت کے بارے میں بھی ماہرین سیاسیات میں ہمیشہ بحث و مباحثہ ہوتا رہا ہے۔ قدیم یونانی مفکرین کی رائے ہے کہ وسیع و عریض سلطنتیں کمزور ہوتی ہیں کیونکہ ان میں نظم و نسق قائم رکھنا مشکل ہوتا ہے۔ مگر دورِ جدید میں یہ رائے بدل گئی ہے مواصلات کی ترقی اور ذرائع آمد و رفت میں اس قدر آسانیاں پیدا ہو گئی ہیں کہ وسیع علاقوں پر بھی آسانی کے ساتھ حکومت کی جا سکتی ہے۔ دنیا میں ہمیشہ مختلف حدود اور وسعت کی ریاستیں قائم رہی ہیں۔ قدیم یونان میں شہری ریاستیں تھیں جن کی وسعت آج کل کے اوسط درجہ کی بلدیہ سے بڑی نہ تھی۔ مگر قدیم زمانے میں سلطنت روما برطانیہ سے لے کر مصر اور شام تک پھیلی ہوئی تھی۔ اموی خلافت سندھ سے اسپین تک پھیلی ہوئی تھی۔

آج کل رقبے کے لحاظ سے چھوٹی ریاستوں میں ویٹی کن سٹی اسٹیٹ ۱۰۸ مربع میل، موناکو ۶۰۰ مربع میل، ناؤرو ۸ مربع میل، تووالو ۱۰ مربع میل اور سان مارینو ۲۴ مربع میل ہے۔ اور بڑی ریاستوں میں رشین فیڈریشن ۶۵ لاکھ ۹۲ ہزار ۸ سو مربع میل، کینیڈا ۳۸ لاکھ ۴۹ ہزار مربع میل، چین ۳۶ لاکھ ۹۶ ہزار ایک سو مربع میل، امریکہ ۳۶ لاکھ ۱۸ ہزار ۸ سو مربع میل اور برازیل ۳۲ لاکھ ۸۶ ہزار ۴ سو ۰۰ مربع میل ہے۔

بقول ٹرائچکے:

"ریاست ایک قوت ہے اور یہ گناہ ہے کہ ریاست چھوٹی سی ہو۔"

عظیم تر بننے کی خواہش اس وجہ سے ہوتی ہے کہ اس ملک کا دماغ، اقتصادی خود کفیلی اور وسیع قدرتی وسائل وغیرہ میسر آتے ہیں۔ تاہم آبادی اور رقبہ میں موزوں مناسبت ہونی چاہیے۔

ریاستوں کو علاقے کے بغیر قائم رکھنے کی مثالیں بھی ہیں جو عالمی جنگوں کے

دوران ملتی ہیں۔ مثلاً جنگ عظیم دوئم کے دوران پولینڈ اور چیکوسلواکیہ کی جلاوطن حکومتوں کو بحیثیت ریاست تسلیم کیا گیا۔ ان ریاستوں کا رقبہ اتحادیوں کے قبضے میں چلا گیا تھا لیکن یہ اپنی آبادی و مالیات پر قانونی حیثیت رکھتی تھیں۔ یہ صورتِ حال ریاست کے قانونی نظریے کے علاوہ عملی ضرورتوں کے مطابق تھی۔ ایسی صورت حال ہمیشہ عارضی ہوتی ہے علاوہ ازیں کچھ ایسی بھی جلاوطن حکومتیں ہوتی ہیں جن کی مقبولیت عام نہیں ہوتی جیسے افغان مہاجرین کی جلاوطن حکومت، خالصتان کے سکھوں کی جلاوطن حکومت وغیرہ اس کے برعکس یاسر عرفات کی جلاوطن حکومت کو زیادہ مقبولیت حاصل ہے اسے باقاعدہ

اقوام متحدہ بھی مانتی ہے۔

ریاستوں کی سرحدوں کا تعین کرنے کے لیے نہ صرف فوج اور دفاع کے مسائل پیدا ہوتے ہیں بلکہ بین الاقوامی تعلقات اور قوانین کے مسائل بھی پیدا ہوتے ہیں۔ بہت سی سرحدوں کا تعین حد بندی کے نشانات سے کیا جاتا ہے اگر دو ریاستوں کے درمیان کوئی دریا بہتا ہو تو وسط دریا سرحد قرار دی جاتی ہے۔ اگر ریاستوں کے درمیان پہاڑ ہوں تو بارش کے بہاؤ کے مطابق پہاڑوں کی چوٹیوں پر سرحد مقرر کر لی جاتی ہے۔ سمندری سرحد کو ساحل سے بارہ میل اندر تصور کیا جاتا ہے (قانون بین الاقوام) ہوائی جہازوں کی ایجاد سے قبل ریاستوں کی کوئی ہوائی سرحد نہ ہوتی تھی۔ مگر ان کی ایجاد کے بعد یہ سرحد آسمان تک تصور کر لی گئی ہے۔

۳۔ حکومت GOVERNMENT

حکومت ریاست کا تیسرا اور سیاسی عنصر ہے۔ حکومت سے مراد ایسی تنظیم ہے جو لوگوں کو منظم کر کے ان پر احکام و قوانین نافذ کرے اور امن و امان قائم کرے۔ حکومت ریاست کی مرضی کے اظہار کا عملی ذریعہ ہے۔ یہ ایک ایسی مشینری ہے جس سے ملک کا انتظام اور بندوبست ہوتا ہے حکومت کے بغیر افراد محض ایک گروہ کی مانند ہیں جن کی مرضی اور ارادے بے اثر رہتے ہیں۔ حکومت ایک وسیع [illegible] ہے حکومت کا مطالعاتی ڈھانچہ مختصر یوں بیان کیا [illegible] ہے۔
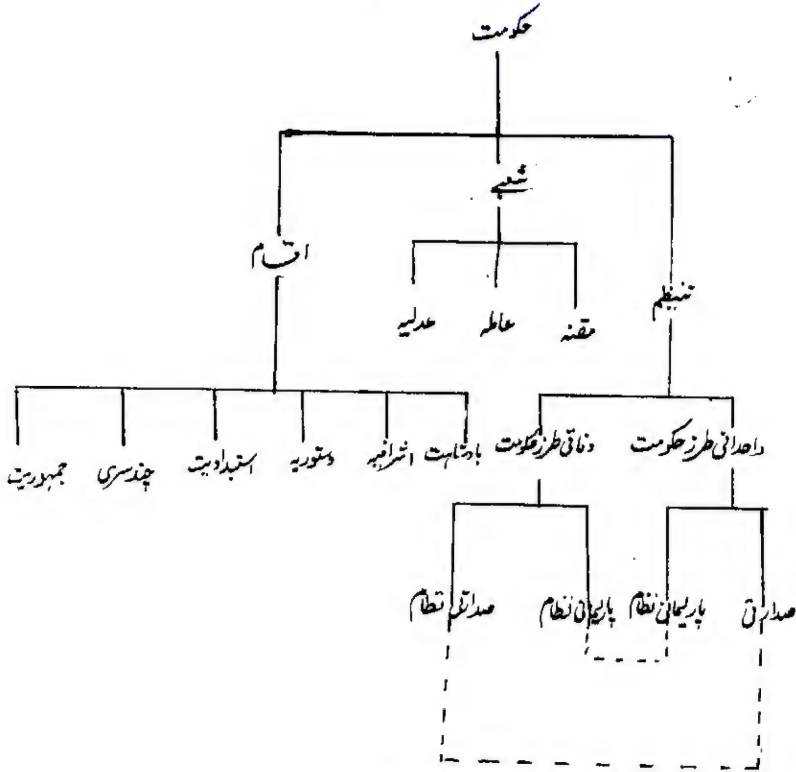
حکومت ریاست کی ظاہری اور عملی شکل وصورت ہے۔

۴۔ اقتدار اعلیٰ :۔ SOVEREIGNTY

ریاست کا چوتھا لازمی عنصر اقتدار اعلیٰ ہے۔ حاکمیت سے مراد ایسی اعلیٰ برتری اور غیر محدود طاقت ہے جو ریاست کی حدود کے اندر سب افراد اور انجمنوں پر فائق ہوتی ہے کسی اندرونی یا بیرونی طاقت کے سامنے سر نہیں جھکاتی۔

حاکمیت کے دو پہلو ہوتے ہیں :۔

۱۔ اندرونی حاکمیت INTERNAL SOVEREIGNTY

۲۔ بیرونی حاکمیت EXTERNAL SOVEREIGNTY

اندرونی حاکمیت سے مراد ریاست اپنی حدود کے اندر تمام افراد اور انجمنوں پر فائق اور با اختیار ہے۔ بیرونی حاکمیت سے مراد حاکمیت کا بیرونی اثر و دباؤ سے

آزاد ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر حاکمیت اندرونی طور پر ایک مثبت طاقت ہے اور بیرونی طور پر ایک منفی طاقت ہے۔

آدھا اقتدار اعلیٰ

HALF SOVEREIGNTY

تاریخ عالم میں ایسی مثالیں بھی ہمارے سامنے آتی ہیں کہ بعض اوقات ریاستیں اندرونی طور پر آزاد اور بیرونی طور پر کسی دوسری ریاست کے ماتحت ہوتی ہیں اور قانون بین الاقوام میں ایسی ریاستوں کو بھی تسلیم کیا جاتا رہا ہے۔ سابق نوآبادیاتی ریاستیں، مناکو نیپال اور بھوٹان وغیرہ کے علاوہ مشرقی یورپ میں چیکوسلواکیہ بلغاریہ ہنگری، پولینڈ اور ایشیا میں افغانستان وغیرہ پر روس جارحیت وغیرہ آدھا اقتدار اعلیٰ کی زندہ مثالیں ہیں۔

مجلس اقوام کا انتدابی نظام اور انجمن اقوام متحدہ کا اماناتی نظام بھی اسی سلسلے کی کڑی رہا ہے۔

اقتدار اعلیٰ کے تصور کی تاریخ

اقتدار اعلیٰ کا تصور علم سیاسیات میں ابتدا ہی سے موجود ہے۔ قدیم یونانی فلسفی ارسطو نے اپنی کتاب سیاست میں اگرچہ لفظ حاکمیت کہیں استعمال نہیں کیا۔ مگر اس کے تصور کو "اختیارات اعلیٰ" کے الفاظ سے موسوم کیا ہے۔ اور جب اس نے ریاستوں کو مختلف اقسام میں تقسیم کیا تو اس تقسیم کا اصول بھی حاکمیت کے اصول پر قائم کیا۔ ارسطو کے بعد رومی مفکرین نے بھی اس تصور پر بحث کی۔

عہد وسطیٰ میں جب یورپ پر عیسائیت کا غلبہ تھا تو حاکمیت کے تصور نے شہنشاہت اور پاپائیت (دنیوی و دینی حاکمیت) کا روپ اختیار کر لیا جس کی وجہ سے ان دو حاکمین میں مدتوں تنازعہ رہا کہ ان میں سے حاکم اعلیٰ کون ہے۔ اسلامی دنیا میں ابن خلدون نے اپنی شہرہ آفاق کتاب "مقدمہ" میں حاکمیت کا تصور اپنے عہد کے لحاظ سے واضح الفاظ میں پیش کیا۔ اس کا کہنا ہے کہ حاکمیت ایسی قوت ہے جو ریاست کے وجود کو قائم رکھتی ہے اور جب حاکم اعلیٰ کمزور ہو جاتا ہے تو ریاست بھی کمزور ہو جاتی

ہے حتی کہ وہ زوال پذیر ہو کر ختم ہو جاتا ہے۔ اور نئی حاکمیت اس کی جگہ لے لیتی ہے۔

دورِ جدید میں فرانسیسی مفکر جین بودین JEAN BODIN پہلا شخص ہے جس نے اقتدارِ اعلیٰ کا جدید تصور پیش کیا۔ اس نے اقتدار اعلیٰ کی تعریف یوں کی :۔

"حاکمیت وہ طاقت ہے جو قانون سے بالاتر ہر شہری اور رعایا پر فائق ہوتی ہے۔"

بودین کے خیال کے مطابق یہ طاقت بادشاہ کو حاصل ہے۔ تھامس ہابس نے بھی بودین کی تقلید کی مگر اس نے اقتدار اعلیٰ کے تصور کو بہتر طور پر اُجاگر کیا۔ اس نے کہا کہ :۔

"حاکمیت قطعی ناقابل تقسیم اور ناقابل انتقال طاقت ہے۔"

ہابس کے بعد جان لاک نے محدود حاکمیت کا تصور پیش کیا۔ لاک کے بعد روسو نے شخصی اور قانونی حاکمیت کے بجائے عمومی اور عوامی حاکمیت کا انقلاب انگیز اور جمہوری نظریہ پیش کیا۔

انیسویں صدی میں انگریز قانون دان آسٹن نے ہابس کی تقلید کرتے ہوئے اقتدارِ اعلیٰ کا وحدتی تصور MONISTIC CONCEPTION OF SOVEREIGNTY پیش کیا۔

اس تصور کے خلاف ایک ردعمل شروع ہوا۔ جو بالآخر حاکمیت کے تصور ہی کو رد کرنے لگا۔ لاسکی کے اس تصور کو اقتدار اعلیٰ کا تکثیری نظریہ PLURALISTIC CONCEPTION OF SOVEREIGNTY کہتے ہیں۔ وحدتی حاکمیت کا نظریہ ریاست کو کلی اختیارات اور طاقت سے مسلح کرنے کی ضرورت پر زور دیتا ہے۔ اسی وجہ سے بین الاقوامی تعلقات میں اس نے جارحانہ کردار ادا کر کے منفی اثرات مرتب کئے ہیں سامراجیت نوآبادیاتی نظام، سرمایہ داری اشتراکی نظام، نازی اور فاشی ازم وغیرہ کی تحریکوں کے پیچھے کسی نہ کسی طرح اقتدار اعلیٰ کا یہی نظریہ کارفرما رہا ہے۔

بیسویں صدی میں ریاست کے کردار میں کچھ تبدیلی آئی مثلاً اس سے

پہلے ریاست کو محض امن و امان قائم رکھنے کا ذریعہ تصور کیا جاتا تھا۔ مگر موجودہ صدی میں ریاست کا کام محض امن و امان نہیں بلکہ رضاکارانہ انجمنوں کے حقوق اور باہمی تعلقات کو تقویت دینا ہے۔

اس میں ریاست کو طاقتور بنانے کے بجائے ان انجمنوں اور اجتماعات کو زیادہ سے زیادہ آزادی، خود مختاری اور خود کاری کے اختیارات اور حقوق دینے کی ضرورت ہے۔ دوسری یہ وجہ ہے کہ موجودہ معاشرے میں فرد اپنی خوشی اور خوشحالی اپنے مخصوص گروہوں اور انجمنوں میں حاصل کرتا ہے۔ وحدتی حاکمیت کے نظریے کے مطابق ریاست ان تمام انجمنوں، اداروں، اجتماعتوں کی کوئی خود مختاری، آزادی اور حقوق تسلیم نہیں کرتی۔ لہٰذا اس نظریے کی تردید میں تکثریت کا نظریہ پیش کیا گیا۔

اقتدار اعلیٰ کے خاتمے کا تصور :-

لاسکی کے نزدیک آج کی مملکت تکثیری۔ دستوری اور ذمہ دار مملکت ہے اس کی اندرونی اور بیرونی سرگرمیاں محدود ہیں۔ ان پر نظر ثانی کی جا سکتی ہے۔ بلکہ مملکت کا خاص کام مختلف انجمنوں میں مفاہمت اور تعاون پیدا کرنا ہے۔ یہ عوامی خدمت کی کارپوریشن ہے۔ لاسکی اقتدار اعلیٰ کے بارے میں کہتا ہے کہ :-

" اقتدار اعلیٰ کو محدود کرنے کا ایک اہم عنصر ہماری دنیا اور انسانیت سے وفاداری ہے۔"[1]

اقتدار اعلیٰ سے متعلق اس کے دو اور جملے بڑے دلچسپ اور بھرپور ہیں مثلاً :-

" اقتدار اعلیٰ کے قانونی نظریہ کو سیاسی فلسفہ کے لئے جائز قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہ علم سیاسیات پر بہت بڑا احسان ہوگا کہ اگر اقتدار اعلیٰ کے نظریہ کو سرے سے ختم کر دیا جائے۔"

"علم سیاسیات سے اقتدار اعلیٰ کا نظریہ اس طرح سے غائب ہوگا جس طرح بادشاہوں کا حق خداداد کا نظریہ THEORY OF DIVINE RIGHT OF KINGS

ختم ہو رہا ہے۔

بلاشبہ موجودہ دور اقتدار اعلیٰ کے لامحدود اختیارات کے لئے موزوں نہیں ہے۔ کیونکہ موجودہ زمانے میں قوموں کا الگ تھلگ رہنا ناممکن ہے۔ باہمی انحصار نے انہیں ایک دوسرے سے قریب تر کر دیا ہے۔ پوری دنیا ایک معاشی وحدت ECONOMIC UNIT ہے۔ ایک قوم کا بحران اس کے اپنے علاقے تک محدود نہیں رہتا۔ بلکہ پوری دنیا اس کی لپیٹ میں آجاتی ہے اس طرح یہ بین الاقوامیت INTERNATIONALISM کا دور ہے۔ لیکن اس کے باوجود ابھی تک کوئی عالمی حکومت یا وفاق قائم نہیں کیا جاسکا جو بین الاقوامی ضابطۂ اخلاق مرتب کرے۔ اور نافذ کرے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ عالمی معاشرہ کے عناصر قانون بین الاقوام انجمن اقوام متحدہ اور ذیلی ادارے، بین الاقوامی عدالت انصاف اور دیگر عالمی اداروں کو مضبوط اور موثر بنایا جائے۔ قانون بین الاقوام میں تمام ریاستوں کو مقتدرانہ حیثیت دی گئی ہے۔ یہ سب ریاستیں اس وقت تک اپنے اقتدار اعلیٰ کا تحفظ نہیں کر سکتیں جب تک کچھ اصولوں کی پابندی کے لئے مشترکہ طور پر تیار نہ ہوں۔ لہٰذا اقتدار اعلیٰ کا خاتمہ تو ناممکن ہے۔ بہرحال اس پر مخصوص قسم کی پابندیاں ضرور لگائی جاسکتی ہیں۔

اقتدار اعلیٰ پر پابندی کا تصور:

عالمی حکومت کا خیال دن بدن زور پکڑتا جا رہا ہے۔ بین الاقوامیت پسند بالخصوص اس کے حامی ہیں کہ تمام مملکتیں اپنی بیرونی آزادی کو خیرباد کہہ کر ایک عالمی برادری میں شامل ہو جائیں۔ ایسے عمومی مسائل جن کا تعلق ایک سے زیادہ ممالک کے ساتھ ہو۔ انہیں عالمی حکومت طے کرے۔ تمام مملکتیں اپنے داخلی معاملات میں خودمختار ہوں لیکن خارجی معاملات میں ان کو مطلق آزادی نہ دی جائے۔ عالمی حکومت کا اہم مقصد بین الاقوامی تنازعات کا حل۔ جنگ کی روک تھام تخفیف اسلحہ اور مشترکہ نوعیت کے مسائل کا حل ہے۔ عالمی حکومت یا وفاق کی اہم رکاوٹیں ۱۔ اقتدار اعلیٰ کی بیرونی آزادی۔ ۲۔ قومیت ۳ اور قوموں کے ذاتی مفادات ہیں۔

اقتدار اعلیٰ کے مطالعے سے بین الاقوامی تعلقات کے طالب علم پر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بیرونی اقتدار اعلیٰ پر بین الاقوامی قانون کے مطابق پابندی لگانا ضروری ہو گیا ہے۔ تاکہ عالمی امن قائم ہو سکے۔ اقتدار اعلیٰ کے تعین کے بغیر بین الاقوامی قانون اور اداروں کی حیثیت ریاستوں کے آگے کچھ بھی نہیں رہتی۔ ہم نے مقتدر ریاستوں کو میثاق مجلس اقوام کی مٹی پلید کرتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ آج اقوام متحدہ کے ساتھ بھی اس سے ملتا جلتا ہی سلوک ہو رہا ہے۔ عظیم طاقتیں اپنی ذمہ داریوں کو پورا نہیں کر رہیں۔

ویٹو پاورز (امریکہ روس چین فرانس برطانیہ) تنازعات کو حل کرنے کے بجائے تنازعات کا باعث بنی ہوئی ہیں۔ بڑی طاقتیں اپنے مفاد کے تحت امن و سلامتی سے متعلق فیصلہ کرتی ہیں۔ پھر یہ کہ دو بڑی طاقتیں روس اور امریکہ ایک دوسرے سے سیاسی مقاصد اور ریاستی نظام میں بالکل مختلف عقیدے پر یقین رکھتی ہیں۔ ان دونوں کا کسی ایک مسئلہ پر متفق ہونا مشکل ہی نہیں بلکہ محال ہے۔ اقوام متحدہ روس اور امریکہ کے دو متضاد نظاموں کے درمیان کھلونا بنی ہوئی ہیں۔ جس سے روس اور امریکہ کھیل رہے ہیں۔ چھوٹی اقوام دونوں کے رحم و کرم پر تماشائی بنی ہوتی ہیں۔ اگر یہ ریاستیں ویٹو کو فرض سمجھ کر استعمال کریں تو بہت سارے مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ لیکن یہاں تو حق کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ ورنہ آج بیت المقدس قبرص، کشمیر، فلسطین جنوبی افریقہ، کمپوچیا، لبنان، کوریا اور منصفانہ بین الاقوامی اقتصادی نظام کا قیام کے مسائل حل کے محتاج نہیں رہتے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ قانون بین الاقوام کو مؤثر بنایا جائے اور تمام عالمی تنازعات کا تصفیہ بین الاقوامی عدالت انصاف کرے۔ عدالت کے اختیار سماعت کو بااختیار بنایا جائے۔ یہ صرف اُسی وقت ہو سکتا ہے کہ عدالت انصاف کی پشت پر کوئی انتظامی قوت موجود ہو۔ مقتدر ریاستوں کے بیرونی اقتدار اعلیٰ پر قانون بین الاقوام کے مطابق پابندی لگانے سے اقتدار اعلیٰ کی حدود کا تعین مثبت ہوتا ہے۔ اس سے اتحاد اور تعاون کی فضا قائم ہو گی بعض ریاستیں سے اپنے اوپر زیادتی یا پھر آزادی و خودمختاری پر داغ سمجھتی ہیں۔ حالانکہ یہ غلط ہے کیونکہ جب تمام ریاستوں پر یکساں

قسم کا قانون لاگو ہوگا تو پھر کسی ریاست کے ساتھ زیادتی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا
مختصراً یوں کہا جا سکتا ہے کہ ریاستوں کو اندرونی پالیسیوں میں مقتدرانہ حیثیت دی جانی
چاہیئے اور بیرونی پالیسیوں میں قانون بین الاقوام کے مطابق پابندی لگائی جانی چاہیے اسی
میں زمین پر انسانی بقا کا راز پنہاں ہے ورنہ تیسری عالمگیر جنگ کی تباہی پہلی دونوں جنگوں
سے کہیں زیادہ ہوگی۔

تیولنسی رائٹ QUINCY RIGHT نے بھی اقتدار اعلیٰ پر پابندی
کے تصور کی حمایت کی ہے ان کے مطابق :۔

" بلدیاتی قانون کے نقطہ نگاہ سے اقتدار اعلیٰ پر پابندی کے تصور کی حمایت کی ہے"

بلدیاتی قانون کے نقطہ نگاہ سے اقتدار اعلیٰ ایک تنظیم ہے جو ناقابل
تقسیم اور ناقابل انتقال ہے۔ لیکن بین الاقوامی نقطہ نگاہ سے یہ قابل تقسیم اور قابل
انتقال قوت ہے۔ لہٰذا تیولنسی رائٹ اقتدار اعلیٰ کے تین اہم پہلوؤں پر پابندی
لگانے یا محدود کرنے کا ذکر کرتے ہیں۔

اوّل تنازعات کا تصفیہ ثالث کے ذریعے۔

دوئم دفاعی قوت کے استعمال کی ضمانت

سوئم بین الاقوامی تجارت میں من مانی پر پابندی۔

اس طرح موصوف عالمی اقتدار اعلیٰ کی حمایت کرتے ہیں فرانس کے جنرل
ڈیگال نے اقتدار اعلیٰ کو محدود کرنے کی سخت مخالفت کی تھی۔ سنہ ۱۹۶۰ء میں مقتدر
ریاست اور قومی آزادی کو فرانسیسی سیاست کی بنیاد قرار دیا گیا۔ انہوں نے اقتدار اعلیٰ
پر پابندی کے تصور کو مسترد کیا۔

جناب ای۔اے۔ کو رودین E.A. KOROVIN روسی کہتا ہے۔

" اقتدار اعلیٰ لامحدود اور من مانی قوت کا اظہار نہیں بلکہ یہ داخلی اور
خارجی معاملات میں " حق خود ارادیت " کا اصول ہے"۔

آگے چل کر موصوف نے یوں اظہار خیال کیا۔

"اقتدار اعلیٰ کا اصول اس قانونی رکاوٹ کا نام ہے جو اقوام کو سامراجی مداخلت اور مغربی اقتصادی حملوں سے روکتا ہے۔"

اقتدار اعلیٰ پر پابندی لگانے کے تصور کی حاصل بحث یہ ہے کہ ریاست نظری اعتبار سے ایک وحدت ہے اور جب تک ریاست کا وجود ہے۔ یقیناً اقتدار اعلیٰ کا بھی وجود رہے گا۔ اس سے یہ بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ اقتدار اعلیٰ کا خاتمہ ریاست کا خاتمہ اور ریاست کا خاتمہ اقتدار اعلیٰ کا خاتمہ ہے۔ جس طرح دیواروں کے بغیر عمارت کھڑی نہیں ہو سکتی۔ اس طرح اقتدار اعلیٰ کے بغیر ریاست قائم نہیں رہ سکتی جہاں اقتدار اعلیٰ کی وجہ سے ناراضگی کی فضا پیدا ہو رہی ہے۔ وہاں اس کی دوسری وجہ ریاستوں کا وسائل کے اعتبار سے مختلف ہونا بھی ہے۔ وسائل کے مختلف ہونے کی وجہ سے جہاں ریاستوں کے تعلقات کے درمیان پیچیدگیاں ہیں۔ وہاں ان کی وجہ سے ریاستوں کے مابین اتحاد بھی برقرار ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ریاستوں کی من مانی کارروائیوں پر پابندی ہونی چاہیئے۔ مگر اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ اس کے لئے اقتدار اعلیٰ ہی کو ختم کر دیا جائے۔

اقتدار اعلیٰ کی خصوصیات

اقتدار اعلیٰ کی اہم خصوصیات حسب ذیل ہیں۔

خصوصیات

- لامحدود اختیارات
- ہمہ گیریت
- دائمی حیثیت
- یگانہ یا منفرد حیثیت
- ناقابل تقسیم
- ناقابل انتقال
- ناقابل زوال
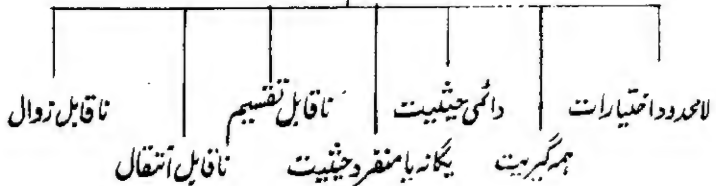
۱۔ لامحدود اختیارات یا مطلق العنانیت:

اقتدار اعلیٰ کی سب سے پہلی خصوصیت مطلق العنانیت ہے۔ یعنی یہ ایک ایسی

طاقت ہے جو لامحدود اختیارات کی مالک ہے۔ دنیا کی کوئی طاقت اس پر قانونی پابندی عائد نہیں کر سکتی اور اگر کوئی طاقت اس کو کامیابی کے ساتھ چیلنج کر سکتی ہے تو وہ طاقت خود مقتدر اعلیٰ بن جائے گی اور تمام نہاد طاقت اس کی محکوم بن جائے گی۔

بعض ماہرین کا خیال ہے کہ ریاست کا مقتدر اعلیٰ قانونی طور پر تو لامحدود اختیارات کا مالک ہوتا ہے لیکن عملی طور پر اس پر کچھ پابندیاں ضرور ہوتی ہیں اندرونی طور پر اسے اخلاقی قوانین رسم و رواج اور روایات کا پابند ہونا پڑتا ہے اور خارجی تعلقات میں ایک ریاست کو بین الاقوامی قانون اور دوسری ریاستوں کے حقوق کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ لیکن یہ تمام پابندیاں ریاست کی حاکمیت یا اقتدار اعلیٰ اپنے اوپر خود عائد کرتا ہے اور خود ہی ختم کرتا ہے۔ ان پابندیوں کو ختم کرنے سے عوام بغاوت کر سکتے ہیں اور دو ملکوں کے درمیان جنگ چھڑ سکتی ہے۔

۲۔ ہمہ گیریت :

اقتدار اعلیٰ جامع ہوتا ہے اور ریاست کی حدود کے اندر تمام افراد اور ادارے اس کے ماتحت ہوتے ہیں۔ کوئی فرد یا ادارہ کسی وقت بھی اقتدار اعلیٰ کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا۔ اقتدار اپنی مرضی سے چاہے تو کسی فرد یا معاملے کو اپنے دائرہ اقتدار سے مستثنیٰ قرار دے سکتا ہے جیسے ملک کے اندر دوسرے ممالک کے سفارتکار اور سفارت خانے وغیرہ۔

۳۔ دائمی حیثیت :

اقتدار اعلیٰ ریاست کی دائمی خاصیت ہے جب تک ریاست کا وجود رہتا ہے۔ اقتدار اعلیٰ کا بھی وجود برقرار رہتا ہے۔ اقتدار اعلیٰ کی بنا پر ہی ریاست اور حکومت میں فرق کیا جاتا ہے ایک ریاست میں حکومت بدلتی رہتی ہے اور ریاست اپنی جگہ برقرار رہتی ہے بادشاہ صدر یا وزیر اعظم کے مرنے یا تبدیل ہونے سے ریاست کے تسلسل پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔

انگلستان میں بادشاہ کی وفات پر یہ فقرہ اسی لیے دہرایا جاتا ہے۔

"بادشاہ مرگیا بادشاہ زندہ باد"

اس کا مطلب یہ ہے کہ بادشاہ مر سکتا ہے لیکن بادشاہت ہمیشہ زندہ رہتی ہے۔

۴۔ یگانہ یا منفرد حیثیت:

اقتدار اعلیٰ ریاستی حدود میں اکلوتا اور یگانہ ہوتا ہے۔ یعنی ریاست میں ایک فرد یا جماعت کو یہ اختیار حاصل ہوتا ہے۔ جیسے ایک نیام میں دو تلواریں نہیں ہوسکتیں دو خداؤں کا تصور ناممکن ہے اس طرح ایک ریاست میں دو حاکم اعلیٰ نہیں ہو سکتے اقتدار اعلیٰ کی یہ خاصیت اس حقیقت پر مبنی ہے کہ ایک ریاست کے اندر دوسری ریاست نہیں بیٹھ سکتی۔

۵۔ ناقابل تقسیم:

کیلیٹل کہتا ہے کہ

"اگر اقتدار اعلیٰ مطلق نہیں ہے تو ریاست کا وجود برقرار نہیں رہ سکتا"

اگر اقتدار اعلیٰ کو تقسیم کر دیا جائے تو ایک ریاست ایک سے زیادہ ریاستوں میں تقسیم ہو جائے گی۔ بعض مفکرین نے وفاقی ریاست کے حوالے سے اقتدار اعلیٰ کی اس صفت پر اعتراض کیے ہیں۔ اس سلسلے میں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ وفاقی ریاستوں میں مرکز اور صوبوں کے مابین اختیارات کی تقسیم ہوتی ہے اقتدار اعلیٰ کی نہیں اقتدار اعلیٰ تو مطلق چیز ہے اور یہ ایک وحدت کی شکل میں ریاست کو حاصل ہوتا ہے۔

۶۔ ناقابل انتقال:

ریاست اپنا اقتدار اعلیٰ دوسری ریاست کو منتقل نہیں کر سکتی اگر وہ ایسا کرتی ہے تو اس کا لازمی نتیجہ ریاست کی موت ہوگا۔ اس کی مثال ایسی ہے جس طرح ایک شخص کی روح دوسرے شخص کو منتقل نہیں کی جاسکتی بالکل اسی طرح اقتدار اعلیٰ ریاست کی روح کی مانند ہے۔ تاہم اگر ریاست اپنے کسی مخصوص علاقے کو کسی دوسری ریاست کے سپرد کر دے تو اس سے ریاست کا مجموعی اقتدار اعلیٰ متاثر نہیں ہوتا جس طرح ۱۸۶۷ء میں زار روس نے اپنی سلطنت کا ایک صوبہ الاسکا

امریکہ کے حوالے کر دیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود زار کی سلطنت قائم رہی تھی۔ اسی طرح ۱۹۴۷ء میں برطانوی ہند کو تقسیم کر کے پاکستان اور ہندوستان دو آزاد ریاستیں قائم کی گئیں لیکن برطانوی سلطنت قائم رہی اس کا اقتدار اعلیٰ بھی قائم رہا اور پاکستان و ہندوستان کو آزادی کے بعد نئی حاکمیت حاصل ہوئی۔

۷۔ ناقابل زوال:

اقتدار اعلیٰ ایک ایسی وحدت ہے جس کو کبھی زوال نہیں آتا۔ چاہے ریاست اپنے اس حق کو استعمال میں لائے یا نہ لائے اس کے برعکس اگر کوئی ادارہ یا فرد اپنے حق کو نہ جتائے تو وہ حق ختم ہو جاتا ہے اور یہ حق اسے منتقل ہو جاتا ہے جو اسے استعمال میں لاتا ہے۔

مثلاً اگر کوئی ریاست پڑوسی ریاست کے کسی علاقے پر قبضہ کر لیتی ہے تو وہ اس علاقے پر اپنی حاکمیت کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ کیونکہ حاکمیت ناقابل زوال ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر گذشتہ چالیس سال سے بھارت نے کشمیر پر قبضہ جمایا ہوا ہے مگر اس قبضے سے بھارت کی حاکمیت ثابت نہیں ہوتی۔ اس کا فیصلہ رائے شماری کے ذریعے ہی ہوگا خواہ بھارت اس کو ٹالنے میں کتنی ہی مدت لگا دے۔

۲۔ ریاستی نظام کا ارتقاء:

سیاسی مفکرین ریاست کے ارتقاء کے بارے میں ارتقائی یا تاریخی نظریہ EVOLUTIONARY OR HISTORICAL THEORY کو درست تسلیم کرتے ہیں اس نظریہ کے مطابق ریاست نہ اللہ تعالیٰ نے تخلیق کی ہے اور نہ یہ محض جبر و قوت کا نتیجہ ہے یہ نہ محض خاندان کی توسیع شدہ شکل ہے اور نہ ہی یہ کسی معاہدے کے

ذریعے وجود میں آئی ہے۔ ریاست ایک طویل عرصے کے ارتقائی عمل کا نتیجہ ہے اس عمل میں کئی عوامل اور قوتوں نے مل کر حصہ لیا۔ مختلف ادوار میں مختلف مقامات پر مختلف عوامل نے مختلف کردار ادا کیا یہ عوامل حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ رشتہ داری ۲۔ مذہب ۳۔ قوت و جبروت

۴۔ معاشی ضروریات ۵۔ سیاسی شعور

اس نظریئے کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم ریاست کے ارتقاء کا جائزہ لیں گے۔
اس ارتقائی سفر کے دوران حسب ذیل قسم کی ریاستیں قابل ذکر ہیں:۔

۱۔ قدیم قبائلی معاشرہ اور ریاست
۲۔ قدیم مشرقی بادشاہتیں اور سلطنتیں
۳۔ قدیم یونان کی شہری ریاستیں
۴۔ قدیم سلطنت روما
۵۔ عہد وسطی کی جاگیردارانہ ریاست
۶۔ جدید قومی ریاست

۱۔ قدیم قبائلی معاشرہ اور ریاست:۔

ریاست کی ابتدا کے بارے میں صحت مند ریکارڈ کی عدم موجودگی کی وجہ سے ریاست کے ارتقاء کے عہد کا تعین ایک مشکل امر ہے۔ ماقبل از تاریخ کے انسان کے ہاتھوں کی بنی ہوئی پتھر کی اشیاء ہتھیار اور اوزار وغیرہ کی مدد سے آثار قدیمہ کے ماہرین نے قدیم انسان کے بارے میں معلومات حاصل کی ہیں یعنی قدیم انسان کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا بنیادی ماخذ اوزار ہی ہیں۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ قبل از تاریخ معاشرے میں ریاست و حکومت کا قطعی کوئی وجود نہ تھا انسان چند افراد پر مشتمل چھوٹے چھوٹے گروہوں کی صورت میں جنگلوں وادیوں اور میدانوں میں اپنی زندگی بسر کر رہے تھے۔ پانچ چھ ہزار سال قبل مسیح میں جب انسان نے

زراعت سیکھ لی اور جانوروں کو پالنا شروع کر دیا تو مادر سری معاشرہ پدر سری میں تبدیل ہوا اور مستقل طور پر قبائل کی بستیاں آباد ہونے لگیں۔ ہر قبیلے کا اپنا سربراہ ہوتا تھا جو اپنی سیاسی بصیرت کی بنا پر اس مقام تک پہنچا تھا۔ قبائلی معاشرہ بنیادی طور پر جنگجو معاشرہ تھا۔ اس وجہ سے قبائلی معاشرہ بادشاہت میں تبدیل ہو گیا اور ایک سیاسی تنظیم کے قیام کی راہ ہموار ہوئی۔ قبائلی سردار اس سیاسی تنظیم (ریاست) کا حاکم اعلیٰ یا بادشاہ بن گیا۔ ریاست بیک وقت جنگ کی بیٹی اور ماں ہے۔ بیٹی اس طرح کہ وہ جنگ سے پیدا ہوتی ہے اور ماں اس طرح کہ وہ جنگ کو جنم دیتی ہے۔ یہ صورت حال اس وقت تک جاری رہے گی جب تک ریاست کا وجود باقی ہے۔ ریاست کا سب سے اہم مقصد اپنے عوام کا جارحیت سے بچاؤ اور تحفظ ہے اس لئے جنگ ریاست کے لئے ڈھال بھی ہے اور تلوار بھی۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں کمزور ریاستیں ختم ہوتی رہتی ہیں اور نئی طاقت ور ریاستیں وجود میں آتی رہتی ہیں مثل مشہور ہے کہ "بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو کھا جاتی ہے"

۲۔ قدیم مشرقی بادشاہتیں اور سلطنتیں

آثار قدیمہ کے ماہرین کے۔ آر۔ ٹوڈ اور مسٹر واڈیا (کیمبرج ایکسپیڈیشن ۱۹۳۵ء) کے مطابق انسانی تہذیب کا ارتقاء ۵ لاکھ سال قبل قدیم پنجاب کی وادی سوہان (ضلع راولپنڈی اور اٹک) میں ہوا۔ یہ وادی دریائے ہرو اور دریائے سوہان کے کنارے واقع تھی وادی سوہان کی طرح مصر میں دریائے نیل کی وادی۔ عراق میں دجلہ و فرات کی وادیاں دریائے سندھ کی وادی قدیم ہند میں گنگا و جمنا کی وادی قدیم چین میں دریائے یانگسی اور دوسرے دریاؤں کی وادیاں قدیم تہذیب و تمدن کے گہوارے کہلاتی تھیں۔ بعد ازاں مصر عراق ایران ہندوستان اور چین میں عظیم بادشاہتیں اور سلطنتیں قائم ہوئیں۔ عوام بادشاہ کو خدا یا نیم خدا سمجھتے تھے۔ عوام حکمرانوں کی پرستش کو اپنا مذہبی عقیدہ سمجھتے تھے اور

ان کی پوجا کیا کرتے تھے یہ سلطنتیں سماجی طور پر مستحکم اور پائیدار ہوتی تھیں جس کی وجہ سے تہذیب و تمدن صنعت و حرفت اور کئی علوم و فنون نے بہت فروغ پایا۔ لیکن یہ ریاستیں سیاسی طور پر بہت کمزور اور ناپائیدار تھیں۔ ان میں ہر وقت سازشوں بغاوتوں خانہ جنگی اور بیرونی حملوں کا خطرہ رہتا تھا۔ حکمران کی وفات خانہ جنگی کا پیش خیمہ ہوتی تھی۔ اس لئے حکومت کی ساری طاقت زور و جبر اور ظلم و ستم سے امن و امان قائم رکھنے میں صرف ہو جاتی تھی۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ قدیم سلطنتوں کا جمود زدہ استبدادی نظام حکومت ایشیا اور افریقہ کے ممالک میں زمانہ قدیم سے زمانہ جدید تک جاری رہا۔ اگرچہ سلطنتیں اور بادشاہتیں بدلتی رہیں۔

۳۔ شہری ریاستیں :۔

قدیم مشرقی سلطنتوں کے برعکس قدیم یونان میں قبائلی ریاستیں پہلے شہری ریاستوں میں تبدیل ہوئیں اور کئی صدیوں تک یہ شہری ریاستیں قائم رہیں۔ ان شہری ریاستوں میں بسنے والے افراد بیشک مشترکہ رسم و رواج رکھتے تھے لیکن سیاسی طور پر وہ ایک دوسرے سے بالکل آزاد تھے۔ یہ شہری ریاستیں خود کفیل تھیں اور اپنا علیحدہ علیحدہ نظام حکومت رکھتی تھیں۔ جس سے یونانیوں کو طرز ہائے حکومت کا تقابلی مطالعہ کرنے کا موقعہ ملا۔ یونانیوں کے ہاں علم سیاسیات کے فروغ کی دوسری وجہ یہ تھی کہ وہاں علم سیاسیات فلسفہ اخلاق پر مبنی تھا۔ قانون سے وہ صرف واقف ہی نہ تھے بلکہ اُس کا احترام کرنا بھی جانتے تھے۔

افلاطون (۴۲۷ تا ۳۴۷ ق م) اپنی کتاب الجمہوریہ REPUBLIC میں اگرچہ یونانی معاشرت اور مملکت کے فرق کو واضح نہیں کرتا۔ لیکن اس کے باوجود نظام حکومت، آزادی، جمہوریت اور شہری کا تصور ہمیں یونان ہی سے ملا ہے۔ آج بھی مغربی افکار پر یونانی فکر کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں۔ یونانی اپنے آپ

کو "مہذب لوگ" خیال کرتے تھے اور اپنے گردونواح کی تمام قوموں کو باربیرین یعنی وحشی تصور کرتے تھے۔ یعنی یونانیوں کے ہاں نسلی برتری کا تصور پایا جاتا تھا۔ ان ریاستوں میں سفارتی تعلقات قائم ہونے کے باوجود دوستی کا فقدان تھا۔ مختلف شہری ریاستیں ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار رہتی تھیں۔ وہ کبھی بھی متحد ہو کر ایک "عظیم یونانی ریاست" نہ بن سکیں۔ ان کے نہ ختم ہونے والے جھگڑوں اور جنگوں نے پہلے مقدونیہ کے بادشاہ فلیپس اور سکندرِ اعظم کو اور بعد ازاں سلطنت روما کو انہیں فتح کر لینے کی راہ دکھائی۔ جس سے ان سب کی آزادی اور خودمختاری ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی اور قدیم یونانی شہری ریاستوں کا دور ختم ہوا۔

۴۔ قدیم سلطنت روما:

قدیم یونان کی طرح قدیم اطالیہ (اٹلی) میں بھی مختلف قبائلی شہری ریاستیں قائم تھیں۔ اِن میں روم کے شہر کی ایک ایسی شہری ریاست تھی جسے تقریباً ایک ہزار سال قبل مسیح میں لاطین قبیلے نے آباد کیا تھا۔ ابتدا میں یہ بادشاہت تھی مگر پانچ سو سال قبل مسیح میں یہ جمہوریہ بن گئی۔ چار سو سال بعد اس شہری ریاست نے یورپ، مغربی ایشیا اور شمالی افریقہ کے متعدد ممالک فتح کر کے ایک عظیم سلطنت قائم کی رومی جمہوریہ کا خاتمہ ہو گیا اور اعلیٰ اختیارات فردِ واحد کے ہاتھوں میں مرکوز ہو گئے جسے حروفِ عام میں قیصر یا شاہنشاہ کہا گیا۔ یہ سلطنت تقریباً پانچ سو سال قائم رہی۔ تاریخ انسانی میں سلطنت روما پہلی ریاست تھی جس نے قانون کی حکمرانی اور بالادستی کے اصولوں کو واضح کیا۔ اِن کو مضبوط اور مستحکم بنیادوں پر استوار کیا۔ رومن قانون اقوام نے جدید قانون بین الاقوام میں اور قانون فطرت نے جدید بنیادی حقوق کے تصورات کے ارتقاء میں مدد دی۔ سلطنت روما کا ایک کارنامہ "رومی نظم و نسق" بھی تھا۔ جس کی بدولت سلطنت کے یورپی۔ ایشیائی اور افریقی صوبوں میں خوشحالی کا دور دورہ ہوا۔ اِن تمام خوبیوں کے باوجود

سلطنت روما کے سیاسی نظام میں بعض نقائص بھی تھے۔ مثلاً شہریوں کی سیاسی آزادیوں اور مقامی خودمختاری کو نیست و نابود کیا گیا تھا۔ ساری سلطنت بے رحم اور سنگدل حکمرانوں کے ماتحت آگئی تھی۔ جس نے عوام پر مختلف ٹیکسوں کا بوجھ لاد دیا۔ اِس استبدادیت سے نجات حاصل کرنے کے لئے چاروں طرف سے قبائل نے حملہ کر دیا۔ یورپ کے شمال سے جرمن قبائلی حملہ آوروں نے ۴۷۶ء میں شہر روم پر قبضہ کر کے سلطنت کے یورپی صوبوں میں اپنی قبائلی بادشاہتوں کا اعلان کر دیا۔ سلطنت روما کا خاتمہ ہُوا۔ یورپ میں عہد وسطی کی جاگیرداریت کا آغاز ہُوا۔

۵۔ عہد وسطی میں یورپ کی جاگیردارانہ ریاستیں :۔

جاگیرداریت مسلح زمینداروں کے ایسے سیاسی و سماجی نظام کو کہتے ہیں جس میں وہ اپنی فوجی برتری اور قوت کے سہارے اپنی زمینوں پر قبضہ اور تصرف قائم کرتے ہیں۔ اپنا قانون اور حکم چلاتے ہیں۔ جاگیردارانہ نظام ریاست FEUDAL STATE SYSTEM یورپ میں تقریباً ایک ہزار سال (۵۰۰ء سے ۱۵۰۰ء) تک قائم رہا۔ اِس دور میں یورپی جاگیردارانہ ریاست نے متعدد سیاسی، اقتصادی، سماجی اور تمدنی کمالات اور تکمیلات حاصل کیں۔ مثلاً:

i۔ اس جاگیرداریت نے یورپ کی سرزمین سے صدیوں پُرانے قبائل اور قبل از تاریخ معاشرے کی گروہ بندیوں اور لوٹ مار کا قلع قمع کر دیا۔ بیرونی قبائل اور دوسرے حملہ آوروں مثلاً اسپین کے عرب اور بربر قبائل، شمالی یورپ کے وائیکنگ، ہن اور منگول قبائل کے حملوں کی کامیابی سے مدافعت کی اور یورپ کی سرزمین کو بیرونی حملہ آوروں سے محفوظ کر لیا۔

ii۔ براعظم یورپ میں ایسا امن و امان قائم کیا جس سے بتدریج تجارت اور صنعت و حرفت کو دوبارہ فروغ حاصل ہُوا۔ یورپ ترقی و خوشحالی کی شارع

پرگامزن ہوگیا۔

iii۔ اس نظام نے علاقائی علیحدگیوں کا خاتمہ کر دیا۔ جاگیردار طبقے نے کلیساء کے ساتھ مل کر ایسی تہذیب و تمدن اور نظریہ حیات کو جنم دیا جس میں قبائل، ذات پات کی تقسیم، علیحدگی کے تصورات اور عقائد کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔ اس سے زبان اور قوم کی بنیاد پر قومی شعور اور قومی وفاداری کی بنیاد پڑی۔ اس نئے طرزِ فکر سے ایک طرف جاگیرداریت کا خاتمہ ہوا اور دوسری طرف اس نے قومی ریاست کو جنم دیا۔ یہاں یہ امر دلچسپی سے خالی نہیں کہ یورپی جاگیردارانہ ریاست کے ہمعصر مشرقی ممالک کی نیم جاگیردارانہ اور نیم قبائلی بادشاہتیں اور سلطنتیں مثلاً عباسی خلافت یا سلجوقی بادشاہت یا چنگیز خان کی منگول سلطنت یا ہندوستان کے راجپوت اور دوسرے راجاؤں کی حکومتیں یا دہلی کے سلاطین یا مغل شاہنشاہوں کی سلطنتیں کوئی بھی یہ تکمیلات اور کمالات حاصل نہ کر سکیں۔ بلکہ مشرقی اقوام کسی حد تک قبائلیت اور استحصالی جاگیردارانہ ریاست کے پیدا کردہ انتشار، جمود اور افراتفری کی دلدل میں دھنسی ہوئی ہیں۔

چودھویں صدی میں یورپ کی "فیوڈل ریاست" زوال پذیر ہونا شروع ہوگئی اور مزید دو صدیوں میں اِن کا بیشتر یورپی ممالک سے خاتمہ ہوگیا۔

جاگیردارانہ ریاستوں کے خاتمہ کے اہم اسباب حسب ذیل تھے:۔

i۔ اس نظام نے انگلستان، فرانس، اٹلی، جرمنی، بلجیم اور ہالینڈ وغیرہ میں امن عامہ کو کافی مستحکم کر دیا۔ ان ممالک میں تجارت کو فروغ حاصل ہونے سے نئے طبقے وجود میں آگئے۔ جو جاگیرداروں کی جنگجوانہ پالیسی سے نفرت کرتے تھے یہ نئے طبقے اپنی تجارت کے فروغ کے لئے سرمایہ کاری کے بہتر مواقع کے لئے ایک مضبوط مرکزی حکومت چاہتے تھے۔

ii۔ اس نظام پر مہلک اور کاری ضرب توپ اور بندوق کے استعمال سے بھی لگی۔ جاگیردار مسلح زمیندار تھا جو شمشیر زنی اور شہسواری کا دھنی تھا لیکن

توپ اور بندوق کی ایجاد سے عام سپاہی فیوڈل لارڈ FEUDAL LORD کو شکست دینے میں کامیاب ہو گئے۔

iii۔ جاگیرداروں میں بھی ایسے لوگ پیدا ہو گئے جو اپنی جاگیروں کو دفاعی مقاصد کے بجائے زرعی پیداوار بڑھانے اور منافع کمانے کے لئے وقف کرنے لگے اس سے یورپی جاگیرداریت زرعی سرمایہ کاری میں تبدیل ہو گئی اور یورپی فیوڈلزم اپنی موت آپ مر گیا۔

ان تغیرات کے علاوہ پندرھویں اور سولھویں صدیوں میں کئی اور واقعات بھی رونما ہوئے جنہوں نے جاگیرداریت کو خاتم کرنے میں اور قومی ریاست کی ظہور پذیری میں مدد دی۔

قومی ریاست:۔

سیاسی مفکرین میں میکاولی (۱۴۶۹ء سے ۱۵۲۷ء) پہلا شخص ہے۔ جس نے جدید قومی ریاست کا تصور پیش کیا۔ اس کی مجموعی فکر میں قوم پرستی اور حب الوطنی کا عنصر غالب ہے۔ جدید قومی ریاست کا ارتقاء پندرھویں صدی میں مغربی یورپ کے دو ممالک انگلستان اور فرانس سے ہوا ان دونوں ممالک میں ان کی صد سالہ جنگ (۱۳۳۷ء تا ۱۴۵۳ء) کے نتیجے میں قومی خودداری ابھر کر سامنے آئی۔ سولہویں اور سترھویں صدی میں باہمی جنگوں کے باعث اسپین، پرتگال اور ہالینڈ وغیرہ قومی ریاستیں بن گئے۔ ان کے بعد شمالی یورپ میں سویڈن، ڈنمارک، ناروے اور سوویت یونین بھی قومی ریاستیں بن گئے۔ انیسویں صدی میں اٹلی اور جرمنی بھی قومی ریاستیں بن گئے۔ پہلی عالمی جنگ ۱۹۱۴-۱۹ء کے بعد سارا یورپ قومی ریاستوں میں تبدیل ہو گیا۔ یورپ کی مثال اور اثرات کے باعث شمالی اور جنوبی امریکہ میں کینیڈا اور امریکہ سے لے کر ارجنٹائن اور برازیل تک قومی ریاستیں قائم ہو گئیں۔ انیسویں صدی کے آخر میں ایشیا میں سب سے پہلے جاپان کی قومی ریاست

وجود میں آئی ۔ دوسری عالمی جنگ ۴۵-۱۹۳۹ء کے بعد ایشیا اور افریقہ میں قومی ریاستوں کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے ۔ آج ایشیا میں ۳۵ اور افریقہ میں ۵۲ قومی ریاستیں قائم ہو چکی ہیں ۔

قومی ریاست کے تصور نے انسانی معاشرے کو ایک نئی تنظیم اور نئی روح عطا کی ہے ۔ قومی ریاست کے قیام سے قبل انسانی معاشرے کی تنظیم قبیلوں ، ذات پات اور برادری جیسی مقامی جمیعتوں اور گروہوں کی صورت میں ہوتی تھی ۔ جو اپنے الگ الگ مفادات اور وفاداریوں کی حامل ہوتی تھی ۔ اس لئے معاشرہ چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بٹا ہوا ہوتا تھا ۔ جس کو "ریاستی طاقت" کے ذریعے متحد رکھا جاتا تھا تاکہ سماجی ضروریات اور احتیاجات کی تکمیل کے لئے امن وامان قائم رہے ۔ تاہم قومی ریاست کے وجود میں آنے سے قبل ریاستیں اِن مسائل کو حل نہیں کر پاتی تھیں جبکہ قومی ریاست نے اس مسئلہ کو مستقل طور پر حل کر دیا ۔ قومی ریاست سے قبل ریاستوں میں حاکم اور محکوم میں صرف سیاسی غلبے اور محکومی کے تعلقات ہوتے تھے ۔ اکثر حکمرانوں اور محکوم لوگوں یا رعایا کی زبان مذہب اور تہذیب و تمدن مختلف ہوتے تھے حکمران عموماً غیر ملکی حملہ آوروں کی اولاد ہوتے تھے ۔ جو اپنی فوجی برتری کی بدولت حکمرانی قائم رکھتے تھے ۔ قومی ریاست نے اس سیاسی تفریق اور تضاد کو ختم کر دیا اس میں حکمران طبقہ ملک و قوم ہی سے پیدا ہوتا ہے ۔ اپنی قوم کے جذبات اور مفادات کی ترجمانی کرتا ہے ۔ حکومت عوام کے ووٹوں سے برسر اقتدار آتی ہے اور عوام کی مرضی سے ہی برسر اقتدار رہتی ہے ۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ جمہوریت اور قومی ریاست لازم و ملزوم ہیں ۔ قومی ریاست کے قیام اور تسلیم کرنے کے لئے دو اصول بڑے اہم ہیں :-

ا ۔ قومی ریاستوں کی خود مختاری اور حاکمیت کا اصول ۔

ب ۔ قومی ریاستوں کی مساویانہ بین الاقوامی حیثیت کا اصول

اِن اصولوں کے مطابق ہر قومی ریاست اندرونی اور بیرونی طور پر آزاد اور

خود مختار حاکمیت کی مالک ہوتی ہے۔ قانون بین الاقوام میں بڑی اور طاقتور ریاستیں چھوٹی اور کمزور ریاستوں کے برابر تصور کی جاتی ہیں۔ لیکن بین الاقوامی تعلقات میں عملاً اِن اصولوں کی نفی کی جاتی ہے اور ایک طاقتور قومی ریاست قرب وجوار کی چھوٹی اور کمزور ریاستوں پر اپنی چودھراہٹ قائم کرنے کی کوشش کرتی ہے تاکہ اس کا معاشی اور تمدنی استحصال کیا جائے۔ اس طرح ایک طاقتور قومی ریاست ایک سامراجی اور نوآبادیاتی سلطنت بن جاتی ہے۔ نئی استعماریت کی مثالوں سے زمانہ جدید کی تاریخ بھری پڑی ہے۔

۳۔ قوم پرستی یا جذبہ قومیت

NATIONALISM

تعریفیں :۔

" قوم پرستی ایک جذباتی کیفیت کو کہتے ہیں جس کے باعث کوئی فرد خود کو اپنی قومی ریاست کی وفاداری کی انتہا پر محسوس کرتا ہے"

" قوم پرستی ایک روحانی جذبہ ہے جو لوگوں کی ایک ایسی تعداد کے اندر پیدا ہو جاتا ہے۔ جو ایک خاص خطّہ زمین میں رہتے ہوں اور جن میں ایک ہی زبان ایک ہی مذہب یکساں تاریخ و روایات ، مشترک اغراض و مقاصد اور مشترک سیاسی میل جول اور مطمع نظر موجود ہو" گلکرائسٹ

" قومیت سے مراد ایسی آبادی ہے جو بعض رشتوں مثلاً زبان، ادب، افکار اور رسم و رواج کی بنا پر کچھ اس طرح متحد ہو کہ خود کو ایک مربوط وحدت محسوس کرے اور جسے دوسری آبادیوں سے جو اس طرح کے رشتے میں منسلک ہوں ممیز کیا جا سکے" لارڈ برائس

قوم پرستی کی مختصراً یہ تعریف کی جا سکتی ہے :۔

" قومیت ایک قوت ہے جو ایک مخصوص و معین علاقے کے لوگوں کو باہم متحد کرتی ہے ۔ تاکہ وہ اپنے اندرونی و بیرونی حقوق کا تحفظ کر سکیں"

قوم پرستی کے عناصر :۔

ELEMENTS OF NATIONALISM

۱۔ مشترکہ سکونت یا وطن

۲۔ مشترکہ نسل یا نسل پرستی

۳۔ مشترکہ زبان و ادب

۴۔ مشترکہ ثقافت
۵۔ مشترکہ مذہب
۶۔ قومی اتحاد کا جذبہ
۷۔ توسیع پسندی کے عزائم
۸۔ قومی ریاست کا تصور
۹۔ جذبۂ آزادی و ہم خیالی
۱۰۔ مشترکہ مفادات سیاسی تجربات جذبات اور اُمیدیں۔

قوم پرستی کی تاریخ:۔ HISTORY OF NATIONALISM

دراصل قوم پرستی کی تاریخ قومی ریاستوں کے عروج وارتقاء کی تاریخ ہے۔ اس کی ابتداء تقریباً پندرھویں صدی میں مغربی یورپ کے دو ممالک فرانس اور انگلستان سے ہوئی۔ ان دونوں ممالک کے درمیان صد سالہ جنگ ۱۳۳۷ء۔ ۱۴۵۳ء HUNDRED YEAR WAR کے نتیجے میں قومی ثقافت و زبان وغیرہ سے قومی جذبات اُبھر گئے۔ جو قرون وسطی کے عیسائی نظریات کے مخالف تھے۔ جب یہ جذبات زور پکڑ گئے تو یہ دونوں ممالک قومی ریاستیں بن گئے۔ چودھویں صدی میں جب یورپ میں مذہبی جنگیں شروع ہوئیں تو اسپین اور ہالینڈ بھی قومی ریاست بن گئے تھے۔ دو قومی ریاستیں بن گئیں یہ عمل جاری رہا۔ حتیٰ کہ اٹھارویں صدی تک تقریباً سارا مغربی اور وسطی یورپ قومی ریاستوں میں بٹ گیا۔ اٹھارویں صدی کے آخر میں انقلاب فرانس واقع ہوا۔ جس کے نتیجے میں قوم پرستی کی لہر مشرقی یورپ اور جنوبی یورپ میں بھی پھیل گئی۔

موجودہ صدی میں یورپ سے باہر ترکی عرب۔ چین۔ جاپان۔ برطانوی ہند اور دیگر ممالک بھی قوم پرستی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ جنگ عظیم اول میں یورپی سامراجی طاقتوں کو پہلا زبردست جھٹکا لگا اور وہ قدرے کمزور پڑ گئیں جس کی وجہ سے براعظم ایشیاء اور افریقہ میں چند قومی ریاستیں وجود میں آئیں۔ جن میں چین ترکی اور مصر قابل ذکر ہیں۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد یورپ اور امریکہ کی سامراجی طاقتوں

کی عالمگیر قوت بھی ختم ہونے لگی۔ جن طاقتوں اور ملکوں پر انہوں نے اپنی سامراجیت قائم کی ہوئی تھی۔ وہ ایک ایک کر کے ان سے آزاد ہو کر خود مختار ریاستیں بننے لگیں آج دنیا میں اقوام متحدہ کی ممبر ۱۵۹ ریاستیں موجود ہیں۔

قوم پرستی اور بین الاقوامی تعلقات :۔

زمانہ جدید میں قوم پرستی مذہب کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کا غلط استعمال ہمیں سامراجیت، استعماریت کی طرف لے جاتا ہے۔ اس کا مناسب استعمال قوموں کی آزادی اور اقتدار اعلیٰ کا نقیب ہے۔ برطانیہ میں اس تصور کی بدولت لوگوں نے انفرادی آزادی کی قدر و قیمت سمجھ لی۔ اس کے حصول کے لئے کلیساء کے لامحدود اختیارات سے مقابلہ کیا۔ صنعتی انقلاب کے بعد اس جذبے سے سرشار ہو کر برطانوی قوم نے دوسری اقوام پر اپنی برتری قائم کرنا شروع کر دی۔ اپنا گھر بھرنے کے لئے دوسروں کے گھروں میں ڈاکے ڈالنے شروع کر دیئے۔ کیونکہ قوم پرستی کے جذبے سے صرف اور صرف یہی جذبہ اور خیالات پیدا ہوئے تھے کہ ہم سب سے بہتر ہیں۔

برطانوی جذبات کے اثرات جب فرانس میں پہنچے تو انہوں نے بھی جذبہ قومیت کے نشہ سے سرشار ہو کر انفرادی آزادی کے لئے موثر آواز اٹھائی حتیٰ کہ ۱۷۸۹ء میں انقلاب فرانس رونما ہوا۔ فرانس میں صحیح معنیٰ میں جذبہ قومیت کی ابتدا انقلاب سے ہی شروع ہوتی ہے۔ فرانس کے تاریخ دان بچوں کو پڑھاتے تھے کہ

"فرانس ہی ہمیشہ انسانی ترقی کی صف میں آگے رہا ہے۔ اس نے آزادی مساوات اور اخوت کے اصولوں کو دنیا تک پہنچایا ہے۔"

جرمنی میں یہ تعلیم دی جانے لگی کہ :

"جرمن قوم تو اپنی اخلاقی پاکبازی کے لئے جیولیس سیزر کے وقت سے مشہور ہے۔ اور جرمن لوگ خدا کے منتخب بندے ہیں۔ جن کا مقصد دنیا کو اعلیٰ تہذیب سکھانا ہے۔"

اہل انگلستان نے اپنی نسلوں کو یہ درس دیا۔

"انگلستان ہی نے سب سے پہلے انفرادی آزادی اور پارلیمانی طرز حکومت قائم کیا۔ اس کے یہاں سب سے پہلے صنعتی انقلاب آیا۔ مشینری کی مدد سے اس نے دنیا کی تاریخ بدل ڈالی۔"

اٹلی بھی قوم پرستی کے درس میں کسی سے پیچھے نہ رہا۔ چنانچہ اپنے بچوں کو فخر سے پڑھانے لگا۔

"روم نے صدیوں تک دنیا کی طاقتوں اور ان کے قلوب پر حکومت کی اور موجودہ اٹلی روم کی پرانی روایات اور وقار کو حاصل کرنے میں مصروف ہے۔"

اس سارے درس کا بنیادی مقصد اپنی قوم کو دوسری اقوام سے جنگ کے لئے تیار کرنا تھا۔ عام خیال یہ تھا کہ دوسروں پر بالادستی صرف جنگ کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ خود ولیم قیصر کے یہ الفاظ اسی حکمت عملی کی ترجمانی کرتے ہیں۔

"دائمی اور مستقل امن ایک خواب کی طرح ہے اور یہ کوئی دلفریب خواب بھی نہیں ہے۔ دنیا کے کاروبار میں جنگ بھی ایک ضروری چیز ہے۔ خدا خود اس کا موجد اور جاری کرنے والا ہے۔ بغیر جنگ کے دنیا کی ترقی رک جائے گی اور اس پر جمود طاری ہو جائے گا۔"

جنگ عظیم اوّل کے بعد جذبہ قومیت :-

جنگ عظیم اوّل کے کچھ عرصہ پہلے یہ خیال کیا جاتا تھا کہ قوم پرستی کے جذبات ٹھنڈے پڑ رہے ہیں اور بین الاقوامیت کا دور شروع ہو رہا ہے لیکن ۱۹۱۴ء کی عالمی جنگ نے ثابت کر دیا کہ یہ جذبہ اپنی مخصوص اہمیت کے ساتھ قائم ہے ۱۹۱۹ء میں پیرس امن کانفرنس منعقد ہوئی جس میں مفتوح اقوام سے زندہ رہنے کا حق چھین لیا گیا۔ جس سے جذبہ قومیت اور جمہوریت کے درمیانی تعلق "آزادی" کے تصور کا خاتمہ ہو گیا اور قوم پرستی میں ایک بار پھر شدت پیدا ہو گئی۔ اٹلی میں مسولینی اور جرمنی میں ہٹلر کی قیادت میں گمراہ کن تصورات سامنے آئے۔ اور انسانیت کو صرف بیس سال بعد دوسری عالمگیر جنگ کا سامنا کرنا پڑا۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد جذبہ قومیت :-

دوسری عالمگیر جنگ کے بعد تقریباً تمام اقوام میں یہ احساس بیدار ہو چکا ہے کہ انتہا پسند قومیت کی گرفت سے اپنے آپ کو نکالنا چاہیئے۔ قومی برتری اور بڑائی کے پرانے اور روایتی طرز عمل سے کنارہ کشی کی جائے۔ پرانی دشمنیوں کو بھول جایا جائے اتحاد و تعاون کے لیے نئی راہوں کا تعین کیا جائے۔ جس میں عالم اقوام میں قومیت کی شدت کے بجائے بین الاقوامی اتحاد اور ترقی کا احساس اُجاگر ہو۔ آج مدبرین اور ماہرین سیاسیات کے سامنے جذبہ قومیت کو کنٹرول کرنے کا مسئلہ درپیش ہے اس مقصد کے لئے اکتوبر ۱۹۴۵ء کو انجمن اقوام متحدہ کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اقوام کے مابین جنگ اور تصادم کی صورت میں اقوام متحدہ کو مؤثر کارروائی کرنے کے اختیارات دیئے گئے۔

ریاستوں کے درمیان باہمی اختلافات کو دور کرنے کے لئے بین الاقوامی عدالت انصاف کا قیام عمل میں لایا گیا۔ لیکن اس کے باوجود قومیت کی ترقی پرانے خطوط پر ہونا شروع ہو گئی۔ دنیا میں ۱۷۰ کے قریب آزاد اقوام کسی نہ کسی طرح سے جذبہ قومیت کے وجود کی قوت کا اظہار کر رہی ہیں۔ اسی جذبے کی وجہ سے دنیائے انسانی چھوٹے چھوٹے حصوں میں بٹ گئی ہے۔ اگر حقیقی سیاسی حالات کا جائزہ لیا جائے تو جذبہ قومیت کی بنا پر ریاستوں کے قیام نے دنیا میں قومی انتشار پھیلایا ہے مثلاً یورپ کے چھوٹے سے براعظم میں ۲۹ ملک بن گئے ہیں۔ جن میں بعض کی آبادی اور رقبہ پاکستان کے ایک ضلع سے بھی کم ہے۔ دنیا کے اس طرح حصے بخرے کرنے سے قدرتی وسائل بھی ضائع ہوتے ہیں۔ جنگ پرستی اور قومی منافرت پھیلتی ہے امن عالم خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ قومیت کی بنیاد پر ریاستوں کی تقسیم کے بارے معاشی رپورٹ کہتی ہے " معاشی حالات اس قدر ترقی نہیں کر رہے جس قدر آبادی بڑھ رہی ہے۔ "

اس طرح قومی ریاستوں کی سرحدیں سکڑ رہی ہیں۔ ان سکڑتی سرحدوں نے انسانی تہذیب امن اور سلامتی کے لئے خطرہ پیدا کر دیا ہے۔ قومی منافرت اور

تعصب کے باعث دنیا خطرناک حد تک جنگی تیاریوں میں مشغول ہے چونکہ چھوٹی اقوام بڑی اقوام کا مقابلہ نہیں کر سکتیں اور یہ چھوٹی اقوام بڑی اقوام کی غلامی میں جا رہی ہیں۔ جسے ہم اصطلاحاً نئی استعماریت NEO-COLONIALISM کہتے ہیں۔ مثلاً افغانستان پر روسی قبضہ۔ کمپوچیا پر ویت نامی جارحیت وغیرہ

قوم پرستی مختلف زمانوں میں مختلف علاقوں میں مختلف شکلوں میں ظاہر ہوئی مثلاً استعماریت شہنشاہیت۔ نوآبادی نظام۔ سرمایہ داری، اشتراکی نظام نازی تحریک، فاشی تحریک اور قوموں کے حق خود ارادیت وغیرہ کی تحریکیں ایسی ہیں جن کے پیچھے کسی نہ کسی طرح سے جذبہ قومیت کا تصور رہا ہے ان سب تحریکوں نے دنیا پر مثبت کم اور منفی اثرات زیادہ چھوڑے ہیں۔ اسی لئے ایک ہندوستانی شاعر اور مفکر نے کہا تھا :-

"جذبہ قومیت ایک فتنہ ہے :"

ہائیز HAYES نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے۔

"جذبہ قومیت ایک گالی ہے اور گالی کے سوا کچھ نہیں۔"

جذبہ قومیت کی روک تھام :-
RESTRICTIONS ON NATIONALISM

بین الاقوامی تعلقات پر جذبہ قومیت کے اثرات تباہ کن ثابت ہوئے ہیں اس لئے بین الاقوامی تعلقات کی بہتری اور انسانی بقاء کے لئے ضروری ہے کہ ایسی قومیت کا خاتمہ کر دیا جائے جس کا مقصد اقوام عالم کو مسلح کر کے ایک دوسرے کے خلاف برسرپیکار کرنا ہو۔ ہم جانتے ہیں کہ کس طرح قرون وسطیٰ میں تہذیب نے جاگیرداری نظام کی روک تھام کا مطالبہ کیا تھا۔ آج اس سے بھی بڑے پیمانے پر اس بات کی ضرورت ہے۔ کہ تہذیب کی بقاء کے لئے قومیت کی روک تھام کی جائے۔ ہمیں اس وقت ایک عالمی وفاداری اور ایک عالمی خدمت گزاری کی ضرورت ہے اور اگر انسانی جذبہ جنگ کو امراض افلاس عدم مساوات اور ناانصافی کے خلاف جنگ کرنے میں لگا دیا جائے تو یہ امید کی جاتی ہے۔ کہ دنیا میں نہ صرف امن ہوگا بلکہ انسانیت کی سلامتی خوش حالی اور آزادی کو بھی

بے پناہ وسعت دی جا سکے گی۔

جذبہ قومیت کی روک تھام کے لیے ماضی میں حسب ذیل اقدامات کیے گئے۔

جذبہ قومیت کی روک تھام کے اقدام

۱- توازن طاقت BALANCE OF POWER

جذبہ قومیت کو روکنے کے لئے توازن طاقت بہت ہی پرانا عنصر ہے اس نظریے کو چار سو سال قبل مسیح ———— میں اپنایا گیا۔ مگر سلطنت روما میں یہ نظریہ ختم ہو گیا۔ پندرہویں اور سولہویں صدی میں اس نظریے کی ازسر نو تشکیل کی گئی۔ برطانوی بادشاہ ہنری ہشتم ۱۵۰۹ - ۴۴ء کے طاقت ور وزیر کارڈنیل ولذی کے متعلق مورخین کا خیال ہے کہ اس نے انگلستان کے امور خارجہ

کو اسی اصول پر چلایا تھا۔ اس نظریہ نے یورپ کی تیس سالہ جنگ ۱۶۱۸ء۔۴۸ جس کے بعد معاہدہ ویسٹ فیلیا کے ذریعے یورپ کی سرحدیں متعین کی گئی۔ سات سالہ جنگ ۱۷۵۶ء۔۶۳ جس میں برطانیہ اور پروشیا فرانس کے خلاف متحد ہوئے فرانسیسی کش مکش ۱۷۹۲ء۔۱۸۱۵ء جو انقلابیوں اور نپولین کے مابین رہی۔ اس کے علاوہ دیانا کانگریس ۱۸۱۵ء کے فیصلوں میں بھی اس نظریے نے اہم کردار ادا کیا۔ اس کے بعد توازن طاقت کا نظریہ برطانوی اختیار سے نکل کر پوری دنیا میں پھیل گیا۔ اسی توازن کے بگڑنے سے ۱۹۱۴ء کو پہلی عالمی جنگ کا آغاز ہوا۔ اس کی زندہ مثال روس کے حکمراں زار نیکولاس دوم کا برطانیہ کے بادشاہ جارج پنجم کے نام وہ تار ہے جو اس نے ۲ر اگست ۱۹۱۴ء کو آسٹریا کی طرف سے سرویہ کو الٹی میٹم دیئے جانے کی اطلاع ملنے کے بعد بھیجا تھا۔ تار میں لکھا تھا۔

> "اس اقدام کا مقصد سرویہ کو فتح کر کے آسٹریا میں شامل کرنا ہوگا جس کے نتائج یہ برآمد ہوں گے کہ بلقان میں توازن طاقت بگڑ جائے گا۔ جو کسی ریاست کے خاص مفاد کے علاوہ ان طاقتوں کے مفاد کے خلاف بھی ہے جو یورپ میں امن بحال کرنا چاہتی ہیں، اس لئے مجھے قوی امید ہے کہ آپ کا ملک یورپ میں توازن طاقت برقرار رکھنے کے لئے لڑنے والے ممالک فرانس اور روس کی حمایت سے گریز نہیں کرے گا۔"

عالمی جنگوں کے درمیانی عرصے ۱۹۱۹ء۔۳۹ میں توازن طاقت کے نظریے پر عمل درآمد ہوتا رہا۔ مگر ہٹلر کے برسر اقتدار آنے کے بعد یہ توازن بگڑنا شروع ہو گیا۔ جس سے دوسری عالمگیر جنگ کا آغاز ہوا۔

غرض کہ توازن طاقت نے قومی خود غرضی کو روکنے کے لئے اہم کردار ادا کیا ہے۔ مگر بعض اوقات اس تصور نے بے لگام قومیت کی برائیوں کو روکنے کے بجائے انہیں تقویت بھی پہنچائی ہے۔

۲۔ اتحادات :۔ ALLIANCES

توازن طاقت کی حکمت عملی کو برقرار رکھنے اور قومیت کی شدت میں کمی کرنے میں سترہویں صدی کے آخری زمانے کے اتحادات نے اہم کردار ادا کیا ہے ان میں پردستیا، آسٹریا ہنگری اور روس کے مابین بادشاہوں کی مجلس ۱۸۷۳ء سب سے اہم ہے یہ مجلس ۱۸۸۶ء میں بلغاریہ کے مسئلے پر روس اور آسٹریا کے واضح اختلافات کی وجہ سے ٹوٹ گئی۔ جنگ کے خطرے کو کم کرنے کیلئے بسمارک نے روس اور آسٹریا کا معاہدہ کروادیا جس سے روس اور فرانس کے اتحاد کا معاملہ بھی ختم ہوگیا۔

جرمنی آسٹریا اور اٹلی کے درمیان ۱۸۸۲ء میں سہ گانہ اتحاد قائم ہوا۔ اس معاہدے میں اٹلی کو فرانس سے تحفظ ملا۔ جرمنی اور آسٹریا پر روس حملہ ہونے کی صورت میں اٹلی مدد دینے کا پابند ہوا۔

فرانس اور روس کا اتحاد ۱۸۹۳ء میں ہوا۔ اس کے تحت اگر جرمنی فرانس پر حملہ کرے یا اٹلی جرمنی کی حمایت سے ایسا کرے تو روس جرمنی کے خلاف لڑے گا اس معاہدے سے یورپ میں توازن طاقت قائم ہوا۔

برطانیہ فرانس اور روس کے درمیان ۱۹۰۷ء میں "ثلاث ثلاثہ TRIPLE ENTETE کا معاہدہ ہوا۔ یہ معاہدہ اتحاد ثلاثہ TRIPLE ALLIANCE (جرمنی اٹلی اور آسٹریا) کے جواب میں تشکیل پایا تھا۔ ان دونوں معاہدوں میں برطانیہ اور جرمنی اپنے اپنے گروہوں کے سربراہ تھے۔ ان اتحادات کی بدولت یہاں توازن طاقت قائم ہوا۔ وہاں خفیہ اتحادات و معاہدات کی بدولت کشیدگی میں اضافہ بھی ہوا۔ پہلی عالمی جنگ انہی اتحادات کی مرہون منت ہے۔ ہٹلر کے برسراقتدار آنے کے بعد بھی مختلف ممالک نے جرمن انتہا پسندانہ قوم پرستی کے تصور کو ختم کرنے کے لئے آپس میں اتحادات کیے۔

اس کے باوجود اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان اتحادات کی بدولت بعض اوقات توازن طاقت کی حکمت عملی کو نقصان بھی اٹھانا پڑا ہے مزید یہ کہ

اتحادیوں کو جب کبھی صلح کر لینے میں سہولت نظر آتی ہے تو وہ اپنے دوستوں کو پریشانی کے عالم میں چھوڑ کر علیحدہ صلح کر لیتے ہیں۔

۳۔ معاہدات:۔ TREATIES

قوم پرستی کی شدت کو روکنے کے لئے ایک اور کوشش معاہدات کا طویل سلسلہ ہے۔ ان میں اکثر و بیشتر معاہدے جنگوں کے بعد صورت حال کو درست کرنے اور آئندہ جنگوں کو روکنے کے لیے ترتیب دیئے گئے۔ اس سلسلے میں جدید دنیا کا پہلا معاہدہ ویسٹ فیلیا و ۱۶۴۸ء جو یورپ میں ۳۰ رسالہ جنگ کے خاتمے پر ہوا اس میں انگلستان کے سوا تمام یورپی اقوام نے شرکت کی اس معاہدے کی رو سے تمام اقوام کو باضابطہ طور پر تسلیم کیا گیا۔

نپولینی جنگوں کے بعد ویانا کانگریس ۱۸۱۴ء-۱۵ء نے ایک دائمی امن کی بنیاد رکھنے کی کوشش کی۔ توازن طاقت جسے نپولین نے درہم برہم کر دیا تھا۔ اُسے دوبارہ بحال کر دیا گیا۔ بعض طاقت ور ملکوں نے کمزور قومیتوں کے حقوق غصب کر لئے مثلاً پولینڈ آسٹریا اور روس کے مابین تقسیم ہوا۔ ۱۸۷۰ء-۷۱ء کی جنگ میں جرمنی نے فرانس سے اساس اور لورین کے علاقے چھین لئے۔ جس سے جرمنی کی پوزیشن مستحکم ہو گئی اور فرانس کا غرور خاک میں مل گیا۔ پہلی عالمی جنگ کے بعد پیرس امن کانفرنس ۱۹۱۹ء اور اس معاہدے میں تشکیل پانے والی مجلس اقوام جنوری ۱۹۲۰ء کا مقصد بھی قوم پرستی کی شدت کے رجحان کو کم کرنا تھا۔

بہر حال مجلس اقوام اپنے مقاصد اور کارکردگی میں ناکام رہی جس کی وجہ سے ستمبر ۱۹۳۹ء کو دوسری عالمی جنگ کی ابتدا ہوئی۔ اس جنگ کے اختتام پر انجمن اقوام متحدہ وجود میں آئی۔ جس کا مقصد بھی قوم پرستی کے منفی رجحان کو روک کر بین الاقوامیت کے جذبے کو فروغ دینا ہے۔ اقوام متحدہ کی کارکردگی حوصلہ افزا نہ سہی بہرحال اس کی کوششیں قابل تحسین ہیں۔

۴۔ یورپی رجحان: EUROPEAN TREND

انیسویں صدی کے نصف آخر میں یورپی معاملات کی رہنمائی اور توازن طاقت کی حمایت بڑی بڑی سلطنتوں کے ایک مفصل سے راضی نامے سے کی گئی تھی۔ یہ راضی نامہ یورپی ترجمان کہلاتا ہے۔ جرمنی، روس، آسٹریا، فرانس، انگلستان اور اٹلی کم وبیش تمام اہم امور پر دوستانہ مفاہمت میں راضی ہو گئے تھے۔ اس رجحان کا سب سے اہم کارنامہ برلن کانفرنس ہے۔ جس نے روس اور ترکی کی جنگ ۱۸۷۷ - ۷۸ء کو بند کرا دیا۔ دیگر سلطنتوں نے مل کر ترکوں پر روسیوں کی کامل فتح کے ثمرات سے روس کو محروم کر دیا۔ روس کو یورپ میں ترک سلطنت کا خاتمہ کرنے سے باز رکھا گیا۔ اس میں شک نہیں کہ بلقان میں آزاد یا نیم آزاد ریاستیں قائم کی گئیں۔ لیکن ملک کے بڑے حصے پر قبضہ ترکی ہی کا رہا۔

اس یورپی رجحان کی بدولت ایسے ہی دیگر مسائل حل کئے گئے۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو ان بڑی سلطنتوں کے درمیان نازک اختلافات کے رونما ہونے کا اندیشہ تھا۔ موجودہ صدی کے شروع ہونے کے ساتھ ہی یہ رجحان ختم ہونا شروع ہو گیا۔ پیرس امن کانفرنس ۱۹۱۹ء میں تمام اقوام کی حق خود مختاری کو تسلیم کیا گیا اور موثر انتظام کے لئے مجلس اقوام کا قیام عمل میں لایا گیا۔

۵۔ بین الاقوامی ثالث: INTERNATIONAL MEDIATOR

پچھلی صدی میں بین الاقوامی ثالثی کی عدالتوں نے بھی ترقی کی۔ کسی مسئلے کے حل کے لئے دو مخالف ریاستیں باہمی رضامندی سے تیسری ریاست کو ثالث مان لیتی ہیں جس سے جھگڑے کا فیصلہ ہو جاتا ہے جیسے امریکی یرغمالیوں کے سلسلے میں امریکہ اور ایران کے درمیان الجزائر نے بین الاقوامی ثالث کا کردار ادا کیا۔ ہیگ کانفرنسوں ۱۸۹۹ء اور ۱۹۰۷ء میں ثالثی کی مستقل عدالت کا قیام عمل میں

لایا گیا۔ ان کانفرنسوں میں شریک ممالک ہی ثالثی عدالت کے اراکین نامزد کرتے تھے۔ اس ثالثی کی عدالت نے بھی بہت سے اہم فیصلے کئے۔ ان سے قانون بین الاقوام کی تدوین بھی ہوئی۔ ملاحظہ فرمائیے اس سلسلے کے اہم مقدمات۔

۱۔ الاباما کا مقدمہ ۱۸۷۲ء امریکہ اور برطانیہ کے مابین
۲۔ پیوس فنڈ کا مقدمہ ۱۹۰۲ء امریکہ اور میکسیکو کے مابین
۳۔ نارتھ اٹلانٹک فشریز کا مقدمہ ۱۹۱۰ء برطانیہ اور امریکہ کے مابین
۴۔ سردار کر کا مقدمہ ۱۹۱۱ء برطانیہ اور فرانس کے مابین

بعض ریاستیں اپنے متنازعہ مسائل کو ثالثی عدالتوں میں پیش کرنے کو اپنی عزت اور آزادی کو متاثر کرنے والی چیز سمجھتی ہیں۔ جس سے بین الاقوامی ثالثی نظریاتی طور پر کتنی ہی قابل تعریف کیوں نہ ہو لیکن بے اعتمادی اور دشمنی کے امراض کے علاج کے لئے عملاً نامناسب ہے۔ اگر ثالثی کے عہد نامے میں دستبرداری کی گنجائش نہ ہو تو ثالثی کی عدالتوں کے فیصلوں پر ریاستوں کو پابند ہونا پڑتا ہے۔ اگر کوئی فریق فیصلہ کرنے سے انکار کرے تو دوسری فریق ریاستیں قانون بین الاقوام کے تحت دباؤ ڈال سکتی ہیں۔ تاہم اگر کوئی فیصلہ جس میں غلط فہمی۔ دھوکہ دہی یا غیر ضروری جانبداری برتی گئی ہو تو اس کی پابندی فریقین پر ضروری نہیں۔

قوم پرستی کے قومی سیاست پر اثرات

قوم پرستی قومی سیاست پر مندرجہ ذیل عمومی اثرات چھوڑتی ہے

۱۔ جمہوری خارجہ پالیسی :۔

قومی ریاست جتنی بھی مطلق العنان ہو اُسے عوامی خواہشات کا احترام کرنا پڑتا ہے اس وجہ سے قومی ریاستوں کے حکمران اور سفارت کار کوئی ایسی پالیسی نہیں بنا سکتے جو عوامی احساسات اور رجحان کی عکاسی نہ کرتی ہو۔ کہا جاتا ہے کہ انقلاب

فرانس اور دوسرا نپولین بونا پارٹ کی جنگوں نے جمہوریت کی ابتدا کی ۱۹۴۸ء میں یورپ میں جو تحریک چلی اس نے اس تصور کو مزید تقویت بخشی۔ فرانس اٹلی جرمنی میں دستوری حکومتیں قائم ہوئیں۔ پہلی عالمی جنگ تک جمہوریت نے کافی مستحکم صورت اختیار کر لی۔

۲۔ حکمت عملی کا اختیاریا ذریعہ:۔ TOOL OF POLICY

سیاست دان بعض معاملات کو جذبہ قومیت کے ساتھ منسلک کر کے عوامی حمایت حاصل کرتے ہیں۔ یہ کام ایسی صورت میں کرنا چاہیئے جب ایسا کرنا ناگزیر ہو جائے کیونکہ ان کا یہ عمل ایک مصلحتی رائے کا سہارا لینے کے مترادف ہے اس کی مثال ایران کے انقلاب میں آسانی سے مل جاتی ہے ایرانی رائے عامہ شاہ کے خلاف تھی اور شاہ کو امریکی سرپرستی حاصل تھی جس کی وجہ سے موجودہ حکومت کو رائے عامہ کے دباؤ کی وجہ سے امریکہ کے خلاف پالیسی بنانی پڑی۔ اس پالیسی کی بدولت ایران کی صورت حال ہمارے سامنے ہے۔

۳۔ غیر حقیقت پسندانہ پالیسی:۔

بعض اوقات جذبہ قومیت حقیقت پسندانہ خارجہ پالیسی کی راہ میں زبردست رکاوٹ بن جاتی ہے جس سے ریاستوں کو غیر حقیقت پسندانہ پالیسی کو اپنانا پڑتا ہے۔ جو پالیسی ساز افراد کو اپنی مطلوبہ پالیسی بنانے کے حق سے محروم کر دیتا ہے۔ بعض ریاستیں دوسری ریاستوں کی ہدف کا نشانہ بھی بن جاتی ہیں۔ مثلاً امریکہ کی ایک عرصہ تک قومی چین کی حمایت، پاکستان کی بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے میں تاخیر وغیرہ۔

۴۔ ناپسند فیصلے کرنا:۔ MAKING UNPOPULAR DECISIONS

بحرانی صورتوں میں پالیسی ساز کو جلد فیصلے کرنے ہوتے ہیں۔ ان فوری اقدامات کا تصادم قومی جذبات کے ساتھ ہوتا ہے۔ ایسے وقتوں میں پالیسی ساز کے کئی بہتر متبادل فیصلے ہوتے ہیں۔ لیکن اُسے صرف وہ فیصلے کرنے پڑتے ہیں جنہیں عوامی

حمایت حاصل ہو۔ امریکی حکومت کی اسرائیل نواز پالیسی۔ امریکہ کی ایرانی مخالفت پالیسی ماضی میں روس کے بارے میں ترکی کی پالیسی، کشمیر کے بارے میں حکومت پاکستان کی پالیسی۔

سیاست دانوں نے اکثر محسوس کیا ہے کہ جذبہ قومیت کو خطرناک حد تک ابھارنا آسان ہے کسی پالیسی کی حمایت میں عوامی حمایت کو بلند ترین سطح تک لے جایا جا سکتا ہے مثلاً غیر ملکی نظریات سے ڈرا کر یا ان چیزوں کا احساس دلا کر جن کو وہ اپنے حقوق سمجھتے ہوں۔ لیکن یہاں یہ بات بڑی مایوس کن ہے کہ قومی جذبات کو ابھارنا جتنا آسان ہے اُن پر قابو پانا اتنا ہی مشکل ہے اور جب ان کی ضرورت نہ رہے تو ان کو ختم کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ ان قومی جذبات کی وجہ سے بعض اوقات رائے عامہ کا دباؤ اس نقطے سے کہیں زیادہ آگے پہنچ جاتا ہے، جس کو اپنے مقاصد کے حصول کے لئے منزل مقصود بنایا جاتا ہے۔ موجودہ زمانے کے حالات اور رجحانات کے تحت کہا جا سکتا ہے کہ "اس وقت جدید دنیا کی سب [illegible] اور بنیادی ضرورت یہ ہے کہ ایسا سیاسی نظام بنایا [illegible] ہیں قوم پرستی مملکت کے لئے آخری منزل نہ بن جائے۔"

کے حصول کے لئے انسانی فطرت کی [illegible]

قوم پرست گروہ نہ صرف اپنی علیحدہ تہذیب و تمدن مذہب و زبان، نسل و رنگ، ادب و فن وغیرہ میں اپنی امتیازی حیثیت تلاش کرتا ہے بلکہ اس پر فخر بھی کرتا ہے اور نہ صرف ان کو ترقی دینے کی کوشش کرتا ہے بلکہ دوسرے گروہوں اور ملکوں پر ان کو ٹھونسنے کی کوشش کرتا ہے جس کی وجہ سے قوموں کے درمیان جنگ و جدال کا بازار اور بھی زیادہ گرم ہو جاتا ہے۔ جذبہ قومیت نے قومی سیاست پر بہت سارے منفی اثرات چھوڑے ہیں۔ یہاں ہم ان خامیوں کو بیان کر رہے ہیں۔

۱۔ تہذیب و تمدن کیلئے خطرہ:۔

عام حالات میں قوم میں جذبہ قوم پرستی اور وطن پرستی صرف اپنی قوم کی ترقی و ارتقاء کے احساسات پر مبنی ہوتا ہے گو یا وہ اپنی قومی ترقی کے حصول اور اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے دوسری قوموں کے مفادات کو نظر انداز کرنے سے گریز نہیں کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ جذبہ قومیت کو تہذیب اور تمدن کے لئے عظیم خطرہ سمجھا جاتا ہے۔

۲۔ معاشرتی انتشار:۔

جذبہ قومیت نے دنیا میں جنگ پرستی باہمی منافرت اور تعصب کے جذبات کو فروغ دیا ہے اس کی وجہ سے تمام اقوام میں بغض بھر گیا ہے جس سے اقوام عالم کے ذرائع ابلاغ ایک دوسرے کے خلاف زہر اگل رہے ہیں اس سے ایک نفسیاتی جنگ نے جنم لیا ہوا ہے۔ اور یہ سرد جنگ کبھی بھی گرم جنگ میں تبدیل ہو سکتی ہے۔

۳۔ سامراجیت کی بنیاد:۔

قوم پرستی نے ہی سامراجیت کو جنم دیا۔ مغربی ممالک میں جذبہ قومیت نے نہایت بھیانک صورت حال اختیار کر لی۔ انہوں نے افریقہ ایشیا اور دیگر براعظموں کے پس ماندہ ممالک اور لوگوں پر حملے کر کے اُن کو اپنا غلام بنا لیا اس طرح ان اقوام نے ان ممالک میں لوٹ مار اور استحصال کا ایسا بازار گرم کیا کہ یہ ممالک خستہ حال ہو گئے۔ ان کے موجودہ مسائل بھی اسی سامراجیت کا حصہ ہیں۔

۴۔ علاقائی تقسیم:۔

قوم پرستی اقوام میں اختلافات کا سبب بنتا ہے اس سے مختلف اقوام کے مابین اتحاد ختم ہو جاتا ہے بعض ایسی مملکتیں بن جاتی ہیں جن میں مختلف رنگ نسل اور مذہب کے لوگ رہتے ہیں۔ ان میں علیحدگی پسندی کے جذبات پروان چڑھ سکتے ہیں۔ اگر ان جذبات کو تسلیم کر لیا جائے تو سوئٹزرلینڈ میں چار، روس اور بھارت میں ایک درجن سے زائد مملکتیں قائم ہوں گی۔

۵۔ وقار و عزت کی سیاست :۔

قوم پرستی عزت و وقار اور عزت کی سیاست ہے۔ جذبہ قومیت جب جارحانہ قومیت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ تو وہ دوسری قوموں کی عزت وقار اور تکالیف کا خیال نہیں کرتا اور دوسری اقوام کی فلاح و بہبود کو نظر انداز کر دیتا ہے۔

۶۔ عالمی امن و استحکام کیلئے خطرہ :۔

قوم پرستی عالمی امن و تہذیب کے لئے خطرہ ہے جب تک اقوام عالم پر امن بقائے باہمی کے اصول پر عمل نہیں کریں گی اور اپنے آپ کو دوسروں سے اعلیٰ و ارفع سمجھنا ترک نہیں کریں گی۔ عالمی امن کو استحکام حاصل نہیں ہو سکتا۔ خود غرضی رقابت اور نفرت کے جذبات ترقی کرتے رہیں گے۔ یہ جذبات انسانیت کی تباہی کا پیش خیمہ ہیں۔

۷۔ نئی استعماریت :۔

جنگ عظیم اوّل کے بعد یورپ میں بہت سی چھوٹی چھوٹی مملکتیں قائم ہو گئیں۔ لیکن بعد میں ان کو اپنا وجود برقرار رکھنا مشکل ہو گیا۔ کیونکہ وہ معاشی ذرائع اور وسائل میں کمزور تھیں۔ جن کی وجہ سے لازماً ان کو بڑی طاقتوں کا سہارا لینا پڑا۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد ایشیا اور افریقہ میں بیرونی امداد کے ذریعے نئی آزاد ہونے اور ترقی پذیر ریاستوں کو قرضے دیئے گئے جس سے نئی استعماریت کو استحکام نصیب ہوا۔

۸۔ پروفیسر ہیز کا خیال ہے :۔

تمام لوگوں کا منظم ذاتی مفاد ہے اور خود غرضانہ مقاصد کو بروئے کار لانے کی منظم سیاست و تجارت نیز استحصال کی منظم قوت کا دوسرا نام جذبہ قومیت ہے۔

ٹیگور کہتے ہیں۔

" جذبہ قومیت مختلف زبانوں اور مختلف علاقوں میں مختلف صورتوں میں رونما ہوا ہے۔ مثلاً استعماریت شہنشاہیت نوآبادی نظام

سرمایہ داری، نازی تحریک، فاشی تحریک۔ اشتمالیت، اشتراکیت جارحیت نیز قوموں کا حق خود ارادیت وغیرہ ان میں سے ہر ایک میں بعض اچھائیاں ہیں اور بعض خامیاں۔"

قوم پرستی کی خوبیاں:۔

جدید دنیا میں جذبہ قومیت تقریباً مذہب کی حیثیت اختیار کر چکا ہے بین الاقوامی تعلقات میں یہ طاقتور اور موثر طاقت ہے۔ جذبہ قومیت کو اگر محدود اور مناسب طریقہ سے استعمال کیا جائے تو اس کی بہت سی خوبیاں بیان کی جا سکتی ہیں۔

۱۔ آزادی اور اتحاد کا جذبہ:۔

قوم پرستی لوگوں میں آزادی و اتحاد کے جذبات پیدا کرتی ہے اور ان کے لئے ایسے ایسے مواقع فراہم کرتی ہے جس میں وہ اپنی قوم کی ثقافت ادب اور علم و فن کی ترقی میں جانفشانی سے حصہ لے سکیں اس طرح ہر قوم کی مخصوص تہذیب و تمدن ترقی کر کے کل دنیا کی ترقی اور فلاح میں معاون ثابت ہوتی ہے۔

۲۔ جمہوریت کی ترویج:۔

تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ قومیت کا آغاز عوام کے جمہوری جذبات اور خواہشات کا نتیجہ ہے جہاں قومی جذبات بیدار ہوتے ہیں۔ وہاں لوگ بادشاہت، آمریت اور غیر ملکی سامراجیت کے خلاف بیدار ہو جاتے ہیں اور اپنے ملک میں قومی و جمہوری حکومت قائم کرتے ہیں۔

۳۔ معاشی خوشحالی:۔

قومیت کا جذبہ لوگوں میں اپنے ملک کے قدرتی وسائل اور ذرائع کو پوری طرح ترقی دینے اور کام میں لانے کی طرف لے جاتا ہے جس کے باعث ملک میں مکمل طور پر اقتصادی ترقی اور خوشحالی کا دور دورہ ہوتا ہے اور لوگوں کا معیار زندگی بلند ہو جاتا ہے۔

۴۔ **کردار و فکر کی تعمیر:۔** قومیت کا جذبہ فرد کے کردار و خیالات کو بلند کرتا ہے اسے اپنے محدود گروہوں مثلاً قرابت داری اور مقامیت کے تنگ نظریں تعصبات سے بالاتر ہو کر قوم و ملک کے جذبات سے سرشار ہوتا ہے اور اس طرح ایک وسیع تر معاشرے کی بنیاد رکھتا ہے جو کنبہ گاؤں اور علاقہ سے باہر ملک و قوم کی اجتماعی زندگی کو اپنا مقصد اور نصب العین تصور کرتا ہے۔

۵۔ **صحت مند مقابلے کا رجحان:۔** قومیت کے جذبے سے صحت مند مقابلے کا رجحان پیدا ہوتا ہے مقابلہ اور رشک انسان کے لئے فطری ہے اگر یہ دونوں چیزیں نہ ہوں تو معاشرے کی ترقی رک جائے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ رشک حسد میں نہ بدل جائے اور مقابلہ صحت مند ہو۔ اس مقابلے کے رجحان سے قومیں جلدی سے ترقی کرنے لگ جاتی ہیں جس سے دنیائے انسانی کو آزادی تہذیب و تمدن اور خوشحالی نصیب ہوتی ہے۔

عالمی مملکت کا عدم قیام:۔ جذبہ قومیت کی بدولت دنیا عالمی مملکت کے قیام سے بچ گئی ہے۔ عالمی حکومت کے قیام ہی امن عالم کو فروغ حاصل ہو سکتا ہے۔ لیکن ترقی کی رفتار سست ہو جائے گی جو اس وقت مقابلہ بازی کی وجہ سے قائم ہے۔ جذبہ قومیت کے باعث ہر مملکت اپنی نمایاں صفات مثلاً ثقافت تہذیب روایات اور زبان و ادب کو ترقی دیتی ہے اس سے پوری دنیا پر مثبت اثرات پڑتے ہیں۔ مختلف ثقافتوں کے مابین پُرامن بقائے باہمی کا اصول ثقافتوں کی بقا اور ترقی کے لئے ضروری ہے۔

ان خوبیوں کے پیش نظر کہا جا سکتا ہے کہ جذبہ قومیت کا اصول یہ ہے۔

"زندہ رہو اور دوسروں کو زندہ رہنے میں مدد کرو۔"

یہ اصول قوموں کو نہ صرف آزادی دلاتا ہے بلکہ دوسری اقوام کو آزادی کے احترام کا درس بھی دیتا ہے۔

۴۔ قومی طاقت

NATIONAL POWER

جسطرح آبادی رقبہ حکومت اقتدار اعلیٰ اور جذبہ قومیت ریاست کے استحکام اور وجود کے برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہے۔ اسی طرح قومی مفادات کے حصول۔ علاقائی سالمیت۔ سیاسی آزادی۔ معاشی و سماجی ترقی وقار اور نظریات کے فروغ کیلئے قومی طاقت کا منضبط ہونا چاہیئے۔ ہمیں قومی طاقت کے حصول کی قومی انصاف پسندی LEGAL JUSTIFICATION نظریہ اقتدار اعلیٰ میں ملتی ہے۔ اقتدار اعلیٰ کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے عوام کو تحفظ فراہم کرے۔

قومی طاقت میں اضافے کے رجحان میں شدت پندرہویں صدی عیسوی میں آئی جب ریاستیں دوبارہ قومیت کی بنیاد پر تشکیل پانا شروع ہوئیں۔ جذبہ قومیت کی ابتدا فرانس اور انگلستان سے ہوئی یہ دونوں ممالک ایک دوسرے سے دست گریباں تھے۔ ان میں صد سالہ جنگ ۱۳۳۷ء تا ۱۴۵۳ء کی وجہ سے قومی ثقافت و جذبات ابھر کر سامنے آئے جو قرون وسطیٰ کے عیسائی مذہب کے خلاف تھے سولہویں صدی میں مذہبی جنگوں کی وجہ سے اسپین اور ہالینڈ دو قومی ریاستوں کی حیثیت سے سامنے آئے انقلاب فرانس ۱۴ جولائی ۱۷۸۹ء کی بدولت قومی ریاستوں کی لہر مشرقی یورپ اور جنوبی یورپ کی طرف بھی پھیل گئی۔ اور ایک صدی کے اندر سارا یورپ قومی ریاستوں میں بٹ گیا۔ یہاں تک کہ آج دنیا کی ہر ریاست قومی ریاست ہے۔ اور ہر ریاست میں قومی طاقت میں اضافے کا رجحان پایا جاتا ہے۔

برٹرینڈ رسل BERTRAND RUSSEL نے کیا خوب کہا ہے۔

"ہر شخص طاقت کے حصول کے لئے کوشش کرتا ہے۔ یہاں تک کہ خدا بننا چاہتا ہے۔ حالانکہ یہ ناممکن ہے۔"

بین الاقوامی تعلقات و سیاسیات میں ان ہی ریاستوں کا کردار سب سے زیادہ نمایاں ہوتا ہے جو زیادہ قومی طاقت کی حامل ہوتی ہیں۔ ایسی ریاستیں اپنے مفادات کی بخوبی حفاظت کر سکتی ہیں قومی طاقت کی ضرورت صرف بین الاقوامی تعلقات میں اثر و نفوذ ڈالنے کے سلسلہ میں ہی نہیں ہوتی بلکہ ریاست کو خود اپنے علاقے میں امن و امان کی صورت حال بہتر بنانے اور انتہا پسندوں اور نت نئے ہنگاموں سے نمٹنے کے لئے بھی قومی قوت استعمال کرنا پڑتی ہے۔ بقول شخصے۔

زندگی کی خواہش اور طاقت کی خواہش کو ایک دوسرے سے جُدا نہیں کیا جا سکتا ۔"

قومی طاقت کے عناصر :- ELEMENTS OF NATIONAL POWER

قومی طاقت کے عناصر کی دو اقسام ہیں ۔

مجسم عوامل :- TENGIBLE FACTORS

اس میں وہ تمام عوامل شامل ہیں جن کا تعلق مادے یا وجود سے ہے مثلاً جغرافیائی حیثیت افرادی وسائل اور طبعی ساخت TOPOGRAPHY وغیرہ ۔

غیر مجسم عوامل :- INTENGIBLE FACTORS

ایسے عوامل جن کا تعلق نظریہ یا نظام سے ہوتا ہے ۔ مثلاً نظامِ حیات ۔ معیارِ تعلیم ۔ قومی اخلاق و کردار اور قومی قیادت وغیرہ

قومی طاقت کے عناصر کا چارٹ

قومی طاقت کے عناصر

- مجسم عناصر
  - جغرافیائی حیثیت
    - محل وقوع
    - ارضی سیاست
  - طبعی ساخت
    - پہاڑ
    - میدان
    - سطح مرتفع
    - آب و ہوا
    - مٹی
    - نباتات
    - ساحل سمندر
    - معدنیات
    - دریا
  - قدرتی افرادی وسائل
    - آبادی ۔
    - تعلیم و ٹیکنالوجی ۔
    - قدرتی وسائل اور خام مال ۔
    - خوراک ۔
    - فوجی تنظیم
- غیر مجسم عناصر
  - سیاسی معاشی اور سماجی نظام
  - معیارِ تعلیم
  - قومی اخلاقیات
  - قومی قیادت
  - بین الاقوامی، خارجہ حکمت عملی
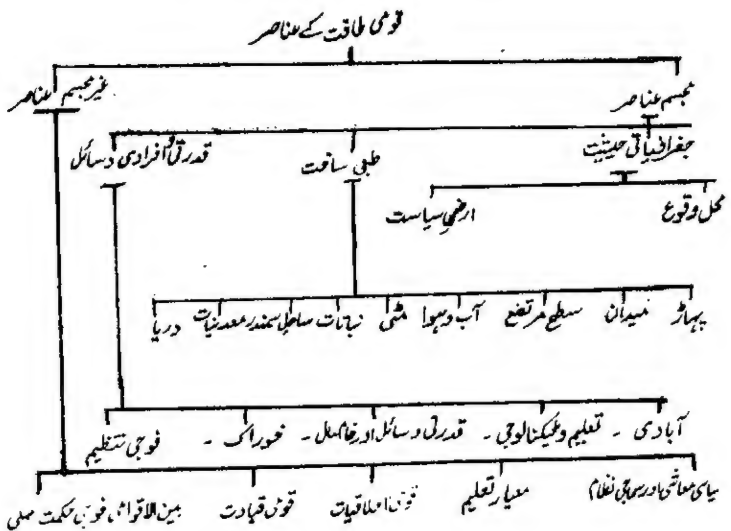
۱۔ جغرافیائی حیثیت

GEOGRAPHICAL POSITION

سب سے اہم مجسم عوامل جغرافیائی حیثیت ہے جس سے کسی ریاست کی قومی طاقت کا اظہار ہوتا ہے۔ دنیا کی تمام ریاستوں کے مابین جغرافیائی لحاظ سے نمایاں فرق ہوتا ہے۔ جغرافیائی حیثیت سے مراد تمام جغرافیائی حالات اور عوامل ہیں جو کرۂ ارض کے اس مقام پر پائے جاتے ہیں جہاں کوئی ملک آباد ہے ان میں آب ہوا دریا سمندر پہاڑ ندی نالے زمین اور کرہ ہوائی اور اب جب کہ خلائی راکٹ اور جہاز ایجاد ہو گئے ہیں کرہ ہوائی اور خلائے بسیط OUTER SPACE اور اس ملک کا دنیا کے نقشے پر مخصوص مقام بھی شامل ہے۔ جغرافیائی حیثیت پر انسان کو کم و بیش کچھ اختیار حاصل نہیں ہوتا۔ تاہم اب سائنس اور ٹیکنالوجی کی ایجادات کے ذریعے انسان جغرافیائی حالات اور عوامل کو بھی سازگار بنا سکتا ہے۔ تسخیر قدرت کا عمل انسان کو ان پر زیادہ سے زیادہ عبور اور قابو عطا کر رہا ہے۔ جغرافیائی حیثیت کسی ملک کی قومی طاقت و معیشت میں اہم کردار ادا کرتی ہے قومی طاقت کے ان عوامل میں ہم محل وقوع اور ارضی سیاست کا تذکرہ بھی کرینگے

محل وقوع :۔ LOCATION

محل وقوع سے مراد ملک کا حدود اربعہ ہے۔ اس سے ملک کے لوگوں کی معاشی سرگرمیوں کا تعین ہوتا ہے کسی ملک کا محل وقوع اس وقت موافق کہلاتا ہے جبکہ اس کے اطراف میں پانی ہو اور کسی دوسرے ملک سے خشکی کا راستہ ملتا ہو۔ عالمی منڈیوں سے قریب ترین واقع ہو

صنعتی علاقوں سے کسی ملک کی قربت اس ملک کی صنعتی ترقی میں معاون ہوتی ہے جیسا کہ اٹلی اور سوئٹزرلینڈ کے معاملہ میں ہے کہ یہ ممالک جرمنی اور فرانس کے قریب واقع ہیں۔

عالمی حوالہ سے برطانیہ کا محل وقوع بے حد موافق ہے۔ جس کی بنا پر برطانیہ میں صنعتی اور اقتصادی ترقی ہوئی۔ یہی صورت حال بحرالکاہل میں جاپان کی ہے۔ اس کے برعکس وہ ممالک جن کا محل وقوع بری ہے وہ صنعتی اور تجارتی لحاظ سے پسماندہ ہیں۔ جیسے افغانستان۔ نیپال آسٹریا وغیرہ کیونکہ یہ ممالک دنیا کے اہم بحری اور بری راستوں سے بڑے دور فاصلے پر واقع ہیں۔

ارض سیاست :- GEO-POLITICS

جغرافیائی حالات کا ریاستوں کے باہمی تعلقات پالیسی اور سیاست پر اثر اندازی کو ارض سیاست کہتے ہر ملک کے تعلقات کا انحصار اس کے محل وقوع پر ہوتا ہے اگر کوئی ملک اس عوامل کو نظر انداز کرتا ہے تو اسے سخت نقصان اٹھانا پڑتا ہے جیسا کہ پاکستان سوویت یونین کے بجائے امریکہ سے تعلقات استوار رکھنا چاہتا ہے۔ حالانکہ ارض سیاست کی اصول کی رو سے پاکستان کو روس کے ساتھ امریکہ کی نسبت بہتر تعلقات رکھنے چاہئیں۔ ایسے ممالک جغرافیائی حیثیت کو مد نظر رکھ کر پالیسیاں بناتے ہیں۔ ان کی قومی طاقت میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ اور بین الاقوامی برادری میں بھی بہتر کردار ادا کر سکتے ہیں۔ [تفصیل باب اول میں دیکھئے]

طبعی ساخت

TOPOGRAPHY

کسی ملک کی طبعی ساخت ان عوامل میں سے ایک بہت ہی اہم عامل ہے جو اس ملک کی معاشی حالت اور قومی طاقت کا تعین کرتا ہے۔ اس میں مندرجہ ذیل عناصر شامل ہیں۔

ا۔ پہاڑ :- MOUNTAINS

پہاڑ کسی ملک کی قومی طاقت کو بڑی حد تک متاثر کرتے ہیں کیونکہ پہاڑی علاقے کاشتکاری کے لئے موزوں نہیں ہوتے۔ نیز ان علاقوں میں مصنوعاتی کارخانے لگانا بھی ممکن نہیں ہوتا تاہم پہاڑوں سے مختلف فوائد بھی حاصل ہوتے ہیں۔ مثلاً بارشیں ہوتی ہیں۔ یہاں چراگاہیں ہوتی ہیں۔ جنگلات کی نشوونما کا انحصار پہاڑوں پر ہوتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

اا۔ میدان :- PLAINS

میدانی علاقوں میں متعدد سہولتیں میسر ہونے کی وجہ سے یہ علاقے انسانی سرگرمیوں کا مرکز بن جاتے ہیں۔ یہ کھیتی باڑی کیلئے موزوں ہوتے ہیں غذائی اجناس اور زرعی خام مال خوب پیدا ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ میدان دنیا کی ۹۰ فیصد آبادی کی معاونت کرتے ہیں۔ ملک کے ذرائع حمل ونقل، تجارتی وصنعتی زندگی کو مستحکم بنانے کے لئے میدان اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

iii۔ سطح مرتفع :۔ PLATEAU

سطح مرتفع کے علاقوں کی ترقی قدرے مشکل ہوتی ہے کیونکہ یہاں کی مٹی غیر زرخیز اور کھیتی باڑی کے لئے غیر موزوں ہوتی ہے ۔گو کہ ان علاقوں میں معدنی دولت بڑے پیمانے پر پوشیدہ ہوتی ہے ۔لیکن چونکہ یہاں ذرائع حمل ونقل کا فقدان ہوتا ہے لہٰذا ان وسائل کو بڑے پیمانے پر استعمال نہیں کیا جا سکتا۔جس کی وجہ سے ان علاقوں میں تجارت وصنعت ترقی یافتہ حالت میں نہیں پائی جاتی ۔

iv۔ آب وہوا :۔ CLIMATE

انسان اور اس کی سرگرمیوں کو متاثر کرنے والے جغرافیائی عوامل میں سے آب وہوا سب سے زیادہ اہم اور بنیادی حیثیت رکھتی ہے ۔زراعت نباتات جنگلات حمل ونقل صنعتوں کی تعمیر اور ترقی میں اہم کردار ادا کرتی ہے ۔

آب وہوا کسی بھی ملک کے لوگوں کی صحت قوت پیداوار اور تمدن کا تعین کرنے میں ایک مرکزی عامل ہوتا ہے ۔معتدل علاقوں میں آب وہوا انسان کو اس امر کی رغبت دلاتی ہے کہ وہ اپنے حالات کو بہتر بنانے کے لئے تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لائے ۔لیکن منطقہ حارہ کے علاقوں کی آب وہوا انسانی جسم اور دماغی صلاحیتوں کی بہتر نشوونما کے لئے قطعی موزوں نہیں ہے ۔

v۔ مٹی :۔ SOIL

اچھی مٹی زرعی سرگرمیوں پر مثبت اثر ڈالتی ہے اور اس سے قومی آمدنی میں اضافہ ہوتا ہے ۔ اس کے برخلاف ایسے ممالک جہاں کی مٹی خراب ہوتی ہے وہاں دیگر عوامل کے موافق ہونے کے باوجود زراعت سے خاطر خواہ فوائد حاصل نہیں کئے جا سکتے ۔مٹی فصلوں کے انتخاب اور پیداوار پر کنٹرول کرنے میں بڑی معاونت کرتی ہے ۔زرخیز مٹی کے علاقوں میں گنجان آبادی ہوتی ہے ۔

vi۔ نباتات :۔ VEGETATION

قدرتی نباتات کسی بھی ملک کی عام ترقی اور معاشی نشوونما میں اہم کردار ادا کرتے ہیں مثال کے طور پر استوائی جنگلاتی علاقہ جہاں نباتات کی کثرت ہے ۔سوائے شکارگاہوں ،ربڑ کے درختوں

اور کسی حد تک پھلوں کے حصول کے علاوہ اور کسی انسانی معاشی فعل کے لئے موزوں نہیں۔ اس کے برخلاف مخروطی جنگلات کا علاقہ گودے دار لکڑی کی پیداوار کیلئے نہایت موزوں ہے۔

ریگستانی علاقے عام طور پر نباتات سے تہی دست اور بنجر رہتے ہیں۔ ان علاقوں میں زراعت مشکل سے ہوتی ہے اور جانور پالنے والے اپنے گلوں کو ایک مقام سے دوسرے مقام پر چراگاہوں کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔

نباتات کے آب و ہوا پر بھی دور رس اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ کیونکہ درخت مرطوب ہواؤں کو اپنی طرف کھینچتے ہیں جس کی بنا پر نباتات والے علاقوں میں بارش کا اوسط زیادہ ہوتا ہے۔

(ii) ساحل سمندر :- COASTLINE

سمندری ساحل دو قسم کے ہوتے ہیں۔

۱۔ کٹے پھٹے ۲۔ غیر کٹے پھٹے۔

اگر ساحل سمندر کٹا پھٹا ہو تو ایسے ساحل پر بندرگاہوں کی تعمیر و ترقی آسان ہوتی ہے اور نتیجے کے طور پر ایسے علاقوں میں صنعت و تجارت کی نشوونما خوب ہوتی ہے۔ جیسا کہ برطانیہ میں ہوا ہے۔ ایسے ممالک جہاں کے ساحل کٹے پھٹے نہیں ہوتے وہ اپنی بین البحری تجارت کو ترقی نہیں دے سکتے مثال کے طور بحری تجارت کے لئے افریقہ کے کئی علاقے غیر موزوں ہیں جہاں کے ساحلِ سمندر مسلسل یا غیر کٹے پھٹے ہیں۔

(iii) معدنیات :- MINERALS

معدنی وسائل بھی انسان کی معاشی سرگرمیوں پر اثر انداز ہونے والے عوامل میں سے ایک عامل ہے کیونکہ معدنی وسائل انسان کی رہن سہن کی نہج کو بدل دیتے ہیں۔ صنعتی ترقی کیلئے معدنیات سب سے اہم اور ضروری ہوتی ہیں۔ ریاست متحدہ ہائے امریکہ۔ برطانیہ عظمیٰ سوویت یونین اور جرمنی کی صنعتی ترقی کا راز اسی میں مضمر ہے۔ ان ملکوں میں معدنی وسائل کی کثرت ہے۔ آسٹریلیا اور جنوبی افریقہ کے گرم اور الاسکا کے سرد ریگستانوں میں معاشی ترقی اس وقت ممکن ہوگی جب کہ یہاں معدنی وسائل کا پتہ چلا یا جائے گا۔

۱۱۔ دریا :- RIVERS

دریا ملک کی اقتصادی زندگی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ یہ انسانی ترقی کے لئے مختلف طریقوں سے خدمات انجام دیتے ہیں۔ دریاؤں سے آبی رسد ہوتی ہے ماہی گیری کو ترویج پاتی ہے۔ قدرتی ذرائع حمل ونقل کا کام انجام دیتے ہیں۔ زمینوں کو زرخیز بنانے کا قدرتی وسیلہ ہوتے ہیں۔ قدرتی ذرائع آبپاشی کے طور پر خدمات انجام دیتے ہیں۔ ان سے پن بجلی پیدا ہوتی ہے۔

دریائی وادیوں نے ہی دنیا کی قدیم تہذیبوں کو جنم دیا۔ مثال کے طور پر مصر کی تہذیب نے دریائے نیل۔ بابل کی تہذیب نے دجلہ و فرات اور ہڑپہ کی تہذیب نے جہلم چناب۔ راوی ستلج اور بیاس کی وادیوں میں آنکھ کھولی اور ترقی کی منازل طے کیں۔

۳۔ قدرتی اور افرادی قوت کے وسائل

NATURAL AND MAN POWER RESOURCES

قومی ریاست کی طاقت کے حصول کیلئے افرادی قوت اور وسائل براہ راست کردار ادا کرتے ہیں۔ اس سے ریاست کی اندرونی ساخت طاقت اور بیرونی تعلقات پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ اگر افراد کے حوصلے بلند ہوں تو وہ بڑی سے بڑی منزل کو طے کر جاتے ہیں۔ دنیا کے عظیم انقلاب مثلاً انقلاب فرانس ۱۷۸۹ء انقلاب سوویت ۱۹۱۷ء اور انقلاب چین ۱۹۴۹ء افراد کی بے پناہ قربانیوں ہی کے مرہون منت ہیں۔

سیاسی انقلابات کے علاوہ صنعتی اور زرعی انقلاب بھی عوام ہی کے مرہون منت ہوتے ہیں اگر کسی ریاست کے عوام نا اہل اور پسماندہ ہوں تو اس ملک کے لئے آزادی برقرار رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ قدرتی وسائل اور افرادی قوت کے سلسلے میں یہاں ہم حسب ذیل موضوعات زیر بحث لائیں گے۔ آبادی۔ تعلیم و ٹیکنالوجی۔ خام مال۔ خوراک اور فوجی تنظیم۔

ا۔ آبادی :- POPULATION

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آبادی کسی ملک کیلئے ایک مضبوط قوت کی علامت ہے چین کی ایک ارب سے زائد آبادی نے اس ملک کو عظیم بنا دیا ہے۔ اسطرح ہندوستان کی ۷۵ کروڑ کے قریب عوام اسکی

اہمیت اور قوت کو دنیا سے تسلیم کروانے کیلئے کافی ہے۔ مشاہدے سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ زیادہ آبادی والے ملک کی خارجہ پالیسی اور حکمت عملی جارحانہ وسعت پذیر اور ملک گیر ہوتی ہے۔ ایسا ملک سامراجی IMPERIALIST اور جنگ باز MILITARIST بن جاتا ہے۔ دوسرے ممالک اور علاقوں کو مغلوب کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر ایسا ملک صنعتی ہو تو وہ اپنے ہمسایہ ملک کی منڈیوں پر قبضہ کرنے کی سوچتا ہے۔ جیسا کہ روس نے مشرقی یورپی ممالک کے ساتھ کیا ہوا ہے۔

ii- تعلیم و ٹیکنالوجی :- EDUCATION AND TECHNOLOGY

قوم کی تہذیبی ترقی میں تعلیم اور ٹیکنالوجی اہم کردار ادا کرتی ہے۔ جس کی وجہ سے اسے قوت کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ ذرائع آمد و رفت کی جدید ترین ایجادات نے جہاں انسانی معاشرے کی ترقی کو رفتار اور عروج دیا وہاں ایٹمی ایجادات کی تعلیم و ٹیکنالوجی نے ریاستوں کو استحکام اور طاقت کو ایک نیا روپ دیا۔ آج ان ریاستوں کی قوت اور برتری میں کوئی شک نہیں جو ایٹمی علم پر دسترس رکھتی ہیں۔ آبدوز کشتیوں نے بڑے بڑے جہازوں کی اہمیت کو ختم کر دیا ہے۔ میزائل نے ان ہوائی جہازوں کی قوت کو بے کار کر دیا ہے۔ جو کبھی فوج کیلئے قابل فخر سمجھے جاتے تھے۔

ہمیں تعلیم اور ٹیکنالوجی "کم خرچ بالا نشین" کی طرف لئے جا رہی ہے۔ جس کی وجہ سے دنیا کے سبھی ممالک تعلیم پر زور دے رہے ہیں۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد روس اور امریکہ علمی اور فنی مہارت کی بنا پر دنیا کی دو عظیم طاقتیں بن گئے۔ انکے بعد چین اور جاپان بھی اسی بنیاد پر عظیم دنیا کی صف میں آکھڑے ہوئے ہیں۔

iii- قدرتی وسائل اور خام مال :-

NATURAL RESOURCES AND RAW MATERIAL

جغرافیائی حیثیت اور قدرتی وسائل میں بنیادی فرق یہ ہے کہ جغرافیائی حالات پر انسان کو کم و بیش کچھ اختیار نہیں ہوتا جبکہ قدرتی وسائل کو انسان کم یا زائد کر سکتا ہے۔ ہر ملک کی صنعتی ترقی میں خام مال بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ کسی ملک میں قدرتی وسائل اور خام مال جتنا زیادہ ہوتا ہے وہ ریاست اتنی ہی خوشحال ہوتی ہے۔ اگر کسی ملک کے پاس سونے کی کانیں ہوں تو وہ اس دولت سے اپنی ضروریات کی تمام چیزیں دوسرے ممالک سے خرید سکتا ہے تعلیم اور

ٹیکنالوجی کی بدولت خام مال کا نعم البدل تیار کر سکتا ہے۔ مثلاً چین جو کبھی پٹ سن کے سلسلے میں پاکستان کا محتاج تھا۔ مصنوعی پٹ سن یا نائیلون کی ایجاد نے پاکستانی پٹ سن کی اہمیت کو ختم کر دیا اسی طرح اگر کسی ریاست کے پاس افرادی قوت کی بہتات ہے تو وہ مشینوں کی بجائے آدمیوں کی تعداد سے صنعتی معیشت کو ترقی دے سکتی ہے۔

ایسے ممالک جن کے پاس قدرتی وسائل کی کمی ہے تو ایسی صورت میں انہیں دوسری ریاستوں سے خام مال درآمد کرنا پڑتا ہے جس سے زرِ مبادلہ میں کمی واقع ہوتی ہے نیز جنگی صورتِ حال میں ایسے ممالک کی صنعتیں بحران کا شکار ہو جاتی ہیں۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ لوہا۔ کوئلہ۔ تیل اور دیگر معدنیات ریاست کی قوت کا مظہر ہوتی ہیں۔

۱۱۔ خوراک :- FOOD

خوراک بھی قدرتی وسائل میں شامل ہے۔ یہ خدا کی طرف سے دیا ہوا ایک عطیہ ہے۔ ریاست کی قومی طاقت میں اس بات کا بڑا انحصار ہوتا ہے کہ وہ غذائی طور پر کسی حد تک خود کفیل ہے قومی ترقی میں خوراک کی اہمیت اس قدر بڑھ گئی ہے کہ بعض اوقات ترقی یافتہ ممالک بھی اس کی خاطر اپنی پالیسیاں تبدیل کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ پسماندہ ممالک کی خارجہ پالیسیوں کا انحصار صرف اور صرف خوراک کے حصول پر منحصر ہو کر رہ گیا ہے۔ ایسے ممالک جہاں صنعتی ترقی زیادہ نہیں ہوئی لیکن زرعی اور غذائی پیداوار ضرورت سے زیادہ ہے تو وہ ان غذائی اشیا کو برآمد کر کے اپنی معیشت کو متوازن بناتے ہیں۔ مثال کے طور پر آسٹریلیا، دودھ اور مکھن کی برآمد سے اپنی قومی قوت کو برقرار رکھے ہوئے ہے۔ امریکہ دنیا میں سب سے زیادہ خوراک کے معاملے میں نہ صرف خود کفیل ہے بلکہ دیگر ممالک کو غذائی امداد بھی فراہم کرتا ہے۔ اس وجہ سے ان پسماندہ ممالک کی پالیسیاں امریکی خارجہ پالیسی کے مفادات کی آئینہ دار ہوتی ہیں عربوں کا تیل سستے داموں خوراک کے حصول کی وجہ سے ہی امریکی سرمایہ داروں کے ہتھے چڑھا اور ان ممالک کی ہمدردیاں اور وفاداریوں کا سودا بھی روٹی کے عوض آسانی سے ہو گیا۔ روس۔ چین اور جاپان جیسے ممالک بھی خوراک کے معاملے میں امریکہ کے سامنے سرنگوں ہیں۔

۷۔ فوجی تنظیم :۔ MILITARY ORGANIZATION

ریاست کی علاقائی سالمیت قومی سلامتی اور خود مختیاری کیلئے مسلح افواج کی ضرورت ہوتی ہے ۔آج دنیا کا ہر ملک اپنی فوجی طاقت میں اضافہ کا خواں ہے ۔ بقول ای ایچ کار " اپنی طاقت کے لحاظ سے ریاست کا ہر فعل جنگ کی طرف مائل ہوتا ہے ۔ایک پسندیدہ ہتھیار کے طور پر نہیں بلکہ آخری حربہ کی صورت میں ۔"

دوسری جنگِ عظیم کے بعد سب سے زیادہ زور تخفیف اسلحہ اور فوجی قوت میں اضافہ کی روک تھام پر دیا جا رہا ہے ۔مگر ریاستیں اس میں اضافہ اور نت نئے اسلحہ کی ایجادات کی طرف اپنی پوری توجہ و احباک مرکوز کیئے ہوئے ہیں اور روز بروز تقریباً سبھی ریاستوں کے دفاعی بجٹ میں اضافہ ہو رہا ہے ۔ماہرین کا کہنا ہے :

" تیسری عالمی جنگ ایٹمی اور آخری جنگ ہو گی ۔"

تمام ریاستوں کی دفاعی قوت میں فوجوں کی تعداد اور اسلحہ کو خاص اہمیت حاصل ہوتی ہے ۔فوجوں کی بہتر تنظیم بھی ایک بنیادی حیثیت رکھتی ہے اس لئے ہر شخص کو فوج میں بھرتی نہیں کیا جاتا ۔افواج کی بھرتی کے لئے قد وزن اور سینے کی چوڑائی وغیرہ کی کچھ شرائط رکھی جاتی ہیں ۔

کسی ریاست کی طرف سے فوجی تنظیم کو بہتر اور فعال بنانے پر دوسری ریاستوں کو اس کی نیت اور مقاصد پر شبہ ہونے لگتا ہے ۔جو ریاستوں کے درمیان کشیدگی اور علاقائی امن کیلئے خطرناک صورت حال سمجھی جاتی ہے ۔دوسری طرف اس سے غفلت ریاست کو کمزور کر دیتی ہے ۔ریاستیں فوجی تنظیم اور تیاریاں اولاً اپنی ریاست کو مستحکم و مضبوط بنانے کی خاطر کرتی ہیں ۔مگر ریاستوں کے ان نیک مقاصد کو ریاستوں کے درمیان جنگ و جدل کی صورت میں دیکھا گیا ہے ۔

سائنس اور ٹیکنالوجی کی ایجادات سے فوجی قوت جدید ترین خطوط پر استوار ہوئی ہے جس کی وجہ سے موجودہ دور میں ریاستیں فوج کی تعداد سے زیادہ معیار پر توجہ دیتی ہے ۔

قومی قوت کے غیر مجسم عناصر

INTENGIBLE FACTOR OF NATIONAL POWER

ابھی تک ہم نے قومی طاقت کے مجسم عناصر کا مطالعہ کیا ہے اور اب غیر مجسم عناصر کو موضوع

تحت لائیں گے جو مجسم عناصر کو فعال بنانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں ۔ ان میں بے شمار عناصر شامل ہیں ۔ لیکن یہاں وسیع تر معنوں میں چند ایک پر روشنی ڈالی جائے گی ان میں سیاسی معاشی اور سماجی نظام ۔ معیار تعلیم ۔ قومی اخلاقیات ۔ خوش قیادت اور بین الاقوامی فوجی حکمت عملی شامل ہے

۱۔ سیاسی، معاشی اور سماجی نظام :۔ POLITICAL, ECONOMICAL AND SOCIAL SYSTEM

اقوام عالم میں کوئی ایسا نظام ابھی تک وجود میں نہیں آیا جس پر پوری انسانیت متفق ہو مختلف معاشروں، مملکتوں میں نظام حیات مختلف ہے ۔ کہیں اشتراکی اور کہیں سرمایہ دارانہ نظام کہیں اسلامی نظام حیات ملتا ہے ۔ بعض ممالک نے ان تمام نظاموں کو ملا جلا کر اپنایا ہے ۔ اس طرح ہر ملک اپنے ماحول کے مطابق ایک نظام حیات کو اپناتا ہے ۔ یہاں ہم سیاسی معاشی اور سماجی پہلوں پر علیحدہ علیحدہ تبادلہ خیال کریں گے

ا ۔ سیاسی نظام :۔

قومی طاقت کی رو سے سیاسی نظام سے مراد ریاست کی حکومت کا وہ طریقہ کار ہے جس کے تحت وہ عوام پر حکومت کرتی ہے ۔ قومی طاقت کے نقطہ نظر سے نظام کوئی اہمیت نہیں رکھتا حکومت چاہے جمہوری ہو یا آمریت اشرافیہ ہو یا چند سری یا پھر کوئی بھی نظام ہو اگر مملکت کے تمام امور خوش اسلوبی سے انجام پا رہے ہیں تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ سیاسی نظام قومی طاقت کے حصول میں اپنا کردار پوری طرح ادا کر رہا ہے ۔ مملکت کے تمام امور اسی وقت انجام دیئے جا سکتے ہیں جب ریاست میں سیاسی انتشار کے بجائے سکون ہو ۔

ب ۔ معاشی نظام :۔

معاشی نظام سے مراد ملک کی پیداوار اور تقسیم کا طریقہ کار ہے ۔ اشیا کی پیداوار اور تقسیم کے لیے کئی معاشی نظام رائج ہیں ۔ جن میں اشتراکی معشیت ۔ سرمایہ دارانہ معشیت ۔ اسلامی معشیت اور ملی جلی معشیت خاص طور پر قابل ذکر ہیں ان نظاموں کا سب سے اہم مقصد زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل کرنا ۔ آجیروں اور اجیروں کے درمیان عدل و انصاف کرنا ہے تاکہ ایک طبقہ دوسرے کا استحصال نہ کر سکے اس طرح ریاست کی قوت میں مستحکم اور مقبول معاشی نظام اہم کردار ادا کرتا ہے ۔

ج۔ سماجی نظام :۔

سیاسی اور معاشی نظام کے ساتھ ساتھ سماجی نظام بھی ریاست کی قومی طاقت میں اہمیت کا حامل ہے۔ صاف ستھرا پرامن سماجی نظام قومی طاقت کے حصول میں زیادہ معاون ثابت ہوتا ہے۔ اگر معاشرتی فضا خراب ہو تو ریاست نت نئے ہنگاموں اور فسادات کا شکار رہتی ہے جس سے قومی قوت پر برا اثر پڑتا ہے۔ اگر ریاست میں مختلف طبقوں اور فرقوں کے لوگ آباد ہوں تو ظاہر ہے کہ ان کے درمیان ثقافتی روایات بعض اوقات نظریاتی روایات بھی مختلف ہونگی چنانچہ ایسی ریاست میں ضروری ہے کہ تمام طبقوں اور فرقوں کی حدود کا تعین کیا جائے۔ ورنہ طبقاتی اور فرقہ وارانہ کشمکش ریاست کے لئے تباہ کن ثابت ہوگی۔ امریکہ انگلستان، بھارت، سری لنکا اور پاکستان میں نسلی اور فرقہ وارانہ فسادات کی خبریں آئے دن آتی رہتی ہیں۔

معاشرتی تضادات اور انتشار کا شکار ریاستیں ایک طرف اپنی داخلی صورت حال میں الجھی رہتی ہے جس کا اثر خارجہ پالیسی پر بھی پڑتا ہے اس سے ریاست کی قومی یکجہتی کو نقصان پہنچتا ہے یہ بات قومی طاقت کے حق میں بھی مضر ہے۔

ز۔ معیار تعلیم :۔

ریاست کی ترقی و خوشحالی میں معیار تعلیم ہمیشہ بڑی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ ترقی پذیر ممالک ہمیشہ علمی میدان میں ترقی یافتہ ممالک کے نقش قدم پر چلتے ہیں ابتدائے انسانیت سے لیکر آج تک کے حالات کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو بلاشبہ ہم اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ معمولی ایجادات سے لیکر اعلیٰ ترین ایجادات علم ہی کی مرہونِ منت رہی ہیں۔

ریاست کا معیار تعلیم جس قدر بلند ہوگا افرادی قوت میں اسی قدر نکھار پیدا ہوگا۔ لوگ ریاستی پالیسی اور قوانین کو سمجھ سکیں گے اور ریاست اپنے پروپیگنڈائی مقاصد حاصل کر سکے گی اس کے برعکس ایسے ممالک جن کا تعلیمی معیار پست ہے ان ممالک کے صاحب ثروت لوگ اعلیٰ اور معیاری تعلیم کے لئے ترقی یافتہ ممالک کا رخ کرتے ہیں۔ موجودہ دور میں ترقی پذیر ممالک کے لوگ امریکہ، فرانس اور برطانیہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کیلئے جاتے ہیں اس سے ایک فائدہ تو یہ ہوتا ہے کہ ملک کو اعلیٰ تربیت یافتہ افراد میسر آجاتے ہیں۔ اور دوسری طرف یہ اعلیٰ تربیت یافتہ افراد ذہنی

طور پر تہذیب غیر کے غلام ہو چکے ہوتے ہیں اور پھر یہ افراد اپنے ممالک میں غیروں کی تہذیب کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اور اپنی تہذیب کو گھٹیا سمجھنے لگتے ہیں

iii۔ قومی اخلاقیات :۔ NATIONAL MORALS

ریاست کے افراد کے مابین اتحاد و محبت قومی یکجہتی تعاون اور مساوات کی بنیادیں قومی اخلاقیات پر ہوتی ہیں قومی اخلاقیات کی تشکیل میں مذہب اور قومیت اہم عناصر کی حیثیت رکھتے ہیں ایسی ریاستیں جہاں مذہب کی گرفت کمزور ہے وہاں قومیت ہی قومی اخلاقیات کو استوار کرتی ہے۔ جاپان اور چین وغیرہ ایسے ممالک ہیں جہاں قومی اخلاقیات کی ساری بنیادیں قومیت کے عنصر پر مشتمل ہیں۔ ان کے برعکس پاکستان اور اسرائیل پر مذہبی عنصر کا غلبہ ہے۔ قومی اخلاقیات کی غیر موجودگی میں معاشرے میں انتشار عداوت و نفرت جیسے جذبے فروغ پاتے ہیں جو کسی بھی ریاست کو صرف تباہی ہی کی طرف لے کر جا سکتے ہیں۔ اس وجہ سے قومی طاقت کے حصول کے لئے قومی اخلاقیات کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اعلیٰ اخلاق و عادات کسی ملک و قوم کی ترقی کی نشانیاں ہوتی ہیں۔ اخلاقی انقلابات دنیا میں جلد اور دور رس اثرات چھوڑتے ہیں۔ جیسے اسلامی انقلاب۔

iv۔ قومی قیادت :۔ NATIONAL LEADERSHIP

ماہرین قومی قیادت کو بہت زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ لیکن عام طور پر اسے نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ اعلیٰ قومی قیادت کے بغیر اجتماعی ترقی کا تصور ممکن نہیں ہے۔ عربوں جیسی قوم جو بات بات پر آپس میں لڑ پڑتی تھی جب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی قیادت سنبھالی تو نہ صرف وہ عرب میں بلکہ پوری دنیا میں ایک عظیم قوت بن کر ابھرے۔ اس طرح تاریخ اسلام میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد خلفاء راشدین تک بہترین قیادت رہی تو اسلامی ریاست ترقی کرتی رہی اور اس کے بعد اختلافی قیادت کی بدولت اسلامی سلطنت کو زوال ہوا موجودہ قومی ریاستوں میں فرانس کو جنرل ڈیگال جیسی قیادت نے آزادی سے ہمکنار کرایا۔ چین کو ماؤزے تنگ جیسی شخصیت نے عظیم قوت بنایا۔ لینن کی بدولت ۱۹۱۷ء میں دنیا کا پہلا اشتراکی انقلاب روس میں آیا مسولینی اور ہٹلر جیسی شخصیتوں نے اپنی ریاستوں کو تباہ

اور بربادی کے سوا کچھ نہیں دیا۔ سوئیکارنو اور قائداعظم محمد علی جناح جیسی شخصیتوں نے اپنی ریاستوں کو آزادی کی دولت سے مالا مال کر دیا۔ اس مختصر جائزے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قیادت قومی طاقت میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔

۱۱۔ بین الاقوامی فوجی حکمت عملی: INTERNATIONAL MILITARY STRATEGY

بین الاقوامی فوجی حکمت عملی سے مراد ریاست کا وہ فوجی کردار ہے جس سے دشمن کو پریشانی یا شکست کا سامنا کرنا پڑے۔ ایسی ریاستیں جو دوسری بڑی ریاستوں سے خطرہ محسوس کرتی ہیں وہ دوسرے ممالک سے اتحادی معاہدے کر کے اپنی پوزیشن کو مضبوط اور مستحکم کرتی ہیں۔ ماہرین کا خیال ہے کہ ایک ریاست کو علاقائی سالمیت اور قومی سلامتی کے تحفظ کیلئے زیادہ سے زیادہ اپنے قوت بازو پر بھروسہ کرنا چاہیئے کیونکہ اکثر اوقات بڑی ریاستیں معاہدوں کی پابندی نہ کر کے چھوٹی ریاستوں کو نقصان پہنچا جاتی ہیں۔

ہر ریاست کی فوجی حکمت عملی سیاسی حکمت عملی کے ماتحت ہوتی ہے اگر ہم دوسری عالمی جنگ ۱۹۳۹-۴۵ء کے بعد طاقت کے حصول اور اس کو برقرار رکھنے کیلئے امریکہ اور روس کی تگ و دو اور کارفرمائیوں کا جائزہ لیں تو یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ان ممالک نے جنگ کے دوران ہی اپنا سیاسی اور فوجی تسلط قائم رکھنے کیلئے کوششیں شروع کر دی تھیں۔

THE RE-AWAKENING OF EAST — برٹرینڈ رسل نے اپنے ایک مضمون "مشرق کی از سر نو بیداری" میں لکھا تھا کہ:۔

اگر از سر نو بیداری ہوتے ہوئے ایشیا کو کسی طاقت سے خطرہ لاحق ہو سکتا ہے تو وہ روس ہے یقیناً ان کے پیش نظر یہی بات تھی کہ روس طاقت پر بھروسہ کرتا ہے اور دوسری طرف امریکہ کا کردار جمہوری انداز فکر کی غمازی کرتا ہے یہ اور بات ہے کہ امریکہ کا یہ کردار نہ صرف اپنی اہمیت بین الاقوامی سطح پر کھو دیتا ہے بلکہ بذات خود اس کے حق میں بھی نقصان دہ ثابت ہوا ہے۔

جنوب مشرقی ایشیاء میں اگر ہم ان دو بڑی طاقتوں کی فوجی حکمت عملی کا جائزہ لیں تو اندازہ ہوگا کہ دنیا کے اس خطے میں امریکہ اپنی بالادستی قائم کرنے کیلئے بھرپور کوشش کر رہا ہے۔ گو کہ اسے بڑی سیاسی اور پیچیدہ صورت حال کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ ایک طرف فاصلے زیادہ ہیں دوسری طرف روس اپنے جغرافیائی محل وقوع کی وجہ سے بالادستی کر رہا ہے یعنی یہ کہ پاکستان، ایران اور افغانستان کے قریب

واقعہ ہے کہ روس نے بھارت کو حلیف اور افغانستان پر اپنا فوجی تسلط ۱۹۷۹ء سے قائم کیا ہوا ہے اب روس کو گرم پانیوں تک پہنچنے اور خلیجی ریاستوں پر اپنا اثر و رسوخ قائم کرنے کے سلسلے میں فی الوقت افغانوں کی مزاحمت کا سامنا ہے۔ جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے وہ امریکہ کا ایک بہترین دوست اور معاون ثابت ہو رہا ہے امریکہ کی طرف سے ایف ۱۶ طیاروں کی فراہمی، سریع الحرکت فوج کی مشقیں اور امریکی وزیر خارجہ کے دورے اس بات کے غماز ہیں کہ پاکستان امریکہ کی نظر میں اپنے خطہ کی وجہ سے اہم ہے۔ ایران شاہ کی معزولی اور آیت اللہ خمینی کے برسر اقتدار آنے کے بعد اس کے ہاتھ سے نکل گیا ہے۔ خلیج کی ریاستیں جو تیل کی دولت سے مالا مال ہیں امریکہ اور روس ابھی سے ان کے بارے میں اپنا لائحہ عمل بنا رہے ہیں انہیں احساس ہے کہ بنفس خود خلیج کی ریاستیں اور سعودی عرب اپنا دفاع کرنے کے قابل نہیں ہے لہٰذا انہیں لازمی طور پر کسی ایک کا ہمنوا بننا ہے اس سلسلے میں امریکہ اپنی سیاست سرمایہ اور فکری لائحہ عمل کے تحت ابھی تک خلیج کی ریاستوں اور سعودی عرب میں اپنا اثر و نفوذ قائم رکھے ہوئے ہے۔ دوسری طرف اسرائیل کی صورت میں مشرق وسطیٰ کی سرزمین پر اس کے مفادات کی نگرانی کیلئے ایک بہترین آلہ کار موجود ہے۔ لہٰذا اس وقت امریکہ اپنی سریع الحرکت فوج کے قیام افغانستان کی زبانی ہمدردی، پاکستان کو حلیف بنانے اور روس کے افغانستان میں الجھے رہنے میں اپنی کامیابی سمجھتا ہے یہی وجہ ہے کہ امریکہ افغان مجاہدین اور مہاجرین کی امداد کر رہا ہے۔

۵۔ قومی خارجہ پالیسی

NATIONAL FOREIGN POLICY

ہر مقتدر ریاست کی قومی پالیسی کی دو شاخیں ہوتی ہیں ان میں ایک داخلی حکمت عملی ہوتی ہے جس کا تعلق مملکت کی حدود کے اندرونی معاملات سے ہوتا ہے۔ دوسری شاخ خارجی حکمت عملی ہے جس کا تعلق ریاست کے بیرونی تعلقات سے ہوتا ہے۔ خارجی حکمت عملی ہی کی بدولت ایک ریاست اس بات کا تعین کرتی ہے کہ اُسے عالمی برادری میں کیا کردار سرانجام دینا ہے۔ ریاستیں اپنی بقاء اور مقاصد کے حصول کے لئے اپنے مخصوص سیاسی، معاشرتی مذہبی اور ثقافتی پس منظر میں اپنی خارجہ پالیسی مرتب کرتی ہیں، کسی بھی ملک کی خارجہ پالیسی جامد اور استوار نہیں رہ سکتی بلکہ یہ ہمیشہ لچکدار ہوتی ہے اسی لئے کہا جاتا ہے کہ بین الاقوامی تعلقات میں کوئی ملک نہ تو دائمی دشمن ہوتا ہے اور نہ ہی ابدی دوست۔

خارجہ پالیسی کے مفہوم کو سادہ الفاظ میں یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ "ریاستیں اپنے مخصوص حالات میں اپنے قومی مفادات و مقاصد کے حصول کے لئے دوسری ریاستوں سے تعلقات قائم کرنے کے لئے جو طرزِ عمل اور رویہ اختیار کرتی ہیں انہیں ریاست کی خارجہ پالیسی کہتے ہیں۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ تمام ریاستیں معاشی سیاسی سماجی اور جغرافیائی لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔ اس وجہ سے ان کی خارجہ پالیسیوں کے اصول بھی جدا جدا ہوتے ہیں مثلاً امریکہ سوویت یونین اور چین کی خارجہ پالیسیوں کے اصولوں میں واضح فرق ہے۔ لیکن یہ واضح رہے کہ بعض اوقات اصول اور عمل میں تضاد بھی پایا جاتا ہے

امریکہ کی خارجہ پالیسی کے بنیادی اصول

امریکہ کی خارجہ پالیسی کے بنیادی اصول حسب ذیل ہیں جن کی امریکہ خود وقتاً فوقتاً

وضاحت کرتا رہتا ہے۔

۱ امریکہ دنیا میں ایک حقیقی پائدار امن دیکھنا چاہتا ہے جس میں کسی کو برتر حیثیت حاصل نہ ہو

۲ امریکہ دنیا میں ہمیشہ عالمی اتحاد و تعاون کے لئے کام کرتا ہے۔

۳ امریکہ بین الاقوامی قانون کا احترام چاہتا ہے۔

۴ شخصی آزادی کا احترام اور جمہوریت کو فروغ دینے کے لئے امریکہ ہر دم کوشاں ہے

۵ امریکہ ہمیشہ عوام کے حق خودارادیت کی مکمل حمایت کرتا ہے اِس بنا پر اِس نے کیوبا اور فلپائن کو آزادی دی اور مزید کوئی نوآبادی قائم نہیں کی۔

۶ امریکہ صرف ظاہری معاشرے پر یقین رکھتا ہے ایسے پوشیدہ معاشرے پر اعتماد نہیں کرتا جس میں کالے قوانین، عوامی رائے عامہ و آزادی کا گلا گھونٹا جائے۔

سوویت روس کی خارجہ پالیسی کے بنیادی اصول:-

(۱) روس پوری دنیا میں اشتراکیت کو پھیلانا چاہتا ہے اس کا موقف یہ ہے کہ دنیا ایک ہے اور امن ناقابل تقسیم ہے۔

(۲) روس دنیا سے امریکی سامراجیت کا خاتمہ چاہتا ہے کیونکہ روس کے خیال میں تمام عالمی مسائل امریکی سامراج کے پیدا کردہ ہیں۔ روس ایشیائی اور یورپی ممالک سے امریکی اثرات کا خاتمہ چاہتا ہے۔

(۳) روس اپنے جنوب اور جنوب مشرق کی طرف سے گرم سمندروں تک رسائی چاہتا ہے۔ درّہ دنیال یا افغانستان کے راستے اس اصول کی تکمیل ہوسکتی ہے۔

(۴) روس اپنی مغربی سرحدوں پر واقع ممالک پر بھرپور اثرات کا ارتکاز چاہتا ہے۔

(۵) کمیونسٹ انفارمیشن بیورو کا قیام عمل میں لاکر دنیا بھر میں کمیونسٹ پارٹی کی طرز پر کمیونسٹ پارٹیوں کی تشکیل و تنظیم۔

(۶) روس اپنے آپ کو اس قابل بنانا چاہتا ہے کہ وہ عالمی اشتراکی دفاع کے قابل ہوجائے۔

(۷) روس اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں ویٹو کے حق کی بقاء اور اُس کا تحفظ چاہتا ہے

⑧ روسی خارجہ پالیسی کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ بیرونی دنیا کو اپنے حالات سے بے خبر رکھا جائے۔

چین کی خارجہ پالیسی کے بنیادی اصول :۔

① چین کی خارجہ پالیسی کا پہلا اصول یہ ہے کہ نظریات کے سلسلے میں غیر جانبداری سے کام لیا جائے چینی حکومت مارکسزم لینن ازم اور ماؤ ازم کے اصولوں پر عمل پیرا ہے۔ ماؤ اضداد کے ٹکراؤ کا قائل ہے۔ دنیا کو اشتراکی اور سامراجی دو مختلف بلاکوں میں تقسیم کرتا ہے۔ ماؤ کا یہ بھی خیال ہے کہ اضداد کا ٹکراؤ دونوں بلاکوں میں موجود ہے۔ اشتراکی بلاک میں یہ ٹکراؤ خود بخود ختم ہو جائے گا جبکہ سامراجی بلاک میں یہ بذریعہ جنگ ختم ہوگا۔

② چینی خارجہ پالیسی کا دوسرا اصول سامراجیت کے خلاف جدوجہد میں محکوم قوموں کی مدد کرنا ہے نیز سامراجیت کے خلاف جدوجہد کرنے والوں کو پناہ دینا۔ دنیا کی تمام قوموں کی آزادی کے تحفظ، علاقائی سالمیت کی بقاء اور ملکی اقتدار اعلیٰ کا احترام ہمیشہ چین کی خارجہ پالیسی کا مرکزی نقطہ رہا ہے۔

③ چین کی خارجہ پالیسی کا تیسرا اصول یہ ہے کہ چین کا وجود تسلیم کیا جائے اور اسے ایشیا کی عظیم طاقت جانتے ہوئے مناسب مقام دیا جائے۔

④ جنگ آزادی کے دوران تعاون کرنے والے اور فارموسا کو چین کا جزو لاینفک تسلیم کرنے والے ممالک کے ساتھ ترجیحی بنیادوں پر تعلقات قائم کئے جائیں گے۔ ویسے اب امریکہ سے بھی تعلقات قائم کئے جا چکے ہیں۔

قومی مفادات اور خارجہ پالیسی :۔

ہر ریاست کی خارجہ پالیسی دراصل اُس کے قومی مفادات کی آئینہ دار ہوتی ہے

قومی مفادات سے مراد وہ اشیاء یا وسائل ہیں جو قومی سالمیت و ترقی کے لئے ہمیشہ ضروری خیال کئے جائیں یا کم سے کم ان سے مراد وہ مخصوص وسائل ہوتے ہیں جو کسی قوم کے قبضہ میں ہوں اور وہ انہیں اپنی ترقی کے لئے اپنے قبضہ میں رکھنا ضروری خیال کرتی ہو یا اُن کے حصول کے لئے جدوجہد کرتی ہو تو مفاد کا نظریہ اور اس کے حالات پر اثر انداز ہونے والا کردار ہمیشہ جاری رکھنے والا عمل ہوتا ہے۔ مفادات کی ہمیشگی کی ایک مثال یہ ہے۔ روس میں بالشویک انقلاب کے بعد حکومت کا ڈھانچہ یکسر بدل جانے کے باوجود بھی قومی مفادات کی ان بنیادوں میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ جو زار حکومت کے زمانے سے مستحکم تھے۔ برطانیہ کی لیبر پارٹی نے اپنے منشور کے مطابق بہت سے معاملات میں انقلابی تبدیلیاں کیں۔ مگر قومی مفادات کے ان اصولوں کو برقرار رکھا جو اپنی پیش رو قدامت پسند پارٹی کے زمانے سے رائج تھے۔

اس سے ہرگز یہ مراد نہیں کہ یہ اصول آفاقی ہیں۔ زمانے اور حالات کے ساتھ ساتھ ان میں بھی تبدیلیاں آسکتی ہیں۔ مگر ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے جبکہ خارجہ پالیسی وقتی مصلحتوں کے تحت تبدیل ہوتی رہتی ہے۔

خارجہ پالیسی کے مقاصد:۔ OBJECTIVES OF FOREIGN POLICY

قومی ریاست کی خارجہ پالیسیوں کے مندرجہ ذیل مقاصد ہوتے ہیں۔

خارجہ پالیسی کے مقاصد:۔
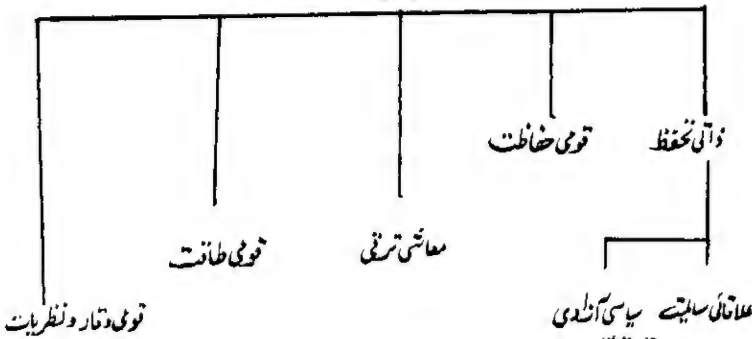
ذاتی تحفظ
قومی حفاظت
معاشی ترقی
قومی طاقت
قومی وقار و نظریات
علاقائی سالمیت
سیاسی آزادی

۱۔ ذاتی تحفظ:۔ SELF RESERVATION

افراد کے مسائل ریاستوں کے مسائل سے مختلف نہیں ہوتے جس طرح ایک فرد

اپنے تمام مسائل حل نہیں کر سکتا۔ اسی طرح ایک ریاست بھی اپنا تحفظ نہیں کر سکتی۔ اس وجہ سے دوسری ریاستوں کے ساتھ تعلقات قائم کرنے کا سب سے اہم مقصد ذاتی تحفظ ہوتا ہے۔ ذاتی تحفظ میں علاقائی سالمیت اور سیاسی آزادی کے عناصر اہم حیثیت رکھتے ہیں۔

i- علاقائی سالمیت :-

ریاست کو اپنے وجود کو منوانے کے لئے علاقائی سالمیت کا تحفظ کرنا پڑتا ہے۔ سرحدوں کی موثر حفاظت بھی ریاستوں کی خارجہ پالیسی کی بنیاد ہوتی ہے۔ ریاست کی اس حکمت عملی کی بدولت دیگر ہمسایہ ریاستوں کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے جو اس پر حملہ کرنے کا ارادہ رکھتی ہوں۔ بھارت نے روس کے ساتھ ۹ اگست ۱۹۷۱ء کو ایک دفاعی معاہدہ کیا جس کی بارہ دفعات میں ایک اہم دفعہ یہ تھی۔

"بھارت پر حملہ کی صورت میں روس براہ راست مداخلت کرے گا"

امریکہ اور مغربی یورپی ممالک نے روسی خطرے کے پیش نظر اپریل ۱۹۴۹ء کو معاہدہ شمالی اوقیانوس NATO کیا۔ روس اور مشرقی یورپ کے ممالک نے اپنے تحفظ کے لئے مئی ۱۹۵۵ء میں معاہدہ وارسا کیا۔ آج تقریباً سبھی ممالک دوسرے ممالک سے اپنے علاقائی تحفظ کی خاطر دفاعی معاشی معاہدات کرتے ہیں۔

ii- سیاسی آزادی :-

سیاسی آزادی کا مسئلہ بھی علاقائی سالمیت کی طرح ریاستوں کی خارجہ پالیسی کی ہمیشہ اساس رہا ہے۔ دور جدید میں جب تمام ریاستیں قومیت کی بنیاد پر ظہور پذیر ہو رہی ہیں۔ تو سیاسی آزادی کا مسئلہ اور زیادہ اہمیت اختیار کر گیا ہے سیاسی آزادی کی عدم موجودگی میں ریاست کی خارجہ پالیسی کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے اور اکثر ممالک ایسی ریاست کی حکومت کو تسلیم بھی نہیں کرتے جیسے آج کل افغانستان کو سیاسی آزادی میسر نہیں ہے۔ شیخ مجیب کے دور حکومت میں بنگلہ دیش کو سیاسی آزادی حاصل نہ تھی۔ پولینڈ ہنگاریہ اور چیکوسلواکیہ وغیرہ کو سیاسی آزادی حاصل نہیں ہے اس طرح مجلس اقوام کے انتدابی نظام اور اقوام متحدہ کے امانتی نظام کے ماتحت آنے

والے علاقوں کو بھی سیاسی آزادی حاصل نہ تھی۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ آج کی ترقی پذیر ریاستیں بڑی ریاستوں کے کنٹرول میں ہیں۔ بالفاظ دیگر اُن کے رحم و کرم پر ہیں۔ یہ بڑی ریاستیں ان کے اندرونی معاملات میں دخل اندازی کرتی رہتی ہیں اور یہ ترقی پذیر ریاستیں اپنے مفادات کی خاطر اُنہیں ایسا کرنے کی اجازت دیتی ہیں۔

۲۔ قومی حفاظت :۔ NATIONAL SECURITY

ہر ریاست اپنی قومی خارجہ پالیسی تشکیل دیتے وقت اپنی قومی حفاظت کو خصوصی اہمیت دیتی ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے وہ دوسری ریاستوں سے دفاعی معاہدے کرتی ہے تاکہ اپنی دفاعی پوزیشن کو مضبوط بنایا جا سکے بین الاقوامی تعلقات کی پوری تاریخ دفاعی معاہدات سے بھری پڑی ہے۔ موجودہ صدی کے چند مشہور معاہدے :۔

- معاہدہ لوکارنو اکتوبر ۱۹۲۵ء اس میں فرانس اور بلجیم نے اس بات کا عہد کیا کہ وہ جرمنی کے مغربی علاقوں کی سرحدوں کے لئے آپس میں جنگ نہیں کریں گے۔
- معاہدہ انزاس ۱۹۵۱ء اس معاہدے میں امریکہ آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ شامل تھے۔ امریکہ نے دیگر دو ممالک کو کمیونسٹ جارحیت کے خلاف ضمانت دی۔
- معاہدہ شمالی اوقیانوس اپریل ۱۹۴۹ء اس معاہدے کے تحت امریکہ کینیڈا اور مغربی یورپ کے ممالک روسی حملے کا جواب دینے کی صورت میں متحد ہوئے۔
- وارسا پیکٹ مئی ۱۹۵۵ء مغربی جرمنی کے ناٹو میں شمولیت مشرقی یورپ کے ممالک کے لئے نقصان دہ تھی۔ اس وجہ سے انہوں نے اپنے دفاع کے لئے روس کی سرپرستی قبول کر لی۔

قومی حفاظت کے لئے دفاعی معاہدوں کے علاوہ سفارتی تعلقات بھی قائم کئے جاتے ہیں۔ اور سفیروں کی وساطت سے بھی ریاستیں آپس میں تعاون قائم کر لیتی ہیں۔ مثال کے طور

پر آج دنیا کئی بلاکوں میں تقسیم ہے۔ مثلاً۔ اشتراکی بلاک، سرمایہ دارانہ بلاک۔ اسلامی بلاک تیسری دنیا ناوابستہ ممالک کی تحریک وغیرہ اس کا مطلب یہ ہوا کہ تمام ریاستیں اپنے حالات اور قومی ضروریات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے خارجہ پالیسی کا تعین کرتی ہیں۔

۳۔ اقتصادی ترقی :۔ ECONOMIC DEVELOPMENT

قومی خارجہ پالیسی کا ایک مقصد معاشی ترقی بھی ہوتا ہے معاشی ترقی کا انحصار صنعتی اور کاروباری ترقی پر ہے۔ اس مقصد کے لئے ضروری ہے کہ خام مال کی فراہمی سستے داموں ہو اور تیار شدہ مال کی کھپت کے لئے منڈیاں میسر ہوں۔ ترقی یافتہ ممالک مثلاً امریکہ۔ برطانیہ۔ جرمنی۔ جاپان۔ اور چین وغیرہ کی خارجہ پالیسی کا محور اپنے مال کی کھپت کے لئے منڈیوں کی تلاش ہے۔ جبکہ ترقی پذیر ممالک ترقی یافتہ ممالک کے اشتراک سے سرمایہ کاری کے معاملات کو ترجیح دیتے ہیں۔ پاکستان اور روس کے مابین "اسٹیل مل" کا منصوبہ معاشی ترقی کی ترجمانی کرتا ہے۔ پاکستان، ایران اور ترکی کے مابین آر۔سی۔ڈی کا قیام۔ مغربی یورپ کے ممالک بلجیم۔ ڈنمارک۔ فرانس، مغربی جرمنی۔ یونان۔ آئرلینڈ۔ اٹلی۔ لکسمبرگ۔ نیدرلینڈ اور برطانیہ کے مابین مشترکہ منڈی کا قیام اور مشرقی یورپ میں روس۔ ہنگری، چیکوسلواکیہ۔ رومانیہ۔ بلغاریہ۔ پولینڈ۔ البانیہ، مشرقی جرمنی، کیوبا۔ ویت نام اور منگولیا وغیرہ نے کومی کون کونسل کا قیام عمل میں لایا تاکہ معاشی ترقی کے لئے اقتصادی پالیسیوں کو مربوط کیا جاسکے۔

ایک وقت تھا جب اہل یورپ عربوں کا مذاق اڑاتے تھے اور ان کی عقل و فہم کے بارے میں طرح طرح کے لطیفے روز اخبارات کی زینت بنتے تھے۔ مگر آج جب ان کے تیل کی دولت پر پورے یورپ کی تمام تر رونق اور ترقی کا انحصار ہو کر رہ گیا ہے تو یورپ عربوں کی دوستی کا دم بھرتا ہے اور ان کے اقتدار کی پاسداری کرتا نظر آتا ہے۔ اس طرح ریاستوں کی خارجہ پالیسی میں معاشی عنصر انتہائی اہم اور موثر کردار ادا کرتا ہے۔ تمام بین الاقوامی تعلقات سیاسی سمجھوتے اور اتحادی معاہدے ریاستوں کے معاشی مفادات کے حصول کے گرد گھومتے ہیں یہانتک کہ ترقی پذیر ممالک کی آزادی بھی معاشی مفادات کی مرہونِ منت ہوتی ہے۔

۴۔ قومی طاقت :۔ NATIONAL POWER

ریاستیں ہمیشہ اپنی حفاظت کے پیش نظر اپنی قومی طاقت میں اضافے کیلئے کوشاں رہتی ہیں۔ قومی طاقت ریاست کا مقصد نہیں ہوتی بلکہ مقاصد کے حصول کا ذریعہ ہوتی ہے۔ مضبوط قومی طاقت کے بغیر کوئی ریاست عالمی برادری میں موثر کردار ادا نہیں کر سکتی۔ جب کوئی ریاست اپنی قومی قوت میں اضافے کیلئے ٹھوس اقدامات کرتی ہے تو دوسری ریاستوں کے ساتھ تعلقات کا مسئلہ بھی درپیش آتا ہے۔ جیسا کہ پاکستان نے امریکہ سے ایف ۱۶ طیارے خریدے تو بھارت کو اس سے تشویش ہوئی۔

آج اقوام عالم کی آخری خواہش یہی ہے کہ ان کی قومی طاقت میں زیادہ سے زیادہ اضافہ ہو ترقی یافتہ اور ترقی پذیر سبھی ملک اس میں برابر کے شریک ہیں۔ بہر حال یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ قومی طاقت قومی مفادات کے حصول تک رہنا چاہیئے۔ ورنہ اس کے خطرناک نتائج برآمد ہونگے

۵۔ قومی وقار و نظریات :۔ NATIONAL PRESTIGE AND IDEALOGY

قومی ریاست کی خارجہ پالیسی کی تشکیل کے وقت جہاں دیگر مقاصد کی طرف توجہ دی جاتی ہے۔ وہاں قومی وقار و نظریات کی حفاظت اور وسعت کو بھی مدِ نظر رکھا جاتا ہے امریکہ جمہوری نظریات۔ روس اشتمالی نظریات۔ چین اشتراکی نظریات۔ ہندوستان سیکولر نظریات اور پاکستان اسلامی نظریات کے تحفظ اور وسعت پر اپنی خارجہ پالیسیوں کی بنیاد رکھتے ہیں۔ روسی قائد لینن نے فرمایا۔

" اشتراکیت اور سرمایہ داری کا ایک ساتھ چلنا ناممکن ہے۔ دونوں نظام ایک دوسرے کے خلاف برسرپیکار ہیں۔ اور اس جدوجہد میں کسی ایک نظام کو دوسرے نظام پر حاوی ہوتا ہے"

قائد اعظم نے مسلم اتحاد کا یوں ذکر کیا ہے۔

" سیاسی اقتدار کا جو ڈرامہ فلسطین، انڈونیشیا اور کشمیر میں کھیلا جا رہا ہے۔ وہ ہماری آنکھیں کھولنے کیلئے کافی ہونا چاہیئے۔ ہم اپنے مسلم اتحاد ہی کے ذریعے دنیا کے مشورہ خانوں میں اپنی آواز کی قوت منوا سکتے ہیں۔"

نظریات کی ہم آہنگی مختلف ممالک کے مابین اتحاد و تعاون کے تعلقات کو فروغ دیتی ہے

مثلاً تمام اشتراکی ممالک کے روس سے گہرے تعلقات ہیں اسی طرح دنیا بھر کے اسلامی ممالک آپس میں بہت اچھے تعلقات قائم کئے ہوئے ہیں ۱۹۴۵ء کے بعد عالمی طاقتوں روس اور امریکہ کے مابین سرد جنگ بھی نظریات کی بالادستی کی جنگ ہے۔ دورِ جدید میں نظریات براہِ راست قومی طاقت کے ساتھ منسلک ہو گئے ہیں۔

جہاں تک قومی وقار کا تعلق ہے اس میں ریاست ہمیشہ عوامی دباؤ کے تحت ہوتی ہے اگر حکومت عوامی دباؤ کی پرواہ نہ کرے تو ملک میں انقلاب یا خانہ جنگی کی کیفیت ہو سکتی ہے یہی وجہ ہے کہ ایسی پالیسیاں جن کا تعلق براہِ راست عوامی یا ملکی وقار سے ہو حکومت فوری اقدامات کرنے سے گریز کرتی ہے اور اپنے مقاصد کے حصول کیلئے پہلے سے خاصہ پروپیگنڈا کرنا پڑتا ہے۔ حکومت پاکستان نے بنگلہ دیش کو منظور کرنے کا یہی طریقہ کار استعمال کیا۔ علاوہ ازیں اگر ملک میں طوفان سیلاب زلزلے وغیرہ کی تباہ کاریوں کی وجہ سے ہنگامی حالات کے اعلان پر بیرونی امداد حاصل کی جائے تو اس وقت بھی دشمن ریاستوں سے امداد نہیں لی جاتی۔ جیسا کہ ۱۹۷۰ء میں طوفان کی تباہ کاریوں کے باوجود پاکستان نے اسرائیل کی امداد عوامی دباؤ کے تحت قبول نہیں کی تھی۔

خارجہ پالیسی پر عمل درآمد کے اصول

THE OPERATION CRITERIA OF FOREIGN POLICY

ریاستیں اپنی خارجہ پالیسی مرتب کرنے وقت کئی اصولوں کو مدِ نظر رکھتی ہیں۔ بہرحال ان میں تین اصول بہت اہم ہیں۔ اول پالیسی کا ٹھوس ہونا۔ دوئم پالیسی کا لچکدار ہونا اور سوئم پالیسی کا مقاصد کے حصول میں موثر ہونا۔

۱۔ پالیسی کا ٹھوس ہونا۔ CONCERTNESS OF POLICY

خارجہ پالیسی کے ماہرین کے لئے ضروری ہے کہ وہ جس ریاست کی خارجہ پالیسی تعین یا مرتب کر رہے ہوں اس کے حالات اور عوام کی حیثیت سے پوری طرح واقف ہوں تاکہ پالیسی ٹھوس بنیادوں پر استوار ہو سکے۔ پالیسی جتنی ٹھوس ہوگی اتنا ہی اس پر عملدرآمد کا امکان زیادہ ہوگا۔ ٹھوس بنیادوں کا مطلب یہ ہے کہ خارجہ پالیسی قومی مفادات اور تسلیم شدہ حقائق کو بنیاد بنا کر مرتب کی جائے خارجہ پالیسی کی ناکامی سے اندرونی حکمت عملی بھی متاثر ہوتی

ہے۔ بعض اوقات اس سے ملک کی علاقائی سالمیت بھی خطرے میں پڑ جاتی ہے

۲۔ پالیسی کا لچکدار ہونا۔ FLEXIBLE POLICY

تاریخ عالم کا مطالعہ کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ دنیا میں عام طور تباہی و بربادی کی وجہ حکمرانوں اور بادشاہوں کی ہٹ دھرمی (غیر لچکدار پالیسی) رہی ہے۔ دور جدید میں جہاں حالات و واقعات میں بڑی تیزی سے تبدیلی آ رہی ہے ملک کی پالیسی لچکدار ہونا ضروری ہے تاکہ عام مفادات کی تکمیل کے لئے متبادل عناصر کو آسانی سے تلاش کیا جا سکے ورنہ قومی مفادات کے حصول میں رکاوٹ پیش آئے گی۔

۳۔ پالیسی کا مقاصد کے حصول میں مؤثر ہونا۔

ATTAINABILITY OF OBJECTIVE

خارجہ پالیسی کا تعین کرتے وقت مقاصد کے حصول کو بھی مدِ نظر رکھنا چاہیئے۔ یہ مقاصد ایسے ہونے چاہیئے جو ریاست کے مسائل کے مطابق ہوں اگر کوئی ریاست حقائق کو نظر انداز کر کے خارجہ پالیسی میں ایسے مقاصد اور امور شامل کر لیتی ہے جو قابل عمل نہیں ہیں تو اس سے ریاست کو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا جیسا کہ ایک برما جیسی چھوٹی ریاست چین جیسی بڑی ریاست کو شکست نہیں دے سکتی۔ چاند پر بستی بسانے اور خلائی تحقیق کے منصوبے امریکہ جیسے ملک ہی کو زیب دیتے ہیں۔ ایسی پالیسی امریکہ اور روس کے لئے ہی قابل قبول ہو سکتی ہے۔ پاکستان اور بھارت جیسے ترقی پذیر ممالک کیلئے ایسی پالیسی زیب داستان ہی ثابت ہو سکتی ہے لہٰذا خارجہ پالیسی قابل عمل اور مقاصد کے حصول کے یقینی حد تک قریب ہونی چاہیئے۔

خارجہ پالیسی پر عمل درآمد کے طریقے

THE EXECUTION OF FOREIGN POLICY

ریاست اپنی خارجہ پالیسی پر عملدرآمد کے لئے عموماً چار طریقے اختیار کرتی ہے۔
(۱) سیاسی طریقہ (۲) نفسیاتی طریقہ (۳) اقتصادی طریقہ (۴) مسلح طریقہ۔

۱۔ سیاسی طریقہ۔ POLITICAL METHODS

خارجہ پالیسی کے مقاصد کے حصول کے لئے سب سے زیادہ پُر امن اور مہذب طرز عمل

سیاسی طریقہ ہے۔ اس طریقے کا دارومدار سفارتکاری پر ہوتا ہے سفارتکاری کے بارے میں صرف اتنا عرض کردینا کافی سمجھتا ہوں کہ گفت وشنید کے ذریعے بین الاقوامی تعلقات کا طریقہ کار ہے۔ اس میں سفارتکار بات چیت کے ذریعے دوطرفہ اور تجارتی معاہدوں کو فروغ دیتے ہیں جس سے ریاستوں کے تعلقات پروان چڑھتے ہیں ثقافتی تجارتی اور دیگر ماہرین کے وفود کے تبادلے اور رابطے بھی اس قسم کی خارجہ پالیسی کی ایک کڑی ہیں

۲۔ معاشی طریقہ :- ECONOMIC METHODS

خارجہ پالیسی پر عملدرآمد کروانے کے لئے معاشی طریقہ بھی سیاسی طریقے کا ایک حصہ ہے اس میں ریاستیں پروپیگنڈا کے ذریعے اپنے ممالک کی خوشحالی بیان کرتی ہیں۔ اور آنے والے حالات کے بارے میں پیشن گوئیاں کی جاتی ہیں۔ عالمی تجارت میں اپنی مخصوص حکمت عملی کی بدولت طلب ورسد کا توازن بگاڑ دیا جاتا ہے۔ بعض اوقات مخصوص ممالک بین الاقوامی تجارت پر اجارہ داری قائم کر لیتے ہیں اور پھر اپنی مصنوعات یا خام مال کو معاشی ہتھیار کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ جیسے امریکہ۔ روس۔ فرانس۔ برطانیہ۔ اٹلی اور جرمنی وغیرہ اسلحہ برآمد کرتے ہیں۔ اسلحے کے بڑے بڑے خریدار۔ شام۔ لیبیا۔ سعودی عرب۔ بھارت۔ عراق۔ مصر۔ اسرائیل۔ جنوبی کوریا۔ ایران اور ویت نام ہیں۔ عربوں کی تیل کی برآمد پر اجارہ داری ہے جسے وہ خارجہ پالیسی کے مقاصد کے حصول کے لئے استعمال کرتے ہیں۔

موجودہ دور میں معاشی طریقے پر پہلے جتنا بھروسہ نہیں کیا جاتا۔ پہلے معاشی طریقے میں تجارتی بائیکاٹ قرضوں کی روک تھام تجارتی سہولتوں سے انکار کافی موثر تھے لیکن اب محدود حد تک ان اصولوں کے تحت دباؤ ڈالا جاسکتا ہے۔

۳۔ نفسیاتی طریقہ :- PSYCHOLOGICAL METHODS

نفسیاتی طریقہ میں پروپیگنڈا کے ذریعے دوسری ریاست کے شہریوں کو اپنی پالیسی کے حق میں تیار کیا جاتا ہے تاکہ رائے عامہ پالیسی کی افادیت کے قائل ہو کر اپنی حکومت پر دباؤ ڈالیں مثال کے طور پر پاکستان کا یہ پروپیگنڈا ہم بھارت کے ساتھ بہترین تعلقات چاہتے ہیں۔ اس سے بھارتی حکومت پر بھارتی مسلمان بھی بہتر تعلقات کیلئے دباؤ ڈالیں گے۔ اس مقصد کیلئے باقاعدہ

حکومت کی مشنری حرکت میں آ جاتی ہے۔ اس میں اخبارات۔ رسائل وجرائد۔ ریڈیو۔ ٹیلی ویژن لیٹریچر، ثقافتی یلغار، موسیقی۔ افواہ سازی اور خوف وہراس بھی۔ شامل ہیں۔ اگر سچ کے لیے پروپیگنڈا کیا جا رہا ہو تو پھر زیادہ محنت نہیں کرنا پڑتی۔ کیونکہ سچ خود ایک پروپیگنڈا ہے۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد ہٹلر اور مسولینی نے اپنی قوم کی کھوئی ہوئی طاقت کو بحال کرنے اور دوسری جنگ عظیم کے بعد امریکہ اور روس نے اپنے حلقہ اثر کو بڑھانے کے لئے پروپیگنڈا کا سہارا لیا جس میں سرد جنگ کی ابتدا ہوئی یہ سرد جنگ ۱۹۵۵ء میں جنیوا کانفرنس کے بعد پرامن بقائے باہمی میں تبدیل ہوگئی۔ اس وقت تک چین اور جاپان بھی عالمی سیاست میں اپنی حیثیت منوا چکے تھے۔ آج تقریباً سبھی بڑی اور چھوٹی طاقتیں اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے پروپیگنڈا کا ہتھیار یا نفسیاتی طریقہ استعمال کرتی ہیں۔

۴۔ مسلح طریقہ: ARMED METHODS

جب خارجہ پالیسی پر عملدرآمد کے پرامن طریقوں سے کام نہ چلے تو مقاصد کے حصول کا آخری طریقہ جنگ ہے۔ انسانی تہذیب نے جنگ کے ذریعے مسائل حل کرنے کا طریقہ باقی طریقہ کار سے بہت پہلے اپنا لیا تھا۔ قومی ریاستوں کے وجود میں آنے کے بعد پہلی جنگ اسپین، برطانیہ اور فرانس کے مابین ۱۵۸۵ء–۱۶۰۴ء لڑی گئی جس میں اسپین نے نئی دنیا کو چیلنج کیا کہ حق دیئے بغیر کسی چیز کو کارآمد نہیں بنایا جاسکتا۔

موجودہ صدی میں پہلی اور دوسری عالمگیر جنگیں بھی مسلح طریقہ کی عکاسی کرتی ہیں۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ جنگوں کے بعد دنیا کی وہی پوزیشن ہے جو جنگوں سے پہلے نظر آتی تھی۔ یعنی جنگوں نے مسائل حل نہیں کئے۔ ویسے جدید دور میں زبردستی اور جنگ کے ذریعے زیر کرنے کا طریقہ بس تھوڑا سا بدل گیا ہے۔ اب ریاستیں عام طور پر دھمکی سے کام لیتی ہیں ۱۹۵۶ء میں نہر سوئز کے معاملے میں روسی حکومت نے دھمکی دی کہ اگر اس معاملے کو مناسب طریقے سے حل نہ کیا گیا تو مداخلت کی جائے گی۔ کچھ عرصہ پہلے روس نے جاپان کو بھی دھمکی دی تھی کہ اگر اس نے امریکہ سے مزید ہتھیار لینے بند نہ کئے جس سے روسی سالمیت کو خطرہ ہے تو جاپان کو دوسری عالمگیر جنگ کی سی عبرتناک صورتحال سے دوبارہ دوچار ہونا پڑے گا۔

باب سوم

ریاستی تنازعات کی اکائیاں

INSTRUMENTS OF STATE INTERACTION

۱۔ ڈپلومیسی یا سفارتکاری

۲۔ پروپیگنڈہ

۳۔ توازن طاقت

۴۔ ریاستوں کے مابین تنازعات

۵۔ جنگ

۱۔ سفارتکاری

DIPLOMACY

تعریف :۔

آزاد اور خود مختار ریاستوں کے درمیان سرکاری گفتگو اور ذہانت کے حربوں کا نام ڈپلومیسی ہے۔

آکسفورڈ انگلش ڈکشنری کے مطابق :۔

ڈپلومیسی گفت و شنید کے ذریعے بین الاقوامی تعلقات کا طریقہ کار ہے

یا

وہ طریقہ کار جو سفیر یا سفارتکار باہمی معاملات میں فنی طور پر استعمال میں لاتے ہیں۔

یا

وہ طریقہ کار جس کے تحت ریاستوں کے درمیان تعلقات قائم اور برقرار رکھے جاتے ہیں۔

برطانوی مصنف ارنسٹ استوو کے مطابق :۔

" ڈپلومیسی ذہانت اور مہارت کے اس استعمال کو کہتے ہیں جو ریاستوں کی حکومتوں کے مابین سرکاری تعلقات کے معاملے میں عمل میں لائی جاتی ہے۔ "

اسٹالن کے بقول :۔

" ایک سفارت کار کے الفاظ کا اس کے اعمال سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اس کے الفاظ کچھ اور اعمال کچھ ہوتے ہیں۔ "

جدید دور کی ایک تعریف :۔

آزاد اور مقتدرہ ریاستوں کی حکومتوں کے مابین مواصلاتی رابطہ HOT LINE ڈپلومیسی کہلاتا ہے۔

خارجہ پالیسی اور ڈپلومیسی میں فرق:۔

خارجہ پالیسی تعلقات کی نوعیت ہے اور ڈپلومیسی وہ طریقہ کار ہے جس کے ذریعے خارجہ پالیسی پر عمل درآمد کیا جاتا ہے اس کی وضاحت یوں ہو سکتی ہے کہ ایک ملک کی حکومت اپنے سفارت کاروں کے ذریعے اپنی خارجہ پالیسی کے اصولوں کا اطلاق دوسرے ممالک پر کرتی ہے اور ایک مؤثر ڈپلومیسی کے ذریعے دوسری ریاستوں کے پالیسی ساز افراد کے فیصلوں کو براہ راست متاثر کر سکتا ہے اور اپنی خارجہ پالیسی کے اصولوں پر عمل درآمد کروا سکتی ہے۔

سفارت کاری کی درجہ بندی:۔ HIERARCHY OF DIPLOMACY

سفارت کاری میں سب سے بڑا درجہ سربراہ مملکت کو حاصل ہوتا ہے اور وہ تمام خارجی امور کا سربراہ ہوتا ہے۔ سفارتکاری کے افراد دو قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ جو اندرون ملک کام کرتے ہیں دوسرے وہ جو بیرون ملک ڈپلومیسی کا کام سرانجام دیتے ہیں۔

عام طور پر سفارت کار کا لفظ اُن ہی لوگوں کے لئے استعمال ہوتا ہے جو بیرون ملک اپنے ملک کی سفارتی خدمات انجام دیتے ہیں۔ بیشتر ممالک میں سفارتی عملے کو ایک پیشہ وارانہ بنیادوں پر منتخب کیا جاتا ہے جس کے لئے عموماً انہیں مقابلے کے امتحان میں شریک ہونا پڑتا ہے اور بعض افراد کو براہ راست بھی رکھ لیا جاتا ہے ترقی پذیر ممالک میں ریٹائرڈ سی ایس پی اور فوجی افسران اس سلسلے میں بڑے کام آتے ہیں۔ ماضی بعید میں سفارت کاروں کے لئے خاص یا مخصوص طریقہ کار نہیں ہوتا تھا۔ بادشاہ اپنی مرضی سے اپنے نمائندے مستقل اور عارضی بنیادوں پر بھیجا کرتے تھے لیکن آج کی ریاستیں اپنے مستقل سفیر بھیجتی ہیں اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ "مستقل سفارتی کمیشن کا ادارہ" موجودہ دور کی پیداوار ہے ایک ریاست کا اپنا سفارتکار دوسرے ملک بھیجنا اور دوسرے ملک کا سفارت کار اپنے ملک میں رکھنا حق سفارتخانہ RIGHT OF LEGATION کہلاتا ہے

کانگریس آف ویانا ۱۸۱۵ء اور کانفرنس آف آیکس۔لا۔چاپل ۱۸۱۸ء کے تحت سفارت کاروں کو مندرجہ ذیل درجوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

۱۔سفیر اور کلیسائی نمائندے:۔

پوپ کے نمائندے اور سفیر پہلی قسم میں شامل ہیں یہ براہ راست سربراہ مملکت سے گفت وشنید کر سکتے ہیں۔انہیں ایکسیلنسی EXCELLENCY سے مخاطب کیا جاتا ہے۔

۲۔وکیل مختار اور غیر معمولی سیاسی نمائندے:۔

وکیل مختار اور غیر معمولی سیاسی نمائندے کا تعلق دوسرے درجے سے ہوتا ہے یہ سربراہ مملکت کے نمائندے نہیں ہوتے اس لئے اُسے دوسرے ملک کے سربراہ سے بھی براہ راست یا ذاتی طور پہ ملنے کی رعایت نہیں ہوتی لیکن رواجاً اُسے مختلف موقعوں پہ ملاقات کی رعایت حاصل ہوتی ہے۔

۳۔وکیل مقیم:۔

وکیل مقیم کی حیثیت تیسرے درجے کی ہوتی ہے اس درجے کو ۱۸۱۹ء میں سفارت کاروں میں شامل کیا گیا ہے۔وکیل مقیم اکثر بڑی طاقتوں کی جانب سے چھوٹی طاقتوں کی طرف بارہا بھیجے جاتے ہیں۔

۴۔ناظم الامور:۔

یہ وزیر خارجہ کا نمائندہ ہوتا ہے اور دوسرے ملک کے وزیر خارجہ کی طرف بھیجا جاتا ہے اس نسبت سے یہ اپنا خط تقرر وزیر خارجہ کو پیش کرتا ہے۔

۵۔ہائی کمشنر اور مقیم عام:۔

دولت مشترکہ کے ارکان میں برطانیہ ہائی کمشنر

کا تقرر کرتا ہے۔ اس کے علاوہ ایسے ممالک جنہیں خارجہ تعلقات قائم کرنے کا حق نہیں ہوتا۔ وہ دوسری ریاستوں میں مقیم عام کا تقرر کرتی ہیں۔

انجمن سفارت کاراں :۔

کسی ریاست میں جب مختلف ریاستوں کے سفارت کار جمع ہو جاتے ہیں تو وہ سب مل کر ایک انجمن سفارت کاراں بنا لیتے ہیں اس جماعت کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہوتی اس جماعت کا بنیادی مقصد یہ ہوتا ہے کہ ریاست میں مقیم مختلف ممالک کے سفارت کاروں کے حقوق و مراعات کی حفاظت کرے اس کا سربراہ عام طور پر پوپ کا نمائندہ یا ریاست میں مقیم سب سے پرانا سفیر ہوتا ہے۔

سفارتکاروں کے فرائض

FUNCTION OF DIPLOMATIC ENVOYS

۱۔ گفت و شنید :۔ NEGOTIATION

ایک سفیر دوسری ریاست میں تمام بین الاقوامی تعلقات و معاملات کے سلسلے میں اپنی ریاست کی نمائندگی کرتا ہے۔ ہر وقت ہر موضوع پر بات چیت کے لئے تیار رہتا ہے۔ اپنی ریاست اور بیرون ریاست کے مابین ذرائع ابلاغ کا بھی وسیلہ ہوتا ہے۔

۲۔ نمائندگی :۔ REPRESENTATION

سفارت کار دوسری ریاست میں اپنی ریاست کی نمائندگی کرتا ہے اس لئے اس کا فرض ہے کہ دوسری ریاست کے خارجہ عہدیداروں سے بہتر معاشرتی روابط قائم رکھے۔ علاوہ ازیں دیگر ممالک کے سفارتی نمائندوں سے بھی تعلقات قائم کرنے کی کوشش کرے۔ مختلف تہواروں کے مواقع پر وہاں کے عوام اور دیگر ممالک کے سفارت کاروں کو اپنی حکومت کی پالیسیوں سے آگاہ کرے اور اگر وہاں کے عوام میں کوئی غلط فہمی پیدا ہو گئی ہو تو اُسے دور کرے۔

۳۔ اطلاعات :۔ REPORTING

سفارت کار کا ایک فرض یہ بھی ہے کہ وہ ہر موقعے اور موقع کا اپنے طور پر بغور

مشاہدہ OBSERVATION کرے اور اس کے نولئہ ومضمرات کی اطلاع اپنی حکومت کو دے۔

۴۔ مفادات کا تحفظ :۔ PROTECTION OF INTEREST

سفارت کار کا فرض یہ ہے کہ وہ اپنے ان شہریوں کی جان ومال اور مفادات کی حفاظت کرے جو اس ملک میں زندگی بسر کر رہے ہوں مثال کے طور پر امریکہ میں پاکستانی سفیر کو صرف پاکستان کا نقطہ نظر ہی واضح نہیں کرنا ہوتا بلکہ امریکہ میں مقیم پاکستانی باشندوں کے مفاد کا تحفظ بھی کرنا ہوتا ہے۔

سہولتیں و مراعات :۔ PRIVILEGES AND IMMUNITIES -

۱: سفارت کاروں کو ذاتی حفاظت کی ضمانت دی جاتی ہے

۲: سفارت کار پر فوجداری عدالت میں مقدمہ نہیں چلایا جا سکتا۔ لیکن اگر سفارت کار بغاوت یا کسی بڑے جرم میں ملوث ہو تو اُسے حراست میں لے کر واپس بھیج دیا جاتا ہے۔

۳: سفارت کار فوجداری کے علاوہ دیوانی اختیار سماعت سے بھی بری الذمہ ہوتے ہیں۔ بہرحال اگر سفارت کار اپنی صفائی پیش کرنا چاہے تو ایک عام شہری کی حیثیت سے دیوانی عدالت میں پیش ہو سکتا ہے۔

۴۔ سفارت کاروں کی سرکاری رہائش گاہ کو بھی وہی حیثیت حاصل ہوتی ہے جیسے وہ مرسل الیہ ریاست کے علاقے میں شامل ہی نہیں۔ لیکن اگر کوئی سفارت کار مجرمین کو پناہ دے تو اُسے یہ رعایت حاصل نہیں رہتی۔

۵۔ سفارت کاروں کو اپنے مذہب کے مطابق عبادت کا پورا پورا حق حاصل ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں ایک بات یہ ہے کہ اگر اس ریاست کا مذہب کچھ اور ہو نیز ملکی قانون کے تحت سفارتی نمائندوں کو مذہبی تبلیغ سے روک دیا گیا ہو تو وہ اپنی سرکاری رہائش گاہ میں مذہبی عبادت کے لئے اس ریاست کے باشندوں کو دعوت وغیرہ نہیں دے سکتے۔

۶۔ سفارتی نمائندوں سے محصولات یا کسٹم ڈیوٹی وغیرہ وصول نہیں کی جاتی۔ اس رعایت کی کوئی قانونی حیثیت نہیں بلکہ یہ ایک بین الاقوامی رواج ہے۔

۷۔ سفارتی نمائندوں کو اپنی ذمہ داریوں پر عمل درآمد کے لئے مواصلات کے آزادانہ استعمال کی آزادی ہوتی ہے ان کے خطوط کو کھولا نہیں جاتا اور نہ ہی ان کے مواصلاتی نظام میں غیر ضروری خلل ڈالا جاتا ہے۔

۸۔ سفارتکاروں کے ذاتی و گھریلو ملازمین بھی مخصوص وخصوصی مراعات کے مستحق ہوتے ہیں یہ دیوانی و فوجداری کی گرفت سے آزاد ہوتے ہیں اگر سفارتکار چاہے تو ان حقوق سے دستبردار بھی ہو سکتا ہے۔

سفارتی مشن کا اختتام:- TERMINATION OF DIPLOMATIC MISSION

سفارتی مشن مندرجہ ذیل وجوہات کی بنا پر برخاست ہو سکتا ہے۔

۱۔ ریاستوں کے مابین تعلقات بہت کشیدہ ہو جائیں، جنگ وغیرہ تک نوبت آ جائے تو سفارتی تعلقات منقطع ہو سکتے ہیں۔

۲۔ سفارتی مشن کے اختتام کی دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ مرسل الیہ ریاست کی طرف سے سفارتی نمائندوں کی واپسی کا مطالبہ کیا گیا ہو یہ سفارتی عملے کی طرف سے ناپسندیدہ افعال کے ارتکاب کی صورت میں ہو سکتا ہے۔

۳۔ حکومت یا حکومتوں کی تبدیلیوں کی بدولت بھی سفارتی مشن اختتام پذیر ہو سکتا ہے

۴۔ کبھی کبھی ریاستیں مخصوص مقاصد کے لیئے تعلقات قائم کرتی ہیں اور جب یہ مقاصد پورے ہو جاتے ہیں تو سفارتی مشن کا اختتام ہوتا ہے۔

۵۔ کوئی ریاست دوسری ریاست میں شامل ہو جائے یا الحاق کر لے تو سفارتی مشن ختم ہو جائے گا۔

ڈپلومیسی کے خواص:-

سفارتکاری ایک علم بھی ہے اور فن بھی اس کی ابتدا علم سیاسیات کی طرح یونان سے ہوئی۔ چار سو سال قبل مسیح میں یونانیوں کے ہاں ایک کانفرنس کے انعقاد کا پتہ چلتا ہے جو انہوں

نے اسپارٹا اور ایتھنز کے خلاف کارروائی کے سلسلہ میں منعقد کی تھی۔ حکومتوں اور ریاستوں کے درمیان جدید خطوط پر مذاکرات کی ابتدا انقلاب فرانس اور امریکہ کی خانہ جنگی کے بعد ہوئی انقلاب اور خانہ جنگی سے ان ملکوں میں عوامی خواہشات و جذبات نے حکومت کی پالیسیوں پر اثر انداز ہونا شروع کر دیا جس سے حکمرانوں کو یہ احساس ہو گیا کہ ڈپلومیسی میں عوامی رائے عامہ کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس عمل کی بدولت ڈپلومیسی میں نمایاں تبدیلیاں ہوئیں اور ڈپلومیسی محض حکمرانوں کی نمائندگی کے بجائے قوم کی نمائندگی کا فن بن گئی۔ اٹھارہویں صدی سے قبل سفارتکاروں کا تعلق عموماً اُمراء اور صنعتکاروں کے طبقے تک محدود تھا اور حکومتیں انہیں ہی اس قسم کے فرائض کی انجام دہی کے لئے منتخب کرتی تھیں۔ مگر اٹھارویں صدی کے بعد سے جمہوری ڈپلومیسی کی اصطلاح عام ہو گئی یعنی عوام بھی اس میں شامل ہو گئے مگر اس سلسلے میں ماہرین ڈپلومیسی اعتراض کرتے ہوئے نظر آنے لگے۔

ماہرین کا خیال ہے کہ عام آدمی عالمی مسائل اور خود اپنی ریاست کے مسائل پر اتنی گہری نظر نہیں رکھتا کہ وہ کسی دوسری ریاست کے افراد یا سفارتکاروں سے ذمہ دارانہ گفت و شنید کر سکے۔ ماہرین نے اس پر دوسرا اعتراض یہ کیا کہ عام آدمی اپنے مطالعہ و مشاہدہ میں کمی کے باعث کسی بھی غیر ذمہ دارانہ افعال کا مرتکب ہو سکتا ہے۔ جس کی وجہ سے ریاست کو خواہ مخواہ شرمندگی برداشت کرنی پڑتی ہے۔

اس لئے ڈپلومیسی کے مسائل و فرائض کو مخصوص ماہرین تک محدود رکھنے پر زور دیا گیا ہے۔

ڈپلومیسی کے کئی نمایاں فرائض کی نشاندہی کی جا سکتی ہے جس کے مطالعہ سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ یہ ایک دشوار گزار کام ہے۔ ڈپلومیسی کے نمایاں فرائض حسب ذیل ہیں۔

۱۔ ڈپلومیسی۔ دباؤ ڈالنے کیلئے :۔

ڈپلومیسی میں دباؤ ڈالنے کے عنصر کو بھر پور دخل ہے۔ یہ اقدام سیاسی ذرائع کی موجودگی میں یا انفرادی قوت و دانش کے بل بوتے پر انجام دیا جاتا ہے۔ مثلاً مذاکرات میں الٹی میٹم دینا۔ کسی فریق کے لئے وقت کی پابندی اور حدود کو سخت کرنا۔ رسمی اور غیر رسمی احتجاج۔ نفسیاتی دباؤ ڈالنا وغیرہ ان سب باتوں کا بنیادی مقصد صرف یہ ہے کہ دوسروں سے اپنی رائے یا نقطہ نظر کو دوسروں پر دباؤ ڈال کر تسلیم کروایا جائے۔

۲۔ ڈپلومیسی، ترغیب و مصالحت کا طریقہ کار:۔

ڈپلومیسی میں ترغیب و مصالحت کے عناصر کا بھی بڑا دخل ہے۔ ایک طرف گفتگو کو آگے بڑھانا اور دوسری طرف تجاویز و ترغیب کا جال پھینکنا سفارت کاری کی مہارت میں شامل ہے۔ ایک سفارت کار مصالحت کو قریب لاکر دور اور دور سے قریب لانے کی بڑی مہارت رکھتا ہے اور یہی ڈپلومیسی کی کامیابی کا طرہ امتیاز ہے۔

۳۔ ڈپلومیسی۔ پائیدار تعلقات قائم کرنیکا طریقہ:۔

ڈپلومیسی دو ریاستوں کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ اچھے اور پائیدار تعلقات قائم کریں اور کسی مسئلہ کے پر امن تصفیئے کے لئے نقطہ نظر میں تبدیلی پیدا کرنے پر مجبور کرتی ہے ریاستوں کو لچکدار موقف کی افادیت سے روشناس کرواتی ہے جس سے ریاستوں کے درمیان پائیدار تعلقات قائم ہوتے ہیں۔

۴۔ ڈپلومیسی۔ لالچ یا اکسانے کا طریقہ:۔

سفارت کار دوسری ریاستوں کو لالچ یا اکسانے کا طریقہ کار بھی آزماتے ہیں اس سلسلے میں عموماً بڑی طاقتیں ... پذیر ممالک کو فنی ماہرین فوجی امداد اور ترقیاتی منصوبوں میں سرمایہ کاری کا لالچ دیکر انہیں اپنے مقاصد سے باز رکھتی ہیں اور انہیں مخصوص قسم کے معاہدوں میں شامل کر لیتی ہیں

۵۔ ڈپلومیسی۔ معاہدے کو استوار کرنیکی تکنیک:۔

ڈپلومیسی معاہدے تک رسائی کے لئے بلاشبہ ایک اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اس لئے کہا جاتا ہے کہ ڈپلومیسی تحریری معاہدوں کیلئے مذاکروں کا فن ہے اور اس فن کے لئے جن باتوں کی ضرورت ہے ان میں بہت ہی کم اختلاف پائے جاتے ہیں اس لئے ایک سفارت کار میں چار خوبیوں کا ہونا ضروری قرار دیا جاتا ہے۔

۱۔ احساس اور ادراک کا حامل ہو ، اپنی پالیسیوں کی مشکلات اور حقائق سے پوری طرح

واقفیت رکھتا ہو۔

(ب) لچکدار پالیسی کا حامل اور مفید مقاصد کے حصول کے لیے چھوٹی چھوٹی باتوں کو نظر انداز کرتا ہو۔

ج۔ ایک اچھے سفارتکار کو اپنی قابلیت اور استعداد پر بھروسہ کرتے ہوئے کبھی بھی ریاستی وسائل کی حدود کو عبور نہیں کرنا چاہیئے۔

(د) ماضی حال اور مستقبل کی عالمی سیاسیات پر نظر رکھے اور اپنے بیانات کی تعبیر و تشریح سے اچھی طرح واقف ہو۔

ڈپلومیسی کی اقسام

ڈپلومیسی کی اہم اقسام حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ دوطرفہ ڈپلومیسی:۔

ایسی ڈپلومیسی جو سیکرٹری خارجہ یا دوسرے سفارتکار ذاتی طور پر سرانجام دیتے ہیں۔ اس میں سفارتکار کی ذاتی رازدارانہ گفتگو کو بڑا کمال حاصل ہوتا ہے۔ اس میں جو کامیابی حاصل ہوتی ہیں ان میں بیرونی مداخلت کے آثار بہت ہی کم ہوتے ہیں۔ ممکنہ عارضی تعلقات کو ختم کرنے کے لئے بہت کام کی چیز ہے۔

ڈوطرفہ ڈپلومیسی کثیر الاطراف ڈپلومیسی میں زینے کا کام دیتی ہے۔

۲۔ کثیر الاطراف ڈپلومیسی:۔

کثیر الاطراف ڈپلومیسی میں بنیادی طور پر ڈو ممالک مذاکرات کرتے ہیں۔ ان مذاکرات کے اثرات بہرحال زیادہ ممالک پر پڑتے ہیں۔ اس کی ایک اہم مثال جاپانی معاہدہ ستمبر ۱۹۵۱ء اس معاہدے میں جاپان اور امریکہ کے مابین بات چیت کے ذریعے بہت سارے امور سان فرانسسکو کانفرنس ۴ ستمبر تا ۸ ستمبر ۱۹۵۱ء سے پہلے ہی طے ہو گئے تھے۔ یہاں تک کہ جاپانی حکومت کی از سر نو تنظیم اور اس کے آئین میں ترمیم وغیرہ تک کر دی گئی تھی اس کانفرنس میں روس کو شامل

نہ کیا گیا جس کی وجہ سے مشرقی یورپ کے ممالک نے بائیکاٹ کیا۔ اتحادیوں اور امریکہ نے اس سے فائدہ اٹھایا۔
ڈپلومیسی کا یہ طریقہ کار مختلف بلاکوں کی تشکیل کی حوصلہ شکنی کرتا ہے مختلف ممالک میں اتحاد و بھائی چارے کی فضا ہموار کرتا ہے۔

۳۔ سربراہی ڈپلومیسی :- SUMMIT DIPLOMACY

اس قسم کی ڈپلومیسی عام طور پر ریاستوں کے سربراہ انجام دیتے ہیں چوٹی کی کانفرنسوں میں عام طور پر سربراہ مملکت شرکت کرتے وقت ان کی کامیابی یا ناکامی پر زیادہ توجہ نہیں دیتے اس وجہ سے کچھ کانفرنسیں ایسی ہوتی ہیں جن میں صرف سربراہ مملکت و حکومت ہی شرکت کرتے ہیں اس کی اہم مثالیں۔
اسلامی کانفرنس کی تنظیم۔ ناوابستہ ممالک کی تنظیم۔ افریقی ممالک کی تنظیم وغیرہ کی سربراہی کانفرنسیں قابل ذکر ہیں۔ اسے چوٹی کی ڈپلومیسی بھی کہا جاتا ہے۔

۴۔ ڈیموکریٹک ڈپلومیسی :- DEMOCRATIC DIPLOMACY

یہ موجودہ صدی کی پیداوار ہے۔ اس میں عوامی خیالات و رجحانات کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے البتہ ماہرین ڈپلومیسی اس طریقہ کار کو زیادہ اچھا نہیں سمجھتے۔ ان کے خیال میں سفارتی تعلقات صرف ایسے افراد کو سونپے جانے چاہیئے جو اس میدان میں ماہر ہوں بقول نیکولسن "جمہوری ڈپلومیسی کی پہلی خرابی مقتدر افراد کی غیر ذمہ داری ہے دوسری خامی یہ ہے کہ عام آدمی عالمی مسائل سے پوری طرح واقفیت نہیں رکھتا اس لئے صحیح تجزیہ نہیں کر سکتا ہے"
اگرچہ ڈیموکریٹک ڈپلومیسی جمہوری معاشروں کے لئے بہتر ثابت ہوئی ہے مگر اس سے بعض اوقات بڑے بڑے بحران بھی پیدا ہوتے ہیں۔

۵۔ کھلی ڈپلومیسی :- OPEN DIPLOMACY

کھلی ڈپلومیسی اور جمہوری ڈپلومیسی ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں۔ پہلی عالمی جنگ کے دوران امریکی صدر ولسن نے کھلی ڈپلومیسی کا نعرہ لگایا۔ اور اپنے چودہ نکات میں خفیہ ڈپلومیسی کی

ممانعت کی۔ میثاق انجمن اقوام کے ذریعے کھلی ڈپلومیسی کو عام کرنے کی بھرپور کوششیں کی گئیں۔
موجودہ دور میں U.N.O بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ عملی زندگی میں اس طریقہ کار کو
بعض اوقات ناممکن طریقہ کار سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ کیونکہ ریاستوں کے مابین کچھ مسائل
ایسے بھی طے کیے جاتے ہیں جن کو کھلے عام بیان کرنے سے ان کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے
بقول امریکی صدر ولسن:۔

"کھلی ڈپلومیسی کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ نجی مسائل پر بحث ہی نہ کی جائے۔ بلکہ
اس کا مقصد یہ ہے کہ کوئی فیصلہ خفیہ نہ رکھا جائے اور بین الاقوامی تعلقات کھلی فضا میں
قائم کئے جائیں۔"

۶۔ خفیہ ڈپلومیسی :۔ SECRET DIPLOMACY

خفیہ ڈپلومیسی کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ اس کی سب سے زیادہ مخالفت پہلی عالمی
جنگ ۱۹۱۴-۱۹۱۹ء میں کی گئی۔ کیونکہ پہلی اور دوسری عالمی جنگیں خفیہ ڈپلومیسی ہی کا نتیجہ
تھیں۔ اس وجہ سے اسے ایک قابل مذمت فعل قرار دیا گیا۔ لیکن ایک فرانسیسی سفارتکار
نے خفیہ معاہدوں کی حمایت کرتے ہوئے کہا ہے۔

"جس دن رازداری ختم ہو جائے گی اس دن سے معاہدے بھی ختم ہو جائیں گے۔"
اس دلیل میں یہ خیال پوشیدہ ہے کہ عوام حقائق اور سچائی کا سامنا کرنے سے عموماً گھبراتے
ہیں۔ اب بین الاقوامی سیاسیات میں بھی تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ دو قطبی نظام جو قائم ہوا تھا
اب اس کی جگہ کثیر قطبی نظام نے لے لی ہے اور یورپ فیصلوں کے مرکز کی حیثیت سے ابھرا ہے
تیسری دنیا کے ممالک ایک الگ بلاک بن گئے ہیں اور ترقی پذیر ممالک کے لئے یہ کیسے ممکن
ہے کہ تمام بلاکوں کے ساتھ آزادانہ تعلقات قائم کریں۔ چنانچہ انہیں مجبوراً خفیہ ڈپلومیسی
کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

۷۔ آمرانہ ڈپلومیسی :۔ TOTALITARIAN DIPLOMACY

آمرانہ ڈپلومیسی جمہوری ڈپلومیسی کے اُلٹ ہے یہ حکمرانوں کی مرضی اور منشا کے
مطابق ہوتی ہے۔ اس کے بحیثیت مجموعی دنیا پر منفی اثرات مرتب ہوئے ہیں اور عالمی امن

کو دھچکا لگا ہے۔ مثلاً نپولین مولینی اور ہٹلر کی ڈپلومیسی۔

دراصل حقیقت یہ ہے کہ تمام آمر اس دنیا میں فاتح کی حیثیت سے رہنا چاہتے تھے۔ اور چاہتے ہیں۔ اور اپنی نسل یا قوم کی برتری کو ثابت کرنے کیلئے ان کو لازماً جنگ کرنی پڑتی ہے آمرانہ ڈپلومیسی نے سفارتکاروں کو مجبور کیا کہ وہ ایسے طریقوں پر عمل پیرا ہوں جن سے دوسری ریاستوں میں انتشار پھیلے۔ وہاں کی قیادت کمزور ہو۔ تاکہ آمرانہ پالیسیوں کے نفاذ میں کسی دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ آمرانہ ڈپلومیسی نے مجلس اقوام اور انجمن اقوام متحدہ میں بھی سازشی مقاصد کو استعمال کیا۔ جرمنی اور روس نے اس قسم کے حربے استعمال کیئے۔ ان کے نزدیک ڈپلومیسی کے اخلاقی و روائتی طریقوں کو اپنانے میں مقاصد کی تکمیل دشوار تھی۔ انہوں نے دوسرے سفارتی نمائندوں کو مقررہ شہر سے باہر جانے پر پابندی عائد کی اور سرکاری افسران سے ملاقات میں دشواریاں پیدا کیں۔ مذاکرات میں حقارت آمیز سلوک برتا اس طرح وہ اپنے مفادات کے پیش نظر آمرانہ ڈپلومیسی نافذ کیے رہے روسی قائدین کا خیال تھا:۔

"جب تک سرمایہ داری نظام اندرونی کمزوریوں کی وجہ سے تباہ نہیں ہوجاتا بیرونی دباؤ کی یہ صورت بہرحال بحال رکھنی چاہیئے۔"

لیکن بعد کے حالات نے یہ ثابت کردیا کہ ایک دوسرے کو زیر کرنا مشکل ہے تو دونوں ممالک نے پرامن بقائے باہمی کی پالیسی پر عمل کرنا شروع کردیا۔

۸۔ کانفرنس کے ذریعے ڈپلومیسی: DIPLOMACY BY CONFERENCE

یہ ڈپلومیسی کا جدید رجحان ہے اس میں منفی رجحان رکھنے والی ریاستوں پر کانفرنس کے ذریعے اخلاقی دباؤ ڈالا جاتا ہے۔ چند ایسی مشہور کانفرنسیں جو ڈپلومیسی کا درجہ رکھتی ہیں

(۱) ویسٹ فالیا کانفرنس ۱۶۴۸ء۔ موجودہ قانون بین الاقوام اور عملی سفارتی تعلقات قواعد کو ترقی دی۔

(۲) کانگریس آف ویانا ۱۸۱۵ء سفارتکاروں کی درجہ بندی، وجود اور فرائض۔

(۳) کانگریس آف ایکس۔ لا۔ چیپل ۱۸۱۸ء اس میں بھی سفارتکاروں کے فرائض اور کارکردگی

پر توجہ دی گئی۔

(۴) برلن کانگریس ۱۸۷۸ء علاقائی ڈپلومیسی کیلئے جو ملکوں کو اپنے مفادات کے تحفظ کرنے کے طریقے اور ذرائع بتاتی ہے۔

(۵) پیرس کانگریس ۱۸۵۶ء۔ جنگ کریمیا کے مسئلہ کو حل کرنے کیلئے منعقد ہوئی۔

آج کل ہر سال ہزاروں کانفرنسیں اقوام متحدہ کے اندر اور باہر منعقد ہوتی ہیں۔ ماہرین کا خیال ہے کہ دنیا میں امن وامان بحال کرنے میں ان کانفرنسوں نے بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ اور بین الاقوامی تعلقات میں اعتدال پیدا ہوا ہے۔

اقوام متحدہ کے ذریعے ڈپلومیسی DIPLOMACY BY U.N.O.

اقوام متحدہ کے ذریعے جو ڈپلومیسی ہوتی ہے اس کو پارلیمانی ڈپلومیسی بھی کہا جاتا ہے کیونکہ جنرل اسمبلی کی حیثیت ایک مقننہ LEGISLATURE کی سی ہوتی ہے۔ یہاں ⅔ کی اکثریت سے فیصلے کئے جاتے ہیں۔ اور دوسری ریاستوں پر اخلاقی دباؤ ڈالا جاتا ہے کہ وہ اکثریت کی رائے کا احترام کریں۔ انجمن اقوام متحدہ ڈپلومیسی کا آخری قدم ہے اگر ڈپلومیسی کے عمل درآمد میں مثبت اندازِ فکر کے اصولوں کو سامنے رکھا جائے تو بہت سارے مسائل زیادہ وقت ضائع کئے بغیر حل ہو سکتے ہیں۔

۲۔ پروپیگنڈہ

PROPAGANDA

پروپیگنڈہ ایک نفسیاتی جنگ ہے۔ جس میں علاقوں کی جنگ کی بجائے ذہنوں کو تقسیم کیا جاتا ہے۔ اور پروپیگنڈا کے بل بوتے پر پوری قوم کو اپنے ساتھ ملایا جاتا ہے۔ یہ ساری کارروائی نہایت پرامن اور دوستی کی فضا میں ہوتی ہے، پروپیگنڈا کا عملی استعمال زمانہ قدیم سے مذہبی حلقوں میں مذہب کی ترغیب و اشاعت کے سلسلے میں کیا جا رہا ہے۔ لیکن صنعتی انقلاب کے بعد اسے سیاسی مقاصد کے حصول کے لئے بھی استعمال کیا جانے لگا۔ ۱۸۵۲ء میں بسمارک نے اخبارات کو اپنی خارجہ پالیسی کی زیادہ سے زیادہ تشہیر کے لئے استعمال کیا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد پروپیگنڈہ کے طریقوں اور استعمال میں بڑی تیزی سے اضافہ ہونا شروع ہو گیا۔

بیسویں صدی کے ابتدائی ادوار میں حکمرانوں نے پروپیگنڈے کو بہت ترقی دی۔ اٹلی میں فاشیوں جرمنی میں نازیوں۔ روس میں کمیونسٹوں اور چین میں سوشلسٹوں نے اس کو اپنے مقاصد کے حصول اور رائے عامہ کو اپنے حق میں ہموار کرنے میں زیادہ سے زیادہ استعمال کیا۔

آج پروپیگنڈہ قومی پالیسی کا آلہ بن گیا ہے۔ اس طرح نفسیاتی طریقے سے تمام ریاستیں اپنی قومی پالیسیوں کی تشہیر کے لئے دوسری ریاستوں کی رائے عامہ کو متاثر کرنے کیلئے بڑے زور و شور سے سرگرم عمل ہیں۔

پروپیگنڈا کی تعریف

"پروپیگنڈا پہلے سے طے کردہ مقاصد کی خاطر دوسروں کے خیالات اور احساسات کو متاثر کرنے کی کوشش کا نام ہے۔" ہلر

ایک اور تعریف:

"مقتدر ریاستیں اپنے مفاد کی تکمیل اور اپنے قومی مقاصد کے حصول کے لئے اپنے ملکی وسائل کا بھرپور استعمال کرتی ہیں اور اپنی قومی طاقت کو بڑھانے کے لئے تمام ممکنہ طریقوں کو اپناتی ہیں ریاست کی انتظامیہ شہریوں کی توجہ اس جانب راغب کرنے کے لئے جو نفسیاتی طریقہ استعمال کرتی ہے۔ اسے

پروپیگنڈہ کہتے ہیں۔

پروپیگنڈہ کے طریقے :- TECHNIQUES OF PROPAGANDA

عملاً کسی چیز کے پروپیگنڈہ کے لئے دو طریقے استعمال کئے جاتے ہیں۔"

۱۔ خوف دلا کر۔

۲۔ لالچ دے کر۔

یہ انسانی فطرت ہے کہ وہ دوسروں کی باتوں میں آجاتا ہے اور جب اسے کسی شئے کے مہلک نتائج سے آگاہ کیا جائے اور کسی مخصوص شئے کی پیش کش کی جائے تو وہ اس کی طرف راغب ہو جاتا ہے۔ یہ عمل ایک انسان کو لالچ دیکر بھی کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اس مخصوص شئے کی خرابیاں اس کے سامنے ہوتی ہیں۔ خوف اور لالچ کا یہی طریقہ انسانوں سے ہٹ کر ریاستوں پر بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ کیونکہ دو افراد کے مسائل ریاستوں کے مسائل سے مختلف نہیں ہوتے۔"

آج پروپیگنڈہ کے بے شمار طریقے ایجاد ہو چکے ہیں مگر ان میں چار بہت اہم ہیں :-

پیشکش کا طریقہ :-

پیش کش کے طریقے میں لالچ کا عنصر غالب ہوتا ہے۔ اس طریقے میں مسئلے کا صرف ایک پہلو اُجاگر کیا جاتا ہے۔ جس میں حقائق بھی ہو سکتے ہیں لیکن معاملہ اس کے برعکس بھی ہو سکتا ہے مثال کے طور پر دوسری جنگ عظیم سے پہلے ہٹلر کا یہ دعویٰ تھا کہ اسے صرف سوڈیٹسن کا جرمن علاقہ درکار ہے لیکن اس پیشکش کے پیچھے چیکوسلواکیہ کے کنٹرول کے عزائم پنہاں تھے۔ امریکہ کی دفاعی اور اقتصادی امداد کی پیش کش پر پاکستان سیٹو اور سینٹو کا ممبر بنا۔

بعض اوقات اس قسم کے پروپیگنڈا کے لئے فرضی اور جھوٹی دستاویزات بھی تیار کرنی پڑتی ہیں دوسری جنگ عظیم کے دوران نازیوں کا ایک پروپیگنڈہ یہ تھا کہ یہودی پوری دنیا پر حکومت کرنا چاہتے ہیں۔ نازیوں نے اسے سچ ثابت کرنے کے لئے ایک کتاب "زیون کے عقلمند آدمی کا پروٹوکول" PROTOCOLS OF THE WISEMAN OF ZION.

پیش کی۔ (مغربی مفکرین کی رائے) جسکے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ یہ کتاب روس کے بالشویک انقلاب کے بعد جرمنی گئی تھی۔ ہٹلر کے ساتھی جوزف گوئبلز جو پروپیگنڈا کے محکمے کا سربراہ

تھا۔ اس کا قول تھا۔ "جھوٹ اتنا بولو کہ سچ نظر آنے لگے۔"

پروپیگنڈہ کی پیش کش ہمیشہ برائی پر مبنی نہیں ہوتی بلکہ سچ بذات خود ایک موثر پروپیگنڈا ہے۔ جیسے چرچل کے برطانوی وقار اور عظمت کے لئے جذباتی نعرے۔ ان سے مخالفین کو برطانوی طاقت کا احساس ہوتا تھا اور قومی یکجہتی کو تقویت ملتی تھی۔ بعض اوقات کسی معاملہ میں کوئی دعویٰ کرنا بھی اس قسم کے پروپیگنڈا کی شکل ہے۔ مثلاً پولینڈ پر جرمنی کا دعویٰ۔ تائیوان پر چین کا دعویٰ کشمیر پہ پاکستان کا دعویٰ۔ لبنان پر عربوں کا دعویٰ وغیرہ کے اقدامات پروپیگنڈا کی اس ضمن میں آتے ہیں۔

۲۔ توجہ مبذول کرانے کا طریقہ :۔

پروپیگنڈا کے سب سے زیادہ موثر ہونے کا انحصار زیادہ سے زیادہ افراد کی توجہ اس مسئلہ کی طرف مبذول کرنے پر ہوتی ہے۔ ریاستوں کے حکمرانوں کے پیغامات۔ تقریریں یا اعلانات احتجاجات۔ فوجی پریڈ اور صنعتی اشیا کی نمائش وغیرہ کے مظاہرے سب اس سلسلے کی کڑیاں ہیں اسطرح کی قوت کا مظاہرہ رومیوں کے دور سے ہوتا چلا آرہا ہے۔ اٹلی جرمنی۔ روس نے موجودہ صدی میں قوت کا مظاہرہ مختلف انداز میں کیا ہے۔
آج تک ایٹمی دھماکوں، مصنوعی سیاروں۔ ہائیڈروجن بموں۔ نیوکلیئر پلانٹوں اور چاند ستاروں پر کمندیں ڈال کر دوسروں کو اپنی طرف متوجہ کیا جارہا ہے۔ عہد حاضر میں سفارتخانوں میں ثقافتی شو دستاویزی فلمیں۔ اولمپک گیمز اور غیر ملکی سربراہوں کے دورے دوسروں کی توجہ مبذول کروانے کے کام آتے ہیں۔

۳۔ ردعمل حاصل کرنے کا طریقہ :۔

ہیگل کا کہنا ہے کہ ہر قوت اپنی مخالف قوت کو جنم دیتی ہے۔ بادشاہت کے عمل سے جمہوریت کی قوت۔ سرمایہ داری۔ اشتراکیت کو جنم دیتی ہے۔ اس طرح پروپیگنڈہ کی تکنیک جب توجہ حاصل کرتی ہے۔ تو اس کا ردعمل ہوتا ہے۔ اور یہ ردعمل مثبت حاصل کرنے کے لئے بعض اوقات جذباتی قسم کے نعروں سے کام لیا جاتا ہے۔ مثلاً امن سب کا حق ہے۔ زمین کسانوں کی ہے۔ جمہوریت بحال کرو۔ مزدوروں کو روزگار دو۔ آزادی تقریر و تحریر انسان کا پیدائشی حق

ہے۔ روٹی کپڑا اور مکان بنیادی ضرورت ہے۔ کبھی بھی حکومت وقت بھی ایسے پلان تیار کرتی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ ملک ۵ سال میں جنت کا حصہ بن جائے گا۔ گورنمنٹ کے اس پروپیگنڈے کا مقصد ملکی استحکام اور عوام کو مطمئن کرنا ہوتا ہے۔

دوسری عالمی جنگ کے بعد روس کی طرف سے پروپیگنڈہ کیا گیا۔ کہ یورپی لوگ جنگ سے تنگ آ چکے ہیں اور وہ کمیونزم سے بھی اتحاد کر لیں گے اس کے برعکس امریکہ نے کمیونزم کے خطرات گننے شروع کیے۔ اسرائیل ہمیشہ اپنی پالیسیوں کو یکساں رکھنے کا پروپیگنڈا کرتا ہے۔ اس کا مقصد عربوں کے رویے پر اثر انداز ہونا ہوتا ہے۔ پاکستان میں مسٹر بھٹو نے روٹی، کپڑا، مکان اور صدر ضیاء الحق اسلامی نظام حیات کا نعرہ لگا کر پر حکومت کر رہے ہیں۔

۴۔ قبولیت حاصل کرانے کا طریقہ:

پروپیگنڈا کو مقبولیت حاصل کرانے کے لئے مختلف ذرائع ابلاغ کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ ان میں اخبارات، رسائل و جرائد، ریڈیو ٹیلی ویژن نشریات، لٹریچر، ثقافتی یلغار، موسیقی، افواہ سازی اور خوف و ہراس سے کام لیا جاتا ہے اگر سچ کے لئے پروپیگنڈہ کیا جا رہا ہو تو پھر زیادہ محنت نہیں کرنی پڑتی کیونکہ سچ بذات خود ایک پروپیگنڈہ ہے۔

پروپیگنڈہ کو مقبول بنانے کے لئے روس نے نعروں کا سہارا لیا، جرمنی کے ہٹلر نے نسل پرستی، اٹلی کے مسولینی نے قوم پرستی کے بل بوتے پر پروپیگنڈہ کیا اور اپنے مطلوبہ مقاصد حاصل کرنے کی کوشش کی۔ مرحوم صدر ایوب خان کہتے تھے کہ پاکستانی افواہ سازی کے ماسٹر ہیں۔ ساری عوام میں خوف و ہراس پھیلا سکتے ہیں اور غلط قسم کے نعروں کو صحیح ثابت کر سکتے ہیں جیسے اسلام خطرے میں ہے اور صوبائی خودمختاری کا فقدان ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

آج کی ساری سیاست ایک نفسیاتی سیاست ہے۔ دفتر خارجہ میں ماہرین نفسیات بٹھائے جاتے ہیں۔ جو دوسری اقوام کی جبلت کا مطالعہ کرتے ہیں۔ لیکن پاکستان کے دفتر خارجہ میں ابھی تحقیق کا شعبہ قائم نہیں کیا گیا۔ اپنی بات اس مصرعے پر ختم کر رہا ہوں

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالبؔ

پروپیگنڈا اور سیاسیات عالم

پروپیگنڈا ایک نفسیاتی جنگ ہے جو بغیر ہتھیاروں کے لڑی جاتی ہے اس میں علاقوں پر قبضہ کے بجائے ذہنوں پر حکمرانی کی جاتی ہے اس کے برعکس گرم جنگ میں ہتھیاروں کا آزادانہ استعمال ہوتا ہے اور اس کے پس پردہ توسیع پسندی کے عزائم پنہاں ہوتے ہیں اس گرم جنگ کی کامیابی کے لیے آج کل نفسیاتی جنگ بڑا اہم کردار ادا کرتی ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ آج کی گرم جنگ کی کامیابی کا دارو مدار ہی نفسیاتی جنگ پر ہے۔ آج وہی ممالک دنیا میں حکمرانی کر سکتے ہیں جن کے پروپیگنڈا کے ذرائع بہتر ہوں۔ بین الاقوامی تعلقات میں پروپیگنڈا کا استعمال تو صنعتی انقلاب کے بعد سے ہی ہو گیا تھا۔ لیکن اس کا عام استعمال پہلی عالمی جنگ ۱۹۱۴ء-۱۹ء میں شروع ہوا۔ اور اس کے اثرات پوری دنیا پر مرتب ہوئے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مقاصد اور مفادات کے حصول کے لیے انسانی تاریخ میں سب سے زیادہ کام قوت کے استعمال سے کیا گیا ہے۔ لیکن موجودہ دور میں قوت کے ساتھ ساتھ پروپیگنڈا کا بھی استعمال ہو رہا ہے۔ دو عالمگیر جنگوں کے درمیانی عرصہ میں پروپیگنڈا کی اس دوڑ میں اٹلی جرمنی اور روس سب سے آگے رہے۔ اٹلی کی فاشسٹ پارٹی اور مسولینی کی قیادت نے انتہائی پر اثر پروپیگنڈا کیا۔ مسولینی نے اطالوی قوم کو دنیا کی "عظیم قوم" SUPER NATION قرار دیا۔ مسولینی نے کہا کہ وہ یونان، ترکی اور مصر کو قبضے میں لے کر اٹلی کے اس قید خانے کی زنجیریں توڑنا چاہتا ہے جس میں وہ مقید ہے۔ اس کے علاوہ لیبیا کو سوڈان کے ذریعے حبشہ سے ملا کر اور کیپ الکاہل کو جنوبی افریقہ سے ملا کر بحر ہند کی طرف بڑھنا چاہتا ہے تاکہ ایک عظیم اطالوی سلطنت قائم ہو سکے۔

یہ وہ دور تھا جب جرمنی میں ہٹلر مکمل طور پر اقتدار پر قبضہ کر چکا تھا۔ ہٹلر کو "ہیل ہٹلر" HEIL HITLER کہہ کر سلوٹ کیا جاتا تھا جس کے معنی ہیں۔ کہ خدا ہٹلر کو سلامت رکھے۔ ہٹلر نے معاہدہ ورسائلز ۱۹۱۹ء کے خلاف پروپیگنڈا کیا جرمن عوام کو آرین نسل قرار دے کر دنیا کی سب سے افضل نسل بنا دیا جرمنوں کے اندر

یہ احساس پیدا کیا کہ وہ صرف حکمرانی کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔ اس طرح ہٹلر نے
بڑے سائنسی انداز میں پروپیگنڈا کر کے جرمنوں کے اندر ایک نئی روح پھونک دی۔
روس میں ۱۹۱۷ء کے بالشویک انقلاب کے بعد ۱۹۳۶ء تک ایک مضبوط آمر حکومت قائم
ہو چکی تھی۔ اس حکومت نے نئے انداز اور سوشلزم و کمیونزم کی اشاعت کے لئے
دنیا کو نئے ترقی پسندانہ نعروں سے ہمکنار کیا۔ تمام لوگوں کو اُن کی ضرورت کی ضمانت
دولت کی مساوی تقسیم اور محنت کشوں کی حکومت کا پروپیگنڈا کیا۔ سوشلزم، کیمونزم
اور پرولتاری حکومت کے نعروں تلے پوری دنیا کے مزدوروں کو متحد کرنے کی کوششیں
کیں۔ اپنے مخالفین کو سرمایہ دار، بورژوا اور سامراجی وغیرہ کے خطابات سے نوازا۔
اور انہیں عالمی مسائل کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ عوام میں اتحاد اور جدوجہد کے لئے تمام
طبقوں کے خاتمے کا تصور اس قدر حسین بنا کر پیش کیا۔ جس نے پوری دنیا کے غریب
عوام پر گہرے اثرات مرتب کئے۔ دوسرے ملکوں میں بھی کمیونسٹ پارٹیاں بننے لگیں
پروپیگنڈا کے ذریعے سخت قسم کی نفسیاتی، جذباتی اور دہشت کی فضا کو ہوا دی گئی
اور آج بھی یہ صورت حال محدود شکل میں جاری ہے۔

ستمبر ۱۹۳۹ء کو دوسری عالمی جنگ شروع ہوئی۔ جنگ کے دوران اتحادیوں
نے وسیع پیمانے پر محوریوں کے خلاف پروپیگنڈا کیا۔ مختلف ریڈیو اسٹیشن قائم کئے امریکہ
اور برطانیہ نے مل کر اپنے ہیڈ کوارٹر میں پروپیگنڈائی جنگ کے لئے ایک بہت بڑا مرکز
قائم کیا جس کا مقصد جرمن پروپیگنڈا کو ناکام بنانا تھا۔ اتحادیوں نے ایسے ریڈیو اسٹیشن
قائم کئے جو اپنے آپ کو جرمن ریڈیو اور غیر جانبدار بتاتے تھے۔ لیکن یہ ساری چالیں فیل
ہو گئیں۔ کیونکہ ہٹلر نے بھی جوزف گوئبلز کی سربراہی میں پروپیگنڈا کی ایک علیحدہ وزارت
قائم کی ہوئی تھی جس نے پوری جرمن قوم کو واحد رائے عامہ کی شاہراہ سے ہموار کر لیا
تھا۔ اُن کے ذہنوں میں یہ چیز بٹھادی گئی تھی کہ جرمن فوج کو کبھی شکست نہیں
ہو سکتی۔ پہلی عالمی جنگ میں جو شکست ہوئی تھی اُس کی وجہ یہ تھی کہ جرمن فوج میں
یہودی عناصر بھی موجود تھے۔ جرمن قوم کے لئے اپنی برتری کے لئے جان دینا
تقدس کی علامت بن گیا تھا۔ جرمن قوم اپنی برتری کے لئے ہر محاذ پر لڑنے اور مرنے
کے لئے تیار تھی پروپیگنڈا کے ذریعے دوسری ریاستوں کے عوام و فوجوں کے

حوصلے پست کرنے کی کوششیں کی جاتی رہیں لیکن روسی محاذ کھلنے کی وجہ سے جرمنی کی افرادی قوت آڑے آئی اور اتحادیوں کے ساتھ بے شمار محاذوں پر لڑنے کے لئے افرادی قوت کی کمی کے باوجود جرمن شکست کے خوف سے آخری وقت تک فتح کی امید میں زبردست مقابلہ کرتے رہے۔

اتحادی بے شمار وسائل کی موجودگی میں بھی جرمنی، اٹلی اور جاپان کو بہت عرصے تک زیر کرنے میں ناکام رہے۔ بالآخر اتحادیوں نے ایٹم بم اگست ۱۹۴۵ء میں استعمال کئے جس سے محوری کیمپ نے ہتھیار ڈال دیئے۔

دوسری جنگ کے بعد روس اور امریکہ دو بڑی طاقتوں کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آئے۔ ان دونوں طاقتوں نے دوسری جنگ عظیم ۱۹۳۹-۴۵ء کے بعد اپنے نظریات و مفادات کے سلسلے میں بڑے زور و شور کے ساتھ پروپیگنڈا جاری رکھا ہوا ہے۔ جنگ کے بعد ۱۹۴۷ء سے روس اور امریکہ کے مابین سرد جنگ COLD WAR کا آغاز ہوا روس چونکہ اُس وقت واحد کمیونسٹ ملک تھا اس وجہ سے سب سے پہلے روس کی یہ کوشش تھی کہ وہ اپنے حلیفوں میں اضافہ کرے۔ اس سلسلے میں اُس نے مشرقی یورپ میں رومانیہ، بلغاریہ، ہنگری، چیکوسلواکیہ، یوگوسلاویہ پر اپنا اثر و رسوخ قائم کر لیا ۱۹۴۸ء میں روس دنیا کے سب سے بڑے ملک (بلحاظ آبادی) چین میں بھی اشتراکی انقلاب برپا کرنے میں کامیاب ہوگیا۔

دوسری طرف امریکہ نے یونان اور ترکی کو کمیونسٹوں کی سرگرمیوں سے بچانے کے لئے ٹرومین ڈاکٹرین کا اعلان ۱۹۴۷ء میں کیا اور ان ممالک کو امداد دی۔ ۱۹۴۹ء میں مارشل پلان پر عمل درآمد شروع ہوا جس کا مقصد جنگ سے تباہ حال اور ترقی پذیر ممالک کی اقتصادی امداد کرنا تھا۔ روس نے اس کے خلاف پروپیگنڈا کیا کہ امریکہ جرمنی کو دوبارہ مسلح کرنا چاہتا ہے۔ اپریل ۱۹۴۹ء میں امریکہ نے اپنے اتحادیوں کے دفاع کے لئے ناٹو کی تشکیل کی۔ اس کا مقصد ممبر ممالک کا مشترکہ دفاع تھا۔ اس کے جواب میں روس نے بھی مئی ۱۹۵۵ء کو اپنے حلیفوں کے ساتھ مل کر وارسا پیکٹ کیا۔ دیا جس سے یورپ دفاعی طور پر دو حصوں میں تقسیم ہوگیا۔ کوریا کی جنگ ۱۹۵۰ء سے بھی دونوں ممالک کے اختلافات میں اضافہ ہوا۔ یہ جنگ بھی روسی حکمت عملی کا نتیجہ تھی

۱۹۵۵ء کی جینوا کانفرنس کے بعد دونوں ممالک پُرامن بقائے باہمی کی پالیسی پر عمل درآمد کر رہے ہیں اس کی دو وجوہات ہیں۔ اوّل تو یہ کہ اب ابھی میدان میں کسی طاقت کو برتری نہیں رہی اور دوسرا یہ کہ اب عالمی سیاست میں دو قطبی نظام ختم ہو رہا ہے اور اس کی جگہ کثیر قطبی نظام لے رہا ہے۔ یورپ فیصلوں کے مرکز کی حیثیت سے اُبھر رہا ہے تیسری دنیا ایک الگ بلاک بن گئی ہے اور اب ان طاقتوں کے درمیان چین اور جاپان کی قوت بھی موجود ہے۔ امریکہ کے اس وقت چین کے ساتھ تعلقات بہت اچھے ہیں اور تجارت کو فروغ ہو رہا ہے۔ جبکہ چین روس کے ساتھ بھی اب اپنے تعلقات معمول پر لانے کی کوشش کر رہا ہے۔ ویسے بھی اب عالمی سیاست میں طاقت کے حصول کی جدوجہد کے بجائے، مال کی کھپت کے لئے منڈیوں کی تلاش اور حلقۂ اثر میں اضافے کیلئے کیا جا رہا ہے۔ اب پروپیگنڈا کا محور معاشی ترقی ہو گیا ہے۔

۳۔ توازن طاقت

BALANCE OF POWER

تعریفیں :- DEFINITIONS

۱۔ ریاستوں کے درمیان ایک ایسا منصفانہ توازن جو اُن میں سے کسی ایک کو دوسری پر اقتدار قائم کرنے سے روک سکے۔

(انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا)

۲۔ ایک ایسا نظام جو اس تصور پر قائم ہو کہ کسی خطے کی ریاستیں طاقت میں اس طرح توازن رکھتی ہوں کہ آپس میں توازن کے باعث کسی قسم کا قبضہ ناممکن ہو

(انسائیکلوپیڈیا انٹرنیشنل ریلیشنز)

۳۔ توازن طاقت سے مراد اقوام عالم کے خاندان کے ارکان کے درمیان طاقت کا ایک منصفانہ توازن ہے جو ان میں سے ہر ایک رُکن کو اس قدر طاقت ور بننے سے روکے جس سے وہ دوسرے ارکان پر اپنی مرضی زبردستی ٹھونس سکے۔

(پروفیسر سڈنی بی۔ فے)

۴۔ توازنِ قوت کے ہزاروں ممکنہ معنی ہو سکتے ہیں مگر سارا نظریہ اس بات پر مشتمل ہے کہ ترازو کے دو پلڑوں کی طرح کا ایک توازن ہے۔ جب تک دونوں پلڑوں کا وزن برابر ہوگا تو اس کا نتیجہ توازن ہوگا۔

(پروفیسر اے الف لارڈ)

۵۔ توازن طاقت بین الاقوامی سیاسیات کا قدرتی اصول ہے۔ جو عام اور سماجی اصولوں کا ڈھانچہ ہے۔

(ہنس جے مارگھنتھیو)

۶۔ توازن طاقت کا مطلب برابری یا مساوات کے ہیں۔

(چارج شوارزن برگر)

۷۔ توازن طاقت کو دو درجوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ درجہ اول میں توازن کا مطلب برابری اور درجہ دوئم میں یہ ایک قسم کی یکسانیت ہے۔ موصوف اس بات پر زور دیتا ہے کہ توازن طاقت کا نظریہ اول الذکر کا اظہار اور مؤخر الذکر کی پیروی کرتا ہے۔

(گلاورز ڈگسن)

۸۔ بین الاقوامی سیاست میں توازن طاقت سے مراد اقوام عالم کے درمیان طاقت کی اکائیوں کی کچھ اس طرح تقسیم سے ہے کہ کوئی ایک ملک اتنا طاقتور نہ ہو جائے کہ اطراف کے ممالک اپنے وجود وبقاء ومفاد کے لئے خطرہ محسوس کرنے لگ جائیں۔

(ڈاکٹر احمد عبدالقدیر حامد کراچی)

۹۔ ایک ماہر سیاستدان کا خیال ہے کہ توازن کا اصول تقریباً تمام علوم میں تسلیم اور استعمال کیا جاتا ہے۔ جیسے طبعیات حیاتیات معاشیات، عمرانیات وغیرہ اسی طرح علم سیاسیات میں بھی خود مختاری طاقت ور ریاستوں اور کمزور ریاستوں کے استحکام کے لئے توازن کا اصول ضروری ہے اگر معاشیات میں بچت اور سرمایہ کاری، درآمد و برآمد، قیمت و لاگت پیداوار اور ضرورت کے درمیان توازن ایک ضروری عنصر کی حیثیت رکھتا ہے۔ تو بالکل اسی طرح سیاسیات میں توازن طاقت ریاستوں کے درمیان ایک اہم عنصر کی اہمیت رکھتا ہے
آرنلڈ بی ہاس کہتے ہیں کہ یہ ایک مبہم تصور ہے۔ جس کے آٹھ جداگانہ معنی ہیں۔

(۱) مساوات جو قومی ریاستوں کی طاقت برابر تقسیم کرنے سے پیدا ہوتی ہے
(۲) مساوات جو قومی ریاستوں کی طاقت غیر منصفانہ تقسیم کرنے سے پیدا ہوتی ہے
(۳) مساوات جو ایک قومی ریاست کے تسلط کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے
(۴) ایک نظام جو ایک مناسب امن و استحکام پیدا کرتا ہے

(۵) ایک نظام جو عدم استحکام اور جنگ کی ترجمانی کرتا ہے

(۶) طاقتی سیاست

(۷) آفاقی قانون

(۸) پالیسی سازوں کے لئے ایک راہ نما کی حیثیت

توازن طاقت کی خصوصیات :-

CHARACTERISTICS OF BALANCE OF POWER

عام طور پر توازن طاقت سے مراد ہم مساوات لیتے ہیں. حالانکہ ایسا نہیں ہے کیونکہ تاریخ ہر لمحہ بدلتی رہتی ہے. تعلق کے رشتے بھی بدلتے رہتے ہیں. لہذا جب ہم توازن طاقت کی بات کرتے ہیں تو اس میں توازن کے ساتھ ساتھ عدم توازن بھی قائم ہو سکتا ہے.

توازن طاقت کی چند اہم خصوصیات مندرجہ ذیل ہیں.

(۱) توازن طاقت ایک عارضی چیز ہے. یہ ہمیشہ کے لئے قائم نہیں ہوتا بلکہ وقت اور حالات کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتا رہتا ہے.

(۲) نکلسن جے سپائک مین N.J. SPYKMAN کہتے ہیں توازن طاقت خدائی عطیہ نہیں ہے. بلکہ یہ انسان کی عملی مداخلت سے حاصل کیا جاتا ہے. ریاستیں اپنے اقتدار کی سلامتی اور اپنے وجود کے استحکام کے لئے ہر وقت کوشاں رہتی ہیں. موصوف کے مطابق توازنِ طاقت کی بنیاد ان اعمال پر ہے.

۱. اقتدار کی سلامتی ۲. اپنے وجود کی سلامتی

اس طرح توازن طاقت خارجہ تعلقات کا ایک سادہ سا حربہ ہے.

(۳) حقیقی توازن طاقت تو شاذ و نادر ہی قائم ہوتا ہے اور اگر ہو بھی جائے تو یہ شناخت مشکل ہے کہ توازن طاقت واقعی قائم ہوا ہے اس کا حقیقی امتحان باکسوٹی جنگ ہے مگر جنگ توازن قوت کو منتشر کر دیتی ہے

(۴) توازن طاقت کا رجحان نہیں "جوں کی توں" صورت حال کی طرف لے جاتا ہے لیکن تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ وہ اقوام جنہوں نے ان قوتوں کا کوئی اثر نہیں

لیا اُن کا انجام آخرکار تباہی ہوا ہے۔ لہٰذا موثر کردار ادا کرنے کے لئے توازن طاقت کو متحرک ہونا چاہیئے۔

(۵) مارٹن وہیٹ MARTIN WIGHT کہتا ہے ایک مورخ اور سیاست دان میں یہ فرق ہے۔ مورخ اس وقت توازن طاقت کی موجودگی کا اظہار کرے گا۔ جب اس کے نزدیک دونوں قوتیں کم و بیش یکساں طاقت کی حامل ہوں گی۔ لیکن سیاستدان اس وقت کہے گا کہ توازن قوت موجود ہے جب اس کے اپنے ملک کا پلّہ بھاری ہوگا۔

(۶) توازن طاقت کا اصل مقصد امن برقرار رکھنا نہیں بلکہ اس کا اصل محرک انصاف قائم کرنا ہے تاکہ ریاستوں کی آزادی و خود مختاری قائم رہے کبھی کبھی تو توازن طاقت کے طریقوں سے سرد جنگ شروع ہو جایا کرتی ہے

(۷) توازن طاقت کا یہ کھیل دراصل بڑی ریاستوں کا کھیل ہے چھوٹی ریاستیں محض اس کے نتائج سے متاثر ہوتی ہیں یا زیادہ سے زیادہ ان کی حیثیت تماشبین کی سی ہوتی ہے این جے اسپائک مین کہتے ہیں :۔

"جب تک کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ اتحاد نہیں کرتیں ان کی حیثیت محض باٹوں کی سی ہو کر رہ جائے گی جس کو دوسرے لوگ استعمال کریں گے۔"

(۸) توازن طاقت کا نظام جمہوریت اور آمریت دونوں کے لئے موزوں نہیں ہے کیونکہ جمہوریت اس سلسلے میں کوئی بہت زیادہ متحرک قوت فراہم نہیں کرتی اور آمریت میں آمر چاہتا ہے کہ توازن طاقت پر بھی اس کی آمریت قائم ہو

(۹) روایتی اصطلاح میں توازن طاقت کا مطلب یہ ہے کہ ریاستوں کے درمیان ایک ریاست اپنا وجود برقرار رکھ سکے۔ لیکن ایک خیال یہ ہے کہ ریاستوں کے تعلقات کی نوعیت تبدیل ہوتی رہتی ہے اس لئے ضروری نہیں ہے۔ کہ توازن طاقت حاصل کرنے سے ایک ریاست کی سیاسی حالت پہلے جیسی رہے اس لئے ماہرین کا خیال ہے کہ موثر توازن طاقت ——————— ہی مفید اور ضروری ہے

(۱۰) عہد بہ دور میں توازن طاقت کی حیثیت بالکل تبدیل ہو گئی ہے۔ مختلف

ریاستیں ترقی کرکے عالمی سطح پر آگئی ہیں۔ آج کا نظام ایک قطبی اور دو قطبی کے بجائے کثیر قطبی نظام ہے جس کی وجہ سے توازن قائم کرنے والا کوئی ایک ملک نہیں رہا۔ جیسا کہ پچھلی صدی میں تھا۔

توازن طاقت قائم کرنے کے طریقے

METI ITAINING BALANCE OF POWER

توازن طاقت قائم کرنے کے مندرجہ ذیل طریقے ہیں۔

اتحاد اور جوابی اتحاد ۱۔

CREATING ALLIANCE AND COUNTER ALLIANCES

اتحاد اور جوابی اتحاد توازن طاقت کا ایک عام سا طریقہ ہے۔ اتحاد دو قسم کے ہوتے ہیں

۱۔ جارحانہ اتحاد۔ OFFENSIVE ALLIANCE

ایسا اتحاد جو توازن طاقت کو اپنے ارکین کے حق میں جمع کرتا ہے

۲۔ مدافعانہ اتحاد۔ DEFENSIVE ALLIANCE

ایسے اتحاد کو کہتے ہیں جو توازن قوت کو بحال کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ تمام اقوام اپنے اتحاد کو مدافعانہ اتحاد ہی کہتی ہیں۔ ۱۸۸۲ء میں اتحاد ثلاثہ (جرمنی، آسٹریا، اٹلی) کے وجود میں آنے کی وجہ سے توازن طاقت بگڑنے لگا تو اس کے جواب میں اتلانت ثلاثہ (فرانس، برطانیہ، روس) وجود میں آیا۔ اس طرح موجودہ عہد میں ناٹو ۱۹۴۹ء کے مقابلے میں وارسا پیکٹ ۱۹۵۵ء ہوا۔ روس اور امریکہ کے موجودہ اتحاد کو " اتحاد عجیب " کا نام دیا گیا ہے۔ اگر سفارتی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو اتحادات مستقبل میں جارحیت کے آئینہ دار ہوتے ہیں اس لئے اتحادات صرف وقتی طور پر ہی فائدہ مند ثابت ہوتے ہیں۔ یہ بات بھی مشاہدے میں آئی ہے کہ اتحاد عارضی ہوتا ہے اور جب تک ایک ریاست کا مفاد اس میں شامل ہوتا ہے اس وقت تک ریاست اتحاد سے منسلک رہتی ہے اور جب ریاست کو اتحاد

میں مفاد کے بجائے نقصان نظر آئے تو ریاست اتحاد سے الگ ہو جاتی ہے۔ جیسے پاکستان کا سیٹو اور سینٹو کی رکنیت سے علیحدگی اختیار کرنا

۲۔ تلافیاں :۔ COMPENSATIONS

توازن طاقت کو برقرار رکھنے کی دوسری ترکیب "تلافی" ہے۔ یہ مرحلہ بیشتر جنگ کے خاتمے پر ہوتا ہے۔ تلافی سے مراد کسی ریاست کو اس کا وہ توازن عطا کرنا ہوتا ہے جس سے وہ دوران جنگ محروم ہو گئی ہو۔ تلافی کی مشہور ترین مثال پولینڈ کی تین بار تقسیم ۱۷۷۲ء، ۱۷۹۳ء اور ۱۷۹۵ء پہلی عالمی جنگ ۱۹۱۴-۱۹ء کے بعد معاہدہ ورسائی ۱۹۱۹ء میں اسی اصول کو اپنایا گیا۔ جرمنی کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اتحادیوں نے آپس میں تقسیم کر لیے۔

مارگن تھیو کا خیال ہے۔ مفتوحہ علاقوں کی تقسیم جو جنگ کے تاوان کے طور پر عمل میں آتی ہے۔ عام طور پر یہ توازن طاقت کے اصول کی بنیادی کڑی ہے دوسری عالمی جنگ ۱۹۳۹-۴۵ء کے بعد اقوام متحدہ کے ذریعہ حق خود ارادیت کے اصول کو تسلیم کئے جانے کی وجہ سے موجودہ دور میں بظاہر اس کا براہ راست عمل ختم ہو گیا ہے

۳۔ اسلحہ سازی و تخفیف اسلحہ ARMAMENTS AND DISARMAMENTS :

توازن طاقت کے لئے یہ ایک ناپائیدار اور متحرک طریقہ ہے کیونکہ اس طریقے کو اختیار کرنے سے دو خطوں یا ملکوں کے درمیان اسلحہ سازی کی دوڑ شروع ہو جاتی ہے۔ رقابتیں بڑھنے لگتی ہیں۔ صورت حال سنگین ہونا شروع ہو جاتی ہے نیز یہ توازن ہمیشہ عارضی ہوتا ہے۔ مثلاً پہلی جنگ سے قبل جرمنی اور برطانیہ کے درمیان بحری مقابلے کی دوڑ دوسری جنگ کے بعد روس اور امریکہ کے مابین اسلحہ کی دوڑ جاری ہے۔ حالانکہ تخفیف اسلحہ کے سلسلے میں روس اور امریکہ کے مابین سالٹ اول ۱۹۷۲ء میں ہی طے پا گیا تھا۔

ماہرین کا تخفیف اسلحہ کے بارے میں خیال ہے :۔

(۱) ہر ریاست کے پاس صرف اتنا اسلحہ ہونا چاہیئے جو اس کی علاقائی سالمیت

کے لئے کافی ہو۔

(۲) انتہائی تباہ کن ہتھیاروں کو سرے ہی سے ختم کر دیا جائے۔

(۳) مزید اسلحہ سازی بند کر دینی چاہیئے اور پہلے سے تیار شدہ اسلحہ تباہ کر دینا چاہیئے۔

اس سلسلے میں اقوام متحدہ بھی سرگرم عمل ہے۔

۴۔ مداخلت اور عدم مداخلت INTERVENTION AND NON-INTERVENTION

یہ کردار صرف توازن کنندہ ریاست ہی انجام دے سکتی ہے۔ مداخلت کے معنی یہ ہیں کہ کسی ملک کے ساتھ شریک ہو جائے۔ یہ پالیسی عام طور پر بڑی طاقتیں اختیار کرتی ہیں اور عدم مداخلت کی پالیسی سے مراد دوسرے ملک یا ممالک سے ناوابستگی کا اظہار کرنا ہے۔ یہ پالیسی عام طور پر ترقی پذیر ممالک اختیار کرتے ہیں یا پھر وہ ممالک جو حالات سے مطمئن ہوتے ہیں اور طاقت کے توازن کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ پچھلی دو صدیوں میں برطانیہ کے ہنری ہشتم ۱۵۰۹-۴۷ء نے فرانس و آسٹریا کے مابین اور ملکہ الزبتھ نے اپنے دور حکومت میں فرانس اور اسپین کے مابین توازن قائم رکھا۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد بلاک سیاست کی وجہ سے توازن کنندہ BALANCER کا کردار کافی حد تک کم ہو گیا ہے۔ البتہ پھر بڑی طاقتیں اور اقوام کبھی کبھی توازن قائم کرنے کا کردار سرانجام دیتی رہتی ہیں۔

۵۔ فاضل ریاستیں: BUFFER STATES

دو قطبی یا کثیر قطبی نظام کے تحت توازن قوت اس وقت بہت خطرناک ہو جاتا ہے۔ جب درمیان میں کوئی فاضل ریاست یا علاقہ نہ ہو۔ فاضل ریاستوں کو توازن طاقت میں بڑی اہمیت حاصل ہے کیونکہ یہ مخالف قوتوں کے درمیان گہرے اثرات رکھتی

ہیں۔ یہ ریاستیں غیر جانبدار، طفیلی یا پھر ماتحتی بھی ہو سکتی ہیں۔

افغانستان روسی جارحیت سے قبل پاکستان اور روس کے درمیان فاصل ریاست کا کام دے رہا تھا۔ اسی طرح منچوریا چین اور روس کے درمیان بفر اسٹیٹ کا کام سرانجام دے رہا ہے۔ دو بڑی ریاستیں روس اور امریکہ ایک دوسرے سے ہزاروں میل دور ہیں ان کے درمیان ساری ریاستوں کا علاقہ بفر زون کہلاتا ہے جس کی وجہ سے روس اور امریکہ کے درمیان براہ راست جنگ نہیں ہو سکتی۔ اس سے نتیجہ یہ نکلا کہ فاصل ریاستیں توازن طاقت کو برقرار رکھنے میں مدد دیتی ہیں۔

۶- تقسیم کرو اور حکومت کرو — DIVIDE AND RULE

یہ پالیسی لازماً توازن طاقت کا ساتھ نہیں دیتی۔ رومیوں نے یہ طریقہ بکھرے ہوئے لوگوں پر کنٹرول حاصل کرنے کے لئے استعمال کیا۔ یہ طریقہ سامراجی قوتوں نے بھی ہمیشہ استعمال کیا ہے تاکہ مقامی آبادی کو غلامی میں رکھا جا سکے۔ اس پالیسی کے تحت برطانیہ نے برصغیر پر قبضہ کیا اور کئی سو سال تک اپنا تسلط قائم رکھا مشرقِ وسطیٰ کے ممالک پر فرانس اور برطانیہ نے یہی اصول اپنایا۔ آج روس اور امریکہ اس پالیسی پر گامزن ہیں۔ مشرقی یورپ پر اشتراکیت کی اور مغربی یورپ پر سرمایہ دارانہ نظام کی حکمرانی ہے۔

عہد جدید کا بین الاقوامی نظام: — THE BALANCE OF POWER IN MODERN AGE

دوسری عالمی جنگ کے بعد حالات یکسر تبدیل ہو گئے اور جنگ سے پہلے والا روایتی نظام ختم ہو گیا۔ جنگ سے قبل کثیر قطبی نظام قائم تھا اور سیاسیات عالم میں طاقت بے شمار اکائیوں میں تقسیم تھی۔ اس کا اصل مرکز یورپ ہی تھا۔ ساری عالمی سیاست یورپ کے گرد گھومتی تھی۔ بالفاظ دیگر عالمی سیاست پر مکمل طور پر یورپی ممالک کی اجارہ داری قائم تھی۔ خاص کر برطانیہ، فرانس، جرمنی اور اٹلی سرفہرست تھے۔ سپین پرتگال اور دیگر اسکینڈے نیوین ممالک اتنے اہم نہ تھے۔ روس کی اہمیت دوسری عالمی جنگ کے بعد ہوئی۔ اس سے قبل کے سالوں میں روس اپنے انقلاب اور انقلابی

تجربوں کو مستحکم کرنے میں مصروف رہا اور عالمی سیاست میں کھل کر کوئی کردار ادا کرنے کے قابل نہ تھا

جنگ کے بعد توازن طاقت کا ایک نیا نظام وجود میں آیا جسے ہم دو قطبی BI-POLAR نظام کہتے ہیں۔ امریکہ اور روس یورپ کی جگہ ابھر کر سامنے آئے۔ اور دونوں عظیم طاقتوں نے آہستہ آہستہ اپنی گرفت اتنی مضبوط کر لی کہ یورپ کے بیشتر ممالک ان کے حاشیہ بردار اور طفیلی بن کر رہ گئے۔ دنیا دو بلاکوں میں تقسیم ہو گئی، ایک اشتراکی بلاک اور دوسرا سرمایہ دارانہ بلاک اس کے بعد عالمی سیاست میں سرد جنگ COLD WAR کی کیفیت پیدا ہو گئی اور ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا سیاست کا مرکز یورپ کے بجائے ماسکو اور واشنگٹن بن گئے اور آج تک ہیں۔ یورپ جو ہمیشہ توسیع پسندی اور استعماریت کا علمبردار رہا مابعد جنگ اپنے معاشی و سیاسی زوال کے سبب اس موقف پر قائم نہ رہا کہ وہ اپنے زیر استعمار علاقوں پر نگرانی قائم رکھے گا۔ استعمار کی مشکلات کو دیکھتے ہوئے ایشیا و افریقہ کے محکوم و مظلوم عوام کے حوصلے بھی بلند ہونے لگے۔ ان کی ہمتیں بندھیں اور اپنی سیاسی تنظیموں کے توسط سے یہاں کے عوام نے اپنے حقوق منوانے کی جدوجہد شروع کی۔ حالات نے افریقی ایشیائی عوام کا بھرپور ساتھ دیا اور تھوڑے ہی عرصہ میں آزادی کی یہ تحریکیں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئیں اور سارے ایشیا اور افریقہ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

مارشل پلان اور ناٹو کے ہتھیاروں سے "تازہ دم ہونے کے بعد استعماری قوتوں نے آخری کوشش اپنے قدم جمائے رکھنے کی کی مگر کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ مصر میں انگریزوں کی ناکامی اور مشرق بعید میں فرانس کی تاریخی شکست نے افریقی ایشیائی عوام کے حوصلے مزید بلند کر دیئے اور ان ممالک کے عوام نے محسوس کر لیا کہ مغرب ناقابل تسخیر نہیں ہے۔ اگر جذبہ صادق ہو اور حوصلے بلند ہوں تو بڑے سے بڑے استعمار کو بھی نیچا دکھایا جا سکتا ہے۔ افریقہ اور ایشیاء کی آزادی کی تحریکوں کے سبب یورپ کے ممالک کا رہا سہا بھرم بھی جاتا رہا اور ان کے لئے صرف ایک ہی راستہ تھا کہ وہ دو عظیم طاقتوں میں سے کسی ایک کے ساتھ واسطہ قائم کریں۔ نتیجتاً مغربی یورپ امریکہ کے زیر اثر چلا گیا اور مشرقی یورپ روس کے تسلط میں آ گیا۔ اس نظریہ توازن طاقت کے

نظام کو ہم دو قطبی نظام کہتے ہیں۔ جو کثیر قطبی نظام MULTIPOLAR SYSTEM سے زیادہ سہل اور سادہ ہے۔

اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ موجودہ بین الاقوامی تعلقات میں کونسا نظام امنِ عالم کا ضامن ہے۔ یہ کہنا واقعی مشکل ہے کہ کونسا نظام توازن طاقت دائمی امن کے لئے مفید ہے مگر عام طور پر دو قطبی نظام کو زیادہ مؤثر سمجھا جاتا ہے۔ کثیر قطبی نظام میں طاقت کی اکائیاں کئی مرکزوں میں بٹی ہوئی ہوتی ہیں اور ہر اک کا محور، مقصد اور سوچ کا انداز مختلف ہوتا ہے۔ اس صورت میں اختلافات زیادہ اور شدید نوعیت کے ہوتے ہیں اور اپنے مقاصد کے حصول کے لئے دوسرے کا لحاظ کم ہی کیا جاتا ہے۔ جب طاقت کے کئی مراکز ہوں تو ان کی مجموعی نگرانی ناممکن ہو جاتی ہے کسی بھی وقت کوئی ملک جارحیت کا ارتکاب کر سکتا ہے اور دوسرے ممالک کا یکجا ہو کر مقابلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کیونکہ ہر ملک کا اپنا اپنا مفاد ہوتا ہے۔ اسی طرح کثیر قطبی نظام جوڑ توڑ کی سیاست کے تابع ہوتا ہے اور اس نوعیت کی دوستی یا اتحاد مصلحت کوشی کی خاطر ہوا کرتی ہے۔ اس میں خلوص کم ہوتا ہے۔ اس صورت میں نہ کوئی دائمی دوست تصور کیا جاتا ہے اور نہ ہی دائمی دشمن مقصد صرف مطلب برآری اور حصولِ منفعت ہوتا ہے۔ اس سیاست کے نتیجے میں جنگ ناگزیر ہو جاتی ہے۔

دو قطبی نظام توازن میں دنیا کی تقریباً تمام تر تباہ کن صلاحیت پر دو بڑی طاقتوں کی اجارہ داری ہے ان دونوں طاقتوں روس اور امریکہ کے مابین اپنی عسکری معاشی و سیاسی طاقت میں مزید اضافے کے لئے ایک مستقل کشمکش جاری ہے ہر ایک اپنے اتحادیوں کی مدد سے اپنی قوت کی بالادستی کے لئے کوشاں ہے۔ یہ کاوش اب ایک ایسی منزل پر پہنچ گئی ہے۔ کہ جہاں سے یہ اندازہ لگانا مشکل ہو گیا ہے کہ کون زیادہ طاقت در ہے۔ دونوں طاقتوں میں یہ صلاحیت یکساں نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دوسری عالمی جنگ کے بعد دونوں ممالک میں براہ راست تصادم نہیں ہو سکا۔ دونوں یہ سمجھتے ہیں کہ تصادم کے بعد نہ کوئی فاتح ہے گا اور نہ کوئی مفتوح۔ یہ بے یقینی کی کیفیت ہمارے دور میں غیر مستحکم امن کی ضامن ہے۔ مگر حقیقی صورت حال یہ ہے کہ دو قطبی نظام میں چھوٹے ملکوں کی سلامتی ان دو عظیم طاقتوں کی مرضی کے تابع ہو جاتی ہے جو ایک خوشگوار صورت نہیں۔ علاقائی جنگیں دکور یا

ویتنام وغیرہ) اس کی مرہون منت تھیں۔ عالمی سیاست میں یہ رجحان کسی بھی طرح عالمی امن اور چھوٹے ملکوں کی آزادی اور خود مختاری کا ضامن نہیں ہو سکتا۔ بڑی طاقتیں جب چاہیں جو چاہیں کر سکتی ہیں۔

چین اور تیسری دنیا کے ممالک سے تیسرے بلاک کے قیام کی کاوش بڑی حد تک مثبت قدم ہے اگر سیاسیات عالم کے افق پر تیسرا قطب فعال ہو جائے تو کمزور ممالک کے سہارے کو تقویت ملے گی کیونکہ آج ایک بار پھر استعماریت اور نوآبادیاتی نظام چور دروازے سے تیسری دنیا کے ممالک میں داخل ہونے کی کوشش کر رہا ہے اس کی بڑی وجوہات سائنس ٹیکنالوجی اور سرمایہ پر سپر پاورز کا مکمل کنٹرول ہے۔ عالمی سرمایہ کا کچھ حصہ پیٹرو ڈالرز PETRO-DOLLARS کی شکل میں تیل پیدا کرنے والے ممالک کے پاس ضرور آگیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود سائنس اور ٹیکنالوجی سے تیسری دنیا کے ممالک خالی ہیں۔ جب تک یہ صورت حال تبدیل نہیں ہو جاتی۔ اس وقت تک سہ قطبی نظام توازن طاقت نہیں کیا جا سکتا۔ توازن طاقت کے نظام میں ایک اہم عنصر ایٹمی توانائی کا بھی ہے۔ یہ عنصر اتنی اہمیت اختیار کر گیا ہے کہ آج کے نظام کو جوہری توازن طاقت ATOMIC BALANCE OF POWER کہا جاتا ہے۔ اور دنیا توازن دہشت BALANCE OF TERROR کا شکار ہو گئی ہے جس کی وجہ سے دنیا کے سبھی ممالک اور خاص کر ترقی پذیر ممالک اپنی قومی آمدنی کا بیشتر حصہ ایٹمی ہتھیاروں کی خرید پر صرف کر رہے ہیں۔ ایک طرف تو ایٹمی ہتھیاروں کی تباہی کا خوف ہے جبکہ دوسری طرف اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کہ ایٹمی ٹیکنالوجی انسانیت کی بھلائی کے لئے کتنی ضروری ہے بشرطیکہ اس کو پُرامن مقاصد کے لئے استعمال کیا جائے۔

آج ایک بار پھر دو قطبی نظام توازن طاقت کو ختم کرنے کی کوشش مسلسل کی جا رہی ہے۔ تاکہ روس امریکہ اور ان کے حواریوں کی بالادستی ختم ہو سکے۔ اس ضمن میں سب سے پہلی کوشش ناوابستہ ممالک کی طرف سے کی گئی مگر افسوس اس بات کا ہے کہ ناوابستہ ممالک کی تحریک میں کوئی بھی ملک اس مقام پر نہیں جہاں سے وہ اس نظریہ کی کامیابی کے لئے اپنے مادی وسائل کا موثر استعمال کر سکے۔ علاوہ ازیں ناوابستہ ممالک کی غیر جانبداری بھی مختلف نوعیت کی رہی ہے اور بیشتر اوقات موقع پرستی کا شکار

بھی۔ اس کے علاوہ ان ممالک کی معاشی سیاسی سماجی اور جغرافیائی حیثیت مختلف ہے نیز یہ ممالک مذہبی لسانی اور نسلی اعتبار سے بھی مختلف ہیں۔ ایسی صورت میں ان کا عالمی سیاست میں موثر کردار ادا کرنا ممکن نہیں۔ بھارت کے چین اور پاکستان کے ساتھ تعلقات نے بھی اس سلسلے میں منفی کردار ادا کیا ہے۔

دوسری کوشش تیسری دنیا کے گروپ کی طرف سے کی گئی۔ یہاں بھی ان ہی مشکلات کا سامنا رہا جو اوپر بیان کی گئی ہیں۔ تیسری دنیا کے کچھ ممالک روس کے ہم نوا ہیں۔ یا ہمدردی رکھتے ہیں اور باقی ممالک مغربی بلاک سے وابستہ ہیں۔ ان ممالک کی معاشی پسماندگی کو ختم کرنے کی جو کوششیں کی گئیں۔ وہ بھی بارآور نہ ہو سکیں۔

تیسری کوشش اسلامی ممالک کی طرف سے کی جا رہی ہے۔ ان ممالک کے پاس قابل لحاظ معدنی و معاشی وسائل ہیں۔ ان میں اکثر ممالک پیٹرو ڈالرز سے مالامال ہیں۔ ایک دوسرے کے منسلک ہونے کی خواہش بھی رکھتے ہیں۔ مگر اس اتحاد میں بھی بے شمار رکاوٹیں ہیں۔ مشرقِ وسطیٰ اور افریقہ کے بیشتر ممالک باوجود ایسی دولت کے انتہائی پسماندہ ہیں۔ نہ یہاں تعلیم ہے نہ سائنس نہ صنعت اور نہ ہی معقول سیاسی نظام ہے۔ اکثر صورتوں میں یہاں فوجی اور جاگیردارانہ طرز کا نظام حکومت ہے۔ یہ ممالک آپس کے تنازعوں کا شکار ہیں۔ جیسے ایران عراق پاکستان افغانستان مصر اور سعودی عرب وغیرہ اس صورت میں ان ممالک کا عالمی سیاست میں ایک موثر گروہ ہونا دور کی بات نظر آتی ہے ان ممالک کے اتحاد کے لئے ماضی اور حال میں جتنی کاوشیں ہوئیں اُن کے نتائج مثبت برآمد نہیں ہوئے

اب روس اور امریکہ کے علاوہ چین اور جاپان بھی ابھر کر سامنے آ چکے ہیں۔ یورپ ایک بار پھر مرکز کی حیثیت سے ابھر رہا ہے جس کی وجہ سے ان دو بڑی طاقتوں کی اہمیت کم ہوتی ہوئی نظر آ رہی ہے۔ اس لئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ آنے والے دور میں ایک بار پھر کثیر قطبی توازن طاقت کا نظام قائم ہوگا۔ اور جنگ ناگزیر ہو جائے گی

۴۔ ریاستوں کے مابین تنازعات :۔

DISPUTES BETWEEN STATES

ریاستوں کے درمیان تصادم یا جھگڑے آج کے دور کی پیداوار نہیں بلکہ یہ تصادم ابتداء ہی سے ہوتا چلا آیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کائنات کی بنیادی اساس ، خیر و شر ، نیکی و بدی ، حق و ناحق پر رکھی گئی ہے۔ اس وجہ سے ہم تاریخ انسانی کے کسی دور پر بھی نگاہ ڈالتے ہیں تو جہاں ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ تعاون و اتحاد کے جذبے نے انسان میں محبت ، لگاؤ اور قربانی کی ضرورت کو اجاگر کیا ہے معاشرتی زندگی نے دوستی و بھائی چارگی کے ماحول میں تقسیم کار کے ذریعے ترقی کے مراحل طے کیے ہیں وہاں ہمیں اُن حالات سے بھی واسطہ پڑتا ہے جہاں انسان نے انسان کی تباہی کے لئے قدم قدم پر خود غرضانہ افعال سے بھی دریغ نہیں کیا۔ اس منفی جذبے کے پیچھے خواہ مذہبی عصبیت کارگر رہی ہو یا معاشی مفاد ، شہرت کی خواہش ہو یا دولت کی حرص ، جاہ و مرتبہ کی ضرورت ہو یا تعمیر کی تحریک بہر حال انسانی خون کی ندیاں ہر دور میں بہتی رہی ہیں۔

حالیہ دور کی جنگوں کا ہی حساب لگائیں تو پتہ چلتا ہے کہ لاکھوں انسانوں کا قتل عام ہوا کروڑوں روپیہ کی املاک تباہ ہوئیں اور لاکھوں بچے یتیم ہوئے۔ میرے خیال میں آج کا تشدد آج کی مزاجی کیفیت اور بے چینی کی واحد وجہ قانون فطرت سے انحراف ہے۔ قادر مطلق سے بغاوت کا نتیجہ ہے۔ انسانیت کو اس وقت تک سکون میسر نہیں ہو سکتا جب تک وہ حقیقی مقتدر اعلیٰ کی بالادستی اور اس کے دیئے ہوئے دستور کے آگے اپنا سر تسلیم خم نہیں کر لیتی۔

ہمارے عالمی قانونی نظام کی اساس بے شک قانون فطرت "LAW OF NATURE" پر ہے۔ مگر جیسے جیسے وقت گزرتا گیا۔ فطرت میں بھی تبدیلی آتی گئی اور نئے تصورات جنم لیتے چلے گئے۔ قانون بین الاقوام کے تعلق سے مثبت مکتبہ فکر نے عالمی قانونی نظام کو ایک نیا رخ دیا اور قانون فطرت کے تصور پر ایک کاری ضرب لگائی۔ قومیت اور قومی مملکت اور مملکت کے مفاد کے تصور

نے اس مکتبہ فکر کو تقویت پہنچائی ۔ چرچ کی بالادستی کے خاتمے اور سیکولر نظریات نے قوانین فطرت کے اثر و بالادستی کو مزید نقصان پہنچایا ۔

ان ساری تبدیلیوں نے عالمی قانونی نظام

جو مملکتوں کے درمیان عالمی نظام قانون کے احساس کو یکسر بدل ڈالا موجودہ رائج ہے ۔ اُنہی کیفیات کا عکاس ہے ۔ ایک فکر اور ایک خاص مفاد کا ترجمان ہے ۔ اس نظام میں قوانین فطرت کا احترام ہے نہ عدل کا اصول کارفرما ہے ۔ اور نہ ہی اخلاقی اقدار کا اثر آج کے نظام کی بنیاد طاقت POWER اور صرف طاقت ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں امن کا فقدان ہے ۔ اسلحہ کی دوڑ جنگ وجدل کا کاروبار جاری ہے ۔ جب صورت حال یہ ہو تو تنازعات کیوں نہ پیدا ہوں ۔ اس کرۂ ارض کے کسی بھی جگہ پر اگر ہم نظر ڈالیں تو ہر جگہ انتشار نظر آئے گا ۔ تلاش امن اور قیام امن کی تمام کوشش بے اثر ہو کر رہ گئیں ہیں ۔ ہر مسئلہ کو مملکتیں اپنی انا کا مسئلہ بنا لیتی ہیں ۔ مملکت کا مفاد انسانیت کے مفاد اور عالمی مفاد سے بالاتر سمجھا جانے لگا ہے ۔ موجودہ بین الاقوامی قانونی نظام تیسری دنیا کے کمزور ممالک اور بے بس انسانوں کے حقوق کی کوئی ضمانت دینے سے قاصر ہے ۔ ان حالات میں کسی مسئلہ پر ریاستوں کا پُرامن تصفیہ نہیں ہو پاتا ۔ تو انائی کرداروں کا وہ کھیل شروع ہو جاتا ہے جس کا نتیجہ آخر جنگ کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے ۔ اس لئے جنگ سے پہلے تنازعات کے پُرامن سمجھوتہ پر زور دیا جاتا ہے ۔

ریاستوں کے مابین تنازعات کی وجوہات

۱ ۔ محدود علاقائی اقتدار اعلیٰ کا دعویٰ LIMITED TERRITORIAL SOVEREIGNTY CONFLICTS

بعض اوقات ریاستوں کے درمیان تنازعات محدود علاقائی اقتدار اعلیٰ کے مسئلے ہوتے ہیں ۔ اس قسم کے جھگڑوں میں کسی علاقے پر کوئی ریاست اپنا اقتدار چاہتی ہے ۔ جس سے تصادم ہو جاتا ہے ۔ مثال کے طور پر پاکستان اور بھارت کا موقف یہ ہے ۔ کہ "کشمیر ہمارا ہے ۔"

اسی طرح جزائر فاک لینڈ میں ارجنٹائن نے اپنے اقتدار اعلیٰ کا اعلان کر دیا تھا جس کی وجہ سے برطانیہ کو فوجی کارروائی کرنی پڑی۔ ایران عراق جنگ شط العرب اور آبنائے ہرمز پر ایک دوسرے کے اقتدار کا دعویٰ کرنے پر ہوئی۔

۲۔ ذاتی تحفظ :۔ SELF SECURITY

بعض اوقات ریاستیں اپنے ذاتی تحفظ کے لئے بھی جنگ یا تصادم میں اُلجھ جاتی ہیں۔ اگر ایک ریاست محسوس کرتی ہے۔ کہ اس کی سالمیت خطرے میں ہے۔ اور دوسری ریاست اس پر حملہ کر دے گی تو وہ اپنے تحفظ کے لئے اپنے دفاع کو مضبوط بنانی ہے یا بنانے کی کوشش کرتی ہے تو دوسری ریاست اس سے پہلے کہ پہلی ریاست اپنا دفاع مضبوط کرے اس پر حملہ کر دیتی ہے۔ مثال کے طور پر اسرائیل نے عراق کے ایٹمی ری ایکٹر کو تباہ و برباد کر دیا۔

۳۔ نظریاتی عنصر :۔ IDEALOGICAL FACTOR

اگر دو ریاستوں کے درمیان نظریاتی اختلاف ہو تو ان کے مابین تصادم ہو سکتا ہے۔ جیسے پاکستان اور بھارت کے درمیان نظریاتی اختلاف موجود ہے۔ ایک اسلامی ریاست ہے اور دوسری سیکولر جس کی وجہ سے بہتر تعلقات ممکن نہیں۔ اسی طرح امریکہ اور روس کے مابین نظریاتی اختلاف کی وجہ سے سرد جنگ جاری ہے۔ جس میں وقت اور حالات کے ساتھ ساتھ کمی و زیادتی ہوتی رہتی ہے۔

۴۔ قومی مفادات :۔ NATIONAL INTEREST

ریاستیں اکثر اوقات قومی مفادات کی ترجمانی کرتے ہوئے دوسری ریاستوں سے متصادم ہو جاتی ہیں۔ جہاں ایک ریاست کا مفاد دوسری ریاست کے مفاد سے متصادم ہوا جھگڑا شروع ہو گیا۔ گویا قومی مفادات بھی ریاستوں کے درمیان جھگڑا پیدا کرنے کا سبب بنتے ہیں۔

۵۔ قومی وقار :۔ NATIONAL PRESTIGE

بعض اوقات قومی وقار کے مسئلے پر بھی ریاستوں کے درمیان تصادم ہو جاتا ہے ہر ریاست چاہتی ہے کہ اُسے بین الاقوامی برادری میں نمایاں حیثیت حاصل ہو سنہ ۱۹۲۶ء میں یونان کا بلغراد پر حملہ اِسی سلسلہ کی ایک کڑی تھا۔ اِسی طرح جزائر فاک لینڈ کو برطانیہ نے اپنی انا کا مسئلہ بنا کر فوجی کارروائی کے ذریعے دوبارہ ارجنٹائن سے حاصل کیا۔ مختصراً یہ کہ ریاستیں ہمیشہ اپنے قومی وقار کا دفاع کرتی ہیں۔

۶۔ لامحدود استعماریت :۔ UNLIMITED COLONIALISM

جب کوئی ریاست لامحدود استعماریت کے ارادے کرتی ہے تو اس کا دوسری ریاستوں کے ساتھ تصادم ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر نازی جرمنی نے اپنی لامحدود استعماریت کی خاطر آسٹریا کے ساتھ عدم تعاون کا اصول اپنایا۔ اس قسم کے تصادم میں ریاستیں عموماً ایک دوسرے کی آزادی کو ختم کرنے کی کوشش کرتی ہیں

۷۔ حصول آزادی کی خاطر تصادم :۔ LIBERATION CONFLICT

بعض اوقات ریاستوں میں حصول آزادی کی خاطر بھی تصادم ہوتا ہے۔ اس کو ہم انقلابی جنگ کے نام سے بھی موسوم کر سکتے ہیں۔ یہ تنازعات اس لئے پیدا ہوتے ہیں کہ ایک ریاست دوسری ریاست کے لوگوں کو نظریاتی یا اخلاقی طور پر آزادی دلانے میں اپنا کردار ادا کرتی ہے۔

تنازعات کے تصفیہ کا طریق کار

قانون بین الاقوام کے تحت بین الاقوامی تنازعات کے حل کے طریقوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

تنازعات کے تصفیہ کا طریق کار

پُرامن ذرائع سے تصفیہ	جابرانہ ذرائع سے تصفیہ
گفت و شنید	انتقام
پیش کش	انتقامی کارروائی
مفاہمت	پُرامن ناکہ بندی
مصالحت	مداخلت
ثالثی	جنگ
عدالتی تصفیہ	
بین الاقوامی تنظیم کے ذریعے	

پُرامن ذرائع سے تصفیہ:۔ PEACEFUL MEANS OF SETTLEMENT

صدیوں کے تجربات نے بین الاقوامی تنازعات کے پُرامن حل کے کئی طریقے مہیا کیے ہیں جن میں کچھ ۱۸۹۹ء اور ۱۹۰۷ء کی ہیگ کانفرنس میں اپنائے گئے جن کے تحت تنازعات کے پُرامن حل پر زور دیا گیا تھا اسی طرح ۱۹۴۵ء میں سان فرانسسکو میں انجمن اقوام متحدہ کا تشکیل کردہ منشور بھی اسی پر زور دیتا ہے۔ مجلس اقوام ۱۹۱۹ء کا بھی یہی مقصد تھا۔ یہ حقیقت اب روز روشن کی طرح واضح ہوگئی ہے کہ تنازعات کا پُرامن حل ہی انسان کو امن و بقا کی ضمانت دے سکتا ہے۔

پُرامن ذرائع سے تصفیہ کے مندرجہ ذیل طریقے ہیں۔

۱۔ گفت و شنید:۔ NEGOTIATION

عالمی تنازعات کے پُرامن سیاسی یا سفارتی تصفیہ کے لئے بلاواسطہ گفت و شنید سب سے احسن طریقہ سمجھا جاتا ہے۔ اس طریقہ کار میں کئی خوبیاں

ہیں ۔ یہ طریقہ کار سب سے زیادہ سہل اور سیدھا سادہ ہے ۔ اس میں پیش رفت بڑی آسانی کے ساتھ کی جاتی ہے ۔ جب دو مقتدر ریاستوں کے درمیان کوئی تنازعہ پیدا ہوتا ہے تو وزارت خارجہ ایک نوٹ یا خط لکھ کر فریق متعلقہ کو دعوت گفتگو دیتی ہے ۔ یہ سفارتی نوٹ وزارتِ خارجہ کے سیکریٹری کی طرف سے متعلقہ فریق کے سیکریٹری خارجہ کو بھیجا جاتا ہے ۔ عموماً ایسے خطوط حکومتیں اپنے سفیروں کے ذریعے بھیجتی ہیں ۔ مذاکرات کے اس سلسلہ میں پیش رفت کوئی بھی فریق کرسکتا ہے اس طریقہ کار میں وقت کا ضیاع کم ہوتا ہے اور ابتدائی مرحلے میں ہی مسئلے حل ہو جاتے ہیں ۔ اس قسم کی گفت وشنید وزارتی سطح پر وزیر اعظم کی سطح پر اور سفراء کی سطح پر ہوسکتی ہے ۔

بعض اوقات اختلافات کی صورت میں صفائی کے لئے خط وکتابت ہوتی ہے جیسے پاک بھارت تنازعات کے تصفیہ کے لئے دونوں حکومتوں کی طرف سے آئے دن نوٹس کے تبادلے وغیرہ اس سے اختلافات وغیرہ کے خاتمے کی کوشش کی جاتی ہے ۔ لیکن اکثر اس طریقہ کار کے نتائج باہمی تصفیہ کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں ۔ اور اگر مذاکرات ناکام ہوجائیں تو پھر فریقین کے موقف میں شدت پیدا ہو جاتی ہے ۔ جس سے تعلقات میں جمود اور بگاڑ کی صورت پیدا ہو سکتی ہے ۔ جس کے نتیجے میں فریقین ایک دوسرے کے خلاف سرد جنگ کا آغاز کر سکتے ہیں ۔ ذرائع ابلاغ ایک دوسرے کے خلاف پروپیگنڈہ کے لئے استعمال ہونا شروع ہو جاتے ہیں ۔ ایسے اسٹیج پر تنازعہ عالمی کش مکش کا شکار ہو جاتا ہے اور اطراف کے ممالک اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں ۔

۲۔ مفاہمت :۔ GOOD OFFICES

جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے کہ مذاکرات کی ناکامی کا نتیجہ سرد جنگ ہے جو کسی بھی لمحے گرم جنگ ( ) میں تبدیل ہو سکتی ہے جنگ کی صورت میں عالمی برادری کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ تنازعہ کا تصفیہ کرانے

کی کوشش کرے۔ ادارتی سطح پر یہ کام اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کا ہے اقوام متحدہ کے منشور کے تحت قائم کردہ دیگر علاقائی تنظیمیں بھی اس امر میں اپنا کردار ادا کرتی ہیں۔ جیسے اسلامی سربراہی کانفرنس۔ امریکن ریاستوں کی تنظیم افریقی اتحاد کی تنظیم وغیرہ۔

عہد قدیم سے لے کر آج تک بے شمار تنازعات کا تصفیہ مفاہمت کی پیش کش اور اس طریق کار کو اپنا کر کیا گیا ہے۔ دو طرفہ مذاکرات کی ناکامی کے بعد گفتگو کا سلسلہ شروع کرنے میں پیش کش کو کافی اہمیت حاصل ہے جیسے ہی تنازعہ میں ملوث ممالک پیش کش کو قبول کرتے ہیں۔ تو مصالحتی کارروائی شروع ہو جاتی ہے۔ پیش کش کرنے والا ملک فوری طور پر فریقین سے رابطہ قائم کرتا ہے۔ اور اُن کی ایما پر آپس میں ملاقات کا بندوبست کرتا ہے تاکہ مذاکرات دوبارہ شروع ہو سکیں۔ اس قسم کے بے شمار مذاکرات سوئٹزر لینڈ کے شہر جنیوا میں منعقد کیے گئے۔ سوئٹزر لینڈ ایک غیر جانبدار ملک ہے۔ اس کے علاوہ پیرس، لندن، ویانا، نیویارک وغیرہ میں مذاکرات کا آغاز ایک طے شدہ ایجنڈے کے مطابق ہوتا رہتا ہے۔ عالمی تنازعات کی تاریخ کے مطالعہ سے یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ بیشتر عالمی تنازعات پیش کش کے ذریعے طے کیے جاتے ہیں۔

۳۔ توسل :- MEDIATION

مفاہمت اور توسل میں فرق صرف اتنا ہے کہ توسل کرنے والا ملک ایک قدم آگے بڑھ کر خود بھی فریقین کے ساتھ مذاکرات میں شامل ہو جاتا ہے۔ اس طریق کار میں توسل کو اس بات کا بھی حق حاصل ہے کہ وہ مسئلہ کو حل کرنے کے سلسلے میں اپنی تجاویز بھی پیش کرے اور تصفیہ کی راہ تلاش کرے۔ توسل میں مذاکرات کے تعطل کا شکار ہونے کا امکان کم اور تصفیہ کی امید زیادہ ہوتی ہے۔

مفاہمت کی طرح توسل کی پیش کش ایک دوستانہ فعل ہے پیش کرنے

والے ملک کا یہ اختیاری فعل ہے کوئی قانونی حق یا پابندی نہیں البتہ اخلاقی ذمہ داری ضرور ہے۔

توسل کی پیش کش کو معاندانہ فعل نہیں سمجھا جاتا۔ توسل کو قبول کرنا یا نہ کرنا متنازعہ میں ملوث حکومتوں کے اختیار میں ہے۔ کسی قسم کی پیش کش پر عمل درآمد کے لئے ضروری ہے کہ ہر دو فریق اس کو قبول کریں۔ اگر ایک فریق قبول کرے اور دوسرا انکار کرے تو توسل معرض وجود میں نہیں آسکتا اس انکار کو غیر دوستانہ عمل نہیں سمجھا جاتا۔ توسل عالمی تنازعات کے پرامن تصفیہ کا سب سے اہم، موثر اور سہل طریق کار ہے۔ اس لئے اسے بین الاقوامی تعلقات میں ہمیشہ اپنایا گیا ہے اور پسند کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔

۴۔ مصالحت: CONCILIATION

تنازعات کے پرامن تصفیہ کے لئے مصالحت بھی ایک موثر طریقہ کار سمجھا جاتا ہے۔ اس میں دوستانہ تصفیہ دوسری ریاستوں کا تعاون تفتیش کی غیر جانبدار پارٹی یا مشاورتی کمیٹی کی رائے وغیرہ کی روشنی میں کوئی مسئلہ وغیرہ حل ہو جاتا ہے۔ مصالحت میں اس سے کسی تنازعہ کا حوالہ کسی کمیشن کو ملتا ہے جو فریقین کو تصفیہ کی تجاویز کی رپورٹ مہیا کرتا ہے۔ لیکن ان تجاویز کی حیثیت پابندی کی نہیں ہوتی۔ کوئی بھی ایک فریق اگر اس کو رد کر دے تو کمیشن کی ساری محنت ضائع ہو جاتی ہے۔ مصالحتی کمیشن بڑی حد تک تحقیقاتی کمیشن کا پیش رو سمجھا جاتا ہے۔

۱۸۹۹ء اور ۱۹۰۷ء کی متعین کردہ ہیگ کنونشن نے بین الاقوامی تنازعات کے پرامن حل کے لئے مصالحتی کمیشن کی دفعات متعین کیں۔

پہلی اور دوسری عالمی جنگوں کے بعد مصالحتی اور تحقیقاتی کمیشن کے طریقہ کار کو بے حد فروغ ہوا۔ مجلس اقوام اور اقوام متحدہ نے اس طریقہ کار

کو مناسب اور احسن جانا اور ملکوں کو اس بات کی ترغیب دی اور اُن کی حوصلہ افزائی فرمائی کہ وہ باہمی معاہدوں کے ذریعہ تنازعات کے پُرامن تصفیہ کے لئے مصالحتی اور تحقیقاتی کمیشن کو اپنائیں۔ اس ترغیب اور حوصلہ افزائی کے نتیجے میں مجلس اقوام اور اقوام متحدہ کے ممبر ممالک نے بے شمار معاہدے اور بے حساب کمیشن قائم کئے۔ ان کمیشنوں کی کارکردگی کا جائزہ لینے پر یہ ظاہر ہوتا ہے۔ کہ اس طریقے سے کافی بہتر نتائج برآمد ہوئے ہیں اس کے باوجود کہ تحقیقاتی کمیشن عالمی برادری کی توقعات پر پورے نہیں اترے۔

۵۔ ثالثی ARBITRATION

بین الاقوامی تنازعات کے دوستانہ تصفیہ کا ایک طریقہ ثالثی ہے۔ یہ طریقہ اتنا ہی پرانا ہے جتنی عالمی سیاست۔ ثالثی کا طریقہ سب سے پہلے قدیم یونان کی شہری ریاستوں کے آپس کے تنازعات کے حل کرنے کے لئے مستعمل رہا ہے۔ تنازعات کے پُرامن تصفیہ کے لئے شہری ریاستیں عموماً ثالثی کے طریقے کو زیادہ مناسب اور مفید سمجھتی تھیں۔ اس کے بیشتر اصول اور لوازمات اسی دور کی پیداوار ہیں جو آج تک عالمی سیاست میں رائج ہیں۔

پُرامن تصفیہ کے لئے ثالثی کا طریقہ کار سفارتی/سیاسی بھی ہے اور نیم قانونی بھی یا یہ طریقہ اپنی نوعیت اور ہیئت کے اعتبار سے کلی بھی ہے ادارتی بھی، عارضی بھی ہے اور دائمی بھی۔ عام فہم اصطلاح میں ثالث سے مراد تیسرے شخص یا فریق کی ہے ثالثی سے ہماری مراد اس طریقے سے ہے جس میں تنازعہ کا تصفیہ قانون کی بنیاد پر ہو اس سے رجوع کرنے کے بعد راہ فرار اختیار نہیں کی جا سکتی۔ فریقین پر یہ لازم ہے کہ وہ اخلاقی اور قانونی طور پر ثالثی کے فیصلے کو قبول کریں اور اس پر عمل پیرا ہوں۔

برصغیر کی تقسیم کے نتیجے میں پاکستان کا قیام عمل میں آیا۔ پاک و ہند کی

سرحدوں کا تعین ایک کٹھن مسئلہ تھا۔ خاص طور پر صوبہ پنجاب کی تقسیم کے بعد مشرقی پنجاب بھارت کے حوالے اور مغربی پنجاب پاکستان کے حصے میں آیا۔ مشرقی پاکستان کے بعض اضلاع اور دیہات پاکستان کے حصہ میں آنے تھے۔ اس مسئلہ پر پاکستان اور بھارت کے مابین نزاع پیدا ہو گیا۔ یہ معاملہ بالآخر ثالثی عدالت کے سپرد کیا گیا۔ اس عدالت کے سربراہ ریڈکلف مقرر ہوئے ان کے دیئے گئے۔ ایوارڈ میں پاکستان کے ساتھ صریح ناانصافی کی گئی۔ یہ فیصلہ انتہائی افسوسناک تھا۔ پاکستانی عوام کے جذبات مجروح ہوئے اور شدید ردعمل کا اظہار کیا گیا۔ قومی ذرائع ابلاغ نے اس ایوارڈ کو رد کرنے کی رائے دی قائداعظم ایک قانون دان تھے اور اس کے احترام سے واقف تھے۔ اسی اسپرٹ کے ساتھ انہوں نے ریڈکلف ایوارڈ کو من وعن قبول کر لیا۔ کیونکہ پاکستان اخلاقی اور قانونی طور پر اس فیصلے کو قبول کرنے کا پابند تھا۔

پاکستان اپنے عالمی تنازعات کو پرامن طور پر حل کرنے میں کبھی پس و پیش نہیں رہا۔ جبکہ بھارت پاکستان کے حکمرانوں کی نظر میں بھارت کا قومی وقار و مفاد کوئی ایسی ویسی چیز نہیں۔ جو مفاہمت مصالحت یا ثالثی کے سپرد کیا جا سکے۔ اگر قوموں کا یہی موقف اور فلسفہ ہو جس پر وہ کاربند ہوں تو پھر مستقل عالمی اور دائمی امن کا افق ہمیشہ تاریک نظر آئے گا۔

ثابت یہ ہوتا ہے کہ ریاستیں اپنے قومی وقار کی خاطر ثالثی کے فیصلے کو ماننے سے انکار بھی کر سکتی ہیں اور انہیں اس پر کوئی سزا نہیں دی جا سکتی۔ ماسوائے اس کے کہ کوئی مخصوص گروہ اس کا بائیکاٹ کر دے۔

۲۔ عدالتی تصفیہ :- JUDICIAL SETTLEMENT.

عدالتی تصفیہ کا واحد ادارہ جو آج کل عالمی برادری میں موجود ہے۔ وہ

بین الاقوامی عدالت انصاف ہے جو ہیگ میں اور مجلس اقوام کی دفعات کے تحت کام کرنے والی مستقل عدالت برائے بین الاقوامی انصاف کی جانشینی میں قائم ہوئی۔ عدالت اور ثالثی میں بنیادی فرق یہ ہے کہ عدالت مستقل ہوتی ہے جبکہ ثالثی کی عدالت عارضی طور پر مقرر کی جاتی ہے۔ عدالت کو قانونی ترویج کے تسلسل کا اختیار ہے جبکہ ثالثی کی عدالت اس اختیار سے محروم ہے۔

۱۹۴۵ء میں اقوام متحدہ کے منشور کے باب ۴ کے تحت بین الاقوامی عدالت انصاف کو تشکیل دیا گیا۔ یہ اقوام متحدہ کا ایک اہم جز یا اعضاء ہے۔ یہ مساعی علاقائی سطح پر بھی ہوتی رہی ہے اور آج بھی جاری ہے جیسے یورپی کونسل۔ امریکی مملکتوں کی تنظیم، افریقی اتحاد کی تنظیم، اسلامی سربراہی کانفرنس اور اشتراکی مملکتوں کی تنظیم وغیرہ اسی نوعیت کے ادارے ہیں۔ ان سب کا مقصد اپنے اپنے منشور کے مطابق عالمی امن کی حفاظت اور باہمی اشتراک و تعاون ہے۔

توقع تو یہ تھی کہ مملکتیں اپنے جھگڑے طے کرنے کے لئے اسی عدالت سے رجوع کریں گی۔ یہ کوئی مشکل امر نہیں تھا۔ اگر عالمی برادری یا اقوام متحدہ کی رکن مملکتیں اپنے قومی دستور میں صرف ایک دفعہ کا اضافہ کرلیں تو یہ عدالت فعال ہوسکتی ہے ہر مملکت اپنے دستور میں صراحت کردے کہ جب کبھی کوئی تنازعہ دوسرے ملک کے ساتھ اٹھے گا۔ تو سیدھا عالمی عدالت انصاف سے رجوع کیا جائے گا۔ لیکن امن پسندوں کا یہ خواب ابھی تک شرمندہ تعبیر نہیں ہوسکا۔ عالمی عدالتِ انصاف کے اسٹیٹوٹ کی تشریح یہاں ممکن نہیں صرف یہ جان لیجئے۔ کہ اس عدالت کا دائرہ کار محدود، اختیار سماعت محدود اس کی بالادستی مشکوک ہے۔ لہٰذا عدالت اُس وقت تک فعال نہیں ہوگی۔ جب تک تنازعہ میں ملوث دونوں فریق اس سے رجوع نہ کریں۔ کسی ایک فریق کے اس عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانے سے بات نہیں بنتی۔ یہ عدالت اس وقت تک مفلوج سمجھی جائے گی۔ جب تک

کہ دونوں فریق اس کے آگے پیش ہونے پر راضی نہ ہو جائیں گے۔ دوئم یہ کہ اگر فریقین رجوع بھی کریں۔ اور عدالت فیصلہ بھی صادر کر دے۔ تب بھی عدالت موثر نہیں کیونکہ فیصلے کے ماننے سے انکار پر عدالت منکر کو سزا نہیں دے سکتی کیونکہ عدالت کے پاس کوئی تعزیری اختیار نہیں۔ عدالت کے پاس کوئی پولیس فورس نہیں جو مجرم کو حوالات پہنچوا سکے۔ اسی طرح اس کا اختیار سماعت ملکتوں کی ثواب دید پر ہے۔ لہٰذا عدالت کا تصفیہ لازمی نہیں بلکہ اختیاری ہے۔

علاوہ ازیں یہ عدالت کبھی کبھی مشاورتی فرائض بھی سر انجام دیتی ہے اور عدالت کی اس مشاورتی آراء نے تنازعات کے تصفیہ میں کافی مدد دی ہے جیسے تیونس مراکش کے معاملہ میں فرمان اور پولینڈ میں جرمن آباد کاروں کے معاملے وغیرہ پر موجودہ بین الاقوامی عدالت انصاف نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ عدالت تنازعات کے تصفیہ میں کوئی غیر معمولی کامیابی حاصل نہیں کر سکی۔ اس عدالت کا رول صرف مشاورتی ہی رہ گیا ہے۔ قانونی نکات کی تشریح کے لیے اقوام متحدہ نے کئی دفعہ اس عدالت سے رائے حاصل کی ہے۔

۷۔ اقوام متحدہ کے ذریعے تصفیہ:۔

SETTLEMENT THROUGH THE U.N.O.

عالمی تنازعات کے پرامن تصفیہ کے لیے ادارتی سطح پر اقوام متحدہ کا کردار خاصہ اہم اور کارکردگی بڑی حد تک قابل ستائش ہے گو کہ بڑی طاقتوں کی سیاسی کشمکش نے اس ادارے کی افادیت کو خاصہ نقصان پہنچایا ہے۔ اور اس کی قیام امن کی کوششوں کو مفلوج کر دیا ہے۔ کمزور اور پسماندہ ممالک جو حربی اعتبار سے کوئی مقام نہیں رکھتے اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھنے لگے ہیں اور اس ادارے سے وابستہ امیدیں بڑی حد تک مایوسی میں ڈھل گئی ہیں۔ سلامتی کونسل

میں مستقل ممبران (امریکہ ، برطانیہ ، چین ، روس اور فرانس) کا حق تنسیخ VETO POWER اور اس کا بے جا استعمال نے اس ادارے کی رہی سہی ساکھ کو شدید نقصان پہنچایا ہے۔

انجمن اقوام متحدہ کا منشور بڑی امیدوں اور آرزوؤں کے ساتھ وضع کیا گیا تھا اور امید کی جاتی تھی کہ تمام سیاسی تنازعات اقوام متحدہ کی وساطت سے طے کر لئے جائیں گے اقوام متحدہ آج کل اتنی بے بس اور مفلوج ہو کر رہ گئی ہے کہ اسرائیل اور جنوبی افریقہ جیسے چھوٹے ممالک بھی اقوام متحدہ کے احکامات اور قراردادوں کی صریح خلاف ورزی کرتے ہیں اور منشور کی دھجیاں اڑاتے پھرتے ہیں۔ اب وقت آچکا ہے کہ عالمی معاشرے کے ارکان حالات کو بہتر بنانے کے لئے ایک نئی کوشش کریں۔ آج عالمی معاشرے کا رنگ و روپ بدل چکا ہے اقدار بدل چکے ہیں۔ بین الاقوامی قوانین کی بیشتر دفعات اور اصول جو آج سے کئی صدیاں پہلے مرتب کیے گئے تھے فرسودہ ہو چکے ہیں۔ عالمی برادری کے ارکان کی اکثریت تیسری دنیا اور غیر جانبدار ممالک سے وابستہ ہے۔ اُن کی امنگیں نئی ہیں۔ ان کے مسائل منفرد ہیں۔ فرسودہ نظامِ قانون اور ادارے تیسری دنیا کے مفاد ماحول اور مسائل سے ہم آہنگ نہیں ہیں۔ مروجہ نظام ہماری ضروریات اور جذبات کی عکاسی نہیں کرتا۔ اس لئے اسے بدلنے کی ضرورت ہے اور ایسی دنیا کی تخلیق کی ضرورت ہے جہاں افراد بہتر انسانی برادری کے رکن ہوں جہاں ہر ایک کے حقوق کی حفاظت ہو۔ کسی کے حقوق پامال نہ ہوں ایسا جہاں ہو جس میں استحصال ممکن نہ ہو ایسے جہاں میں نہ تنازعات جنم لیں گے اور نہ تصادم ہوگا نہ مکر و فریب کی سیاست ہوگی نہ انسانی جانوں کی تباہی۔ انسان کی تخلیق خالقِ حقیقی نے ایسی ہی دنیا کے لیے کی تھی۔ دائمی امن ایسی ہی دنیا میں ممکن ہے۔

جابرانہ ذرائع سے تصفیہ :۔

FORCIBLE MEANS OF SETTLEMENT

جب ریاستیں بین الاقوامی تنازعات کو پُرامن ذرائع سے حل نہیں کر پاتیں تو ان تنازعات کو جابرانہ طریقوں سے حل کرنے کے مندرجہ ذیل طریقے ہیں

۱۔ انتقام :۔ RETORTION

انتقام کی اصطلاح ریاستوں کی زیادتی وغیر ذمہ دارانہ اعمال کے انتظام کے معنوں میں استعمال ہوتی ہے۔ یہ کسی دوسری ریاست یا اُس کے شہریوں کی اخلاقی آزادی پر قانونی پابندیاں عائد کرنا ہوتا ہے۔ ان میں سے کچھ طریقے سفارتی تعلقات سے علیحدگی، سفارتی مراعابات کے خاتمے اور مالی رعایات سے دستبرداری وغیرہ بھی ہیں ۱۹۰۴ء میں جاپان نے روس کو اُس کے مال پر درآمدی ڈیوٹی لگانے کی وجہ سے دھمکی دی تھی کہ اس نے اپنے بعض پانیوں میں سے جاپان کے ماہی گیر جہاز نکال دیئے ہیں۔

آج کل ایسے طریقِ کار سے اجتناب برتا جاتا ہے۔ کیونکہ اس سے ریاستوں کے باہمی تعلقات میں تلخی پیدا ہوتی ہے اور حالات خراب ہوتے چلے جاتے ہیں۔ جہاں اقوام متحدہ کے منشور کی دفعہ ۲ قابلِ ذکر ہے جس میں اقوام متحدہ کے تمام ارکان کو تنازعات کا تصفیہ امن کو خطرے میں ڈالے بغیر پُرامن طریقوں سے حل کرنے کو کہا گیا ہے تاکہ انصاف و بقا کے تقاضوں کو تقویت ملتی رہے گی۔ اگر انتقام کی وجہ سے انصاف کو خطرہ لاحق ہو تو یہ منشور اقوام متحدہ کے تحت غیر قانونی ہوگا۔

۲۔ انتقامی کارروائیاں :۔ REPRISALS

عالمی تنازعات کے تصفیہ کا ایک طریقہ انتقامی کارروائی بھی ہے انتقامی کارروائی کی اصطلاح بہت وسیع ہے اور تلافی کے لئے

کسی ریاست کی طرف سے کئے جانے والے تمام اقدامات اس میں شامل ہو سکتے ہیں۔ عام طور پر انتقامی کارروائی میں دوسری ریاست کی جائیداد ضبط کر لی جاتی ہے یا شہریوں کو یرغمال بنا لیا جاتا ہے۔ انتقامی کارروائیوں کو صرف اس صورت میں مناسب سمجھا جاتا ہے۔ جب کوئی ریاست واقعی بین الاقوامی غفلت کی مرتکب ہوئی ہو کارروائی پانے سے پہلے خطا کار ریاست کو اس کی غلطیوں سے آگاہ کر دینا چاہیئے علاوہ ازیں انتقامی کارروائی کی نوعیت اور حد صرف اتنی ہی ہونی چاہیے۔ جتنی کہ مضرات سے دوسری ریاست کو دو چار ہونا پڑا ہو۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انتقامی کارروائی کے مقاصد کو کسی قابل یقین سمجھوتہ سے حل کرنا چاہیے۔ تاکہ آئندہ پھر تنازعہ پیدا نہ ہو۔ اقوام متحدہ کے منشور میں کہا گیا ہے کہ رکن ممالک کو کسی ریاست کی علاقائی سالمیت اور سیاسی آزادی کے خلاف دھمکی کے طرز عمل کو نہیں اپنانا چاہیئے اور طاقت کے استعمال سے گریز کرنا چاہیئے اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایسی تمام انتقامی کارروائیاں جن سے فوجی قوت کے ملوث ہونے اور جنگ کا خطرہ لاحق ہو۔ غیر قانونی ہو گئیں

انتقامی کارروائی کی اہم مثالوں میں ۱۹۳۵ء میں ورسیلز میں یوگوسلاویہ کے بادشاہ الیگزینڈر کو قتل کیا گیا۔ تو ہنگری کے باشندوں کو اس شبہ پر کہ قاتل ہنگرین تھا۔ انتقامی کارروائی کے طور پر ملک سے نکال دیا گیا۔

۱۹۵۰ء کے عشرے میں امریکہ کی طرف سے چینی جائیداد کی ضبطی اور تجارتی مال کا بائیکاٹ صرف اس لئے کیا گیا کہ چین کوریا میں داخل اندازی کر رہا تھا۔

۱۹۷۰ء کے عشرے میں سوویت یونین نے انتقامی کارروائی کے طور پر پاکستان کے مشرقی بازو کو الگ کر دیا۔ عام طور پر انتقامی کارروائی انفرادی طور پر کی جاتی ہے۔ مگر کبھی کبھی انتقامی کارروائی کی اجتماعی مثالیں سامنے آتی ہیں جیسے خواب آور ادویات کی درآمد و برآمد پر سمندری اعانت کرنا ۱۹۳۱ء کے جنیوا ڈرگ کنونشن کے تحت ہوئی یہ کارروائی ان ریاستوں کے خلاف کی جاسکتی

ہے۔ جو خواب آور ادویات کا ناجائز کاروبار کرتی ہیں۔
یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اگر خطا کار ریاست اپنی غلطیوں کا معاوضہ
دے تو انتقامی کارروائی ختم ہو جاتی ہے۔

۳۔ پُرامن ناکہ بندی PACIFIC BLOCKADE

عالمی تنازعات کا زبردستی تصفیہ کرانے کا ایک طریقہ پُرامن ناکہ بندی بھی ہے جس میں کسی ساحلی ریاست کا ساحلی یا بندرگاہ کا سلسلہ منقطع کر دیا جاتا ہے۔ جس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ خطا کار ریاست مظلوم ریاست کے نقصان کی تلافی کرے۔ یہ ہتھیار زمانہ امن میں طاقتور ریاست کمزور ریاست کے خلاف استعمال کرتی ہے اس کے مقاصد عموماً اجتماعی ہوتے ہیں۔
اقوام متحدہ کی دفعہ ۴۲ میں واضح طور پہ بیان کیا گیا ہے کہ پُرامن ناکہ بندی کی تجویز "عالمی امن و بقا" کو برقرار رکھنے کے لئے سلامتی کونسل کی طرف سے کی جانی چاہیئے۔ بڑی طاقتیں پُرامن ناکہ بندی کا حق اس لئے رکھتی ہیں کہ وہ جنگ کے خطرات سے بچنا چاہتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ناکہ بندی کرنے والی ریاستوں کو یہ حق نہیں ہوتا کہ وہ غیر جانبدار جہازوں کی تلاشی لیں یا دوسری ریاستوں کے جہازوں کو پکڑیں۔ یہ حق صرف اس وقت ہوتا ہے جب جنگ جاری ہو اور ناکہ بندی حربی طاقت کی طرف سے ہو تاہم دیگر ریاستوں کے جہازوں کو ناکہ بندی سے گزرنے کی اجازت ہوتی ہے۔ قانون بین الاقوام کی رو سے اُن کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی جاسکتی۔

پُرامن ناکہ بندی اتنی لچکدار ہوتی ہے کہ کسی بھی طرح کے حالات میں کی جا سکتی ہے۔ عام حالات میں وہ مقاصد جو جنگ سے حاصل نہیں ہوتے۔ اس سے حاصل کیے جاتے ہیں۔ پُرامن ناکہ بندی کی پہلی مثال ۱۸۲۷ء میں سامنے آئی جب برطانیہ فرانس اور روس نے ترکی کی ناکہ بندی کی۔ اس کے بعد کئی مثالیں سامنے آچکی ہیں۔

بعض ماہرین پُرامن ناکہ بندی کی قانونی حیثیت پر شبہ کرتے ہیں۔ مگر اسے

اقوام متحدہ کے منشور کی روشنی میں دیکھا جا سکتا ہے

۴۔ مداخلت :- INTERVENTION

عالمی تنازعات میں زبردستی کا ایک اور طریقہ مداخلت ہے۔ کسی عالمی تنازعہ کو مداخلت کے ذریعہ حل کرنا دراصل کسی تیسری ریاست کی طرف سے آمرانہ اقدام ہوتا ہے۔ اس طرح کی آمرانہ مداخلت کی مثال ۱۸۹۵ء میں برطانیہ فرانس اور روس کا اقدام تھا جو انہوں نے جاپان کے خلاف کیا اور اسے مجبور کیا کہ وہ چین کو جنوبی منچوریہ کا وہ علاقہ واپس کر دے جو اس نے چین سے ۱۸۹۴-۹۵ء کی جنگوں میں حاصل کیا تھا۔ ۱۹۶۸ء میں چیکوسلاویہ میں وارسا ارکان کی مداخلت اور دسمبر ۱۹۷۹ء میں افغانستان میں سوویت مداخلت بھی اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔

۵۔ جنگ :- WAR

عالمی تنازعہ کے تصفیہ کا آخری جارحانہ طریقہ مسلح جنگ ہے۔ جنگ کا نتیجہ ہمیشہ فتح یا شکست میں ہوتا ہے۔ جنگ کی صورت میں طاقت ور اپنے مقاصد حاصل کر لیتا ہے اور کمزور خاموش ہو جاتا ہے۔

WAR

فطری طور پر انسان کے اندر خیر اور شر کی دو قوتیں پائی جاتی ہیں۔ اول الذکر کی وجہ سے ایک انسان دوسرے انسانوں سے محبت اور ہمدردی سے پیش آتا ہے اور موخر الذکر انسانوں کے مابین دشمنی نفرت اور حسد جیسے احساس کو پروان چڑھاتا ہے۔ یہ منفی احساسات انفرادی اور اجتماعی حیثیت سے لاگو ہوتے ہیں۔ تاریخ میں قوموں اور ملکوں کے مابین مفادات کے ٹکراؤ نے تنازعات کو ہوا دی اور جنگوں کو ہمیشہ آخری تصفیہ کے طور پر استعمال کیا گیا اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ جنگوں سے اکثر اوقات مثبت نتائج بھی برآمد ہوئے۔ بین الاقوامی تعلقات میں عظیم جنگوں GLOBAL WARS کی فہرست حسب ذیل ہے۔

۱۔ ہسپانوی جہازوں کی جنگ: WAR OF ARMADA

یہ جنگ ۱۵۸۵ء۔ ۱۶۰۴ء تک اسپین برطانیہ اور فرانس کے مابین لڑی گئی۔ اس میں نئی دنیا نے اسپین کی اجارہ داری کو چیلنج کیا کہ حق دیے بغیر ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

۲۔ ولندیزوں کی جنگ آزادی: DUTCH WAR OF INDEPENDENCE

یہ جنگ ۱۶۶۵ء۔ ۹۸ تک جاری رہی۔ اس میں نیدرلینڈ اسپین اور پرتگال نے حصہ لیا۔ نتیجتاً امریکہ میں اسپینی طاقت کمزور ہوئی اور یورپ میں ہابس برگ خاندان کو زوال ہوا۔

۳۔ لوئس چہار دہم کی جنگ:۔ WAR OF LOUIS XIV

یہ جنگ ۱۷۱۵ - ۱۶۸۳ تک جاری رہی۔ اس میں فرانس آسٹریلیا اسپین نیدرلینڈ، پرتگال اور انگلستان نے حصہ لیا۔ اس جنگ کے بعد یورپ میں توازن طاقت قائم ہوگیا جسے لوئس چہار دہم روکنا چاہتے تھے اور برطانیہ کی عالمی تجارت خوب چمکی

۴۔ سات سالہ جنگ:۔ SEVEN YEARS WAR

یہ جنگ ۶۳ - ۱۷۵۶ء تک جاری رہی اس میں فرانس، برطانیہ آسٹریلیا، پروشیا، اور اسپین شریک ہوئے۔ اس جنگ کے نتیجے میں فرانس کی انڈیا اور امریکہ کی نوآبادیات ختم ہوگئیں۔ اور پروشیا ایک عظیم طاقت بن گیا۔

۵۔ امریکہ کی انقلابی جنگ:۔ AMERICAN REVOLUTIONARY WAR:-

یہ جنگ ۸۳ - ۱۷۷۵ء تک جاری رہی۔ اس میں برطانیہ فرانس اور اسپین شامل تھے۔ اس جنگ کے نتیجے میں امریکہ کو آزادی نصیب ہوئی۔

۶۔ فرانس کی انقلابی جنگ و نپولینی جنگیں:۔

FRENCH REVOLUTIONARY AND NAPOLEONIC WARS

یہ جنگیں ۱۸۱۵-۱۷۹۲ء تک جاری رہیں۔ ان میں فرانس آسٹریلیا، پروشیا، برطانیہ، روس، اسپین پرتگال اور سویڈن شریک ہوئے اس جنگ سے یورپ کا اتحاد قائم ہوا۔ غلاموں کی تجارت کا خاتمہ ہوا۔ اور سمندر پار برطانوی بادشاہت قائم ہوئی۔

۷۔ جنگ عظیم اوّل FIRST WORLD WAR

یہ جنگ ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء تک جاری رہی۔ اس میں جرمنی آسٹریا ہنگری روس فرانس برطانیہ اٹلی جاپان اور امریکہ شامل تھے۔ اس جنگ کے بعد مجلس اقوام کا قیام عمل میں آیا۔ جرمنی تباہ و برباد ہو گیا۔ آسٹریا اور ہنگری کو تقسیم کر لیا گیا۔

۸۔ جنگ عظیم دوئم: SECOND WORLD WAR

یہ جنگ ۱۹۳۹ء۔ ۴۵ء تک جاری رہی۔ اس میں جرمنی برطانیہ فرانس اٹلی سوویت یونین جاپان اور امریکہ شریک ہوئے۔ اس جنگ کے نتیجے میں اقوام متحدہ کا قیام اور روس و امریکہ دنیا کی عظیم طاقتیں بن کر سامنے آئیں۔ ان جنگوں کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں لاکھوں بلکہ کروڑوں انسانوں کی جانیں اور کھربوں ڈالر مالیت کی جائیداد تباہ و برباد ہوئی۔ لیکن ہمیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ ان جنگوں کی بدولت ہمیں بہت سارے فوائد بھی حاصل ہوئے جیسے پسماندہ علاقوں کی آزادی اور ترقی کرنے کا حوصلہ وغیرہ جنگوں کی وجوہات مقاصد اور اسباب پر اگلے صفحات پر روشنی ڈالیں گے۔

یہاں پہلے جنگ کی تعریف کی طرف کرتے ہیں۔

جنگ کی تعریف:

جنگ کی تعریف پر تمام ماہرین قانون و سیاسیات متفق نہیں ہیں۔ بلکہ سب نے اپنے اپنے نقطہ نظر سے اس کی تعریف بیان کی ہے

۱۔ پروفیسر اسٹارک کہتے ہیں:

"جنگ سے مراد عام طور پر یہ لی جاتی ہے۔ دو یا دو سے زائد ریاستوں کے درمیان ابتدائی طور پر مسلح مقابلہ ہو۔ جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ دو فریقین ایک دوسرے پر اپنی شرائط کے تحت فیصلے تھوپنے جاتے ہیں۔

۲۔ بقول ادون ہیم :۔

"جنگ دراصل دو یا دو سے زائد ریاستوں کے مابین مسلح فوجی لڑائی ہے جس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ فاتح فریق مفتوح پر اپنی شرائط مسلط کر سکے۔"

۳۔ ہالؔ کا خیال ہے :۔

"جب مقتدر ریاستوں کے اختلاف اس نقطہ پر پہنچ جائیں جہاں فریقین طاقت کے استعمال پر اتر آئیں یا کوئی ایک فریق جارحانہ کارروائی کرے جسے دوسرا امن کے خلاف سمجھتا ہو تو جنگ چھڑ جاتی ہے اور دونوں فریقین اس وقت تک جنگ جاری رکھتے ہیں جب تک ان میں سے کوئی ایک دوسرے کی من مانی شرائط قبول کرنے کو تیار نہیں ہو جاتا۔

۴۔ جرمن مفکر کارل وان کلازوٹیز کے مطابق :۔

جنگ سیاسی تعلقات کا حصہ ہے۔ اس لئے اس کی علیحدہ کوئی حیثیت نہیں جنگ اس کے سوائے کچھ نہیں ہے کہ یہ باقی تمام ذرائع کے اشتراک سے سیاسی عمل کا تسلسل ہے۔

۵۔ انسائیکلو پیڈیا آف برٹینیکا میں لکھا ہے۔

"جنگ کسی منظم طاقت کے استعمال کا نام ہے۔ جو دو مخالف انسانی گروہ اپنی پالیسی زبردستی ایک دوسرے پر مسلط کرنے میں استعمال کرتے ہیں۔"

جنگ کی وجوہات :۔ THE CAUSES OF WAR

بین الاقوامی تعلقات کے مطالعے سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ کوئی مخصوص وجہ یا وجوہات نہیں ہوتیں۔ بلکہ بیشتر اوقات تو کوئی بہانہ تنتا ہے۔ اور جنگ شروع ہو جاتی ہے۔ میرے خیال میں جنگ کے وجوہات میں سب اہم عنصر مفاد کا ٹکراؤ ہے اور مفاد کا یہ ٹکراؤ انسان کا انفرادی اور اجتماعی دونوں پہلوؤں پر اثرانداز ہوتا ہے۔

جنگ کی وجوہات پر بھی ماہرین سیاسیات و قانون نے اپنے اپنے خیالات

کا اظہار کیا ہے جہاں چند ایک کی رائے بیان کی جا رہی ہے۔

۱۔ پروفیسر قیونسی رائٹ کہتے ہیں۔

"جنگ درحقیقت اُن تمام حالات کا ردِ عمل ہوتا ہے جو ابتدا ہی سے انسانی زندگی کے مراحل میں روبہ عمل ہیں۔ جنگ اس وقت ہوتی ہے، جب مفادات کا ٹکراؤ ہوتا ہے۔ یہ خواہ مادی ہوں، نظریاتی ہوں، حقیقی ہوں یا روایتی بہرحال اپنے مخصوص اثرات رکھتے ہیں۔

۲۔ پروفیسر چارلس ہاجز جنگ کی ابتدائی وجوہات میں معاشرتی معاشی سیاسی اور مذہبی عوامل ہی کو اہمیت دیتا ہے۔ موصوف کا خیال ہے کہ معاشرتی وجوہات میں مذہب نسل ثقافت تکبر اور ڈر شامل ہے سیاسی وجوہات میں بادشاہت، ملکی مسائل قومیت سامراجیت سفارتی قانون وغیرہ شامل ہے معاشی وجوہات میں آبادی تجارتی پالیسی، غیر ملکی سرمایہ کاری اور غیر جانبدارانہ حقوق وغیرہ شامل ہیں۔

۳۔ آرنالڈ بریچ کا خیال ہے :۔

"مقتدر ریاستوں کے درمیان جنگوں کی وجوہات باقی تمام معاملات کے علاوہ اس حقیقت پر مبنی ہیں۔ کہ ریاستیں زیادہ تر مقتدرانہ حیثیت رکھتی ہیں۔ لہٰذا جنگیں محض اس لئے چھڑ جاتی ہیں کہ دنیا میں کوئی مؤثر نظام قانون نہیں ہے اور نہ ہی کوئی عالمی تنظیم جو ریاستوں کو طاقت کے استعمال سے روکنے کی طاقت وصلاحیت رکھتی ہو۔"

۴۔ ڈبلیو اے ٹرنر نے اپنے تحقیقی مقالہ "جنگ کی وجوہات اور دنیا کے انقلابات" میں اس کی تقریباً اہم وجوہات بیان کی ہیں۔ جن میں زیادہ تر معاشی۔ مذہب اور جذبات وغیرہ سے متعلق ہیں۔

۵۔ ویلیم اسٹیڈ نے جنگ کی وجوہات کا تجزیہ ذرا مختلف کیا ہے :۔

"عدم تحفظ کا احساس اور اس کو خطرہ میں ڈالنے کا ڈر دراصل آج کے دور میں بلاشبہ سب سے اہم وجوہات جنگ تسلیم کی جاتی ہے۔

ان تعریفوں کا جائزہ لینے کے بعد خلاصہ کے طور پر جنگ کے مندرجہ ذیل وجوہات بیان کی جا سکتی ہیں

۱. خفیہ معاہدات و جارحانہ معاہدات۔

۲. اسلحہ سازی و تخفیف اسلحہ۔

۳. نسلی برتری یا قومیت کی شدت۔

۴. بین الاقوامی تنظیم کی غیر ثالثی حیثیت۔

۵. توسیع پسندی کے عزائم

۶. معاشی ترقی و نئی منڈیوں کی تلاش

۷. توازنِ طاقت کی عدم موجودگی۔

۸. نظریاتی برتری یا سرد جنگ

جنگ عظیم اوّل کے اسباب پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر قیونسی رائٹ نے یوں لکھا ہے

"پہلی عالمی جنگ کی وجوہات کے بارے میں مصنفین نے جن نقاط کو زیر بحث لایا ہے۔ ان میں روس اور جرمنی کی فوج کے اجتماعات، آسٹریا کا الٹی میٹم، سارجیوں کا قتل۔ فرانس کی السس اور لورین کو حاصل کرنے کی خواہش بلقان پر اقتدار قائم کرنے کی آسٹریا کی خواہش۔ یورپ کا طریقہٗ اتحاد۔ اسلحہ سازی کے اقدامات۔ بین الاقوامی سفارت کاروں کا طرز عمل۔ یورپ کا غلط سیاسی نظام۔ قومیت کی بنیاد پر دشمنیاں۔ معاشی پالیسیاں۔ اقتدار اعلیٰ کا نظریہ سالمیت کی جدوجہد، ریاستوں کی طرف سے ہوس ملک گیری۔ آبادی، وسائل و طرز زندگی کی غیر مساوی تقسیم۔ نوآبادیاتی دشمنیاں۔ قومی عظمت کے لئے جنگ کو قومی پالیسی کا آلہ کار بنانا۔ انسانی جذبہ کی ناکامی اور کئی وجوہات موجود تھیں۔

اعلانِ جنگ :۔ DECLARATION OF WAR

قانون بین الاقوام داخلی بار کا تقاضہ ہے کہ بغیر اعلان کے کسی قسم کی جنگ شروع نہ کی جائے۔ اب تک یہ روایت چلی آرہی ہے کہ کوئی بھی ریاست اس قسم کے اقدام سے پہلے اس کا داخلی اعلان ضرور کرتی ہے۔ یہ خواہ اعلان عام ہو اپنے

عوام کے لئے ہو یا سفارت کاروں کے لئے ہو بہرحال ایک تسلیم شدہ طریقے سے ہوتا ہے تاکہ مخالفین کو معلوم ہو جائے۔

۱۹۰۷ء کی ہیگ کانفرنس کے تیسرے کنونشن میں طے پایا کہ کسی قسم کی لڑائی اس وقت تک شروع نہیں ہونی چاہیئے جب تک اس کا باقاعدہ اعلان نہ کر دیا جائے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ ان اصولوں کی خلاف ورزی کئی بار ہو چکی ہے۔ مثلاً ۱۹۳۱ء میں جاپان کا منچوریہ پر حملہ ستمبر ۱۹۳۹ء کو جرمنی کا پولینڈ پر حملہ دسمبر ۱۹۴۱ء کو جاپان کا پیرل ہاربر پر حملہ اور ستمبر ۱۹۶۵ء کو بھارت کا پاکستان پر حملہ بغیر اعلان جنگ کے بغیر ہوا۔

جنگوں کی کارکردگی :۔

جنگوں کی کارکردگی میں ان کے فوائد نقصان اور مقاصد بھی شامل ہیں جہاں ہم جنگوں سے ہونے والے عوامل پر تبصرہ کریں گے۔

ا۔ سامراجیت و استعماریت سے نجات :۔

جنگوں کی بدولت دنیا کی بہت ساری اقوام نے سامراجیت سے نجات پائی اور آزادی سے ہمکنار ہوئی۔ مثلاً امریکی قوم نے سامراجیت سے نجات پائی اور آزادی سے ہمکنار ہوئیں۔

بلقان کی جنگوں میں عوام نے ترک سے آزادی حاصل کی۔ کیوبا کے لوگ اسپین سے آزاد ہوئے مشرقِ وسطیٰ اور ایشیا میں بیشتر اقوام پہلی اور دوسری عالمگیر جنگوں کی وجہ سے آزاد ہوئیں۔ ماوزے تنگ کا قول ہے۔

" انقلاب کا سب سے بڑا مقصد یہ ہوتا ہے کہ سیاسی طاقت حاصل کی جائے تاکہ تمام مسائل کو جنگ کے ذریعے حل کیا جائے اور اقتدار بندوق کی گولی سے جنم لیتا ہے وغیرہ وغیرہ

اسی طرح لینن نے کہا ہے :۔

"سرمایہ داری کا خاتمہ صرف انقلاب سے ہو سکتا ہے۔"

۲۔ بڑی ریاستوں کا قیام:۔

بڑی ریاستوں کے قیام میں جنگوں نے بڑا مثبت کردار ادا کیا ہے۔ ابتدائی دور سے لے کر موجودہ دور تک بڑی ریاستیں دوسری ریاستوں پر قبضہ کر کے ہی بڑی ہوتی ہیں اور اس سے وسائل کو بہتر طور پر استعمال میں لانے میں مدد ملتی ہے اور ایک خطے کی تہذیب کو دوسرے خطوں میں روشناس کرانے کا موقع ملتا ہے

۳۔ تجارتی تعلقات میں اضافہ:۔

جنگوں کی بدولت مختلف ممالک کے درمیان تعلقات پیدا ہوئے تباہ حال مفتوح ممالک کی معیشت کو استحکام دینے کے لئے مختلف منصوبے اور پلان بنائے جاتے رہے ہیں جس سے ترقی یافتہ یا فاتح ممالک کے مال کی خوب کھپت ہوئی۔ اس سے نئی نئی منڈیاں دریافت ہوئیں۔ اسلحہ کی خرید و فروخت کا بازار بھی گرم ہوا۔

۴۔ اخلاقی قدروں میں بلندی:۔

ماہرین کا خیال ہے کہ جنگ کی بدولت انسان کی دنیا سے محبت کم اور آخرت کی فکر زیادہ ہو جاتی ہے اور اُسے احساس ہوتا ہے کہ یہ دنیا فانی ہے لہٰذا وہ نیک کام کرنے لگتا ہے۔ یہی حال ممالک کا ہے جیسے اس رفتار ہونے پر بہت سارے لوگ عمل درآمد کرتے ہیں۔ تو دنیا میں بہتر ماحول پیدا ہوتا ہے۔

۵ جذبہ قومیت:۔

جنگوں کی بدولت اقوام میں انفرادی اتحاد بڑھتا ہے اور ہر قوم سے تمام خرافات اور بداخلاقیاں یکسر ختم ہو جاتی ہیں۔ کیونکہ قوم دوسرے کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہو رہی ہوتی ہے۔ فضول خرچی اور عیش سے دور بھاگتی ہے اور صرف وہ ہی کام کیا جاتا ہے جس سے جذبہ قومیت کو تقویت ملے۔

سنہ ۱۹۶۵ء اور سنہ ۱۹۷۱ء کی پاک بھارت جنگوں میں ہم دونوں اقوام کے احساسات محسوس کر سکتے ہیں۔ جرمن عوام کا خیال ہے کہ جنگ میں کمزور کم تر اور گھٹیا قسم کے لوگ مارے جاتے ہیں اور اعلیٰ و ارفع لوگوں کو پھلنے پھولنے کا موقع ملتا ہے۔ مغربی مفکرین اس طرز فکر کی خواہ کتنی ہی مخالفت کریں جرمن قوم نے اپنی تاریخ میں نظریہ پرستی کے اس طرز عمل کو ہمیشہ اپنائے رکھا ہے۔

جنگ کے متبادل :۔ THE ALTERNATIVES OF WAR

یہ ہم جان چکے ہیں کہ جنگ کے کچھ فوائد اور بعض نقصان بھی ہیں۔ اگر ان کا تقابلی جائزہ لیا جائے تو میرے خیال میں انسانی تاریخ کی تمام جنگوں میں بنی نوع انسان کو فوائد کم اور وسائل کا زیاں زیادہ ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم جنگ سے بچنے کے لئے اس کے متبادل تلاش کرتے ہیں۔ جنگ کے متبادل کے طور پر مندرجہ ذیل عوامل کو زیر بحث لایا جا سکتا ہے۔

۱۔ تعلیم :۔

عالمی سطح پر تعلیم کے ذریعے جنگ کی تباہی و بربریت کے خلاف پروپیگنڈا کیا جانا چاہیئے اور بنی نوع انسان کو جارحانہ کارروائیوں سے باز رکھتے ہوئے تعمیری لائحہ عمل کی طرف راغب کرنا چاہیئے۔

۲۔ بین الاقوامی معاشی نظام :۔

ماہرین کا خیال ہے کہ بین الاقوامی معاشی نظام کی بدولت عالمی سطح پر اتحاد کی فضا قائم ہوگی۔ اور جنگ کے خطرات کم ہو جائیں گے لیکن عالمی معاشی نظام بعض مخصوص حالات میں غیر یقینی کوشش بھی تصور کی جاتی ہے۔ کیونکہ ریاستیں مقتدرانہ حیثیت رکھتی ہیں۔

۳۔ بین الاقوامی معاہدہ امن :۔

اگر عالمی معاشرہ کے افراد آپس میں ایک معاہدہ کرلیں کہ جنگ کو قومی

پالیسی کے آلہ کے طور پر استعمال نہیں کیا جائے گا۔ تمام ممالک کی جنگ سے دست برداری جنگ کے متبادل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس قسم کا ایک معاہدہ ۲۷ر اگست ۱۹۲۸ء کو پیرس میں "کلیج برینڈ" کے نام سے ہوا تھا۔

۴۔ مؤثر بین الاقوامی تنظیم :۔

پہلی عالمی جنگ کے بعد مجلس اقوام اور دوسری عالمی جنگ کے بعد انجمن اقوام متحدہ کا قیام عمل میں لایا گیا۔ ان دونوں تنظیموں کا بنیادی مقصد بنی نوع انسان یا آنے والی نسلوں کو جنگ کی تباہ کاریوں سے بچانا تھا۔ مجلس اقوام اپنے مقاصد کے ساتھ سلوک جز بھی نہ کر سکی اور انجمن اقوام کی ۴۰ سالہ کارکردگی بھی ہمارے سامنے ہے۔ ان کی ناکامی کی سب سے بڑی وجہ غیر مقتدرانہ حیثیت ہے جبکہ ریاستیں مقتدر حیثیت رکھتی ہیں۔

۵۔ تخفیف اسلحہ :۔

بعض ماہرین کا خیال ہے کہ جتنی اسلحہ سازی ہو گی جنگ کے خطرات اتنے ہی کم ہوں گے۔ دلیل یہ ہے کہ ایک دوسرے کی طاقت کے خوف سے کوئی بھی ریاست جنگ شروع نہیں کرے گی۔ مگر اس نقطۂ نظر سے ماہرین کی واضح اکثریت اتفاق نہیں کرتی۔ ان کا خیال ہے جس طرح جنگ کے لئے اسلحہ ضروری ہے۔ اسی طرح امن و امان برقرار رکھنے کے لئے اسلحہ کی تخفیف ضروری ہے۔ موجودہ دور میں بعد الذکر رائے کی اہمیت زیادہ ہے اس لئے آج جتنا تخفیف اسلحہ پہ زور دیا جا رہا ہے۔ اور کسی عوامل پہ نہیں دیا جا رہا۔

۶۔ اجتماعی تحفظ کا نظریہ :۔

جنگ کے متبادل کے طور پر اجتماعی تحفظ کے نظریہ کو بھی کافی اہمیت حاصل ہے۔ پروفیسر کیولنسی رائٹ کا خیال ہے۔

" اجتماعی تحفظ کا مقصد ایک ایسی مساوات ہے جس کے قائم ہو جانے سے

کسی ریاست کو یہ ہمت ہی نہیں ہو سکتی کہ وہ دوسری ریاست کے خلاف جنگ چھیڑنے کا خطرہ مول لے۔"

اس نظام کی کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ سب ریاستیں ممکنہ حد تک اجتماعی تحفظ کی کارروائی میں بھرپور تعاون کریں۔ اقوام متحدہ نے بھی جنگوں کی روک تھام کے لئے اجتماعی تحفظ کے طریقے کو اپنایا ہے۔ جس میں اسے کبھی کامیابی اور کبھی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا ہے۔ ماہرین اس طریقے کو ایک نفسیاتی طریقہ خیال کر کے اسے جنگ کا متبادل سمجھتے ہیں۔

۷۔ عالمی حکومت یا وفاق :-

بعض ماہرین عالمی حکومت یا بین الاقوامی وفاق کے قیام کو جنگوں سے نجات کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ مگر عملاً اس تجویز میں کوئی حقیقت نظر نہیں آتی۔ کیونکہ قومیت کے احساس میں ڈوبی ہوئی اقوام یا مملکتیں اپنے اقتدار اعلیٰ کی تقسیم یا اس پر کسی قسم کی پابندی پر بالکل تیار نہیں ہوں گی۔ بہرحال اس نظریہ کی اساس و بنیاد پر بین الاقوامی اداروں کی تنظیم کی جا رہی ہے۔ ان بین الاقوامی اداروں کی کارکردگی نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ عالمی وفاق یا حکومت کا قیام ناممکن ہے۔

۸۔ قانون بین الاقوام :-

جنگ کے متبادل کے طور پر اب قانون بین الاقوام کو اپنانا پہلے سے بہت ضروری ہو گیا ہے۔ کیونکہ انتہائی خطرناک میزائل جنگی جہاز ہتھیار ایجاد ہو چکے ہیں اور اب اگر مقاصد کے حصول کے لئے جنگ کی راہ اختیار کی گئی تو اس سے پوری انسانیت تباہ و برباد ہو سکتی ہے۔ قانون بین الاقوام پر صحیح معنوں میں عمل درآمد ہمیں نہ صرف جنگوں سے نجات دلائے گا بلکہ باہمی تعاون اور عالمی بھائی چارے کی فضا بھی فراہم کرے گا۔

☆☆☆

باب چہارم

سماجی معاشی و سیاسی تحریکیں

SOCIAL, ECONOMIC AND POLITICAL MOVEMENTS

۱۔ سامراجیت

۲۔ استعماریت

۳۔ نئی استعماریت

۴۔ غیر جانبداری

۵۔ قانون بین الاقوام

سامراجیت

IMPERIALSIM

تعریف DEFINITION

سامراجیت کی تعریف کے سلسلے میں ماہرین میں اختلافات پائے جاتے ہیں۔ کیونکہ وقت اور حالات کے مطابق اس میں تبدیلیاں آتی رہی ہیں۔ چند اہم تعریفیں حسب ذیل ہیں۔

۱۔ مورٹیمر جونیس یوں کہتے ہیں۔

"سامراجیت ایک ایسی پالیسی کو کہتے ہیں جس کے تحت کسی ایسے وسیع و عریض شہنشاہیت کو تشکیل دینا اور برقرار رکھنا ضروری ہو جس میں کئی وحدتیں ایک ہی مرکزی اقتدار کے ماتحت ہوں۔"

۲۔ پارٹی مون کا خیال ہے۔

"یورپی اقوام کی طرف سے غیر یورپی اقوام پر حکومت کرنے کا نام سامراجیت ہے۔"

۳۔ چارلس اے بیرڈ یوں رقمطراز ہے۔

"سامراجیت ایک ایسا طریقہ کار ہے جس کے تحت حکومت کی مشینری اور سفارت کاری کو دوسری اقوام کے ماتحت علاقہ پر قبضہ کرنے یا حلقہ اثر میں لانے کے لئے استعمال میں لایا جاتے تاکہ صنعتی تجارت کی ترقی اور سرمایہ کاری کے مواقع میسر آسکیں۔"

۴۔ ایمنڈ ایل بی کے مطابق

"ہر حکومت کی طرف سے دوسری حکومت پر غیر حقیقت پسندانہ مطالبات کی بنا پر جارحانہ جنگ سامراجی عمل ہوتا ہے۔"

۵۔ مشہور اشتراکی مفکر کارل مارکس اور لینن فرماتے ہیں۔

سرمایہ دارانہ نظام معیشت میں جب اشیا کی پیداوار ملکی ضروریات سے بڑھ جاتی ہیں،

تو ریاستیں دور دراز علاقوں پر سیاسی اقتدار قائم کرتی ہیں تاکہ انہیں ان علاقوں میں محفوظ منڈیاں مل جائیں۔ مختصراً اس کی تعریف یوں کی جا سکتی ہے۔
سامراجیت سرمایہ داری کا وہ مقام ہے جہاں پورے معاشی نظام پر اس قبضہ ہو جاتا ہے۔

۶۔ آکسفورڈ ڈکشنری میں سامراجیت کے معنیٰ یہ ہیں۔
"ایک شہنشاہ کی حکومت بالخصوص جب وہ جابر اور مطلق العنان ہو۔"

۷۔ تھرڈ نیو انٹرنیشنل ڈکشنری ۱۹۶۱ء میں اس کے معنی کچھ یوں ہیں
"کسی قوم کا علاقہ یا ماتحت علاقے حاصل کرنا اور ان پر اپنا تسلط قائم کرنا۔ یا اس کے لئے اپنی رضامندی ظاہر کرنا بالخصوص ایسی صورت میں جب یہ علاقے اس ملک کی قدرتی سرحدوں سے باہر ہوں دوسری انسانی نسلوں پر اپنی حکومت کی توسیع کو بھی سامراجیت کہتے ہیں۔
ان تعریفوں کی روشنی میں سامراجیت کی ایک جامع تعریف یوں کی جا سکتی ہے۔
"سامراجیت سے مراد کسی ریاست کی غیر علاقہ اور غیر اقوام پر ناجائز تسلط ہے جس کے ذریعے اس غیر علاقے کے وسائل کو وہاں کے عوام کی مرضی کے خلاف کرے تاکہ اس کے اپنے باشندوں کی زندگی بہتر ہو سکے۔"

سامراجیت کی خصوصیات

بالشویک انقلاب کے قائد لینن نے اپنی کتاب "سامراجیت" میں اس کی پانچ خصوصیات

۱۔ آمرانہ اقتدار

سامراجیت ہمیشہ پسماندہ ممالک سے پھلتی پھولتی ہے کیونکہ پسماندہ ممالک عالمی حالات سے ناواقف ہوتے ہیں جس کی وجہ سے نہ جدید تقاضوں کو پورا کر سکتے ہیں اور نہ ہی ان کا مقابلہ کر سکتے ہیں اس طرح یہ ممالک آسانی سے خانہ جنگی یا سیاسی اختلافات کا شکار

ہو کر ترقی یافتہ ممالک کی سیاسی غلامی میں پھنس جاتے تھے جن ممالک میں ایک مرتبہ سامراجیت قائم ہو جاتی ہے تو وہاں رسم و رواج سے لے کر صنعت و حرفت کو کسی نہ کسی طرح تباہ و برباد کر دیا جاتا ہے علاقے کے وسائل کو خوب لوٹا جاتا ہے تعلیمی میدان میں پسماندہ رکھا جاتا ہے سوچ یہ ہے کہ تعلیم سے لوگ آزادی کی خواہش ظاہر کریں گے

۲۔ چند سرمایہ داروں کا اثر و رسوخ

سامراجیت کے ابتدائی زمانے میں بین الاقوامی تجارت کے تمام تر فوائد چند سرمایہ داروں نے حاصل کئے وجہ یہ تھی کہ اس زمانے میں مواصلات اور حمل و نقل کے ذرائع نے ابھی اتنی زیادہ ترقی نہیں کی تھی۔ چند باہمت لوگ ہی اس میں آگے آگئے تھے ان سرمایہ داروں نے صنعتی سرمایہ کاری کی۔ پسماندہ علاقوں سے خام مال اکٹھا کیا اور تیار شدہ مال ان علاقوں کو بھیجا جانے لگا۔ اس طرح سامراجیت پسند ممالک کے درمیان نوآبادی علاقوں اور منڈیوں کا مقابلہ ہونے لگا۔ اپنے مقاصد کے حصول کے لئے انہوں نے ہر جائز و ناجائز طریقہ استعمال کیا۔ سامراجیت پسند ممالک نے اپنے زیر اثر علاقوں سے قدرتی وسائل اور خام مال سے خوب فائدہ اٹھایا جس کی وجہ سے یہ ممالک غریب سے غریب تر ہوتے گئے ان کی قوت خرید کم ہو گئی۔ مزدوروں میں سیاسی شعور بیدار ہوا جس سے انہوں نے آزادی کی بات کی تو سامراجیوں نے ان کی تحریک کو کچلنے کے لئے بھاری سرمایہ استعمال کیا جس سے سرمایہ داروں اور مزدوروں کے درمیان کشیدگی پیدا ہوئی۔

۳۔ پسماندہ علاقوں کی تقسیم

سامراجیوں نے اپنے کاروبار کو مستحکم کرنے اور زیادہ سے زیادہ فروغ دینے کے لئے باہمی معاہدوں کے ذریعہ نوآبادیات اور مفتوح علاقوں کو تقسیم کرنے کا منصوبہ بنایا اس مقصد کی عملی تعبیر کے لئے افریقہ کی تقسیم کی گئی اور ایشیا کے مفتوح ممالک کے قبضہ و اقتدار کے بارے میں سمجھوتے ہوتے جاپان نے برطانیہ سے یہ سمجھوتہ کیا کہ ہم

اپنی تجارت کے لئے دنیا کی منڈیوں کو آپس میں تقسیم کر لیں۔

۴۔ معاشی گروہ بندیاں

سرمایہ داروں نے نوآبادیات سے دولت کمانے کے لئے بین الاقوامی معاشی گروہ بندیاں قائم کیں تاکہ مختلف ممالک میں لگائے گئے سرمائے کا تحفظ ہو سکے۔ صنعتی انقلاب کے بعد سامراجیوں کے درمیان رسہ کشی اور تجارتی جنگ شروع ہو گئی۔ تقریباً سبھی ممالک نے اپنے مال کی کھپت اور ملکی تجارت کی ترقی کے لئے اشیاء کی درآمد پر محصول عائد کئے یہاں ہی معاشی گروہ بندیوں نے جنم لیا۔ درآمدی برآمدی پالیسیوں میں تبدیلیاں کی گئیں۔ مثال کے طور پر امریکہ اور جرمنی نے درآمد پر محصول عائد کر کے اپنی حفاظت کے لئے دیوار کھڑی کر لی۔

سامراجیت کا پس منظر

صنعتی انقلاب کے بعد اہل یورپ کو تین اہم مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ اول صنعتی پیداوار کی کھپت دوئم انسانی آبادی اور بے روزگاری سوئم خام مال کے حصول کا مسئلہ۔ ان مسائل کو حل کرنے کے لئے یورپی ممالک نے سامراجیت کی بنیادیں رکھیں۔ یہاں ہم سامراجیت کے پس منظر کے مطالعے کے لئے برطانیہ، فرانس، جرمنی، روس اور امریکہ کی سامراجی سرگرمیوں کا جائزہ لیں گے۔

۱۔ برطانوی سامراجیت

برطانیہ میں سب سے پہلے صنعتی انقلاب آیا۔ اس وجہ سے سامراجیت کی ابتدا بھی اس نے شروع کی ۱۸۷۰ء تک برطانیہ اکیلا ہی اس میدان کا مجاہد تھا۔ برطانیہ دنیا کا نصف لوہا تیار کر رہا تھا اور اتنا ہی سوتی مال بھی بنا رہا تھا۔ برطانیہ کی یورپ کے ہر ملک سے دوگنی تجارت تھی۔ برطانیہ کی برتری کی ایک اور وجہ یورپی بحران تھا۔ جرمنی اور فرانس صوبہ جات السانس اور لورین کے جھگڑوں میں روس اور آسٹریا اپنے بلقانی رسہ کشی میں اور امریکہ اپنے خانگی جھگڑوں میں مصروف تھا برطانوی مفکرین اور ادیبوں نے کتابیں

پوسٹر اور پمفلٹ لکھ کر برطانوی باشندوں کو سامراجیت کا سبق پڑھایا۔ سرہیری جانسٹن جیسے اعلیٰ حاکم اور تاریخ داں نے برطانیہ کے لوگوں کو افریقہ کے وحشی عوام پر انگریزی حکومت کے فوائد کو واضح کیا اور سامراجیت کی ترغیب دی۔

سےسل اینڈرسن جیسے تاجروں نے نفرت انگیز ہتھکنڈوں اور تدابیر سے جنوبی افریقہ میں لاکھوں پونڈ سونا اور ہیرے جمع کئے۔ برطانیہ کے گلیڈسٹون جیسے سیاست داں جس نے ۱۸۷۵ء میں بحرالکاہل جنوبی کے جزیرے فیجی کو اپنی سلطنت میں ملایا اور اسی سال ہی نہر سوئز پر قبضہ کرنے کا ہنر دکھایا۔ برطانوی وزیر خارجہ سر ایڈورڈ گرے بھی برطانوی سامراجیت کو استوار کرنے کے لئے فرانس، روس، اور جرمنی سے خفیہ معاہدے کرتا رہا۔ یہ معاہدے ایشیا اور افریقہ کے سلسلے میں تھے اس پالیسی کا بھید ۱۹۱۴ء کو جنگ عظیم اول میں کھلا۔

برطانیہ کے پاس ایک زبردست بری اور بحری فوجی طاقت ہونے کی وجہ سے اس نے جبرالٹر، مالٹا، نہر سوئز، عدن، اور سنگاپور جیسے بحری ناکوں پر اپنا تسلط قائم کر لیا جنوبی افریقہ اور رہوڈیشیا میں اس کے ہاتھ ہیرے اور سونے کی کانیں لگیں۔ اور اپنے لوگوں کو آباد کرنے لئے وہاں قابل زراعت زمین بھی مل گئی۔ ۱۹۲۵ء کے بعد برطانیہ کی حالت متزلزل ہوتے لگی ایک طرف تو اس کے مخالف فرانس، اٹلی، جرمنی آسٹریا اور روس وغیرہ اٹھ کھڑے ہوتے اور دوسری طرف نو آبادیات میں بھی بدامنی اور فسادات ہونے شروع ہو گئے۔

۲۔ فرانسیسی سامراجیت

برطانیہ کی بڑھتی ہوئی سامراجیت کے پیش نظر فرانس میں جیولس فیری جیسے سامراجیت پسند وزیراعظم اور گیمبیٹا جیسے تجارتی استعماریت پرست پیدا ہو چکے تھے ۱۸۸۰ء کے فرانس بھی سامراجی توسیع میں شریک ہو گیا اس نے افریقہ میں الجیرا، تیونس، انام اور ٹانکن کو ہڑپ کیا علاوہ ازیں ڈھامی کے ساحلی علاقے اور مڈغاسکر کے جزیرے پر بھی اپنا تسلط قائم کر لیا۔ ۱۹۰۴ء میں انگریزوں سے دوستی کر کے مراکش پر بھی قبضہ کر لیا تقریباً تیس سال میں فرانس نے افریقہ میں ایک عظیم الشان سامراجیت قائم کر لی۔ فرانس سامراجی

توسیع کے اصول میں تو کامیاب ہوگیا مگر وہ تجارتی اقتدار کے راز کو نہ سمجھ سکا لہٰذا اپنے مفتوحہ ممالک کے خام مال سے زیادہ فائدہ نہ اٹھا سکا۔ آئلر وجینا کے چاول سے جاپان نے نفع کمایا۔ مڈغاسکر کے جانوروں کی تجارت ٹرانسوال کے لئے مفید ثابت ہوئی اور سوڈان کی بحری امریکن تجار کے لئے سودمند رہی۔

۳۔ جرمن سامراجیت

جرمن چانسلر بسمارک کا رجحان اقتصادی اور تجارتی اقتدار کی طرف زیادہ نہ تھا جس کی وجہ سے انیسویں صدی میں جرمنی میں صرف سامراجیت کے خیالات ہی پیدا ہو سکے۔ جرمن ماہر معاشیات مڑلیسٹ نے یہاں تک لکھا ہے۔

"جرمن کاروبار کی ترقی و اضافہ اور ملک کے درآمد و برآمد کو بڑھانے نیز بحری فوج کو مضبوط کرنے کے لئے نوآبادیات سب سے اچھا ذریعہ ہیں"

جرمنی کے قیصر ولیم کو بسمارک کی پالیسیوں سے اختلاف تھا وہ جرمنی کو جلد از جلد ایک عظیم طاقت دیکھنا چاہتا تھا۔ چنانچہ ۱۸۹۰ء میں ان ہی اختلافات کی بناء پر بسمارک کو استعفیٰ دینا پڑا۔ وزیر اعظم کیپ ایلین کے ماتحت جرمن سامراجیت کا آغاز ہوا افریقہ میں برطانیہ اور فرانس پہلے ہی سے زمین کی ناپ تول کر چکے تھے جس کی وجہ سے جرمنی کو سوڈان میں ٹوگو سینڈ اور کیمرون کی زمین کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اور بحرالکاہل میں مجموعہ الجزائر سمون پر اکتفا کرنا پڑا۔ چین میں ۱۸۹۱ء میں اس کے ہاتھ کو چو KOW CHOW کا علاقہ آیا۔

جرمنی نے برطانیہ کا مقابلہ کرنے کے لئے اپنے تجارتی جہازوں اور بحری بیڑے کو مضبوط بنایا جس کی وجہ سے ہیمبرگ اور بریمن کی فیکٹریاں دنیا کی بندرگاہوں سے مل گئیں جرمنی کے تجارتی جہازوں نے اپنے کرائے کی شرح میں بہت کمی کر دی جرمنی نے دوسرا قدم یہ اٹھایا کہ اپنے ہمسایوں آسٹریا اور ہنگری وغیرہ سے دوستی کر لی۔ بلقانی صوبہ جات کے بازاروں کو اپنے کچے مال کا مرکز بنایا۔ ترکی کے سلطان سے گفت و شنید کے ذریعے عثمانی سلطنت میں گھسا اور تجارتی مراعات حاصل کیں۔ بغداد ریلوے کے خاص تسلط کے سبب جرمن انجینئرز اور سوداگر ہندوستان کی سرحد تک پہنچ گئے تھے۔ اگر جرمنی کی یہ تدبیر

کامیاب ہو جاتی تو بحر شمالی سے خلیج فارس تک ایک عظیم الشان سلطنت قائم ہو گئی تھی۔

۴۔ روسی سامراجیت

۹۰-۱۸۸۰ء کے درمیانی عرصہ میں فرانس اور بلغاریہ کے حاصل شدہ سرمایہ سے روس میں بڑے پیمانے پر فیکٹریاں اور کارخانے قائم کئے گئے جس سے روس کو بھی نئی نئی منڈیاں تلاش کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی ۱۸۸۸ء میں اس نے ٹرانس کیپین ریلوے TRANS CASPIAN RAILWAY. بنائی جس کے ذریعہ روس ترکستان سے روئی لے جا کر ماسکو کی کلاتھ ملوں کو دے سکتا تھا۔ بحری طاقت کمزور ہونے کی وجہ سے اس نے خشکی کے راستے سے چین میں گھسنے کی کوشش کی۔ ۱۹۰۱-۱۸۹۱ء کے عرصہ میں اس نے ٹرانس سائبرین ریلوے لائن بنوائی اور اسے منچورین ریلوے لائن سے ملا کر پورٹ آرتھر کو پیکنگ سے ملا دیا۔ اس طرح ریلوے لائن کی مدد سے روس چین میں گھس گیا۔ روس بنیادی طور پر چین کے علاقہ منچوریہ پر قبضہ کرنا چاہتا تھا جس میں وہ کامیاب نہ ہو سکا لیکن روس کے بنائے ہوئے کپڑے، مشینیں اور ریلوں کے پرزوں کی فروخت کے لئے یانگ سی کیانگ کا بازار اس کے ہاتھ آ گیا۔

۵۔ امریکی سامراجیت

اٹھارویں صدی کے آخر تک یورپی ممالک کے لئے امریکہ بڑی اچھی منڈی کے طور پر کام دے رہا تھا لیکن انیسویں صدی کے آخری عشرے میں اقتصادی آندھی نے امریکہ کو سامراجیت کا سبق یاد دلایا۔ تو امریکہ نے ابتدا میں یورپی صنعتی مال کی دبا سے بچنے کے لئے درآمدی ٹیکس لگا دیا جس سے یورپ کے مال کی کھپت کم ہو گئی۔ افریقہ اور ایشیا تقسیم ہو چکے تھے۔ لہٰذا امریکہ نے اپنے سامراجی مقاصد کے تکمیل کے لئے مشرق بعید میں نہر پنامہ بنا ڈالی۔ سب سے پہلے اس نے اپنے گھر والوں پر ہاتھ صاف کئے یعنی میکسیکو کے تیل کے چشموں پر قبضہ کیا اور جنوبی امریکہ میں اپنا سرمایہ لگایا۔ غیر ممالک میں خصوصاً

چین میں امریکی تجار نے لاکھوں ڈالر لگا رکھے تھے۔

بیسویں صدی کے شروع تک شمالی کرہ کے تقریباً سبھی ممالک برطانیہ، فرانس جرمنی، اٹلی، آسٹریا، روس، امریکہ، جاپان، سامراجیت کی جد وجہد میں شامل تھے۔ افریقہ کی تقسیم میں وہاں کے اصل باشندوں کی بالکل پرواہ نہ کی گئی۔ سامراجیوں کے مفادات میں تصادم کی وجہ سے کئی دفعہ یورپ میں جنگ ہوتے ہوتے رہ گئی۔

سامراجیت کے مقاصد

THE MOTIVES OF IMPERIALISM

سامراجیت کے اہم مقاصد حسب ذیل ہیں۔

۱۔ معاشی مفادات

سامراجیت میں معاشی مسائل کو بہت زیادہ اہمیت دی جاتی ہے طاقتور ریاستیں ایسے علاقوں پر قبضہ کرنا چاہتی ہیں جن علاقوں سے خام مال حاصل ہو اور تیار شدہ مال کی کھپت ہو۔ پہلے طاقت کے ذریعہ پسماندہ علاقوں پر قبضہ کیا جاتا تھا اب معاشی معاہدوں اور بیرونی امداد کے ذریعے انکی منڈیوں پر تسلط قائم کیا جاتا ہے یہ کہتے جانا ہو گا آج وہ ہاتھی مفت دے رہے ہیں تاکہ ان سے چارہ روز خریدا جائے۔

۲۔ قومی وقار

ہر حکمران اپنی سلطنت کو مضبوط اور وسیع کرنے کا خواہاں ہوتا ہے۔ برطانوی بڑے فخر سے کہا کرتے تھے

"سلطنت برطانیہ پر کبھی سورج غروب نہیں ہوتا۔"

مسولینی جیسا حکمران دنیا کے نقشے میں افریقی صحراؤں پر ہاتھ پھیر کر بڑے فخر سے کہتا تھا۔

"یہ سب اطالوی جھنڈے تلے ہیں۔"

ہان کوہان کے مطابق۔

"سامراجیت میں معاشی مفادات کے علاوہ نفسیاتی مقاصد نے اہم کردار ادا کیا ہے طاقت اور کارناموں کی خواہش نے مقبوضہ علاقوں کے طبقات پر ہی نہیں عوام پر بھی حکومت کرنے کے لئے وسیع نوآبادیاتی سلطنت قائم کرنے میں مدد دی۔"

قوموں کے درمیان زیادہ سے زیادہ طاقت اور قوت کا مظاہرہ زیادہ سے زیادہ نوآبادیات قائم کرکے بآسانی کیا جاسکتا ہے سامراجیت پسند ریاستوں کے باشندے بھی بڑے فخر سے اپنی حکومت کی قوت اور وقار کی بات کرتے نظر آتے ہیں۔

(۳) قومی تحفظ

سامراجی ممالک کے قومی تحفظ کے لئے نوآبادیات نے اہم کردار ادا کیا ہے نوآبادیات نے جہاں خام مال کے حصول اور منڈیوں کی تلاش میں مدد دی ہے وہاں قومی تحفظ کے لئے انسانی قوت بھی مہیا کی ہے۔ برطانیہ نے اپنے قومی تحفظ کے لئے انیسویں صدی میں روس کے خلاف افغانستان، ایران، اور تبت وغیرہ کو استعمال کیا۔ پہلی جنگ عظیم میں فرانس نے اپنی نوآبادیات سے پانچ لاکھ سپاہیوں کو لڑنے کے لئے اور دو لاکھ کے قریب مزدوروں کو استعمال کیا۔ برطانیہ نے صرف ہندوستان سے چار لاکھ فوجی حاصل کئے دوسری عالمی جنگ ۱۹۳۹-۴۵ء میں بھی نوآبادیاتی افواج کو اپنے جنگی مفادات کی تکمیل کے لئے استعمال کیا گیا اسی لئے کہا جاتا ہے کہ طاقتور ریاستوں کے قومی تحفظ کے لئے معاشی، نفسیاتی اور دفاعی اعتبار سے نوآبادیات نے اہم کردار ادا کیا ہے۔

(۴) توازن آبادی

آبادی کو متوازن رکھنے میں بھی سامراجیت نے اہم کردار ادا کیا ہے جن علاقوں کی

آبادی بڑھ جاتی ہے وہاں سے افراد کم گنجان اور غیر آباد علاقوں کی طرف منتقل ہو جاتے ہیں مثال کے طور پر جاپان نے چین کے علاقے پر دوسرے مفادات کے حصول و تکمیل کے علاوہ اپنے ہاں کی آبادی کو بھی منتقل کیا۔ اس کے علاوہ برطانیہ فرانس، اٹلی، جرمنی وغیرہ کے افراد بھی افریقہ اور ایشیا میں آکر آباد ہوئے۔

جنگ عظیم دوئم کے بعد جب سامراجی طاقتوں کی آبادی کم ہو گئی تو برطانیہ جیسے ملک نے غلام علاقوں کے افراد کو برطانوی شہریت کی پیش کش کی برطانیہ اور کینیڈا میں سکھوں کی اتنی بڑی تعداد اسی پالیسی کا نتیجہ ہے۔

۱۹۲۰ء تک دنیا کا تقریباً نصف علاقہ اور دو تہائی آبادی نو آبادیاتی مقبوضات میں رہتی تھی اس طرح یورپی اقوام اپنی آبادی سے دوگنی اور اپنے علاقے سے بیس گنا زیادہ علاقے پر اپنا اقتدار قائم کئے ہوئے تھیں۔ پسماندہ اور کمزور ریاستوں کے قدرتی وسائل اور آبادی کو اپنے مفادات کی تکمیل انسانی تہذیب کے تمام آداب کو بالائے طاق رکھ کر استعمال کیا۔ موجودہ یورپی خوشحالی اور مہذب پن کے پیچھے صدیوں کی بربریت اور لوٹ مار پوشیدہ ہے۔

(۵) صنعتی و تہذیبی ترقی

سامراجیت کی وکالت کرتے ہوئے سامراجیت پسند مفکرین کہتے ہیں کہ پسماندہ علاقوں میں معاشی، صنعتی و تہذیبی ترقی سامراجیت ہی کی مرہون منت ہے۔ اگر ہندوستان غلام نہ ہوتا تو وہ جمہوریت اور آزادی کا سبق کس سے سیکھتا۔ سامراجیت نے غیر مہذب اقوام میں تعلیم سائنس اور ٹیکنالوجی کا معیار بلند کیا یہاں کے پسماندہ افراد کو کھانے، پینے، اٹھنے بیٹھنے کے انگریزوں نے آداب سیکھے۔ اب مغربی اقوام اس سلسلے میں خاصی خوش و خرم نظر آتی ہے کہ جس تہذیب تعلیم و تربیت کی بنیاد انہوں نے صدیوں پہلے ڈالی تھی اب وہ ان علاقوں میں قومی رنگ اختیار کر چکی ہے۔

۶۔ گوروں کی ذمہ داری:۔

گورے (سفید فام) سیاہ فام باشندوں کو زمین پر بوجھ سمجھتے تھے۔ اُن

کی تعلیم و تربیت اور معاشی ترقی کو اپنی ذمہ داری خیال کرتے تھے۔ چنانچہ اس کی تکمیل کے لئے انہوں نے غیر ترقی یافتہ ممالک میں اپنی نوآبادیات قائم کیں اس میں شک نہیں کہ نوآبادیات میں کام کرنے والے ہزاروں افراد ایسے تھے جو اس جذبے کے تحت کام کرتے تھے تاہم یہ طریقہ کار مغرب زدہ دنیا کے لئے کبھی بھی قابل قبول نہیں رہا۔ قائداعظم نے ایک انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا کہ امیر اور غریب دنیا میں ساتھ ساتھ رہتے ہیں لیکن کسی امیر کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ غریب کا گھر جلا دے۔ سامراجیوں کا قائم کردہ نظام تعلیم تیسری دنیا کے ممالک میں قومی رنگ اختیار کر چکا ہے۔ تیسری دنیا کے ممالک اپنے قومی اقدار کے مطابق نیا نظام تعلیم لانا چاہتے ہیں لیکن سامراجی دور کی نوکر شاہی اس کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ پاکستان کی ہی مثال لے لیجئے۔

۷۔ اشتراکی مفکرین کا نظریہ :۔

مغربی مفکرین سامراجیت کی حمایت میں معاشی مفادات، قومی وقار، قومی تحفظ، توازنِ آبادی، صنعتی و تہذیبی ترقی کے دلائل دیتے ہیں اور اپنے گھناؤنے کردار پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اشتراکی قائدین کارل مارکس اور لینن سامراجیت کو سرمایہ داری کے پھیلاؤ سے تعبیر کرتے ہیں۔

"سرمایہ دارانہ معاشی نظام میں جب اشیاء کی پیداوار ملکی ضروریات سے بڑھ جاتی ہے تو ریاستیں دور دراز علاقوں پر سیاسی اقتدار قائم کرتی ہیں تاکہ ان علاقوں میں انہیں اپنے مال کی کھپت کے لئے منڈیاں میسر آسکیں اس طرح سامراجیت سرمایہ داری کا وہ مقام ہے جہاں پورے معاشی نظام پر اس کا قبضہ ہو جاتا ہے۔"

اشتراکی مکتبہ فکر کے نزدیک سامراجیت استحصال کی ترقی یافتہ شکل ہے اس لئے اشتراکی قائدین سرمایہ داری کا یہ نظام ختم کر کے ریاستی اقتدار کے

تحت منصفانہ معاشی اقتدار قائم کرنا چاہتے ہیں۔ مگر افسوس اس بات کا یہ ہے کہ یہ اشتراکی قائدین جو انسانی آزادی اور مساوات کے سب سے بڑے علمبردار بنے پھرتے ہیں ۱۹۱۷ء کے بالشویک انقلاب کے بعد اپنے ہاں بھی انسانی آزادی اور مساوات کا منصفانہ نظام نافذ نہیں کر سکے۔ بلکہ روسی عوام جاگیردارانہ استحصال (زار خاندان کی حکومت) سے نکل کر اشتراکی استحصال (کمیونسٹ پارٹی کی حکومت) کے تحت آ گئے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ انسانیت کو استحصال سے بچانے کا ابھی تک کوئی جدید نظام وجود میں ہی نہیں آیا۔ آزاد اور مساویانہ معاشرتی کے نظام کی ایک جھلک ہمیں "اسلامی سماجی نظام" میں ملتی ہے۔ مگر انسانیت کے باسی اس سے ابھی بہت دور ہیں۔

۲- استعماریت

COLONIALISM

سامراجیت اور استعماریت کا بنیادی مقصد دوسرے علاقوں پر قبضہ کر کے اپنی قوت اور حلقہ اثر میں اضافہ کرنا ہے لیکن دونوں میں نظریاتی طور پر تھوڑا سا فرق ہے نوآبادتی تصور یہ ہے کہ کچھ افراد کا کسی خطے اراضی پر دائمی قیام کرنا عام طور سے ایسی جگہ پہلے آبادی بھی نہیں ہوتی۔ آباد ہونے والے افراد اپنی تہذیب و تمدن کے مطابق مختلف ادارے قائم کرتے ہیں بحیثیت مجموعی سامراجیت استعماریت سے زیادہ خطرناک ہے۔

استعماریت کے بارے میں مشہور اشتراکی مفکر کارل مارکس کہتے ہیں۔

"یہ سرمایہ داری کی آواز ہے جو سامراجیت اور استعماریت کی شکل میں غیر ترقی یافتہ اقوام اور علاقوں کا معاشی استحصال کرنے کے لئے قوت سے استعمال میں لائی جاتی ہے۔"

شمال مشرقی یورپ کی ریاستوں پر روسی تسلط اور جنوبی مشرقی ایشیا میں چینی اثرات استعماریت کی ترجمانی کرتے ہیں استعماری طاقتیں اپنے وجود کی مثبت حیثیت کو ثابت کرنے کے لئے یہ دلیلیں دیتی ہیں کہ ہم نے نوآبادیاتی علاقوں میں سڑکیں تعمیر کرائیں ادویات فراہم کیں۔ ریلوے لائنیں ڈالیں۔ مزید برآں غیر ترقی یافتہ افراد کو کاروبار حکومت چلانے کی تربیت دی اس طرح ان علاقوں کے مفاد میں ہے کہ وہ استعماری قوتوں کو تسلیم کرلیں۔ اور ان کے احکامات کی پابندی کریں۔

درحقیقت ان استعماری قوتوں نے نوآبادیاتی علاقوں کے وسائل کو اپنے مفادات کے لیے لوٹا ہے خود حکومتی کے احساس کو ذہنیت دینے کے بجائے غلامانہ ذہنیت پیدا کی ہے اپنی حکومت بنانے کے لیے انہوں نے غریب عوام کا استحصال کیا ہے دوسری عالمی جنگ کے بعد اقوام متحدہ کے منشور کے تحت اس بات کو تسلیم کیا گیا ہے کہ کوئی بھی ریاست کسی دوسری

ریاست کو اپنی نو آبادی نہیں بنائے گی مگر پھر بھی عملی طور پر یہ سلسلہ جاری و ساری ہے۔

۳- نئی استعماریت

NEO-COLONIALSIM

جنگ عظیم دوئم ۴۵ - ۱۹۳۹ء کے بعد ۲۴ اکتوبر ۱۹۴۵ء کو اقوام متحدہ کا قیام عمل میں لایا گیا تاکہ آئندہ نسل انسانی کو جنگ کی تباہ کاریوں سے بچایا جا سکے۔ تمام ریاستوں نے اس بات کا عہد کیا کہ بین الاقوامی امن و سلامتی کے لیے تمام چھوٹی اور بڑی اقوام کا مساویانہ حقوق اور حق خود ارادیت کے اصول کی بنیاد پر احترام کیا جائے گا۔ ۱۹۶۰ء میں اقوام متحدہ کے ایک اعلان میں نو آبادیات کی آزادی کی حمایت کی گئی جس کا تمام ممبر ممالک نے بڑی گرمجوشی سے خیر مقدم کیا۔ اقوام متحدہ کی کوششوں اور ممبر ممالک کے تعاون کی وجہ سے آج تقریباً سبھی غلام ممالک آزاد اور خود مختار ممالک بن چکے ہیں۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد عالمی سیاست میں ایک اہم تبدیلی واقع ہوئی روس اور امریکہ دو متوازی قوتیں بن کر دنیا کے نقشے پر ابھریں لہٰذا ان پر اخلاقی ذمہ داری عائد ہوتی تھی کہ غریب پسماندہ اور نئی آزاد ہونے والی ریاستوں کا معیار زندگی بہتر بنانے کے لئے ان کی امداد کریں۔ یہ امداد خالصتاً انسانی ہمدردی اور خلوص کی بنیاد پر دی جانی چاہئے تھی لیکن ان ممالک نے جلد ہی اپنے کردار سے ثابت کر دیا کہ اس غیر ملکی امداد کے پس پردہ بھی استعماری عزائم پنہاں ہیں روس نے مشرقی یورپ کی ریاستوں چیکوسلواکیہ، یوگوسلاویہ، رومانیہ، ہنگری، پولینڈ، بلغاریہ وغیرہ کو مولوٹو پلان اور وارسا پیکٹ کے تحت اپنے شکنجے میں جکڑا ہوا ہے۔ افریقہ اور ایشیا میں انگولا، ایتھوپیا، موزمبیق، لاؤس اور کمبوڈیا جنوبی ویت نام جنوبی یمن اور ۱۹۷۹ء سے افغانستان میں روسی مداخلت نئی استعماریت کی کڑی ہے۔

اسی طرح امریکہ نے ایشیا اور افریقہ اور لاطینی میں اقتصادی اور دفاعی امداد کے بل بوتے پر اپنا اثر و رسوخ قائم کیا ہوا ہے۔ چین نے کوریا، تبت اور دیگر سرحدی علاقوں پر اپنی نو آبادیاں قائم کی ہوئی ہیں۔

اقوام متحدہ کی کارکردگی پر تبصرہ کرتے ہوئے انڈونیشیا کے ایک سابق صدر ڈاکٹر

احمد سوئیکارنو نے ٹھیک ہی کہا تھا۔

"اقوام متحدہ چند بڑی اور مفاد پرست طاقتوں کا استحصالی ادارہ ہے یہاں غریب اور ترقی پذیر اقوام کو لوٹنے استحصال کرنے اور ان پر اقتدار قائم کرنے کے باہمی سمجھوتے ہوتے ہیں یہ ادارہ دراصل بڑے ڈاکوؤں کے مفادات کی تکمیل کا ذریعہ ہے جہاں انصاف کرنے والے کو دھتکارا جاتا ہے ان کے خلاف سازشیں کی جاتی ہیں اور انہیں دور جدید کی غلامی کے طریقوں پر طاقت کے ذریعہ مجبور کیا جاتا ہے۔"

آج تینوں عظیم طاقتوں امریکہ روس اور چین کے علاوہ دیگر ترقی یافتہ ممالک مغربی جرمنی فرانس، برطانیہ، اور جاپان وغیرہ تیسری دنیا کے ممالک میں سرمایہ کاری کر کے ان پر سیاسی بالادستی کے بجائے اقتصادی بالادستی قائم کئے ہوئے ہیں اور کر رہے ہیں۔ تاکہ ان ترقی یافتہ ممالک کے مال کی کھپت کے لیے منڈیوں میں وسعت رہے اور ان پسماندہ اور ترقی پذیر ممالک کی بد قسمتی ہے کہ وہ ایک طرف تو پہلے ہی غریب ہیں اور دوسری طرف اپنی مقامی تنازعات اور عالمی طاقتوں کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے وہ مسلح تصادم کی گرفت میں بھی آتے رہتے ہیں ۱۹۴۵ء کے بعد دنیا میں تقریباً ۱۲۰ بڑی جنگیں لڑی گئیں اس طرح ان ممالک کے محدود وسائل کا بڑا حصہ بہتر زندگی کا سامان خریدنے پر نہیں بلکہ تباہی کے ذرائع حاصل کرنے پر خرچ ہو رہا ہے۔

باخبر ذرائع کا کہنا ہے کہ اگر اسلحہ سازی کی صنعت مندے کا شکار ہوتی ہے تو اسلحہ برآمد کرنے والے ممالک کی طرف سے سربراہان، پردہ اور خفیہ ہتھکنڈے استعمال کئے جاتے ہیں تاکہ کہیں نہ کہیں تصادم کی صورت نکلے اور ان کی مصنوعات فروخت ہو سکیں اس طرح چھوٹے ترقی پذیر ممالک کی آزادی اور قومی سلامتی ... کا انحصار بھی عظیم طاقتوں کی پالیسیوں کا ایک حصہ بن گیا ہے۔ یہی نئی استعماریت ہے۔ ... ذہنیت،

...یب عوام کا
...بات کو...

۴۔ غیر جانبداری

غیر جانبداری سے مراد کسی ریاست کا وہ طرز عمل ہے جو وہ دو یا دو سے زائد ریاستوں کے درمیان جنگ کی صورت میں غیر جانبدار رہنے کی صورت میں اختیار کرتی ہے ریاست کی اس حیثیت کا قانون بین الاقوام بھی تسلیم کرتا ہے۔

غیر جانبدار ریاست کی تعریف

۱۔ بقول اوپنہیم

"غیر جانبداری کا مطلب کسی ریاست کا وہ طرز عمل ہے جو وہ شریک جنگ حربیوں کے معاملات سے الگ رہ کر اختیار کرتی ہے اور جسے بہرحال حربیوں نے بھی تسلیم کیا ہو۔"

۲۔ فنوک کا خیال ہے :۔

"غیر جانبداری جیسا کہ بیسویں صدی میں عام طور پر خیال کیا جاتا ہے اس طرح واضح کی جاتی ہے کہ کسی ریاست کے وہ قانونی حیثیت جس کے تحت وہ دو حربی ریاستوں کے معاملات سے الگ رہ کر برقرار رکھتی ہے۔"

۳۔ اسٹارک کے مطابق :۔

"غیر جانبداری فنی نقطہ نظر سے مخصوص قسم کی حیثیت رکھتی ہے جس کے تحت حقوق و فرائض کا ایک سلسلہ شروع ہوتا ہے جس کا احترام حربیوں کو کرنا پڑتا ہے۔"

غیر جانبداری کا تاریخی ارتقاء

اٹھارویں صدی سے پہلے غیر جانبداری کا تصور غیر واضح تھا ریاستوں کو ایک دوسرے کی جنگ میں کسی نہ کسی طرح شریک ہونا پڑتا تھا لیکن اٹھارویں صدی کے بعد غیر جانبداری کے نظریے نے ایک واضح تشکل اختیار کر لی ہے ریاستوں میں اتنا شعور پیدا ہو گیا کہ غیر جانبداری کے نظریے کے نقصانات اور فائدے میں تمیز کرنے لگیں انہوں نے

میں امریکہ نے نپولین کی جنگوں میں غیر جانبدار رہ کر اس نظریہ کو تقویت پہنچائی اور بیسویں میں سوئیزرلینڈ اور بلجیم کے غیر جانبدار بن جانے سے اس نظریئے کو مزید تقویت ملی اس طرح امریکہ کی خانہ جنگی میں دوسری ریاستوں نے غیر جانبدار رہ کر اس نظریہ کی حوصلہ افزائی کی۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ انیسویں صدی میں یورپ میں کئی جنگیں ہوئیں جن میں بیک وقت کئی ریاستوں نے حصہ لیا جس کی وجہ سے دوسری ریاستوں کو غیر جانبدار رہنے کا موقع ملتا رہا۔ ان حالات میں غیر جانبداری کے عام قواعد وضوابط اعلان پیرس ۱۸۵۶ء اور ہیگ کانفرنسوں ۱۸۹۹ء اور ۱۹۰۷ء میں طے کیے گئے۔ لیکن غیر جانبداری کے ان قواعد کو پہلی عالمی جنگ میں ناقابل عمل سمجھا گیا۔ دوسری عالمی جنگ ۱۹۳۹-۴۵ء میں تو بالکل ہی اس کی پرواہ نہ کی گئی پہلی اور دوسری عالمی جنگ میں امریکہ نے غیر جانبدار رہنے کا اعلان کیا تھا مگر وہ بھی حالات کے پیش نظر اس پر قائم نہ رہ سکا۔ اسی طرح دوسری عالمی جنگ میں سوویت یونین کی طرف سے غیر جانبداری کے اعلان کے باوجود جب ۱۹۴۱ء میں جرمنی کی طرف سے بلا اطلاع سوویت یونین پر حملہ ہوا تو مجبوراً اسے بھی جنگ میں کودنا پڑا دوسری عالمی جنگ میں ناروے، ڈنمارک، ہالینڈ، اور بلجیم غیر جانبدار تھے مگر ان کی غیر جانبداری بھی انہیں جرمنی کے حملے سے نہ بچا سکی۔

آج کی عالمی گروہی سیاست میں ریاست کا بالکل غیر جانبدار رہنا آسان نہیں بلکہ ہے اس لئے جدید دور میں ریاستوں کی غیر جانبداری کی حوصلہ افزائی نہیں کی جا سکتی۔ تاہم ایک نقطہ نظر یہ ہے کہ حالات کی سنگینی کے باوجود بھی غیر جانبداری کی افادیت اپنی جگہ برقرار ہے اور یہ نظریہ قابل عمل تصور کیا جاتا ہے۔

غیر جانبداری کی اقسام

۱ دائمی غیر جانبداری PERPETUAL NEUTRALITY

ایسی ریاستیں جنہیں کسی بین الاقوامی عہد نامہ کے تحت غیر جانبدار بنا دیا گیا ہو۔ اور ان کی غیر جانبداری کے احترام کی ضمانت متمدن ریاستوں نے دی ہو دائمی غیر جانبدار کہلاتی ہیں۔ سوئیزرلینڈ ایک غیر جانبدار ریاست ہے۔

۲ عام وجزوی غیرجانبداری GENERAL AND PARTIAL NEUTRALITY

غیرجانبداری عام اور جزوی بھی ہوسکتی ہے موخرالذکر کا مطلب یہ ہے کہ کسی علاقے کا کوئی حصہ غیرجانبدار ہو لیکن باقی نہ ہو۔ یونان کے بعض جزائر اس کی بہترین مثال ہیں اس طرح قومی ریاست کے غیرجانبدار حصے کے معاملات میں ہمیشہ غیرجانبدار فریق کی حیثیت سے اقدامات کرنے پڑتے ہیں اور اس طرح کہ پالیسیوں کے دوران اس علاقے کی مخصوص حیثیت کو بھی پیش نظر رکھنا پڑتا ہے۔

۳۔ رضاکارانہ غیرجانبداری VOLUNTARY AND CONVENTIONAL NEUTRALITY

دوران جنگ اگر مخصوص ریاست جنگ میں حصہ نہ لینے کا از خود اعلان کرے تو یہ رضاکارانہ غیرجانبداری کہلاتی ہے ریاستیں عہدناموں کے تحت بھی غیرجانبدار رہنے کی پابند ہوتی ہیں۔ اس کا تعلق رواجی غیرجانبداری سے ہوتا ہے یہ حیثیت دائمی ہوتی ہے۔

۴۔ تحدیدی غیرجانبداری QUALIFIED NEUTRALITY

ریاست مکمل طور پر غیرجانبدار رہتے ہوئے حربی ریاست کو جنگ سے قبل ہونے والے معاہدے کی روشنی میں امداد دیتی ہے اسے تحدیدی غیرجانبداری کہتے ہیں۔

۵۔ فوجی غیرجانبداری ARMED NEUTRALITY

جب کوئی ریاست جنگ سے الگ تھلگ رہنے کا اعلان کردے لیکن اس اعلان کے باوجود بھی کوئی حربی ریاست اس کی اس حیثیت کی پرواہ نہ کرے اور غیرجانبداری کی عملاً خلاف ورزی کرے تو ایسی صورت میں غیرجانبدار ریاست کو اپنی سالمیت کی حفاظت کے لئے ہتھیار اٹھانے پڑتے ہیں۔ حربی ریاست کو اس سے باز رکھتی ہے کہ وہ اس کے علاقے دوسری شریک جنگ ریاست کے خلاف استعمال نہ کرے۔

۶۔ مثبت غیر جانبداری
POSITIVE NEUTRALITY

اس میں ریاست بین الاقوامی تعاقات میں دوسری ریاستوں کے مشترکہ دفاعی معاہدوں میں شامل نہیں ہوتی۔ اور بین الاقوامی تعلقات میں توازن برقرار رکھنے والے طاقت ور ملکوں سے مساوی معاملات کرنے کی راہ اختیار کرتی ہے اس سے بہر حال ریاستوں کو فائدہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے مفادات و ضروریات کے پیش نظر پالیسیاں بدلنے میں آزاد رہتی ہیں۔

۷۔ کریم النفس غیر جانبداری
BENEVOLENT NEUTRALITY

یہ اس قسم کی غیر جانبداری ہے جس کے تحت غیر جانبدارانہ طرز عمل کی خلاف ورزی کیے بغیر کسی شریک جنگ حربی طاقت کی بالواسطہ حمایت کی جاسکتی ہے۔

غیر جانبدار ریاستوں کے حقوق و فرائض

RIGHT AND DUTIES OF NEUTRAL STATE

پروفیسر لارنس نے غیر جانبدار ریاستوں کے مندرجہ ذیل حقوق و فرائض بیان کیے ہیں۔

غیر جانبدار ریاستوں کے حقوق

۱۔ اپنے علاقوں کو مخالفانہ اقدامات سے محفوظ رکھیں۔ البتہ حربیوں کے علاقے میں دشمنی کے اقدامات جاری رکھے جاسکتے ہیں۔

۲۔ جہاں کہیں حربی اور غیر جانبدار ریاستوں کے درمیان تاروں کا سلسلہ قائم ہو تو وہاں حربی ریاست کو انہیں ضبط یا تباہ کرنے کا کوئی اختیار نہیں ہوگا سوائے اس کے کہ ایسا کرنا اس کی حفاظت کے لئے انتہائی ضروری ہو جائے۔

۳۔ براہ راست دشمنی کے اقدامات کی تیاری سے اپنے علاقے کو محفوظ رکھنے کا حق

بھی غیر جانبدار ریاست کو ہوتا ہے جنگی لوازمات کو یا اس قسم کے دوسرے اقدامات کی اجازت نہیں ہونی چاہئے۔

۴۔ ایسے قواعد بنانے کا اختیار جن کا اس کی غیر جانبداری کے پیش نظر حربیوں کو احترام کرنا پڑے۔ حربیوں کی فوجوں کو غیر جانبدار ممالک کی سرحدوں کو اس وقت تک عبور کرنے کا اختیار نہیں ہے جب تک وہ بیمار یا زخمیوں کو نہ لے جا رہے ہوں یا دشمنوں کی طرف دھکیل دیئے گئے ہوں۔

۵ غیر جانبداری کی خلاف ورزی کرنے والی حربی طاقت سے اس کا تاوان وصول کرنے کا حق بھی ریاست کو حاصل ہے۔ قانون بین الاقوام میں تاوان کا کوئی واضح طریقہ متعین نہیں کیا گیا ہے۔

غیر جانبدار ریاستوں کے فرائض

۱ غیر جانبدار ریاست کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ کسی بھی حربی ریاست کو بالواسطہ یا بلاواسطہ کسی قسم کی مدد دینے سے اجتناب برتے۔

۲ اپنے علاقے کی ان چیزوں کی حفاظت کرے کہ وہاں کسی قسم کی فوجی بھرتی نہ ہو جنگوں کی تیاری نہ ہو اور نہ ہی اس کے علاقائی پانیوں میں جنگی عزائم کی تکمیل ممکن ہونا چاہئے۔ اپنے علاقے میں وائرلیس، ٹیلی فون، اور پرائز کورٹس وغیرہ قائم کرنے کی اجازت نہیں دینا چاہئے۔

۳ غیر جانبدار ریاستوں کو حربی ریاستوں کے ایسے اقدامات کو منظور کر لینا چاہیئے جو اس کے شہریوں کے تجارت کے متعلق ہوں۔

۴ غیر جانبدار ریاست کے علاقائی پانی میں کھڑے جہاز پر اگر حملہ ہوتا ہے تو وہ مدد کے بجائے خود مقابلہ کرے تو غیر جانبدار ریاست پر جہاز کی حفاظت کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔

۵ اگر کوئی حربی ریاست اپنے دشمن کے جہاز کو غیر جانبدار پانی سے گرفتار کر لیتی

ہے تو ایسی صورت میں غیر جانبدار ریاست کا فرض ہے کہ وہ حربی ریاست کے جہاز کو اور اس کے عملے کو رہا کرائے۔

۵۔ قانون بین الاقوام

تعریف

وہ قواعد اور ضوابط جو عالمی ریاستوں کے درمیان پرامن تعلقات کے لئے ضروری ہیں انہی قواعد و ضوابط کو قانونِ بین الاقوام کہا جاتا ہے یہ بین الاقوامی قانون کی عام تعریف ہے اس کی تعریف مختلف مفکرین نے مختلف انداز میں کی ہے۔

۱ اوپن ھائیم :۔

"انٹرنیشنل لا ان رسمی اور رواجی قواعد کے مجموعے کا نام ہے۔ جن کو متمدن مملکتیں اپنے باہمی تعلقات میں اپنے اوپر قانوناً قابل پابندی تصور کرتی ہیں"

۲ پروفیسر براشرلی :۔

"قانون بین الاقوام ان اصولوں اور قواعد کا مجموعہ ہے جو متمدن مملکتوں کے مابین ان کے باہمی تعلقات میں قابل پابندی سمجھتے ہیں۔

۳ چارلس فنی ویک

یہ عام اصولوں اور مخصوص قواعد کا مجموعہ ہے جو عالمی برادری کے ارکین اپنے باہمی تعلقات میں اپنے اوپر پابند تسلیم کرتے ہیں۔

۴ فلپ جوزف :۔

"قانون بین الاقوام ریاستوں کے سماجی تعاون پر مبنی ہے۔

۵ ایس ایس لوٹس کے مقدمہ میں (مستقل عدالت بین الاقوامی انصاف) یہ تعریف بیان کی گئی۔

"ایسے اصول جو آزاد قوموں کے مابین نافذ ہوں"

ان تعریفوں کے تجزیہ سے پتہ چلتا ہے کہ قانون بین الاقوام ان اصولوں کے مجموعے

کا نام ہے جو مقتدر، متمدن اور امن پسند مملکتوں کے آپس کے تعلقات کو ظاہر کرے۔"

ان کو مقتدر ریاستیں اخلاقی طور پر تسلیم کرتی ہیں لیکن عملاً تسلیم کرنا ضروری نہیں

بینتھم نے سب سے پہلے قانون بین الاقوام کی اصطلاح استعمال کی۔ اس کے برخلاف بعض مفکرین نے قانون بین الممالک کی اصطلاح بھی استعمال کی ہے ان کا خیال ہے کہ عالمی معاشرہ قدامت پسند ہے وہاں فرد کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی بلکہ مملکتیں ہی موضوع بحث ہوتی ہیں جبکہ قومی قوانین کا موضوع (SUBJECT) افراد ہوتے ہیں تو ظاہر ہے کہ عالمی قوانین کا موضوع ممالک ہی ہوں گے۔

"کیا قانون بین الاقوام حقیقتاً کوئی قانون ہے"

یہ بحث جان آسٹن کے زمانے میں خاص طور پر زور پکڑ گئی۔ آسٹن کے نزدیک قانون صرف وہی ہے جس کو مملکت کی قوت حاصل ہو اگر اس اصول کو معیار بنا لیا جائے تو ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گے کہ قانون بین الاقوام کوئی قانون نہیں ہے یہ قانون ویسے بھی مملکتوں سے بالاتر نہیں ہے بلکہ مملکتوں کے مابین ایک ضابطہ ہے اور نیز اس کے پاس یا اس پر کوئی قوت نافذہ نہیں ہے آسٹن بین الاقوامی ضابطوں کو "مثبت بین الاقوامی اخلاقیات" کے نام سے یاد کرتا ہے۔ جن پر قومیں عمل کرتی ہیں۔

اسٹارک آسٹن کے اس معیار کو تسلیم نہ کرتے ہوئے اس پر تنقید کرتا ہے کہ جدید تاریخی اصول قانون کی رو سے آسٹن کا عام نظریہ قانون بالکل کھوکھلا ہو جاتا ہے دنیا میں بنی نوع انسان کے بے شمار قبائل اور طبقات ایسے ہیں جن میں کوئی قانون ساز مقتدر نہیں تھا مگر وہاں ایک قانون ضرور نافذ تھا۔ اگرچہ اس وقت عالمی میدان میں کوئی معین مقتدر قانون ساز طاقت نہیں ہے تاہم اس قانون کی تدوین اور تشکیل میں کم و بیش اسی فنی مہارت سے کام لیا جاتا ہے جو مملکتی قانون سازی کا خاصہ ہیں نیز آج مملکتوں کی وزارت امور خارجہ اور بین الاقوامی عاملہ کو جو مسائل درپیش ہیں انہیں ملکی مسائل کی طرز پر ہی طے کیا جا رہا ہے۔ اس سے قانون بین الاقوام میں مثبت کی

شان پیدا ہوتی ہے۔ یوں لگ رہا ہے کہ اگر مملکتوں کا قومی مفاد مجروح نہ ہو رہا ہو تو قانون بین الاقوام بالاتر چیز ہے ورنہ قومی مفاد بالاتر ہے لہٰذا مملکتوں کا مفاد بین الاقوامی مفاد سے بالاتر چیز ثابت ہوا اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ بین الاقوامی سطح پر ہمیں کوئی مقتدر ادارہ نظر نہیں آتا جس کی وجہ سے ریاستوں کی حیثیت مقتدر ہو جاتی ہے ظاہر ہے کہ ویسے بھی دو چیزیں مقتدر نہیں ہو سکتیں۔

• قانون بین الاقوام اور • مملکت

کسی ایک ہی کو مقتدر ہونا ہے آج اگر ساری ریاستیں امن کی علمبردار ہو جائیں تو انہیں اپنے دستور میں صرف ایک جملے کا اضافہ کرنا ہوگا۔ وہ جملہ یہ ہے۔

"ہم انصاف کے لئے عالمی کورٹ سے رابطہ قائم کریں گے"

اگر ہم قانون بین الاقوام بنانے والے اداروں کا جائزہ لیں تو ہمیں موجودہ صدی میں مجلس اقوام ۱۹۱۹ء اور پھر اقوام متحدہ ۱۹۴۵ء نظر آتی ہے۔ اقوام متحدہ کے بارے میں خیال تھا کہ اس کو مقتدر حیثیت حاصل ہو جائیگی جو ممکن ہوتی ہوئی نظر نہیں آ رہی اور پھر جب ہم یہ کہتے ہیں کہ قانون کی نظر میں مملکتیں مساوی حیثیت رکھتی ہیں تو پھر یہ ویٹو پاور VETO POWER کیسی۔ اگر اقوام متحدہ کو تھوڑی دیر کے لیے بین الاقوامی مملکت تسلیم کر لیا جائے تو ہمیں اس میں مقننہ (جنرل اسمبلی) انتظامیہ (سلامتی کونسل عدلیہ (بین الاقوامی عدالت انصاف) تو نظر آتی ہے مگر انتظامیہ کے تحت کوئی پولیس فورس نظر نہیں آتی جو بین الاقوامی ضابطوں کو عملی جامہ پہنائے

آسٹن کا نظریہ اقتدار اعلیٰ آج کافی فرسودہ ہو چکا ہے اس پر کافی کاری ضربیں لگائی گئی ہیں کیونکہ آج دنیا میں کوئی بھی مملکت مکمل طور پر مقتدر یا مطلق العنان نہیں رہی جیسے فرانسیسی بادشاہ لوئی چہاردہم یا رنجیت سنگھ کے زمانے میں یہ کہنا درست معلوم ہوتا تھا کہ میں ریاست ہوں۔ I AM THE STATE

اب دنیا کا کوئی حکمران یہ دعویٰ نہیں کر سکتا۔

بنتھم لارنس کا خیال ہے

"قانون بین الاقوام وہ قانون ہے جو ریاست کے باہمی تعلقات کے قواعد پر مشتمل ہے۔ یہ نہ تو ریاستوں سے برتر ہے اور نہ ہی اس سے سیاسی اقتدار اعلیٰ میں کوئی فرق پڑتا ہے گروشش اور روسو وغیرہ جنہیں ہم فطرت پسند مفکرین کہتے ہیں یہ سب اسے قانون کا درجہ دیتے ہیں جبکہ اثباتیات POSITIVES کے تصور کو ماننے والے قانون فطرت سے انکار تو نہیں کرتے لیکن ان کا کہنا یہ ہے کہ جب تک کسی ضابطے کو باقاعدہ تحریری طور پر مقننہ پاس نہ کرے تو وہ قانون نہیں ہوتا۔ اور تحریری پاس کردہ قانون ہی مملکت سے بالاتر ہوتا ہے۔

اگر قدیم تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو بھی نوع انسان کے بے شمار قبائل ایسے ہیں جن میں کوئی قانون ساز ادارہ موجود نہ تھا مگر وہاں ایک قانونی نظام ضرور نافذ تھا آسٹن کے دور کے بعد کئی بین الاقوامی قوانین واضح ہو چکے ہیں جس کے زور سے رواجی قانون کا عنصر بہت گھٹ گیا ہے۔ اگرچہ بین الاقوامی سطح پر کوئی معین قانون ساز قوت موجود نہیں ہے لیکن اس قانون کی تدوین و تشکیل میں کم و بیش اس فنی مہارت سے کام لیا جاتا ہے جو بلدیاتی قانون سازی میں رائج ہیں۔ آج کل مختلف ریاستوں کے محکمہ امور خارجہ اور بین الاقوامی عدالت کے سامنے جو مسائل آتے ہیں ان کو بالکل بلدیاتی قوانین کی طرح طے کیا جاتا ہے جس سے یہ قانون مثبت راہ پر چل رہا ہے۔

اس کے علاوہ آج کی کئی مہذب ریاستوں نے قانون بین الاقوام کے اصولوں کو اپنے دساتیر میں شامل کر لیا ہے بین الاقوامی کانفرنسیں اور اجلاس اسے تسلیم کرتے ہیں ریاستوں کے حقوق و فرائض کا اس سے تعین ہوتا ہے اور اس سے لاکھوں پیچیدہ مسائل کے حل میں مدد ملتی ہے اس میں بھی شک نہیں کہ آج کل عالمی طاقتوں کی بے جا دخل اندازی اور مفادات نے عالمی سطح پر امن و امان بحال کرنے اور کئی تنازعات کا تصفیہ کرانے میں اقوام متحدہ کی کارکردگی پر اثر ڈالا ہے جس سے بہت سارے مسائل حل ہونے سے رہ گئے ہیں۔ مثلاً مسئلہ کشمیر مسئلہ فلسطین، جنوبی افریقہ کا مسئلہ، مسئلہ افغانستان وغیرہ اقوام متحدہ کے منشور کے مطابق

اگر مہذب ریاستوں کا تعاون حاصل ہوتا تو بہت جلد یہ مسائل حل ہو جاتے۔ اسی طرح بین الاقوامی عدالت انصاف کے دائرہ سماعت اور فیصلوں پر عمل درآمد کرانے کی قوت کا تعین بھی قانون بین الاقوام کی ترقی میں مددگار ثابت ہو سکتا ہے آج کے عالمی مسائل میں سیاسی معاشی، معاشرتی اور سائنسی اتحاد ہی تمام ریاستوں کی ترقی اور امن میں اہم کردار ادا کر سکتا ہے اس لئے قانون بین الاقوام کے قواعد و عمل کی اہمیت آج بھی پہلے کے مقابلے میں کئی گنا بڑھ گئی ہے۔

بین الاقوامی مفکرین کا یہ کہنا غلط ہے کہ قانون بین الاقوام کوئی قانون نہیں ہے

۱۔ کیونکہ بہت سارے بلدیاتی قوانین کی بھی خلاف ورزی ہوتی ہے۔

۲۔ قانون بین الاقوام کو بھی ریاستیں مل کر بناتی ہیں اور اسے تحریری شکل دینے کی کوششیں بھی کی گئی ہیں اور کی جا رہی ہیں اقوام متحدہ اس کو نافذ کرتی ہے اور بین الاقوامی عدالت انصاف اس کے مطابق ہی اپنے فیصلے صادر کرتی ہے۔

قانونِ بین الاقوام کے ماخذ

SOURCES OF
I... ...IONAL LAW

مفہومِ بین الاقوام کے ماخذ کو ہم دو اقسام میں تقسیم کر سکتے ہیں۔
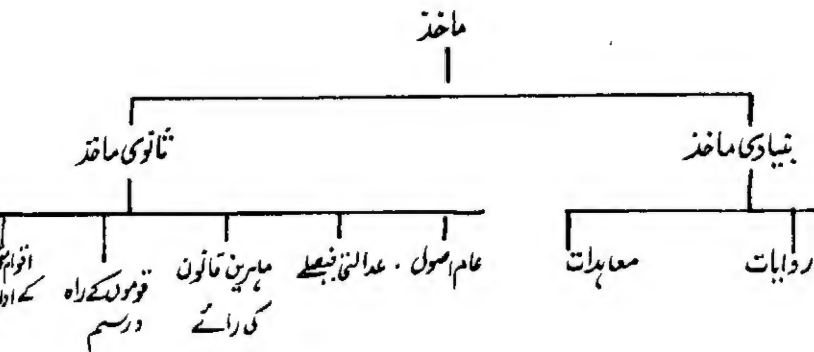
۱۔ روایات

تمام روایات جو ریاستوں کے درمیان موجود ہوں قانون بین الاقوام کا ماخذ

نہیں سمجھی جائیں صرف وہی روایات جن کے بارے میں یہ ثبوت مل جائے کہ انہیں ریاستیں عادتاً قبول کرتی ہیں قانون بین الاقوام کی ماخذ ہوتی ہیں۔

عام طور طالب علم ریت اور روایت

میں فرق نہیں کرتے اور دونوں ہی کو قانون بین الاقوام کا ماخذ قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ دونوں میں فرق پایا جاتا ہے روایت ریاستوں کا ایک مخصوص رویہ ہے جسے ریاستیں ایک مسلسل عادت کی حیثیت سے قبول کر لیتی ہیں یہ طرز عمل عالمی برادری میں تسلیم کیا جاتا ہے جبکہ ریت کا مطلب وہ طریقہ عمل ہے جسے ریاستیں عارضی طور پر اختیار کرتی ہیں۔ انہیں یہ پتہ نہیں ہوتا کہ بعد میں یہ استعمال یا ریت رسم و رواج یا روایت کا روپ دھارے گی یا نہیں اس طرح ریت روایت کی پہلی سیڑھی ہے جو صحیح بھی ہو سکتی ہے اور غلط بھی۔ اس لئے ہم ریت کو قانون بین الاقوام کا ماخذ قرار نہیں دے سکتے۔ جبکہ روایات کو قانون بین الاقوام کا ماخذ قرار دیتے ہیں۔

روایتی قانون بین الاقوام CUSTOMARY INTERNATIONAL LAW

قانون بین الاقوام کا بیشتر حصہ روایات پر مشتمل ہوتا ہے جسے ہم روایتی قانون بین الاقوام کہتے ہیں۔

معاہداتی قانون بین الاقوام CONVENTIONAL INTERNATIONAL LAW

قانون کا وہ حصہ جو معاہدات اور دیگر مآخذ پر مشتمل ہوتا ہے اسے معاہداتی قانون بین الاقوام کہا جاتا ہے۔

روایتی قانون بین الاقوام کے نقائص :۔

اس میں مندرجہ ذیل دو نقائص پائے جاتے ہیں۔

ہمارے پاس ایسا کوئی پیمانہ نہیں ہے جس سے یہ ناپا جاسکے کہ ریاستیں یہ عادت مسلسل اپنائے رکھیں گی۔ جب تک کوئی عادت باقاعدہ روایت نہیں بن جاتی اس وقت تک وہ قانون کا ماخذ قرار نہیں پاتی اس لئے اس میں غیر یقینی کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ روائتی قانون کی دوسری خامی یہ ہے کہ ریاستوں کی بدلتی ہوئی صورت حال کے مطابق اسے

ڈھالا نہیں جا سکتا۔ کیونکہ روایات کو تبدیل کرنا بہت مشکل ہوتا ہے اس وجہ سے ریاستوں کو قانونِ بین الاقوام کے سلسلے میں دوسرے ماخذوں پر انحصار کرنا پڑتا ہے مثلاً ماہرین قانون کی رائے۔ عام اصول، عدالتی فیصلے اور کسی ریاست کے سربراہ کا اقدام وغیرہ۔

۲۔ معاہدات TREATIES

معاہدات قانونِ بین الاقوام کا سب سے اہم ماخذ ہیں کیونکہ عالمی سطح پر کوئی ایسی قوت موجود نہیں ہے جو قوانین بنائے اور ان پر عملدرآمد کرائے۔ اس لئے جب ریاستیں باہمی مفاد کی خاطر آپس میں کوئی معاہدہ کرتی ہیں تو اس معاہدے کے لیے چند اصول و ضوابط وضع کیے جاتے ہیں۔ جن پر فریقین رضامندی ظاہر کرتے ہیں۔ یہ اصول و ضوابط آہستہ آہستہ قانونِ بین الاقوام کے ماخذ کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔

یہ یاد رکھنے کی بات ہے کہ اتفاقیہ قسم کے معاہدات کو ہم قانونِ بین الاقوام کا ماخذ قرار نہیں دے سکتے۔ کیونکہ یہ معاہدے مخصوص حالات کے تحت وجود میں آتے ہیں اور ان میں دو اصول پائے جاتے ہیں

۱ ریاستوں کے درمیان مستقبل کے تعلقات کے اصول

۲ سابقہ رواجی حیثیت کو ختم کرنے والے اصول

ان معاہدات کو قانون ساز معاہدے LAW-MAKING TREATIES کہا جاتا ہے۔

اقوام متحدہ کا منشور

ہم اقوام متحدہ کے منشور کو قانون ساز معاہدے کے زمرے میں شامل کر سکتے ہیں کیونکہ اس کے تحت ریاستوں کو مستقبل میں امن مہیا کیا گیا ہے یہ دستور یا منشور تحریری شکل میں موجود ہے اور ریاستوں کی طرف سے منظور بھی کیا گیا ہے اور اس میں سابقہ رواجی حیثیت کو بھی ختم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ریاستیں اپنی رضامندی کا اظہار دو طریقوں سے کرتی ہیں۔

۱ اعلانیہ رضامندی :- باقاعدہ دستخط کر کے ریاستیں اعلانیہ رضامندی کا اظہار کرتی ہیں۔

۲ غیر اعلانیہ رضامندی :- اس میں ریاستیں بالواسطہ طور پر اپنے رویہ یا کردار کا اظہار کرتی ہیں۔

سوویت یونین کا قانون بھی اس بات پر متفق ہے کہ معاہدات کے مقابلے میں رسم و رواج قانون بین الاقوام کا ایک بدتر ماخذ ہے۔

۱۹۲۰ء کے بعد معاہدات کو عالمگیر حیثیت حاصل ہو گئی ہے ان معاہدات میں اضافہ انیسویں صدی میں ویانا کانفرنس ۱۸۱۵ء سے ہوا۔ اس کانفرنس کے تحت عالمی دریاؤں جہازرانی، سفارتی نمائندے کے حقوق و فرائض وغیرہ طے کیے گئے۔ ہیگ کانفرنسوں ۱۸۹۹ء-۱۹۰۷ء کے نتیجے میں مستقل عدالت برائے ثالثی کا قیام معاہدہ ورسیلز کے تحت مجلس اقوام ۱۹۱۹ء (اجماعی امن و تحفظ) اور اقوام متحدہ نے ۲۱ نومبر ۱۹۴۷ء کو ماہرین قوانین کا ایک کمیشن برائے قانون بین الاقوام مقرر کیا جو ۲۱ اراکین پر مشتمل تھا۔ اس کا کام ریاستوں کے حقوق و فرائض، برامن بقائے باہمی معاہدات کی پابندی سمندروں پر حکومت، قانونی معاہدات، بین الاقوامی حدود، جرائم ریاستی ذمہ داریاں اور سفارتی معاہدات وغیرہ تھے۔

۳- قانونِ بین الاقوام کے عام اصول GENERAL PRINCIPLES OF INTERNATIONAL LAW

یہ ماخذ بین الاقوامی عدالت انصاف کے تحت واضح کیا گیا ہے یہ قانون کے وہ اصول ہیں جنہیں متمدن ریاستیں اپناتی ہیں۔

عام طور پر ریاستیں اپنے تعلقات بہتر بنانے کے لیے روایتی قانون بین الاقوام یا معاہداتی قانون بین الاقوام سے مدد لیتی ہیں لیکن بعض اوقات ایسی صورت حال پیدا ہو جاتی ہے کہ روایتی اور معاہداتی قانونِ بین الاقوام موجود نہیں ہوتا لہٰذا ایسی صورت میں ریاستوں کے سامنے کچھ اختیاری صورتیں ہوتی ہیں اور ریاستیں نئے اصول قائم کر سکتی

ہیں اور انہیں عادت کے طور پر اپنا تی ہیں۔

اس طرح عام اصول و ضابطے ہیں جو اس خلا GAP کو پورا کرتے ہیں۔

عام اصولوں کی وضاحت

نہ صرف آج کل بین الاقوامی عدالت انصاف کرتی ہے بلکہ اس سے قبل مستقل بین الاقوامی عدالت انصاف کے منشور میں بھی یہ شق موجود تھی کہ جب عدالت کے پاس روایات یا معاہدات کی مثالیں نہ ہو تو وہ ان خاص اصولوں کو اپنا سکتی ہیں جن کو متمدن ریاستیں قبول کرتی ہیں

یہ عام اصول کیا ہیں ؟ یہ وہ اصول ہیں جن کی بنیاد انصاف، مساوات، اور عقل پر ہوتی ہے۔ اس لئے انہیں تمام ریاستیں قبول کر لیتی ہیں۔

مستقل عدالت نے قانون کے ان اصولوں کو ۱۹۲۸ء میں چورزو فیکٹری کے مقدمے CHORZOW FACTORY CASE 1928 میں استعمال کیا

اس مقدمے میں کہا گیا ہے کہ کسی معاہدے کی خلاف ورزی کی صورت میں وہ ریاست جو معاہدہ کرتی ہے اس پر نقصان کی ذمہ داری آتی ہے۔

بین الاقوامی عدالت انصاف نے ۱۹۶۸ء میں رام کچھ مصالحتی مقدمہ RAM KATCH ARBITRATION CASE 1968 میں استعمال کیا۔ اس کیس میں یہ اصول اپنایا گیا کہ ہر متعلقہ پارٹی صرف انصاف اور مساوات کے اصول پیش کرے گی

کوئی بھی متمدن ریاست اس کی مخالفت اسلئے نہیں کر سکتی کہ عام اصول بھی وہ قواعد ہیں جو ریاستوں کے اپنے قانونی نظام سے اخذ کئے جاتے ہیں بہر حال یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ریاستوں کا ان اصولوں پر متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

۴۔ عدالتی فیصلے JUDICIAL DECISIONS

عدالتی فیصلوں کو بین الاقوامی عدالت انصاف کے منشور کی دفعہ ۵۹ میں عام

ماخذ کی حیثیت دی گئی ہے ۔ یہ فیصلے تمام ریاستوں کو پابند نہیں کرتے صرف متعلقہ ریاستوں کو اور وہ بھی مخصوص باتوں پر پابند کرتے ہیں اس لئے ہم اسے قانون بین الاقوامی کا ثانوی ماخذ قرار دیتے ہیں۔ بہر حال ان فیصلوں کی اہمیت کو ہم نظر انداز نہیں کر سکتے ۔ کیونکہ بڑے بڑے تجربے کار جسٹس وسیع معلومات اور حالات کو سامنے رکھ کر فیصلہ کرتے ہیں اس لئے اگر کبھی ایسی صورت حال پیش آئے جب روایات اور معاہدات اور عام اصول سامنے نہ ہوں تو عدالتی فیصلوں سے مدد لی جا سکتی ہے ۔

نظیر PRECEDENCE

جب عدالتیں ریاستوں کے درمیان فیصلے دیتی ہیں تو مختلف مثالیں قائم ہو جاتی ہیں آئندہ ایسی صورت حال میں پہلی مثال سے مدد لی جا سکتی ہے لیکن یہ فیصلے کسی مخصوص مقدمہ میں آپس میں مطابقت رکھتے ہوں ورنہ رواجی قاعدہ ظاہر نہیں ہو سکتا جیسے لوٹس کے مقدمہ ۱۹۲۹ء میں مستقل بین الاقوامی عدالت انصاف نے رواجی قواعد کو ماننے سے اس لئے انکار کر دیا تھا کہ ریاستی عدالتوں کے فیصلے ایک ہی نظیر پر متضاد تھے ۔

۵۔ ماہرین قانون کی رائے JURISTS DECISIONS

قانون بین الاقوام میں ماہرین قانون یا محققین کی رائے بھی ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے کیونکہ بعض اوقات ایسی صورت حال سامنے آتی ہے کہ جب روایات یا معاہدات سے استفادہ حاصل نہیں کیا جا سکتا تو ایسی صورت میں ماہرین قانون کی رائے ماخذ کا کام دیتی ہے امریکن سپریم کورٹ کے جسٹس گرے جے JUSTICE GRAY-J کا خیال ہے ۔

" ان بڑے قانون دانوں کی تحقیق کو ایسی غیر جانبدار تخلیق کہہ سکتے ہیں جس پر ہم انحصار کر سکتے ہیں جو یہ بتائیں گے کہ قانون کیا ہے کیونکہ بکھرے ہوتے قانون کو جمع کرنا مشکل ہے

اور اگر قانون کے اصولوں کو ایک جگہ جمع کر دیا جائے تو اس کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔"
یہاں اس نکتہ کی وضاحت ضروری سمجھ رہا ہوں کہ ان محققین کی رائے بغیر ... آ
ہوتی ہے جن سے مدد لی جاتی ہے۔
ریاستوں کے لئے یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ ان کی رائے کو ضرور مانیں اس لئے اسے
قانون بین الاقوام کا ثانوی ماخذ کہا جاتا ہے۔ ہیوگو گروٹیش HUGO GROTIUS
ایسے ماہرین قانون ہیں جنہیں قانون بین الاقوام کا باوا FATHER کہا جاتا ہے۔

۶۔ بین الاقوامی دوستانہ مراسم INTERNATIONAL COMITY

ریاستیں آپس میں بہتر تعلقات قائم کرنے کے لئے بعض اوقات اخلاقی قدروں یا
راہ و رسم کو اپناتی ہیں انہیں بھی قانون بین الاقوام کا ماخذ سمجھا جاتا ہے ماہرین قانون
ان اخلاقی قدروں کو ماخذ کے اعتبار سے ثانوی حیثیت دیتے ہیں کیونکہ انکی حیثیت اخلاقی
ہے لیکن بعض اوقات جب انہی رسموں کی بدولت تعلقات اچھے کرنے میں مدد ملتی ہے تو یہ
قانون بین الاقوام کا ماخذ قرار پاتی ہیں

۷۔ اقوام متحدہ کے ادارے ORGANS OF U.N.O

اقوام متحدہ کے دو ادارے یا اعضاء سلامتی کونسل اور جنرل اسمبلی کی تجاویز بھی
قانون بین الاقوام کا ماخذ قرار دی جا سکتی ہے۔ اقوام متحدہ وہ ادارہ ہے جو قانونِ
بین الاقوام کو نافذ کرتا ہے اور عدالت انصاف سے فیصلہ لیتا ہے اقوام متحدہ کا کام امن کو استحکام
دینا اور جنگ کو روکنا ہے۔
اقوام متحدہ کے بنیادی مقاصد میں یہ بات شامل ہے کہ قانون بین الاقوام کی تدوین
اور ترقی میں مدد دے۔ اگر سلامتی کونسل یا جنرل اسمبلی کوئی اصول بنائے اور ریاستیں اسے
مان لیں تو اسے "امن کا اصول" کہا جائے گا۔ اور یہ قانونِ بین الاقوام کا ماخذ ہو گا۔

باب پنجم

جنگِ عظیم اوّل

THE FIRST GREAT WAR

پس منظر

جنگ کے فریقین

جنگ کے محرکات

جنگ کے نتائج

معاہدات امن

جنگ عظیم اوّل

THE FIRST GREAT WAR

پس منظر:

سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں براعظم یورپ کی حیثیت دیگر براعظموں مثلاً ایشیاء افریقہ آسٹریلیا، شمالی امریکہ اور جنوبی امریکہ سے اہم اور بلند تر تھی یورپ ہی کو دنیا سمجھا جاتا تھا۔ فرانس یورپ کی مضبوط ترین طاقت تھی۔ فرانس پروشین جنگ اے۱۸۷۰ء میں پہلی دفعہ فرانس کو جرمنی کے ہاتھوں شکست کا سامنا کرنا پڑا۔

فرانس کو شکست دینے کے بعد جرمنی کا چانسلر بسمارک یورپی سیاست کا باوا آدم بن گیا۔ بسمارک نے فرانس کی طرف سے ممکنہ حملہ کی صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے ۱۸۷۳ء میں تین بادشاہوں کی لیگ THREE EMPEROR'S LEAGUE (جرمنی روس اور آسٹریا) قائم کی۔

بلقان اور بلغاریہ کے مسئلے پر ۱۸۸۶ء میں لیگ ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئی۔

لیگ کے خاتمے کے بعد یہ اندیشہ تھا کہ روس فرانس کے ساتھ مل جائے گا چنانچہ بسمارک نے اپنی سیاسی حکمت عملی کو بروئے کار لاتے ہوئے جون ۱۸۸۷ء میں روس کے ساتھ ایک مصالحتی معاہدہ REINSURANCE TREATY کیا۔

اس معاہدے کی وجہ سے ایک طرف روس اور آسٹریا کے مابین جنگ کا خطرہ ٹل گیا اور دوسری طرف روس اور فرانس کے اتحاد کا معاملہ ختم ہوگیا۔ روس اور جرمنی کی دوستی برقرار رہنے کے لئے ضروری تھا کہ جرمنی آسٹریا اور روس کے معاملات میں غیر جانبدار رہے لیکن جرمنی عملاً ایسا کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ مصالحتی معاہدے کے فوراً بعد ہی بسمارک نے روس کے خلاف بحرہ روم میں اپنی فوجوں کو متحرک کر دیا تھا یہ معاہدہ روس کے خلاف ایک چال تھی۔ بعد ازاں روس کے نہ چاہتے ہوئے بھی جرمنی کا چانسلر بسمارک اور آسٹریا کے وزیر خارجہ اندراسی نے گیسٹین GASTEIN کے مقام پر ایک ملاقات کی اور ایک معاہدہ کی راہ ہموار کی۔ واضح کرتا چلوں کہ اس

معاہدے کا مقصد روس پر حملہ کرنا نہیں تھا بلکہ اس کا مقصد یہ تھا کہ اگر آسٹریا پر حملہ ہوا تو جرمنی اپنے ذاتی مفادات کی خاطر آسٹریا کی مدد کرے گا۔ اکتوبر ۱۸۷۹ء میں دیانا میں آسٹریا اور جرمنی کے مابین معاہدہ THE AUSTRO-GERMAN ALLIANCE ہوا۔ اس معاہدے پر اٹلی مطمئن تھا اور فرانس اسے "امن کا مظہر" سمجھتا تھا۔ پروفیسر فِنّے نے اس معاہدہ پر یوں تبصرہ کیا۔ "آسٹریا اور جرمنی کے اس معاہدہ نے وسطی سلطنتوں کو منجمد کر کے رکھ دیا تھا۔"

اتحاد ثلاثہ:

جرمنی اور آسٹریا کے اتحاد میں ۱۸۸۲ء میں اٹلی کے شامل ہونے سے اتحاد ثلاثہ THE TRIPLE ALLIANCE کا قیام عمل میں آیا۔ اس معاہدے کی اہم دفعات حسب ذیل تھیں۔

- جرمنی اور آسٹریا اس امر کے پابند تھے کہ اٹلی پر فرانسیسی حملے کی صورت میں دونوں ممالک پوری قوت سے اٹلی کی مدد کریں گے۔
- جرمنی اور اٹلی متذکرہ صورت میں ایک دوسرے کی مدد کے پابند تھے۔
- جرمنی اور آسٹریا پر روسی جارحیت کی صورت میں اٹلی ان کی امداد کرنے کا پابند تھا بصورت دیگر اگر کوئی دوسرا ملک ان پر حملہ کرتا تو اٹلی غیر جانبدار رہتا اور اگر ان پر دو یا دو سے زائد ممالک حملہ آور ہوتے تو اٹلی کے لئے امداد پہنچانا ضروری تھا۔
- اس معاہدہ کے مبادیات کو خفیہ رکھا گیا۔

اٹلی کی خواہش تھی کہ اتحاد ثلاثہ میں برطانیہ کو بھی شامل کیا جائے۔ آسٹریا بھی اس تجویز کا حامی تھا۔ لیکن بسمارک کی مخالفت کی وجہ سے اٹلی کی خواہش کی تکمیل نہ ہو سکی اس معاہدے کی بدولت اٹلی کو بڑی طاقت سمجھا جانے لگا۔ حالانکہ برلن کانگریس ۱۸۷۸ء میں اٹلی کو کوئی اہمیت حاصل نہ تھی۔ اٹلی کو فرانس کی طرف سے حملے کا خطرہ ٹل گیا بلکہ اُسے فرانس کو منہ توڑ جواب دینے کے لیے طاقتور حلیف مل گئے۔ آسٹریا کی بھی دفاعی پوزیشن کافی مستحکم ہو گئی تھی۔ اٹلی کو اس معاہدے سے صرف یہ نقصان اٹھانا پڑا کہ بلقان کے بارے میں اس کی خواہشات محدود ہو کر رہ گئیں۔ پروفیسر ٹیلر لکھتا ہے

"یہ اتحاد اپنی نوعیت کے اعتبار سے شاندار اور وسیع تھا۔ اس کے بنیادی مقاصد معتدل تھے۔ اس معاہدے نے وسطی یورپ کو متحد کر دیا۔ اور روم کی مقدس سلطنت کو دوبارہ زندہ کر دیا۔ ۱۸۸۷ء میں اس معاہدے کی تجدید کے وقت اٹلی کو کچھ مزید مراعات دی گئیں۔ اٹلی ان مراعات کے باوجود اتحاد ثلاثہ سے مطمئن نہ تھا اور اسے چھوڑنا چاہتا تھا۔ یہ وقت تو ۱۹۱۵ء میں آیا۔ لیکن اتحاد ثلاثہ اور اٹلی کے باہمی طرز عمل میں خاصی سرد مہری رہی۔ اس کی ایک وجہ بسمارک کا طرز عمل بھی تھا۔ بسمارک نے اٹلی کے کردار پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا" حریص اٹلی چھپی ہوئی نظروں سے اپنی نفسیاتی تحریک کی تکمیل کے لئے ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ اس کی یہ حرص بد دیانتی کی پیدا کردہ ہے وہ ہمیشہ پشت کی جانب سے حملہ کرنے کو تیار رہتا ہے اور ہمیشہ خیانت کا مرتکب ہوتا ہے" ۱۸۹۰ء میں جرمن شہنشاہ ولیم ثانی نے چانسلر بسمارک کو برطرف کر دیا۔

۱۸۸۷ء میں برطانیہ اور اٹلی کے مابین ایک معاہدہ پر دستخط ہوئے جس کی رو سے دونوں ممالک بحیرہ اسود BLACK SEA اور بحیرہ روم میں موجودہ صورتحال برقرار رکھنے پر رضامند ہو گئے دونوں ممالک نے طے کیا کہ اگر بحیرہ روم میں ان میں سے کسی ایک ملک نے جنگ میں شرکت کی تو دوسرا ملک اس کا ساتھ دے گا۔ اٹلی نے مصر میں اور برطانیہ نے شمالی افریقہ خصوصاً طرابلس میں ایک دوسرے کی پالیسی کی حمایت کرنے کا فیصلہ کیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دونوں ممالک کے تعلقات بہت اچھے ہو گئے۔ یہاں تک کہ ۱۹۰۶ء کی الجیسیرس کانفرنس AL-GECIRAS CONFERENCE میں اٹلی نے جرمنی کے خلاف برطانیہ کی حمایت میں ووٹ دیا۔

اسی زمانے میں جرمنی کی بحری طاقت میں روز افزوں اضافہ ہو رہا تھا۔ ان حالات میں برطانیہ کو اپنی حیثیت برقرار رکھنے کے لئے اپنی پالیسی کا جھکاؤ فرانس کی طرف کرنا پڑا۔

ائتلاف ثلاثہ :

۱۹۰۴ء میں روس اور جاپان کے مابین منچوریا کے مسئلے پر جنگ ہوئی اس جنگ میں جاپان نے روس کو شکست دی تو روسی پالیسی کا جھکاؤ برطانیہ کی طرف ہو گیا۔ ایشیائے عامہ کی تمام مخالفتوں کے باوجود اگست ۱۹۰۷ء میں روس اور برطانیہ کا معاہدہ

چانسلر بسمارک اور نپولین سوئم

۱۹۰۷ء THE ANGLO-RUSSIAN ENTETE ہو گیا۔ یہ معاہدہ دونوں قوموں کے درمیان کسی پُرخلوص ہمدردی پر مبنی نہ تھا۔ کیونکہ انگریز مدت سے روسیوں کے مخالف چلے آ رہے تھے اور یہ مدت ایک صدی سے بھی زائد ہو چکی تھی۔ تاہم اتحاد ثلاثہ کے خلاف ائتلاف ثلاثہ TRIPLE ENTETE کا انتظام ہو گیا۔

بحران کا دور ۱۹۰۵-۱۴ء

۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۴ء کے درمیانی عرصے میں اتحاد ثلاثہ (جرمنی، آسٹریا اور اٹلی) اور ائتلاف ثلاثہ (برطانیہ روس اور فرانس) کے مابین سخت کشمکش رہی۔ جرمنی جانتا تھا کہ ائتلاف ثلاثہ، اتحاد ثلاثہ کے مقابلے میں سیاسی اور اقتصادی لحاظ سے مضبوط ہے آسٹریا اور اٹلی ایک دوسرے سے مشکوک تھے۔ اٹلی اطالوی زبان بولنے والے علاقے کو آسٹریا کے قبضے سے آزاد کروانا چاہتا تھا۔ علاوہ ازیں آسٹریا داخلی گڑبڑ اور بلقان کے جھگڑے میں بھی ملوث تھا۔ دوسری طرف اتحادیوں کے باہمی معاملات طے پا چکے تھے۔ یورپ دو مسلح کیمپوں میں تقسیم ہو چکا تھا۔ اسلحہ سازی اور فوجی قوت کی دوڑ اتنی تیز ہو چکی تھی کہ مستقبل میں امن کی فضا برقرار رکھنا ناممکن تھا۔ بقول گرانٹ اور ٹمپرے "بین الاقوامی پابندیوں اور توازن کے اس شاندار انتظام نے ایک طویل عرصے تک قوموں کے درمیان امن قائم رکھا لیکن محض اپنے موجود ہونے کے باعث آخرکار جنگ و جدل کا سبب بن گیا۔ کیونکہ یہ نظام آفاقی اخوت کے بجائے ایک دوسرے کا مقابلہ کرنے والے اتحادیوں کا تھا۔ اس کی بنیاد اجتماع طاقت کے بجائے توازن طاقت پر تھی۔ جب ایک اتحاد مستحکم ہوتا تھا تو اس کی ترقی سے اس کے باہر کی دوسری قومیں پریشان ہو جاتی تھیں اور مشینی طور پر ایک اور اتحاد قائم ہوا تھا۔ مقابلہ کرنے والے اتحادیوں کی وجہ سے اسلحہ میں مقابلہ شروع ہو گیا اور متحارب کیمپوں میں نفرت اور خوف کی رقابت کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنے مقابلے کو جنگ کے میدانوں میں لے گئے۔

جنگ کے سلسلے میں سب سے اہم واقعہ ۲۸ جون ۱۹۱۴ء کو رونما ہوا۔ اس

گولیوں سے کیا۔ اس قتل سے پہلی عالمی جنگ کی ابتدا ہوئی اپنی نوعیت کے اعتبار سے یہ پہلی عالمی جنگ نہ تھی بلکہ اس سے پہلے بھی عالمی جنگیں لڑی جا چکی تھیں۔ سمندر میں بھی اور خشکی پر بھی۔ مورخین اور مصنفین کے نزدیک لوئی چہار دہم کی جنگوں میں سے کوئی پہلی عالمی جنگ کہلانے کی زیادہ مستحق تھی۔ لیکن ہماری نسل ۱۹۱۴ء کی جنگ کو پہلی عالمی جنگ اس لیے بھی قرار دیتی ہے کیونکہ ستمبر ۱۹۳۹ء میں ایک اور عالمی جنگ شروع ہو گئی تھی۔

فریقین:

پہلی عالمگیر جنگ محوری اور اتحادی کیمپوں کے درمیان ۱۹۱۴-۱۸ء تک لڑی گئی۔

محوری کیمپ: جرمنی۔ آسٹریا۔ ہنگری، ترکی اور بلغاریہ۔

اتحادی کیمپ: برطانیہ۔ فرانس۔ روس۔ جاپان اور امریکہ۔

اٹلی ابتدا میں تو محوری کیمپ میں شامل تھا لیکن لندن پیکٹ کے تحت اتحادی کیمپ میں شامل ہو گیا۔

جنگ کے اسباب:

بقول بسمارک "جس طرح فرانس پروشین جنگ ۱۸۷۰ء تاریخی شبہات اور واقعات کا نتیجہ تھی اسی طرح پہلی عالمی جنگ کے بیج ۱۸۷۰ء کی جنگ میں بو دیئے گئے تھے"۔ پہلی عالمی جنگ کے اہم اسباب مندرجہ ذیل بیان کئے جاتے ہیں۔

۱۔ خفیہ معاہدات:

جنگ عظیم کی ایک اہم وجہ اتحادیوں کے خفیہ معاہدات تھے ۱۸۹۴ء میں روس اور فرانس کے مابین معاہدہ ۱۹۰۲ء میں برطانیہ اور جاپان کے مابین معاہدہ ۱۹۰۴ء میں برطانیہ فرانس کے مابین معاہدہ اور ۱۹۰۷ء میں برطانیہ نے روس سے معاہدہ کیا۔ دوسری طرف جرمنی نے آسٹریا ترکی اور بلغاریہ کو اپنا ہمنوا بنا لیا یورپ باقاعدہ طور پر دو حصوں میں تقسیم ہو گیا اور جنگ ناگزیر ہو گئی۔

۲۔ اسلحہ سازی :

جنگ کی ایک وجہ فوجی تیاری کا جنون بھی تھا۔ اگرچہ اسلحہ سازی کا ابتدائی مقصد امن اور بقاء کی فضا کو قائم رکھنا تھا لیکن اسلحہ سازی نے عالمی سطح پر ڈر اور قوموں کے درمیان شبہات کو عام کیا۔ یہ بات جرمنی اور برطانیہ کے مابین بحری طاقت کے مقابلے سے کھل کر سامنے آگئی۔ اسلحہ سازی کی اس دوڑ اور مقابلے کا خاتمہ صرف جنگ ہی کر سکتی تھی۔

۳۔ قوم پرستی :

جنگ کا ایک سبب منفی قوم پرستی تھی یعنی "زندہ رہو اور دوسروں کو اپنے زیر پا زندہ رکھو"۔ اس طرح ملکی محبت دوسروں سے نفرت کا باعث بن گئی جرمنی سے محبت کا مطلب یہ تھا کہ فرانس اور اس کے اتحادیوں سے نفرت کی جائے۔ اسی طرح فرانس سے محبت کا مطلب جرمنی اور اس کے حلیفوں سے نفرت تھا۔ ۱۹۱۴ء میں سربیا کے ولی عہد شہزادہ فرڈیننڈ کے قتل کا بھی یہی سبب تھا۔

۴۔ نوآبادیات کا رجحان :

ہر ملک اپنی بین الاقوامی تجارت میں اضافہ کرنے کے لئے نوآبادیات چاہتا تھا انگلستان اور فرانس کے پاس کافی نوآبادیات تھیں اس کے مقابلے میں آسٹریا اور ہنگری کے پاس بالکل نوآبادیات نہ تھیں اور جرمنی کے پاس جو تھوڑی بہت نوآبادیات تھیں ان تک رسائی مشکل تھی۔ چنانچہ اس معاشی اجارہ داری کی بدولت بین الاقوامی رقابت شروع ہو گئی جو جنگ عظیم اوّل پر آکر ختم ہوئی۔

۵۔ پریس کا پروپیگنڈہ :

تمام ملکوں کے اخبارات نے قومیت کے مقامی تصور کو ابھارا۔ اپنے اپنے ملک کے عوام کو مقاصد کے حصول کے لئے بھڑکایا۔ اپنے مقاصد کے حصول کے لئے

دوسرے ممالک کے حالات کے بارے میں غلط اور جذباتی قسم کا پروپیگنڈہ کیا۔ اخبارات نے دوسرے علاقوں میں رہنے والے ہم قومیت افراد میں جذباتی لگاؤ پیدا کرنے کے لئے مؤثر پروپیگنڈا کیا۔

۶۔ قیصر ولیم کی حکمت عملی:

ولیم دوم جرمنی کو دنیا کی طاقتور ریاست دیکھنا چاہتا تھا اس کی پالیسی تھی "عالمی طاقت یا زوال" ولیم چاہتا تھا کہ انگریز اس کے تمام مطالبے پورے کریں یا پھر جنگ کے لئے تیار ہو جائیں ولیم کا خیال تھا کہ انگریز جنگ سے گریز کرتے ہوئے اس کے تمام مطالبے مان لیں گے یہ ایک احمقانہ خیال تھا۔ لہٰذا قیصر ولیم کی حکمت عملی کی وجہ سے جرمنی کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔

۷۔ جرمنی میں نسلی برتری کا فلسفہ:

جنگ عظیم کی ایک وجہ جرمنی میں نسلی برتری کی تعلیم و فلسفہ کی مقبولیت بھی تھی۔ جرمن فلاسفر اور مؤرخین ٹرائی ٹشکے، نطشے ڈیل مان، ڈروسے سین اور برن ہارڈی نے اپنی تحریروں کے ذریعے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ آرین نسل صرف حکمرانی کے لئے پیدا ہوئی ہے۔ چنانچہ جرمن ریاست کا مقصد صرف طاقت حاصل کرنا ہے تاکہ پوری دنیا پر حکمرانی کی جا سکے۔ دنیا کی عظمت اور بہتری اسی میں ہو گی کہ جرمن ثقافت تمام دنیا پر جاری ہو جائے اور اہلِ دنیا کا غور و فکر اور عمل کا انداز جرمنوں جیسا ہو جائے۔

۸۔ معاشرتی ماحول:

خفیہ سیاست اور بڑی طاقتوں کے طرز عمل نے عوام کے دماغوں میں بے الجھنیں پیدا کر دیں۔ اس طرح حقائق اور ذمہ داریوں پر پردہ ڈال دیا گیا۔ سنجیدگی اور خلوص کی جگہ جذباتیت نے لے لی۔ پورے یورپ کے خارجہ دفاتر میں جعلسازی چوری، جھوٹ، رشوت خوری اور بدکرداری کا دور دورہ شروع ہو گیا

۹ - الساس اور لورین کا مسئلہ :

جنگ کا ایک سبب فرانسیسی عوام کی یہ خواہش بھی تھی کہ الساس اور لورین کا علاقہ واپس لیں جو جرمنی نے ۱۸۷۰ء کی جنگ میں فرانس سے چھین لیا تھا۔ فرانس کی تیسری جمہوریہ میں اساتذہ اور مفکرین نے نوجوانوں میں یہ علاقے واپس لینے کے لئے انتقامی جذبات بھڑکائے۔ فرانسیسیوں کے نزدیک ان علاقوں کی واپسی اقتصادی لحاظ سے بھی ضروری تھی کیونکہ وہاں لوہے اور کوئلے کی کانیں تھیں۔

۱۰- ٹرینٹن اور ٹریسٹا کا مسئلہ :

ٹرینٹن TRENTION اور ٹریسٹا TRISETA کے علاقے آسٹریا کے قبضے میں تھے اور ان پر اہل اٹلی آباد تھے۔ اٹلی ان علاقوں کو واپس لینا چاہتا تھا۔ اٹلی بحرہ ایڈریاٹک ADRIATIC SEA پر کنٹرول کے معاملے میں آسٹریا اور ہنگری کا واحد مقابل تھا۔ آسٹریا اس قسم کے مقابلے کے لئے تیار نہ تھا جس کی وجہ سے تلخی میں اضافہ ہوا۔

۱۱- مراکش کا مسئلہ :

انیسویں صدی کے اوائل میں مراکش کے مسئلے پر فرانس اور برطانیہ کے مابین کشیدگی پیدا ہوئی بعد ازاں فرانس اور برطانیہ میں دوستی ہوگئی اور ان کی جرمنی کے خلاف رقابت شروع ہوگئی۔ مراکش اپنے جغرافیائی محل وقوع کی وجہ سے بڑی اہمیت کا حامل تھا۔

۱۲- بلقان کا مسئلہ :

بلقان کے ۲ دو صوبے بوسنیا BOSNIA اور ہرزیگووینا HERZGOVINA ۱۸۷۸ء کی برلن کانگریس کے تحت آسٹریا اور ہنگری کو دیئے گئے تھے۔ لیکن یہاں اقتدار اعلیٰ بدستور سلطان ترکی کا رہتا تھا۔ ۱۹۰۸ء میں برلن کانگریس کی خلاف ورزی

کرتے ہوئے سلطان کے اقتدار اعلیٰ کو ختم کر دیا گیا۔ دوسری طرف یہ صوبے آزادی چاہتے تھے اور اس سلسلے میں سربیا سے مدد بھی لے رہے تھے جس کی وجہ سے آسٹریا اور سربیا میں رقابت شدت اختیار کر گئی۔

۱۳۔ طرابلس کا مسئلہ:

اٹلی نے برطانیہ سے ایک خفیہ معاہدہ کر کے طرابلس پر حملہ کیا معاہدے میں یہ طے پایا تھا کہ اٹلی مصر میں برطانوی مداخلت کو جائز تصور کرتا ہے اور برطانیہ اٹلی کو طرابلس پر قبضہ کرنے سے نہیں روکے گا۔ جرمنی آسٹریا اور ہنگری اٹلی کی اس حرکت پر آگ بگولہ ہو گئے۔

۱۴۔ عالمی ادارہ کا فقدان:

جنگ کا ایک اور سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بین الاقوامی معاملات کو کنٹرول کرنے کے لئے کوئی مشینری موجود نہ تھی۔ اگرچہ بین الاقوامی قانون اور اخلاق کا ایک ضابطہ موجود تھا لیکن کوئی قوت نافذہ نہ تھی ۱۸۹۹ء اور ۱۹۰۷ء میں ہیگ میں قرار دادیں پاس کی گئیں۔ لیکن تمام حکومتوں نے ذاتی مفاد کو بین الاقوامی مفاد پر ترجیح دی۔

۱۵۔ انحطاط پذیر سلطنت عثمانیہ:

ڈکنس کے الفاظ میں جنگ عظیم اول کا ایک بڑا سبب ترکی کی وسیع مگر غیر ترقی یافتہ غیر محفوظ اور غیر منتظم سلطنت پر اقتدار حاصل کرنا تھا۔ عثمانیہ کی خلافت اٹھارہویں صدی سے انحطاط پذیر تھی۔ بیسویں صدی کے اوائل میں وہ یورپ کی ایک بالکل گئی گزری سلطنت سمجھی جاتی تھی اور ہر یورپی طاقت اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھانے کے لئے مواقع کی تلاش میں تھی۔

۱۶۔ آسٹروی ولی عہد شہزادہ فرڈیننڈ کا قتل:

بلقان میں آسٹریا اور سربیا میں رقابت چلی آ رہی تھی۔ آسٹریا کی حکومت نے

اپنی شاہی قوت کا مظاہرہ کرنے کے لئے ولی عہد شہزادہ فرڈینینڈ FERDINAND کو سربیا کا دورہ کرنے کے لئے بھیجا۔ سربیا کے نوجوان غلامی سے اکتا چکے تھے۔ جس کی وجہ سے انہوں نے شہزادے کا استقبال بم سے کیا۔ ۲۸ جون ۱۹۱۴ء کو شہزادہ اور اس کی اہلیہ پروگرام کے مطابق بوسنیا کے ایک شہر سراجیوو کی گلیوں میں شان و شوکت سے گزر رہے تھے کہ سازشی نے ان پر گولیاں چلائیں اور دونوں میاں بیوی کو قتل کر دیا۔ جو جنگ عظیم اوّل کا سبب بنا۔

جنگ کے واقعات:

شہزادہ فرڈینینڈ کے قتل کی خبر جب آسٹریا پہنچی تو آسٹریا نے سربیا سے انتقام لینے کا فیصلہ کیا ۲۳ جولائی ۱۹۱۴ء کو آسٹریا نے سخت شرائط کے ساتھ سربیا کو الٹی میٹم بھیجا۔ اس دوران روس نے سربیا کو یقین دلایا کہ روس کسی صورت میں بھی آسٹریا کو سربیا پر ظلم کرنے کی اجازت نہیں دے گا۔ اس پر سربیا کی حوصلہ افزائی ہوئی اور سربیا نے آسٹریا کی شرائط ماننے سے انکار کر دیا۔ سربیا کے انکار پر ۲۸ جولائی ۱۹۱۴ء کو آسٹریا نے اس کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ جسے سربیا نے خوش آمدید کہا اور جنگ شروع ہو گئی۔

جرمنی اور برطانیہ اس جنگ کو محدود رکھنا چاہتے تھے۔ برطانیہ کا طرز عمل منافقانہ تھا ورنہ وہ جنگ کو آسانی کے ساتھ ختم کروا سکتا تھا۔ روس کا خیال تھا کہ آسٹریا کا رویہ حقارت آمیز ہے اس وجہ سے برطانیہ کو سربیا کا ساتھ دینا چاہیئے۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے روس نے اپنی فوجوں کو تیار رہنے کا حکم دے دیا۔ جرمنی نے وقت اور حالات کا جائزہ لیا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر جنگ ہوئی تو برطانیہ غیر جانبدار رہے گا چونکہ برطانیہ ان دنوں آئرلینڈ کے مسئلے میں پھنسا ہوا تھا۔ وہاں آزادی کی تحریک چل رہی تھی۔ اور روس میں بالشویک انقلاب کے آثار نمودار ہو رہے تھے چنانچہ جرمنی نے اس وقت کو اپنے حق میں تصور کرتے ہوئے روس اور فرانس کو الٹی میٹم دیا۔ جس کا ان دونوں نے کوئی تسلی بخش جواب نہ دیا تو یکم اگست ۱۹۱۴ء کو جرمنی نے روس کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ ۲ اگست کو جرمنی نے بلجیم پر قبضہ کر لیا اور شاہ بلجیم سے کہا کہ وہ جرمن افواج کو فرانس کی سرحد تک بغیر کسی روک ٹوک

یورپ اور مشرق اوسط ۱۹۱۴ء – ۱۹۱۸ء
اتحادی اور ان کی مددگار طاقتیں
محوری طاقتیں اور ان کے حلیف
غیر جانبدار
سیاسی حدود
آسٹریا اور ہنگری کی درمیانی سرحد
مقامات جنگ
میل
مغربی محاذ پہلی عالمی جنگ
بحر اوقیانوس
ناروے
سوئیڈن
بحیرہ شمالی
جنگ جٹلینڈ
ماسکو
روس
کیف
جرمنی
وارسا
فرانس
پیرس
آسٹریا ہنگری
بحیرہ اسود
بلغاریہ
اٹلی
روم
کارسیکا
سارڈینیا
سسلی
مالٹا
الجزائر
تیونس
کریٹ
قبرص
لیبیا
قاہرہ
مصر
عرب
فارس

جانے دے شاہ بلجیم کے انکار پر جرمنی نے زبردست گولہ باری کی۔ یہ ۱۸۳۹ء کے اس بین الاقوامی معاہدے کی خلاف ورزی تھی جس کے تحت بلجیم کو غیر جانبداری کی ضمانت دی گئی تھی برطانیہ اس معاہدے کا دستخطی فریق تھا جس کی وجہ سے اگست میں برطانیہ نے جرمنی کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔

فرانس، جاپان اور اٹلی بھی بعد ازاں جنگ میں شریک ہو گئے اگرچہ اٹلی اتحاد ثلاثہ میں شامل تھا لیکن اس نے جرمنی اور آسٹریا کا ساتھ نہ دیا بلکہ ایک سال تک غیر جانبدار رہا اور مئی ۱۹۱۵ء میں لندن پیکٹ کے تحت اتحادیوں سے مل گیا۔ ترکی اور بلغاریہ نے اتحادیوں کے خلاف جنگ شروع کر دی۔

برطانوی نوآبادیات مثلاً کینیڈا، جنوبی افریقہ، نیوزی لینڈ ہندوستان مصر اور افریقی مقبوضات بھی اپنے آقاؤں پر جانثار کرنے کے لئے میدان جنگ میں اُتر آئے۔ فرانسیسی نوآبادیات، انڈوچین، مڈغاسکر بھی جنگ میں شریک ہو گئیں جاپان چین کو بھی میدان جنگ میں کھینچ لایا۔ کیونکہ چین جرمنی کی مقبوضات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ ۱۹۱۷ء کے آخر تک سوئٹزرلینڈ ہالینڈ اسپین اسکنڈے نیویا کے ممالک کے علاوہ پورا یورپ جنگ میں ملوث ہو چکا تھا۔

روس کی جنگ سے علیحدگی:

روس میں ۱۹۱۷ء میں بالشویک انقلاب رونما ہوا زار حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا۔ لینن گورنمنٹ امن کی خواہشمند تھی لہٰذا بریسٹ لٹووسک کا معاہدہ جرمنی اور روس کے درمیان ہوا اس معاہدے کے تحت روس نے مشرقی یورپ کے تمام مقبوضات جرمنی کے حوالے کر دیئے۔

امریکہ کی جنگ میں شرکت:

۱۹۱۷ء میں روس کے جنگ سے ہٹ جانے کے بعد جرمنی کی حیثیت بڑی مضبوط ہو گئی جرمن حملوں نے بڑی تباہی مچائی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اتحادیوں کو شکست ہو جائے گی۔ ایسے موقعہ پر امریکہ نے عدم مداخلت کی پالیسی ترک کر کے

اتحادیوں کا ساتھ دیا۔ امریکہ کی جنگ میں شرکت کی دو وجوہات تھیں اوّل یہ کہ جرمنی اور دوسرے ممالک کی طرف سے جب ناکہ بندی ہوئی تو امریکی مال کی کھپت ختم ہوگئی اور امریکہ میں بے روزگاری پھیلنے لگی۔ اس طرح "عالمی اقتصادی خود غرضی کے اصول" نے امریکہ کو جنگ میں کودنے پر مجبور کیا۔ دوئم یہ کہ امریکہ کے ایک جہاز لوسی تانیا LUSITANIA کو جرمن آبدوزوں نے تباہ کر دیا۔ جس میں کئی امریکی مارے گئے۔ چنانچہ صدر ولسن کو جرمنی کے خلاف جنگ کرنے کا موقعہ مل گیا۔ میرا خیال ہے کہ امریکہ اس لئے بھی جنگ میں ملوث ہوگیا تھا کہ اتحادیوں کی شکست کی صورت میں خود امریکہ کے مستقبل کو خطرہ لاحق ہوگیا تھا۔ امریکی فوج کی آمد سے اتحادیوں میں ایک نئی قوت کی لہر پیدا ہوئی اور جرمن فوجیں مختلف محاذوں سے پسپا ہونے لگیں۔ حالانکہ ۱۹۱۸ء کے شروع میں جرمنی نے زبردست قوت کے ساتھ پیش قدمی کرتے ہوئے فرانسیسی فوجوں کو پیچھے دھکیل دیا تھا اور جرمن فوجیں دریائے مارن تک جا پہنچی تھیں۔ مگر اب اتحادیوں کا پلڑا بھاری ہوگیا تھا۔ اتحادیوں نے قط العمارہ اور بغداد فتح کرنے کے بعد یروشلم اور اس کے آس پاس کے علاقے فتح کر لیے۔ اسی اثناء میں عربوں نے ترکوں کے خلاف بغاوت کر دی اور انگریزوں نے عراق، اردن، شام اور فلسطین پر قبضہ کر لیا برطانیہ نے عربوں کو لالچ دیا کہ جنگ میں فتح کی صورت میں ہم تمہیں ترکوں سے آزاد کروا دیں گے۔ برطانیہ اپنی چال بازحکمت عملی کی بدولت مسلمانوں کو مسلمانوں کے خلاف استعمال کرنے میں کامیاب ہوگیا۔

یورپ کے باہر جرمنی کی مقبوضات مثلاً کیمرون ٹوگولینڈ، جرمن مشرقی افریقہ جرمن جنوبی افریقہ اور جزیرہ کیوچو پر اتحادیوں نے قبضہ کر لیا رومانیہ کے چھن جانے سے محوریوں کے پاس تیل کی کمی واقع ہوگئی اور اتحادیوں کے پاس مقابلے کے لئے کافی ذرائع موجود تھے جرمنی کی حالت کو دیکھتے ہوئے امریکی صدر ولسن نے ۸ جنوری ۱۹۱۸ء کو مشہور زمانہ اپنا چودہ نکاتی امن فارمولا پیش کیا۔ جرمن عوام جنگ سے تنگ آچکے تھے قومیت کا جذبہ اور نشہ تباہی و بربادی کی وجہ سے ہرن ہوچکا تھا۔ ایسے میں ولسن کا نعرہ امن بہت بھلا لگا سنسر شپ کی سخت پابندیوں کے باوجود چودہ نکاتی امن فارمولا جرمن عوام اور فوج میں آگ کی طرح پھیل گیا۔ ۴ نومبر ۱۹۱۸ء

کو وہی سپاہی جنہیں باغیوں کو کچلنے کے لئے بھیجا گیا تھا انہیں جا کر محبت اور بھائی چارہ کا سبق دینے لگے۔ دوسری طرف بلغاریہ نے ۲۸ ستمبر ۱۹۱۸ء کو آسٹریا نے ۴ نومبر ۱۹۱۸ء کو اور ترکی نے اکتوبر ۱۹۱۸ء کو ہتھیار ڈال دیئے۔ ۸ نومبر ۱۹۱۸ء کو قیصر ولیم نے تخت چھوڑ کر ہالینڈ میں پناہ حاصل کر لی اور ۱۱ نومبر ۱۹۱۸ء کو عارضی صلح نامے کی رو سے جرمنی کی درخواست پر جنگ بند کر دی گئی۔ امن کانفرنس (معاہدہ ورسیلز ۲۸ جون ۱۹۱۹ء) تک اتحادیوں نے اپنی ناکہ بندی کی پالیسی کو جاری رکھا۔

ولسن کے چودہ نکات:

امریکی صدر ولسن کے چودہ نکات کو اختصار کے ساتھ یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔

۱۔ آپس میں خفیہ معاہدات نہ کئے جائیں۔

۲۔ کھلے سمندروں میں جہاز رانی کی عام آزادی ہو گی بشرطیکہ کوئی بین الاقوامی پابندی حائل نہ ہو۔

۳۔ امن و امان قائم کرنے والی تمام اقوام کی معاشی رکاوٹوں کو دور کیا جائے گا اور ان کو تجارتی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں گی۔

۴۔ تمام نوآبادیات کا فیصلہ منصفانہ طور پر حق خود ارادیت کی بنیاد پر کیا جائے گا۔

۵۔ اسلحہ سازی کو قومی سالمیت کی ضرورت کی حدود سے تجاوز نہیں کرنے دیا جائے گا۔

۶۔ روس کے زیر اثر علاقوں کو واپس کر دیا جائے گا۔

۷۔ بلجیم کے اقتدار کو محدود کرنے کے بجائے اس کی اصلی حالت کو بحال کیا جائے گا۔

۸۔ فرانس کے وہ تمام علاقے واپس کر دیئے جائیں گے جن پر جرمنی کا قبضہ ہے۔

۹۔ اٹلی کی سرحدوں کا از سر نو تعین کیا جائے گا۔

۱۰۔ پولینڈ کی ایک خود مختار حکومت قائم کی جائے گی اور سمندر تک رسائی کو ممکن بنایا جائے گا۔

۱۱- آسٹریا اور ہنگری میں آباد قوموں کو آزادانہ طور پر ترقی کے مواقع فراہم کئے جائیں گے۔

۱۲- رومانیہ سربیا اور مونٹی نیگرو کی ریاستوں کو دوبارہ بحال کیا جائے گا۔

۱۳- ترکی کے اقتدار اعلیٰ کو تحفظ کی ضمانت اور اس کی خود مختاری کو مؤثر بنایا جائے گا درہ دانیال کو تمام ممالک کے جہازوں کے لئے کھول دیا جائے گا۔

۱۴- عالمی امن کے لئے ایک مجلس اقوام کا قیام عمل میں لایا جائے گا۔

جنگ عظیم اوّل کے خاتمے کے بعد جرمنی آسٹریا ہنگری، ترکی اور اتحادیوں کے کرتا دھرتا نے پیرس میں ملاقات کی تاکہ یورپ کے مستقبل کے نقشے کا تعین کریں۔ میرے خیال میں اگر یہ سب لوگ پیرس کے بجائے سوئٹزرلینڈ کے کسی شہر میں ملتے تو زیادہ موزوں ہوتا۔ فرانس خود براہِ راست جنگ میں ملوث تھا اور اس کے چاروں طرف تباہ کاریوں کے اثرات پائے جاتے تھے۔ بہرحال اس کانفرنس کا اجلاس پیرس میں ہوا امریکہ کے صدر ولسن، فرانس کے وزیر اعظم کلے مینشو اور برطانیہ کے وزیر اعظم لائیڈ جارج نے اس کانفرنس میں اہم کردار ادا کیا۔ گفت و شنید کا معاملہ ایک آسان کام نہ تھا۔ جرمنی نے صدر ولسن کے چودہ نکات کی بناء پر ہتھیار ڈالے تھے۔ لیکن ان نکات کو سمجھوتے کی بنیاد نہیں بنایا گیا۔ اس کی مطابقت ان خفیہ معاہدات کے ساتھ کی گئی جو اتحادیوں نے دشمن کے مقبوضات کو آپس میں تقسیم کرنے کے بارے میں کئے تھے۔ حالات کی نزاکت نے صدر ولسن کو بہت سے معاملات پر سمجھوتہ کرنے کے لئے مجبور کر دیا تھا۔ اس لئے پیرس امن کانفرنس کئی لحاظ سے غیر تسلی بخش رہی۔

جنگ کے نتائج:

۱- ۵۱ ماہ کی اس جنگ میں دنیا کے ساڑھے چھ کروڑ افراد براہ راست ملوث تھے ان میں سے ۹۰ لاکھ کے قریب ہلاک ہوئے۔ ۲ کروڑ ۲۰ لاکھ کے قریب افراد مستقل یا عارضی طور پر زخمی ہوئے اور ۵۰ لاکھ افراد لاپتہ ہو گئے جس سے زندگی کی تمام خوشیاں ماتم کدوں میں بدل گئیں۔

۲- فرانس، اٹلی، یونان، رومانیہ اور روس کی لاکھوں ایکڑ زمین بیکار ہو گئی سمندر ول

پر برطانوی کنٹرول کی وجہ سے جرمنی کی اقتصادی حالت بالکل خراب ہو گئی۔ صنعتی زندگی بھی بالکل معطل ہو کر رہ گئی ایک اندازے کے مطابق اس جنگ میں تقریباً ۴ کھرب ڈالر کا نقصان ہوا۔

۳۔ جرمنی کی تمام نو آبادیات چھین لی گئیں جس سے جرمنی کو یورپ میں ۲۷ ہزار ۲ سو مربع میل اور بیرون یورپ ۱۱ لاکھ ۱۸ ہزار مربع میل سے ہاتھ دھونے پڑے۔ علاوہ ازیں جرمنی پر ۶ ارب ۶۰ کروڑ پونڈ (۳۲ ملین ڈالر) تاوان جنگ کا بوجھ ڈالا گیا۔ آسٹریا میں حالانکہ ۷۰ ۹ ز جرمن باشندے آباد تھے لیکن ان کے ساتھ تعلقات قائم کرنے پر پابندی لگا دی گئی۔

۴۔ معاہدہ سیورس اگست ۱۹۲۰ء کے تحت اناطولیہ کو چھوڑ کے سوا باقی تمام علاقے ترکی سے الگ کر دیئے گئے۔ شمال میں بحیرہ اسود کا ساحلی علاقہ اتحادی کمیشن کے سپرد کیا گیا۔ سمرنا اور اس کے گردونواح کا ایک وسیع علاقہ یونان کو ملا۔ جنوبی ساحل کا ایک زرخیز علاقہ اٹلی کو دے دیا گیا۔ تھریس یونان میں چلا گیا جس سے ترکی کی حیثیت بالکل ختم ہو گئی۔

۵۔ نجد کا علاقہ بدستور ابن سعود کے پاس رہنے دیا گیا۔ ساحلی علاقوں کی تقسیم اس طرح کی گئی کہ عرب کے مشرقی ساحل پر کویت، عمان، عراق اور مصر برطانیہ کے سپرد کر دیئے گئے۔ شام فرانس کے زیر اثر آگیا اور فلسطین پر برطانوی انتداب قائم ہوا تاکہ اسرائیل کے قیام کے لئے راہ ہموار ہو سکے۔ حجاز کی ساحلی پٹی پر شریف حسین کی حکومت کو تسلیم کیا گیا۔

۶۔ رومانیہ کو آسٹریا ہنگری روس اور بلغاریہ کے کچھ علاقے دے کر وسعت دی گئی۔ یونان کو بھی بلغاریہ کا کچھ علاقہ دیا گیا۔ روس اور جرمنی سے کچھ علاقے لے کر پولینڈ کی ایک آزاد ریاست بنائی گئی۔ آسٹریا اور ہنگری سے ۵۴ ہزار مربع میل کا علاقہ حاصل کر کے چیکو سلواکیہ کے نام سے ایک نئی ریاست دنیا کے نقشے پر ابھری۔ مانٹی نیگرو کی حکومت کو سربیا میں شامل کر کے یوگوسلاویہ کے نام سے ایک نئی ریاست قائم کی گئی۔

دیا گیا۔

جنرل موڈ بنڈاف نے جنگ پر تبصرہ یوں کیا ہے۔

"ہماری معیشت مضبوط نہ ہوتی تو بلاشبہ ہم جنگ ہار جاتے۔ کیونکہ جنگ جیتنے کے لئے ملک کے اندر عوام کے لئے خوراک کی صورتحال بہتر سے بہتر ہونا چاہیئے۔ جبکہ جرمنی اور آسٹریا میں ایسا نہیں تھا جس سے لوگوں کا ایک طرف اخلاقی معیار بگڑا اور دوسری طرف ان کا جینا محال ہو گیا۔ نیز جنگ کے دوران روسی انقلاب نے جرمن قیدیوں پر اپنے اثرات چھوڑے۔ یہ جرمن قیدی جب روس کی قید سے رہا ہوئے تو انہوں نے اپنی فوج پر اچھے اثرات نہیں ڈالے۔ کیونکہ سیاسی نظریات کہیں نہیں چھپتے۔"

معاہدات امن

۱۔ معاہدہ لندن

LONDON PACT

فریقین:۔ یہ معاہدہ اٹلی اور اتحادیوں کے درمیان ۱۹۱۵ء کو لندن میں ہوا۔

اہم نکات:

۱۔ اس معاہدے کے تحت اٹلی کو ٹربنو، درہ بریز، جنوبی ٹرا ول ٹریسٹ کا شہر ضلع گر بنڈسکا، شمالی ڈبل میٹا اور استائریا وغیرہ کے علاقے دیئے گئے۔

۲۔ بارہ جزائر پر بھی اٹلی کا تسلط قائم ہو گیا۔

۳۔ اٹلی سومالی لینڈ، اری ٹیریا اور لیبیا میں بھی اپنے مقبوضات کو وسیع کر سکتا ہے۔

۴۔ برطانیہ نے اس کو قرضہ دینے کا وعدہ کیا علاوہ ازیں اس کو مال غنیمت اور تاوان جنگ میں بھی حصہ ملنا تھا۔

۵۔ اس معاہدے میں یہ بھی طے پایا گیا کہ اس معاہدے کی دفعات کو خفیہ رکھا جائیگا۔

نتیجہ:

لندن پیکٹ کے تحت اٹلی محوری کیمپ سے نکل کر اتحادی کیمپ میں شامل ہو گیا اور پہلی عالمی جنگ میں اتحادیوں کی طرف سے محوریوں کے خلاف لڑتا رہا۔

اٹلی کے اس طرز عمل پر تبصرہ کرتے ہوئے جرمنی کے چانسلر بسمارک نے کہا۔

در حریص اٹلی چھپی ہوئی نظروں سے اپنی نفسیاتی تحریک کی تکمیل کے لئے ادھر ادھر دیکھتا ہے۔ اس کی یہ حرص بددیانتی کی پیدا کردہ ہے وہ ہمیشہ پشت کی جانب سے حملہ کرنے کو تیار رہتا ہے اور ہمیشہ خیانت کا مرتکب ہوتا ہے۔"

۲۔ معاہدہ بریسٹ لٹووسک

TREATY OF BREST LITOVSK

فریقین :۔ سوویت یونین اور جرمنی، آسٹریا، ہنگری، ترکی، بلغاریہ کے مابین ۳ مارچ ۱۹۱۸ء کو بمقام بریسٹ لٹووسک میں ہوا۔

۱۹۱۷ء کے انقلاب کے بعد روسی عوام عسکری اور اقتصادی اعتبار سے بے حد خستہ حال اور درماندہ تھے۔ نئی حکومت کو مستحکم بنانے کے لئے ملک میں امن وسکون کی شدید ضرورت تھی اس لئے لینن اور اس کے ساتھیوں نے جنگ سے دست بردار ہو کر اپنے ہمسایہ ممالک سے صلح کے لیئے گفت وشنید شروع کر دی اس سے مشرقی محاذ سے جرمنی کو اطمینان حاصل ہوا لیکن سوویت یونین کی نئی حکومت اور اس کے رہنماؤں کے سیاسی نظریات اس کے لئے جنگ سے بھی زیادہ خطرناک تھے۔

۱۰ فروری ۱۹۱۸ء کو جرمنی اور اس کے حلیف ممالک نے سوویت یونین سے ایک ایسا معاہدہ کیا جس کی رُو سے یوکرین عملاً جرمنی کے زیر حفاظت آگیا اور وہاں کی حکومت نے جرمنی، آسٹریا اور ہنگری کو دس لاکھ ٹن اشیاء خورد بہم پہنچانے کا وعدہ کیا۔

مذکورہ بالا معاہدے کے بعد ۳ مارچ ۱۹۱۸ء کو سوویت یونین اور جرمنی نیز جرمنی کے حلیفوں کے مابین ایک معاہدہ ہوا۔

اہم نکات:

۱۔ سوویت یونین نے روسی پولینڈ تھوانیا، لٹویا، اسٹونیا اور جزائر مون ساونڈ پر قائم شدہ اپنے اختیارات و حقوق سے دست کش ہو کر ان پر جرمنی آسٹریا اور ہنگری کے اقتدار کو تسلیم کیا۔

۲۔ فن لینڈ یوکرین اور جارجیا کی آزادی کو تسلیم کیا گیا۔

۳۔ اردہان قارص اور بالخصوم ترکی کو دینے قرار پائے۔

۴۔ چھ ارب طلائی مارک سوویت یونین نے بطور تاوان جنگ ادا کرنے کا وعدہ کیا۔

۵۔ اس معاہدے کی رُو سے سوویت یونین اپنی ۳۴ فیصد آبادی ۳۲ فیصد قابل زراعت اراضی ۵۴ فیصد صنعتی پیداوار، کوئلہ کی معدنیات کے ۸۹ فیصد اور شکر کے قابل کاشت اراضی کے ۸۵ فیصد رقبہ سے محروم ہو گیا۔

نتیجہ:

اس معاہدے کی بدولت یورپی روس ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ اسے بحرہ اسود سے قطعاً اور بحرہ بالٹک سے تقریباً علیحدہ کر دیا گیا۔ لیکن جرمنی کی شکست کے بعد ۱۱ نومبر ۱۹۱۸ء کو پیرس امن کانفرنس میں اس معاہدے کو منسوخ قرار دے کر اس کی ضروری دفعات کو صلح نامہ ورسیلز میں شامل کر لیا گیا۔

۳۔ معاہدہ بفتی

TREATY OF BUFTEA

فریقین:۔ رومانیہ اور جرمنی، آسٹریا، ہنگری، بلغاریہ، ترکی کے مابین عارضی صلح نامہ بفتی قلعہ میں ۵ مارچ ۱۹۱۸ء کو ہوا۔

اہم نکات:

۱۔ اس معاہدے کی رُو سے رومانیہ دبروجہ سے محروم ہوگیا۔
۲۔ آسٹریا اور ہنگری کو، کوہستان کارپتھیا کے ساتھ ملحق ایسا علاقہ حاصل ہوگیا جس نے فوجی اعتبار سے اسے رومانیہ کے مقابلے میں قوی بنا دیا۔
۳۔ رومانیہ کی فوج کو برائے نام رکھا گیا۔
۴۔ دوران جنگ میں رومانیہ نے دشمن کے جن علاقوں پر قبضہ کیا تھا انہیں خالی کرالیا گیا۔
۵۔ اقتصادی حالات کے پیشِ نظر ہر ممکن اقتصادی امداد دینے کی تجاویز پر غور کرنے کا وعدہ بھی کیا گیا۔

نتیجہ:

اس معاہدے کے بعد رومانیہ کی بین الاقوامی سیاست میں اہم حیثیت ختم ہوگئی اور اسے بھاری نقصان اٹھانا پڑا۔

۴۔ معاہدہ بخارسٹ

TREATY OF BUKHARIST

رُومانیہ اور وسطی یورپ کی حکومتوں کے مابین بفتی کے عارضی صلح نامہ کے بعد ۷ رمئی ۱۹۱۸ء کو بمقام بخارسٹ ایک مستقل صلح نامہ ہوا۔ اس میں بفتی صلح نامہ منسوخ ہوگیا اس معاہدہ کی اہم شرائط حسب ذیل تھیں۔

۱۔ اس معاہدے کی رُو سے کوہستان کارپتھیا کا تمام علاقہ ہنگری کو دیا گیا۔
۲۔ جنوبی ڈبروج بلغاریہ کا حصہ قرار پایا اور اس کے شمالی حصہ میں آسٹریا اور جرمنی کی مشترکہ حکومت قائم کی گئی۔
۳۔ رومانیہ کو ساحل سے بالکل منقطع کر دیا گیا البتہ اسے بندرگاہ "کانسٹینزا" جسے فری پورٹ قرار دیا گیا تھا استعمال کی اجازت دے دی گئی۔
۴۔ بندرگاہ ٹرنو، سویرن اور جیارجیو کو علی الترتیب آسٹریا اور جرمنی کے قبضہ میں دیا گیا۔
۵۔ دریائے ڈینیوب کے متعلق آزاد بار برداری اور جہاز رانی کے تمام بین الاقوامی فیصلوں کو نظر انداز کر کے فریقین اس امر پر رضامند ہوگئے کہ

پر مشتمل ایک مجلس بنا کر اس کا انتظام اس کے سپرد کر دیا جائے۔
ڈینیوب کے کناروں یا بحیرہ اسود کے یورپی ساحل کی ریاستوں کے نمائندوں

۶۔ رومانیہ کے تیل کے چشموں کو ۹۹ سال کے لئے پٹہ پر جرمنی کے حوالے کر دیا گیا۔

۷۔ رومانیہ کی حکومت نے ۵ سال تک مقررہ قیمت پر جرمنی اور اس کے حلیفوں کو اشیاء خوردنی مہیا کرتے رہنے کا وعدہ بھی کیا۔

۸۔ یہ بھی طے ہوا کہ معاہدہ کی شرائط کی تکمیل کے سلسلہ میں جرمنی اور اس کے حلیفوں کی افواج رومانیہ میں مقیم رہیں گی اور ان افواج کی واپسی کے وقت کا تعین بعد میں کیا جائے گا۔

۹۔ رومانیہ کو سوویت یونین سے بسارابیا کا صوبہ حاصل کرنے کے سلسلہ میں بالکل آزاد چھوڑ دیا گیا تھا۔

جرمنی اور رومانیہ کی حکومتوں نے اس معاہدہ کی تصدیق جولائی ۱۹۱۸ء میں کی لیکن اس زمانہ میں جرمنی کی شکست کے امکانات بھی پیدا ہو گئے تھے۔ اتحادیوں نے بریسٹ لٹووسک اور بخارسٹ کے صلح ناموں کی تنسیخ کو جنگ ختم کرنے کے لئے اولین اور بنیادی شرط قرار دیا۔ چنانچہ ۱۱ نومبر ۱۹۱۸ء کو جرمنی اور اتحادیوں کے مابین عارضی صلح نامہ پر دستخط ثبت ہونے سے چند گھنٹے قبل رومانیہ نے از سر نو جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا اور اس طرح یہ معاہدہ عملاً منسوخ ہو گیا۔

۵۔ معاہدہ ورسیلز

TREATY OF VERSAILLES

یہ معاہدہ ۲۸ جون ۱۹۱۹ء کو جرمنی اور اتحادیوں کے مابین طے پایا۔ اس معاہدے کی کل ۴۳۵ دفعات تھیں۔ جن میں پہلی ۲۶ دفعات مجلس اقوام کے بارے میں تھیں۔ جب معاہدہ کا مسودہ تیار ہو گیا تو جرمنی سے وفد بھیجنے کو کہا گیا۔ جرمنی نے فیصلہ کیا کہ کچھ ماتحت افسران بھیجے جائیں جو معاہدہ کا مسودہ برلن لے آئیں تاکہ اس پر غور کیا جا سکے۔ اس سے یہ مطلب اخذ کیا گیا کہ اس سے اتحادیوں کی بے عزتی ہو گی۔ چنانچہ جرمنی سے ایک مکمل وفد بھیجنے کو کہا گیا۔ آخر کار ایک جرمن وفد وزیر خارجہ کی قیادت میں پیرس کے ورسیلز محل میں پہنچا۔ اس کی آمد کے وقت سلامی دینے والے فوجیوں کو ہٹا لیا گیا۔ وفد کے اراکین

پر آزادانہ نقل و حرکت کی پابندی عائد کی گئی۔ جس ہوٹل میں اس کے قیام کا بندوبست کیا گیا تھا اس کی زبردست نگرانی کی گئی۔ انہیں کسی قسم کی مواصلاتی روابط کی مراعات فراہم نہیں کی گئیں۔

اس کے برعکس جب امریکہ اور دیگر اتحادی ممالک کے وفود ورسیلز پہنچے تو انہیں گارڈ آف آنر پیش کیا گیا۔ جرمن وفد کو فرانسیسی وزیر اعظم کلے مینشو نے حقارت آمیز لہجہ میں کہا۔

"آپ لوگوں نے پوری دنیا پر جنگ مسلط کی تھی۔ اب وقت آ گیا ہے کہ آپ سے اس کا حساب لیا جائے"۔

یہ دنیا کا شاید پہلا معاہدہ تھا جس میں بین الاقوامی سطح پر یکطرفہ کارروائی کی گئی۔ جرمنی کو برابری کی بنیاد پر میز پر بیٹھنے کی بھی اجازت نہیں تھی۔ البتہ پھر بھی جرمنی نے معاہدے سے متعلق ایک تفصیلی یادداشت پیش کی۔ ۲۳۰ صفحات پر مشتمل معاہدہ امن پر جرمنی نے ۲۳۴ صفحات کی یادداشت حاضر خدمت کی۔ لیکن اتحادیوں نے معاہدے میں چند معمولی تبدیلیوں کے بعد جرمنی کو دھمکی دی کہ اگر پانچ دن کے اندر اندر اس پر دستخط نہ کئے گئے تو دوسری جنگ کے لئے تیار ہو جائیں معاہدے کی شرائط اس قدر غیر منصفانہ تھیں کہ بہت سے جرمن اس بات کے لئے تیار تھے کہ جنگ کر کے اپنے ملک کو تباہ کرا دیں اور معاہدے کی شرائط کو تسلیم نہ کریں۔ لیکن ہنڈن برگ نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ اتحادیوں کے خلاف کامیابی کے ساتھ جنگ کرنا ممکن نہیں ہے۔ جرمنی میں قحط پڑنے والا تھا لہٰذا جرمنی کی ویمر جمہوریہ نے معاہدے کو تسلیم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن اس نے ان دفعات پر اعتراض کیا جن کا تعلق جنگ کے الزام اور جنگی مجرموں کی رہائی سے تھا۔ اتحادی چاہتے تھے کہ معاہدہ کو غیر مشروط طور پر تسلیم کیا جائے چنانچہ جب جرمنوں کو کوئی اور راستہ نظر نہ آیا تو وہ جھک گئے۔ جرمن نمائندے نے کہا کہ "اس کا ملک بے پناہ طاقت کے سامنے جھک رہا ہے لیکن معاہدے کی شرائط کی ناانصافی کے متعلق جو رائے اس نے قائم کی ہے وہ ترک کرنے کو تیار نہیں ہے"۔

۲۸ جون ۱۹۱۹ء کو معاہدہ ورسیلز پر دستخط ہوئے اس دن آرچ ڈیوک فرڈینینڈ کی پانچویں برسی منائی جا رہی تھی۔

معاہدہ کی شرائط:

معاہدہ ورسیلز کی دستاویز ۱۵ حصوں ۴۴۴ دفعات اور ۲۰۰ شمولات پر مشتمل تھی جن کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

۱۔ الساس اور لورین کا علاقہ جو جرمنی نے ۱۸۷۰ء کی جنگ میں فرانس سے چھینا تھا فرانس کو واپس کر دیا گیا۔

۲۔ وادی سار جو کان کنی کی وجہ سے مشہور ہے پہلے ریفرنڈم کے لئے مجلس اقوام کے حوالے کیا گیا۔ لیکن جنگ میں فرانسیسی کوئلے کی کانیں تباہ ہوئی تھیں اس وجہ سے یہ علاقہ بھی فرانس کو دے دیا گیا۔

۳۔ یوپین اور مال میڈی کے علاقے بلجیم کو دیئے گئے۔

۴۔ مشرقی پروشیا کی تقریباً ۴۰ میل لمبی ساحلی پٹی اور مغربی پروشیا کا صوبہ پوزن پولینڈ کے حوالے کر دیا گیا۔

۵۔ میمل کی بندرگاہ بھی پولینڈ کو دی گئی۔

۶۔ بالائی سلیشا UPPER SILESIA میں رائے شماری کرائی گئی۔ ۶۰ فیصد ووٹ جرمنی کو اور ۴۰ فیصد ووٹ پولینڈ کو ملے مجلس اقوام کے فیصلے کے مطابق زیادہ آبادی والا علاقہ جرمنی کو اور معدنیات والا علاقہ پولینڈ کے حوالے کر دیا گیا۔

۷۔ ڈان زگ شہر DANZIG CITY کو جرمنی سے لے کر ایک آزاد شہر بنا دیا گیا اور پولینڈ کے باشندوں کو اس میں خاص حقوق دیئے گئے۔ شہر کا انتظام و انصرام مجلس اقوام کے سپرد کیا گیا۔

۸۔ دریائے رائین کے دونوں کناروں سے ۵۰ کلومیٹر کا رقبہ مجلس اقوام کے سپرد کیا گیا اس علاقے سے تمام فوجی قلعوں کو مسمار کر دیا گیا اور اس علاقے کی فوجی اہمیت کو ختم کر دیا گیا۔

۹۔ ہائیگولینڈ اور ڈیون کے فوجی اڈے ختم کر دیئے گئے اور جرمنی نے وعدہ کیا کہ وہ آسٹریا کی آزادی کا احترام کرے گا۔

۱۰۔ جرمنی کو سمندر پار اپنی تمام نوآبادیات سے دستبردار ہونا پڑا۔ جاپان کو "کیوچو"

اور "شنٹونگ" کے صوبے اور دوسرے مقبوضات ملے۔ برطانیہ کو مغربی افریقہ میں جرمنی کے مقبوضات ملے، برطانیہ اور فرانس نے کیمرون اور ٹوگو لینڈ کو آپس میں تقسیم کیا۔

۱۱۔ جرمنی نے بلجیم پولینڈ اور چیکوسلواکیہ کی مکمل آزادی اور اقتدار کو تسلیم کر لیا۔ اس سے بریسٹ لٹووسک اور بخارسٹ کے معاہدے ختم ہو گئے۔

۱۲۔ جرمنی، چین، تھائی لینڈ، مصر، مراکش اور لائبیریا میں اپنے خاص حقوق سے دست بردار ہو گیا اتحادیوں نے ان حقوق کو اپنے لئے مخصوص کر لیا۔ اتحادیوں نے ان علاقوں میں جرمن جائیداد اور اس کے شہریوں کی بیرون ملک جائیدادیں بھی ضبط کر لیں۔

۱۳۔ جرمن کے جزائر کو اتحادیوں نے آپس میں بانٹ لیا۔ جاپان کو مارشل آئی لینڈ اور شن چن نیوزی لینڈ کو "سموا" اور برطانیہ کو نارو ملا۔

۱۴۔ جرمنی کی فوجی قوت کو بالکل کم کر دیا گیا۔ جرمنی صرف ایک لاکھ فوجی رکھ سکتا تھا پولیس کی تعداد میں آبادی کی تعداد کے تناسب سے اضافہ کیا جائے گا۔ جنگی اسلحہ بنانے اور درآمد کرنے پر مکمل پابندی لگا دی گئی نیز جرمن جوانوں اور افسران کے استعفیٰ ہونے پر بھی پابندی لگی تاکہ بوقت ضرورت انہیں استعمال نہ کیا جا سکے۔

۱۵۔ جرمنی کو صرف چھ جنگی جہاز چھ چھوٹے جہاز بارہ تباہ کن جہاز اور بارہ تارپیڈو کشتیاں رکھنے کی اجازت دی گئی۔ آبدوز رکھنے کی اجازت نہ تھی۔ بحریہ کے لئے صرف ۱۵ ہزار نفری کی اجازت تھی۔

۱۶۔ جرمنی کی فضائیہ کو بالکل ختم کر دیا گیا۔ تمام فوجی اکیڈیمیاں بھی بند کر دی گئیں۔

۱۷۔ جرمنی کے بادشاہ ولیم دوم کو بین الاقوامی اخلاقیات و معاہدات کی خلاف ورزی کا مجرم قرار دیا گیا۔ ولیم چونکہ نیدرلینڈ میں پناہ لے چکا تھا اور نیدرلینڈ کی حکومت نے قیصر ولیم کو واپس دینے سے انکار کر دیا تھا۔ جرمنی کے ۱۱۲ افراد کو جنگی جرائم کی سزائیں ہوئیں۔

۱۸۔ جرمنی سے کہا گیا کہ وہ تسلیم کرے کہ جنگ عظیم اوّل کی ذمہ داری اس پر عائد ہوتی

ہیں کہ اتحادی حکومتوں اور ان کے باشندوں کے جو نقصانات ہوئے ہیں ان کی ذمہ داری جرمنی پر ہے۔

۱۹۔ جرمنی پر تاوان جنگ کا بوجھ ڈالا گیا اور تاوان کے تعین کے لئے ایک کمیشن مقرر کیا گیا۔

۲۰۔ دریائے ایلب، ڈینیوب، اوڈر اور نیمان کو بین الاقوامی حیثیت دی گئی نہر کیل کو تمام دنیا کے لئے کھول دیا گیا۔ جرمنی کے ہمبرگ وسٹین کی بندرگاہوں کے آزاد علاقے چیکوسلواکیہ کو ۹۹ سالہ پٹہ پر دیئے گئے۔

۲۱۔ جرمنی کو ۱۸۷۰ء کی جنگ میں حاصل کردہ فرانسیسی آرٹ ورک، تمغے، جھنڈے فرانس کو واپس کرنے کو کہا گیا۔ جامعہ لورین کا تحقیقی مواد و مسودات کو ضائع کرنے کا معاوضہ اور حضرت عثمانؓ کے زمانے کا قرآنِ پاک کا اصلی نسخہ حجاز کے سلطان کو واپس کرنے کو کہا گیا۔

۲۲۔ مندرجہ بالا شرائط پر عمل درآمد کروانے کے لئے ایک دفعہ رکھی گئی رائین کے مغرب میں جرمنی کے علاقے پر مع پلوں کے پندرہ سال تک اتحادی فوجوں کا قبضہ رہے گا۔ اگر جرمنی نے وفاداری کے ساتھ وعدوں کو نبھایا تو "کولون" کو پانچ سال بعد "کوبنز" کو دس سال بعد اور "منیز" کو پندرہ سال بعد خالی کردیا جائے گا۔ اگر جرمنی نے غلط رویّہ اختیار کیا تو قبضہ مزید جاری رہے گا۔ درحقیقت ۱۹۳۰ء تک تمام فوجوں کو واپس بلا لیا گیا اور تاوانِ کمیشن نے ۶ ارب ۶۰ کروڑ پونڈ (۳۲ ملین ڈالر) کی رقم کا تعین کیا۔

معاہدہ ورسیلز کا تنقیدی جائزہ:

معاہدہ ورسیلز کو ماہرین نے بہت زیادہ تنقید کا نشانہ بنایا یہاں اس کا اختصار کا ساتھ جائزہ لیا جا رہا ہے۔

۱۔ معاہدہ ورسیلز اتحادیوں کی طرف سے جرمنی پر ٹھونسا گیا تھا۔ یہ ایک جبری امن تھا۔ اس معاہدے کے تحت جرمنی کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے گئے (تفصیل شرائط میں دیکھئے) اور جرمن وفد کو دھمکی دے کر معاہدہ پر دستخط

کروائے گئے۔ اس طرح معاہدے کو اخلاقی رنگ نہ دیا گیا۔

۲۔ جرمنی نے امریکی صدر ولسن کے چودہ نکات کے تحت ہتھیار ڈالے تھے لیکن معاہدے میں چودہ نکات کو نظر انداز کیا گیا اور باہمی گٹھ جوڑ کو مد نظر رکھا۔ حق خود ارادیت کی بھی پرواہ نہ کی گئی۔

۳۔ معاہدہ امن انتقام کے جذبے کے تحت کیا گیا۔ معاہدے کے تحت یہ اصول کارفرما تھا کہ مال غنیمت کے حق دار فاتحین ہوتے ہیں۔ حالانکہ قیام امن کے لئے ضروری تھا کہ جنگ کے بعد جرمنی میں جو "ویمر جمہوریہ" WEIMAR REPUBLIC قائم ہوئی تھی اتحادی اس کے ساتھ تعاون کرتے لیکن اتحادیوں نے ایسا نہیں کیا جس کی وجہ سے جرمنی میں جنوری ۱۹۳۳ء میں ہٹلر برسر اقتدار آگیا جو دوسری عالمی جنگ کا سب سے بڑا محرک بنا۔

۴۔ پولینڈ کو جرمنی میں سے راستہ دیا گیا۔ اس سے جرمن باشندے سخت ناراض تھے اس تقسیم کو ایک جسم کے ٹکڑے کرنے سے تشبیہ دی گئی۔

۵۔ اس معاہدے میں جرمنی کے علاوہ اس کے اتحادیوں کے ساتھ بھی اچھا سلوک نہیں کیا گیا۔ آسٹریا کو ایک چھوٹا سا ملک بنا دیا گیا۔ اس کی سلطنت حکمران اور فوج بھی غائب ہو گئی۔ ہنگری نے آزادی کا اعلان کر دیا اور آسٹریا کی حیثیت یورپی سیاست سے بالکل ختم ہو گئی۔

۶۔ اس معاہدے کی بدولت ۲ لاکھ ۳۰ ہزار جرمن اور ۱۳ لاکھ یوگوسلاویہ کے باشندے اٹلی کی حکومت کے ماتحت چلے گئے۔

۷۔ آرمینیا کے عیسائیوں سے وعدہ کیا گیا تھا کہ جنگ کے بعد انہیں ترکوں سے آزاد کروا دیا جائے گا۔ معاہدہ ورسیلز میں ان کا ذکر ہی نہیں کیا گیا بعد ازاں معاہدہ لوزان جولائی ۱۹۲۳ء میں آرمینیا کو ترکوں کے تحت ہی رہنے دیا گیا۔

۸۔ معاہدہ ورسیلز کے تحت قائم کردہ تاوان کمیشن نے جرمنی پر ۶ ارب ۶۰ کروڑ پونڈ تاوان کا بوجھ ڈالا۔ اتحادیوں کے سمجھ دار افراد جانتے تھے کہ جرمنی اس قدر تاوان کبھی بھی ادا نہیں کر سکے گا اور اگر یہ ادائیگی باقاعدہ جاری رہتی تو ۱۹۸۸ء میں جا کر کہیں ختم ہوتی۔

۹۔ معاہدہ ورسیلز میں اٹلی کو وہ مراعات نہ دی گئیں جن کا لندن پیکٹ ۱۹۱۵ء میں وعدہ کیا گیا تھا۔ اٹلی کے جنگ میں ۷ لاکھ آدمی مارے گئے اور ایک کروڑ ۲۰ لاکھ ڈالر خرچ ہوئے تھے لہٰذا اتحادیوں کے رویئے پر محبان وطن سخت برہم ہوئے اور اتحادیوں کے خلاف ہو گئے۔ بعد ازاں مسولینی کی قیادت امن عالم کے لئے نقصان دہ ثابت ہوئی۔

۱۰۔ جنگی قیدیوں پر مقدمات قائم کرنے کی خبر نے جرمنی میں افراتفری پھیلا دی۔ اس پر پروپیگنڈہ یہ کیا گیا کہ تمام جرمن مفکرین پر مقدمات قائم کئے جائیں گے۔ جس کی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ۔

"یہ معاہدہ امن نہیں بلکہ معاہدہ انتشار تھا۔"

۱۱۔ امن عالم کے لئے بنائی جانے والی انجمن اقوام کو معاہدہ ورسیلز کا ناقابل تسخیر حصہ بنا دیا گیا جس وجہ سے انجمن عالمگیر حیثیت حاصل نہ کر سکی۔ بہت سارے ممالک اس معاہدے سے متفق نہ تھے لہٰذا وہ لیگ آف نیشن کے ممبر نہ بنے۔

۱۲۔ روس کو اس معاہدے میں شامل نہ کر کے اتحادیوں نے غیر حقیقت پسندانہ رویہ اختیار کیا۔

۱۳۔ امریکی صدر ولسن نے امن سمجھوتے کے لئے بہت کام کیا تھا لیکن موصوف سینٹ سے اس معاہدے کی توثیق نہ کروا سکے۔ ۱۹۲۰ء کے صدارتی انتخابات میں صدر ولسن کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کی جگہ صدر ہارڈنگ نے لی۔ ری پبلیکن انتظامیہ نے جرمنی۔ آسٹریا اور ہنگری سے الگ الگ معاہدے کیے جن کی اکتوبر ۱۹۲۱ء میں سینٹ نے توثیق کر دی۔

۱۴۔ معاہدہ ورسیلز کے وقت اور اس کے بعد بھی اتحادیوں کی پالیسیوں میں یکسانیت نہیں پائی جاتی تھی۔ جیسے فرانس جرمنی کو بالکل تباہ و برباد دیکھنا چاہتا تھا جبکہ برطانیہ اس چیز کو ناپسند کرتا تھا۔

۱۵۔ جے۔ایل کاروین : J.L. CARVIN

"اس معاہدے کی وجہ سے یورپ نے بلقانی رنگ اختیار کر لیا تھا یعنی وہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا۔ السا س اور لورین نے شدید بحرانی فساد پیدا کر دی تھی جو حقیقی معنی میں حل نہ ہوئی ولسن کے چودہ نکات ناامید بال بن گئے تھے لیکن المناک پہلو یہ تھا کہ امریکہ اس معاہدے کا ممبر نہ بن سکا۔"

۱۶۔ لیسننگ :

"معاہدہ ورسیلز کی شرائط بے انتہا سخت اور توہین آمیز تھیں۔ ان پر عملدرآمد ناممکن تھا۔ یہ معاہدہ اس اصول کے تحت ہوا کہ فاتحین کو مالِ غنیمت ملتا ہے اور اتحادی فاتحین تھے۔"

۱۷۔ سیمین :

"معاہدہ ورسیلز کی حقیقی کمزوری یہ نہ تھی کہ جرمنی کے جنوب مشرق میں چھوٹی چھوٹی حکومتیں قائم کی گئی تھیں۔ بلکہ اس کی اصل کمزوری یہ تھی کہ ان ریاستوں کے قیام اور دفاع کے لئے مؤثر ذرائع اختیار نہیں کئے گئے تھے۔ کچھ نقادوں نے بجا طور پر کہا ہے کہ یہ سمجھوتہ کلے مینشو کا سمجھوتہ ہے۔ کیونکہ نپولین کے نقشے کے علاوہ کوئی اور نقشہ اس وضاحت کے ساتھ فرانس میں نہیں بنایا گیا تھا۔ اس معاہدے میں صرف فرانسیسی قوم کو کامیابی ہوئی کیونکہ فرانس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ اس کے لئے ترقی کے مواقع یورپ میں ہیں نہ کہ افریقہ میں۔"

۱۸۔ ڈاکٹر لینگسم : DR. LANGSAM

"معاہدہ ورسیلز نے جرمنی کے یورپی علاقے کا ⅛ حصہ کم کر دیا اور اس کی آبادی میں ۶ لاکھ ۵۰ ہزار کی تخفیف کی۔ اس نے جرمنی کو نوآبادیات اور بیرونی سرمایہ کاری جائیدادوں سے بالکل محروم کر دیا وہ قابل کاشت زمین کے ۱۵ فیصد حصے سے مویشیوں

کے ۲۱ فیصد حصّے سے اور دس فیصد کارخانوں سے محروم ہو گیا۔ اس کے سامان تجارت ہیں، ۵ لاکھ سے تخفیف کر کے اسے ۵۰۰ لاکھ ٹن سے بھی کم کر دیا گیا۔ اس کی بحیرہ جو انگلستان کے بعد دوسرے نمبر پر تھی اسے ختم کر دیا گیا۔ اس کی فوج کی تعداد فرانس کی فوج کا ساتواں حصّہ باقی رہ گئی۔ جرمنی کو پوٹاش، لوہے، کوئلے، زنک، سیسے اور خوراک سے محروم کر دیا گیا۔ نو آبادیاں چھن جانے کی وجہ سے جرمنی ابرک، تیل اور دھاگے سے محروم ہو گیا۔ نئی علاقائی شمولیت نے جنگ سے پہلے کے زمانے کی صنعتی اور تجارتی تنظیم کو ختم کر دیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طویل عرصے تک وہ صنعتی مشینیں جو جرمنی کے پاس باقی رہ گئیں تھیں مکمل طور پر کام نہ کر سکیں"۔

۱۹۔ جنرل سمٹس: GENERAL SMUTS

میں نے معاہدہ ورسیلز پر اس لئے دستخط نہیں کئے کہ یہ قابل اطمینان تھا بلکہ اس لئے کئے کہ اس سے جنگ بند ہو جائے گی۔ معاہدہ ورسیلز کے ایک دن بعد کرنل ہاؤس نے ڈائری میں لکھا۔

"میں دوسری قسم کے معاہدہ کو ترجیح دیتا۔"

تنقیدی جائزہ لینے کے بعد اب یہاں میں اتحادی طاقتوں خاص کر برطانوی وزیراعظم لائیڈ جارج کی ترجمانی کرنا چاہ رہا ہوں۔ اتحادی طاقتوں کا موقف یہ تھا کہ پہلی عالمی جنگ جرمنی کے چانسلر بسمارک کی حکمت عملی کا نتیجہ ہے اور پھر خود چانسلر بسمارک کی پالیسی حق خودارادیت کے خلاف رہی ہے۔ اس لئے اب جرمنی کو بھی حق خود ارادیت کی شرائط دہرانے کا حق نہیں ہے۔ جرمنی جو خود انصاف چاہتا ہے کیا اس نے اوروں کے ساتھ انصاف کیا ہے۔ جنگ کی وجہ سے جو لوگ یتیم ہوئے کیا ان کے ساتھ انصاف ہوا۔ دراصل ناانصافی جرمنی کے ساتھ نہیں ہوئی بلکہ ناانصافی ان کے ساتھ ہوئی ہے جنہوں نے جرمنی کو آمریت سے بچایا ناانصافی ان کے ساتھ ہوئی ہے جنہوں نے اپنی جائیدادیں اور جانیں قربان کیں بلکہ جرمنی کے ساتھ تو جو سلوک کیا گیا ہے وہ عین انصاف ہے۔ ورنہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ خطہ ارض سے اس کے وجود کا خاتمہ کر دیا جاتا۔ علاقوں کی تقسیم کے متعلق اتحادیوں کا کہنا یہ ہے کہ جرمنی سے انہوں نے صرف وہی علاقے واپس لئے ہیں جن پر جرمنی نے

کبھی زبردستی قبضہ کر لیا تھا۔ فرانس کی کوئلے کی کانیں جنگ میں تباہ و برباد ہوئیں لہٰذا اس کے بدلے میں برمنی کی وادی سار فرانس کو دینا عین انصاف ہے جرمنی کی مشرقی سرحدوں کے متعلق اتحادیوں کا کہنا ہے کہ اس کی مشرقی سرحد پر ہزاروں برس سے پولستانی قوم آباد تھی اور ان کی جائز حکومت صدیوں سے چلی آرہی تھی۔ جس پر جرمنی نے زبردستی قبضہ کر لیا تھا۔ لہٰذا یہ علاقے پولینڈ کو واپس دینا بھی انصاف کے تقاضوں کو پورا کرنا تھا مزید یہ کہ پولینڈ کو جرمنی کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑا جا سکتا تھا لہٰذا اس لئے اسے میمل کی بندرگاہ ڈان زگ شہر، مشرقی پروشیا کی تقریباً ۴۰ میل لمبی ساحلی پٹی اور مغربی پروشیا کا صوبہ پوزن پولینڈ کے حوالے کیا گیا۔

نو آبادیات کے سلسلے میں اتحادیوں کا خیال تھا۔ کہ جرمن آمریت کو ختم کرنے کے لئے اس سے نو آبادیات کا واپس لینا ضروری تھا۔ تاوان کی کثیر رقم (۳۲ ملین ڈالر) بھی جائز تھی کیونکہ اس سے کہیں زیادہ اتحادیوں کا نقصان ہوا تھا۔ کسی سے جو نقصان ہوا ہو اسے واپس لینا اس لئے جائز ہوتا ہے کہ وہ دوبارہ ایسا کرنے کی جرأت نہ کرے۔ جرمنی پر اسلحہ کی پابندی اس لئے لگائی گئی کہ دنیا میں امن وامان برقرار رہے۔

غرض یہ کہ اتحادیوں کے اقدامات امن کا جامع منصوبہ ہیں اور یہ اقدامات انسانیت کی بقاء اور سلامتی کے لئے ضروری تھے ورنہ یہ امر لازم تھا کہ جرمنی طاقت کے بل بوتے پر دنیا کو تباہی کی طرف دھکیل دے گا۔

تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ وقت کی آمد اور حالات نے یہ ثابت کر دیا کہ جس چیز کا اتحادیوں کو ڈر تھا اور جسے وہ روکنا چاہتے تھے وہ ہو کر رہی یعنی دوسری جنگِ عظیم۔

۶۔ معاہدہ سینٹ جیرمین

TREATY OF ST. GERMAINE

یہ معاہدہ ۱۰ دسمبر ۱۹۱۹ء کو آسٹریا ہنگری اور اتحادیوں کے مابین ہوا۔

معاہدہ کی شرائط:

۱۔ آسٹریا اور ہنگری نے چیکوسلواکیہ، پولینڈ، یوگوسلاویہ کی خود مختاری کو تسلیم کر لیا۔
۲۔ آسٹریا اور ہنگری کے بہت سارے علاقے اتحادیوں نے آپس میں تقسیم کر لئے۔
۳۔ آسٹریا کی فوجی قوت ۳ ہزار افراد تک محدود کر دی گئی۔
۴۔ بین الاقوامی معاوضہ کمیشن نے تاوانِ جنگ کی رقم مقرر کی جو آسٹریا نے ادا کرنی تھی۔

نتیجہ:

اس معاہدہ کی وجہ سے آسٹریا ایک چھوٹی سی جمہوریہ بن گیا۔ جس کے پاس کوئی بندرگاہ نہیں تھی۔ اس کی آبادی و رقبہ پرتگال سے بھی کم ہو گیا۔

گرانٹ اور ٹمپرلے نے اس معاہدہ پر تبصرہ یوں کیا ہے۔

"معاہدہ سینٹ جیرمین نے آسٹریا کی آبادی کو نصف سے بھی کم کر دیا۔ اس معاہدے کے تحت ۷۵ لاکھ سیلشائی۔ ۴ لاکھ جرمن اور ۱۰ لاکھ سے زائد غیر جرمن باشندے پولینڈ کو دیئے گئے ان میں سے ۲۵ لاکھ چیکوسلواکیہ کو ملے۔ آسٹریا کی نئی سرحدیں آرتح جینر سٹائیریا اور ٹائیرول تک محدود ہو گئیں۔ آسٹریا کی آبادی ۲ کروڑ تھی صرف ۸۰ لاکھ رہ گئی اور رقبہ نصف رہ گیا۔ یہ ملک انتہائی غریب ہو گیا اور اس کی معاشی حالت بڑی کمزور ہو گئی"۔

۷۔ معاہدہ نیوُلی

TREATY OF NEVILLY

یہ معاہدہ ۲۷ نومبر ۱۹۱۹ء کو بلغاریہ اور اتحادیوں کے مابین ہوا۔

معاہدہ کی اہم شرائط:

۱۔ بلغاریہ نے وہ تمام علاقے واپس کر دیئے جو اس نے بلقان کی جنگوں ۱۹۱۲-۱۳ء اور پہلی عالمی جنگ ۱۹۱۴-۱۵ء میں حاصل کئے تھے۔
۲۔ مقدونیہ کا ایک حصہ یوگوسلاویہ کو، دبروجا کا تمام علاقہ رومانیہ کو دیا گیا۔

۳۔ بلغاریہ نے ٹریشین کا ساحل اتحادیوں کے حوالے کیا اور بعد ازاں اتحادیوں نے یہ علاقہ یونان کے حوالے کیا۔

۴۔ بلغاریہ پر نصف بلین ڈالر (۵ لاکھ) تاوانِ جنگ عائد کیا گیا۔

۵۔ بلغاریہ کی فوجی قوت ۳۳ ہزار افراد تک محدود کر دی گئی۔

۸۔ معاہدہ ٹرائینون

TREATY OF TRIANON

یہ معاہدہ ۴ جون کو ہنگری اور اتحادیوں کے درمیان طے پایا۔

معاہدہ کی اہم شرائط:

۱۔ ہنگری نے غیر مگیار کی آبادی سے دستبرداری اختیار کی۔
۲۔ سلوویک کا صوبہ چیکوسلواکیہ کو دے دیا گیا۔
۳۔ ٹرانسلوانیہ کا علاقہ رومانیہ کے حوالے کیا گیا۔
۴۔ کروشیا کا علاقہ یوگوسلاویہ کے حوالے کر دیا گیا۔
۵۔ بنٹ کا علاقہ رومانیہ اور یوگوسلاویہ کے درمیان تقسیم ہوا۔
۶۔ ہنگری کی فوجی قوت کو ۳۵ ہزار افراد تک محدود کر دیا گیا۔

بقول گرانٹ اور ٹمپرلے: GRANT & TEMPERLY

"اس معاہدے نے شمالی علاقے سے مگیار اور سلوویک کو علیحدہ کر کے اسے چیکوسلواکیہ کے حوالے کر دیا۔ اس کی رو سے اہل رومانیہ اور مگیار اس سے علیحدہ کر کے جنوب میں یوگوسلاویہ کو دے دیئے گئے۔ اس معاہدے کی رو سے ہنگری کی آبادی ۷۵ لاکھ رہ گئی۔ ان میں ۶۰ لاکھ سے زائد مگیار تھے۔ اس لئے ہنگری مجموعی طور پر تقریباً ۳۰ لاکھ مگیار آبادی سے محروم ہو گیا۔ چیکوسلواکیہ، رومانیہ اور یوگوسلاویہ نے ہنگری

سے نہ صرف اپنی نسل کے باشندے لے لئے بلکہ اس کے علاوہ ۳۰ لاکھ مگیار باشندے بھی لے لئے ان میں سے ۵ لاکھ یوگوسلادیہ کو ۱۰ لاکھ چیکوسلواکیہ کو اور پندرہ لاکھ رومانیہ کو ملے"۔

یہ بات ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ جنگ سے قبل ہنگری کی نصف آبادی غیر ملکی باشندوں پر مشتمل تھی اور چیکوسلواکیہ رومانیہ اور یوگوسلادیہ کی آبادی نسلی اعتبار سے تقسیم کی گئی تھی۔ ۱۹۱۴ء سے قبل ان ملکوں میں ایسی صورتِ حال نہ تھی۔

۹۔ معاہدۂ سیورس

TREATY OF SEVRES

یہ معاہدہ ۱۰ اگست ۱۹۲۰ء کو ترکی اور اتحادیوں کے مابین ہوا۔

معاہدے کی اہم شرائط:

۱۔ سلطان اتحادیوں کی حمایت کے ساتھ قسطنطنیہ میں حکومت کرے گا۔

۲۔ اتحادیوں کو یہ حق ہوگا کہ آبناؤں پر قبضہ کر لیں اور یہ بھی کہ ایشیائی ترکی کے کسی حصے پر قابض ہو جائیں۔

۳۔ آرمینیا جمہوریہ قائم کی جائے گی اس میں مشرقی اناطولیہ۔ ارض روم۔ دان بتلس۔ ترابزون۔ ارزنجان کے صوبے شامل ہوں گے اور اس عیسائی ریاست کی حدود کا تعین امریکہ کی مدد سے کیا جائے گا۔

۴۔ شام پر فرانس کا انتداب، عراق اور اردن پر برطانیہ کا، عدلیہ پر اٹلی کا سمرنا اور مغربی اناطولیہ پر یونان کا انتداب قائم کیا جائے گا۔

۵۔ ترکی کو تمام عرب مقبوضات سے محروم کر دیا جائے گا۔

۶۔ حجاز کی عرب ریاست کو آزادی دے کر برطانیہ کی تحویل میں دیا جائے گا۔

۷۔ مشرقی تھریس پورا اور مغربی تھریس کا کچھ علاقہ یونان کو دیا جائے گا۔

۸۔ سمرنا کا ضلع، امبروس گیلی پولی ایڈریا اور ٹینی ڈوس کے جزائر بھی یونان کو دیئے

جائیں گے۔

۹۔ جنوبی اناطولیہ، ڈوڈی کانیس کے جزائر بشمول رہوڈز اٹلی کے سپرد کئے جائیں گے۔

۱۰۔ درہ دانیال اور باسفورس کو بین الاقوامی تحویل میں دیا جائے گا۔

۱۱۔ دریائے فرات کے مشرقی کرُد علاقے پر مقامی خود مختاری کو تسلیم کیا جائے گا علاوہ ازیں ترکی کو ایرانی اور کرُد سرحدوں کی تبدیلی پر مجبور کیا گیا۔

۱۲۔ ترکی صرف ۵۰ ہزار تک فوج رکھ سکے گا۔ لازمی فوجی تربیت ختم کر دی جائے گی۔ اسلحہ کی تعداد پر بھی پابندی لگائی گئی۔

۱۳۔ ترکی پر تاوانِ جنگ کا بار بھی ڈالا گیا۔

۱۴۔ برطانیہ، فرانس اور اٹلی پر مشتمل ایک مالیاتی کمیشن مقرر کیا جائے گا۔ جس کا مقصد ترکی کا بجٹ، عوامی قرضوں، کرنسی، کسٹم، مراعات بالواسطہ اور بلاواسطہ ٹیکسوں پر کنٹرول اور نگرانی ہوگا۔

۱۵۔ اتحادیوں کے نمائندوں پر مشتمل ایک کمیشن مقرر کیا جائے گا۔ جس کا کام ان شرائط کی نگرانی کرنا ہوگا۔

نتیجہ:

اس ذلیل اور متعصبانہ صلح نامے کے خلاف مسلمانانِ عالم نے نفرت اور غصے کا اظہار کیا حتیٰ کہ ترکی کی حکومت بھی احتجاج کئے بغیر نہ رہ سکی۔ جو اتحادیوں کی توپوں اور بندوقوں کے حصار میں لاچارگی کے ساتھ ترکی اور اسلامی روایات کو بدنام کر رہی تھی اس معاہدے کے ردِعمل میں مصطفےٰ کمال پاشا کی قیادت ابھر کر سامنے آئی۔

۱۰۔ معاہدہ لوزان

TREATY OF LAUSANNE

اتحادیوں نے ترکوں کے خلاف جنگ صلیبی جوش و جذبے کے تحت کی تھی۔ عارضی صلح کے بعد پہلی مرتبہ فرانسیسی فوجیں ۸ فروری ۱۹۲۰ء کو قسطنطنیہ میں داخل

ہوئیں اور ان کے کمانڈر نے سفید گھوڑے پر سوار ہو کر فاتحانہ جلوس کے ساتھ قسطنطنیہ کی شاہراہوں پر گشت کیا۔ غدار عیسائی آبادی نے خوشی میں تالیاں بجائیں اور ترکوں کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ بعض مؤرخین کا بیان ہے کہ محمد فاتح بھی جب قسطنطنیہ میں فاتحانہ داخل ہوا تھا (۲۹ مئی ۱۴۵۳ء) تو سفید ہی گھوڑے پر سوار تھا۔ فرانسیسی کمانڈر نے اتحادیوں کی اس فتح کو محمد فاتح کی فتح قسطنطنیہ کے انتقام کی حیثیت سے نمایاں کرنے کے لئے اس موقع پر اپنی سواری کے لئے سفید گھوڑا ضروری سمجھا۔ اس اندوہناک منظر کو دیکھنے والوں میں خود مصطفےٰ کمال پاشا بھی شامل تھے۔ ان کے دل پر اس کا گہرا اثر ہوا۔

معاہدہ سیورس جو ۱۰ اگست ۱۹۲۰ء کو ہوا تھا۔ اس میں ترک قوم کے ساتھ بڑا توہین آمیز سلوک کیا گیا۔ اس سے مصطفےٰ کمال پاشا کی سربراہی میں قومی قیادت کے لئے راہ ہموار ہوئی۔ ۱۹۲۱ء میں یونانی دشمن سمرنا پر قبضہ کر کے اناطولیہ اور تھریس میں داخل ہو گئے تھے اور مظلوم ترک ان کے مظالم برداشت کر رہے تھے عصمت انونو اور فوزی پاشا نے صورت حال کی نزاکت کا اندازہ کر کے باقاعدہ فوج کی تنظیم شروع کر دی یہ ایک عظیم اقدام تھا۔

اس کے ساتھ ہی کمال پاشا نے فرانس، اٹلی اور روس سے گفت و شنید شروع کر دی۔ اس طرح برطانیہ اکیلا رہ گیا۔ روس اور مغربی یورپ کے درمیان اعتقادی اختلافات پیدا ہو گئے تھے اور اب اتحادی روس میں بالشویک انقلاب کے خلاف جنگ کی سازشوں میں مصروف تھے۔ ترکوں نے اناطولیہ میں کچھ مراعات دے کر فرانس کو سائی لیسیا سے فوجیں ہٹانے پر رضامند کر لیا۔ ہر بکلی کی نو آبادیات میں ترکوں نے اٹلی کو اقتصادی مراعات دیں اور اس کے لئے بعض مفاد منظور کئے اس کے عوض اٹلی نے عدلیہ اور جنوبی و مغربی اناطولیہ سے اپنی فوجیں واپس بلائیں روس اور ترکی کے مابین ماسکو میں مارچ ۱۹۲۱ء کو ایک معاہدے پر دستخط ہوئے۔ اس کی رو سے روس نے فارص اور اردھان کے علاقے ترکوں کو واپس کئے اور ترکوں کو قومی فوج کے لئے اسلحہ اور سامانِ جنگ دینے کا وعدہ کیا اس سے مصطفےٰ کمال پاشا کا وقار بہت بڑھ گیا اور عملاً ان کی حکومت بین الاقوامی طور پر تسلیم ہو گئی۔ نئی ترک حکومت نے

روس سے روپیہ حاصل کیا فرانس اور اٹلی سے اسلحہ خریدا اور یونانیوں کو اگست ۱۹۲۱ء میں ایک سخت شکست دی وہ بھاگ کر سمرنا پہنچ گئے اور ابھی تھریس پر ان کا قبضہ تھا۔ برطانوی فوجیں قسطنطنیہ اور آبناؤں میں مقیم تھیں۔ برطانیہ سے جنگ کے بجائے ۲۹ ستمبر ۱۹۲۲ء کو مدانیہ میں "معاہدہ التوائے جنگ" پر دستخط کئے اس معاہدے کی رو سے برطانیہ نے یہ اپنے ذمے لیا کہ تھریس میں یونانیوں کو غیر مسلح کرے گا اور وطن واپس بھیج دے گا۔ مگر قسطنطنیہ اور آبناؤں میں معاہدہ لوزان ۲۴ جولائی ۱۹۲۳ء تک برطانوی فوج مقیم رہی۔

جب یونانی ترکوں کے مقابلے میں پسپا ہونے لگے تو قوی اندیشہ پیدا ہو گیا تھا کہ برطانیہ بھی اس جنگ میں شریک ہو جائے گا لیکن برطانوی عوام نئی جنگ میں مبتلا ہونے کے لئے تیار نہ تھے۔ مقدمہ کراچی (تحریک خلافت کے سلسلے میں خالق دینا حال کا مقدمہ ۱۹۲۱ء) کے بعد ہندوستانیوں نے بھی برطانیہ سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ اب ہم ترکوں کے مقابلے میں ہرگز نہیں لڑیں گے۔ ہر طرف سے مایوس ہو کر لائیڈ جارج نے برطانوی نوآبادیات سے اپیل کی کہ وہ یونانیوں کی حمایت کریں۔ مگر یہ اپیل رائیگاں گئی۔ ترکوں نے یونانیوں کو سمندر میں دھکیل دیا۔ بالکل لاچار ہو کر انگریزوں نے ۲۱ نومبر ۱۹۲۲ء کو لوزان میں صلح کانفرنس منعقد کی۔

اس میں برطانیہ، فرانس، اٹلی اور قوم پرست ترک شریک ہوئے۔ ابتداء میں روس شریک نہ تھا لیکن قسطنطنیہ اور آبناؤں کے مستقبل کی بحث میں اس کو بھی شریک کر لیا گیا کئی ماہ یہ صلح کانفرنس جاری رہی۔ ترک وزیر خارجہ عصمت پاشا نے ترکی کے مقاصد کی بڑی قوت اور قابلیت سے حفاظت کی۔ میدان جنگ میں وہ جیسے اچھے جنرل تھے ویسے ہی صلح کانفرنس میں اچھے وکیل اور سفارتکار ثابت ہوئے۔ معاہدہ لوزان پر ۲۴ جولائی ۱۹۲۳ء کو دستخط ہوئے۔

معاہدہ کی اہم شرائط:

۱۔ میسوپوٹامیہ (موجودہ عراق اور اردن) اور فلسطین کے علاقے برطانوی انتداب

یں دیئے گئے۔

۲- شام کو ترکی سے آزاد کر کے فرانس کی عارضی تحویل (انتداب) میں دیا گیا۔

۳- عرب علاقوں کو خودمختاری دے دی گئی۔

۴- یورپ میں ترکی کے تمام مقبوضات ماسوائے مشرقی تھریس اس سے واپس لے لئے گئے۔

۵- جزائر ڈاڈی کینز، روڈز اور کیسٹیلو ریزو اٹلی کو دیئے گئے۔

۶- بحیرۂ ایجین کے دوسرے جزائر یونان کو دیئے گئے۔

۷- لیبیا، مصر اور سوڈان کی سیاست و حکومت سے ترکی دست بردار ہو گیا۔

۸- قبرص کا علاقہ برطانیہ کو دیا گیا۔

۹- ترک اقلیتوں کی حفاظت کی جائے گی۔

۱۰- ترکی سے غیر ملکی عدالتیں ختم کر دی گئیں۔

۱۱- ترکی پر تاوانِ جنگ کا بوجھ نہیں ڈالا گیا۔

۱۲- ترک افواج پر کوئی پابندی نہیں لگائی گئی۔

۱۳- درہ دانیال، بحیرۂ مارمورہ اور باسفورس تمام اقوام کے لئے کھول دیئے گئے اور ان کا انتظام مجلس اقوام کے سپرد کیا گیا۔

۱۴- آبناؤں کے ساحل غیر مسلح کر دیئے گئے مگر ان پر اقتدار ترکی ہی کا رہا۔

۱۵- یہ بھی طے پایا کہ آرتھوڈوکس مذہب کے یونانیوں کا لازمی طور پر ترک مسلمانوں سے تبادلہ ہو گا۔

نتیجہ:

عثمانیہ سلطنت کا خاتمہ ہوا۔ ترکوں نے مصطفےٰ کمال پاشا کی قیادت میں ایک قومی خودمختار حکومت قائم کی۔ برطانوی وزیر خارجہ لارڈ کرزن نے اس معاہدہ پر امپیریل کانفرنس میں یوں اظہار خیال کیا۔ "جنگ عظیم کے بعد جتنے معاہدے ہوئے ان سب میں یہی صورت تھی کہ فاتحین نے سنگین کے زور سے جو شرائط چاہیں لکھوائیں۔ گویا وہ حکم اور فیصلے کی کرسی پر موجود تھے جبکہ مجرم موجود نہ ہوتا تھا۔ جو سزا اور فیصلہ ان کو پسند آتا تھا۔ ان کے حق میں تجویز کرتے تھے۔ جب شرائط لکھ لی جاتی تھیں اس وقت ہارے ہوئے

دشمن کو بلایا جاتا تھا کہ سزا یا مجرم کی طرح رسمی طور پر احتجاج کرے یہ وہ حالات تھے
جس میں اصل معاہدہ سیورس مرتب ہوا اور اس پر دستخط ہوئے اگرچہ ترک نمائندوں
نے کبھی اس کی توثیق نہیں کی۔ لوزاں میں جو کچھ ہوا وہ اس سے مختلف تھا۔ وہاں ترک
مساویانہ حیثیت سے میز پر بیٹھے تھے۔ ہر شق پر بحث ہوئی اور بحث کے بعد اس کی
تشریح سمجھائی گئی۔ اس طرح یہ سمجھوتہ ڈنڈے کے زور پر نہیں ہوا بلکہ بحث و مباحثے
سے سمجھا بجھا کر اور افہام و تفہیم سے ہوا۔"

باب ششم

بین الاقوامی تعلقات ۱۹۱۹ء تا ۱۹۳۹ء

INTERNATIONAL RELATIONS FROM 1919 TO 1939

اجتماعی تحفظ اور تخفیف اسلحہ

اجتماعی تحفظ

اجتماعی تحفظ سے مراد یہ نہیں ہے کہ چند ریاستیں آپس میں اتحاد کرکے حملہ آور ریاست کا مقابلہ کریں بلکہ اجتماعی تحفظ سے مراد یہ ہے کہ متعدد ریاستیں کسی ایک متفقہ اصول کے تحت ایک ایسا مضبوط اتحاد قائم کریں جس سے مستقل اور پائیدار امن کی ضمانت مل سکے۔

تعریفیں:

۱۔ ڈاکٹر جارج شوازان:۔

"یہ ایک مشترکہ طریقہ عمل ہے جس کے ذریعے مروجہ عالمی نظام کے تحت کسی ریاست کو اس نظام کی خلاف ورزی سے روکا جائے یا اس کی جارحیت کے خلاف کاروائی کی جائے۔

۲۔ پروفیسر قیونسی رائٹ:۔

"اجتماعی تحفظ کے نظریہ اور توازن طاقت کا باہمی تعلق تو ہے لیکن یہ ایک دوسرے سے کسی حد تک مختلف بھی ہیں۔ اجتماعی تحفظ کا مقصد ایک ایسی مساوات ہے۔ جس کے قائم ہو جانے سے کسی ریاست کو یہ ہمت ہی نہیں ہو سکتی کہ وہ دوسری ریاست کے خلاف جنگ چھیڑنے کا خطرہ مول لے۔"

توازن طاقت کے ذریعے اجتماعی تحفظ اتحاد وجوابی اتحاد سے ممکن ہوتا ہے

لیکن اس طریقہ کار میں باہمی دشمنیاں پنہاں ہوتی ہیں۔ جبکہ اجتماعی تحفظ کے نظریہ کے مطابق ریاستوں کا ایک ایسا اتحاد ہے جس میں کسی دوسرے اتحاد کے خلاف کسی قسم کی دشمنی کا کوئی پہلو نہ پایا جاتا بلکہ تمام ریاستیں ایک متفقہ اصول کو اپنے اوپر نافذ کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر اگر دنیا کی تمام مقتدر ریاستیں اپنے دستور میں صرف ایک جملے کا اضافہ کر لیں کہ "ہم انصاف کے لئے بین الاقوامی عدالت انصاف" سے رابطہ کریں گے تو یہ اصول "اجتماعی تحفظ کا اصول" ہوگا۔ اور اس سے دنیا کو جنگوں سے نجات مل جائے گی۔

اجتماعی تحفظ کے بنیادی اصول:

ماہرین سیاسیات و بین الاقوامی تعلقات اس بات پر متفق ہیں کہ عالمی امن کا قیام اجتماعی تحفظ کے اصول کو تسلیم کئے بغیر ممکن نہیں ہے۔ ماہرین بنیادی تحفظ کے اہم اصول حسب ذیل بتاتے ہیں۔

۱۔ اجتماعی تحفظ کے نظام میں شامل ریاستوں کی طرف سے مخصوص حد تک وعدہ یا معاہدہ پورا کرنے کی ضمانت دی جاتی ہے اگر رکن ریاستیں قومی قانون کی طرح اپنی ذمہ داری پوری نہ کریں تو بڑی طاقتیں انہیں ایسا کرنے سے منع کرتی ہیں۔

۲ اجتماعی تحفظ کے نظام میں شامل ریاستیں اس بات پر متفق ہوتی ہیں کہ وہ ملکی سالمیت و خود مختاری کو برقرار رکھنے اور اس کو مضبوط بنانے کے لئے ممکنہ حد تک قربانی دیں گی۔ کیونکہ ریاستوں کے اس عمل سے ہی قومی سلامتی و خود مختاری کا تحفظ ممکن ہے ورنہ بڑی طاقتوں میں "قوت کی حرص" کا اضافہ ہو جائے گا۔

۳۔ اجتماعی تحفظ کے نظام میں بڑی طاقتوں کا شامل ہونا ضروری ہے اور اسے نسبتی طور پر بین الاقوامی ہونے کا درجہ بھی حاصل رہتا ہے۔ بصورت دیگر ممبر ممالک اپنے مقاصد کے حصول کے لئے زیادہ سے زیادہ جدوجہد کریں گے اور اس سے "عالمی امن" کو گزند پہنچے گا۔

۴۔ اجتماعی تحفظ کے نظام کے لئے دو شرائط ضروری ہیں۔

(۱) اجتماعی تحفظ کا نظام ایک "کھلا نظام" ہو اور کسی مخصوص ریاست کے خلاف نہ ہو

(۱۱) بااثر دار اور عظیم ممالک کی رکنیت کا ہمیشہ خیر مقدم کیا جانا چاہیئے اور تمام رکن ممالک کو بیرونی حملہ کی صورت میں ممکنہ تعاون فراہم کیا جانا چاہیئے۔

۵۔ اجتماعی تحفظ کا نظام اور غیر جانبداری کا روائتی قانون دو مختلف چیزیں ہیں۔ "اجتماعی تحفظ کے نظام" کے اراکین غیر جانبداری کے روائتی قانون کے تحت بعض حقوق سے دستبردار ہو سکتے ہیں۔ صرف غیر رکن ممالک ہی روائتی غیر جانبداری کے مطالبہ کے مجاز ہوتے ہیں۔ تاہم قوانین جنگ نافذ کرنے والے ممالک و حملہ آوروں کے درمیان روبۂ عمل بنیادی اصولوں کا اوّلین مقصد صرف انسانیت کی بقاء ہے۔

ماہرین سیاسیات کا کہنا ہے کہ کوئی بھی "عالمی نظام تحفظ" جو ان اصولوں کے تحت عمل میں لایا جائے گا وہ بہرحال اجتماعی تحفظ کے نظام کے طور پر تسلیم کیا جائے گا۔

اجتماعی تحفظ کا نظام اور علاقائی انتظامات:

تحفظ کے علاقائی انتظامات کو بھی عالمی سطح کے اجتماعی تحفظ کے نظام کی ایک مقامی شکل سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ انتظامات محدود پیمانے پر ہوتے ہیں۔ مخصوص مقاصد کے حصول کے لئے کئے جاتے ہیں۔ اس وجہ سے یہ اتنے مضبوط اور طاقتور نہیں ہوتے کہ کسی بڑی طاقت یا طاقتوں کا تنہا مقابلہ کر سکیں۔ تاہم بعض علاقائی انتظامات کافی حد تک مضبوط بنیادوں پر تشکیل دیئے جاتے ہیں۔ دو عالمی جنگوں کے درمیان معاہدہ لوکارنو دسمبر ۱۹۲۵ء علاقائی انتظامات کی ایک اہم مثال ہے (تفصیل دیکھئے معاہدہ لوکارنو) موجودہ دور میں تنظیم معاہدہ شمالی اوقیانوس NATO اور معاہدہ وارسا WARSA PACT علاقائی انتظامات کے سلسلے کی اہم کڑیاں ہیں۔ علاقائی انتظامات کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اگر رکن ممالک مناسب اقدامات پر مؤثر عمل درآمد کریں تو یہ تنظیمیں کسی بھی خطرے کا بھرپور مقابلہ کرنے کی صلاحیت پیدا کر سکتی ہیں۔

انجمن اقوام متحدہ نے بھی بین الاقوامی علاقائی تنظیموں کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ انجمن کی کمیٹی برائے اجتماعی اقدامات نے ۱۹۵۱ء میں جنرل اسمبلی کو اپنی رپورٹ میں

یہ تجویز پیش کی۔ چونکہ علاقائی انتظامات کی تنظیمیں اقوام متحدہ کے "اجتماعی تحفظ کے نظام" میں اہم کردار ادا کر رہی ہیں۔ اس لئے اجتماعی تحفظ کے نظام کے ان دونوں طریقوں میں تعلقات قائم رہنے چاہئیں۔ یہ تنظیمیں اقوام متحدہ کا حصہ نہیں ہیں۔ بلکہ یہ اپنی الگ حیثیت رکھتی ہیں۔ اقوام متحدہ پر چند بڑی طاقتوں (ویٹو پاورز) کی اجارہ داری ہے اس وجہ سے لوگ زیادہ تر علاقائی انتظامات پر بھروسہ کرنے لگے ہیں۔

آج کا بین الاقوامی معاشرہ ایک اکائی کے بجائے مختلف بلاکوں Blocks میں تقسیم ہے اس وجہ سے بھی علاقائی انتظامات پر زیادہ توجہ دی جا رہی ہے تاہم یہ علاقائی تنظیمیں اپنے آپ کو نظریاتی طور پر ایک کل کا جزو سمجھتی ہیں۔

اجتماعی تحفظ کا نظام اور تخفیف اسلحہ :

جس طرح جنگ کے لئے اسلحہ ضروری ہے اس طرح امن و امان برقرار رکھنے کے لئے اسلحہ ضروری ہے۔ تاریخ بین الاقوامی تعلقات کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ماضی میں عالمی جنگوں میں تباہ کن اور خطرناک اسلحہ کے استعمال کی وجہ سے کروڑوں انسانی جانیں ضائع ہوئیں اور کھربوں ڈالر کا نقصان ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ اجتماعی تحفظ کے سلسلے میں سب سے زیادہ زور تخفیف اسلحہ پر دیا جاتا ہے۔ دو عالمی جنگوں کے درمیان تخفیف اسلحہ کے لئے مندرجہ ذیل اقدامات کئے گئے۔

(i) واشنگٹن کانفرنس دسمبر ۱۹۲۲ء
(ii) جنیوا کانفرنس جون ۱۹۲۷ء
(iii) لندن کانفرنس اپریل ۱۹۳۰ء
(iv) تخفیف اسلحہ کی عالمی کانفرنس فروری ۱۹۳۲ء
(v) چار طاقتی معاہدہ جون ۱۹۳۲ء

تخفیف اسلحہ کے سلسلے میں ان تمام اقدامات کا مقصد اجتماعی تحفظ کو فروغ دینا تھا۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد مسلح جارحیت کا مقابلہ کرنے کے لئے "اجتماعی تحفظ کے نظام" کو از سر نو منظم کیا گیا۔ جنگ کے بعد دنیا نظریاتی طور دو بلاکوں میں تقسیم ہو گئی۔ یہ دونوں بلاک ایک دوسرے سے سبقت لینے کی کوششیں کرنے لگے۔

آج پہلے سے کئی ہزار بلکہ لاکھ گنا زیادہ طاقتور بم ہی نہیں بلکہ ایٹمی قوت سے چلنے والے میزائل بھی ایجاد ہو چکے ہیں۔ امن و سلامتی کے لئے اسلحہ کی اس دوڑ پر کنٹرول کرنا بہت ضروری ہے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی بھی تخفیف اسلحہ پر مسلسل زور دے رہی ہے۔ بعض ماہرین کا خیال ہے کہ تخفیف اسلحہ اور اجتماعی تحفظ کے نظام کا آپس میں کوئی تعلق نہیں ہے۔ تاہم میرے خیال میں یہ ایسی ہی رائے یا خیال ہے کہ اسلحہ کی دہشت جنگ کو روکنے کے لئے ضروری ہے۔ ۱۹۵۲ء میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے امریکی نمائندے مسٹر بیوریاسم دی کوہن نے کہا۔

"میں یہ حقیقت واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اجتماعی تحفظ کے پروگرام اور تخفیف اسلحہ کے پروگرام میں قریبی تعلق ہے۔ یہ دونوں نظام قدم ملا کر چلتے ہیں۔ تخفیف اسلحہ کے نظام کے تحت ہم یہ دیکھتے ہیں۔ کہ کسی ریاست کے پاس اتنے ہتھیار اور فوجی قوت جمع نہ ہو جائے جس سے پڑوسی ریاست کی سالمیت کو خطرہ لاحق ہو جائے۔ جبکہ اجتماعی تحفظ میں اس نقطہ نظر پر توجہ دی جاتی ہے کہ کوئی ریاست اپنی سالمیت کے تحفظ کے لئے زیادہ سے زیادہ بھروسہ اپنی ملکی قوت پر ہی نہ کرے بلکہ وہ اقوام متحدہ کو بھی اپنا مددگار اور محافظ سمجھے اور یہ کہ اگر کسی ریاست کی طرف سے حملہ کیا گیا تو اس بات کی قوی امید ہو کہ اجتماعی تحفظ کے تحت اقوام متحدہ جارحیت پسند قوت کو شکست دے گی اس طرح اگر ریاستوں کو یقین ہو جائے کہ کسی بیرونی حملہ کی صورت میں انہیں تنہا اس جارحیت کا مقابلہ نہیں کرنا پڑے گا تو وہ لازمی طور پر اپنے دفاع کے لئے کم سے کم خطرناک ہتھیاروں کی ضرورت کو محسوس کرے گی اس طرح فطری طور پر خود بخود تخفیف اسلحہ پر عمل درآمد شروع ہو جائے گا اور اجتماعی تحفظ کا نظام آسان ہوتا جائے گا۔ اس طرح ان دونوں نظاموں تخفیف اسلحہ اور اجتماعی تحفظ کے ذریعے امن بحال کیا اور برقرار رکھا جا سکتا ہے۔ ان دونوں نظاموں کے درمیان قریبی تعلق ہونے کی وجہ سے دونوں نظام عمل میں آئے ہیں

پر توجہ کرنا بہر حال جنرل اسمبلی کا فرض ہے۔

اقوام متحدہ کی کارکردگی کو مدنظر رکھتے ہوئے اقوام کا اعتماد اس سے اٹھ گیا ہے اور تقریباً تمام اقوام بلاک سیاست کو بنیاد بنا کر بین الاقوامی علاقائی تنظیموں سے گہری دلچسپی لے رہی ہیں۔ تخفیف اسلحہ کا خواب بھی شرمندہ تعبیر ہوتا ہوا نظر نہیں آ رہا۔

تخفیفِ اسلحہ

جنگ عظیم اوّل ۱۹۱۴-۱۹۱۹ء میں پہلی دفعہ بھاری اور تباہ کن اسلحے کا استعمال ہوا۔ جس کی وجہ سے اتنی تباہی مچی کہ تاریخ میں اس کی مثال ڈھونڈنا مشکل تھی۔ تباہی میں سب سے زیادہ موثر کردار تباہ کن اسلحے کا تھا۔ حالات نے یہ ثابت کر دیا کہ جس طرح جنگ کے لیے اسلحہ ضروری ہے اس طرح امن و امان برقرار رکھنے کے لیے تخفیف اسلحہ بھی ضروری ہے۔ چنانچہ تخفیف اسلحہ کے لیے انجمن اقوام کے اندر اور باہر بے شمار کوششیں کی گئیں۔ جو کسی حد تک تو بار آور ثابت ہو گئیں البتہ مجموعی طور پر ناکام رہیں۔ یہاں پر ان کوششوں کا علیحدہ علیحدہ ذکر کیا جا رہا ہے۔

۔ واشنگٹن کانفرنس	دسمبر ۱۹۲۱ء
جنیوا کانفرنس	جون ۱۹۲۷ء
لندن کانفرنس	اپریل ۱۹۳۰ء
تخفیف اسلحہ کی عالمی کانفرنس	فروری ۱۹۳۲ء
چار طاقتی معاہدہ	جون ۱۹۳۲ء

واشنگٹن کانفرنس دسمبر ۱۹۲۱ء

پہلی عالمی جنگ کے بعد جاپان مشرق بعید کی سب سے بڑی اور دنیا کی تیسری بڑی طاقت بن گیا۔ کیونکہ پیرس امن کانفرنس جون ۱۹۱۹ء کے تحت جرمنی کے دو جزیرے مارشل آئی لینڈ اور شن جنگ کے علاوہ چین کا کچھ علاقہ جو کیو چاؤ کے نام سے [illegible] بھی جاپان کے قبضے میں آیا۔ نیز جنگ میں جرمنی اور روس کے

بحری بیڑے بھی تباہ ہو گئے تھے۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ پہلی عالمی جنگ کے دوران امریکی پالیسی کے تحت جاپان کو بڑی مقدار میں اسلحہ فراہم کیا گیا۔ تاکہ امریکہ چین کے خلاف اپنے عزائم پورے کر سکے۔

جاپان ان حالات میں اپنے توسیع پسندانہ عزائم کی تکمیل چاہ رہا تھا۔ جاپان کی میچوریا پر نظر بس ۱۸۹۴-۹۵ء سے لگی ہوئی تھیں۔ لیکن ان حالات کا علم جب امریکہ کو ہوا۔ تو اُسے سخت تشویش ہوئی۔

چنانچہ امریکہ کی طرف سے تخفیف اسلحہ کی واشنگٹن کانفرنس بلائی گئی۔ بڑی بڑی طاقتوں برطانیہ، جاپان، فرانس اور اٹلی کے علاوہ بحرالکاہل میں علاقائی مفادات رکھنے والے ممالک چین، پولینڈ، پرتگال اور بلجیم کو بھی شرکت کی دعوت دی گئی۔

کانفرنس کی کارکردگی

اس کانفرنس میں تین صلح ناموں پر دستخط ہوئے۔

۱۔ چار طاقتی صلح نامہ ۲۔ پانچ طاقتی صلح نامہ ۳۔ نو طاقتی صلح نامہ۔

چار طاقتی صلح نامہ: اس معاہدے پر ۱۲ دسمبر ۱۹۲۱ء کو دستخط ہوئے۔

اس معاہدے میں امریکہ برطانیہ، فرانس اور جاپان شامل تھے۔ اس میں یہ طے پایا کہ آپس کے تمام اختلافات باہمی صلاح مشورے سے حل کیے جائیں گے۔ خاص کر بحرالکاہل کے مقبوضہ جزیروں کے سلسلے میں اور دوسری طاقتوں کی طرف سے جارحانہ اقدامات کی روک تھام کے لیے۔

پانچ طاقتی صلح نامہ

اس معاہدے کا تعلق خاص طور پر تخفیف اسلحہ سے تھا اس میں ۳:۵:۵ کا فارمولا طے پایا گیا۔

اس کی تشریح یہ ہے۔ کہ امریکہ اور برطانیہ میں برابری جاپان کو ان کا ۶۰ فیصد اور اٹلی و فرانس کو ۳۵ فیصد حصہ ملے گا۔

اس معاہدے میں یہ بھی طے پایا کہ چھوٹے جہازوں تباہ کار جہازوں اور آب دوزوں پر اس فارمولے کا اطلاق نہیں ہوگا۔

نوطاقتی معاہدہ: اس معاہدہ پر ۴ر فروری ۱۹۲۲ء کو دستخط ہوئے۔

واشنگٹن کانفرنس کے اس معاہدے میں برطانیہ، امریکہ، فرانس، جاپان، اٹلی پولینڈ، بلجیم، پرتگال اور چین شامل تھے۔ ان تمام ممالک نے اس معاہدے کی رُو سے یہ اعلان کیا کہ ہم سب چین کی قومی سلامتی اور خود مختاری کا احترام کریں گے۔ اور اس کے موجودہ حالات سے فائدہ نہیں اٹھائیں۔ جاپان نے کیوچاؤ کا وہ چینی علاقہ بھی واپس کردیا جو اسے معاہدۂ ورسیلز کے تحت ملا تھا۔ اور منچوریا پر قبضہ کرنے کا ارادہ (عارضی) بھی ترک کردیا۔

واشنگٹن کانفرنس پر ایک تبصرہ

تخفیف اسلحہ کے سلسلے میں یہ پہلی اور کامیاب کانفرنس تھی۔ جس سے وقتی طور پر بحرالکاہل کے علاقے میں جنگ سے پہلے والا توازن بحال ہوگیا۔ امریکہ اور برطانیہ کو جاپانی طاقت کی برتری کا جو احساس پیدا ہوگیا تھا، وہ دور ہو گیا۔ مزید یہ کہ جاپان جو امریکہ اور برطانیہ کے مقابلے میں ۷۰ فیصد اسلحہ کا مطالبہ کررہا تھا۔ وہ ۳:۵:۵ کے فارمولے پر ۶۰ فیصد لینے پر رضامند ہوگیا۔

اس کانفرنس کی بدولت جاپان کے وقار کو ضرور ٹھیس پہنچی۔ اور وہ اپنے فی الحال منچوریہ والے عزائم پورے نہیں کرسکا۔ کیونکہ نوطاقتی معاہدے کے تحت جاپان اور دیگر شریک ممالک پر یہ پابندی لگادی گئی تھی کہ وہ چین کی قومی سلامتی کا احترام کریں۔ یہاں یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ جب عالمی معاشی بحران ۳۱-۱۹۲۹ء نے دنیا کو اپنی لپیٹ میں لیا، تو جاپان بھی اس سے

نہ بچ سکا۔ امریکہ اور چین نے جاپان سے ریشم کی درآمد بند کر دی. جاپان ۳ بلین ڈالر کا مقروض ہو گیا۔ ایسے حالات میں جاپان کے لیے منچوریا کی قدر قیمت اور بڑھ گئی۔ اس وقت دوسری اقوام بھی عالمی مسائل میں مصروف تھیں جیسے مسئلہ تاوان، معاشی بحران، تخفیف اسلحہ اور آباد کاری وغیرہ وغیرہ۔

چین میں بھی خانہ جنگی جاری تھی۔ تو جاپان کو اپنے عزائم دوبارہ یاد آگئے جن کو وہ واشنگٹن کانفرنس میں بھول گیا تھا۔ جاپان نے حالات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے منچوریا پر ستمبر ۱۹۳۱ء کو حملہ کر دیا۔ اور جنوری ۱۹۳۲ء کو یہ قبضہ مکمل ہو گیا۔

جنیوا کانفرنس جون ۱۹۲۷ء

اس کانفرنس کی تجویز امریکی حکومت کی طرف سے پیش کی گئی کہ واشنگٹن کانفرنس ۲۲-۱۹۲۱ء کے تمام دستخط نگاروں کو جمع کیا جائے۔ اور واشنگٹن کانفرنس کے "معاہدہ پانچ طاقتی" جس میں تخفیف اسلحہ کے لیے ۳ : ۵ : ۵ کا فارمولا پیش کیا گیا تھا۔ اس کو عملی شکل دی جائے۔

اس صورت احوال کے مدِنظر فرانس اور اٹلی نے اس کانفرنس میں شرکت کرنے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ اس طرح انھیں امریکہ اور برطانیہ کے مقابلے میں ۳۵ فیصد اسلحہ رکھنے کی اجازت ہوتی تھی۔ مزید یہ کہ فرانس تخفیف اسلحہ کو علیحدہ موضوع بحث نہیں بنانا چاہتا تھا جس کی وجہ سے اس کانفرنس میں صرف ۳ طاقتیں امریکہ، برطانیہ اور جاپان شریک ہوئیں۔

کانفرنس کی کارکردگی

اس کانفرنس میں امریکہ کی طرف سے یہ تجویز پیش کی گئی کہ تباہ کار جہازوں

آبدوزوں اور گشتی جہازوں پر بھی ۳ : ۵ : ۵ کا واشنگٹن کانفرنس والا تناسب لاگو کیا جائے۔ جو برطانیہ کے لیے کسی صورت میں بھی قابلِ قبول نہ تھا۔ کیونکہ اُسے اپنی نوآبادیات کے کنٹرول کے لیے چھوٹے جہازوں کی زیادہ ضرورت تھی۔ اس صورتِ حال کے مدِّ نظر برطانیہ نے یہ مؤقف اختیار کیا کہ جہازوں کو وزن اور توپوں کے قطر کے لحاظ سے دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ بڑے جہازوں پر واشنگٹن تناسب اور چھوٹے جہازوں کے سلسلے میں آزادی یا پھر ہلکی پابندی لگائی جانی چاہیے۔

برطانیہ کے اس مؤقف کی بدولت امریکہ کو "برابری کی تخفیف کا اصول" خطرے میں نظر آنے لگا۔ ان حالات میں جاپان نے درمیانی راہ نکالی۔ اور دونوں طاقتوں کی رضامندی پر اپنی قبولیت کا اظہار کیا۔

تبصرہ

جینوا کانفرنس تخفیف اسلحہ کے سلسلے میں دوسری کوشش تھی جو بالکل ناکام ثابت ہوئی۔ اس میں واشنگٹن کانفرنس کے تمام ممبران کا شامل ہونا تو بڑی بات تھی۔ لیکن اس پر وہ چار طاقتیں (امریکہ، برطانیہ، فرانس اور جاپان) بھی متفق نہ ہو سکیں جنھوں نے واشنگٹن کانفرنس میں چار طاقتی معاہدے کے تحت باہمی مسائل گفت و شنید کے ذریعے طے کرنا قرار پایا تھا۔

اور پھر مزے کی بات تو یہ ہے کہ جو تین طاقتیں اس کانفرنس میں شامل ہوئیں ان میں بھی اتفاق رائے نہ پایا گیا اور باہمی اختلافات کی وجہ سے تخفیف اسلحہ کے سلسلے میں ایک تعطل سا پیدا ہو گیا۔

اُنھی دنوں امریکی کانگریس نے ۲۷۴ ملین ڈالر کا بجٹ اسلحہ سازی کے لیے پاس کر دیا۔ جس سے ایک ائیر کرافٹ کیریر اور ۵ اگشتی جہاز تیار کیے جا سکتے تھے۔

ستمبر ۱۹۲۸ء کو امریکی اخبار نے ایک خبر چھاپی کہ برطانیہ اور فرانس نے آپس میں ایک خفیہ معاہدہ کیا ہے۔ جس کے تحت فرانس تخفیف اسلحہ کو ایک موضوع بنا کر گفت و شنید نہیں کرے گا اور واشنگٹن تناسب سے بھی انحراف کرے گا۔ یہ بات کسی حد تک لندن کانفرنس اپریل ۱۹۳۰ء میں صحیح ثابت ہوئی۔ جس کا ذکر آگے کیا جا رہا ہے۔

لندن کانفرنس اپریل ۱۹۳۰ء

لندن کانفرنس برطانوی وزیراعظم میکڈونیلڈ اور امریکی صدر ہربرٹ کی کوششوں کا نتیجہ تھی۔ اس کانفرنس کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں برطانیہ امریکہ اور جاپان کے علاوہ اٹلی اور فرانس بھی شامل ہوئے۔ اس کانفرنس کا تعلق خاص طور پر بحریہ کے تخفیف اسلحہ سے تھا۔

کارکردگی

اس کانفرنس کو کامیاب بنانے کے لیے برطانیہ نے اپنی پالیسی میں تبدیلی کی اور اپنے گشتی جہازوں کی تعداد ۷۰ سے کم کرکے ۵۰ کرنے پر رضامند ہو گیا۔ لیکن اب برطانیہ والا مؤقف (برطانیہ نے جنیوا کانفرنس میں یہ مؤقف اختیار کیا تھا کہ مجھے اپنی نوآبادیات کے لیے زیادہ گشتی جہازوں کی ضرورت ہے) فرانس کی طرف سے اختیار کیا گیا۔

ان حالات کے دیکھا دیکھی اٹلی نے بھی فرانس کی برابری کا مطالبہ کر دیا اور جاپان نے پہلی دفعہ ان پابندیوں کا ذکر کیا جو اس پر واشنگٹن کانفرنس کے نو طاقتی معاہدے کے تحت لگا دی گئیں تھیں۔

اب جاپان نے بھی امریکہ اور برطانیہ کے مساوی تناسب کا مطالبہ کر دیا تھا۔

اس کانفرنس میں باہمی اختلاف بڑے عروج پر پہنچ گئے۔ جاپان امریکہ اور برطانیہ کے سمجھانے پر واشنگٹن تناسب پر رضامند ہو گیا البتہ اُسے کچھ مراعات دینی پڑیں۔ جیسے آبدوزوں میں برابری اور تباہ کار جہازوں کا ۷ فیصد حصہ وغیرہ وغیرہ۔

اس کانفرنس میں فرانس کا اختلاف اٹل ثابت ہوا۔ اور نجی طور پر تخفیف اسلحہ کی کانفرنسیں ہونی بالکل بند ہو گئیں۔ اس کے بعد ہم لیگ آف نیشنز کی اُس کارکردگی کا جائزہ لیتے ہیں، جو اُس نے تخفیف اسلحہ کے سلسلے میں سرانجام دی۔

تخفیف اسلحہ اور انجمن اقوام

۱۰ جنوری ۱۹۲۰ء کو معاہدہ ورسیلز کی توثیق کے وقت انجمن اقوام کا قیام عمل میں آیا۔ بلاشبہ اس کا سب سے اہم کام امن وسلامتی کے لیے بین الاقوامی اتحاد پیدا کرنا تمام ایسے اقدامات کی فکری وعملی نفی کرنا جو اقوام کے درمیان تصادم کا باعث بنیں۔ جارحیت کی روک تھام کے لیے سب سے ضروری یہ تھا۔ کہ تخفیف اسلحہ کے سلسلے میں جامع کارروائی کی جائے۔ پہلی عالمی جنگ نے یہ ثابت کر دیا تھا۔ کہ انسانیت کو تباہی سے بچانے کا سب سے مؤثر حل تخفیف اسلحہ کا عمل ہے۔

پیرس کانفرنس جون ۱۹۱۹ء میں جرمنی پر صرف اسلحہ سازی کے سلسلے میں پابندی ہی نہیں لگائی گئی بلکہ اسلحہ رکھنے کی حدیں بھی مقرر کر دی گئیں۔ جن کا ذکر ہم پیچھے کر چکے ہیں۔

لیگ نے اپنے قیام کے تقریباً نو ماہ بعد نومبر ۱۹۲۰ء کو تخفیف اسلحہ کے سلسلے میں ایک کمیٹی قائم کی جس کا کام صرف یہ تھا کہ مختلف ممالک سے

تخفیف اسلحہ کے بارے میں رائے معلوم کی جائے۔

اس کمیٹی نے صرف رائے معلوم کرنے میں ۵ سال صرف کر دیے۔ جس سے اس کی سست روی کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ اس نے دوسرے ممالک سے جو رائے لی اس کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

بجٹ میں فوجی مصارف کم کیے جائیں اور بجٹ کی باقاعدہ اشاعت کی جائے۔

فوجی بھرتی بند کر دی جائے۔

ایسے کیمیکل پر پابندی لگائی جائے جن کے استعمال سے وبا وغیرہ پھیلنے کا خطرہ ہوتا ہے۔

جہازوں کی تخفیف کے بارے میں مختلف رائے تھی۔ بعض توپوں کے قطر کے لحاظ سے کوئی وزن کے لحاظ سے اور کچھ مجموعی طور پر جہازوں کی تخفیف چاہتے تھے۔

تخفیف اسلحہ کے لیے مستقل کمیشن قائم کیا جائے۔

تخفیف اسلحہ کے لیے عالمی کانفرنس بلانے کی راہ ہموار کی جائے۔

بالآخر دسمبر ۱۹۲۵ء کو "انعرادی کمیشن" کا قیام عمل میں آیا۔ جس میں امریکہ روس اور جرمنی کا نام سرفہرست تھا۔ اس کے کئی اجلاس ہوئے۔ آخر کار یہ کمیشن تخفیف اسلحہ کی عالمی کانفرنس بلانے میں کامیاب ہوگیا۔

عالمی کانفرنس برائے تخفیف اسلحہ

یہ کانفرنس فروری ۱۹۳۲ء کو جنیوا میں ہوئی۔ کل اکسٹھ[61] ممالک نے شرکت کی۔ کانفرنس کی صدارت برطانوی وزیر خارجہ ہنڈرسن کو سونپی گئی۔ لیکن افسوس! کہ کانفرنس کے اجلاس سے پہلے ہی برطانیہ میں پارلیمنٹ کے

انتخابات ہوئے اور یہ صاحب اپنی نشست کھو بیٹھے۔

اس طرح اُنھوں نے نجی حیثیت سے کانفرنس کی صدارت کی، جس سے کوئی خاطر خواہ فائدہ نہ ہوا۔ کانفرنس میں بڑی طاقتوں نے جو رائے دی اُس کا خلاصہ مندرجہ ذیل ہے۔

فرانسیسی رائے

انجمن اقوام کی ایک پولیس قائم کی جائے۔ اور بڑی طاقتوں کو صرف وہی اسلحہ رکھنے کی اجازت ہو جو لیگ آف نیشنز کے تصرّف میں بھی ہوگا۔

روسی رائے

ہتھیاروں پر مکمّل اور عالمگیر پابندی لگائی جائے۔

جرمن رائے

پیرس امن کانفرنس میں جرمنی پر جن ہتھیاروں کی پابندی لگائی گئی تھی اُس کا نفاذ تمام اقوام پر کیا جائے۔

امریکی رائے

مُسلّح افواج اور اسلحہ کو مجموعی طور پر ایک تہائی کم دیا جائے۔

برطانوی رائے

ہتھیاروں کی حدبندی تعداد کے لحاظ سے نہ کی جائے۔ (حالانکہ کمیشن تعداد کا قائل تھا) بلکہ جارحانہ ہتھیاروں پر مکمّل طور پر پابندی لگائی جائے۔

تمام بڑی طاقتوں کی تجویزوں میں کوئی بھی ایسی تجویز نہ تھی جس پر تمام ممالک متفق ہوں۔ فرانسیسی تجویز امریکہ اور برطانیہ کو بُری لگی اور روس کی تجویز کو کسی بھی ملک نے نہیں سراہا۔ برطانوی تجویز بھی کافی پیچیدہ تھی۔ کیونکہ جارحانہ ہتھیاروں کی تعریف مختلف کی جا رہی تھی۔ کوئی بھاری توپ خانہ کو، کوئی آبدوزوں کو اور کوئی کیمیائی جنگ کو جارحانہ تصور کرتا تھا۔

۲۰ جولائی ۱۹۳۲ء کو کانفرنس میں ایک قرارداد پاس کی گئی۔

"سویلین افراد پر حملہ نہیں کیا جائے گا۔ کیمیائی جنگ، بھاری توپ خانے پر پابندی لگادی جائے گی اور شہری ہوابازی کے لیے ضابطۂ اخلاق جاری کیا جائے گا۔

اس کانفرنس میں جرمنی کو صاف نظر آرہا تھا کہ اتحادیوں پروہ پابندیاں نہیں لگائی جارہی ہیں۔ جن کا اطلاق پیرس امن کانفرنس کے تحت جرمنی پر کیا گیا تھا۔ جرمنی نے اس بناء پر علیحدہ ہونے کی دھمکی دی تھی۔ اور یہ اعلان کر دیا تھا کہ جرمنی اُس وقت تک کانفرنس کے فیصلے کو تسلیم نہیں کرے گا جب تک قوموں کے درمیان "حقوق کی برابری کا اصول" قطعی طور پر تسلیم نہیں کر لیا جاتا۔ جرمنی میں ہٹلر چانسلر بن چکا تھا۔ اور وہ اپنی ذلت کا بدلہ لینے کے لیے ویسے بھی لیگ سے چھٹکارا چاہتا تھا۔ فرانس میں عدم تحفظ کا احساس بڑھتا جارہا تھا۔ ان حالات میں فرانس کو اپنے حلیفوں کا قائم کردہ اتحاد کمزور نظر آرہا تھا۔ اور فرانس تخفیف اسلحہ میں کافی بلکہ ضرورت سے زیادہ دلچسپی لے رہا تھا۔ اسی دوران برطانوی وزیراعظم کی طرف سے تخفیف اسلحہ کے لیے ایک پانچ سالہ "مکڈانلڈ پلان" پیش کیا گیا۔ جس میں تمام یورپی ممالک کے اعداد و شمار درج تھے لیکن اس پر اختلاف کی وجہ سے عمل درآمد نہیں ہوسکا۔

فرانس نے اپنے منصوبے میں تخفیف اسلحہ کے لیے دو ادوار مقرر کیے۔

پہلے دور میں فرانس صرف ہتھیاروں کی بین الاقوامی نگرانی اور افواج کی از سرِ نو تنظیم چاہتا تھا۔ اور دوسرے دور میں اصلی اسلحے کی حد بندی چاہتا تھا۔ اس منصوبے کی برطانیہ اور اٹلی نے تائید کی۔ اور برطانوی وزیرِ خارجہ سر سائمن نے ۱۴ اکتوبر ۱۹۳۳ء کو کانفرنس کے دفتر جاکر اس کی توثیق کر دی۔ اور چند ہی گھنٹوں کے بعد جرمنی نے لیگ اور کانفرنس سے علیحدگی کا اعلان کر دیا۔

اس کے بعد کانفرنس تقریباً چھ ماہ تک مختلف ممالک کے فوجی بجٹ ہتھیاروں کی تجارت اور اسلحہ سازی کے اخراجات کی اشاعت پر غور کرتی رہی۔ اس کانفرنس کو باقاعدہ ختم نہیں کیا گیا۔ بلکہ خود بخود ہی یہ ختم ہو گئی۔ ۱۹۳۴ء میں اس کے اجلاس ہونے بالکل بند ہو گئے تھے۔

چار طاقتی معاہدہ

تخفیف اسلحہ کے سلسلے میں جون ۱۹۳۳ء کو روم میں اٹلی، برطانیہ، فرانس اور جرمنی کے مابین ایک معاہدہ بھی ہوا۔

جس میں طے پایا کہ:

پیرس امن کانفرنس کی اُن دفعات میں ترمیم کی جائے گی جو ہمارے لیے ناقابلِ عمل ہیں۔

بوقت ضرورت ایک دوسرے کی مدد کی جائے گی۔

اگر عالمی کانفرنس برائے تخفیف اسلحہ ناکام ہوئی تو جرمنی کو بھی مسلح ہونے کا حق ہوگا۔

تمام یورپی و غیر یورپی مسئلوں کے علاوہ نوآبادیات کے سلسلے میں بھی پالیسیوں میں ہم آہنگی پیدا کی جائے گی۔

باہمی ترقی کے لیے معاشی اتحاد قائم کیا جائے گا۔
اقلیتوں اور چھوٹے ممالک کے تحفظ کے لیے ایک بین الاقوامی پولیس بنائی جائے گی۔
اس معاہدے کی فرانس اور جرمنی کی طرف سے توثیق نہ ہو سکی۔ جس کی وجہ سے بے سود رہا۔ البتہ اس سے یہ فائدہ ضرور ہوا، فرانس اور اس کے اتحادیوں کے مابین ناراضگی پیدا ہو گئی اور عالمی طاقتوں کے درمیان نئے اتحاد کے لیے راستہ ہموار ہوا جو کہ جرمن پالیسی کی ایک نئی چال تھی۔

مسئلہ تاوان اور عالمی معاشی بحران

مسئلہ تاوان

REPARATION PROBLEM

جنگ ہارنے والی ریاست سے جو جنگی ہرجانہ جیتنے والی ریاست لیتی ہے اسے تاوان کہتے ہیں۔ معاہدہ ورسیلز جون ۱۹۱۹ء میں پہلی عالمی جنگ ۱۹۱۴ء-۱۹۱۹ء کی ذمہ داری جرمن قوم پر ڈالی گئی۔ اور اُسے تاوان کی ادائیگی کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا۔ تاوان کی وصولی کے بارے میں اتحادی طاقتیں مختلف نظریات رکھتی تھیں۔ مثال کے طور پر فرانس جرمن معیشت کو بالکل تباہ و برباد دیکھنا چاہتا تھا۔ کیونکہ اُسے جرمنی سے عدم تحفظ کا احساس تھا۔ فرانس جرمن قوم کی فطرت سے بخوبی واقف تھا۔ اس لیے اُسے پتہ تھا کہ یہ اپنی ذلت کا بدلہ ضرور لے گا۔ فرانس کے برعکس برطانیہ اور دیگر اتحادی ممالک جرمن معیشت کو برقرار رکھتے ہوئے تاوان کی وصولی چاہتے تھے۔

تاوان کا حتمی تخمینہ لگانے اور وصولی کا طریقۂ کار طے کرنے کے لیے انجمن اقوام نے ایک "تاوان کمیشن" مقرر کیا۔ یہ کمیشن تاوان کا حتمی تخمینہ تو نہ لگا سکا البتہ وصولی کے طریقۂ کار کے سلسلے میں اس نے فیصلہ کیا کہ فی الوقت جرمن ایک ارب پونڈ (۲۰ بلین مارک) کی رقم ادا کر دے اور باقی رقم (جس کا اندازہ ابھی تک نہیں لگایا گیا تھا) ۳۰ سال کے عرصہ میں ادا کی جائے۔ مزید یہ کہ جرمنی کو جنس (خاص کر کوئلہ) کی صورت میں بھی ادائیگی کی سہولت دی گئی۔ جرمنی نے پہلی قسط ہی ادا کی تھی۔ کہ اتحادیوں

اور جرمن کے درمیان برابری کی بنیاد پر "اسپا کانفرنس" ہوئی۔ جس کا مقصد آئندہ چھ ماہ کے اندر کوئلے کی تقسیم اتحادیوں کے مابین کس شرح سے ہوگی۔ اس میں طے پایا کہ فرانس ۵۲ فیصد برطانیہ ۲۲ فیصد اٹلی ۱۰ فیصد بلجیم ۸ فیصد چھوٹے اتحادی ۸ فیصد لیں گے۔

افسوس! جرمن یہ ادائیگی نہ کرسکا۔ اتحادیوں نے مارچ ۱۹۲۱ء کو دریائے رائن کے مشرقی جانب تین اہم شہروں ڈوسل ڈورف، ڈوئس برگ اور روراٹ پر قبضہ کرلیا۔ ۲۱ اپریل ۱۹۲۱ء کو تاوان کمیشن نے تاوان کا حتمی تخمینہ لگایا۔ جرمنی کل ۶ ارب ۶۰ کروڑ پونڈ (۳۲ ملین امریکی ڈالر) تاوان ادا کرے گا۔ اتحادیوں کے عقل مند افراد اُس وقت ہی سمجھ گئے تھے کہ جرمنی اتنی بڑی رقم کبھی بھی ادا نہیں کرسکے گا۔

چنانچہ اتحادیوں نے یہ فیصلہ کیا کہ جرمن قرضوں اور تاوان کو تین حصوں میں بانٹ دیا جائے۔ دو تہائی مالیت کے تاوان کو التوا میں ڈال دیا گیا اور ایک تہائی جو ۲ ارب پونڈ سے کچھ ہی زیادہ تھا کی وصولی کے لیے اتحادی اپنے گوشوارے تیار کرنے لگے۔ اس پروگرام کے مطابق جرمن کو سالانہ ۱۰ کروڑ پونڈ اور اپنی درآمدات کا ۲۵ فیصد حصہ اتحادیوں کو ادا کرنا پڑتا۔ جرمن قوم کو اس پروگرام کے ساتھ یہ الٹی میٹم بھی دیا گیا کہ اگر اُس نے گوشوارے کے مطابق ادائیگی نہ کی تو "وادی روہر" پر قبضہ کر لیا جائے گا۔ یہ علاقہ کوئلے اور فولاد کی پیداوار کی وجہ سے مشہور تھا۔ جرمن کابینہ میں ایک ہل چل مچ گئی۔ حالات سے مجبور ہو کر الٹی میٹم کو ماننا پڑا۔

اگست ۱۹۲۱ء تک یعنی چار ماہ میں ابھی جرمنی نے صرف ۵ کروڑ پونڈ ہی کی ادائیگی کی تھی کہ مارک کی قیمت گرنا شروع ہوگئی جس سے جرمنی میں افراطِ زر کی ابتداء ہوئی۔ ابتداء میں ایک پونڈ کی قدر ۲۰ مارک

تھی جو سال کے آخر تک ۲۵۰ مارک تک پہنچ گئی۔ یہ قیمت اتنی گری کہ ۳۵ ہزار مارک کا ایک پونڈ ملنے لگا۔ یہ شدید افراطِ زر تھا جس نے جرمنیوں کی روزمرہ کی زندگی کو بھی عذاب بنا دیا۔ یہ معاہدہ ورسیلز سے بھی زیادہ خطرناک ثابت ہوا۔

اتحادیوں میں برطانیہ نرمی کی پالیسی اختیار کرنا چاہتا تھا لیکن فرانس کی نظریں "وادی روہر" پر لگی ہوئی تھیں۔ اور فرانس دل ہی دل میں یہ سوچ رہا تھا کہ اس حصے سے وادی روہر کا سارا خزانہ اتحادیوں کی جیب میں جانے لگے گا۔ چنانچہ فرانس نے لیگ آف نیشنز سے یہ ثابت کرواکر کہ جرمنی تاوان کی ادائیگی میں مخلص نہیں، اپنی فوجیں وادی روہر پر اُتار دیں۔ وادی پر قبضے کے بعد جرمنی کے مقبوضہ اور غیر مقبوضہ علاقوں کے درمیان حد بندی کر دی۔ جس کے آر پار کسی چیز کے گزارنے کی اجازت نہ تھی۔ مقبوضہ علاقوں سے فرانسیسیوں نے جرمنوں کو نکال دیا، یا پھر قیدی بنا لیا۔ اور تاوان کی وصولی کے لیے ایک تنظیم قائم کی۔ اس قبضے کے خلاف "روہر لینڈ" میں تحریک چلائی گئی ہڑتالیں ہوئیں، ایجی ٹیشن کئے گئے تالہ بندیوں کی نوبت آئی جس سے روزمرہ کی زندگی معطل ہو کر رہ گئی۔

اس کے ردِ عمل میں فرانسیسی انتظامیہ (جو روہر لینڈ پر قابض تھی) نے جرمن باغیوں کو جمع کیا اور انھیں روہر لینڈ کی ایک نئی مملکت "ریوالور ری پبلک" بنانے کا لالچ دیا۔ فرانس کے ان اقدام کی عالمگیر پیمانے پر مخالفت کی گئی۔ مزید یہ کہ اس قبضے کی بدولت فرانس کے تو انتظامی اخراجات بھی پورے نہ ہوئے البتہ جرمن معیشت کا بالکل دیوالیہ نکل گیا۔ افراطِ زر کی ابتداء ہوئی۔ قومی آمدنی کم ہونا شروع ہوئی۔ کارخانوں کی پیداوار گھٹ گئی۔ منافع اور آمدنیاں گرنے لگیں۔ بے روزگاری عام ہونے لگی۔ قرضوں کی طلب سکڑنے لگی، قوتِ خرید کم ہونے لگی۔ سرکاری عمل منجمد ہونے کی وجہ سے

تاجروں اور صنعت کاروں پر مایوسی چھانے لگی۔ مقررہ تنخواہ پانے والے ملازمین کی حالت عام مزدوروں سے بھی بدتر ہو گئی۔ اس میں شک نہیں کہ افراطِ زر جرمنی کے لیے معاہدہ ورسیلز سے بھی زیادہ خطرناک ثابت ہوا۔ جرمنی میں اس بحران کی وجہ سے قومی اشتراکیت کا رجحان پھیلا۔

اب تاوان کی دوبارہ بحالی کے لیے جرمنی کے مالیات کی جانچ پڑتال ضروری تھی۔ اس مقصد کے لیے اتحادیوں کی طرف سے ڈاوز پلان اور ینگ پلان پیش کیے گئے۔ جن کا یہاں پر علیحدہ علیحدہ تذکرہ کیا جارہا ہے۔

ڈاوز پلان

اس پلان میں امریکہ برطانیہ فرانس، اٹلی اور جرمنی کے دو دو نمائندے شامل تھے۔ اس کے مقاصد جرمن کرنسی کی گرتی ہوئی قدر کو روکنا، اندرونی اور بیرونی سرمایہ کاری کا حساب لگانا اور جرمن معیشت کو مستحکم کرنا تھا۔ ایک اندازے کے مطابق جرمنی کی اندرونی سرمایہ کاری ۱۷ ہزار ملین اور بیرونی سرمایہ کاری ۳۰۰ ملین ڈالر تھی۔

امریکی سیکریٹری آف اسٹیٹ چارلس۔ ای ہگس نے اگست ۱۹۲۴ء کو اس پلان کی منظوری دی۔ اس کے اہم نکات حسبِ ذیل تھے۔

اگر جرمنی کی صنعت معدنیات اور بیرونی تجارت کو ترقی دی جائے تو یہ جلد اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکتا ہے۔

جرمنی کا مرکزی بنک "ریکس بنک" کو دوبارہ قائم کیا جائے اور اُسے ۵۰ سال تک کرنسی چھاپنے کی اجارہ داری ہونی چاہیے۔

تاوان کی ادائیگی کچھ اس طرح سے ہونی چاہیے کہ ابتداء میں چھوٹی چھوٹی اقساط، بعد میں بڑی اقساط کی ادائیگی ہو۔ تاکہ جرمن معیشت کو استحکام نصیب

ہو سکے۔

جرمنی کو یہ رعایت دی جائے کہ جرمنی تاوان کی ادائیگی جرمن مارک سرکاری ریلوے کے بونڈ، پیداواری اشیاء میں کرسکتا ہے۔

جرمنی کو مکمل سیاسی آزادی ہونی چاہیے۔

تاوان کمیشن کو یہ اختیار ہونا چاہیے۔ کہ وہ اجزائی بنک کی "مجلس عامہ" منتخب کرے اور محصولات کے وصولی کے لیے اتحادی کمیشن کا تقرر کیا جائے مزید یہ کہ پورے منصوبے کا ایک "ایجنٹ جنرل" مقرر کیا جائے۔

یہ پلان" تاوان کمیشن اور انجمن اقوام دونوں کی جانب سے منظور ہو گیا۔ اس دوران پوئن کارکی کابینہ کا زوال ہوا اور نئے وزیراعظم ہریٹ اور اس کی کابینہ نے اس پلان کی توثیق کی۔

پلان کی خوبیاں

جرمنی کو اپنی معیشت مستحکم کرنے کے سلسلے میں مالیاتی پالیسی میں مکمل آزادی دے دی گئی۔ وادی روہر سے فرانسیسی قبضہ ختم ہو گیا۔ تاوان کو سیاسی دائرہ کار سے الگ کر کے خالص تجارتی قرضے کی حیثیت دے دی گئی۔ تاوان کی ابتدائی اقساط میں کمی کی گئی۔ جن کو جرمنی موافق حالات میں ادا کرسکتا تھا۔ تاوان کمیشن (کیونکہ یہ غیر مطمئن تھا) سے سارے مسئلے کو ڈاوز پلان نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اور جرمنی کو بھاری غیر ملکی امداد دی گئی۔ تاکہ وہ اپنی کرنسی کے لیے اثاثے جمع کر سکے۔

پلان کی خامیاں

اس پلان میں کل تاوان ۶ ارب ۶۰ کروڑ پونڈ میں کوئی کمی نہ کی گئی اور نہ ہی ادائیگی کے سلسلے میں کوئی آخری میعاد مقرر کی گئی۔ حالانکہ جرمنی تاوان

کو اپنے اوپر ایک بوجھ سمجھتا تھا۔ اس پلان میں دوسری خامی یہ تھی کہ جرمنی کو بڑی مقدار میں غیر ملکی امداد ملی۔ اور جرمنی اپنے وسائل پر بوجھ ڈالے بغیر سالانہ ادائیگیاں کرنے لگا۔ جس کی وجہ سے یہ پلان کامیاب ہوتا ہوا نظر آیا۔ ایجنٹ جنرل کا کنٹرول جرمنی کو اپنے اُوپر یہ سیاسی دباؤ لگتا تھا۔ جس کو جرمنی پسند نہیں کرتا تھا۔ اس پلان میں ایک خامی یہ بھی تھی کہ اس میں رائن لینڈ کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ جو لیگ کے تحت تھا۔ حالانکہ روہر لینڈ کو فرانس سے خالی کروا لیا گیا تھا۔

ینگ پلان

تاوان کی موثر وصولی کے لیے ۱۹۲۹ء کو جرمنی اور ۵ اتحادی طاقتوں کے مابین ایک سمجھوتا ہوا۔ اس پلان کی مالیاتی کمیٹی کے سنیئر ماہر کا نام "اوون ینگ" تھا۔ جس کی وجہ سے اس پلان کو "ینگ کا منصوبہ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس منصوبے میں تاوان کی ادائیگی کا مکمل اور قطعی حل پیش کیا گیا۔

اس منصوبے کے تحت جرمنی کو کل ۳۷ سالانہ ادائیگیوں میں اوسط ۰.اکروڑ ڈالر ادا کرنے تھے۔ اور باقی رقم ۲۲ چھوٹی چھوٹی اقساط میں ادا کرنی تھی۔ یہ ادائیگیاں اس طرح رکھی گئی تھیں کہ جتنی مدت تک اتحادی امریکہ کو باآپس کے قرضے ایک دوسرے کو دیتے رہیں گے انھیں تاوان ملتا رہے گا۔ اگر یہ سلسلہ باقاعدہ جاری رہتا تو ۱۹۸۸ء میں جاکر کہیں اختتام پذیر ہوتا۔

تاوان کی ادائیگیوں کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ پہلی قسم کی ادائیگی ایسی تھی جس میں مدت کی رعایت کی گنجائش نہیں رکھی گئی تھی۔ اور دوسری قسم کی ادائیگی جس میں مدت کی رعایت دی جاسکتی تھی۔ اُس میں بھی جرمنی پر یہ فرض عائد کیا گیا تھا کہ وہ مدت میں رعایت کی صورت میں۔ بدون

پہلے کمیشن کو مطلع کرے۔

ینگ پلان کے تحت ادائیگی کی صورت میں ایک رعائت یہ بھی دی گئی تھی کہ دس سال تک جرمنی مصنوعات کی شکل میں بھی ادائیگی کرسکتا ہے۔

تاوان کی وصولی و ادائیگی کو آسان بنانے کے لیے بنک آف بین الاقوامی انتظامات قائم کیا گیا۔ اس بنک کا ابتدائی سرمایہ ۱۰۰ ملین ڈالر تھا۔

ینگ منصوبے کے تحت جرمنی کو سیاسی آزادی دے دی گئی تھی۔

جنوری ۱۹۳۰ء میں اس منصوبے کو نافذ کیا گیا۔ ستمبر ۱۹۳۰ء میں جرمنی میں انتخابات ہوئے۔ جس میں تاوان کی مخالفت کرنے والی نیشنل سوشلسٹ پارٹی (نازی پارٹی) جیت گئی۔ اور نئے وزیراعظم برونگ نے تاوان کی ادائیگی سے انکار کر دیا۔ اس لیے ینگ پلان پر عمل درآمد نہیں ہوسکا اور تاوان کا مسئلہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔ آئندہ کے حالات کا آگے تذکرہ کیا جائے گا۔

عالمی معاشی بحران

THE WORLD ECONOMIC CRISIS

معاشی بحران ایسے حالات کی نشاندہی کرتا ہے۔ جس میں معاشی جدوجہد کی رفتار سست پڑ جاتی ہے آمدنیاں اور بچتیں گر جاتی ہیں۔ بے روزگاری عام ہو جاتی ہے۔ قیمتیں آسمانوں سے باتیں کرنے لگتی ہیں۔ پیداواری صنعتیں متاثر ہوتی ہیں کیونکہ افراد کی قوت خرید کمزور پڑ جاتی ہے۔ بین الاقوامی معاشی بحران ایک سے زیادہ دفعہ وقوع پذیر ہو چکا ہے۔

یہاں پر ہم ۱۹۲۹ء-۳۳ء تک کے عالمی معاشی بحران کا جائزہ لیتے ہیں۔

عالمی معاشی بحران کے اسباب

جرمنی پر ۶ ارب ۶۰ کروڑ پونڈ کا تاوان کی صورت میں جو بوجھ ڈالا گیا۔ اس کا بھی عالمی معاشی بحران سے گہرا تعلق ہے۔ کیونکہ جرمن قوم اسے جائز نہیں سمجھتی تھی۔ مزید یہ کہ فرانس نے انجمن اقوام سے یہ ثابت کروا دیا کہ جرمنی تاوان کی ادائیگی کے مسئلے میں مخلص نہیں، وادی رودھر پر قبضہ کر لیا جس سے جرمن معیشت کا دیوالیہ ہوگیا۔ افراطِ زر کی ابتداء ہوئی۔ ایک پونڈ جس کی قدر ۲۰ جرمن مارک تھی۔ اس کی قدر ۲۵ ہزار مارک تک جا پہنچی۔ یہ شدید افراطِ زر تھا۔ جو جرمنی پر معاہدہ ورسیلز سے بھی زیادہ تباہ کن ثابت ہوا۔

عالمی بحران کی دوسری وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ امریکہ نے یورپ والوں کو قرضے دینے بند کر دیے۔ جس سے پیداواری یونٹوں کا کام رک گیا، اور یورپین برآمدات کی شرح بہت کم ہو گئی جس سے یورپین بیرونی تجارت غیر موافق ہو گئی۔

عالمی بحران کی تیسری وجہ یہ ہے کہ پہلی عالمی جنگ ۱۹۱۴-۱۹ء کے بعد بھی ممالک نے سرمایہ کاری سے زیادہ توجہ غیر پیداواری اخراجات (فوجی اخراجات وغیرہ) پر زیادہ توجہ دی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ پوری دنیا میں ایک انتشار اور افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔ ان حالات میں بھی ممالک اپنے تحفظ کی خاطر اپنے آپ کو مسلح کر رہے تھے۔ یورپ میں سرمایہ کاری کی کمی کا ایک اسبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یورپ والوں کو جرمنی سے تاوان کی صورت میں مصنوعات وغیرہ مل رہی تھیں۔

عالمی معاشی بحران کی چوتھی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ ۱۹۲۹ء تک لوگوں کا جے۔ بی۔ سے J.B.Say کے اس اصول پر یقین تھا "کہ رسد اپنی طلب خود پیدا کرتی ہے۔" لیکن صنعتی انقلاب کے بعد یہ فارمولا غلط ثابت ہو چکا تھا۔ اور

بازاروں میں اشیاء کے انبار لگے تھے۔ مگر کوئی خریدار نہ تھا۔ مزید یہ کہ قیمتوں کا تعین رسد اور طلب کے بجائے خود شناختہ نظام کے تحت کیا گیا۔ جس کی وجہ سے بھی لوگوں کی قوت خرید جواب دے گئی۔ حالانکہ ضرورت اس بات کی تھی کہ پیداوار میں اضافہ کر کے قیمتوں کا دارومدار رسد اور طلب کے توازن پر چھوڑ دیا جائے۔

عالمی معاشی بحران کی پانچویں وجہ یہ تھی۔ کہ نوآبادیات میں آزادی کے رجحانات کی وجہ سے اُن کو کنٹرول کرنے کے لئے یورپین ممالک کے اخراجات میں اضافہ ہوا۔ دوسری طرف تخفیف اسلحہ کے نام پر بحری جہازوں کی تعداد میں کمی کی گئی جس سے برطانیہ کی بیرونی تجارت میں کمی واقع ہوئی۔ اور نوآبادیات کا کنٹرول بھی مشکل ہو گیا۔

عالمی معاشی بحران کی چھٹی وجہ یہ تھی۔ کہ سرمایہ کاری کا سارا انتظام نجی ہاتھوں میں تھا۔ جس کی وجہ سے سرکار اس میں زیادہ دخل اندازی نہیں کر سکتی تھی۔ حکومتیں اس بحران کو روکنے میں ناکام رہیں۔ اور سرمایہ داروں نے عالمی مفاد سے نجی مفاد کو ترجیح دی۔

عالمی معاشی بحران کی ساتویں وجہ یہ تھی۔ کہ عالمی طور پر معاشی منصوبہ بندی کا فقدان تھا۔ صرف جزوی معاشیات ہی زیرِ بحث آتی تھی۔ ۱۹۲۹ء میں پہلی دفعہ لارڈ کینز نے کلی معاشیات پر زور دیا جس سے بین الاقوامی معاشیات پر غور ہونے لگا۔ اور بین الاقوامی نوعیت کے پروگرام اور معاشی ادارے بنائے جانے لگے۔

عالمی معاشی بحران کی آٹھویں وجہ یہ تھی۔ کہ جنگ کے دوران اتحادی ممالک نے آپس میں ایک دوسرے سے قرضے لے رکھے تھے۔ جو ادا نہ ہونے کی وجہ سے بحران کا سبب بنے۔ مزید یہ کہ معاشی اتحاد جن میں خاص طور پر جرمنی اور آسٹریا کی کسٹم یونین، لکسمبرگ اور فرانس کا معاشی

اتحاد شامل تھے، ناکام ہو گئے۔ جرمنی اور آسٹریا کا اتحاد فرانسیسی پالیسی کی بدولت ناکام ہوا۔ ۱۹۳۱ء میں آسٹریا کا سب سے اہم نجی بنک "بنک کریڈٹ انسٹالٹ" دیوالیہ ہو گیا۔

عالمی معاشی بحران کی نویں وجہ عالمی سیاسی انتشار تھا۔ انسانیت کو ایک اور جنگ کی آمد نظر آ رہی تھی۔ اٹلی میں مسولینی کی سربراہی میں فاشی ازم آ چکا تھا۔ اور جرمنی میں نازی ازم کے لیے راہ ہموار ہو رہی تھی۔ انجمن اقوام اپنی کارکردگی کے آئینے میں ناکام ہو چکی تھی۔ دنیا بلاکوں میں تقسیم ہو رہی تھی۔ کوئی ایک دوسرے پر اعتماد نہ کر رہا تھا۔ سب ذاتی مفاد کو پیشِ نظر رکھے ہوئے کام کر رہے تھے۔

معاشی بحران کا آخری سبب ہم "تجارتی چکر" کو کہہ سکتے ہیں۔ عالمی معاشی تاریخ کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے۔ کہ آٹھ دس سال میں گرم بازاری اور سرد بازاری کا چکر مکمل ہوتا ہے۔ یہ بحران عالمگیر نوعیت کا ہوتا ہے۔ ۱۹۲۹۔۳۳ء کا بحران بھی تجارتی چکر کے احاطے میں آتا ہے۔

تجارتی چکر:۔
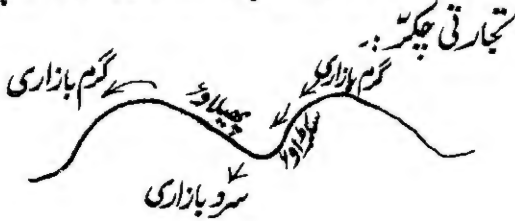
معاشی بحران کے خاتمے کے لیے اقدامات

عالمی معاشی بحران کو ختم کرنے کے لیے امریکی صدر ہوور نے یہ تجویز پیش کی۔ کہ تمام باہمی قرضے اور تاوان ایک سال کے لیے ملتوی کر دیا جائے۔ اس تجویز سے پہلے پہل فرانس نے اختلاف کیا۔ البتہ سود کے لالچ نے اُسے بھی رضامندی کی طرف مائل کر دیا۔ جس سے یہ تمام

قرضے ایک سال کے لیے ملتوی ہو گئے۔ ابھی یہ رعائیتی مدت ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ جرمنی میں انتخابات ہوئے اور پہلی دفعہ انتہا پسندوں کی حکومت بنی۔ وزیراعظم برونگ نے تاوان کی ادائیگی سے ہمیشہ کے لیے انکار کر دیا۔

جولائی ۱۹۳۲ء میں معاشی بحران کو ختم کرنے کے لیے "لوزان کانفرنس" ہوئی۔ اس کانفرنس میں پہلی دفعہ تاوان کے بجائے یورپ کی فلاح و بہبود پر توجہ دی گئی۔ اور تاوان کے مسئلے کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا گیا۔ اس کانفرنس کی سب سے اہم بات یہ تھی کہ انجمن اقوام پر زور دیا گیا تھا کہ وہ معاشی بحران کے خاتمے کے لیے ایک بین الاقوامی معاشی کانفرنس بلائے۔ جو یقیناً لیگ کی ایک بہت بڑی کامیابی تھی۔

عالمی معاشی کانفرنس

جون ۱۹۳۳ء کو لندن میں دنیا کے ۶۷ ممالک نے "عالمی معاشی کانفرنس" میں شرکت کی۔ یہ تاریخ کا سب سے بڑا اجتماع تھا۔ اور انسانیت کے مزاج کو خراجِ عقیدت تھی جو مل جُل کے کام کرنے کے عقیدے پر قائم ہوئی تھی۔ اس کانفرنس کے مقاصد میں بے روزگاری کو ختم کرنا، مزدوروں کی فلاح و بہبود کے لیے پروگرام مرتب کرنا، بنیادی اشیاء کی قیمتوں میں استحکام پیدا کرنا، بین الاقوامی تجارت اور سرمایہ کاری کو فروغ دینا، مالیاتی اور زری پالیسیوں پر نظرثانی کرنا وغیرہ شامل تھا۔

کانفرنس میں امریکہ نے یہ موقف اختیار کیا۔

لچکدار کرنسی ہونی چاہیے۔

محدود مدت کے لیے کسٹم ڈیوٹی ختم کر دینی چاہیے۔

باہمی قرضوں کو نجی سطح پر طے کیا جائے۔

چاندی برآمد کرنے والے ممالک اس کی رسد میں کمی کریں۔

امریکی موقف کی مخالفت کرنے والے ممالک کا لیڈر فرانس تھا۔ فرانس چاہتا تھا کہ :۔

اگر محصولات کو کم کرنا ہو یا پھر کوٹہ سسٹم ترک کرنا ہو تو استوار کرنسی ہونی چاہیے۔

کسٹم ڈیوٹی کی ممانعت اس لیے کی گئی کہ اس سے سب سے زیادہ نقصان برطانیہ کو ہو رہا تھا۔ جو ایک ایکسپورٹر کی حیثیت رکھتا تھا۔

تمام باتیں ابھی زیرِ غور تھیں کہ امریکی صدر روز ویلٹ نے لچکدار کرنسی کے حق میں ایک بیان دے ڈالا جس سے کانفرنس پر کاری ضرب لگی۔ اور جولائی ۱۹۳۳ء کو یہ کانفرنس غیر معینہ مدت تک کے لیے ملتوی ہو گئی۔

اس عالمی کانفرنس سے یہ ثابت ہو گیا کہ معاشی بحران کا حل کسی عالمگیر فارمولے میں نہیں ہے۔ اس کانفرنس سے بے شک کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا تھا لیکن اتنا ضرور ہو گیا کہ لوگوں کو ایک نیا پلیٹ فارم میسر آیا جس سے بہت سارے نئے مسائل کی نشاندہی ہوئی۔

عالمی معاشی بحران کے اثرات

عالمی معاشی کانفرنس کی ناکامی کی وجہ سے انجمن اقوام کے ممبر ممالک کا اعتبار ختم ہو گیا۔ کیونکہ یہ انجمن اس سے پہلے تخفیف اسلحہ کے سلسلے میں بھی اپنی پالیسی کو عملی جامہ نہ پہنا سکی۔ اور سبھی اقوام پر یہ واضح ہو گیا تھا۔ کہ بڑی اقوام اپنے مقاصد کے لیے انجمن اقوام کو استعمال کرتی ہیں۔ اور

جب اس کا کوئی اقدام اُن کے خلاف ہوتا ہے۔ تو وہ لیگ ہی کو خیر آباد کہہ دیتے ہیں ۔

جون ۱۹۳۱ء کو جب امریکی صدر ہوور نے تاوان سمیت تمام قرضوں کو ایک سال کی مدت کے لیے ملتوی کر دیا۔ تو اس سے امریکی معیشت پر منفی اثرات پڑے اور ۱۹۳۲ء کے انتخابات میں ہوور کے بجائے روزویلٹ کو زبردست کامیابی نصیب ہوئی۔ قرضوں کے التوا کی وجہ سے امریکی محکمہ مالیات کو ۸۰ کروڑ پونڈ کا خسارہ برداشت کرنا پڑا۔ امریکہ کو اپنی تجارت بحال کرنے کے لیے ۱۹۳۳ء میں ڈالر کی قیمت میں کمی کرنی پڑی، نیز امریکی صدر روزویلٹ نے کانگریس سے تجارتی معاہدے کرنے کا اختیار حاصل کر لیا۔ اور امریکہ نے کئی ممالک کے ساتھ تجارتی معاہدے کیے۔

معاشی بحران کی وجہ سے یورپ ۱۹۳۱ء میں کرنسی کے اعتبار سے تین گروہوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ ایک طرف وہ ممالک تھے جو سونے کے معیار کو برقرار رکھے ہوئے تھے۔ ان میں فرانس، اٹلی، پولینڈ، بلجیم، ہالینڈ اور سوئٹزرلینڈ شامل تھے۔ دوسرا گروہ جس میں برطانیہ، سویڈن، ناروے، ڈنمارک، فن لینڈ، اسپین، پرتگال اور یونان تھا جس نے طلائی معیار کو ختم کر دیا تھا۔ تیسرا گروہ وہ تھا جو مصنوعی طلائی معیار سے اپنی کرنسی چلا رہا تھا۔ اس گروہ میں جرمنی سب سے آگے تھا۔ واضح رہے کہ ۱۹۳۶ء تک سبھی ممالک نے طلائی معیار کو ختم کر دیا تھا۔ اور اس کی جگہ مصنوعی طلائی معیار اور کاغذی معیار کو اپنایا گیا تھا۔

معاشی بحران کی وجہ سے دنیا میں سخت قسم کی بے روزگاری پھیلی۔ اس بحران کا سب سے زیادہ اثر جرمنی پر پڑا اور وہاں پر ساٹھ لاکھ سے زیادہ افراد بے روزگار ہو گئے۔ ان حالات میں لبرل ڈیموکریٹس کی پالیسیوں سے عوام اختلاف کرنے لگے۔ ۱۹۳۰ء میں پہلی دفعہ جرمنی پر انتہا پسند دن

کی حکومت وزیر اعظم برونگ کی سربراہی میں قائم ہوئی۔ جنوری ۱۹۳۳ء میں ہٹلر جرمنی کا چانسلر بنا۔ تو اس نے بے روزگار نوجوانوں کی ایک فوج تیار کی۔ اور اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے جنگجویانہ پالیسی کو اپنایا۔ ہٹلر کے نزدیک بات چیت کے ذریعے مقاصد کا حصول بزدلی کی علامت تھا۔ ترقی و خوشحالی کے لیے جنگ ضروری ہے۔

اسپین کی خانہ جنگی

THE SPANISH CIVIL WAR.

اسپین برِ اعظم یورپ کے جنوبی حصے میں واقع ہے۔ اور ماضی کی ایک بڑی طاقت رہی ہے۔ یہاں پر مسلمانوں نے سات سو سال تک حکومت کی۔ اور اپنی تہذیب و تمدن کا گہرا اثر چھوڑا۔ مسلمانوں کے زوال کے بعد یہاں پر بوربون ہیبس برگ The Borbon Habsburg خاندان کی حکومت قائم ہوئی۔

عوام کی ناپسندیدگی کی وجہ سے حکومت کو استحکام نصیب نہیں ہوا چنانچہ ۱۸۷۲ء میں اسپین کو جمہوریا بنایا گیا۔ دو سال کی مختصر مدت میں یہ آئین ناکام ہوا تو الفانسو یازدہم (Alfanso – XII) نے حکومت کا کنٹرول سنبھال لیا۔ ۱۸۹۸ء میں اسپین اور امریکہ کے مابین نوآبادیات کے سلسلے میں آخری جنگ لڑی گئی۔ اسپین کی نوآبادیات چھن جانے کی وجہ سے اسپین کو معاشی طور پر کافی نقصان برداشت کرنا پڑا۔ فوجوں کو ریاستی وفادار رکھنے کے لیے اُن کی تنخواہوں میں بھی اضافہ وغیرہ کیا گیا۔ اور کوئی نیا انقلاب نہیں آنے دیا۔

۱۹۱۴ء کو جب پہلی عالمی جنگ شروع ہوئی تو اسپین پر الفانسو XIII حکومت کرتا تھا جس کی والدہ آسٹریا سے اور بیوی کا تعلق برطانیہ سے تھا۔ جس کی وجہ سے الفانسو نے "غیر جانبدار پالیسی" اختیار کی۔ البتہ بائیں بازو کے افراد جن میں دانش ور اور آزاد خیال لوگوں کی اکثریت تھی وہ اتحادیوں کا ساتھ دینا چاہتے تھے۔ ان حالات میں الفانسو کے لیے ضروری تھا کہ وہ اپنے ملک کے عوام کی توجہ کسی اور جانب مبذول کرائے۔ چنانچہ اُس نے "اسپینی مراکو" میں فوج کشی کی۔ اور اس مہم کا سربراہ جنرل فرانکو کو بنایا گیا۔ اس جنگ میں اسپین کی زبردست تباہی ہوئی۔ اور ہر طرف بے چینی، خوف وہراس

کی فضا قائم ہوئی۔ عوام غیر مطمئن ہو گئے۔ تو حالات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کیپٹن پرنمو ریورا Captain Primo Rivera نے حکومت کی باگ دوڑ سنبھالی اور "اسپینی مراکو" کو ایک زبردست شکست دی۔

۱۹۲۹ء میں عالمی معاشی بحران کے وقت اسپین میں ایک مرتبہ پھر بادشاہت قائم ہوئی۔ لیکن یہ بادشاہت بحرانی دور میں ہی ختم ہو گئی۔ اور اسپین میں مسٹر زامورا Mr. Zamora کی قیادت میں دوسری جمہوریہ 2nd Republic قائم ہوئی۔ زامورا نے سیاست سے چرچ کا کردار بالکل ختم کر دیا۔ جس کی خاص کر کیتھو لک فرقے نے سب سے زیادہ مخالفت کی۔ حالات اتنے سنگین ہو گئے کہ مسٹر زامورا حکومت مسٹر آزانہ Mr. Azana کے ہاتھ دے کر خود مستعفی ہو گئے۔ اس نے زندگی کے ہر شعبے میں اصلاحات کیں۔ تمام شعبہ ہائے زندگی کو از سرِ نو منظم کیا۔ جنوری ۱۹۳۲ء میں جنرل سن جرو General Sanjuro نے آزانہ حکومت کا تختہ الٹ دیا لیکن یہ آمریت زیادہ عرصہ تک برقرار نہ رہ سکی۔ اور آزانہ دوبارہ برسرِ اقتدار آ گیا۔ اسپین کی ترقی و خوشحالی کے لیے آزانہ نے دائیں اور بائیں بازو کی ایک مشترکہ حکومت بنائی۔ البتہ بغور جائزہ لینے سے یہ چیز واضح ہو جاتی تھی کہ بائیں بازو کے افراد کی اس میں اکثریت تھی۔ حکومت روز مرہ کے کاموں میں مصروف تھی کہ ایک عوامی لیڈر سٹیلو Stelo کا دارالحکومت میڈرڈ میں قتل ہوا جس کی ذمہ داری حکومت پر ڈالی گئی۔ آزانہ سرکار کے خلاف عوامی جذبات اور ہیجانات کو ابھارا گیا۔ جھوٹا پروپیگنڈا کیا گیا۔ جس سے ملک میں سیاسی انتشار پھیلا۔ روز مرہ کی مصروفیات معطل ہو کر رہ گئیں۔

ان حالات میں اسپین کے باغی اور بادشاہت کے حامی جنرل فرانکو نے اسپین پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا۔

اسپین کی خانہ جنگی کے واقعات:

اسپین میں خانہ جنگی کی ابتداء جولائی ۱۹۳۶ء کو ہوئی اس کے فریقین میں ایک طرف برسرِاقتدار طبقہ اور دوسری طرف باغی جنرل فرانکو جو شاہی دورِ حکومت کے خاتمے کے وقت اسپینی مراکو میں فوج کا سپہ سالار تھا۔ اسپینی مراکو اسپین کے جنوب میں واقع ہے۔ اور ان کے درمیان بحرہ روم بہتا ہے۔ جنرل فرانکو شاہی دور کے خاتمے کے بعد واپس اسپین نہیں گیا۔ اور اسپینی مراکو میں رہتے ہوئے اسپین کے جمہوری انقلاب کے خلاف تیاری کرتا رہا۔ عوامی لیڈر اسٹیلو کے قتل کی بنا پر جب عوام اور حکومت کے مابین تصادم ہوا تو جنرل فرانکو نے ان حالات سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے ۱۸ جولائی ۱۹۳۶ء کو اسپین پر حملہ کر دیا۔ فرانکو بادشاہت کا حامی تھا۔ اس وجہ سے تمام شاہ پرست ادارے بھی جنرل فرانکو کے ساتھ ہو گئے۔ یہ کوئی پُرامن انقلاب نہیں تھا۔ بلکہ جنرل فرانکو اور آذانہ گورنمنٹ کی فوجوں کے درمیان تقریباً ڈھائی سال سے زیادہ عرصہ جنگ ہوتی رہی۔ جنرل فرانکو نے اسپین کا جنوبی علاقہ تو بڑی آسانی سے فتح کر لیا۔ اور نومبر تک انقلابی فوجیں اسپین کے دارالحکومت میڈرڈ کی نواحی بستیوں تک پہنچ گئیں۔ اور پھر دونوں فریقین کے درمیان جنگ شدت اختیار کر گئی۔

جرمنی اٹلی اور پرتگال کُھلم کُھلا جنرل فرانکو کی حمایت کر رہے تھے۔

جرمن بحریہ اور فوجیں ہزاروں کی تعداد میں اس جنگ میں لڑیں۔ اٹلی میں فاشی ازم کی بدولت اور ایبے سینا پر نیا نیا قبضہ کرنے کی وجہ سے اس کی فوجیں چاق و چوبند تھیں۔ اس جنگ کی وجہ سے یورپ دو حصوں میں بٹ چکا تھا۔ اور اس بات کا خدشہ پیدا ہو گیا تھا۔ کہ کہیں یہ جنگ عالمی جنگ کی صورت اختیار نہ کر جائے۔

اس صورت احوال سے نمٹنے کے لیے ۱۹۳۶ء کو لندن میں ایک "عدم مداخلت کمیٹی" بنائی گئی جس میں ۲۷ یورپی ممالک شامل تھے۔ اس کمیٹی کا

مقصد یہ تھا کہ اسپین کی خانہ جنگی میں کوئی یورپی ملک شرکت نہ کرے۔ تاکہ جنگ صرف اسپین کے حدود تک محدود رہے۔

جنگ بندی کے لیے دوسری کوشش پٹرول سسٹم Petrol system کا قیام تھا۔ جس کے قیام کے لیے سوئٹزرلینڈ کے شہر نیون Nyon City میں نو ممالک کے درمیان ایک سمجھوتا ہوا۔ پٹرول سسٹم کا مطلب یہ ہے کہ ایک بین الاقوامی پولیس قائم کرکے اسپین کی سرحدوں پر لگادی جائے، تاکہ بیرونی ممالک سے کوئی اسلحہ وغیرہ نہ آسکے۔ پٹرول سسٹم کی وجہ سے چند ہفتے تو اسلحہ کی فراہمی رُک گئی۔ لیکن جلد ہی اس کی خلاف ورزی ہونے لگی۔

آزانہ گورنمنٹ کی امداد روس کر رہا تھا۔ جس سے اسپین میں اشتراکی انقلاب کا خطرہ پیدا ہوگیا۔ چنانچہ جرمنی کے مردِ آہن ہٹلر اور اٹلی کے ڈکٹیٹر مسولینی نے اشتراکی اثر کو مٹانے کے لیے جنرل فرانکو کو ایک لاکھ اطالوی فوجیں دوسو ایرکرافٹ۔ ۹ جنگی جہاز اور ۱۰۰ ملین ڈالر کے قریب قرضہ دیا۔ ہٹلر اور مسولینی کی اس حکمت عملی کی بدولت یورپ میں امن کا ماتم ہونے لگا۔ برطانیہ امریکہ فرانس اور روس کی طرف سے جب جرمنی اور اٹلی کی اس حکمت عملی پر احتجاج کیا گیا تو ان کا مذاق اڑایا گیا۔ اور روس پر کچھ الزامات بھی صحیح ثابت ہوئے۔ چنانچہ روس نے آزانہ گورنمنٹ کی امداد کرنا بند کردی۔ تب جنرل فرانکو کی کامیابی یقینی ہوگئی۔

ایک سال کے عرصے میں جنرل فرانکو آدھے اسپین پر قبضہ کرچکا تھا۔ کئی اہم بندرگاہیں فوجی اڈے اور اہم اداروں کا انتظام انقلابیوں نے سنبھال لیا تھا۔ انقلابیوں کی مسلسل کامیابی ہورہی تھی۔ اور حکومت پر سرخوں نے قبضہ کرلیا۔ اُنھوں نے اپنا دارالحکومت میڈوڈ کے بجائے والن سیا Valen Sia کو بنایا۔ حکومتی امور میں ان ترقی پسندوں کے ہاں بھی ہم خیالی نہ تھی۔ جس کی وجہ سے ملک میں مزید سیاسی افراتفری پھیلی، ادھر

جنرل فرانکو کو باقاعدہ امداد ملتی رہی۔ آخر کار دسمبر ۱۹۳۸ء کو ایک بڑے حملے کی صورت میں جنرل فرانکو کی حکومت قائم ہوئی۔ اور اس نے اپنی موت تک (۱۹۷۵) ایک آمر کی حیثیت سے اسپین پر حکومت کی۔ اس کی وفات کے بعد الفانسو کا پوتا جان کارلوس اسپین کا آئینی بادشاہ بنا۔

ایک اندازے کے مطابق اسپین کی خانہ جنگی میں تقریباً ۱۰ لاکھ افراد مارے گئے۔ اور کوئی ۱۳ لاکھ کے قریب زخمی ہوئے۔ اگر یہ خانہ جنگی مزید جاری رہتی تو دوسری عالمی جنگ کی بنیاد بن سکتی تھی۔

اسپین کی خانہ جنگی کے اثرات

اسپین میں جنرل فرانکو کی مستقل آمریت قائم ہو گئی اور جمہوریت کا خاتمہ ہو گیا۔ سیاسی انتشار ختم ہوا۔ اور دائیں بازو کے افراد کا حکومت پر کنٹرول ہو گیا۔ سرخ انقلاب کا خطرہ بالکل ختم ہو گیا۔ اور اشتراکیت کے بجائے سرمایہ دارانہ نظام کو تقویت ملی۔ اسپین کی بیرونی تجارت محدود ہو گئی البتہ یورپ کے دوسرے ممالک کو اس سے ضرور فائدہ ہوا۔ اسپین کے علاوہ اس کا بین الاقوامی سیاست پر بھی گہرا اثر پڑا۔ یورپ دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ نظریاتی اتحاد پروان چڑھتا گیا۔ جرمنی کو اپنا اسلحہ آزمانے کا موقع مل چکا تھا۔ لہٰذا ہٹلر نے مسولینی سے مل کر اپنے جنگجویانہ اقدامات کو عملی شکل دینا چاہی تو بیرونِ یورپ جاپان سب سے زیادہ ان کی طاقت سے متاثر ہو کر ان کے اتحاد میں شامل ہو گیا۔ دوسری طرف اتحادی بھی اپنے آپ کو مضبوط کر رہے تھے۔ دونوں گروپوں کے مابین دوسری عالمی جنگ کی ابتدا ۳ ستمبر ۱۹۳۹ء کو ہوئی۔

منچوریہ کی جنگ

چین اور جاپان کے تعلقات

اس باب میں ہم چین اور جاپان کے تعلقات کا جائزہ لیں گے اور مزید یہ کہ چین اور جاپان کے مابین لڑی جانے والی منچورین جنگ نے لیگ آف نیشنز اور عالمی دنیا پر کیا اثرات مرتب کیے ہیں۔ ان حالات کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم چین اور جاپان کے ماضی کا مختصراً جائزہ لیں۔

یہ اندازہ لگانا تو مشکل ہے کہ کن حالات میں جاپان کو پہلے پہل توسیع پسندانہ اقدام اٹھانے کا خیال آیا۔ البتہ یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ مغربی طاقتوں کی دیکھا دیکھی اسے عظیم طاقت SUPER POWER بننے کا خیال آیا ہوگا۔ سنہ ۱۸۹۴-۹۵ء میں ایک جنگ کے دوران جاپان نے چین کے صوبے کوریا اور چوزن پر قبضہ کر لیا۔ اور مستقبل میں منچوریہ پر قبضہ کرنے کا خواب دیکھنے لگا۔ منچوریا چین کا ایک زرخیز علاقہ، گرم پانی کی بندرگاہ، اور پھر مزے کی بات یہ ہے کہ یہاں سے ایک ریلوے لائن روس تک جاتی تھی۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ روس کے پاس گرم پانی کی کوئی بندرگاہ نہیں ہے۔ اس لیے روس کی نظریں بھی منچوریا پر لگی ہوئی تھیں۔

منچوریا کے مسئلے پر سنہ ۱۹۰۴ء میں روس اور جاپان کے مابین ایک جنگ بھی ہوئی جس میں جاپان نے روس کو شکست دی۔ سنہ ۱۹۱۴ء میں پہلی

عالمی جنگ میں جاپان کو امریکہ کی طرف سے بڑی مقدار میں اسلحہ وغیرہ فراہم کیا گیا۔ تاکہ مشرق بعید میں خاص طور پر چین کے خلاف امریکہ اپنے عزائم کی تکمیل کر سکے۔ جنگ بند ہونے تک جاپان بحرالکاہل کی سب سے بڑی طاقت بن گیا تھا۔ عالمی طور پر اس کا تیسرا نمبر تھا۔ جاپان کی اس بڑھتی ہوئی طاقت پر امریکہ اور برطانیہ کو سخت تشویش ہوئی۔ چنانچہ امریکہ کی طرف سے برطانیہ جاپان فرانس اور اٹلی کے علاوہ ان ممالک کو جو بحرالکاہل میں علاقائی مفادات رکھتے تھے واشنگٹن کانفرنس دسمبر ۱۹۲۱ء کے لیے دعوت نامے جاری کیے گئے۔ اس کانفرنس کا مقصد تخفیف اسلحہ اور جاپان کو چین کے بارے میں اپنے عزائم سے باز رکھنا تھا۔ اس کانفرنس کے ۹ طاقتی معاہدے کے تحت تمام اراکین پر یہ ذمہ داری ڈالی گئی کہ وہ چین کی قومی سلامتی اور خود مختاری کا احترام کریں۔ جاپان نے کیوچاؤ کا وہ علاقہ بھی چین کو واپس کر دیا جو اُسے پیرس امن کانفرنس ۱۹۱۹ء کے تحت ملا تھا۔ اور منچوریہ پر قبضہ کرنے کا ارادہ بھی وقتی طور پر ختم کر دیا۔

۱۹۲۷ء میں چین میں قوم پرستوں اور اشتراکیت پسندوں کے مابین تصادم ہوا۔ خانہ جنگی کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ قوم پرستوں کی قیادت چیانگ کائی شیک کر رہے تھے اور اشتراکیت پسند ماؤزے تنگ کی سربراہی میں متحد تھے۔ ماؤزے تنگ کو روسی حمایت حاصل تھی۔ جب کہ دوسری طرف امریکہ امداد کر رہا تھا۔

عالمی معاشی بحران کی ابتداء ۱۹۲۹ء میں ہوئی۔ یہاں اس کا اثر پوری دنیا پڑا۔ جاپان بھی اس سے نہ بچ سکا۔ اور اُسے وہ عزائم پھر سے یاد آ گئے جن کو وہ واشنگٹن کانفرنس میں بھول گیا تھا۔

جنگ کی وجوہات :

عالمی معاشی بحران ۱۹۲۹-۳۰ء میں جاپانی معیشت کو زبردست دھچکا لگا۔ اس کی بیرونی منڈیوں کی تعداد تقریباً نصف رہ گئی۔ ریشم کی برآمد بالکل بند ہو گئی۔ بے روزگاری عام ہوئی اور ایک اندازے کے مطابق ۳ بلین ڈالر کا مقروض ہو گیا۔

اسی دوران اندرونی منگولیا میں چینی لٹیروں کے ہاتھوں ایک جاپانی آفیسر کا قتل ہوا جس سے جاپانیوں میں انتقام کی آگ بھڑکی۔

جاپان نے منچوریہ پر قبضہ کا ایک سبب یہ بھی بتایا کہ ہم نے ۱۸ اور ۱۹ ستمبر ۱۹۳۱ء کی درمیانی رات کو مکڈن کی ریلوے لائن چینی سپاہیوں کو اڑاتے دیکھا۔

جاپان کو منچوریہ پر قبضے کا روس کی جانب سے بھی خطرہ تھا۔ روس اور جاپان کے مابین منچوریا کے مسئلے پر ۱۹۰۴ء میں پہلے بھی ایک جنگ ہو چکی تھی۔ جاپان نے اس سنہری موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔

واقعات :

۱۹ ستمبر ۱۹۳۱ء کو جاپانی گورنمنٹ نے ایک فوجی دستہ مکڈن بھیجا۔

جاپانی دستے کی ایک چھوٹی سی جھڑپ کے نتیجے میں ۱۰ ہزار چینی سپاہیوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ چار دن میں ہی مکڈن کے شمال میں دو سو میل تک جاپانی فوجوں نے قبضہ کر لیا۔ اور اس کے بعد جاپانی فوج کا رخ منچوریا کی طرف ہوا۔ اور نومبر کے وسط تک جاپانی فوجیں منچوریہ پر قبضہ کر کے جنوب کی طرف بڑھنے لگیں۔

جنوب کی طرف پت چاؤ کی فتح کے بعد ۴ جنوری ۱۹۳۲ء کو جاپانی

فوجیں دیوار چین تک پہنچ گئیں۔ قبضے کے بعد جاپان نے منچورین ریلوے لائن کے روس والے حصص خرید لیے اور اس علاقے کا ماسٹر بن گیا۔

یہاں پر ایک سوال ذہن میں پیدا ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ چین جیسے بڑے اور کثیر آبادی والے ملک پر جاپان نے کیسے قبضہ کر لیا۔ اس کا جواب زیادہ مشکل نہیں کیوں کہ اس وقت کا چین آج کے چین سے بالکل مختلف تھا۔ چینی قوم نشے کی عادی تھی۔ اور وہاں پر کوئی مستحکم طرزِ حکومت نہ تھی۔ برطانیہ نے اپنے مفاد کی خاطر چین کو منشیات کا عادی بنایا۔ جس سے جاپان نے خاطر خواہ فائدہ حاصل کیا۔ اُس وقت چینی قوم کو "سویا ہوا چین" Sleeping China کے نام سے بھی یاد کیا جاتا تھا۔

چین کے برعکس جاپان نے بادشاہت کی پرستش میں ترقی کا عروج پایا تھا۔ اس کا سربراہِ مملکت، وزراء، اُمراء ملک و قوم کے مخلص فدائی تھے۔ چین کے برعکس جاپان میں صنعتی انقلاب آچکا تھا اس کی انڈسٹری دن رات کام کر رہی تھی۔ اس کی فوج بڑی منظم اور وفادار تھی۔

منچوریہ پر قبضے کے بعد جاپان نے منچورین گورنمنٹ کا تختہ اُلٹ دیا اور ہنری، پاؤ، آئی Hanry-pu-yi کی سربراہی میں ایک نئی حکومت تشکیل دی۔ منچورین سربراہ دی چیف ایگزیکٹیو The Chief کہلاتا تھا یا کہا جاتا تھا۔ منچوریہ کا نیا نام منچوکو Manchou-Kuo رکھا گیا۔ شنگ چن Shang-chun کو اس کا دارالحکومت بنایا گیا۔ اس مہم پر جاپان کے تقریباً ۶۲ ملین ڈالر خرچ ہوئے۔ مزید یہ کہ منچوکو گورنمنٹ کو استحکام کی خاطر ۱۰ ملین ڈالر کا قرضہ

بھی فراہم کیا۔

اس صورتِ حالات سے سب سے زیادہ پریشانی روس کو ہوئی۔ کیونکہ روس کا خیال تھا کہ جاپان فرانسیسی مدد کے ساتھ بالشیویک انقلاب Bolsheviks Revolution کے خلاف کام کر رہا ہے۔ چنانچہ روس نے جاپان کے اس پھیلاؤ کو روکنے کے لیے اپنی ۳ لاکھ میں سے ۲ لاکھ فوج سائبیریا کے راستے منچوکو بھیج دی۔ جاپان واقعی سرخ فوج سے خوفزدہ ہوگیا۔ اور اُس نے کوئی مزید قدم اٹھانے سے گریز کیا۔

منچوریَن جنگ میں لیگ آف نیشن کا کردار

جاپان نے جب جنوری ۱۹۳۲ء کو منچوریا پر قبضہ کیا۔ اُس وقت لیگ کے مسلسل اجلاس ہو رہے تھے۔ چنانچہ چین نے لیگ کی دفعہ نمبر ۱۱ کے تحت (جس کی رُو سے جنگ یا اعلان کی اطلاع دینا ضروری تھی) اپیل کی۔ جاپان نے اس کا جواب یہ دیا کہ یہ اقدامات چینی لیڈروں سے تحفظ کی خاطر کیے گئے ہیں۔ ویسے جاپان منچوریہ پر قبضہ کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ مزید یہ کہ جاپان اسے فوجی کاروائی کے بجائے "پولیس کاروائی" کا نام دیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ معاہدہ پیرس ۲۷ اگست ۱۹۲۸ء میں جنگ کی ممانعت قرار دی گئی تھی۔ اور تخفیف اسلحہ کی واشنگٹن کانفرنس کے نو طاقتی معاہدے کے تحت جاپان پر یہ پابندی لگائی گئی تھی کہ وہ چین کی قومی سلامتی وخود مختاری کا احترام کرے۔

جاپانی رویے کو دیکھ کر یہ بالکل واضح ہو گیا تھا کہ اسکی پالیسی میثاق انجمن اقوام معاہدہ پیرس واشنگٹن کانفرنس کا نو طاقتی معاہدہ

اور ولسن کے چودہ نکات کے خلاف جا رہی ہے۔ لیگ آف نیشنز نے اتفاق رائے سے ایک قرار داد پاس کی جس کے تحت جاپانی فوجوں کو منچوریا سے واپس جانے کو کہا گیا تھا۔

ان حالات میں امریکہ نے تاڑ لیا تھا کہ جاپان بحرالکاہل میں بلندی پر جا رہا ہے۔ اس نے کونسل کی حمایت کے لیے اپنے نمائندے پی کنگ اور ٹوکیو بھیجے، اور صدر کونسل سے کہا کہ لیگ کی کارروائیوں کو واشنگٹن میں "خوش آمدید" کہا جائے گا۔ لیکن جاپان کی ممانعت کی وجہ سے امریکی پالیسی ناکام ہو گئی۔

جاپان چاہتا تھا کہ فوج کی واپسی کی ابتدائی بات چیت براہ راست چین کے ساتھ طے پائی جائے۔ لیکن کونسل کے ممبران کا اصرار یہ تھا کہ پہلے جاپانی فوجی دستے واپس بلائے جائیں۔ تب گفت و شنید کا سلسلہ جاری کیا جائے۔ اس کشمکش کے نتیجے میں اعلانیہ ناکامی تو نہ ہوئی البتہ اس مسئلے میں ایک تعطل ضرور پڑ گیا۔ پھر لیگ نے اس کے لیے کیا کیا؟ یہ بڑی مزے کی بات ہے کہ اپنی پرانی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے ایک کمیشن بٹھا دیا۔ کیونکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مسئلے کی اہمیت کم ہو جائے گی۔ اور فریقین خود بخود ہی راضی ہو جائیں گے۔ (ایک عام خیال) یہ کمیشن لارڈ لیٹن Lord Lytton کی سربراہی میں قائم کیا گیا۔ اس میں امریکہ، برطانیہ، فرانس جرمنی اور اٹلی کے نمائندے شامل تھے۔ اس کمیشن کا مقصد مشرق بعید کے حالات کا صحیح جائزہ لینا تھا۔ کمیشن کو کسی فریق کے فوجی معاملات میں دخل اندازی کی اجازت نہ تھی۔

لیٹن کمیشن کو جاپان کی طرف سے یہ سفارش پیش کی گئی، کہ منچوریہ اب ایک آزاد ریاست بن چکی ہے۔ (جاپانی مشیروں کے

تحت ایک کٹھ پتلی حکومت قائم تھی) جس کو اب بین الاقوامی اصولوں کے تحت ختم نہیں کیا جا سکتا چنانچہ لیگ پر لازم ہے کہ وہ منچوکو کی قومی سلامتی اور خود مختاری کا احترام کرے۔ لیکن اس تجویز سے اتفاق رائے نہیں کیا گیا۔

لیٹن کمیشن نے اپنی ایک لمبی چوڑی رپورٹ مرتب کی اور ستمبر ۱۹۳۲ء کو لیگ کے جنیوا والے اجلاس میں بھیجی۔ یہ رپورٹ نہ صرف بحران منچوریہ کے بارے میں تھی بلکہ جاپان اور چین کے تعلقات کا مکمل احاطہ کرتی تھی۔ اس رپورٹ میں جہاں جاپانی قبضے کو ناجائز قرار دیا گیا تھا۔ وہاں اس بات سے بھی انکار نہیں کیا گیا تھا کہ ماضی میں چین کی پالیسی جاپان کے بارے میں اشتعال انگیز رہی ہے۔

رپورٹ میں یہ سفارش کی گئی تھی کہ چین اور جاپان آپس میں "جنگ نہ کرنے کا معاہدہ" No Aggression کریں۔ اور اس معاہدہ میں روس کو بھی شامل کیا جائے۔ مزید یہ کہ لیگ کی سرپرستی میں منچوریہ کو ایک آزاد اور خود مختار ریاست بنایا جائے اس رپورٹ پر کونسل اسمبلی اور اسمبلی کی مقرر کردہ انکوائری کمیٹی نے باری باری غور کیا۔ اور میثاقِ انجمنِ اقوام کے تحت انکوائری کمیٹی کو ایک رپورٹ تیار کرنے کو کہا گیا۔

انکوائری کمیٹی نے حسب ذیل سفارشات پیش کیں۔

جاپانی فوج کو منچوریا سے واپس بلایا جائے۔

چین کے اقتدارِ اعلیٰ کے تحت وہاں ایک خود مختار حکومت قائم کی جائے۔

موجودہ حکومت کو اراکینِ انجمن اقوام ماننے سے انکار کر دیں۔

چین اور جاپان کے باہمی اختلاف کو ختم کیا جائے۔

۲۴ فروری ۱۹۳۳ء کو اسمبلی کے اجلاس میں اس رپورٹ پر رائے شماری ہوئی۔ اجلاس میں ۴۴ ممالک نے شرکت کی۔ ان میں سے ۴۲ نے چین کے حق میں ووٹ دیا۔ سیام (موجودہ تھائی لینڈ) نے رائے شماری میں حصہ نہیں لیا۔ اور جاپان نے مخالفت میں ووٹ دے کر اپنا فرض ادا کر دیا۔ ایک ووٹ نتائج پر اثر انداز نہ ہو سکا۔ یوں ہی اسمبلی نے جاپان کے خلاف قرارداد پاس کی، تو جاپانی وفد ایک ساتھ ہال سے باہر نکل گیا۔ اور ایک ماہ بعد ۲۷ مارچ ۱۹۳۳ء کو باضابطہ طور پر لیگ کی رکنیت سے علیحدہ ہو گیا۔

اس کارروائی کی بدولت میثاقِ انجمن اقوام کی مٹی پلید ہو گئی۔ سب چھوٹی طاقتیں جان گئیں کہ لیگ بڑی طاقتوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ اور بڑی طاقتیں اُس وقت تک لیگ میں رہتی ہیں جب تک اُنھیں اُس میں اپنا مفاد نظر آتا ہے۔ جاپان کے نکل جانے سے لیگ آف نیشنز کا بحرالکاہل کے علاقے سے اثر و رسوخ بالکل ختم ہو گیا۔ امریکہ کا ممبر نہ ہوتے ہوئے لیگ کی کارروائی کو واشنگٹن میں خوش آمدید کہنا لیگ کا مذاق اڑانے کے مترادف تھا۔

لیگ جب جاپانی عزائم کو روکنے میں ناکام ہوئی تو دورِ جدید میں بھی یہ ثابت ہو گیا کہ آج بھی وہی صدیوں پرانا قانون چل رہا ہے۔"

"جس کی لاٹھی اُس کی بھینس۔"

عرب دنیا

مشرقِ وسطیٰ کا علاقہ دنیا کی تاریخ میں ہمیشہ ممتاز اور عظیم الشان تہذیبوں کا مرکز اور انبیاء کرام و مرسلین کی سرزمین رہا ہے۔ آج بھی عیسائیت، یہودیت اور اسلام کے مشترکہ قبلہ کی حیثیت سے دنیا کی کثیر آبادی کا روحانی مرکز ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ رفتارِ عالم پر نگاہ ڈالنے والے اس "خطۂ ارض" کو خصوصی دلچسپی سے دیکھتے ہیں۔

مشرقِ وسطیٰ میں ہم عراق فلسطین لبنان وشام سعودی عربیہ اور مصر سے بحث کریں گے۔ لیکن علیحدہ علیحدہ جائزہ لینے سے پہلے ذرا اس علاقے کی مجموعی حیثیت پر تبصرہ کرتا چلوں۔ یہاں پر اسلامی نظام صدیوں قائم رہا۔ یہاں سے ہی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خلافتِ اسلامیہ کی بنیاد رکھی۔ اور مسلمانوں کی پہلی مقدس ریاست "مدینہ" عمل میں آئی۔ اس علاقے کی آخری نگران خلافت "خلافت عثمانیہ" تھی جس کا مرکز انقرہ تھا۔ خلافتِ عثمانیہ کے تمام اہم امور ترکوں کے پاس تھے۔ عرب اپنے تہذیب و تمدن، نسل و زبان کی وجہ سے ترکوں سے اپنے آپ کو بہتر و اعلیٰ سمجھتے تھے۔ سترویں صدی عیسوی میں سلطنت عثمانیہ کا زوال شروع ہوا۔ اُنیسوی صدی میں برطانیہ نے اس مقدس سرزمین پر اپنے قدم جمالیے۔

۱۹۱۴ء کو پہلی جنگ لڑی گئی۔ جنگ کے دوران ۱۹۱۷ء کو یہودی اور برطانوی وزیر خارجہ کے مابین ایک معاہدہ ہوا جس کے تحت جنگ میں یہودیوں کو برطانیہ کا ساتھ دینا پڑا۔ اور برطانیہ نے اس کے بدلے یہودیوں کی ایک آزاد ریاست بنانے کا وعدہ کیا۔

دوسری طرف جنگ میں عربوں کو یہ لالچ دیا گیا کہ اگر جنگ میں

ہماری فتح ہو گی تو ہم تمہیں ترکوں سے آزاد کرا دیں گے۔

افسوس! مسلمانوں کی عقل نے کام نہ کیا۔ اور برطانیہ جیسا ہوشیار چالاک اور چالباز ملک مسلمانوں ہی کو مسلمانوں کے خلاف استعمال کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ ترکوں اور عربوں کی باہمی کشمکش کے نتیجے میں عربوں پر بڑی آسانی کے ساتھ یورپی تسلط قائم ہو گیا۔ اور یہودی ریاست کے قیام میں بھی سہولت میسر آئی۔ بدقسمتی سے اس وقت مسلم دنیا میں کوئی بھی ایسا ملک نہ تھا۔ جو عربوں کی قیادت کرتا۔ اور نہ ہی عربوں کے اندر ہی اتحاد و اتفاق تھا۔ جس سے یورپی اقوام نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔

پیرس امن کانفرنس جون ۱۹۱۹ء میں یہاں اتحادیوں نے اپنے دوسرے زیر اثر علاقوں کو نہیں پوچھا وہاں عربوں کو بھی دعوت نہیں دی گئی۔ بلکہ جنگ کے بعد ان علاقوں پر لیگ آف نیشنز کے میثاق کے تحت ان پر انتدابی نظام قائم کیا۔ جس سے اُن عرب رہنماؤں کو بڑی تکلیف محسوس ہوئی۔ جو ایک متحدہ عرب ریاست کی آس لگائے بیٹھے تھے۔ گویا عالمی جنگوں کی درمیانی مدت میں عربوں کے لیے آزادی کی کشمکش تھی۔ کیونکہ وہ خلافتِ عثمانیہ سے نکل کر برطانیہ اور فرانس کے زیرِ نگرانی آ چکے تھے۔ عرب ممالک کو برطانیہ سے اپنی آزادی کے حصول کی خاطر جن حالات سے گزرنا پڑا۔ اُن کا یہاں ذرا تفصیل سے ذکر کیا جائے گا۔

عراق

عراق کے علاقے سے برطانوی انتداب کی ابتداء ہوئی۔ یہ انتداب کوئی باضابطہ طور پر لیگ کی طرف سے نہیں ہوا تھا۔ بلکہ عراق اور برطانیہ نے آپس میں ایک معاہدے کے تحت منظور کیا۔ جسے بعد

میں لیگ آف نیشنز سے منظور کروایا گیا تھا۔
معاہدے کے تحت برطانیہ نے عراق سے عہد کیا تھا کہ وہ عراق کو ایسے ضروری مشورے اور امداد دے گا۔ جو عراق کے قومی اقتدارِ اعلیٰ کے منافی نہ ہوں گے۔

• برطانیہ کے لیے عراق کی اہمیت تیل کے وافر چشموں اور یورپ و ایشیا کے درمیان واقع ہونے کی وجہ سے تھی۔ برطانوی رائے عامہ کا ایک خاصہ طبقہ عراق پر غیر معینہ مدت کے انتداب کے خلاف تھا۔ چنانچہ لیگ کے میثاق کے تحت عراق سے یہ وعدہ کیا گیا کہ جب وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل ہو جائے گا تو اُسے آزاد کر دیا جائے گا۔ یہ وقت عراق کو ۱۹۳۶ء میں جا کر نصیب ہوا اور عراق برطانیہ سے دوستی کا ایک ۲۵ سالہ معاہدہ کر کے لیگ کا ممبر بن گیا۔ عربوں میں یہ پہلا ملک تھا جو لیگ کا ممبر بنا۔
عراق اور ترکی کے درمیان موصل کے علاقے کا سرحدی تنازعہ تھا۔ لوزان کانفرنس میں جب یہ مسئلہ حل نہ ہو سکا تو لیگ کے تحت اس مسئلے کے حل کے لیے ایک کمیشن مقرر کیا گیا۔ ترکی کے احتجاج کو نظر انداز کرتے ہوئے برطانیہ کے حق میں فیصلہ دیا گیا۔ برطانیہ کی مدد سے اس علاقے میں تیل کی ایک پائپ لائن بچھائی گئی جو طرابلس، (شام) سے حیفہ (فلسطین) تک جاتی تھی۔ اسے یورپ تک لے جانے کا پروگرام تھا۔

اردن اور فلسطین

ایشیاء میں برطانیہ کا دوسرا انتداب اُردن اور فلسطین پر قائم ہوا۔ اس علاقے کو دریائے اُردن نے جغرافیائی اور انتظامی لحاظ سے دو[۲] حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ اس دریا کے مشرق کی طرف اردن اور

مغرب کی طرف "فلسطین واقع ہے۔

اردن ایک ٹھیٹھ عرب ریاست ہے وہاں پر حکومت برطانیہ نے اپنے مقرر کردہ امیر کو وسیع اختیارات دے رکھے تھے تاکہ امن و امان برقرار رہے۔ اردن کو دوسری جنگِ عظیم کے بعد ۱۹۴۶ء میں آزادی نصیب ہوئی۔ اردن کے برعکس فلسطین کے انتداب کا مسئلہ کافی پیچیدہ تھا۔ اس کا تفصیلی ذکر زلیونزم کے حصے میں کر دیا گیا ہے۔

لبنان اور شام

یہ علاقے فرانسیسی انتداب کے ماتحت تھے۔ فرانس نے اپنی انتظامی سہولت کی خاطر اس علاقے کو لبنان اور شام میں تقسیم کر رکھا تھا۔ فرانس کو اس علاقے کے انتداب میں برطانیہ کے مقابلے میں کچھ زیادہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ کیونکہ فرانس اس علاقے میں اپنی انتظامیہ کے ذریعے اپنے قوانین نافذ کرنا چاہتا تھا لیکن یہاں پر اکثریت مسلمانوں کی تھی۔ اپنے نظام حیات کو چھوڑ کر وہ کیسے فرانسیسی نظام قبول کر سکتے تھے۔ اس کشمکش کے نتیجہ میں ہائی کمشنر مسٹر سرّیل Mr. Sarrail نے جہازوں اور ٹینکوں سے دمشق پر حملہ کیا۔ اور عربوں کی عوامی مزاحمت کو کچل دیا اور انتدابی ہائی کمشنر نے عربوں سے ۴۴ ہزار ڈالر اور ۳ ہزار رائفلیں تاوان کے طور پر طلب کیں۔ جب عربوں کی طرف سے اس ہرجانے کے ادا کیے جانے کا انکار کیا گیا تو سرّیل کی طرف سے دوسرے حملے کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ لیکن لیگ کے انتدابی کمیشن کی مداخلت کی وجہ سے یہ حملہ ترک ہو گیا۔

فرانسیسی صدر پون کارے نے ۱۹۲۷ء میں یہاں ایک عبوری قانون نافذ کیا۔ لیکن عوام نے اس کی پرزور مخالفت کی۔ چنانچہ ۱۹۳۲ء

کو انتخابات کروا کر وسیع پیمانے پر دھاندلیاں کی گئیں۔ تاکہ قوم پرست کامیاب نہ ہو سکیں۔ اس دھاندلی کی وجہ سے سیاسی استحکام کے بجائے سیاسی انتشار پھیلا۔ تو تمام اختیارات ہائی کمشنر نے دوبارہ واپس لے لیے۔ یہاں ایک طرف فلاحی اقدامات کیے گئے وہاں دوسری طرف آزادی کی تحریک کو خوب دبایا گیا۔

۱۹۳۶ء کو شام اور فرانس کے درمیان مذاکرات کے ذریعے دوستی کا ایک معاہدہ ہوا۔ جس کی توثیق کے بعد شام نے فرانس کی تائید کے ساتھ انجمن اقوام کی رکنیت کے لیے درخواست دینی تھی۔ لیکن تین سال گزرنے کے باوجود اس کی توثیق نہ ہو سکی۔ تو قوم پرستوں نے دمشق میں فسادات برپا کر دیے۔ جس سے ہائی کمشنر نے شامی پارلیمنٹ توڑ دی اور اختیارات پانچ ناظموں کی ایک مجلس کے حوالے کر دیے گئے۔ دوسری جنگ کے دوران ۱۹۴۱ء میں لبنان اور شام کو آزاد کر دیا گیا۔

سعودی عرب

نجد کے حکمران ابن السعود نے جنگِ عظیم اول ۱۹۱۴۔۱۹ء کے دوران ترکی کے خلاف اتحادیوں کی حمایت کی۔ جس کی وجہ سے ابن السعود کو اتحادیوں خاص کر برطانیہ کی طرف سے کافی امداد ملنے لگی۔ لیکن جنگ کے بعد جہاں دیگر عربوں سے نہیں پوچھا گیا۔ وہاں پیرس امن کانفرنس ۱۹۱۹ء میں ابن السعود کو بھی کوئی حیثیت نہ دی گئی۔ چنانچہ انگریزوں کے اس رویے کے پیشِ نظر ابن السعود نے فتوحات کا آغاز کیا۔ حجاز کے بادشاہ شریف حسین کو شکست دے کر اس علاقے کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ اور نئی مملکت "سعودی عربیہ" کے نام سے قائم کر دی۔

ابن السعود کی اس کارروائی کی بدولت بین الاقوامی امن خطرے میں پڑ گیا۔ کیونکہ ان اقدامات سے بحیرہ قلزم Red Sea اور بحیرہ عرب Arabian Sea کے علاقوں میں طاقت کا توازن بگڑ گیا۔ السعود کا پروگرام تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے والا عرب دوبارہ متحد ہو جائے سعودی عرب نے لیگ کے ممبر بننے کی درخواست نہیں دی بلکہ ۱۹۳۶ء میں عراق اردن اور مصر سے معاہدات کر کے اپنی پوزیشن مضبوط کر لی۔ ۱۹۳۹ء سے پہلے عرب دنیا میں صرف سعودی عرب ہی ایک خود مختار اور آزاد ملک رہ گیا تھا۔

۱۹۳۶ء میں عربوں کے اندر جو اتحاد اور اتفاق پیدا ہوا۔ اس کی بڑی وجہ ایبے سینا کی جنگ تھی۔ کیونکہ عربوں کا خیال تھا کہ کہیں مسولینی کی جارحیت عرب کا رخ نہ کرے۔

مصر

مصر پر ۱۸۸۲ء میں برطانیہ نے اپنا تسلط قائم کیا۔ اور ترکی کی برائے نام بالادستی قائم رہی۔ پہلی عالمی جنگ کے بعد یہ بالادستی بھی ختم ہو گئی۔

برطانیہ نے مصر سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اسے جنگ میں استعمال نہیں کرے گا۔ لیکن جلد ہی برطانیہ اپنے وعدے سے پھر گیا۔ شروع شروع میں تو اچھے معاوضے پر مصری مزدور اور اونٹ استعمال کیے گئے۔ مگر جلد ہی مصریوں کا استحصال ہونے لگا۔

جنگ کے بعد پیرس امن کانفرنس جون ۱۹۱۹ء میں برطانیہ نے یہاں دوسری نوآبادیات کے نمائندوں کو دعوت دی وہاں مصریوں سے پوچھا تک نہیں گیا۔ یہ وہ وقت تھا جس وقت مصر میں قوم پرست

تحریک زور پکڑ رہی تھی۔ اس تحریک کی کامیابی کے لیے مصری لیڈر ایس زیڈ پاشا نے وفد wafed کے نام سے ایک سیاسی پارٹی بنائی۔ اور اپنے حقوق کی خاطر برطانیہ اور فرانس کا دورہ کیا۔

مسٹر ایس زیڈ پاشا کو گرفتار کر کے مالٹا بھیج دیا گیا۔ جس سے مصر میں ایک طوفان برپا ہوا۔ ہڑتالیں شروع ہوئیں، جلوس نکلے ایجی ٹیشن ہوئے تالا بندیوں تک نوبت آئی۔ لیکن فوج کے ذریعے اس تحریک کو کچل دیا گیا۔

بالآخر ۱۹۲۲ء میں مصر کو نیم آزادی دی گئی۔ اور اہم امور ملکہ برطانیہ کے پاس رہے۔ مثلاً:۔

مصری دفاع، نہر سوئز کی حفاظت، سوڈان کا کنٹرول۔ غیر ملکیوں کے حقوق کا تحفظ وغیرہ۔

۱۹۲۹ء میں جب برطانیہ میں لیبر حکومت برسرِ اقتدار آئی تو مصر نے آزادی کی کوششوں کو دوبارہ تیز تر کر دیا۔ ان کوششوں کی بدولت برطانیہ اور مصر کے مابین ایک معاہدہ عمل میں آیا۔

ا۔ ○ برطانیہ نہر سوئز کے علاوہ تمام مصری علاقوں سے فوجیں واپس بلا لے گا۔

ب۔ ○ مصری افواج کو برطانیہ میں تربیت دی جائے گی۔

ج۔ ○ آپس میں باہمی امداد اور سفیروں کے تبادلے کیے جائیں گے۔

یہ معاہدہ مصطفےٰ نحاس پاشا نے مسترد کر دیا۔ اور مصر میں اکتوبر ۱۹۳۰ء کو نیا آئین نافذ کیا گیا۔ اقتدارِ اعلیٰ کی مکمل آزادی کے لیے کشمکش دوسری جنگِ عظیم تک جاری رہی۔ اور جنگِ عظیم دوم کے بعد مصر ایک مقتدر ریاست بن گیا۔

○

معاہدہ جینوا ستمبر ۱۹۲۴ء

TREATY OF GENEVA

تاوان کے مسئلہ کے حل کے لئے ڈاوز پلان پر ۳۰ اگست ۱۹۲۴ء میں امریکہ برطانیہ فرانس اٹلی اور جرمنی کے نمائندوں سے لندن میں دستخط کرنے کے بعد اگلے ماہ جینوا میں مجلس اقوام کی اسمبلی میں فرانس کے تحفظ کے تصفیہ طلب مسئلے کو طے کرنے کیلئے ایک اہم کوشش کی گئی۔ فرانس حالانکہ ۱۹۲۲ء میں ضمانتی معاہدے کی برطانوی تجویز کو مسترد کر چکا تھا۔ نومبر ۱۹۲۰ء میں مجلس اقوام نے ہتھیاروں کی تخفیف کے بحث طلب مسئلے کو حل کرنے کی کوششیں شروع کر دی تھیں ۱۹۲۳ء میں مجلس اقوام کی اسمبلی میں اجتماعی تحفظ کا نظریہ پیش کیا جا چکا تھا۔ جس کے تحت اسمبلی کو صرف یہ فیصلہ کرنا تھا کہ کسی لڑائی میں حملہ آور کون ہے پھر اس کے خلاف فوجی کارروائی کی ذمہ داری کن ارکان پر عائد ہوتی تھی۔

ستمبر ۱۹۲۴ء میں اسمبلی نے "معاہدہ جینوا" تیار کر کے حکومتوں کو منظوری کے لئے بھیج دیا۔ معاہدہ جینوا کا پورا نام "بین الاقوامی تنازعات کے پرامن تصفیہ کا معاہدہ" تھا۔ ۲ اکتوبر ۱۹۲۴ء کو مجلس اقوام کی اسمبلی نے اس معاہدے کی توثیق کر دی۔

معاہدہ کی خصوصیات

اس معاہدہ کی خاص خاص باتیں حسب ذیل ہیں:-

(۱) اس معاہدہ میں کوشش کی گئی کہ مجلس اقوام کے میثاق کو بہتر بنایا جائے گا

(۲) قانونی نوعیت کے تمام تنازعات کو مستقل عدالت برائے بین الاقوامی انصاف میں پیش کیا جائے گا۔

(۳) دیگر تنازعات کو میثاق مجلس اقوام کے طریقہ کار کے تحت ہی رکھا گیا لیکن اگر کونسل کسی متفقہ فیصلے پر نہ پہنچتی تو تنازعہ کو ثالثی کی ایک جماعت کے حوالے کر دیتی جس کے فیصلے کی پابندی لازمی ہوتی تھی۔

(۴) سلامتی اور ہتھیاروں کی تخفیف کے درمیان توازن قائم رکھنے کی غرض سے معاہدہ میں

یہ تجویز پیش کی گئی تھی کہ تخفیف اسلحہ کی کانفرنس ۲۵ جون ۱۹۲۵ء کو منعقد کی جائے بشرطیکہ اس وقت تک کافی ریاستیں اس کی توثیق کر چکی ہوں۔

معاہدہ جینوا میں کونسل کے اختیارات دینے کے لئے کچھ نہیں کیا گیا۔ اس طرح فرانسیسی مطالبے کو پورا کرنے میں یہ دستاویز باہمی امداد کے معاہدہ سے کچھ آگے نہیں جانے پائی ۱۹۲۴ء میں فرانسیسی حکومت نے اس معاہدے کو کافی سمجھتے ہوئے قبول کر لیا یہ اُس صلح جوئی کا زبردست ثبوت ہے جو پوئن کارے کے زوال کے بعد سے فرانسیسی پالیسی میں پیدا ہو گئی تھی۔ فرانس کی حکومت نے اس معاہدے کو اس لئے بھی قبول کر لیا تھا کہ اس میں معاہدہ ورسیلز کے تصفیوں کو بحال رکھا گیا تھا۔ ۱۹۲۴ء میں اس معاہدہ پر کسی قسم کی تنقید نہیں کی گئی۔ جرمنی مجلس اقوام کا رکن نہیں تھا اور نہ ہی سابقہ چھوٹی چھوٹی دشمن ریاستوں کو یہ امید تھی کہ وہ اتنی طاقتور ہو جائیں گی کہ حملہ کر سکیں۔ بلکہ انھیں تو خود حملے کا خوف ستائے جا رہا تھا۔ چنانچہ سبھی نے خوشی خوشی معاہدہ جینوا پر دستخط کر دیئے۔

اس معاہدہ کے ردعمل میں پہلا ہنگامہ ان دفعات کے سلسلے میں اٹھا جن میں داخلی عمل داری سے تعلق رکھنے والے معاملوں کو مجلس اقوام کے سامنے پیش کیا جا سکتا تھا۔ اس تجویز کو پیش کرنے میں جاپانی پالیسی کو سبھی جانتے تھے کہ کنیڈا، آسٹریلیا، اور نیوزی لینڈ نے امریکی مثال کی پذیرائی کرتے ہوئے اپنے علاقوں سے جاپانی توطن گیروں IMMIGRANTS کو نکال دیا تھا۔ جاپان چاہتا تھا کہ ان بندشوں کے خلاف جینوا میں احتجاج کرانے کا حق منوا لے۔ ایسا حق دینے کے لئے معاہدہ کی دفعہ ۱۱ میں کافی گنجائش بھی تھی لیکن برطانوی قلمرویں DOMINIONS تحریری صورت میں اِسے ماننے سے ہچکچا رہی تھیں۔ توطن گیروں کے مسئلے سے متعلق ان کے گھریلو قوانین پر مجلس اقوام کبھی بھی بحث یا اعتراض کر سکتی تھی اور یہ جلد واضح ہو گیا کہ کچھ اور نہیں تو جینوا کے معاہدہ کی توثیق سے انکار کر دے گی۔

معاہدہ جینوا کی کچھ دیگر دفعات پر بھی قلمرووں اور برطانیہ میں نکتہ چینی کی گئی مثلاً لازمی ثالثی ایسی جدت تھی جس میں برطانوی رائے عامہ آسانی سے راضی نہیں ہو سکتی تھی نیز سلطنت برطانیہ عظمٰے میں تہدیدوں یعنی دھمکیوں کو کبھی بھی پسند نہیں کیا گیا۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ اگر برطانیہ میں وہی حکومت رہتی جس نے معاہدہ جینوا پر دستخط کئے تھے تو شاید معاہدہ برقرار رہتا۔ لیکن نومبر ۱۹۲۴ء کے انتخابات میں مکڈانلڈ کی لیبر حکومت کی جگہ بالڈون کی کنزرویٹو

حکومت قائم ہو گئی جس سے جینوا کے معاہدے کی قسمت پر مہر لگ گئی۔ ۱۰ مارچ ۱۹۲۵ئہ میں نئے وزیر خارجہ آسٹن چیمبرلین نے باضابطہ طور پر مجلس اقوام کی کونسل کو یہ سنا دیا کہ برطانیہ نے اس "معاہدہ نامہ" کو قبول نہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس طرح یہ مجوزہ معاہدہ صرف چھ ماہ اپنی حیاتی برقرار رکھ سکا۔

معاہدہ لوکارنو دسمبر ۱۹۲۵ئہ

TREATY OF LOCARNO

جرمنی، فرانس، برطانیہ، اٹلی، چیکوسلواکیہ، پولینڈ اور بلجیم کے وفود نے سوئٹزرلینڈ میں لوکارنو کے مقام پر ۵ اکتوبر سے ۱۶ اکتوبر ۱۹۲۵ئہ تک ملاقاتیں کیں، کانفرنس میں جنگ عظیم اول کے بعد پہلی مرتبہ باہمی نفرت کے بجائے دوستی اور خیر سگالی کے جذبات ظاہر کئے گئے۔ اس تبدیل شدہ فضا کو لوکارنو کے خاص ماحول سے منسوب کیا گیا۔ اس خوش آئندہ ماحول میں سات معاہدے ہوئے۔

(۱) ایک معاہدہ میں جرمنی فرانس اور بلجیم نے ایک دوسرے کی اس وقت کی سرحد کو تسلیم کرنے کے بعد انھیں تبدیل نہ کرنے اور ایک دوسرے پر حملہ نہ کرنے کا وعدہ کیا۔ برطانیہ اور اٹلی نے مذکورہ بالا ملکوں کو اس معاہدہ کا پابند رکھنے اور اس کے خلاف عمل پیرا ہونے والے ممالک کے خلاف عسکری اقدامات کی ذمہ داری لی تھی

(۲) جرمنی و بلجیم (۳) جرمنی و فرانس (۴) جرمنی و پولینڈ اور (۵) جرمنی و چیکوسلواکیہ کے مابین ثالثی کے معاہدے ہوئے۔ علاوہ ازیں (۶) فرانس و پولینڈ اور (۷) فرانس و چیکوسلواکیہ کے درمیان جرمن جارحیت کے پیش نظر معاہدات قرار پائے۔ ان تمام معاہدوں کی یکم دسمبر ۱۹۲۵ئہ کو لندن میں باقاعدہ توثیق کر دی گئی۔

ان تمام معاہدات میں سرفہرست معاہدہ جرمنی و دیگر ممالک کی سرحدات کے بارے میں تھا۔ اس میں جرمنی کی مغربی سرحدوں کو مستقل کر دیا گیا تھا اور اراکین معاہدہ جرمنی و بلجیم اور فرانس نے ایک دوسرے پر عدم جارحیت کی رضامندی ظاہر کی۔ لیکن اگر ذوجی انخلا کے اصول کی خلاف ورزی کی گئی تو وہ اپنا دفاع کریں گے اور یہ اقدام مجلس اقوام کی دفعہ ۱۶ کے مطابق ہوگا۔ اس کی رو سے مجلس اس ملک کے خلاف کارروائی کر سکتی تھی جس نے حملہ کی ابتدا کی ہو۔ اراکین نے یہ بھی فیصلہ

کیا کہ ہر قسم کے مسائل پر امن ذرائع سے حاصل کئے جائیں گے اور جو مسائل سیاست کے عام اصولوں سے حل نہ ہو سکیں گے تو ان معاملات کو مجلس اقوام کی کونسل میں آخری فیصلے کے لئے پیش کیا جائے گا۔

اراکین اس ملک کی مدد کریں گے جو جارحیت کا شکار ہوگا۔ اس معاہدے پر عمل درآمد کے لئے ضروری تھا کہ جرمنی مجلس اقوام کی رکنیت اختیار کرے۔

ثالثی کے چاروں معاہدوں میں کہا گیا کہ جرمنی اور دیگر ممالک اپنے مسائل دوستانہ فضا میں حل کریں گے اور اگر ایسا نہ کر سکے تو اپنے مسائل کو ثالثی کی عدالت یا بین الاقوامی انصاف کی مستقل عدالت میں پیش کریں گے۔ لیکن یہ دفعات ان تنازعات پر لاگو نہ ہو رہی تھیں جو اس کنونشن سے قبل وقوع پذیر ہوئے تھے اس کی پابندی ان مسائل کی صورت میں لازمی نہ تھی جو امن کے سمجھوتے (معاہدہ ورسیلز) کے نتیجے میں پیدا ہوئے تھے۔

فرانس و پولینڈ اور فرانس و چیکوسلواکیہ کے درمیان طے پانے والے معاہدوں میں کہا گیا تھا کہ اگر خاص معاہدوں کے دستخط کنندہ ممالک لوکارنو کے وعدوں کی پابندی نہ کر سکے تو وہ غیر اشتعال شدہ حملے کی صورت میں ایک دوسرے کی فوری مدد کریں گے۔

جنگ عظیم کے بعد یہ پہلا معاہدہ تھا جو تمام اقوام کے درمیان برابری کی بنیاد پر ہوا تھا۔ اس معاہدہ میں جرمنی نے معاہدہ ورسیلز کی شرائط کو تسلیم کر لیا تھا۔ جس کی وجہ سے ماہرین کا کہنا ہے۔

"معاہدہ ورسیلز کی تکمیل معاہدہ لوکارنو میں آکر ہوئی۔"

معاہدہ لوکارنو میں یہ بات ضرور قابل غور ہے کہ اس میں جرمنی کی مغربی و مشرقی سرحدوں میں تفریق پیدا کر دی گئی تھی۔ جرمنی کی مغربی سرحدوں کی حفاظت و تحفظ کے لئے برطانیہ اور اٹلی تیار تھے لیکن مشرقی سرحدوں کی حفاظت کے لئے کوئی تیار نہ تھا جو پولینڈ اور چیکوسلواکیہ کے ساتھ ملتی تھیں اس لئے اشارۃً یہ بتا دیا گیا تھا کہ مشرقی سرحدیں جائز نہیں ہیں۔ ان میں تبدیلی ہوگی۔ مگر سرحدوں کی تبدیلی کے لئے جرمنی کو جنگ کرنے کا اختیار نہ تھا۔ اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے اسے ثالثی کا طریقہ اختیار کرنے کو کہا گیا تھا۔

بہر حال اس معاہدہ کی بدولت کچھ عرصے کے لئے فرانس اور جرمنی کے درمیان کھچاؤ کم ہو گیا اور اس حقیقت کو تسلیم کیا گیا معاہدہ ورسیلز جون ۱۹۱۹ء عدل و انصاف پر مبنی نہیں تھا۔ اس معاہدہ میں جرمنی کو پوری نہ سہی جزوی طور پر بڑی طاقتوں کے خاندان میں ایک باعزت رکن کی

حیثیت سے قبول کر لیا گیا۔

تنقید و تبصرہ

(۱) گیھتون ہارڈی نے معاہدہ لوکارنو کی اہمیت ان الفاظ میں بیان کی ہے۔

"برطانیہ نے بہتر تحفظ کا جو احساس فرانسیسیوں اور جرمنوں کے دماغ میں پیدا کر دیا تھا اس سے کشیدگی اور جنگ کی فضا ختم ہو گئی قطع نظر اس کے کہ برطانیہ عملاً اپنے وعدے پورے بھی کر سکتا تھا یا کہ نہیں۔ دراصل جنگ کے متلاشی کو اپنے مقاصد کی تکمیل سے باز رکھنا ہی اصل مقصد ہوتا ہے اسے شکست دے کر یا گرفتار کر کے تباہی کی تلافی نہیں کی جا سکتی یہ معاہدہ امن اور جنگ کے مابین حقیقی دیوار تھی"۔

(۲) آسٹن چیمبرلین کی رائے ہیں

"یہ معاہدہ جنگ اور امن کے سالوں کے درمیان تفریق کرتا ہے"۔

(۳) لنگ سیم کے مطابق

"معاہدہ لوکارنو امن کا حقیقی محافظ نہ بن سکا۔ جرمنی کی مشرقی سرحدوں کا مسئلہ جوں کا توں رہا اور اس امر کی کوئی ضمانت نہ تھی کہ یہ مسئلہ پرامن طور پر حل ہو جائے گا ۱۹۲۵ء کے بعد بین الاقوامی معاملات میں دوستانہ ماحول کا فروغ اس معاہدے کی سب سے بڑی خوبی تھی"۔

(۴) بال اور کلو نے یوں تبصرہ کیا ہے۔

"لوکارنو کے معاہدے کے بعد جرمنی مجلس اقوام کا رکن (ستمبر ۱۹۲۶ء) بن گیا حالانکہ اس معاہدہ سے پہلے جرمنی کو ایک مفرور مجرم کی حیثیت سے دیکھا جاتا تھا"۔

(۵) بقول ای۔ ایچ کار:۔

"بالآخر معاہدہ لوکارنو معاہدہ ورسیلز اور میثاق مجلس اقوام کے حق میں تباہ کن ثابت ہوا"۔

(۶) بریانڈ کہتے ہیں:۔

"معاہدہ لوکارنو امن کے لئے ایک ذریعہ ہے فرانس اور جرمنی کے مابین ابھی جھگڑے باقی تھے۔ مگر اب ثالث کو فیصلہ کرنا تھا نہ کہ فریقین کا"۔

(۷) سائمنڈ اور رینیسی کے بقول:۔

"معاہدہ لوکارنو کی اہمیت اس بات میں ہے کہ اس نے مجلس اقوام کی اہمیت بتا دی

اور دنیا کو بھی اس سے آگاہ کر دیا جو علاقائی سلامتی کے لئے اسے اہم کہتے تھے"۔

تھامپسن کا خیال ہے:۔

(۸) "۱۹۲۵ء کی ساز گار فضا میں معاہدوں نے بلاشبہ یورپ میں امن کی فضا پھیلا دی۔ جس میں فرانس اور جرمنی کی ضرورتوں کو عزم داری کے ساتھ تسلیم کیا گیا لیکن یہ معاہدے تباہ کن اس لئے تھے کہ جرمنی کی مغربی سرحدوں کو مقدس اور مستقل تصور کیا گیا تھا۔ اس کا مطلب ہوا کہ معاہدہ ورسیلز صرف اس حد تک موثر تھا جس حد تک جرمنی نے اس کی تائید کی تھی۔ برطانیہ کی اس تفریق نے کسی بعض یا مخصوص سرحدوں کی حفاظت کرے گا اس سمجھوتے کے وعدوں پر پانی پھیر دیا"

(۹) گرانٹ اور ٹمپرلے کے مطابق:۔

" لوکارنو کا معاہدہ بیکار نہ تھا۔ اگرچہ اس موقعہ پر دور اندیشی سے کام لیا گیا تھا لیکن اس نے آسٹن چیمبرلین کی اس پیش گوئی کو پورا نہ کیا کہ یہ جنگ اور امن کے سالوں میں تفریق کرتا ہے"۔

(۱۰) ایک عام رائے یہ بھی ہے کہ

" لوکارنو کے معاہدہ کی بدولت یورپ میں اقتصادی اور سیاسی حالات میں بہتری آئی۔ جینوا یورپ کے مرکز کی حیثیت حاصل کر گیا۔ مجلس اقوام کا وقار بلند ہوا ڈاوز پلان ۱۹۲۴ء کی بھی تکمیل ہوئی یعنی جرمنی کو بڑی طاقتوں میں پوری برابری تو نہیں البتہ ایک کامل اور باعزت مقام حاصل ہو گیا"۔

افسوس اس بات کا ہے کہ مجلس اقوام جرمنی کی امیدوں پر پوری نہ اتری جرمنی کو وہ کچھ نہ مل سکا جس کا وہ طلبگار رہا تھا۔ مجلس اقوام نے معاہدہ ورسیلز کی رُو سے تخفیف اسلحہ کی عالمی کانفرنس فروری ۱۹۳۲ء کو جینوا میں بلائی اس کانفرنس میں اتحادیوں پر وہ پابندیاں نہیں لگائی گئیں جن کا اطلاق معاہدہ ورسیلز کے تحت جرمنی پر کیا گیا تھا۔ چنانچہ جرمنی نے یہ اعلان کیا کہ جرمنی اس وقت تک کانفرنس کے فیصلے کو تسلیم نہیں کریگا جب تک قوموں کے درمیان "حقوق کی برابری کے اصول" قطعی طور پر تسلیم نہیں کر لیا جاتا اس دوران جرمنی میں ہٹلر برسر اقتدار آگیا اس نے مجلس اقوام سے ویسے ہی چھٹکارہ چاہا تاکہ اپنے عزائم کی تکمیل کر سکے چنانچہ ۱۴ اکتوبر ۱۹۳۳ء کو ہٹلر نے مجلس اقوام اور کانفرنس سے باقاعدہ علیحدگی کا اعلان کر دیا ۱۹۳۶ء میں ہٹلر نے رائن لینڈ پر قبضے کا حکم دیا تو یہ معاہدہ کالعدم ہو گیا اس واقعہ کے بعد برطانیہ پر فرانس سے متعلق اور اٹلی پر ہر دو ممالک پر بلجیم سے متعلق امداد و اعانت کی جو ذمہ داریاں عائد ہوتی تھیں

ان کی تجدید کر لی گئی تھی۔

معاہدہ کیلوگ بریان اگست ۱۹۲۸ء

KELLOGG BRIAND PACT

اس معاہدہ کو میثاق امن بھی کہتے ہیں۔ اس کا مقصد قومی پالیسی کے طور پر جنگ کی مذمت اور بین الاقوامی تنازعات کو حل کرنا تھا اس معاہدے سے پیشتر ۱۹۲۳ء کے سیمسل ایکومین امداد باہمی کے مسودے میں اعلان کیا جا چکا تھا۔ کہ جارحانہ جنگ ایک بین الاقوامی جرم ہے لہٰذا اراکین بھوتہ یہ جرم نہیں کریں گے۔ ۱۹۲۴ء کے جینوا پروٹوکول میں بھی یہی بات دہرائی گئی کہ جارحانہ جنگ بین الاقوامی معاشرے کے ارکان کے استحکام کے لئے تباہ کن ہوگی اور یہ ایک عالمی جرم ہے۔ دستخط کنندہ نے اس بات کی حامی بھری کہ وہ صرف جارحیت کو روکنے یا مجلس اقوام کی مرضی سے جنگ کریں گے مگر برطانیہ کی عدم توجہی یا مخالف کی وجہ سے اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔

معاہدہ کیلوگ بریان سے متعلق ابتدائی بات چیت جون ۱۹۲۷ء میں شروع ہوئی بریاں (فرانسیسی) نے امریکہ کے سیکریٹری آف اسٹیٹ مسٹر کیلوگ کو یہ تجویز پیش کی کہ دونوں ممالک کے مابین جنگ کو قومی پالیسی کے آلہ کے طور پر ترک کر دینے کا معاہدہ ہونا چاہیئے۔ امریکہ نے یہ موقف اختیار کیا کہ اس مجوزہ معاہدہ کا اطلاق عالمگیر ہونا چاہیئے برطانیہ نے چند شرائط کے تحت معاہدہ میں شرکت کی۔ برطانیہ دنیا کے کچھ حصوں میں آزادی عمل کا اختیار چاہتا تھا امریکہ کے "نظریہ منرو" کو تسلیم کر لیا گیا۔ اس معاہدہ میں پیرس میں ۲۷ اگست ۱۹۲۸ء کو پندرہ ممالک کے نمائندوں نے دستخط کئے۔ جن میں امریکہ، برطانیہ، فرانس، جرمنی، جاپان، بلجیم، پولینڈ، چیکوسلواکیہ اور برطانوی ہندزیادہ اہم ہیں۔ ۲۴ جولائی ۱۹۲۹ء کو امریکی صدر ہوور نے اعلان کیا کہ معاہدہ پر عمل درآمد کیا جائے گا۔ ۱۹۳۰ء کے آخر تک ۶۱ ممالک نے اس معاہدہ کو تسلیم کر لیا تھا۔

اس معاہدہ کی توثیق سب سے پہلے سوویت روس نے کی روسی کوششوں کی بدولت لیٹویا، ایسٹونیا، پولینڈ، رومانیہ لتھوانیا اور ترکی نے بھی شمولیت اختیار کر لی۔ روس نے اس معاہدہ کو موثر بنانے کے لئے مندرجہ بالا ممالک سے "لٹوی نوف پروٹوکول" نامی ایک معاہدہ بھی کیا تھا۔

امریکہ کا خیال تھا کہ کیلوگ بریاں معاہدہ ملک کے لئے منرو کے اصول کو نافذ العمل کرنے کے حق میں مداخلت نہیں کرتا۔ اس بات پر بھی اتفاق کیا گیا کہ یہ معاہدہ جارحانہ جنگوں کو روکتا ہے اور اس کا اطلاق دفاعی جنگوں پر نہیں ہوتا۔ یہ معاہدہ اس جنگ پر بھی لاگو نہیں ہوتا۔ جو اس ملک کے خلاف کی جائے۔ جس نے اس کی خلاف ورزی کی ہو یا ایسی جنگ جو مجلس اقوام کی ہدایت کے ماتحت لوکارنو کے معاہدے کے تحت یا دوسرے سمجھوتوں یعنی غیر جانبدار معاہدوں کے ماتحت ہوتی ہو۔

ابتدائیہ :

"بنی نوع انسان کی بہبود کو ترقی دینے کے لئے گہرے احساس فرض کے ساتھ اور بہ اطمینان کر کے کہ وقت آ گیا ہے کہ قومی پالیسی کے طور پر جنگ کو ترک کر دینا چاہیے پرامن اور دوستانہ تعلقات جو قوموں کے درمیان ہیں ان کو جاری رکھنے کے لئے اور ان کے تعلقات میں تمام تبدیلیاں پرامن طریقوں سے طے کرنے کے لئے دنیا کی مہذب قوموں نے قومی پالیسی کے طور پر جنگ نہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے"

دفعات معاہدہ :-

اس معاہدہ میں صرف تین ۳ دفعات تھیں۔

۱۔ اعلیٰ دستخط کنندگاں طاقتوں نے اقرار کیا وہ عالمی مسائل اور جھگڑوں کے تصفیہ کے لئے جنگی راستہ اختیار کرنے سے گریز کریں گے اور قومی پالیسی کے طور پر جنگ کو اپنانے سے ہمیشہ گریزاں رہیں گے۔

۲۔ معاہدہ کے دستخط کنندگان کے درمیان کسی بھی قسم اور کسی بھی وقت اٹھنے والے تنازعات پرامن طریق کار سے حل کئے جائیں گے۔

۳۔ اس معاہدہ کی توثیق۔ جرمنی، امریکہ، بلجیم، فرانس، برطانیہ، اٹلی، جاپان، پولینڈ اور چیکوسلواکیہ اپنے اپنے آئینی تقاضوں کو مدنظر رکھ کر کریں گے۔ واشنگٹن میں توثیق شدہ مسودات رکھتے ہی معاہدہ نافذ العمل سمجھا جائے گا۔ معاہدہ کو دوسری اقوام کی شمولیت کے لئے اس وقت تک کھلا رکھا جائے گا جب تک اس کی ضرورت محسوس کی جائے گی۔

تنقید و تبصرہ :

معاہدہ کی اہمیت کے بارے میں ماہرین کو کئی آراء سامنے آئی ہیں ۔

۱ - امریکی سیکریٹری آف اسٹیٹ مسٹر سٹمن :

" اراکین معاہدہ نے دستخط کر کے یہ بات واضح کر دی کہ جنگ پوری دنیا میں ایک غیر قانونی چیز ہے اسکے بعد جب قومیں جنگ میں مشغول ہوں گی تو ان میں سے ایک یا ایک سے زائد کے متعلق یہ تصور کیا جائے گا کہ انھوں نے معاہدہ کی خلاف ورزی کی ہے امریکہ ان کی قانون شکنی پر بھی مذمت کرے گا "۔

۲ - نورمبرگ بین الاقوامی فوجی ٹریبونل کے مطابق : -

" وہ قومیں جنھوں نے معاہدے پر دستخط کئے ہیں وہ جنگ کو قومی پالیسی بنانے کی مذمت کرتی ہیں، قانون بین الاقوام کے نقطہ نظر سے جنگ غیر قانونی چیز ہے ۔ اور وہ لوگ جو جنگ کا منصوبہ بناتے ہیں یا جنگ کرتے ہیں انھیں اس کے خوف ناک اور تباہ کن نتائج کا خمیازہ بھگتنا ہوتا ہے ۔ اگر ممالک ایسا کریں گے تو جرم کا ارتکاب کریں گے معاہدہ اس کی اجازت نہیں دیتا "۔

۳ - لینگ سیم نے اس امر پر افسوس کیا ہے کہ

" اس معاہدہ کی پشت پر کوئی قوت نافذہ نہ تھی ۔ موصوف اس معاہدہ کو " دانت " مہیا کرنا چاہتے تھے ۔ تاکہ کوئی بھی مملکت جنگ کو آسانی کے ساتھ دوسری مملکت پر مسلط نہ کر سکے اور اس معاہدہ کی پیروی صرف اخلاقی فریضہ کے طور پر نہ کی بلکہ قانونی فرض سمجھ کر کی جائے "۔

۴ - بال اینڈ کلو کا خیال ہے : -

" اس معاہدہ میں جارحانہ جنگ کی مذمت کی گئی ہے نہ کہ دفاعی جنگ کی حالانکہ ہر حملہ آور دفاعی جنگ لڑنے کا بہانہ بنا سکتا ہے یہی کمزوری اس معاہدہ کے زوال کی دلیل ہے ۔ ایک نمایاں خامی یہ بھی تھی کہ اس کو نافذ کرنے سے متعلق کوئی دفعہ موجود نہ تھی ۔ اس معاہدہ کی نوعیت نفسیاتی

تھی جو سریع الزوال ثابت ہوئی۔ اس معاہدے کے بعد عدم جارحیت پر مبنی بے شمار معاہدے ہوئے گویا "عدم جارحیت" کا خیال معاہدوں میں عموماً ایک رواج بن گیا تھا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ کہیں بھی جارحیت کی نہ تو تعریف کی گئی اور نہ ہی جارح کے لئے سزا تجویز کی گئی"۔

۵ ۔ سمنڈز اور رینیسی :۔

"فرانس نے بجا طور پر اس معاہدہ میں ترمیم کا مطالبہ کیا۔ کیونکہ اس میں نہ تو جارحیت کی تعریف کی گئی ہے اور نہ ہی اس کی سزا کا تذکرہ تھا فرانس اس لئے بھی غیر مطمئن تھا کہ نہ تو کوئی عدالت اس کی وضاحت کرنے والی ہے۔ اور نہ ہی کوئی پولیس فورس اسے نافذ کرنے والی ہے۔ امریکہ صرف اس لئے مطمئن تھا کہ اسے کوئی خاص ذمہ داری نہیں لینا پڑ رہی تھی"۔

۶ ۔ گیبھتوں ہارڈی :۔

"اس معاہدے میں جنگ کی عالمگیر پیمانے پر مذمت کی گئی اور اس معاہدہ نے ایسی بنیاد فراہم کردی تھی جس میں امریکہ اور روس جیسی مملکتیں مجلس اقوام سے باہر رہ کر بھی امن کی مجموعی تنظیم میں براہ راست دلچسپی لے سکتیں تھیں"۔

۷ ۔ دھیلر نبیٹ

"اس معاہدہ میں صرف جارحانہ جنگ کو رد کیا گیا تھا اس لئے ستمبر ۱۹۲۷ء میں پولینڈ کی قرارداد سے آگے جنگ روکنے کے لئے کچھ نہ کیا جا سکا یہ ضرور ہے کہ اس معاہدہ نے اس وقت دنیا میں امن کی فضا قائم کرنے میں مدد دی لیکن اس کا انحصار دستخط کنندہ ممالک کی نیک نیتی پر رہا یہ معاہدہ ان ممالک کے خلاف جنھوں نے اس کی کوئی پابندی نہ کی کوئی کارروائی نہ کر سکا"۔

کہا جاتا ہے کہ کیلوگ بریان کا معاہدہ مجلس اقوام کے میثاق سے مختلف تھا۔ میثاق مجلس ایک سیاسی معاہدہ تھا۔ جبکہ کیلوگ بریان کے معاہدہ کی پابندی

اخلاقی تھی۔ اس کی بنیاد جنگ ایک جرم کے احساس پر رکھی گئی تھی۔ میثاق مجلس میں بعض جنگوں کی اجازت تھی اور کچھ سے روکا گیا تھا۔ ان جنگوں کی سزا بھی مقرر کر دی گئی تھی۔ جن سے روکا گیا تھا۔ مگر کیلوگ برہان معاہدہ میں تمام جنگوں کی مذمت کی گئی تھی اور کسی جنگ کے لئے سزا نہیں مقرر کی گئی تھی۔

۸ - شوبین کا خیال ہے کہ

"اس معاہدہ پر عمل درآمد کرانے کے لئے قوت نافذہ کا فقدان تھا۔ کوئی بھی طاقتور ریاست جارحیت کا ارتکاب کر کے اسے ذاتی دفاع کا نام دے سکتی ہے دنیا اس کی لاکھ مذمت کرے طاقت ور ملک پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوگا اسے صرف قوت ہی سے روکا جا سکتا ہے"۔

مختصر یہ کہ معاہدہ کی کامیابی کا دارومدار عالمگیر ہونے پر تھا۔ لیکن بہت سارے ممالک مثلاً، ارجنٹائن، برازیل، بولیویا، السلواڈور وغیرہ اس سے الگ رہے۔ معاہدہ کی کامیابی کا دوسرا راز ممبر ممالک کی نیک نیتی پر تھا۔ مگر کچھ ہی عرصہ بعد جاپان اور اٹلی نے اس کی خلاف ورزی شروع کر دی۔ ان کی کارروائیوں پر پولیس ایکشن اور دفاعی جنگ کا خوبصورت پردہ ڈالا گیا۔ کیونکہ معاہدہ میں اس کی گنجائش تھی۔ اس معاہدہ کی بدولت مجلس اقوام کی افادیت میں کمی واقع ہوئی اور نہ ہی یہ معاہدہ امن کی مضبوط بنیادیں مہیا کر سکا۔ جنوری ۱۹۳۲ء میں امریکی حکومت نے اعلان کیا کہ وہ کسی ایسے معاہدہ یا میثاق کو تسلیم نہیں کرے گی جو معاہدہ کیلوگ برہان کی شرائط کی خلاف ورزی پر مبنی ہو۔ اس میثاق کے بعد دوسری عالمگیر جنگ کے علاوہ دنیا کی تقریباً سبھی لڑائیاں اعلان جنگ سے بے نیاز رہیں۔

برلن روم ٹوکیو محور

جاپان اور اٹلی جنگ عظیم اول میں اتحادیوں کے ساتھ تھے معاہدہ ورسیلز سے اٹلی مطمئن نہ تھا۔ کیونکہ اٹلی کو وہ مراعات نہ دی گئیں جن کا لندن پیکٹ ۱۹۱۵ء میں وعدہ کیا گیا تھا۔ مگر اس کے باوجود وہ مغربی جمہوری ممالک کے ساتھ تعاون کرتا رہا۔ حتیٰ کہ اس نے ۱۹۲۵ء کے معاہدہ لوکارنو کے تحت جرمنی کی مغربی سرحدوں کی حفاظت کی ضمانت دی۔ جو بلجیم اور فرانس سے ملی ہوئی تھیں۔ اٹلی جرمنی کے ساتھ آسٹریا کے الحاق کی مخالفت کر رہا تھا۔ لہٰذا اس بات کا امکان نہ تھا کہ وہ جرمنی کے دشمنوں کے ساتھ اتحاد کرے گا۔ ہٹلر نے ۱۹۳۸ء میں جب آسٹریا پر قبضہ

کرنے کی کوشش کی تو اٹلی نے فرانس اور برطانیہ کو فروری ۱۹۳۴ء کے اعلانیہ میں شامل ہونے کی ترغیب دی اور اس امر کا اعلان کیا کہ تینوں طاقتیں متعلقہ معاہدوں کے مطابق آسٹریا کی آزادی کے قیام کے لئے یکساں نقطہ نظر رکھتی ہیں۔ اسی سال اٹلی آسٹریا اور ہنگری کے وزرائے اعظم نے "روم پروٹوکول" پر دستخط کئے۔ تینوں کی طرف سے اس امر پر اتفاق کیا گیا کہ وہ یورپی ممالک کے آپس میں اتحاد عمل کو ترقی دینے کے لئے ایک پالیسی اختیار کریں گے ۱۹۳۳ء میں اٹلی نے سوویت روس سے جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کیا۔ جون ۱۹۳۴ء میں ہٹلر اور مسولینی کی پہلی ملاقات وینس میں ہوئی اس سے کوئی مفید نتائج تو برآمد نہ ہوئے۔ البتہ دونوں قائدین میں ہم خیالی پائی گئی جس سے مستقبل میں دوستی کے امکان روشن ہو گئے۔ اکتوبر ۱۹۳۵ء میں جب اٹلی نے ایبے سینیا پر حملہ کیا تو اسے کافی نقصان پہنچا۔ جس کی وجہ سے وہ جرمنی کے کافی قریب ہو گیا مجلس اقوام نے اس کے ردعمل کے طور پر اٹلی پر "معاشی ناکہ بندی" کی کوشش کی جو ناکام رہی۔

جاپان کی اس معاہدہ میں شرکت بھی واشنگٹن کانفرنس دسمبر ۱۹۲۱ء کا نتیجہ تھی اس کانفرنس میں تخفیف اسلحہ کے پانچ طاقتی صلح نامہ میں طے پایا کہ امریکہ اور برطانیہ کو برابری جاپان کو ان کا ۶۰ فیصد اور اٹلی و فرانس کو ۳۵ فیصد حصہ ملے گا۔ اسے ۳:۵:۵ کا فارمولا کہتے ہیں۔ جاپان نے اسے امریکہ اور برطانیہ کی اخلاقی برتری اور اپنی توہین تصور کیا۔ اپریل ۱۹۳۰ء کی لندن کانفرنس جس کا تعلق بحریہ کے اسلحہ کی تخفیف سے تھا۔ اس میں جاپان نے امریکہ اور برطانیہ کے مساوی تناسب کا مطالبہ کر دیا تھا۔ مگر امریکہ اور برطانیہ کے سمجھانے پر واشنگٹن تناسب پر راضی ہو گیا تھا۔ ۱۹۳۴ء میں امریکہ، برطانیہ اور جاپان کے نمائندوں نے ایک بار پھر بحری طاقت کی حدود پر بحث کی۔ جاپان نے اس میں برابری کا کھل کر مطالبہ کیا لیکن جاپان کی نہ مانی گئی جس پر جاپان نے دسمبر ۱۹۳۴ء میں بحری سمجھوتے کو ختم کرنے کے لئے دو سال کا نوٹس دے دیا۔ اس نوٹس کی معیاد ۱۹۳۶ء میں ختم ہونا تھی۔

ہٹلر کمیونزم اور سوویت روس کی کھلم کھلا مذمت کر رہا تھا۔ ۱۹۳۵ء میں سوویت روس نے فرانس سے جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کیا ان دونوں ممالک نے جارحیت کی صورت میں ایک دوسرے کی مدد کرنے کا وعدہ کیا۔ معاہدہ کی معیاد ۵ سال مقرر کی گئی۔ اسی سال ہٹلر نے برطانیہ سے ایک بحری معاہدہ کیا جس کی رو سے وہ جرمن بحریہ کی قوت کو برطانوی بحریہ کی قوت کے ۳۵٪ رکھنے پر رضامند ہو گیا۔ نومبر ۱۹۳۶ء میں ہٹلر نے جاپان سے کامنٹرن کے خلاف معاہدہ کیا۔ اراکین معاہدہ نے اس امر پر اتفاق کیا کہ وہ تیسری بین الاقوامی کانفرنس کے
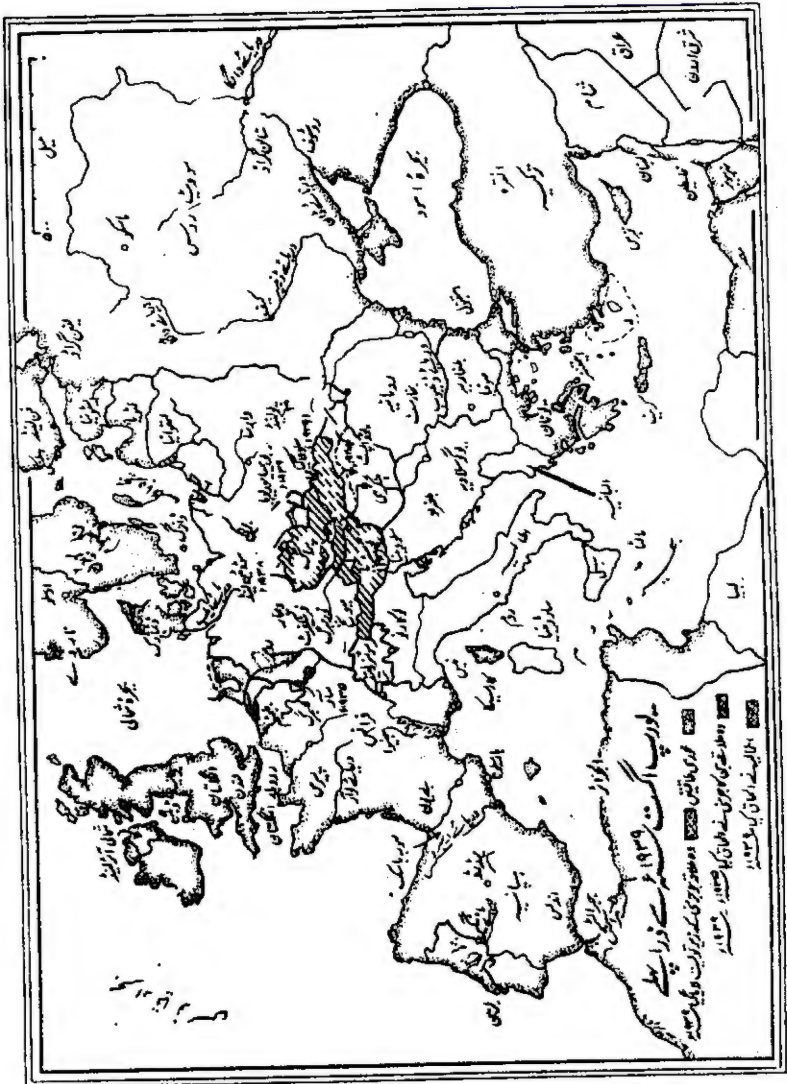
متعلق ایک دوسرے کو معلومات مہیا کریں گے۔ ضروری دفاعی تدابیر پر مشورے کریں گے اور ان اقدامات پر عمل پیرا ہونے کے لئے ایک دوسرے سے تعاون کریں گے۔

۱۹۳۵-۳۶ء میں جرمنی، اٹلی اور جاپان ایک ہی کشتی پر سوار ہو چکے تھے۔ یہ بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ مجلس اقوام کو جرمنی نے ایک طرف کر دیا۔ اور مجلس اقوام نے جاپان اور اٹلی کو مجلس سے نکال دیا۔ اس طرح ان تینوں ممالک نے مجلس اقوام اور اس کی حمایتوں کی مخالفت میں اتحاد کیا۔ تینوں نے کمیونزم اور سوویت روس کی بھی مخالفت کی۔ سب سے پہلے جرمنی نے اٹلی کی ایبے سینیا پر فتح کو تسلیم کیا۔ دونوں ممالک کی آمر حکومتیں ایک دوسرے کے قریب آ گئیں۔ ہٹلر اور مسولینی چاہتے تھے کہ معاہدہ ورسیلز میں تبدیلی کی جائے۔ دونوں کو فتوحات کی ہوس تھی۔ مسولینی اپنے آپ کو کھلم کھلا زمین کا بھوکا کہہ رہا تھا۔ ہٹلر سر عام کہہ رہا تھا کہ "ضرورت کسی قانون کی پابند نہیں ہوتی" مسولینی نے ۱۹۳۵ء میں جرمنی کا اور ہٹلر نے اٹلی کا دورہ کیا۔ دونوں ممالک نے اشتراکیت کے خلاف ایک معاہدہ کیا۔ اٹلی نے بھی اس کی حمایت کی۔ نومبر ۱۹۳۶ء میں جاپان اور جرمنی کے مابین جو دوستی کا معاہدہ ہوا تھا ۱۹۳۷ء میں اٹلی بھی اس میں شامل ہو گیا جس سے برلن روم ٹوکیو محور وجود میں آیا۔

ہٹلر نے اس محور کو دنیا کا عظیم سیاسی مثلث قرار دیا تھا جو تین ایسی ریاستوں پر مشتمل تھا۔ جو اپنے حقوق اور اہم مفادات کی حفاظت کے لئے تیار تھیں۔ مسولینی نے اعلان کیا کہ اتحادی کیمپ سے کسی قسم کا ——— کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکتا۔ یا تو ہم زندہ رہیں گے یا وہ۔ یہ محور دوسری عالم گیر جنگ کے درمیان برقرار رہا۔ لیکن جنگ میں محوریوں کی شکست کی وجہ سے ۱۹۴۵ء کے بعد قائم نہ رہ سکا۔

باب ہفتم

جنگ عظیم دوم

THE SECOND GREAT WAR

۱۔ جنگ کے فریقین

۲۔ جنگ کے اسباب

۳۔ جنگ کے واقعات

۴۔ جنگ کے نتائج

۵۔ معاہدات امن

THE SECOND GREAT WAR

جنگ کے فریقین :۔

پہلی عالمی جنگ کی طرح دوسری عالمی جنگ کے بھی دو کیمپ تھے:

(۱) اتحادی کیمپ :۔

۱۔ برطانیہ ۲۔ فرانس ۳۔ روس ۴۔ امریکہ اور دیگر اتحادی

(۲) محوری کیمپ :۔

۱۔ جرمنی ۲۔ اٹلی ۳۔ جاپان

(۲) جنگ کے اسباب

دوسری جنگ عظیم کا اصل سبب جرمنی کے ساتھ اتحادیوں کا وہ غیر منصفانہ سلوک ہے۔ جو پہلی جنگ کے بعد اس کی کمزوری کے پیش نظر اس سے روا رکھا گیا جس کا ثبوت معاہدہ ورسائی ہے۔ علاوہ ازیں اس جنگ کے اسباب میں بعض دوسرے عوامل بھی کارفرما تھے جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) معاہدہ ورسیلز

معاہدہ ورسیلز میں ہی دوسری جنگ عظیم کے بیج بو دیئے گئے تھے کیونکہ یہ یکطرفہ معاہدہ فاتحین اقوام نے شکست خوردہ اقوام پر مسلط کیا تھا اس میں جرمنی کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے گئے تھے۔ السا س اور لورین، وادی سار فرانس کو دیئے گئے۔ مشرقی پروشیا کی ساحلی پٹی اور مغربی پروشیا کا صوبہ پوزن اور میمل کی بندرگاہ پولینڈ کے حوالے کر دی گئی۔ جرمن جزائر کو اتحادیوں نے آپس میں تقسیم کر لیا اس کی فوجی قوت کو بھی ختم کر دیا گیا۔ مزید یہ کہ جرمنی پر ۶ ارب ۱۰ کروڑ پونڈ

تاوان جنگ مسلط کیا گیا۔ جو جرمنی کسی بھی صورت میں ادا نہیں کر سکتا تھا۔ جس کی وجہ سے یہ کہا جاتا ہے۔

"یہ معاہدہ امن نہیں بلکہ معاہدہ انتشار تھا۔"

(۲) نازی ازم

جرمنی کی آبادی آٹھ کروڑ تھی مگر پہلی جنگ عظیم کے بعد اس کے پاس جو خطہ زمین رہ گیا تھا وہ دو لاکھ تینتیس ہزار مربع میل سے زیادہ نہ تھا۔ ملک کی سمٹی ہوئی حدود کے اندر ان کے لئے آرام سے زندگی بسر کرنے اور ترقی پانے کی صورت نہ رہی تھی۔ چنانچہ ان کا مطالبہ تھا کہ انھیں زندہ رہنے کے لئے اور زمین چاہیئے ان حالات میں جرمنی میں نسلی تفاخر نے قوت پکڑی اس تصور نے جرمن عوام کے دلوں میں ہٹلر کے لئے ایسی جگہ پیدا کر دی کہ وہ اس کے ادنی اشارے پر کٹ مرنے کو تیار ہو گئے۔ پروپیگنڈے کے ذریعے جرمن قوم کے دلوں میں یہ بات بٹھا دی کہ جرمن قوم قدرتی طور پر غیر معمولی سوجھ بوجھ اور بلند و بالا صلاحیتوں کی مالک ہے پہلی جنگ عظیم میں اتحادیوں نے ان کی صلاحیتوں کو پامال کرنے کی سازش کی تھی لہذا متحد ہو کر انھیں اتحادیوں سے اپنی کھوئی ہوئی عظمت بحال کروانی چاہیئے۔

چنانچہ ہٹلر کے پاس جنگ کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

(۳) انجمن اقوام کی غیر ثالثی حیثیت:۔

انجمن اقوام ایسے غیر جانبدار ادارے کی حیثیت سے نہ ابھر سکی جس میں ہر چھوٹی بڑی مملکت ناانصافی کے خلاف تحفظ پا سکے۔ اس کی ایک بڑی وجہ تو یہ تھی کہ لیگ کو معاہدہ ورسائی کا ناقابل تسخیر جز بنا دیا گیا تھا۔ اس میں شمولیت کے لئے معاہدہ ورسائی کی توثیق ضروری تھی۔ اور بیشتر آزاد ریاستیں اس معاہدے کو یکطرفہ معاہدہ سمجھتی تھیں جس نے لیگ کو عالمگیر نہ بننے دیا۔

لیگ کی مردہ کرداری کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس کے رکن ممالک مفاد پرست تھے اور وہ اس وقت تک لیگ کے ممبر رہے۔ جب تک انھیں اس میں اپنا مفاد نظر آیا۔ اور جب لیگ نے ان ممالک کے خلاف کوئی اقدام اٹھایا تو انھوں نے لیگ ہی کو خیرباد کہہ دیا۔ جیسے جاپان منچوریہ کے مسئلے پر اٹلی ایبے سینیا کے مسئلے پر اور جرمنی نے تخفیف اسلحہ کے مسئلے پر لیگ کو خیرآباد کہا۔

اس سے چھوٹی ریاستوں کو عدم تحفظ کا احساس ہوا۔ نیز یہ کہ لیگ کے پاس کوئی ایسا ہتھیار بھی نہ تھا۔ جس سے وہ کسی دوسری ریاست پر دباؤ ڈال سکے۔ لیگ کسی ملک کے جنگی توانین میں ترمیم یا جنگ کرنے والے ملک کو سزا نہیں دے سکتی تھی۔ اس لئے کہا جاتا ہے لیگ کے دانت نہیں تھے۔

④ اتحادیوں کی پالیسوں میں اختلاف رائے

پیرس امن کانفرنس ۱۹۱۹ء کے بعد اتحادیوں کی پالیسوں میں جو خاص کر اٹلی کے بارے میں تھی۔ اختلاف رائے پایا جاتا تھا۔ برطانیہ بذات خود یورپی سیاست سے دور رہ کر سیاست سے زیادہ معاشی مفادات سے دلچسپی لے رہا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جرمنی میں بھی وسیع پیمانے پر اپنی تجارت کو فروغ دے رہا تھا۔ جبکہ فرانس کو اپنی سلامتی کی فکر پڑی ہوئی تھی۔ فرانس اس سے بخوبی واقف تھا کہ جرمنی طاقت میں آنے کے بعد سب سے پہلے فرانس ہی کو اپنی ہوس کا نشانہ بنائے گا۔ لہٰذا فرانس برطانیہ اور امریکہ سے تحفظ چاہتا تھا۔ لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکا۔ جس کی وجہ سے فرانس تلاش تحفظ میں دوسری جنگ عظیم سے پہلے گھومتا رہا۔ اگر برطانیہ اور فرانس کی پالیسیوں میں یکسانیت ہوتی تو شاید جرمنی میں ہٹلر کو پھولنے پھیلنے کا موقع میسر نہ آتا اور دوسری جنگ عظیم کا منہ نہ دیکھنا پڑتا۔

⑤ تخفیف اسلحہ

تخفیف اسلحہ کا مطلب مادی اور جنگی وسائل کو غیر ملکی معاہدوں کے مطابق کم کرنا ہے حالات نے یہ ثابت کر دیا ہے۔ کہ جس طرح جنگ کے لئے اسلحہ ضروری ہے اسی طرح امن قائم رکھنے کے لئے تخفیف اسلحہ بھی ضروری ہے تخفیف اسلحہ کے لئے انجمن اقوام کے اندر اور باہر بے شمار کوششیں کی گئیں۔ لیکن کوئی خاطر خواہ نتائج برآمد نہیں ہوئے البتہ برطانیہ نے اپنے آپ کو غیر ضروری حد تک غیر مسلح کر دیا۔ جب کہ فرانس نے یہ موقف اختیار کیا۔ کہ اسے اپنی قومی سلامتی کے لئے اسلحہ کی ضرورت ہے۔ دوسری طرف ہٹلر نے برسر اقتدار آنے کے بعد جرمنی کی بری، بحری اور ہوائی فوج کو مسلح کرنا شروع کر دیا تھا۔ ۱۹۳۶ء کو راہن لینڈ پر ہٹلر نے قبضہ کر لیا۔ اٹلی اور جاپان ہٹلر سے متاثر ہو کر اس کے ساتھی بن گئے۔ اس میں شک نہیں کہ ۱۹۳۵ء میں اتحادیوں نے اسلحہ بندی شروع کر دی تھی۔ جس میں دونوں

فریقین کے ہاں فوجی قوت میں بے پناہ اضافہ ہو چکا تھا۔ جو دوسری جنگ کا سبب تھی۔

(۶) جاپانی توسیع پسندی :

جنگ عظیم دوم کی ایک وجہ جاپانی سامراجیت بھی بیان کی جاتی ہے۔ کیونکہ جنگ عظیم اول کے بعد مشرق بعید میں جاپان دنیا کی تیسری طاقت بن گیا تھا۔ معاہدہ امن کے تحت جرمنی کے مارشل آئی لینڈ اور شن ٹن کے علاوہ چین کا کچھ علاقہ "کیو چاؤ" جاپان کے حصے میں آیا امریکہ چین کے خلاف اپنے عزائم کی تکمیل کے لئے جاپان کو بھاری مقدار میں اسلحہ فراہم کرتا رہا جس کی وجہ سے جاپان کی "ہوس ملک گیری" میں اضافہ ہوا۔ عالمی معاشی بحران ۳۱-۱۹۲۹ء میں جب جاپانی معیشت کا دیوالیہ ہوا تو جنوری ۱۹۳۲ء کو جاپان نے منچوریہ پر قبضہ کر لیا۔ اور مجلس اقوام کو خیر باد کہہ دیا۔ جولائی ۱۹۳۷ء میں جاپان اور چین کے مابین جنگ چھڑ گئی۔ جس میں جاپان کو فتح ہوئی۔ یورپ کے باہر ہٹلر سے سب سے زیادہ متاثر ہونے والا جاپان تھا۔ جاپان اور جرمنی کے درمیان اشتراکیت کے خلاف ۱۹۳۶ء میں ایک معاہدہ ہوا۔ ۱۹۳۷ء میں اٹلی نے بھی اس کی حمایت کر دی جس سے برلن، روم اور ٹوکیو محور کہلائے ۱۹۴۱ء میں جاپان نے محوریوں کی طرف سے پرل ہاربر پر حملہ کر کے جنگ میں شمولیت اختیار کر لی۔

(۷) نظریاتی برتری کا مسئلہ

جنگ عظیم دوم کی ایک وجہ نظریاتی برتری بھی تھی۔ جمہوریت پسندوں (امریکہ فرانس برطانیہ اور آمریت پسندوں (جرمنی، اٹلی اور جاپان) میں مقابلہ پایا جاتا تھا۔ دونوں کو اپنی طاقت پر ناز تھا۔ بہرحال ان میں پہل آمریت پسندوں نے کی۔ جس کی وجہ سے جمہوریت پسندوں کو لازمی طور پر جنگ میں شامل ہونا پڑا۔ نظریات کے اس ٹکراؤ میں مصالحت ناممکن تھی اور فریقین میں سے صرف ایک ہی باقی رہ سکتا تھا۔ محوری طاقتیں یہ سوچنے پر مجبور ہو گئیں تھیں کہ برطانیہ فرانس آخر کس خوشی میں بے پناہ نوآبادیات پر قبضہ جمائے بیٹھے ہیں۔

ہٹلر نے اپنی کتاب "میری زندگی اور جدوجہد" میں یوں لکھا ہے۔

"دوسری جنگ عظیم ایک اچھی جنگ ہے باوجود اس کے تمام ہولناکیوں کے اس لئے کہ اس کی وجہ سے غاصبیت کا خاتمہ ہوا۔"

⑧ ہٹلر کا عروج

اے۔ جے۔ پی۔ ٹیلر A.J.P. TAYLOR کا خیال ہے کہ ہٹلر انتہا پسند نہیں تھا۔ بلکہ یہ جنگ حادثاتی طور پر شروع ہوئی ہٹلر اپنے ملک کو ایک عظیم ملک بنانا چاہتا تھا اور جنگ عظیم اول میں اپنے کھوئے ہوئے علاقے واپس لینا چاہتا تھا۔

ٹیلر کے اس خیال کو دیگر مفکرین نے چیلنج کیا ہے اس میں انھوں نے ۲ دو دلائل دیئے ہیں۔

(۱) اگر وہ جارحیت پسند نہیں تھا تو اس نے اپنے آس پاس کے علاقے فتح کر کے جرمنی میں کیوں شامل کیئے۔

(۲) ہٹلر نے ۳۹-۱۹۳۳ء تک جرمنی کو بڑے پیمانے پر مسلح کیا جس سے اس بات کی بڑی واضح نشاندہی ہوتی ہے کہ اس کا مقصد عالمگیر جنگ تھا۔

پولینڈ پر حملہ ۱۹۳۹ء کر کے ہٹلر نے اس معاہدے کو چیلنج کیا جو برطانیہ اور فرانس کے درمیان پولینڈ کو تحفظ دینے سے متعلق ہوا تھا۔

ہٹلر نے اپنی کتاب "میری زندگی اور جدوجہد" میں اپنی زندگی کے تین مقاصد لکھے ہیں

۱۔ جرمنی کی پرانی حیثیت کو بحال کرنا جو پہلی جنگ عظیم سے پہلے تھی اس طرح تمام وہ علاقے واپس لینا جو معاہدہ ورسائی کے تحت جرمنی سے اتحادیوں نے لیئے تھے۔

۲۔ جرمن قوم کو یکجا کر کے عظیم سلطنت میں آباد کرنا جو آسٹریا اور چیکو سلواکیہ پر قبضہ کیئے بغیر ممکن نہ تھا۔

۳۔ جرمنی کو یورپ کی ایک عظیم طاقت بنانا۔

جنگ کے واقعات

جرمنی کے جارحانہ اقدامات کی ابتداء ۱۱ مارچ ۱۹۳۸ء کو آسٹریا پر قبضے سے ہوئی دوسری عالمی جنگ کی اصل ابتدا یہاں سے ہی ہوتی ہے۔ مگر اس سے پہلے جاپان اور اٹلی جنگ کے لئے راستہ ہموار کر چکے تھے۔ یعنی ۱۹۳۱ء میں جاپان نے چین کے شمالی صوبہ منچوریا پر تسلط جمالیا۔ پھر ۱۹۳۵ء میں اٹلی نے ایبے سینیا پر قبضہ کر لیا اسپین میں خانہ جنگی سے فائدہ اٹھا کر اٹلی اور جرمنی نے اس میں مداخلت کی اور باغی فوجوں کی مدد کر کے جنرل فرانکو کو اسپین

کے تخت و تاج کا مالک بنا دیا۔ ۱۹۳۷ء میں جاپان نے پورے چین پر تسلط جمانے کی نیت سے اس پر دھاوا بول دیا۔ یہ سب واقعات ہٹلر کے عزائم کو اور پختہ اور مشتعل کرنے کا موجب بنے۔ چنانچہ اس نے آسٹریا کے لوگوں کی عام رائے لے کر ۱۱ مارچ ۱۹۳۸ء کو وہاں جرمن فوجیں بھیج کر قبضہ کر لیا۔ آسٹریا کا چانسلر ملک سے نکال دیا گیا۔ پھر انگریزی فرانسیسی، جرمنی اور اطالوی نمائندوں کی ایک کانفرنس ۲۹ ستمبر ۱۹۳۸ء کو میونخ میں طلب کی گئی جس میں چیکو سلواکیہ سے ملحقہ علاقہ سوڈین لینڈ طلب کیا گیا۔ جواز یہ تھا کہ وہاں اکثریت جرمنوں کی ہے چنانچہ معاہدہ میونخ کے مطابق یہ علاقہ جرمنی کو دے دیا گیا۔ مارچ ۱۹۳۹ء کو ہٹلر نے چیکو سلواکیہ کے چانسلر کو جرمنی میں بلایا اور اُسے دھمکی دے کر ایک دستاویز پر دستخط کروا لئے گئے اور اس علاقہ کو جرمنی میں ضم کر لیا

۱۹۳۹ء میں روس اور جرمنی کے مابین جنگ نہ کرنے کا "سوویت نازی معاہدہ" ہوا۔ جس سے پولینڈ کا دفاع کمزور پڑ گیا۔ اس کے بعد ہٹلر نے پولینڈ سے ڈینزگ شہر کی واپسی کا مطالبہ کر دیا۔ پولینڈ کی طرف سے ابھی جواب موصول نہ ہوا تھا کہ یکم ستمبر ۱۹۳۹ء کو ہٹلر نے پولینڈ پر حملہ کر دیا۔ برطانیہ اور فرانس نے پولینڈ کو جرمنی کے حملہ سے بچانے کا وعدہ کر رکھا تھا۔ چنانچہ انھوں نے ۳ ستمبر ۱۹۳۹ء کو جوابی کاروائی کی۔ اس طرح دوسری عالمگیر جنگ شروع ہو گئی

—— فرانس اور برطانیہ کی مدد پولینڈ کو نہ بچا سکی۔ ہٹلر نے ڈانزگ شہر اور کاریڈار کو فتح کرتے ہوئے صدر مقام وارسا پر بھی قبضہ کر لیا۔ مشرق کی طرف سے کچھ علاقے پر روسی فوجیں قابض ہو گئیں۔ جس سے پولینڈ کی آزادی روس اور جرمنی کے ہاتھوں تقسیم ہو کر رہ گئی۔

۱۹۳۹ء کے موسم بہار میں روس نے لینن گراڈ کے تحفظ کے لئے حفظ ماتقدم کے طور پر فن لینڈ پر قبضہ کر لیا اور جرمن خطرے کے پیش نظر روسیوں نے اہل فن لینڈ والوں سے صلح کر لی اس طرح روس نے بالٹک کی ریاستوں لیٹویا، استھونیا اور لتھونیا کو بھی اپنے زیر اقتدار کر لیا تھا۔ ۱۹۴۰ء کے شروع میں جرمن افواج نے ڈنمارک اور ناروے پر اچانک حملہ کر دیا ڈنمارک نے فوراً ہتھیار ڈال دیئے۔ البتہ ناروے نے اتحادی فوج کی مدد سے مزاحمت کی۔ جرمن فوجوں
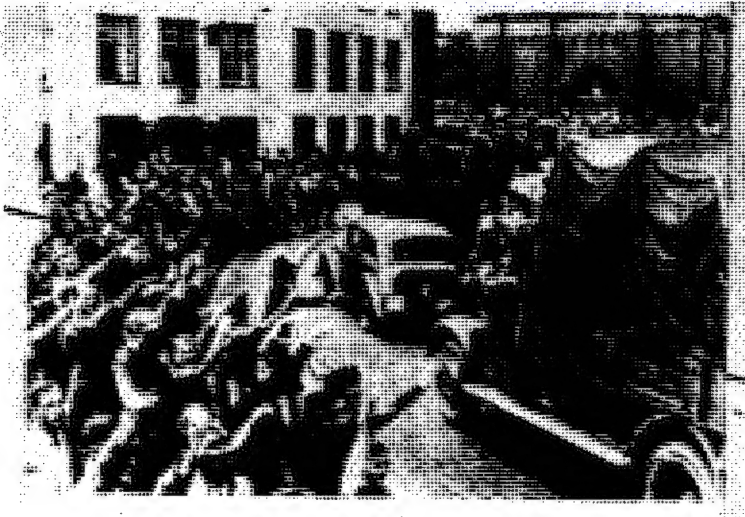
ستمبر ۱۹۳۹ء کو جرمن فوج کا دستہ ڈانزگ شہر میں داخل ہو رہا ہے۔

نے ناروے کے ایک ہزار میل لمبے ساحل پر قبضہ کر لیا اور ناروے کی سلطنت ختم کر دی۔

ناروے اور ڈنمارک سے فارغ ہونے کے بعد ہٹلر نے ہالینڈ کو فتح کرتے ہوئے بلجیم کا رخ کیا۔ تو کوئی لاکھ کی تعداد میں اتحادی افواج ڈنکرک کی بندرگاہ سے اپنی جان بچا رہی تھی اور اس طرح کروڑوں روپے کا سامان جرمن افواج کے ہاتھ آگیا۔ ۲۸ مئی ۱۹۴۰ء کو شاہ بلجیم نے جرمنی کی اطاعت قبول کر لی۔

اتحادیوں کی مسلسل شکستوں کی وجہ سے برطانیہ کے وزیر اعظم چمبرلین کو استعفیٰ دینا پڑا اور ان کی جگہ ونسٹن چرچل وزیر اعظم ہو گئے۔ مئی ۱۹۴۰ء میں ہٹلر نے لکسمبرگ پر قبضہ کرتے ہوئے فرانس کا رخ کیا اور جرمن افواج نے فرانس کی مضبوط قلعہ بند دیوار میجینو لائن پر قبضہ کر لیا۔ اس صورتحال سے مجبور ہو کر ۲۴ جون ۱۹۴۰ء کو فرانس صلح کرنے پر مجبور ہو گیا۔ فرانس پر قبضہ کرنے سے پہلے اٹلی بھی جنگ میں جرمنی کا اتحادی بن چکا تھا۔ اب جرمنی اور اٹلی کے مقابلے میں برطانیہ تنہا رہ گیا تھا۔ اگر ہٹلر اس وقت برطانیہ پر حملہ کرتا تو یقیناً کامیاب ہوتا۔ مگر ہٹلر نے اس پر توجہ نہ دی۔ اور اکتوبر ۱۹۴۰ء میں رومانیہ کے تیل والے علاقوں اور مارچ ۱۹۴۱ء میں بلغاریہ اور یوگوسلاویہ پر اپنا تسلط قائم کر لیا۔ اس وقت چند ملکوں کے سوا تمام یورپ جرمنی کے زیر اقتدار آچکا تھا

برطانیہ میں ونسٹن چرچل کی جذباتی قیادت نے ایک طرف پوری برطانوی قوم میں عزم و ہمت کی ایک نئی روح پھونک دی تھی۔ نیز مغربی محاذ پر اٹلی اور یونان کے مابین جنگ چھڑ گئی۔ جس سے اٹلی کو مسلسل شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اٹلی کی اس نازک صورتحال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے برطانیہ نے افریقی مقبوضات پر قبضہ کر لیا۔ برٹش شمالی لینڈ جس پر اٹلی ۱۹۴۰ء میں قابض ہو چکا تھا وہ برطانیہ نے واپس لے لیا اور پھر ابی سینیا فتح کر کے سابق شہنشاہ ہیل سیلاسی کے حوالے کر دیا۔

۸ اگست ۱۹۴۰ء کو جرمنی نے انگلستان پر فضائی حملہ کیا جرمنی کا خیال تھا کہ پہلے برطانوی فضائیہ کو تباہ کیا جائے۔ لیکن لندن میں زیر زمین مقامات کی پناہگاہوں نے اس مسئلے کو حل کر دیا مزید یہ کہ جہازوں کو مار گرانے والی توپیں بھی نصب کر دی گئیں تھیں۔ برطانوی فضائیہ نے جرمن جہازوں پر فرانس، بلجیم، ہالینڈ اور ناروے کی بندرگاہوں سے بمباری شروع کرا دی جس سے جرمنوں کی توجہ تقسیم ہونے لگی۔ علاوہ ازیں امریکی صدر روزویلٹ نے ۵۰ تباہ کن جہاز برطانیہ کو امداد کے طور پر دیئے یہ معاملہ چند اڈوں کو پٹہ پر دینے کی عوض طے کیا گیا ۱۹۴۱ء میں امریکی کانگریس نے ایک بل منظور کیا کہ وہ تمام ممالک جو محوریوں کے خلاف لڑ رہے ہیں۔ اُن کی مدد کی جائے۔ اسی دوران ۱۴ اگست ۱۹۴۱ء کو روزویلٹ کی چرچل سے بحرِ اوقیانوس میں ایک جہاز پر ملاقات ہوئی اور ایک چارٹر مرتب ہوا۔

۲۲ جون ۱۹۴۱ء کو ہٹلر نے روس کے خلاف اعلان جنگ کر دیا تھا بعض ماہرین کا خیال ہے کہ روس اور جرمنی کی جنگ برطانوی چال کا نتیجہ تھی۔ چونکہ ۱۹۳۹ء میں سوویت نازی دوستی معاہدہ ہو چکا تھا۔ بہرحال روسیوں اور جرمنوں کے مابین گھمسان کی جنگ ہوئی۔ چند ماہ کے اندر اندر جرمن فوجیں روس کے ڈیڑھ ہزار میل لمبے محاذ پر دُور دُور تک پھیل گئیں۔

لینن گراڈ کو روس کے باقی حصوں سے کاٹ دیا۔ ماسکو کا محاصرہ کئی سال تک جاری رہا مگر سردیوں کے موسم میں روسیوں نے جرمنوں پر شدید حملے کر کے انھیں پیچھے دھکیل دیا۔ بہرحال جرمن فوجیں میدان میں ڈٹی رہیں اور پھر ہمت کر کے یوکرین اور کریمیا پر حملہ آور ہوئیں اور قفقاز تک پہنچ گئیں۔ روسی فوج نے بڑی بہادری اور جرأت سے مقابلہ کیا۔ یہاں تک کہ جرمنوں کو مار بھگایا۔ روسیوں نے برلن تک تعاقب کیا۔ اور بہت سے جرمن علاقوں پر قبضہ کر لیا۔

اس کامیابی پر جنرل میک نے روسیوں کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا تھا۔

"میں نے زندگی میں کئی جنگیں دیکھیں اور لڑی ہیں۔ ہزاروں کے بارے میں پڑھا ہے۔ لیکن جس طرح آپ نے حملہ آور کا مقابلہ بہادری، شجاعت اور بے خوفی سے کیا ہے۔ تاریخ میں ایسی مثال ملنا مشکل ہے"۔

برطانوی وزیراعظم ونسٹن چرچل نے کہا۔

"جرمنی کے غبارے کی ہوا اصل میں روسیوں نے نکالی ہے"۔

جاپان جواب تک غیر جانبدار تھا۔ اس نے بھی بحرالکاہل میں امریکی مقبوضات، فرانسیسی نو آبادیات میں اپنے بحری اور ہوائی اڈے قائم کرنے شروع کر دیئے۔ جزائر فلپائن۔ انڈمان جزیرہ نما ملایا، ہانگ کانگ، سنگاپور اور برما جاپان کے قبضے میں آگئے۔ ہندوستان کے شہر کلکتہ اور چٹاگانگ پر جاپان نے ہوائی حملے کئے۔ برما اور آسام کی سرحد پر جاپان اور برطانیہ کے درمیان عرصہ تک خون ریز جنگ جاری رہی۔

۷ دسمبر ۱۹۴۱ء تک امریکیوں کو بھنک نہ لگی کہ جاپانی بحریہ کے ۳۲ جنگی جہاز اور آب دوزیں پرل ہاربر سے دو سو میل تک پہنچ گئیں ہیں۔ اس بحری بیڑے میں چھ طیارہ بردار جہاز بھی شامل تھے۔ جاپانی بحری بیڑے نے صبح آٹھ بجے سے ایک بجے دوپہر تک اپنی بمباری جاری رکھی۔ اس میں جاپان کے صرف ۲۹ طیارے تباہ ہوئے اور ۳۲ بحری جہازوں پر مشتمل یہ بحری بیڑہ حملے کے فوری بعد جاپان واپس پہنچ گیا۔ لیکن جنگ ختم ہونے تک امریکیوں نے اس حملے میں شریک سوائے ایک کے تمام بحری جہازوں کو غرق کر دیا۔ اس حملے میں جاپان نے چھوٹی آبدوزیں بھی استعمال کیں۔ جنھیں جرمنی میں ڈیزائن کیا گیا تھا۔ اور جاپان میں تیار ہوئی تھیں۔

اس حملے کی سنگینی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ پہلے ۳۰ منٹ میں دو ہزار امریکی فوجی ہلاک ہوئے۔ امریکہ کے مشہور جنگی جہاز غرق ہو گئے۔ ان میں ایک "ایریزونا" تھا۔

یہاں یہ بتانا بھی ضروری خیال کر رہا ہوں کہ اس واقعہ کی یادگار سمندر میں ڈوبے ہوئے جہاز ایریزونا کے اوپر تیار کی گئی ہے۔ اس جہاز میں ۱۵۵۰ فوجی تھے جن میں صرف ۲۸۹ زندہ بچے ہلاک ہونے والوں میں سے ۱۱۰۰ کی لاشیں اب بھی غرق شدہ بحری جہاز میں ہی ہیں۔ پرل ہاربر کی یادگار میں جہاں دوسرے کتبے لگے ہوئے ہیں وہاں انجیل مقدس کی یہ عبارت بھی جلی حرف میں دھات کی پلیٹ پر کندہ ہے۔
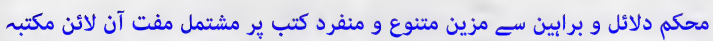
"مرنے والے زندہ رہیں گے"

امریکہ کے لئے جان دینے والوں میں ان لوگوں کے نام ہمیشہ سرفہرست رہیں گے۔

۱۹۴۲ء میں جنرل منٹگمری نے جرمنی واٹلی کی فوجوں کو لیبیا سے نکال کر ٹریپولی وتیونیہ پر قبضہ کرلیا۔ ۱۹۴۳ء میں اٹلی کی افواج کو مکمل شکست ہوئی اور سسلی پر اتحادیوں نے قبضہ کرلیا۔ اسی وقت اٹلی میں مسولینی کی حکومت ختم ہوگئی اور مارشل بیڈ یوگولیونے حکومت کی بھاگ دوڑ سنبھالی۔ لیکن مسولینی کو جرمن نکال کرلے گئے ۱۹۴۵ء کو مسولینی کو دوبارہ گرفتار کرکے گولی مار دی گئی۔

بحرالکاہل میں جاپان کی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں کے پیش نظر امریکی جنرل میک آرتھر کو بحرالکاہل کا سپریم کمانڈر اور برطانوی لارڈ مونٹ بیٹن کو جنوب مشرقی ایشیاء کی کمان دی گئی۔ مونٹ بیٹن نے برما سے اور میک آرتھر نے فلپائن سے جاپانیوں کو نکال باہر کیا۔ ۱۹۴۴ء میں اتحادی افواج نے نارمنڈی پر قبضہ کرلیا۔ اور کافی جدوجہد کے بعد پیرس واپس لے لیا۔ اسی سال امریکی فوجیں رہین لینڈ واپس لینے میں کامیاب ہوگئیں تو روس نے بھی مشرقی حصے سے جرمنی پر حملہ کردیا۔ جرمنی دونوں محاذوں پر نہیں لڑ سکتا تھا۔ چنانچہ مئی ۱۹۴۵ء کو جرمنی نے غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دیئے اور ہٹلر لاپتہ ہوگیا۔ بعض کے خیال میں ہٹلر نے ۲۹ راپریل کو ہی خودکشی کرلی تھی۔

جاپان نے اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ امریکہ نے جاپان کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کرنے کے لئے ۶ راگست ۱۹۴۵ء کو ہیروشیما پر ایٹم بم گرایا جس سے لاکھوں افراد ہلاک اور پورا شہر کھنڈرات میں تبدیل ہوگیا۔ جاپان نے اب بھی شکست کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا۔ اس کے ساتھ روس نے ۸ راگست ۱۹۴۵ء کو اپنی فوجیں منچوریا بھیج دیں اور ۹ راگست ۱۹۴۵ء کو امریکہ نے جاپان کے دوسرے شہر ناگاساکی پر ایٹم بم گرادیا جس سے جاپان کی فوج گھبرا کر ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہوگئی۔ اس طرح ۲ ستمبر ۱۹۴۵ء کو صبح ۹ بجے اطاعت نامے پر دستخط ہوئے اور دوسری بڑی جنگ کا خاتمہ ہوا۔

(۴) جنگ کے نتائج:

(۱) اس جنگ میں دنیا کی تقریباً ۳ ملین آبادی تباہ وبرباد ہوئی جس میں تقریباً آدھی روس کی آبادی تھی۔ تقریباً ۱۲ ملین آبادی کو اپنا وطن ترک کرکے دوسرے

ممالک میں جانا پڑا۔

(۲) جنگ کی وجہ سے یورپ کی ثالثی حیثیت ختم ہوگئی اور اس کی جگہ دو غیر یورپی طاقتوں، (روس اور امریکہ) نے لے لی جس سے ماسکو اور واشنگٹن سیاست کا گڑھ بن گئے۔ روس کا مقصد اشتراکی انقلاب کے لئے راہ ہموار کرنا ہے جبکہ امریکہ جمہوریت کو طاقت کا سرچشمہ سمجھتے ہوئے سرمایہ دارانہ نظام زندگی کا خواہاں ہے۔

(۳) اقتصادی امداد کے لئے امریکہ کی طرف سے مارشل پلان اور روس کی طرف سے مولوٹو پلان تیار کیا گیا ہے۔ اسی طرح دفاعی نقطہ نظر میں اتحادیوں نے ناٹو اور اشتراکی بلاک نے نے اس کے مقابلے میں وراسا پیکٹ کیا۔ اس طرح سے دنیا دو حصوں میں تقسیم ہوگئی

(۴) جنگ عظیم دوئم سے جہاں ایک طرف جذبہ قومیت کو تقویت ملی وہاں دوسری طرف سامراجیت کا خاتمہ ہوا۔ نوآبادیات میں آزادی کی کامیاب تحریکیں چلیں۔

(۵) اس جنگ میں پہلی مرتبہ ایٹمی اسلحہ استعمال کیا گیا۔ جس سے دنیا کو اجتماعی امن کا احساس ہوا اور اس مقصد کے لئے اقوام متحدہ کا قیام عمل میں آیا۔

مُعاہداتِ امن

دوسری عالمگیر جنگ میں ساری دنیا قہر و غضب کی لپیٹ میں آگئی یہ پہلی متحرک جنگ تھی۔ روز ویلٹ نے اٹلانٹک چارٹر میں واضح اعلان کیا کہ ہم چار آزادیوں کے لئے لڑ رہے ہیں۔

- خوف سے آزادی ______
- ضروریات سے آزادی ______
- سیاسی آزادی ______
- مذہبی آزادی ______

برطانوی وزیراعظم چرچل، روس کے سربراہ اسٹالن اور امریکی صدر روز ویلٹ اس کے ہیرو تھے۔ جنگ کے بعد سب سے بڑا مسئلہ شکست خوردہ ممالک کے ساتھ امن معاہدات کرنا تھا۔ جب کہ جنگ کے خاتمے پر دو بڑے واقعات رونما ہو چکے تھے۔

——— • ایٹمی ہتھیاروں کا آغاز

——— • امریکی اور روسی نقطہ ہائے نظر میں اختلاف

امریکہ کی ایٹمی برتری کو ساری دنیا نے تسلیم کر لیا تھا۔ روس نے دوسری جنگ عظیم میں اتحادیوں کا ساتھ اس لئے دیا کہ جرمنی کو شکست دی جائے اس سے یہ تاثر لینا غلط ہوگا کہ روس نے لینن کے نظریات (اشتراکیت) کو ترک کر دیا تھا۔ بلکہ اس نے اپنے مقاصد کے حصول کے لئے یہ اتحاد کیا۔ اور جب روس کو یہ مقصد حاصل ہو گیا تو اب سرمایہ دارانہ ممالک کے ساتھ روس کا اتحاد برقرار رکھنا روس کے لئے بے اثر تھا۔

پوٹسڈیم کانفرنس

POTSDAM CONFERENCE

جرمنی کے ہتھیار ڈالنے کے بعد ۱۹۴۵ء کو برطانیہ، روس اور امریکہ کے درمیان پوٹسڈم کے مقام پر دو کانفرنسیں ہوئیں ان دونوں کانفرنسوں میں حسب ذیل امور زیر بحث رہے۔

— • جرمنی کے ساتھ سلوک

— • نئے عالمی ادارے کا قیام و نوعیت

— • مقبوضات کے ساتھ سلوک

— • پولینڈ کی سرحدات کا تعین

— • معاہدات امن کے بارے میں

یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ پہلی کانفرنس میں اسٹالن نے جو نقطہ نظر پیش کیا۔ ٹرومین اور چرچل کے لئے قابل قبول نہ تھا۔ پوٹسڈیم کی دوسری کانفرنس میں ونسٹن چرچل کی جگہ ایٹلی برطانیہ کے وزیراعظم بن چکے تھے۔ اسٹالن کے اختلافات کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ وہ چاہتا تھا کہ روسی مفادات کو مدنظر رکھا جائے کیونکہ روس فوجی اور اقتصادی طور پر امریکہ سے کمزور ہے اور نظریاتی ٹکراؤ کی وجہ سے امریکہ روس کی تباہی کا سبب بن سکتا ہے۔ اسی لئے روس نے پہلا ایٹمی دھماکہ ۱۹۴۹ء ہی میں کر دیا تھا۔ نیز مشرقی یورپ سے روس نے اپنی فوجیں واپس بلانے سے انکار کر دیا تھا۔ اس طرح سے روس کی پوزیشن مشرقی یورپ میں

دوسری عالمی جنگ کے بعد اسٹالن۔ ٹرومین اور چرچل پہلی پوٹسڈیم کانفرنس، ۱۷ جنوری ۱۹۴۵ء میں

مستحکم ہو گئی۔

کانفرنس کے پہلے اجلاس میں ۲: ۳: ۴ کا فارمولا طے پایا گیا۔

۲ سے مراد فن لینڈ ــــ برطانیہ اور روس سے معاہدہ کرے گا۔

۳ سے مراد اٹلی ــــ برطانیہ، روس اور امریکہ سے معاہدہ کرے گا۔

۴ سے مراد جرمنی ــــ برطانیہ، فرانس، امریکہ اور روس سے معاہدہ کرے گا۔

لیکن اس فارمولے پر اتفاق رائے نہ ہو سکا۔ تو دوسرے اجلاس میں یہ طے پایا کہ معاہدے کی دفعات بڑی طاقتیں (امریکہ، برطانیہ، روس) مرتب کریں گی بعد میں فرانس اور چین بھی بڑی طاقتوں میں شامل ہو گیا۔ معاہدے کی توثیق عالمی کانفرنس کرے گی اور وزرائے خارجہ کی کمیٹی (جو کانفرنس میں تشکیل دی گئی) اسے آخری شکل دے گی۔ نیز اس بات پر بھی اتفاق ہوا کہ پہلے معاہدے ان ریاستوں کے ساتھ کئے جائیں گے جن کے ساتھ اختلافات کم ہوں گے دس ماہ کی بات چیت کے بعد کانفرنس نے ۱۰۷ تجاویز پیش کیں اس طرح ۱۰ فروری ۱۹۴۷ء کو پیرس میں پانچ معاہدوں پر دستخط ہوئے۔

(۱) اٹلی سے معاہدہ

اس معاہدے کی ۹۰ دفعات تھیں اور ۷ اس کے ضمیمے تھے۔ معاہدے کے تحت اٹلی کے کچھ علاقے جیسے چھوٹے سنٹ برنارڈ کے اضلاع، مونٹ تھابر، چیبرٹن مونٹ سنس ٹنڈا اور بریگا فرانس کو دیئے گئے، زہرا، بالاگوسا، لاگوسٹا اور ساحل ڈیماٹین کے جزائر یوگوسلاویہ کو دیئے گئے۔ ویٹریز اور دمشق کے جزائر یونان کے حوالے کئے گئے اور افریقی نوآبادیات سے اس کا اقتدار ختم کر دیا گیا۔ البانیہ اور ایبے سینیا کی آزادی کو تسلیم کروا لیا گیا۔

اٹلی سے معاہدے کے دوران ٹرسٹی کے علاقے پر اختلافات سامنے آیا۔ مغربی بلاک چاہتا تھا کہ یہ علاقہ اٹلی کے پاس رہے جب کہ روس بلغاریہ کو دینا چاہتا تھا معاہدے پر عمل درآمد کے وقت اٹلی کے اس شہر کو بین الاقوامی درجہ دے دیا گیا۔ لیکن پھر بھی یہ دو حصوں میں بٹا رہا۔ زون "اے" پر امریکہ اور برطانیہ کی فوج کا کنٹرول تھا۔ جب کہ زون "بی" پر یوگوسلاویہ کا کنٹرول تھا۔ یہ صورتحال ۱۹۵۴ء تک برقرار رہی اس کی وجہ یہ تھی کہ صدر ٹیٹو کے اسٹالن کے ساتھ اختلافات تھے۔ چنانچہ صدر ٹیٹو کا اقتصادی امداد کے لئے مغربی بلاک کی طرف رجوع ہوا۔ ۱۹۵۴ء میں کانفرنس نے یہ فیصلہ کیا کہ ٹرسٹی کا علاقہ اٹلی کو دے دیا جائے اریٹیریا کو جنرل اسمبلی نے ایتھوپیا کے ساتھ ضم کر دیا اور صومالیہ کی آزاد ریاست وجود میں آئی۔ اٹلی کو اپنی ہتھیار ...

تارپیڈو، طیارہ بردار جہاز اور سب میرین، ہیوی ٹینک وغیرہ رکھنے پر پابندی لگا دی گئی اس کی نیوی کو ۲ جنگی جہازوں تک محدود کر دیا گیا۔ البتہ ۲۵، ۲۵ ہزار آرمی اور نیوی رکھ سکتا تھا۔ ایئر فورس کو ۲ سو لڑاکا طیاروں اور ۱۵۰ مال بردار طیاروں تک کم کر دیا گیا۔
سات سال میں روس کو ایک سو ملین ڈالر اور البانیہ کو ۵ ملین ڈالر کا تاوانِ جنگ ادا کرنے کا پابند کیا گیا۔

جہاں تک دریائے ڈینیوب پر جہاز رانی کا تعلق ہے معاہدے کے مطابق اس پر جہاز رانی کے لئے تمام ممالک کو آزادی تھی۔ لیکن روس اپنی برتری چاہتا تھا۔ چنانچہ جب روس نے مشرقی بلاک پر اپنا تسلط قائم کر لیا۔ تو اس نے دریائے ڈینیوب پر دوسرے ممالک کو جہاز رانی کا حق دینے سے انکار کر دیا۔ اس چیز کو صرف یوگوسلاویہ نے چیلنج کیا۔ اس طرح روس کی طرف سے معاہدے کی خلاف ورزیاں ہوئیں۔ جس کا نتیجہ ناٹو NATO کی شکل میں ظاہر ہوا۔

(۲) بلغاریہ سے معاہدہ

یہ معاہدہ ۳۸ دفعات اور چھ ضمیموں پر مشتمل تھا۔ اس معاہدے کی رو سے بلغاریہ کی یکم جنوری ۱۹۳۸ء والی سرحدات بحال کر دی گئیں۔

دفاع کے سلسلے میں حسب ذیل پابندیاں لگائی گئیں۔

- ۵۵ ہزار آرمی اور ۱۸ سو طیارہ شکن توپیں۔
- ۵ ہزار دو سو ایئر فورس اور ۹۰ ہوائی جہاز۔
- ۳ ہزار پانچ سو نیوی۔

۸ سال میں یونان کو ۴۵ ملین ڈالر اور یوگوسلاویہ کو ۲۵ ملین ڈالر تاوان جنگ ادا کرنا قرار پایا۔

(۳) رومانیہ سے معاہدہ

اس معاہدے کی ۴۰ دفعات اور ۶ ضمیمے تھے اس معاہدے کے تحت رومانیہ کی یکم جنوری ۱۹۳۸ء کی سرحدات بحال کر دی گئیں

دفاع کے سلسلے میں مندرجہ ذیل پابندیاں لگائی گئیں۔

- آرمی = ایک لاکھ ۲۰ ہزار اور ۵ ہزار طیارہ شکن توپیں۔

——• ایئر فورس ۸ ہزار اور ۱۵۰ طیارے

——• نیوی صرف پانچ ہزار افراد پر مشتمل ہوسکتی تھی۔

۸ سال کے عرصہ میں روس کو ۳۰۳ ملین ڈالر جنس کی صورت میں تاوانِ جنگ ادا کرنا تھا۔

(۴) ہنگری سے معاہدہ

یہ معاہدہ ۴۳ صفحات اور ۶ ضمیموں پر مشتمل تھا۔ اس معاہدے کی رُو سے ہنگری کی آسٹریا سے یوگوسلاویہ کے ساتھ پہلی جنوری ۱۹۳۸ء کی سرحدات کو بحال کردیا گیا۔ اس معاہدے میں یہ بھی طے پایا کہ ہنگری دریائے ڈینیوب کے مغرب میں واقع ۳ گاؤں یوگوسلاویہ کو دے گا۔ جس کے نتیجے میں ٹرانس سلوانیا رومانیہ کو مل گیا۔

ہنگری کی عسکری قوت کچھ یوں قرار پائی۔

——• آرمی ۶۵ ہزار

——• ایئر فورس ۵ ہزار اور ۹۰ طیارے۔

تاوان کے سلسلے میں ہنگری روس کو ۲ سو ملین ڈالر، یوگوسلاویہ اور چیکوسلواکیہ کو ۵۰ ملین ڈالر ادا کرے گا۔

(۵) فن لینڈ سے معاہدہ

یہ معاہدہ ۳۶ دفعات اور ۶ ضمیموں پر مشتمل تھا۔ اس معاہدے کے تحت فن لینڈ کی یکم جنوری ۱۹۴۱ء والی سرحدیں بحال کردی گئیں مگر پیٹسیمو PETSAMO کا صوبہ روس کے حوالے کردیا گیا۔ روسی فنشی معاہدہ ۱۹۴۱ء بحال کردیا گیا۔ روس نے ہانگو میں پٹہ داری چھوڑ دی اور بحری مقاصد کے لئے ۵۰ سال کے لئے پورکالا۔ اڈ PORKKALA UDD کا بحری علاقہ پٹے پر حاصل کرلیا۔

افواج پر مندرذیل پابندی عائد کی گئی

——• آرمی ۳۵ ہزار ۴ سو۔

——• نیوی چار ہزار آٹھ سو۔

——• ایئر فورس ۳ ہزار اور ۶۰ طیارے

فن لینڈ کو ستمبر ۱۹۴۷ء سے ۸ سال میں روس کو ۳ سو ملین ڈالر تاوان جنگ ادا کرنا ہوگا

۶- آسٹریا سے معاہدہ مئی ۱۹۵۵ء

جہاں تک آسٹریا کے ساتھ معاہدے کا تعلق ہے اتحادیوں کو اس میں تاخیر نہیں کرنا چاہیئے تھی کیونکہ اسے نہ تو جرمنی کی طرح تقسیم کیا گیا اور نہ ہی اس کا محل وقوع اتنا اہم تھا۔ اتحادیوں کا یہ ملک کوئی ایسا ویسا دشمن بھی نہ تھا جیسا کہ جرمنی، اٹلی، جاپان وغیرہ۔

اتحادیوں میں جنگ کے دوران آسٹریا کے بارے میں چند نکات پر اتفاق رائے ہوا تھا۔ جو حسب ذیل ہیں۔

- آسٹریا کی یکم جنوری ۱۹۳۹ء کی سرحدات بحال کر دی جائیں گی۔
- آسٹریا سے تاوان نہیں لیا جائے گا۔
- یوگوسلاویہ میں آسٹرین جائیدادیں اسے ضبط کرنے کا اختیار دے دیا گیا۔
- آسٹریا کی کن چیزوں کو جرمن ملکیت تصور کیا جائے گا۔
- روس آسٹریا سے "قابل تبدیل کرنسی" ایک سو پچاس ملین ڈالر چھ سالوں میں لے گا۔

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود روس اینگلو امریکی اختلاف کی وجہ سے معاہدے پر دستخط نہیں ہو سکے

اختلافات :-

(۱) روس ایک سو پچاس ملین کی رقم آسٹریا سے تاوان جنگ کے عوض وصول کرنا چاہتا تھا۔ مغربی ممالک نے اس چیز کو تسلیم نہیں کیا۔

(۲) مارشل ٹیٹو یہ چاہتے تھے کہ مغربی آسٹریا کا علاقہ یوگوسلاویہ کے حوالے کر دیا جائے اور اس مطالبے کے پیچھے مارشل ٹیٹو کو سوویت یونین کی حمایت حاصل تھی۔

(۳) آسٹریا ۱۹۳۸-۴۵ء تک جرمنوں کے قبضے میں رہا تھا۔ اس عرصے میں آسٹریا میں جرمنی نے جو جائیدادیں بنائی تھیں۔ ان کے بارے میں روس کا موقف یہ تھا کہ مشرقی آسٹریا میں موجود تمام جرمن ملکیت روس کے حوالے کر دی جائے۔ روس کے اس مطالبے کو بھی مغربی بلاک نے رد کر دیا۔

۱۹۵۰ء میں عالمی سیاسی صورت حال میں ایک اہم تبدیلی آئی کہ کوریا دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ اسی دوران اسٹالن کا انتقال ہو گیا اور اس کی جگہ خروشیف برسر اقتدار آئے جنہوں نے آتے ہی خارجہ پالیسی کی ازسر نو تنظیم کی۔ پُرامن بقائے باہمی کی پالیسی اختیار کی ۱۹۵۵ء میں مغربی جرمنی نے نیٹو SEATO میں شمولیت اختیار کر لی۔ جس سے اس نے دوبارہ اپنے آپ کو مسلح کرنا شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ روس کو اس سے تشویش لاحق ہوئی۔ چنانچہ روس نے

وزیرخارجہ نے اعلان کیا کہ وہ آسٹریا کے ساتھ معاہدہ کرنے کو تیار ہے۔ اس اعلان کو آسٹرین چانسلر نے بھی قبول کرلیا۔ جس کے نتیجے میں آسٹریا کا ایک وفد ماسکو گیا۔ اور اس بات چیت میں مندرجہ ذیل امور طے پائے۔

۔۔۔۔ • آسٹریا کی آزاد حیثیت کو بحال کیا گیا۔

۔۔۔۔ • آسٹریا نے اپنی غیر جانبداری کی ضمانت دی۔

۔۔۔۔ • آسٹریا کی دفاعی قوت پر پابندی لگائی گئی کہ وہ کوئی مہلک ہتھیار نہیں بنائے گا۔

۔۔۔۔ • روسی حکومت آسٹریا کو ڈنوب سینک کے تیل کے کارخانے اور قیدی واپس کرنے پر راضی ہے۔

۔۔۔۔ • تاوان کے طور پر آسٹریا روس کو ۱۰ سال تک ایک لاکھ ٹن تیل سالانہ مہیا کرے گا۔

اپریل ۱۹۵۵ء میں روسی وزیر خارجہ نے امریکہ، برطانیہ اور فرانس کے وزرائے خارجہ کو آسٹریا سے معاہدہ کی توثیق کے لئے ویانا آنے کی دعوت دی اس طرح سے مئی ۱۹۵۵ء کو اس معاہدے پر دستخط ہوئے۔

۷۔ جرمنی سے معاہدہ

جرمنی جنگ عظیم دوئم کے بعد "سیاسی میدان کی گیند" بن کر رہ گیا جس سے اینگلو امریکی اور روسی بلاک کھیلتے رہے ۱۹۴۵ء میں روس، امریکہ اور برطانیہ نے پوٹسڈیم کانفرنس میں فیصلہ کیا کہ۔

۔۔۔ • جرمنی کو چار زونوں میں تقسیم کیا جائے۔

۔۔۔۔ • جرمنی کو غیر مسلح کر دیا جائے۔

۔۔۔۔ • نازی ازم کو ختم کر کے اس کی جگہ انتخابات کے ذریعے جمہوریت بحال کی جائے۔

۔۔۔۔ • تاوان کے سلسلے میں روس اور مغربی بلاک میں اتحاد نہیں ہو سکا۔ روس کا موقف یہ تھا کہ جنگ میں سب سے زیادہ نقصان روس کو پہنچا ہے۔ لہٰذا جرمنی سے تاوان وصول کرنے کا حق روس کو پہنچتا ہے جب کہ مغربی بلاک اس کے لئے تیار نہ تھا۔ چنانچہ جرمنی کو چار زونوں میں تقسیم کیا گیا۔ برلن کے بھی چار سیکٹر مقرر کئے گئے ان کے انتظام کے لئے چار طاقتوں (امریکہ، برطانیہ، روس اور فرانس) کی ایک مشترکہ مرکزی

کمان قائم کی گئی ۔ اس مرکزی کمان نے فیصلہ کیا کہ جرمنی کی سیاسی تقسیم نہیں بلکہ انتظامی تقسیم ہو گی ۔ تمام زونوں کے لئے ایک پالیسی مرتب کی جائے گی ۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت سوویٹ یونین اور مغربی بلاک کا یہ ارادہ نہیں تھا کہ جرمنی کو تقسیم کیا جائے لیکن جب پالیسی مرتب کرنے کا وقت آیا تو شدید اختلافات پیدا ہو گئے ۔ روس نے تاوان کے مطالبے سے دستبردار ہونے سے انکار کر دیا ۔ تو ۱۹۴۷ء میں برطانیہ اور امریکہ نے اپنے دونوں زونوں کو ملا کر اتحاد قائم کیا۔ فرانس بھی بعد میں اس اتحاد میں شامل ہو گیا۔

روسی مندوبین کانفرنس سے واک آؤٹ کر گئے اور اس کے بعد روس نے جنگی تاوان وصول کرنے کے لئے جرمنی کی جائیدادیں فروخت کرنا شروع کر دیں ۔ مشینری کو روس نے اپنے ملک میں منتقل کرنا شروع کر دیا ۔ دوسرا اقدام روس نے یہ اٹھایا کہ مشرقی زون سے خوراک کی سپلائی مغربی زون کو روک دی ۔ روسی حلقے کی آبادی تقریباً پونے دو کروڑ تھی اگرچہ یہ حلقہ صنعتی اور غذائی لحاظ سے زیادہ اہم نہ تھا تاہم چونکہ برلن اس حصے میں واقع تھا ۔ اسی لئے اس کی اہمیت فراموش نہیں کی جا سکتی تھی ۔ اتحادیوں کے حلقے کی آبادی ساڑھے چار کروڑ کے قریب تھی اور یہ حلقہ صنعتی اعتبار سے جرمنی کا اہم ترین حلقہ تھا ۔ مغربی بلاک کو خوراک کی ضروریات پوری کرنے کے لئے بھاری مقدار میں سرمایہ خرچ کرنا پڑا ۔ سیاسی اور سماجی بحالی کے لئے ۱۹۴۹ء میں قانون ساز اسمبلی بنائی گئی ۔ ویمری ری پبلک دستور ۱۹۱۹ء کے خطوط پر نیا دستور نافذ کیا گیا ۔ مقامی حکومتی اداروں کو بحال کیا گیا مارک کی قدر و قیمت ختم ہو چکی تھی ۔ جس کی وجہ سے نیا سکہ رائج کیا گیا ۔ تجارتی سرگرمیوں میں تیزی آئی اور اقتصادیات بہتر ہونے لگیں ۔ اس کے ردعمل کے طور پر سوویت یونین نے مشرقی زون میں اشتراکی اصلاحات نافذ کیں ۔ جرمنی کے دونوں حصوں میں الیکشن کروائے گئے ۔ مغربی حصے میں کرسچن ڈیموکریٹک پارٹی برسر اقتدار آئی جس سے مغربی جرمنی "وفاقی جمہوریہ" کہلایا اور مشرقی حصے میں سوشلسٹ پارٹی برسر اقتدار آئی اور وہاں پر سوویت یونین کے زیر اثر اشتراکی حکومت قائم ہوئی ۔ جرمنی کی تقسیم جو پہلے عارضی اور انتظامی تھی ۔ اب مستقل اور سیاسی ہو گئی ۔

مئی ۱۹۵۲ء میں مغربی ممالک نے ایک معاہدے کے ذریعے مغربی جرمنی کو اندرونی و بیرونی معاملات میں خود مختاری دی اور اسے معاہدہ تنظیم جنوب مشرقی ایشیا SEATO کا تحفظ دیا گیا ۔

فرانس کی مخالفت کے باوجود مغربی جرمنی کو روسی جارحیت کے ممکنہ خطرہ کی وجہ سے

اسلحہ رکھنے کی اجازت دے دی گئی۔

۸۔ جاپان سے معاہدہ ستمبر ۱۹۵۱ء

جاپان سے امن معاہدے میں تاخیر کی وجہ روس اور امریکہ کے درمیان باہمی اختلافات کو قرار دیا جاسکتا ہے۔ روس جاپانی مقبوضات میں اپنا حصہ چاہتا تھا۔ اس سلسلے میں امریکہ کا موقف یہ تھا کہ روس نے جاپان کے خلاف اعلان جنگ کرنے میں تاخیر کی ہے اس لئے روس کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ جاپانی مقبوضات میں شریک ہو۔ روس نے ہتھیار ڈالنے سے صرف دو دن پہلے جاپان کے خلاف اعلان جنگ کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ روس معاہدہ امن میں شریک نہیں ہوا۔

سان فرانسسکو کانفرنس:

امریکی حکومت نے ۱۹۵۱ء میں اتحادیوں کی نمائندگی کرتے ہوئے تقریباً ۴۹ ممالک کی کانفرنس بلائی۔ روس کی شمولیت نہ ہونے کی وجہ سے اشتراکی بلاک نے کانفرنس کا بائیکاٹ کیا۔ یہ کانفرنس ۴ ستمبر سے ۸ ستمبر ۱۹۵۱ء تک جاری رہی اس میں اتحادیوں کی جاپان کے ساتھ امن معاہدہ کی دفعات طے ہوئیں۔

یہاں میں یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ امریکہ نے جاپان پر اپنا اثر و رسوخ بڑھانے کے لئے ایک تو جاپانی حکومت کی از سر نو تنظیم کی اور آئین میں ترامیم بھی کروائیں۔ اس کی وجہ مشرق بعید میں امریکی مفاد وابستہ تھا۔

معاہدے کی دفعات کا خلاصہ :۔

۱۔۔۔۔ معاہدے میں جاپان کی آزادی اور سلامتی کو تسلیم کیا گیا۔

۲۔۔۔۔ جاپان اقوام متحدہ میں شمولیت اختیار کرے گا۔ اور اس کے اصولوں کی پابندی کرے گا

۳۔۔۔۔ جاپان پر قابض افواج کو واپس بلایا جائے گا۔ اور اس کی جگہ محافظ افواج تعینات کی جائے گی۔

۴۔۔۔۔ معاہدے کی علاقائی دفعات کے مطابق جاپان نے کوریا کی آزادی کو تسلیم کیا اور جزائر فیولیدٹ، پورٹ ہیملٹن اور ڈاگسیلٹ کے کوریائی علاقوں سے دستبردار ہو گیا۔

۵۔۔۔۔ جاپان نے فارموسا، پیسکاڈور، کورائل جزائر (۱۹۰۵ء سے جاپانی قبضے میں رہنے والے علاقے) ... سلسل کے

جزائر اور انجمن اقوام کے انتدابی نظام کے تحت بحرالکاہل کے علاقوں سے بھی اپنے حقوق ختم کر دیئے۔

۶۔ جاپان نے دوران جنگ ــــ خاتمہ جنگ کے لئے کیئے جانے والے معاہدات کو تسلیم کر لیا۔ چین نے بھی اپنے مقبوضات سے دستبرداری کا اعلان کیا۔

۷۔ جاپان اراکین معاہدہ سے پرامن رہنے اور تجارتی لین دین کرنے پر رضامند ہو گیا نیز یہ طے پایا کہ آئندہ چار سال میں جاپان اتحادیوں کو زیادہ سے زیادہ سہولت فراہم کریگا تاہم اس سلسلے میں دوسرے ممالک کے رویے کو مدنظر رکھا جائے۔

۸۔ معاہدے میں جاپانی معیشت کی عدم استحکام کے خطرے کی وجہ سے اس پر تاوان کی کوئی پابندی نہیں لگائی گئی۔ اور جنگ میں دوسرے ممالک میں جاپان نے جو تباہی پھیلائی ان کی تعمیر نو میں حسب ضرورت مدد کی جائے گی۔

۹۔ جاپان نے غیر جانبدار دل اور جنگی قیدیوں کی سہولت کے لئے اپنی غیر ملکی جائیدادوں سے دستبرداری اختیار کر کے اُسے بین الاقوامی ریڈ کراس کو استعمال کرنے کی اجازت دے دی۔

۱۰۔ معاہدے میں یہ بھی طے پایا کہ جاپان مہلک ہتھیار نہیں بنائے گا اور بڑی فوج بھی تیار نہیں کرے گا بلکہ محدود فوج رکھے گا۔

۱۱۔ معاہدے میں یہ بھی طے پایا کہ اگر کوئی تنازعہ باہمی گفت وشنید کے ذریعے سے حل نہیں ہوتا۔ تو وہ بین الاقوامی عدالت انصاف کو بھیجا جائے گا۔ اور فیصلے کی پابندی کا جاپان نے وعدہ کیا۔

۱۲۔ سرخ چین کے بارے میں جاپان کو پالیسی مرتب کرنے کا اختیار دیا گیا۔

معاہدے کی توثیق میں جاپان اور امریکہ کے علاوہ آسٹریلیا، برما، کنیڈا، سیلون، فرانس انڈیا، انڈونیشیا، نیدرلینڈ، نیوزی لینڈ، پاکستان، فلپائن، برطانیہ اور روس کے نام لئے گئے ان کی توثیق اکثریت نے کر دی۔

امریکہ جاپان معاہدہ

اس معاہدے کے فوراً بعد امریکہ نے جاپان کے ساتھ امن و سلامتی کا معاہدہ کیا جو ابھی تک برقرار ہے اس معاہدے کے تحت امریکہ نے جاپان میں فوجیں رکھنے کا حق قانونی طور پر سے تسلیم کر والیا۔ تاکہ تخریبی عناصر کے خلاف جاپان کا موثر تحفظ ہو سکے نیز

جارحیت کا مقابلہ بھی کیا جا سکے۔

امریکہ کا جاپان سے علیحدہ معاہدہ کرنے کی دوسری وجہ یہ تھی کہ جاپان کے دستور میں یہ بات لکھی تھی کہ جاپان کسی بھی سلامتی کے معاہدے میں شامل ہو سکتا ہے۔

اس معاہدے میں جاپان نے یہ بھی عہد کیا کہ امریکی اجازت کے بغیر کسی اور طاقت کو جاپان میں عسکری اور فوجی نوعیت کی تنصیبات کی اجازت نہیں دی جائے گی یہ معاہدہ اس وقت تک رہے گا جب تک کہ اقوام متحدہ کی طرف سے یا بین الاقوامی طور پر ساری دنیا میں اور خاص طور پر جاپان کے علاقے میں مستقل امن کے قیام کی ضمانت کا موثر اور عملی انتظام نہیں ہو جاتا۔

اس معاہدے کی بدولت امریکہ کی اس علاقے میں برتری قائم ہو گئی ۱۹۵۸ء میں جاپان ٹیکنیکل لحاظ سے آزاد ہو گیا لیکن سیاسی طور سے وہ امریکہ کا طفیلی ملک بن گیا۔ اور ۱۹۷۱ء تک اس کی یہ پوزیشن برقرار رہی۔ اس کے بعد بین الاقوامی سیاسیات میں بعض اہم تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ امریکہ اور چین کے تعلقات بہتر ہونے شروع ہو گئے۔ جاپان نے اپنی آزاد خارجہ پالیسی بنائی جس سے امریکہ کا جاپان پر اثر و رسوخ خاصا کم ہو گیا۔ اب جاپان امریکہ کا طفیلی نہیں بلکہ حامی ملک بن گیا ہے۔

باب ہشتم

بین الاقوامی معاشرے کی اکائیاں

INSTRUMENT OF INTERNATIONAL SOCIETY

۱۔ مجلس اقوام

۲۔ مجلس اقوام کی کارکردگی

۳۔ مجلس اقوام کی ناکامی کے اسباب

۴۔ انجمن اقوام متحدہ

۵۔ انجمن اقوام متحدہ کی تشکیل

۶۔ انجمن اقوام متحدہ کا قیام امن میں کردار

۷۔ انجمن اقوام متحدہ اور مجلس اقوام کے اختلافی نکات

۸۔ انجمن اقوام متحدہ کا تنقیدی جائزہ

مجلس اقوام

THE LEAGUE OF NATIONS

تاریخی اعتبار سے مجلس کی طرز پر معاہدوں کا رواج زمانہ قبل از تاریخ PRE HISTORICAL PERIOD میں بھی موجود تھا اگرچہ اس دور میں معاہدات دستاویزی شکل میں موجود نہ تھے اس قسم کے معاہدات کو فریقین اپنے مذہبی پیشواؤں کے تابع کر دیتے تھے تاکہ ان معاہدوں کی حیثیت قانونی ہو جائے۔ ان معاہدوں کی خلاف ورزی کرنے والا شخص ملکی یا مذہبی مجرم تصور کیا جاتا تھا۔

کسی بین الاقوامی تنظیم کے قیام کے خیالات کا سراغ تاریخی طور پر چودہویں صدی عیسوی سے ملتا ہے پائیرے ڈوبوئس نے ۱۳۰۵ء میں ایک کتاب بعنوان "ارض مقدس کی بازیابی" میں پالیسی بین الاقوامی ثالثی اور ایک بین الاقوامی عدالت کے قیام کا اظہار کیا ۱۶۲۵ء میں گروشیئس نے اپنی مشہور کتاب "جنگ اور امن کا قانون" لکھی اور اس کے پیروکاروں نے بعض کئی ایسے اصول وضع کیے جن کا مقصد یہ تھا کہ مملکتیں آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ اچھے تعلقات قائم کریں اور مملکتوں کے مابین امن کی بنیاد دوستی پر تعلقات ظہور پذیر ہوں لیکن ان اصولوں سے کسی ایسی تنظیم یا مجلس کا پتہ نہیں چلتا جو ان اصولوں کو نافذ کر سکے۔

اٹھارویں صدی میں ایک فرانسیسی مصنف نے قیام امن کے لیے ۱۹ ریاستوں کے وفاق کی ایک تجویز پیش کی۔ جرمنی کے ایک مفکر نے یہ تجویز پیش کی کہ اقوام کے درمیان وفاق کچھ اس قسم کا ہو کہ جس کا مقصد صرف جنگ کا خاتمہ کلی طور پر اور آئندہ جنگ کا خطرہ بالکل ٹل جائے تاکہ دنیا میں امن و امان کا دور دورہ ہو۔ روس نے یورپ کے وفاق کی تجویز پیش کر کے مستقل قیام امن کے اس تصور کی حمایت کی۔

حقیقت میں ہر جنگ نے دائمی امن کے لیئے تجاویز کے ایک طویل سلسلے کو جنم دیا لیکن ۱۸۱۵ء تک ایک بین الاقوامی تنظیم صرف خوابوں تک محدود رہی اور لوگوں نے خیالی طور پر ایک تنظیم قائم کرنے میں ساتھ دیا۔ ۱۸۱۵ء کے مقدس اتحاد پر روس پروشیا اور اسٹریا نے دستخط کئے۔ یہ قیام امن کی طرف پہلا قدم تھا اور پہلا عملی کام بھی اس تجاویز میں تینوں مملکتوں نے عہد کیا کہ مذہبی نقطہ نظر سے ایک حقیقی اخوت اور امن کے ماحول میں تینوں مملکتیں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں گی اور امن و امان قائم رکھنے میں ایک دوسرے کا ساتھ دیں گی ایک وقت تک یہ اتحاد روبہ عمل رہا لیکن چند سالوں میں یہ اتحاد غیر موثر ہو گیا اور آخر کار ۱۸۴۸ء کے انقلاب نے اس اتحاد کو بالکل ختم کر دیا۔

پچھلی صدی میں امریکہ میں یہ تصور از سر نو پروان چڑھا اور یہاں سے برطانیہ فرانس اور سوئٹزرلینڈ تک پہنچ گیا لندن میں ۱۸۴۳ء کو اور پیرس میں ۱۸۴۹ء میں عالمی کانفرنسیں منعقد ہوئیں۔ جن کی بدولت انگلستان فرانس اور امریکہ میں کئی امن پسند تنظیمیں قائم ہوئیں مگر ان تنظیموں کی سرگرمیاں ۱۸۶۰ء تک ختم ہو چکی تھیں۔ ۱۸۷۰-۷۱ء میں جرمنی اور فرانس کے مابین جنگ چھڑ گئی ۱۸۷۷-۷۸ء میں روس اور ترکی کی جنگ کے بعد ایک بار پھر تحریک امن نے فریڈرک باسی کی سربراہی میں زور پکڑا اس تحریک نے اہل دنیا میں ثالثی کی اہمیت اور فوائد کا پروپیگنڈہ کیا جس سے تقریباً سبھی ممالک اس بات پر راضی ہو گئے کہ اگر دو ممالک میں جھگڑا ہو تو ثالثی کے ذریعے اس کو حل کیا جائے ۱۸۸۹ء میں عالمی امن کانفرنس اور پارلیمانی اتحاد کانفرنس ہوئی۔ اس کے بعد ۱۸۹۳ء کی شکاگو امن کانفرنس میں بین الاقوامی عدالت انصاف کی تشکیل کے لیے بحث و تمحیص ہوئی۔ بعد ازاں کئی عالمی نوعیت کی کانفرنسیں ہوئیں لیکن ان میں ۱۸۹۹ء اور ۱۹۰۷ء کی ہیگ کانفرنسیں بہت مشہور ہیں۔ ان کانفرنسوں کی بدولت حکومتوں کے درمیان ثالثی کا فیصلہ نہ صرف عام ہوا بلکہ اس کی اہمیت میں بھی اضافہ ہوا۔

جنگ عظیم اول ۱۹۱۴-۱۹ء میں جب سبھی ممالک جنگ کی تباہ کاریوں سے تنگ آ گئے تو اس بات کی شدت سے ضرورت محسوس کی گئی کہ کوئی ایسی عالمی تنظیم بنائی جائے جو دنیا میں مستقل امن برقرار رکھ سکے۔ بنی نوع انسان کو محبت عالمی بھائی چارے اور امن کا سبق سکھائے۔ ان حالات میں امریکی صدر ولسن نے مشہور زمانہ چودہ نکاتی امن فارمولا

پیش کیا۔ جرمنی نے صدر ولسن کے چودہ نکات کو مانتے ہوئے ہتھیار ڈال دیئے۔

مجلس اقوام کا قیام:

مجلس اقوام کے قیام کے لئے سب سے زیادہ کام امریکہ، برطانیہ، سوئٹزرلینڈ جرمنی اور ہالینڈ نے کیا تھا۔ ۲۸ر جون ۱۹۱۹ء کو پیرس کے ورسیلز محل میں معاہدہ امن پر دستخط ہوئے اس معاہدے کی کل ۴۳۵ دفعات تھیں۔ جس میں پہلی ۲۶ دفعات مجلس اقوام کے بارے میں تھیں۔ جس سے مجلس اقوام معاہدہ ورسیلز کا ناقابل تنسیخ حصہ بن گئی۔ ۱۰ر جنوری ۱۹۲۰ء کو معاہدہ ورسیلز کی توثیق کے وقت مجلس اقوام کی منظوری بھی ہوئی۔ اس کے میثاق پر ۳۲ ریاستوں نے دستخط کئے جن میں ۱۳ غیر وابستہ تھیں سینیٹ کی عدم توثیق کی وجہ سے امریکہ مجلس کا ممبر نہ بن سکا۔

مجلس اقوام کا صدر مقام:

مجلس اقوام کا صدر مقام سوئٹزرلینڈ کا مشہور شہر جنیوا قرار پایا اور اس کے پہلے سیکریٹری سر جیمس ارک ڈرمنڈ تھے۔

رکنیت:

ہر آزاد ریاست جس کو لیگ کے میثاق سے اتفاق ہو اس کی ممبر بن سکتی تھی۔ علاوہ ازیں نیم آزاد ریاستیں بھی اس کی ممبر بن سکتی تھیں۔ بشرطیکہ یہ لیگ کے اراکین کی دو تہائی حمایت حاصل کرلیں۔ مجلس سے علیحدگی کے لیے دستوری طور پر ۲ دو سال قبل علیحدگی کا نوٹس دینا ضروری تھا لیکن یہ صرف کاغذی حد تک رہا عملی طور پر جب کوئی چاہے اس سے علیحدہ ہو سکتا تھا۔

دستور:

مجلس اقوام کا دستور لچکدار اور تحریری تھا۔ اس لئے اس میں ضرورت کے مطابق آسانی سے ترمیم کی جا سکتی تھی اسمبلی کی دو تہائی اکثریت کی منظوری سے ترمیم

کر سکتی تھی اور اگر ترمیم کونسل کی طرف سے ہو تو تمام ممبران کا متفق ہونا ضروری تھا دستور ۲۶ دفعات اور دو ضمیموں پر مشتمل تھا۔

مجلس اقوام کے ادارے :

دستوری طور پر مجلس تین اداروں پر مشتمل تھی۔ اسمبلی کونسل اور سیکرٹیریٹ مستقل عدالت برائے بین الاقوامی انصاف اور بین الاقوامی ادارہ محنت مجلس کے ذیلی ادارے تھے ان اداروں کی اعانت کے لئے بعض دوسری ذیلی فنی تنظیمیں اور مستقل یا عارضی کمیشن بھی تھے۔

۱۔ اسمبلی :

یہ مجلس کی اعلیٰ ترین باڈی تھی آزاد اور نوآبادیاتی مملکتیں اس کی ممبر بن سکتی تھیں اس میں ہر ریاست کے تین نمائندے ہوتے تھے۔ جن کا صرف ایک ووٹ ہوتا تھا اسمبلی کا ایجنڈا اسیکریٹری جنرل تیار کرتا تھا اس کی کاپیاں ممبران میں پیشگی تقسیم کر دی جاتیں تھیں اور اجلاس کے دوران ان پر بحث ہوتی تھی اور بوقت ضرورت خصوصی اجلاس بلایا جا سکتا تھا ہر سال اسمبلی کے صدر کا انتخاب کسی چھوٹی مملکت سے ہوا کرتا تھا جس کی عام طور پر کونسل میں کوئی نمائندگی نہ ہوا کرتی تھی اس کی چھ مستقل کمیٹیاں تھیں چھ نائب صدر منتخب کئے جاتے تھے ان کی مشترکہ حیثیت ایک مجلس قائمہ کی سی تھی۔

یہ بات اہمیت کی حامل ہے کہ مجلس اقوام کے پاس کوئی ایسی قوت نہ تھی جس کے ذریعے وہ کسی مملکت کے جارحانہ اقدام کے خلاف کوئی کارروائی کر سکے مزے کی بات یہ ہے کہ اس کے پاس تنازعات کے حل کے لیئے سب سے موثر ہتھیار "کمیشنوں کا قیام" تھا جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جھگڑے کو بآسانی ختم کروا دیتے یا جھگڑا خود بخود ختم ہو جاتا تھا۔ دراصل یہ تمام چیزیں کاغذی کارروائی کے لئے ہوتی تھیں۔ ان کے پس پردہ بڑی طاقتیں اپنے سیاسی مفادات حاصل کرتی تھیں۔

اسمبلی کے خاص خاص کاموں میں بجٹ پاس کرنا کونسل کے غیر مستقل اراکین کا انتخاب کرنا اور مجلس کی رکنیت بڑھانا شامل تھے اس کی سرکاری زبانیں انگریزی اور فرانسیسی

تھیں البتہ اسپیکر کی اجازت سے تیسری زبان بھی استعمال کی جا سکتی تھی۔

۲۔ کونسل:

کونسل ایک طرح سے لیگ کی انتظامیہ تھی ابتدا میں پانچ بڑی طاقتیں امریکہ، برطانیہ، فرانس، اٹلی اور جاپان کو اس کی مستقل رکنیت دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ لیکن امریکہ کے شامل نہ ہو سکنے سے مستقل اراکین کی تعداد چار رہ گئی تو عارضی تعداد کو چار سے بڑھا کر چھ کر دیا گیا۔ جس سے اراکین کی ابتدائی تعداد دس رہی۔ وقت اور حالات کے ساتھ ساتھ ان کی مستقل اور عارضی تعداد میں کمی بیشی ہوتی رہی جیسے ۱۹۲۶ء میں جرمنی کو مستقل رکنیت دی گئی ۱۹۳۳ء میں جرمنی اور جاپان نے مجلس کو خیر باد کہہ دیا تو مستقل اراکین کی تعداد صرف تین رہ گئی ۱۹۳۴ء میں روس مستقل رکن کی حیثیت سے شامل ہوا۔ لیکن اٹلی علیحدہ ہو گیا۔ اس طرح مستقل اراکین کی تعداد تین ہی رہی مگر عارضی ممبران کی تعداد تیرہ کر دی گئی۔

کونسل کا نگران چیئرمین کہلاتا تھا جس کا انتخاب کونسل کے ارکان میں سے حروف تہجی کی بنا پر باری باری ہوتا تھا۔ کونسل کا اجلاس سال میں چار دفعہ ہوتا تھا اور بوقت ضرورت بھی طلب کیا جا سکتا تھا۔ کونسل کی حیثیت بین الاقوامی قانون ساز ادارے کی سی ہو گئی تھی اس کی قراردادوں کا احترام کیا جاتا تھا اور یہ تمام انتظامی امور کی ذمہ دار ہوتی تھی۔

میثاق COVENANT میں کونسل اور اسمبلی کے فرائض میں کوئی خاص فرق نہ تھا در اصل اسمبلی اور کونسل دونوں ریاستوں کی مساوات اور بڑی طاقتوں کی بالادستی کے مابین ایک سمجھوتے کی حیثیت رکھتی تھیں۔ میثاق نے مجلس کو مخصوص قسم کے اختیارات عطا کئے تھے اس امر کی نشاندہی کے بغیر کہ آیا یہ اختیارات کونسل کو حاصل ہوں گے یا اسمبلی کو۔ لیکن عام خیال یہ ہے کہ میثاق کی منشاء اسمبلی کے مقابلے میں کونسل کو بالادست بنانا تھا اسمبلی کا خاص مقصد تعاون کے لیئے بین الاقوامی نقطہ نظر کو فروغ دینا تھا۔ عملی طور پر کونسل کو اسمبلی پر فوقیت حاصل تھی جس طرح عام جمہوری ممالک میں انتظامیہ مقننہ پر حاوی ہوتی ہے۔

غیر مستقل اراکین کا انتخاب ۳ سال کے لئے ہوتا تھا اور ہر سال ان کی ایک تہائی تعداد ریٹائر ہو جاتی تھی کونسل میں تیسری قسم کے ارکان ایڈ ہاک AD-HOC ہوتے تھے۔

۳۔ سیکریٹریٹ :

یہ ادارہ سیکریٹری جنرل کے ماتحت ہوتا تھا۔ جس کے عہدے کی میعاد دس سال تھی سیکریٹری جنرل منتخب ہو جانے کے بعد دوسری تقرریاں خود کرتا تھا۔ سیکریٹریٹ کے عملے کی تعداد مختلف اوقات میں مختلف رہی ہے۔

سنہ ۱۹۱۹ء میں ۱۲۱

سنہ ۱۹۳۱ء میں ۷۰۷

سنہ ۱۹۴۰ء میں ۲۰۹

سنہ ۱۹۴۶ء میں ۹۴

سیکریٹریٹ کو ۱۱ شعبوں میں تقسیم کیا گیا تھا سنہ ۱۹۳۸ء میں ۱۵ شعبے تھے خاص شعبوں میں مرکزی شعبہ، سیاسی شعبہ، قانونی شعبہ اور اطلات کا شعبہ وغیرہ شامل تھے اس کے ساتھ کچھ اور تنظیمیں بھی وابستہ تھیں مثلاً تین فنی تنظیمیں معاشی اور مالی تنظیم نقل وحمل کی تنظیم اور تنظیم صحت، ان تنظیموں کے علاوہ مستقل مشاورتی کمیشن، بری بحری افواج کے عارضی مشاورتی کمیشن اور انتظامی تنظیمیں۔ دو خود مختار تنظیمیں بھی تھیں۔ یعنی عالمی انصاف کی مستقل عدالت اور عالمی مزدور تنظیم یہ مجلس کے لازمی اعضاء نہ تھے مگر عالمی امن، خوشحالی اور سلامتی کے قیام میں مجلس کے مقاصد کی تکمیل کے لئے تعاون کرتے تھے۔

سیکریٹریٹ کے تمام عہدے قومیت کی بنیاد پر طے کئے جاتے ہیں اور بعض اعلیٰ عہدے مخصوص قوموں کے لئے مخصوص تھے اس کے باوجود قابلیت اور صلاحیت کو نظر انداز نہیں کیا گیا تھا۔ یہ بڑے قابل لوگ ہوتے تھے جو پوری انسانیت کے سماجی اور سیاسی کاموں سے واقفیت رکھتے تھے۔ اس کا عملہ حقیقی معنوں میں انسانیت کا خادم سمجھا جاتا تھا۔ مجلس کے اخراجات اس کے رکن ممالک پورے کرتے تھے ان میں سب سے زیادہ فرانس اور برطانیہ ادا کرتے تھے علاوہ ازیں فلاحی تنظیموں کی

طرف سے بھی بھاری امداد ملتی تھی۔ مجلس کے عروج کے وقت چھ ملین ڈالر کا بجٹ ریکارڈ کیا گیا۔

۴۔ مستقل عدالت برائے بین الاقوامی انصاف:

مجلس اقوام کی تحت عالمی سطح پر ریاستوں کے درمیان تنازعات اور جھگڑوں کے تصفیہ کے لئے ایک مستقل عدالت برائے بین الاقوامی انصاف تشکیل دی گئی اس عدالت میں ۹ جج اور ۴ ڈپٹی جج شامل تھے ان ججوں کا انتخاب نو سال کے لئے کونسل اور اسمبلی کے مشترکہ اجلاس میں کیا جاتا تھا۔ ایک جج ۹ سال تک اپنے فرائض انجام دینے کے بعد دوبارہ جج بننے کا اہل نہیں تھا یہ جج صاحبان آپس میں سے عدالت کا صدر اور نائب صدر منتخب کرتے تھے جو تین سال تک اپنے فرائض سرانجام دیتے تھے۔

عدالت کا اختیار سماعت:

۱۔ مشاورتی اختیارِ سماعت:

اسمبلی اور کونسل کی طرف سے بھیجے ہوئے معاملات پر عدالت اپنی رائے دیتی تھی اور عدالتی ٹربیونل کی حیثیت سے وہ متعلقہ فریق ریاستوں کے باہمی معاملات جو اس کے سامنے پیش کئے جاتے تھے فیصلہ کرتی تھی۔ اس کے فیصلے فریقین پر پابندی کی حیثیت رکھتے تھے۔

۲۔ نزاعی اختیار سماعت:

عدالت برائے بین الاقوامی انصاف کو ایسے تمام معاملات پر اختیارِ سماعت حاصل تھا جو حکومتوں کی جانب سے اس کے سامنے پیش کئے جاتے تھے۔ یہ عہد ناموں کی تشریح سے متعلق بھی فیصلے کرتی تھی عدالت کا فیصلہ اسی صورت میں قابل قبول یا قابل نفاذ ہوتا تھا جب دونوں ریاستیں اس کو تسلیم کرلیں یہی عدالت ۱۹۴۵ء میں انجمن اقوام متحدہ کی بین الاقوامی عدالتِ انصاف کی صورت میں جلوہ گر ہوئی۔

۵۔ بین الاقوامی ادارہ محنت:

مجلس اقوام کے تحت مزدوروں کی فلاح وبہبود کے لئے ایک ادارہ محنت تشکیل دیا گیا جس کا بنیادی مقصد دنیا کے مزدوروں کی حالت کو بہتر بنانا تھا اس ادارے میں حکومتوں کے نمائندے سرمایہ دار اور مزدوروں کے نمائندے شامل تھے۔ اس کے سالانہ اجتماعات میں اہم فیصلے کئے جاتے تھے۔ اس میں ایک شق یہ بھی پاس کی گئی تھی کہ ۱۰ سال سے چھوٹے بچوں سے کام نہ لیا جائے اور روزانہ کام کے اوقات کار زیادہ سے زیادہ ۸ گھنٹے ہوں جو ممالک مجلس کے ممبر نہیں تھے وہ بھی اس ادارے کے ممبر بن سکتے تھے۔ ادارے کی مجلس عاملہ میں ۳۲ ارکان شامل تھے سربراہ کو ڈائریکٹر کہا جاتا تھا۔ مختلف امور کی دیکھ بھال کے لئے کئی کمیٹیاں تشکیل دی گئیں۔ ادویات کی نگرانی کی کمیٹی کی کارکردگی سب سے بہتر تھی۔

بین الاقوامی ادارہ محنت کا صدر مقام سوئٹزرلینڈ کا شہر جنیوا تھا۔

مجلس کی کامیابیاں:

مجلس اقوام نے اپنی ۲۶ سالہ زندگی (۱۰ جنوری ۱۹۲۰ء تا ۸ اپریل ۱۹۴۶ء) میں سب سے اہم کارنامہ یہ انجام دیا کہ اس نے عالمی برادری میں تعاون اور اتحاد کی فضا قائم کی اور دنیا والوں کی توجہ ایسے امور کی طرف دلائی جو تنازعات کی جڑ تھے۔ تمام ریاستوں کو گفت وشنید کے ذریعے مسائل حل کرنے کا طریقہ کار سکھایا مختصراً انسداد جنگ کے لئے مجلس نے جو اقدامات کئے ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۔ موصل کا علاقہ:

۲۵-۱۹۲۴ء میں عراق اور ترکی کے درمیان موصل میں تیل کے چشموں پر جھگڑا ہوا۔ یہ علاقہ دراصل ترکی کا تھا۔ لیکن ترکی نے جرمنی کا ساتھ دیا تھا۔ لہٰذا برطانیہ یہ چاہتا تھا کہ یہ علاقہ عراق کے حوالے کر دیا جائے۔ چنانچہ لیگ نے اس مسئلے پر ایک کمیشن بٹھایا۔ اس نے ترکی کے احتجاج کو نظر انداز کرتے ہوئے عراق کے حق میں فیصلہ دیا۔ بہر حال

۱۰ جون ۱۹۲۶ء کے معاہدہ میں فریقین ایک سرحدی خط قائم کرنے پر متفق ہو گئے۔

۲۔ یونان، بلغاریہ مسئلہ:

اکتوبر ۱۹۲۵ء میں یونان نے بلغاریہ کے کچھ سرحدی علاقوں پر قبضہ کر لیا مجلس نے یونان کو اپنی فوجیں واپس بلانے پر مجبور کیا اس طرح انتہائی کامیابی سے جنگ کے امکانات کو ختم کر دیا۔ اور بلغاریہ کو اس کا ہرجانہ بھی دلایا۔

۳۔ بالائی شلیشیاء کا مسئلہ:

معاہدہ ورسیلز کے تحت بالائی شلیشیاء کا علاقہ مجلس کی تحویل میں دیا گیا مجلس نے ۱۹۲۱ء میں اس علاقے میں ریفرنڈم کر دایا۔ جس میں ۴۰ ہزار ووٹ پولینڈ کو ۶۰ ہزار ووٹ جرمنی کو ملے جس سے ثابت ہو گیا کہ وہاں کے لوگ جرمنی کی حکمرانی چاہتے تھے۔ پول باشندوں کی تعداد زیادہ ہونے کی وجہ سے پولینڈ کا مطالبہ تھا کہ اس علاقے کو پولینڈ کے حوالے کیا جائے چنانچہ اس کے حل کے لئے مجلس نے ایک کمیشن مقرر کیا اس کمیشن نے ایک سرحد متعین کرنے اور مخصوص معاشی اور سماجی انتظامات کرنے کی تجویز پیش کی فریقین نے ان تجاویز کو مان لیا۔ اس کے تحت زیادہ زمین اور آبادی تو جرمنی کے حصے آئی البتہ معدنیات سے مالا مال علاقہ پولینڈ کے حوالے کر دیا گیا۔

(۴) اٹلی، ایتھوپیا کا مسئلہ:

دسمبر ۱۹۳۴ء میں اٹلی اور ایتھوپیا کے درمیان ایبے سینیا کے علاقے کا جھگڑا ہوا اس وقت اٹلی پر مسولینی کی حکومت تھی۔ چنانچہ جب مجلس نے اٹلی کے خلاف "معاشی ناکہ بندی" کی تو بعض ممالک نے لیگ کا ساتھ نہ دیا جس سے مسولینی کی افواج نے ایبے سینیا پر گولہ باری کر کے اس پر قبضہ کر لیا اور اس کے ساتھ ہی مجلس کو خیرباد کہہ دیا۔

۵۔ تخفیف اسلحہ :

مجلس کی تخفیف اسلحہ کی کوششیں قابل ذکر ہیں لیکن بحیثیت مجموعی مجلس اس سلسلے میں ناکام رہی اس کی وجہ یہ تھی کہ بڑی طاقتیں مثلاً امریکہ، برطانیہ، فرانس، جرمنی، جاپان اور دیگر ممالک کے درمیان اسلحہ کی تخفیف کا معیار مختلف تھا ۱۹۲۵ء میں انطرامی کمیشن مقرر کیا گیا اور پھر ۱۹۳۲ء کو تخفیف اسلحہ کی عالمی کانفرنس بھی بلائی گئی۔ اس کانفرنس میں جرمنی نے لیگ کو خیرباد کہہ دیا اور تخفیف اسلحہ کا مقصد ہی فوت ہو گیا۔

۶۔ معاشی بحران :

مجلس اقوام نے معاشی بحران کے خاتمے کے لئے جون ۱۹۳۳ء کو لندن میں ایک عالمی معاشی کانفرنس بلائی تاکہ بیروزگاری کا خاتمہ کیا جائے۔ مزدوروں کی فلاح وبہبود کے لئے اقدامات کئے جائیں۔ بنیادی اشیاء کی قیمتوں میں استحکام لایا جائے۔ سرمایہ کاری میں ہر سطح پر اضافہ کیا جائے اور بین الاقوامی تجارت کو فروغ دیا جائے مالیاتی اور زری پالیسیوں پر نظر ثانی کر کے نظام زر کو بہتر بنایا جائے۔ لیکن افسوس کہ لیگ کی یہ کوششیں بارآور نہ ہو سکیں کیونکہ بڑی طاقتیں خاص کر امریکہ اور فرانس میں معاشی بحران کے خاتمے کے لئے ہم خیالی نہ تھی۔ یہ کانفرنس جولائی ۱۹۳۳ء کو غیر معینہ مدت کے لئے ملتوی ہو گئی اور پھر اس کا کبھی اجلاس نہ ہوا۔

۷۔ خفیہ معاہدات :

مجلس اقوام نے مملکتوں کے اس حق کو تسلیم کیا کہ وہ مخصوص وجوہات کی بناء پر دوسری مملکتوں سے معاہدات کر سکتی ہیں خفیہ معاہدات کی ممانعت کر دی گئی۔ ہر معاہدہ کی اشاعت ضروری قرار پائی اراکین مجلس کو خفیہ معاہدات میں شرکت سے بھی منع کر دیا گیا۔

۸۔ جنگی قیدیوں کی واپسی:

مجلس اقوام نے دنیا کے ۲۶ ممالک کے تقریباً ساڑھے چار لاکھ جنگی قیدیوں کو دشمن کے قید خانوں سے رہائی دلائی۔

۹۔ فن لینڈ اور سویڈن کا مسئلہ:

۱۹۲۰ء میں فن لینڈ اور سویڈن کے مابین جزائر آلینڈ کی ملکیت پر تنازعہ پیدا ہوا تو لیگ نے جزائر آلینڈ فن لینڈ کے حوالے کئے اور فن لینڈ کو ان جزائر کی قلعہ بندی کرنے سے روکا۔

۱۰۔ پولینڈ اور لیتھوتیا کا مسئلہ:

پولینڈ اور لیتھونیا کے مابین ولناڈسٹرکٹ کا تنازعہ پیدا ہوا۔ مجلس نے پولینڈ کے حق میں فیصلہ دیا۔ اور جنگ کے امکان کو ختم کر دیا۔

۱۱۔ اٹلی اور یونان تصادم کا خطرہ:

۱۹۲۳ء میں اٹلی کے چند فوجی یونان کی سرحد کے قریب مردہ حالت میں پائے گئے تو اٹلی نے اس کی ذمہ داری یونان پر عائد کی اس سے دونوں ملکوں کے مابین جنگ چھڑنے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ مجلس کی مداخلت کی وجہ سے یہ خطرہ ٹل گیا۔

۱۲۔ بولیویا اور پیراگوئے کا مسئلہ:

بولیویا اور پیراگوئے (جنوبی امریکہ) کے مابین ۱۹۲۸ء میں جنگ چھڑ گئی مجلس اقوام نے اس جنگ کو روکنے کے لئے مؤثر کردار ادا کیا۔

۱۳۔ پیرو اور کولمبیاء کا مسئلہ:

پیرو اور کولمبیاء (جنوبی امریکہ) کے مابین سرحدی تنازعہ پیدا ہوا۔ پیرو نے کولمبیاء کے سرحدی علاقے (صوبے لیٹسیا) پر قبضہ کر لیا تو مجلس اقوام نے

مداخلت کر کے کو لمبیا کو یہ علاقہ واپس کرایا اور جنگ کے امکانات کو ختم کیا۔

۱۴۔ یونان اور ترکی کے مابین تبادلہ آبادی :

مجلس اقوام نے یونان اور ترکی کے مابین آبادی کے تبادلہ کے جملہ امور کو اپنی نگرانی میں مکمل کرایا اور دونوں ممالک کو بہتر تعلقات کے مواقع بہم پہنچائے۔

۱۵۔ انتدابی انتظام :

مجلس اقوام نے پس ماندہ اور ترقی پذیر علاقوں کا انتداب (عارضی تحویل) دوسرے ترقی یافتہ ممالک کے سپرد کیا۔ یہ طے پایا کہ جب یہ ترقی پذیر ممالک اپنے معاشی و سیاسی امور چلانے کے قابل ہو جائیں گے تو انہیں آزاد اور خود مختار (علاقے نے مملکت) کی حیثیت دے دی جائے گی یہ علاقے ایشیاء اور افریقہ میں تھے مثلاً شام، فلسطین اردن اور روڈیشیا وغیرہ انتدابی نظام کے مقاصد حسب ذیل تھے۔

(۱) معاشی معاملات میں تفریق کو ختم کرنا۔

(۲) ان کی قانونی حیثیت سالمیت اور انفرادیت کو برقرار رکھنا۔

(۳) لوگوں کے مفادات کا تحفظ کرنا۔

اس میں شک نہیں کہ انتدابی نظام انسانی بنیادوں پر خدمت کرنے کا کامیاب تجربہ تھا۔

۱۶۔ فلاحی خدمات :

فلاحی اقدامات میں سب سے اہم کام مجلس اقوام نے یہ کیا کہ کروڑوں افراد جو جنگ کی وجہ سے بے گھر ہو چکے تھے ان کی رہائش کے بندوبست کے لئے حتی الامکان کوششیں کی۔ انسانی حقوق کو اپنے دائرہ کار میں شامل کیا۔

بنی نوع انسان کی جسمانی اور ذہنی صحت کو بہتر بنانے کے لئے خطرناک ادویات کی تجارت کو ممنوع قرار دیا اور وسیع پیمانے پر پھیلنے والی بیماریوں کا انسداد کیا گیا۔ انسداد غلامی کے لئے مؤثر اقدامات کیئے گئے ۱۹۲۲ء میں انسداد غلامی کا ایک مستقل کمیشن قائم

کیا۔ رکن ممالک پر زور دیا گیا کہ وہ اقلیتوں سے اچھا سلوک کریں مجلس نے عورتوں اور بچوں کی تجارت پر پابندی لگائی۔ پسماندہ ممالک کے عوام کو تعلیمی سہولتیں اور وظائف مہیا کئے گئے۔ بلاشبہ مجلس اقوام کے یہ اقدام تعریف کے مستحق ہیں۔

مجلس کی ناکامی کے اسباب:

CAUSES OF THE FAILURE OF LEAGUE

ماہرین نے مجلس کی ناکامی کے بیشتر اسباب بتائے ہیں جن میں چند مشہور مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) مجلس اقوام کو معاہدہ ورسیلز کا ناقابل تسخیر حصہ بنا دیا گیا تھا۔ مجلس میں شمولیت کے لئے معاہدہ کی توثیق کرنا ضروری تھا اور بیشتر آزاد ریاستیں اس معاہدے کو اتحادیوں کی یک طرفہ کارروائی سمجھتی تھیں۔ اس وجہ سے مجلس عالمگیر نہ بن سکی۔

(۲) مجلس کی کامیابی کا دارومدار بین الاقوامی ہونے پر تھا اس کا بانی رکن امریکہ بھی اس میں سینٹ کی عدم توثیق کی وجہ سے شامل نہ ہو سکا۔ ۱۹۲۵ء تک جرمنی بھی اس سے الگ رہا۔ روس نے ۱۹۳۴ء میں شمولیت اختیار کی منچوریہ پر حملہ کے سبب ۱۹۳۳ء میں جاپان علیحدہ ہو گیا اٹلی کی ناراضگی کا سبب حبشہ کی جنگ تھی۔ اس طرح متعدد ممالک کے تعاون سے مجلس اقوام محروم ہو گئی۔

(۳) لیگ جن مقصد کے لئے بنائی گئی تھی مثلاً امن کا قیام۔ انسانیت کا تحفظ وغیرہ یہ دونوں ہی کام سرانجام نہ دے سکی۔ منچوریہ جنگ اور اسپین کی خانہ جنگی اس کی اہم مثالیں ہیں۔

(۴) مجلس کی ناکامی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس کے رکن ممالک مفاد پرست تھے اور وہ اس وقت تک لیگ کے ممبر رہے جب تک انہیں اس میں کوئی مفاد نظر آیا اور جب مجلس نے ان کے خلاف کوئی اقدام کئے تو ان مملکتوں نے مجلس کو خیرباد کہہ دیا۔ جاپان نے منچوریہ کے مسئلے پر اٹلی نے ابی سینیا کے مسئلے پر اور ہٹلر نے تخفیف اسلحہ کے مسئلہ پر لیگ کو خیرباد کہا۔

(۵) مجلس مکمل طور پر ریاستوں کی انجمن تھی اور اس کے پاس کوئی ہتھیار نہ تھا جس سے وہ کسی دوسری مملکت پر دباؤ ڈال سکے۔ دوسری بات یہ کہ اس نے سستی کو سے کام لیا کبھی معاہدوں کی تجدید پر توجہ نہ دی۔ جس کی وجہ سے بعض اوقات مملکتوں

کے مابین اتفاق رائے نہ ہو سکا۔

(۶) عام طور پر یہ تاثر لیا جاتا تھا کہ مجلس پر برطانوی اور فرانسیسی غلبہ ہے جس سے چھوٹی ریاستوں کو عدم تحفظ کا احساس ہوتا تھا۔ چونکہ ان کے جائز حقوق بھی ان کو نہیں مل رہے تھے۔

(۷) مجلس صرف یورپی مسائل ہی کو دنیا کے مسائل سمجھتی تھی ایشیاء اور افریقہ کے مسائل کو نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ اس کا مقصد یورپ کی بالا دستی کو برقرار رکھنا تھا۔

(۸) مجلس کے دونوں اداروں (اسمبلی، کونسل) کو وسیع تر اختیارات دیئے گئے تھے کونسل کو انتظامی لحاظ سے فوقیت دی گئی تھی لیکن کونسل کے تمام اراکین کا متفق ہونا ضروری قرار پایا تھا۔ جس کی وجہ سے تنازعات کے حل میں کافی مشکلات پیش آئیں اور کئی تنازعات حل نہ ہو سکے۔

(۹) مجلس کو میثاق کے تحت یہ اختیار دیا گیا تھا کہ وہ حملہ آور پر معاشی پابندی لگا سکتی ہے مجلس نے حبشہ (ابے سینیا) کے مسئلے پر اٹلی پر یہ اختیار استعمال کیا تو ممبر ممالک نے مجلس کا ساتھ نہ دیا اور ان ممالک نے قومی مفاد کو عالمی مفاد پر ترجیح دی۔

(۱۰) مجلس کے زوال کی ایک وجہ ۱۹۲۹ء کا معاشی بحران بھی تھا۔ جس نے تمام یورپی ممالک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ اس بحران سے یورپی معیشت کا دیوالیہ ہو گیا۔ مجلس کی بین الاقوامی معاشی کانفرنس ناکام ہو گئی جس سے لوگوں میں خوف و ہراس پھیل گیا۔

(۱۱) مجلس کی ناکامی کی ایک وجہ آئینی کمزوریاں بھی تھیں۔ مجلس کے آئین میں جنگ کو غیر قانونی قرار دیا گیا تھا البتہ حملہ آور ریاست AGGRESSIVE STATE کے خلاف تمام ریاستیں مل کر جنگ کر سکتی تھیں۔ لیکن آئین میں جارحیت کی وضاحت نہیں کی گئی تھی۔

(۱۲) جولائی ۱۹۳۶ء میں اسپین میں سول حکومت قائم ہوئی۔ جرمنی اور اٹلی باغیوں کا ساتھ دینے لگے اور روس حکومت اسپین کی مدد کرنے لگا کیونکہ یہ حکومت اشتراکی ذہن کی تھی۔ یورپ کی اس خانہ جنگی میں مجلس کوئی خاص کردار ادا نہ کر سکی۔ ماسوائے دسمبر ۱۹۳۶ء کو اپنے اجلاس میں چند قرار دادیں پاس کر دیں۔

(۱۳) ۱۹۳۴ء میں جب مجلس کے ممبران کی تعداد ۴۳ تھی اس میں گروہ بندیاں شروع ہو گئیں یہ وہ ممالک تھے جو برطانیہ اور فرانس کے ہم خیال تھے لیگ کی واضح طور پر دو گروہوں میں تقسیم اس کے زوال میں مزید پیش رفت کا باعث ہوئی۔

(۱۴) مجلس کی کارکردگی کے فقدان کو دیکھتے ہوئے اراکین اور اداروں نے فنڈ دینے میں غفلت برتنی شروع کر دی جس کی وجہ سے مجلس کو اپنا اسٹاف کم کرنا پڑا۔ اخراجات کم کرنے پڑے۔ علاوہ ازیں ممبر ممالک نے اس کے اجلاس میں بھی دلچسپی لینی کم کر دی۔ جس سے اس کی ناکامی یقینی ہو گئی۔

(۱۵) جرمنی نے ۱۹۳۹ء میں چیکوسلواکیہ پر قبضہ کر لیا تو مجلس خاموش تماشائی بنی رہی جس سے عالمی رائے عامہ میں یہ تبدیلی آئی کہ وہ مجلس کی کارروائیوں سے زیادہ دلچسپی نازی گروپ کے لائحہ عمل سے لینے لگے۔

(۱۶) لوگوں کو جب عالمی ادارے سے توقعات ختم ہو گئیں تو علاقائی اور محدود نظریاتی تنظیمیں بننے لگیں اور یورپ والوں کے اندر مشترکہ عالمی اتحاد کے بجائے یورپ کے اتحاد کا نظریہ پروان چڑھا۔ یہ تاثر دوسرے برّاعظموں میں بھی خاصا مقبول ہوا۔

(۱۷) مجلس میں شامل بڑی طاقتوں میں احساس ذمہ داری کا فقدان تھا۔ جو مجلس کی تباہی کا سبب بنا۔ اس کے اراکین نے اپنے قول کی اپنے فعل سے کھلم کھلا تردید کی اور یہ بڑی ریاستیں چھوٹے ممالک کو بھی میثاق کی پابندی کرنے کو نہ کہہ سکیں۔

(۱۸) مجلس کے اختیارات بحیثیت عالمی ادارے کے بہت ہی محدود تھے ایک تو یہ کہ مجلس صرف رکن ممالک کے خلاف ہی کارروائی کر سکتی تھی اور غیر رکن ممالک بین الاقوامی تعلقات اور طریقہ کار کے سلسلے میں آزاد تھے۔ دوسرے یہ کہ مجلس کسی بھی ملک کے جنگی قوانین میں ترمیم یا جنگ کرنے والے ممالک کو سزا نہیں دے سکتی تھی۔ اس لئے کہا جاتا ہے کہ مجلس کے دانت نہیں تھے۔

(۱۹) روس کی عدم شمولیت کی وجہ سے بھی لیگ کی ساکھ پر بُرا اثر پڑا کیونکہ روس ۱۹۱۷ء کے بالشویک انقلاب کے بعد ایک بڑی انتہا پسندانہ طاقت بن چکا تھا اور اپنے نظریات دنیا بھر میں پھیلا رہا تھا۔ روس کی شمولیت ۱۹۳۴ء میں ہوئی

اٹلی روس کی رکنیت کے خلاف تھا۔

(۲۰) کلیت پسندی کی تحریکیں دنازی ازم فاشی ازم بھی مجلس اقوام کے لئے تباہی کا سبب بنیں۔ کیونکہ لیگ ان کی کھوئی ہوئی عظمت ان کو واپس نہیں دلا سکی تھی بلکہ الٹا ان پر مزید بوجھ ڈال رہی تھی۔ ہٹلر اور مسولینی دونوں ہی جنگجویانہ پالیسی کے قائل تھے۔ مسولینی نے حبشہ پر قبضہ کی خاطر اور ہٹلر نے توسیع پسندانہ پالیسی اپنانے کی خاطر تخفیف اسلحہ کی عالمی کانفرنس کے موقعہ پر مجلس کو خیرباد کہہ دیا تھا۔ دوسری جنگ عظیم انہی کی پالیسیوں کا نتیجہ تھی۔

(۲۱) شاعر مشرق علامہ اقبال نے مجلس اقوام کے بارے میں یوں ارشاد فرمایا۔

من ازیں بیش ندانم کہ کفن دزدے چند
بہر تقسیم قبور انجمن ساختہ اند

ترجمہ:۔ میں اس سے کچھ زیادہ نہیں جانتا کہ چند کفن چوروں نے قبروں کی تقسیم کی خاطر انجمن بنائی ہے۔

مجلس کی زندگی کے آخری ایام:

مجلس کے اجلاس اس کے مکمل خاتمے تک باقاعدگی سے ہوتے رہے لیکن ان اجلاسوں میں شریک ممالک کی حیثیت برائے نام تھی اور کوئی سرکردہ ملک مجلس کے اجلاسوں میں شریک نہیں ہوتا تھا۔ ۱۹۳۹ء کے اوائل میں مجلس کا ۱۰۵واں اجلاس ختم ہوا تو یہ طے ہوا کہ اگلا اجلاس ۸ ستمبر ۱۹۳۹ء کو ہوگا مگر یکم ستمبر ۱۹۳۹ء کو جرمنی نے پولینڈ پر حملہ کر دیا اور ۳ ستمبر کو برطانیہ اور فرانس نے جرمنی کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا۔ اس طرح مجلس کا آخری باضابطہ طے شدہ اجلاس نہ ہوسکا جنگ عظیم دوم کے دوران مجلس کا وجود برقرار رکھنے کے لئے امریکی تعاون سے اس کے بعض شعبے امریکہ منتقل کر دیئے گئے۔ مجلس کا خزانہ لندن منتقل کیا گیا۔ بین الاقوامی تنظیم محنت کا دفتر مانٹریال منتقل کر دیا گیا۔ اس طرح مجلس کا شیرازہ بالکل بکھر گیا۔ فنڈز میں شدید کمی واقع ہوگئی مجلس کو اپنے سیکریٹریٹ کے ممبران کی تعداد سو سے بھی کم کرنا پڑی۔

۱۴، اگست ۱۹۴۵ء کو مجلس کے سیکریٹری جنرل جناب سر اوینول نے استعفیٰ دے

دیا جس سے غیر سرکاری طور پر مجلس کی "عاملہ" ختم ہو گئی۔ مجلس کے بکھرے ہوئے ادارے اپنی اپنی جگہ کام کرتے رہے اور جب اقوام متحدہ بنی تو اس کا ایک حصہ بن گئے۔
۸۔ اپریل ۱۹۴۶ء کو مجلس کا آخری اجلاس ہوا اس اجلاس کے آخری الفاظ یہ تھے۔

THE LEAGUE IS DEAD, LONG LIVE U.N.O.

مجلس اقوام مر گئی۔ اقوام متحدہ زندہ باد

انجمن اقوام متحدہ

جنگ عظیم اول کے بعد اینگلو سیکشن کی خواہش پر مجلس اقوام ______ بنائی گئی۔ تاکہ آئندہ عالمگیر جنگوں کو روکا جا سکے۔ لیکن صرف ۲۰ سال بعد ستمبر ۱۹۳۹ء کو دوسری عالمگیر جنگ شروع ہو گئی۔ تو جنگ کے دوران ہی ایسی عالمگیر تنظیم بنانے کی کوشش شروع ہو گئیں جس میں مجلس اقوام والی خامیاں نہ ہوں۔ یہ عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ انجمن اقوام متحدہ مجلس اقوام کی طرح مخصوص افراد کے ذہن کی عکاسی نہیں کرتی بلکہ یہ مختلف اعلانات اور کانفرنسوں کی مرہون منت ہے۔

(۱) اعلان لندن LONDON DECLARATION

۱۲ جون ۱۹۴۱ء کو برطانیہ، کینڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، جنوبی افریقہ اور کئی جلا وطن حکومتوں نے "اعلان لندن" پر جمیس پیلس میں دستخط کئے۔ اعلان لندن کا بنیادی مقصد باہم مل جل کر رہنا اور دوسری اقوام کو بھی امن کی ترغیب دینا تھا۔ تاکہ جنگ کے خطروں سے چھٹکارہ حاصل کیا جا سکے۔

(۲) میثاق اوقیانوس ATLANTIC CHARTER

۱۴ اگست ۱۹۴۱ء کو امریکی صدر روز ویلٹ اور برطانوی وزیر اعظم چرچل کے مابین بحر اوقیانوس میں ایک جہاز پر ملاقات ہوئی اور دونوں نے ایک معاہدے پر دستخط کئے جس کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

— • دونوں ممالک کسی علاقے پر قبضہ نہیں کریں گے اور نہ ہی کسی ملک کی سرحدیں اس کی مرضی کے بغیر مقرر کریں گے۔

— • تمام اقوام عالم کے حق آزادی کو تسلیم کیا گیا اور غلام قوموں کی آزادی کا عزم کیا گیا۔

— • عالمی اقتصادی حالت کو بہتر بنایا جائے گا اور اسلحہ میں تخفیف کر کے مستقبل میں جنگ کے امکان کو دور کیا جائے گا۔

(۳) اعلان اقوامِ متحدہ DECLARATION OF U.N.O

یکم جنوری ۱۹۴۲ء کو ۲۶ ریاستوں کے نمائندوں نے "اعلان اقوامِ متحدہ" پر واشنگٹن میں دستخط کئے اور میثاقِ اوقیانوس کو بنیاد بنا کر یہ طے پایا گیا کہ سب مل کر امن کے دشمنوں کے خلاف جد و جہد کریں گے۔ یعنی ہٹلر کے خلاف مکمل فتح تک اتحادیوں نے ایک دوسرے کے ساتھ مکمل حمایت کا عہد کیا۔

(۴) ماسکو کانفرنس MOSCOW CONFERENCE

اکتوبر ۱۹۴۳ء کو ماسکو کانفرنس میں چار بڑی طاقتوں امریکہ، برطانیہ، روس اور چین کے نمائندوں نے عالمی امن کے لئے ایک ادارے کی ضرورت محسوس کی اور اعلان اقوامِ متحدہ کا اعادہ کیا۔

(۵) تہران کانفرنس TEHRAN CONFERENCE

دسمبر ۱۹۴۳ء میں روز ویلیٹ، اسٹالن اور چرچل نے تہران میں اعلان کیا کہ انھیں یقین ہے کہ وہ امن بحال کرانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

(۶) ڈمبارٹن اوکس کانفرنس

دسمبر ۱۹۴۴ء کو امریکہ، برطانیہ، روس اور چین کے نمائندوں کے درمیان واشنگٹن کی ایک عمارت ڈمبارٹن اوکس میں کانفرنس ہوئی جس میں اقوامِ متحدہ کی دھندلی سی شکل سامنے آئی اس کے ڈھانچے اور ویٹو پاور سے متعلق بحث ہوئی۔

(۷) یالٹا کانفرنس YALTA CONFERENCE

۱۱ فروری ۱۹۴۵ء کو روس کریمیا میں یالٹا کے مقام پر استالن، روز ویلیٹ اور چرچل نے اعلان کیا کہ ۲۵ اپریل ۱۹۴۵ء کو امریکہ میں سان فرانسسکو کے مقام پر اقوامِ متحدہ کی ایک کانفرنس طلب کی جائے۔ جو اقوامِ متحدہ کا منشور مرتب کرے۔

(۸) سان فرانسسکو کانفرنس SANFRANCISCO CONFERENCE

۲۵ اپریل سے ۲۶ جون ۱۹۴۵ء تک کے بحث و مباحثے میں دنیا کی اقوام انجمن اقوامِ متحدہ کا منشور مرتب کرنے میں کامیاب ہو گئیں جس میں بین الاقوامی عدالتِ انصاف کا دستور بھی شامل ہے ۲۴ اکتوبر ۱۹۴۵ء کو اقوامِ متحدہ وجود میں آگئی اور ۱۰ جنوری ۱۹۴۶ء کو جنرل اسمبلی کا پہلا اجلاس منعقد ہوا۔

منشور کے ابتدائیہ میں اس بات کا اعلان کیا گیا کہ

ہم باشندگان اقوام متحدہ اس عزم کا اظہار کرتے ہیں کہ

—— • آنے والی نسلوں کو جنگ کے عذاب سے بچائیں جس نے ہماری زندگی میں دو دفعہ نوع انسانی کو ان گنت دکھ پہنچائے ہیں۔

—— • بنیادی حقوق انسانی قدر و قیمت، عورت و مرد، چھوٹی بڑی اقوام کے مساویانہ حقوق کے اصولوں پر از سر نو اقرار کرتے ہیں۔

—— • اس عزم کا بھی اظہار کرتے ہیں کہ ایسے حالات پیدا کئے جائیں گے جس کے تحت معاہدات اور دیگر بین الاقوامی قانون کے ذریعے سے عائد شدہ واجبات کا احترام اور انصاف برقرار رکھا جائے گا۔

—— • وسیع آزادی کی فضا میں معاشرتی ترقی کو فروغ دیں اور معیار زندگی کو بلند کریں گے

—— • ہم ایک اچھے ہمسایہ کی طرح آپس میں امن برقرار رکھیں گے اور اپنی طاقت کو بین الاقوامی امن و سلامتی کی بے قراری کے لئے متحد کریں گے اور تمام اقوام کی معاشی و سماجی ترقی کے لئے بین الاقوامی مشنری کو استعمال کریں گے۔

اقوامِ متحدہ کے اغراض و مقاصد

دفعہ نمبر ۱ اور ۲

۱ بین الاقوامی امن و سلامتی کے لئے تمام چھوٹی بڑی اقوام کے مساویانہ حقوق اور حق خود ارادیت کے اصول کی بنیاد پر احترام کرنا

۲ تمام اقوام میں معاشی، سماجی، ثقافتی یا انسان دوستی کی نوعیت کے عالمی مسائل طے کرنے کے لئے بین الاقوامی سطح پر تعاون کرنا۔

۳ پرانے اور نئے مسائل کو گفت و شنید کے ذریعے حل کرنا تاکہ عالمی امن و انصاف پر کسی قسم کی آنچ نہ آنے پائے۔

۴ انسان کے بنیادی حقوق کی حفاظت کرنا اور انسانوں میں مساوات، آزادی اور اخوت کے رشتوں کو عام کرنا۔

۵) جو ریاستیں اس کی ممبر نہیں ہیں انھیں بھی عالمی امن و سلامتی کے تحفظ کے لئے حتی الامکان ان اصولوں پر عمل پیرا ہونے کی ترغیب دینا جنھیں اقوام متحدہ اپناتی ہے۔ انجمن کو اس بات کا اختیار نہیں ہے کہ کسی ریاست کے داخلی معاملات میں دخل دے۔

تبصرہ

اقوام متحدہ کے اغراض و مقاصد سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ یہ ادارہ کچھ باتوں کے لحاظ سے بے حد دور اندیش ہے مجلس اقوام اس خوبی سے محروم تھی۔ مثال کے طور پر اقوام متحدہ کو اصولی طور پر بڑی فکر ہے۔ کہ غیر یورپی قومیں بھی ترقی کریں اور عالمی معاملات میں پوری طرح حصہ دار بن جائیں۔ اس کے برخلاف مجلس اقوام دنیا کو محض یورپی نظر سے دیکھتی تھی۔ اور اس کا مقصد یورپ کی بالا دستی کو کسی نہ کسی طرح برقرار رکھنا تھا۔ لیکن اقوام متحدہ عالمی مسائل کو جس نظر سے دیکھتی ہے اس میں یورپ سکڑ کر بہت چھوٹا رہ گیا ہے۔ ایشیاء اور افریقہ اپنی وسعت اور آبادی کی بنا پر بہت نمایاں ہو گئے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود انجمن اقوام متحدہ نے کچھ اقدام ایسے بھی کئے ہیں جس کی وجہ سے مجلس اقوام کے اغراض و مقاصد کی نفی ہوتی ہے جیسا کہ چھوٹی بڑی اقوام کے لئے مساوات کا اصول تسلیم کیا گیا ہے۔ اس مساوات کا مفہوم عام آدمی کی سمجھ میں اس لئے نہیں آتا کہ سلامتی کونسل میں ۵ بڑی طاقتوں کو خصوصی اور امتیازی حیثیت VETO POWER عطا کی گئی ہے۔

جہاں تک اس عہد کا تعلق ہے کہ بین الاقوامی قانون کا احترام کرتے ہوئے تمام چھوٹی بڑی اقوام کی سالمیت اور قومی سلامتی کا احترام کیا جائے گا۔ کیا کشمیر کے مسلمانوں کے ساتھ انصاف اور آزادی کا برتاؤ کیا جا رہا ہے؟ کیا بیت المقدس اور دیگر علاقوں پر اسرائیل کا غاصبانہ قبضہ انصاف اور آزادی کے تحت ہے۔ کیا قبرص کے ترک مسلمانوں پر یونان کا ظلم و ستم انصاف اور آزادی کے مترادف ہے کیا جنوبی افریقہ اور امریکہ میں نسلی امتیاز کی پالیسی انصاف اور آزادی پر مبنی ہے؟ آج اقوام متحدہ اہل دنیا کو اس کا جواب دینے سے قاصر ہے۔ لطف کی بات تو یہ ہے کہ دنیا کی سب سے بڑی دو طاقتیں انجمن اقوام متحدہ کے اغراض و مقاصد کی دھجیاں اڑا رہی ہیں۔ امریکہ نے ویت نام میں کیا کیا؟ روس آج کل افغانستان میں کیا کر رہا ہے؟ ہمسایوں کے ساتھ کہاں امن و انصاف کا برتاؤ کیا جا رہا ہے؟ دنیا کی تمام مہذب اقوام ان کے کردار کو بھانپ گئیں ہیں۔ سوچا تو یہ گیا تھا کہ بڑی طاقتیں اس ادارے میں سر جوڑ کر بیٹھیں گی اور چھوٹے ملکوں کے مسئلے

حل کئے جائیں گے۔ لیکن ان بڑی طاقتوں نے اسے زور آزمائی کا اکھاڑا بنالیا ہے یہی وجہ ہے کہ اقوام متحدہ موثر طور پر کام نہیں کر سکی۔

رکنیت MEMEERSHIP

دفعہ نمبر ۳ تا ۶

ہر امن پسند ملک جو اقوام متحدہ کے منشور سے متفق ہو اس کا ممبر بن سکتا ہے بشرطیکہ سلامتی کونسل کی سفارش پر جنرل اسمبلی ۲/۳ کی اکثریت سے منظوری دے دے۔ وہ ۵۱ ممبران اس ادارے کے بنیادی اراکین تسلیم کئے جاتے ہیں۔ جنھوں نے سان فرانسسکو کانفرنس میں حصہ لیا . . . . اب اقوام متحدہ کے ممبران کی تعداد ۱۷۸ ہے۔ سلامتی کونسل کی سفارش پر کسی بھی ممبر کو جنرل اسمبلی کی رکنیت سے خارج کیا جا سکتا ہے۔ نیز سلامتی کونسل معطل شدہ ممبران کے حقوق بحال بھی کر سکتی ہے۔

اقوام متحدہ کی تشکیل

دفعہ نمبر ۷ سے دفعہ نمبر ۱۰ تک اقوام متحدہ کی تشکیل اس کے اعضاء اور اس کے اختیارات کا ذکر ہے۔

اقوام متحدہ کے اعضاء ORGANS OF UNITED NATIONS
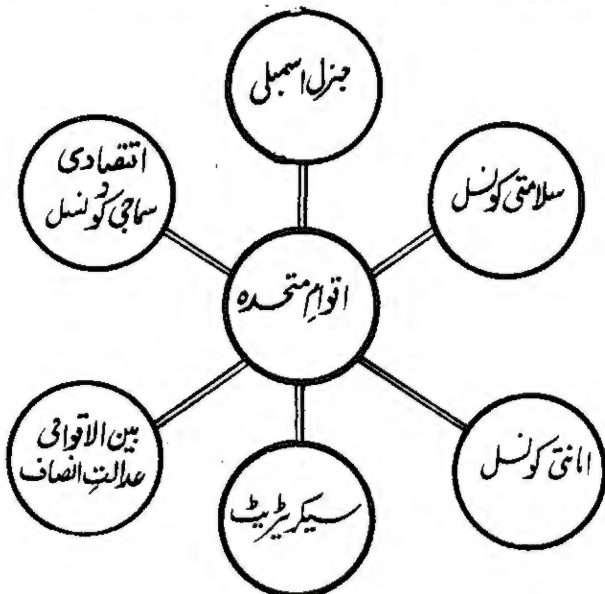
۱- جنرل اسمبلی

جنرل اسمبلی کا ڈھانچہ

جنرل اسمبلی

دستور العمل کمیٹیاں
- جنرل کمیٹی
- اسناد کمیٹی

خاص کمیٹیاں
- سیاسی وسلامتی کی کمیٹی
- معاشی ومالیاتی کمیٹی
- سماجی انسانی وثقافتی کمیٹی
- امانتی نظام کے خاتمے کی کمیٹی
- انتظامی امور اور بجٹ کی کمیٹی
- قانونی کمیٹی
- ایڈہاک سیاسی کمیٹی

تمام ممبران کے ساتھ

مجالس قائمہ
- انتظامی امور اور بجٹ کی کمیٹی
- چندہ وصول کرنے کی کمیٹی
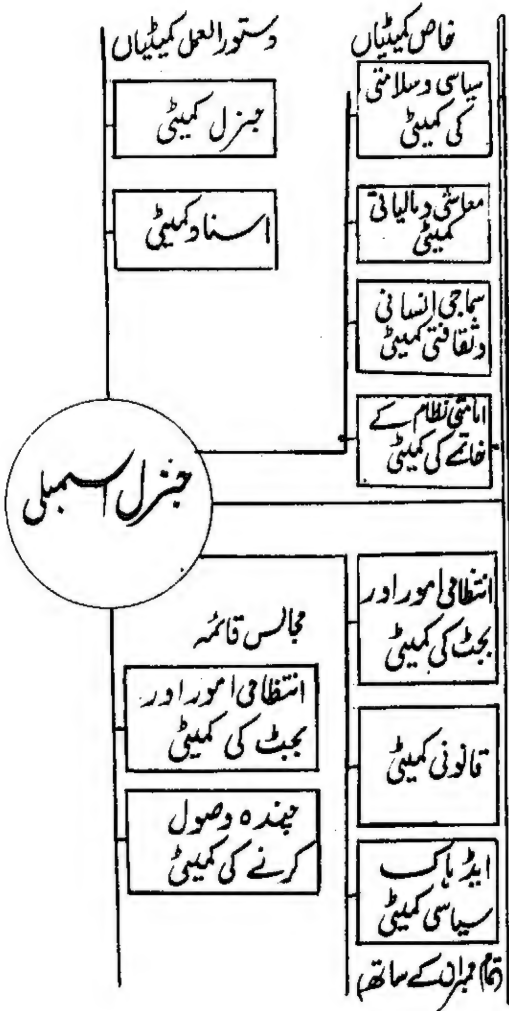
جنرل اسمبلی کی مقرر کردہ کچھ کمیٹیاں اور کمیشن
- ہنگامی کمیٹی
- تخفیف اسلحہ کا کمیشن
- امن وسلامتی کا کمیشن
- اجتماعی تحفظ کی کمیٹی
- نئے ارکان کے داخلے کی کمیٹی
- فلسطین کا مصالحتی کمیشن
- جنگی قیدیوں کے سلسلے میں ایڈہاک کمیٹی
- اقوام متحدہ کی انتظامی کمیٹی
- اسٹاف پنشن کمیٹی
- بین الاقوامی قانون کمیشن
- بین الاقوامی جرائم کی تحقیقات کی کمیٹی
- حملہ آور کے تعین کی کمیٹی
- جنرل اسمبلی کے اجلاس کے تعین کی کمیٹی
- اور دیگر علاقائی تنازعات کی کمیٹیاں قابل ذکر ہیں

جنرل اسمبلی کی تشکیل

تمام ممالک جو اقوامِ متحدہ کے ممبر ہیں وہ جنرل اسمبلی کے بھی ممبر ہوتے ہیں۔

ہر ملک اپنی مرضی سے زیادہ سے زیادہ ۵ مندوب نمائندگی کے لئے بھیج سکتا ہے۔

اجلاس

عام اجلاس ہر سال ستمبر کے تیسرے منگل کو اسمبلی کے صدر مقام نیو یارک میں ہوتا ہے سلامتی کونسل اور ممبروں کی اکثریت کی خواہش پر خصوصی اجلاس بھی بلایا جا سکتا ہے۔ اسمبلی کے اجلاس میں فیصلے ۲/۳ کی اکثریت رائے سے ہوتے ہیں۔

فرائض و اختیارات

(۱) عالمی امن اور سلامتی کو برقرار رکھنے کے لئے تعاون کے اصولوں پر تبادلہ خیال کرنا۔ سفارشات پیش کرنا۔ ان میں تخفیف اسلحہ سے متعلق اصولوں اور ترمیموں کے ضابطے شامل ہیں۔

(۲) عالمی امن اور سلامتی پر اثر انداز ہونے والے کسی بھی مسئلے پر غور کرنا اور اس کے بارے میں سفارشیں پیش کرنا ہے البتہ ان میں وہ حالات اور مسائل شامل نہیں ہوں گے جو اس وقت سلامتی کونسل میں زیر غور ہوں۔

(۳) منشور کے دائرہ کار میں رہتے ہوئے ایسے معاملے کے بارے میں سفارشیں کر سکتی ہے جس سے اقوام متحدہ کے کسی دوسرے ادارے کے اختیارات و فرائض پر اثر پڑتا ہو۔

(۴) عالمی سیاسی تعاون، قانون بین الاقوامی کی تدوین، انسانی حقوق، بنیادی آزادیوں کے حصول، معاشی، سماجی، ثقافتی، تعلیمی اور مختلف شعبوں میں عالمی تعاون بڑھانے کی تدابیر کرنا اور سفارشیں کرنا۔

(۵) ہر ایسے معاملے کے پرامن تصفیے کے لئے سفارشیں کرنا جس سے ریاستوں کے درمیان دوستانہ تعلقات خراب ہونے کا اندیشہ ہو یہ معاملہ کسی بھی قسم کا ہو سکتا ہے۔

(۶) اقوام متحدہ کے تمام اداروں کی رپورٹیں حاصل کر کے ان پر تبادلہ خیال کرنا۔

(۷) خصوصی اہمیت کے حامل علاقوں کے سوا تمام علاقوں کے لئے امانتی معاہدوں پر عمل درآمد کرانے کے لئے امانتی کونسل کے ذریعے نگرانی کرنا۔

(۸) اقوام متحدہ کے بجٹ پر تبادلہ خیال کرنے کے بعد اس کی منظوری دینا۔ ممبران کے درمیان حصہ رسدی کا تعین کرنا اور خصوصی اداروں کے بجٹوں کی جانچ پڑتال کرنا۔

(۹) سلامتی کونسل کے غیر مستقل ممبروں، اقتصادی و سماجی کونسل اور امانتی کونسل کے ان ممبران کا انتخاب کرنا جو منتخب کئے جاتے ہیں۔ بین الاقوامی عدالت انصاف کے ججوں کے انتخاب میں سلامتی کونسل کا ساتھ دینا اور سلامتی کونسل کی سفارش پر سیکریٹری جنرل کا تقرر کرنا۔

(۱۰) جنرل اسمبلی نے نومبر ۱۹۵۰ئہ میں "اتحاد برائے امن" کے عنوان سے ایک قرارداد پیش کی جس میں کہا گیا کہ اگر سلامتی کونسل اپنے مستقل ممبران میں عدم تعاون کے باعث قیام امن کی بنیادی ذمہ داری پوری کرنے میں ناکام رہے اور ایسی صورت میں جب کہ امن خطرے میں ہو۔ یا جارحیت کا اندیشہ ہو تو جنرل اسمبلی اقدام کر سکتی ہے۔ اسمبلی کو اس بات کا اختیار رہے کہ وہ اجتماعی اقدامات کے لئے ممبران کو اپنی سفارشات پیش کرنے کی غرض سے اس معاملے میں فوراً تبادلہ خیال کا اہتمام کرے۔ ان اقدامات میں مسلح طاقت کا استعمال بھی شامل ہے۔ جس کی سفارش اس صورت میں کی جائے گی جب جارحیت کا اندیشہ ہو

اگر اس وقت اسمبلی کا اجلاس نہ ہو رہا ہو تو ہنگامی اجلاس چوبیس۲۴ گھنٹوں کے اندر طلب کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کے لئے اقوام متحدہ کی اکثریت یا سلامتی کونسل کے ۹ ارکین اجلاس بلانے کی درخواست کر سکتے ہیں۔

جنرل اسمبلی کی ناقص کارکردگی کی وجہ

جنرل اسمبلی کی ناقص کارکردگی کی سب سے بڑی وجہ اس کا مالی بحران ہے۔ بظاہر تو یہ بحران مالی اور قانونی معلوم ہوتا ہے۔ لیکن درحقیقت اس کے پس پشت بڑی طاقتوں کے ذاتی مقاصد اور جذبہ مزاحمت کارفرما ہے۔ قصہ کچھ یوں ہے کہ سلامتی کونسل کے جن ممبران کو ویٹو کا حق حاصل ہے وہ جنرل اسمبلی یا سلامتی کونسل کے فیصلے کو کالعدم قرار دے سکتے ہیں۔ روس نے اپنا یہ حق بار بار استعمال کر کے سلامتی کونسل کے مناسب اقدام کی راہ میں روڑے اٹکائے تو مغربی طاقتوں نے بڑے غور و خوص کے بعد اس کا توڑ تلاش کیا۔ تاکہ روس کا ویٹو بھی بیکار ہو جائے۔ اور خاص خاص موقعوں پر جنرل اسمبلی کو یہ اختیار دیا کہ وہ ویٹو کی رکاوٹ کے بغیر فیصلے کر سکے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جنرل اسمبلی کے اختیارات کی وجہ سے روس کا ویٹو بھی بے معنی ہو کر رہ گیا۔ اس طرح روس جنرل اسمبلی میں نہ تو ویٹو کے ذریعے کسی کارروائی کو روک

سکتا تھا۔ اور نہ ہی اسے اتنے ممبروں کی حمایت حاصل ہوتی کہ وہ اسمبلی کی قرارداد کو مسترد کر دے۔ چنانچہ روس نے امریکہ کے اس توڑ کو بے اثر کرنے کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا کہ کانگو، فسلطین، کوریا میں اقوام متحدہ نے بحالیِ امن کے سلسلے میں جو کچھ خرچ کیا تھا اس میں اپنے حصے کا چندہ دینے سے انکار کر دیا۔ اس کا اثر مشرقی یورپ کے ممالک پر بھی پڑا۔ ان کا موقف یہ تھا کہ اقوامِ متحدہ نے جو فیصلے روس اور اس کے ہم نواؤں کی منظوری کے بغیر کئے ہیں وہ ان کے ذمہ دار نہیں ہیں۔ اقوامِ متحدہ کے قانون کے مطابق ان مہمات پر جو اخراجات ہوتے ہیں ان کی کفالت تمام ممبر ممالک کو کرنا ہوتی ہے۔

منشور کی دفعہ نمبر ۱۹ کے مطابق ——— جو ملک ۲ دو سال تک اپنے حصے کی رقومات ادا نہ کرے وہ جنرل اسمبلی میں رائے دینے کا حق نہیں رکھتا لیکن روس اور اس کے حلیفوں کا موقف یہ تھا کہ اس دفعہ کا اطلاق بحالی امن کی کارروائیوں پر نہیں ہوتا۔ حالانکہ بین الاقوامی عدالت انصاف روس کے اس موقف کو رد کر چکی ہے۔ ایسے میں امریکہ نے بھی خصوصی امداد اور توسیعی پروگراموں میں چندہ روک لیا۔ بہرحال کسی بھی ملک نے چندہ نہ دینے کا مکمل بائیکاٹ نہیں کیا۔ جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ رقم کا مسئلہ کسی اور اہم اصول کو تسلیم کروانے کے لئے شروع کیا گیا ہے اور وہ اصول یہ ہے کہ اقوام متحدہ اپنے کسی بھی ممبر کو ایسا کام کرنے پر مجبور نہیں کر سکتی۔ جس کے لئے وہ خود آمادہ نہ ہو۔

مخصوص کمیٹیاں

جنرل اسمبلی اپنے فرائض سات مخصوص کمیٹیوں کے ذریعے سرانجام دیتی ہے۔ ان کمیٹیوں میں تمام ممبران کو شمولیت کا حق حاصل ہے یہ کمیٹیاں حسب ذیل ہیں۔

(۱) سیاسیات وسلامتی اور اسلحہ جات کے ضابطے کی کمیٹی۔
(۲) اقتصادی اور مالیاتی کمیٹی۔
(۳) سماجی، انسانی اور ثقافتی کمیٹی۔
(۴) نو آبادیاتی نظام کے خاتمے کی کمیٹی۔
(۵) انتظامی امور اور بجٹ کی کمیٹی
(۶) قانونی کمیٹی
(۷) ایڈہاک سیاسی کمیٹی (مکمل ممبر شپ کے ساتھ) یہ کمیٹی پہلی کمیٹی کی مدد کرتی ہے۔

دستور العمل کمیٹیاں

(۱) جنرل کمیٹی

اجلاس کے دوران اسمبلی کے کاموں کی دیکھ بھال کا کام کرتی ہے۔ اسمبلی کے صدر، سترہ نائب صدر اور ساتوں مخصوص کمیٹیوں کے چیرمینوں پر مشتمل ہوتی ہے۔

(۲) اسناد کمیٹی

یہ کمیٹی ہر سیشن میں قائم کی جاتی ہے۔ اس کا کام نمائندوں کی اسناد کی تصدیق کرنا ہے۔

(۳) اسٹینڈنگ کمیٹیاں

دو اسٹینڈنگ کمیٹیاں ہوتی ہیں ایک انتظامی اور بجٹ کے امور سے متعلق مشورہ دیتی ہے اور دوسری ممبر ممالک سے چندہ وصول کرتی ہے۔

ان تمام کمیٹیوں کا انتخاب جنرل اسمبلی تین سال کے لئے کرتی ہے یہ انتخاب ذاتی صلاحیتوں اور جغرافیائی تقسیم کی بنیاد پر کیا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں بوقت ضرورت ایڈہاک کمیٹیاں بھی قائم کی جا سکتی ہیں۔ جنرل اسمبلی کے کاروبار بھی ایسے نہیں ہیں جو خامیوں سے پاک ہوں ان کے متعلق ایک عام خیال یہ ہے کہ اسمبلی اور اس کی دوسری کمیٹیاں صرف پروپیگنڈائی اعضاء ہیں اسے ایک ایسا ادارہ بنانے کی ضرورت ہے جس میں کسی خاص اکثریت کی رائے جو عقل پر مبنی ہو قبول کی جا سکے نہ یہ کہ ذاتی مفاد اور وقار کی خاطر دوسروں پر حملہ کیا جائے۔ اس کی دوسری خامی یہ ہے کہ اسمبلی کے اجلاسوں میں جو طریقہ کار اختیار کیا جاتا ہے اس میں بہت زیادہ طوالت ہوتی ہے۔ جس کی وجہ سے نمائندوں کے لئے کارروائی کے خاتمے تک اجلاس میں شرکت مشکل ہو جاتی ہے جنرل اسمبلی کی مصروفیت و اختیارات پر بحث کرتے ہوئے یہ نہ بھولنا چاہئیے کہ یہ کوئی عالمی حکومت نہیں ہے جو سیاسی جماعت بندی کے ذریعے چلتی ہو جیسے انتظامیہ اور مقننہ کے اختیارات حاصل ہوں بلکہ یہ ایک عالمی تنظیم ہے جو دنیا کے مختلف اقوام کے اتحاد کے نتیجے کے طور پر مبنی ہے۔ اس کی قوت کا راز کھلے مباحثے اور عوامی رائے کو ڈھالنے میں مضمر ہے۔ ایک ایسی جماعت جس کے اراکین ایک ہی مملکت کے افراد نہیں۔ کئی مملکتوں کے افراد ہیں جو مختلف نسلوں، تہذیبوں اور زبانوں کے حامل ہیں۔ ان سے یہ توقع رکھنا کہ وہ تمام مسائل کو کامیابی سے طے کر لیں گے مشکل ہے۔ لیکن ان مشکلات کے باوجود جنرل اسمبلی نے اپنے لئے

ایک ماحول سازگار کرلیا ہے اور وہ ایک مشترکہ اور متحدہ جذبہ کو پیدا کرنے کی برابر کوششیں کررہی ہے

۲۔ سلامتی کونسل

سلامتی کونسل کی رکنیت جنرل اسمبلی کی طرح اقوام متحدہ کے تمام ارکین کو نہیں دی جاتی بلکہ سلامتی کونسل کے صرف ۱۵ ارکین ہوتے ہیں ۱۹۶۵ء کو منشور میں ترمیم کے ذریعے غیر مستقل ارکین کی تعداد ۶ سے ۱۰ کی گئی تھی۔ سلامتی کونسل جنرل اسمبلی کے مقابلے میں ایک مختصر جماعت ہے اگر ہم جنرل اسمبلی کو مقننہ سے تشبیہہ دیں تو سلامتی کونسل کی حیثیت عاملہ کی سی ہو جاتی ہے یہ جنرل اسمبلی کی پالیسوں کو عملی جامہ پہناتی ہے

سلامتی کونسل کا ڈھانچہ
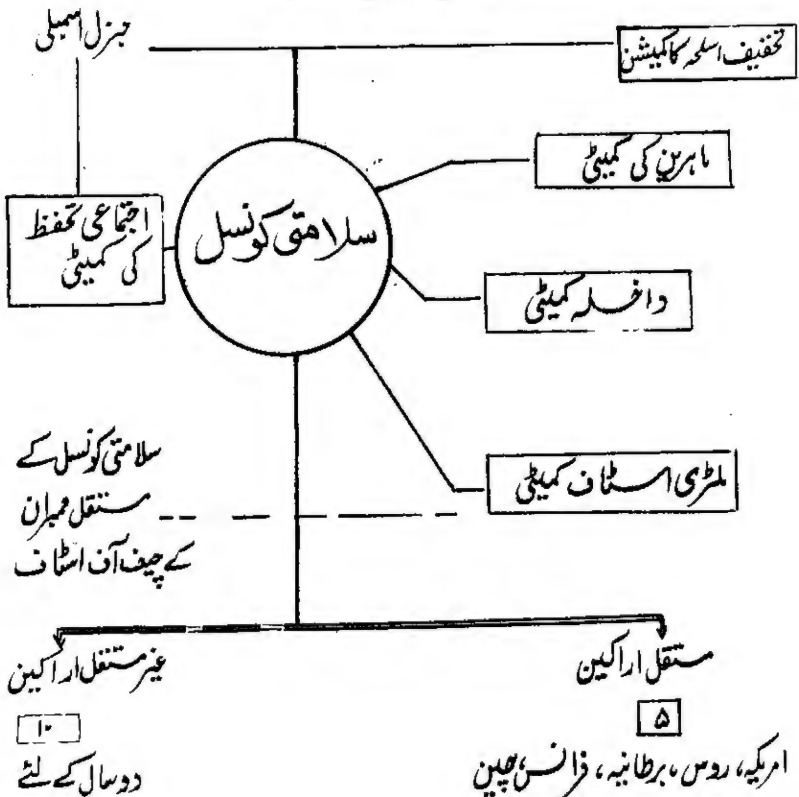
اختیارات و فرائض

(۱) اقوام متحدہ کے اصولوں کے مطابق عالمی امن و سلامتی برقرار رکھنا

(۲) ہر ایسے تنازعہ یا صورتحال کی تحقیقات کرنا جس سے عالمی کشیدگی پیدا ہونے کا خطرہ ہو

(۳) تنازعات کو طے کرنے کے طریقوں اور شرائط کی سفارشیں کرنا۔

(۴) اسلحہ بندی میں باقاعدگی پیدا کرنے کی غرض سے ایک نظام قائم کرنے کے لئے منصوبہ تیار کرنا۔

(۵) نقص امن کے اندیشے اور جارحیت کی نشاندہی کرنا اور اس کے لئے مناسب اقدامات کرنا۔

(۶) حملہ آور کو روکنے کے لئے اقتصادی پابندیاں عائد کرنا۔ اور طاقت کے استعمال کو رد کرنے کا مشورہ دینا۔

(۷) جارحیت کا ارتکاب کرنے والوں کے خلاف فوجی کارروائی کرنا۔

(۸) نئے ممبران کے داخلے کی سفارش کرنا اور ان شرائط کا تعین کرنا جس کے تحت یہ بین الاقوامی عدالت انصاف کے فریق بن سکتے ہیں۔

(۹) خصوصی اہمیت کے حامل علاقوں میں اقوام متحدہ کی طرف سے امانتی فرائض کو عملی جامہ پہنانا۔

(۱۰) جنرل اسمبلی کو سیکریٹری جنرل کی تقرری کے سلسلے میں مشورہ دینا اور جنرل اسمبلی کے اشتراک سے بین الاقوامی عدالت انصاف کے ججوں کو منتخب کرنا۔

(۱۱) جنرل اسمبلی کے سامنے سالانہ اور خصوصی رپورٹیں پیش کرنا۔

(۱۲) سلامتی کونسل اقوام متحدہ کے تمام ممبروں کی جانب سے کام کرتی ہے۔ تمام ممبران اس پر رضامند ہیں کہ وہ کونسل کے مسائل پر عمل کریں گے بوقت ضرورت کونسل کی درخواست پر مسلح افواج امداد اور دیگر ایسی سہولتیں مہیا کریں گے جو بین الاقوامی امن و سلامتی کے لئے ضروری ہوں۔

(۱۳) سلامتی کونسل کی تشکیل اس طرح کی گئی ہے کہ مسلسل اپنے فرائض منصبی سرانجام دیتی رہے اس کے ممبر ممالک کا ایک نمائندہ ہر وقت اقوام متحدہ کے ہیڈ کوارٹر میں موجود رہتا ہے۔ کونسل اگر مناسب سمجھے تو ہیڈ کوارٹر کے علاوہ کہیں اور بھی اجلاس بلا سکتی ہے۔

(۱۴) ایسے ممالک جو سلامتی کونسل کے ممبر نہ ہوں اور اگر کونسل کسی معاملے کے سلسلے میں ان کی

بحث یا مشورے کو ضروری خیال کرے تو چند شرائط کا تعین کر کے اِن کو بحث میں حصہ لینے کی اجازت دیتی ہے۔

ووٹنگ

طریقہ کار کے معاملات سے متعلق فیصلہ ۱۵ اراکین میں سے کم از کم ۹ اراکین کے مثبت ووٹوں سے ہوتی ہے۔ جس میں پانچوں ویٹو پاور کے مثبت ووٹ بھی شامل ہیں۔

تبصرہ

سلامتی کونسل کو ویٹو پاورز نے مفلوج کر دیا ہے کیونکہ اگر پانچوں اراکین میں سے کوئی ایک رکن کسی فیصلے کی حمایت نہیں کرتا تو یہ ممبر اپنا ویٹو کا حق استعمال کرتے ہوئے رخنہ ڈال سکتا ہے۔ اگر کوئی ممبر رائے شماری میں شرکت ہی نہ کرے تو یہ ویٹو تصور نہیں کیا جاتا۔

جیساکہ امریکہ نے شمالی کوریا کی جنگ میں یہ قرارداد منظور کروالی تھی کہ امن فوج کو جنوبی کوریا کی حمایت میں بھیجا جائے۔ اس وقت روس نے اشتراکی چین کے معاملے پر سلامتی کونسل کا بائیکاٹ کیا ہوا تھا۔ اِس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ سلامتی کونسل یا اقوامِ متحدہ کی ناکامی کا سب سے بڑا سبب ان ۵ اراکین کا "حقِ ویٹو" ہے اس طرح اقوامِ متحدہ نے پانچ بڑی طاقتوں کو ویٹو کا اختیار دے کر نہ صرف چھوٹے ممالک کے ساتھ ناانصافی کی ہے بلکہ دیکھا جائے تو اقوامِ متحدہ کے منشور کی خلاف ورزی بھی ہے۔ ویٹو کے اختیار کو سب سے پہلے اور سب سے زیادہ روس نے استعمال کیا۔ کبھی کبھی تو روس نے ایسے مواقع پر بھی اس کو استعمال کیا ہے جب کہ اس کے مفادات سے زیرِ بحث مسئلے کا کوئی تعلق نہ تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اکثر تائیدی فیصلے بھی ناقابلِ عمل قرار دیئے گئے۔ ورنہ آج کشمیر، فلسطین، لبنان، قبرص، ویت نام، کوریا اور تخفیف اسلحہ جیسے مسائل جوں کے توں نہ رہتے۔ اس سے سلامتی کونسل کے وقار کو سخت دھچکا لگا ہے۔ اور جنرل اسمبلی کے اختیارات بھی متاثر ہوئے ہیں۔

مستقل اراکین کے ویٹو کے اختیار پر تنقید کرتے ہوئے آسٹریلیاء نے تجویز پیش کی تھی کہ کم از کم مستقل اراکین ویٹو کا استعمال ایک فرض کی طرح کریں نہ کہ حق کی طرح اور خاص طور پر ایسے مسائل جہاں تعمیل ENFORCEMENT کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ آسٹریلیاء کی اس تجویز کو بعض سیاسی مصلحتوں کی بنا پر رد کر دیا گیا۔ اگر سلامتی کونسل کا کوئی رکن جھگڑے میں فریق ہو تو وہ پھر سلامتی کونسل کی رائے شماری میں حصہ نہیں لے سکتا۔

سلامتی کونسل کے کاموں میں مدد دینے کے لئے مختلف کمیٹیاں بنائی گئی ہیں۔ جس میں سب سے اہم "فوجی اسٹاف کمیٹی" ہے۔

فوجی اسٹاف کمیٹی

یہ کمیٹی سلامتی کونسل کے مستقل اراکین کے چیف آف دی اسٹاف پر مشتمل ہے یہ کونسل کو ان موقعوں پر مشورہ دیتی ہے۔ جب امن کے قیام کے لئے فوجی طاقت استعمال کرنے کی ضرورت پیش آئے۔ اقوام متحدہ کی کوئی باقاعدہ امن فوج نہیں ہے۔ اگر کسی موقع پر امن فوج کی ضرورت محسوس کی جانے تو ایسی صورت میں فوجی اسٹاف کی کمیٹی کے مشورے سے اقوام متحدہ کے مختلف ممالک کی فوجیں اقوام متحدہ کی کمان کے تحت فوجی کاروائی کرسکتی ہیں۔ جیسے کوریا، کانگو، قبرص اور لبنان وغیرہ میں اقوام متحدہ نے اپنی امن فوج بھیجی

۳۔ اقتصادی وسماجی کونسل

دنیا کی معاشی وسماجی حالت کو بہتر بنانے اور ان ممالک کی امداد کرنے کے لئے جو معاشی اور سماجی طور پر پسماندہ ہوں اقوام متحدہ نے اقتصادی وسماجی کونسل کی تشکیل کی ہے۔ یہ کونسل اقوام متحدہ کے تمام معاشی وسماجی مسائل پر غور کرتی ہے۔ اور اپنی تجاویز پیش کرتی ہے۔ اس کونسل نے انتظامی مدارج سے نکل کر مختلف کمیشنوں، سب کمیشنوں اور خصوصی ایجنسیوں سے گفتگو کرکے نیز اقوام متحدہ کی کارگزاریوں کا مطالعہ کرکے اپنی ایک علیحدہ حیثیت منوالی ہے دوسرے مسائل مثلاً حفظانِ صحت، پناہ گزینوں اور مہاجرین کا مسئلہ، بچوں کی امداد، انسانی حقوق اور آزادی کے احترام وغیرہ کو اپنے دائرہ اختیار میں شامل کرلیا ہے اگرچہ کونسل ابھی تک دنیا کے معاشی بحران کے ساتھ کامیابی کے ساتھ نہیں نمٹ سکی تاہم تنظیمی امور تک اس نے کافی کامیابی حاصل کی ہے۔ یہ کونسل ۵۴ ارکان پر مشتمل ہے ۱۸ ارکمبر ہر سال جنرل اسمبلی کی جانب سے ۳ سال کے لئے منتخب ہوتے ہیں۔

اقتصادی وسماجی کونسل کی کمیٹیاں

اقتصادی وسماجی کونسل دو طرح کی کمیٹیوں سے کام چلاتی ہے ان میں کچھ کمیٹیاں تو ایڈہاک بنیادوں پر بنائی جاتی ہیں اور کچھ صرف اجلاس کو کامیاب بنانے کے لئے عمل میں آتی ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ مستقل کمیٹیاں بھی ہوتی ہیں۔

اقتصادی وسماجی کونسل کا ڈھانچہ
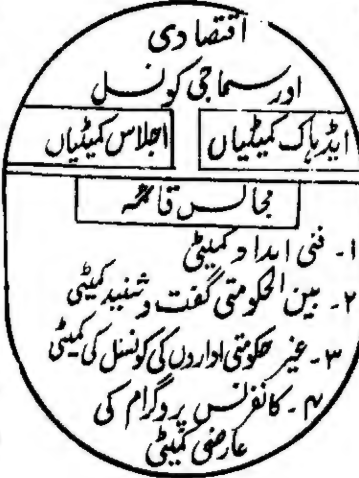
کمیشن

۱ شماریات
۲ آبادی
۳ نقل و حمل مواصلات
۴ انسانی حقوق
۵ حیثیتِ خواتین
۶ منشیات
۷ سرکاری مالیات

علاقائی معاشی کمیشن:
۸ یورپ
۹ افریقہ
۱۰ ایشیا و بحرالکاہل
۱۱ مغربی ایشیا
۱۲ لاطینی امریکہ

اقتصادی اور سماجی کونسل

ایڈہاک کمیٹیاں — اجلاس کمیٹیاں

مجالس قائمہ

۱- فنی امداد کمیٹی
۲- بین الحکومتی گفت و شنید کمیٹی
۳- غیر حکومتی اداروں کی کونسل کی کمیٹی
۴- کانفرنس پروگرام کی عارضی کمیٹی

دوسری کمیٹیاں

بچوں کا ہنگامی فنڈ
مہاجرین کی امداد
مستقل مرکزی افیم بورڈ
نشہ آور ادویات سے تحفظ
کارآمد اشیاء کی عارضی رابطہ کمیٹی

خصوصی ایجنسیاں

۱ I.L.O.
۲ I.A.E.O.
۳ F.A.O.
۴ U.N.E.S.C.O
۵ I.C.A.O.
۶
۷ W.B
۸ I.D.A
۹ I.F.C
۱۰ I.M.F
۱۱ U.P.U.
۱۲ I.T.U.
۱۳ W.M.O.
۱۴ I.M.C.O.
۱۵ G.A.T.T
۱۶ I.R.O
۱۷ IU.O.T.O
۱۸
۱۹

انتظامی رابطہ کمیٹی
فنی امدادی بورڈ

۱۔ فنی امداد کمیٹی

۲۔ بین الحکومتی گفت و شنید کی کمیٹی۔

۳۔ غیر حکومتی اداروں کی کونسل کمیٹی۔

۴۔ کانفرنس پروگراموں کی عارضی کمیٹی

فرائض و اختیارات

۱۔ اقوامِ متحدہ کی معاشی و سماجی سرگرمیوں کے سلسلہ میں اپنی ذمہ داریاں پوری کرنا۔

۲۔ بین الاقوامی اقتصادی، سماجی، ثقافتی، تعلیمی صحت کے مسائل اور متعلقہ امور کا مطالعہ کرنا، رپورٹیں تیار کرنا اور سفارش کرنا۔

۳۔ عالمگیر انسانی حقوق اور بنیادی آزادیوں کا اہتمام کرنا اور اس جذبے کو فروغ دینا

۴۔ عالمی کانفرنسیں منعقد کرنا۔ اور کونسل سے متعلقہ امور کی رپورٹیں مرتب کر کے جنرل اسمبلی کو بھیجنا۔

۵۔ مخصوص اداروں کے ساتھ معاہدے کرنا اور اقوامِ متحدہ کے ساتھ ان کے تعلقات کا تعین کرنا۔

۶۔ معاشی ترقی کے لئے اقوام متحدہ اور مخصوص اداروں کی سرگرمیوں میں رابطہ پیدا کرنا۔

۷۔ جنرل اسمبلی کی طرف سے منظور کردہ خدمات اقوامِ متحدہ کے ممبران کے لئے مہیا کرنا اور مخصوص اداروں کی درخواست پر انھیں خدمات بہم پہنچانا

۸۔ کونسل سے متعلق امور کے بارے غیر سرکاری تنظیموں اور اداروں سے صلاح و مشورے کرنا۔

کمیشن COMMISSIONS

(۱) شماریات

(۲) آبادی

(۳) نقل و حمل و مواصلات

(۴) انسانی حقوق - ذیلی کمیشن امتیازی سلوک کا انسداد اور اقلیتوں کا تحفظ

(۵) حیثیتِ خواتین

(۶) منشیات

⑦ سرکاری مالیات

علاقائی معاشی کمیشن REGIONAL ECONOMIC COMMISSIONS

⑧ یورپ جینوا

⑨ افریقہ عدلیس ابابا

⑩ ایشیا و بحرالکاہل بنکاک

⑪ مغربی ایشیا بیروت

⑫ لاطینی امریکہ سینتیاگو

دوسری کمیٹیاں OTHER BODIES

① بچوں کے ہنگامی فنڈ کی کمیٹی

② مہاجرین و پناہ گیروں کے دفتر

③ مستقل مرکزی افیم بورڈ

④ نشہ آور ادویات کے خلاف تحفظاتی عملہ

⑤ عارضی رابطہ کمیٹی برائے کارآمد اشیاء

خصوصی ایجنسیاں

۱- بین الاقوامی مزدور تنظیم I.L.O.

یہ ادارہ ۱۲ راپریل ۱۹۱۹ء کو قائم ہوا تھا پہلے اسے لیگ آف نیشن کے ماتحت کیا گیا ۱۹۴۶ء میں یہ اقوام متحدہ کا مخصوص ادارہ بن گیا۔ اس کا مقصد بین الاقوامی کاروائی کے ذریعے مزدوروں کی حالت اور معیار زندگی کو سدھارنا اور اقتصادی اور معاشرتی استواری کو فروغ دینا ہے نیز مزدوروں کے معاملے میں ایسے معاہدے کئے جائیں جن کا تعلق اجرت، کام کے اوقات، مزدوری کے لئے کم سے کم عمر کا تعین، مختلف قسم کے کام کرنے والوں کے حالات، مزدوروں کے معاوضے اور انجمنیں بنانے کی آزادی وغیرہ۔

۲- جوہری طاقت کا بین الاقوامی ادارہ I.A.E.O.

یہ ادارہ اکتوبر ۱۹۵۷ء کو قائم ہوا۔ اس کا مقصد ساری دنیا میں امن، صحت اور خوشحالی کے لئے جوہری طاقت کے استعمال کو وسعت دینا اور اس کی رفتار تیز کرنا اور

اس بات کا خیال رکھنا کہ اس ادارے کی یا اس کی سفارش پر دی ہوئی امداد کا استعمال فوجی مقاصد کے لئے تو نہیں ہو رہا ہے۔

۳- ادارۂ خوراک و زراعت F.A.O.

یہ ادارہ ۱۶ راکتوبر ۱۹۴۵ء کو وجود میں آیا۔ اس کا مقصد غذائیت اور زندگی کا معیار بلند کرنا۔ ہر قسم کی خوراک کی پیداوار اور تقسیم سے متعلق انتظام بہتر بنانا، زرعی زمین، جنگلات اور مچھلیوں کی پیداوار کو بڑھانا ہے تاکہ دنیا سے غربت کا خاتمہ ہو سکے۔

۴- اقوام متحدہ کا تعلیمی، سائنسی اور ثقافتی ادارہ UNESCO

یہ ادارہ ۴ رنومبر ۱۹۴۶ء کو قائم ہوا۔ اس ادارہ کا مقصد دنیا کی تمام قوموں کے عزت کا مقام پیدا ہو۔ یہ جملہ باتیں اقوامِ متحدہ کے چارٹر کے مطابق دنیا کے تمام باشندوں کو کسی نسلی، جنسی، لسانی یا مذہبی امتیاز کے بغیر حاصل ہونی چاہئیں۔

۵- عالمی ادارۂ صحت W.H.O.

۷ راپریل ۱۹۴۸ء کو یہ ادارہ وجود میں آیا۔ اس ادارے کا مقصد دنیا کے تمام انسانوں کی صحت کا معیار بلند کرنا ہے یہ ادارہ طبی تحقیقات کی ہمت افزائی بھی کرتا ہے اور بیماریوں سے بچاؤ کے لٹریچر بھی چھاپتا ہے۔ اس ادارے نے تجربہ گاہوں کا ایک بین الاقوامی نظام بھی قائم کر رکھا ہے تاکہ بیماری پیدا کرنے والے اسباب کا پتہ لگایا جا سکے۔

۶- عالمی بینک W.B.

۲۷ ردسمبر ۱۹۴۵ء کو یہ بینک وجود میں آیا اس کا مقصد سود مند مقاصد کے لئے سرمایہ لگانے کی سہولتیں مہیا کر کے ممبر ملکوں کے علاقوں کی ترقی اور تعمیر نو میں ان کی مدد کرنا ہے۔

۷- بین الاقوامی انجمن ترقیات IDA

عالمی بینک اس انجمن کا نظم و نسق قائم رکھنے کا ذمہ دار ہے قرضے دینے کے لئے یہ نیا مخصوص ادارہ ۲۴ ردسمبر ۱۹۶۰ء کو وجود میں آیا۔ اس انجمن کو قائم کرنے کا مقصد یہ ہے کہ کم ترقی یافتہ ممالک کو اہم ترقیاتی ضروریات پوری کرنے کے لئے ایسی شرائط پر قرضے دے، جو زیادہ لچکدار ہوں اور عام قرضوں کی شرائط کے مقابلے میں ان کا کم بوجھ توازن ادائیگی پر پڑتا ہو۔ اس طرح یہ انجمن عالمی بنک کے ترقیاتی مقاصد کو آگے بڑھاتی ہے۔

۸- بین الاقوامی انجمن مالیات I.F.C

یہ انجمن جولائی ۱۹۵۶ء میں قائم ہوئی اور ۲۰ فروری ۱۹۵۷ء کو اقوام متحدہ کا ایک مخصوص ادارہ بن گئی اگرچہ عالمی بنک سے اس کا قریبی تعلق ہے تاہم قانونی اعتبار سے اس کی ایک علیحدہ حیثیت ہے۔ اس کا مقصد ممبر ممالک میں خاص طور پر کم ترقی یافتہ علاقوں میں نجی کوششوں کی ہمت افزائی کرکے اقتصادی ترقی میں مدد دینا ہے۔

۹- بین الاقوامی مالی فنڈ I.M.F.

یہ فنڈ ۲۷ دسمبر ۱۹۴۵ء کو قائم ہوا۔ اس فنڈ کا مقصد مالی تعاون کو ترقی دینا۔ بین الاقوامی تجارت کو وسعت دینا، زرمبادلہ کی استواری کو ترقی دینا۔ ممبر ممالک کے درمیان مبادلے کے انتظامات میں باقاعدگی پیدا کرنا۔ ایسے مقابلے سے باز رکھنا جو شرح مبادلہ میں خفیف کا باعث ہو۔

۱۰- بین الاقوامی ادارہ فضائیہ I.C.A.O.

یہ ادارہ ۴ اپریل ۱۹۴۷ء کو قائم ہوا اس ادارے کا مقصد بین الاقوامی شہری پرواز کے مسائل کا مطالعہ کرنا ہے اور شہری پرواز سے متعلق بین الاقوامی معیار اور قواعد و قانون مرتب کرنا اس کے فرائض میں شامل ہے۔

۱۱- ڈاک کی عالمگیر انجمن U.P.U.

یہ انجمن جولائی ۱۸۷۸ء کو قائم ہوئی تھی۔ انجمن اقوام متحدہ کے قیام کے بعد اس کے زیر اثر آگئی۔ اس کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ ڈاک کی مختلف بین الاقوامی خدمات کا خیال رکھے۔

۱۲- بین الاقوامی مواصلات کی یونین I.T.U

یہ انجمن ۱۸۶۵ء کو پیرس میں قائم ہوئی ۱۹۴۷ء میں اس یونین کی ازسرنو تنظیم ہوئی اور اس کا معاہدہ اقوام متحدہ سے ہوگیا۔ جس کی رو سے وہ مواصلات کا ایک مخصوص ادارہ سمجھا جانے لگا۔ اس انجمن کا مقصد تار ٹیلی فون اور ریڈیو کی خدمات کو فروغ دینا اور ان کے استعمال کو عام کرنا ہے۔

۱۳- عالمی ادارہ موسمیات W.M.O

یہ ادارہ ۲۳ مارچ ۱۹۵۱ء سے قائم ہے۔ یہ ادارہ زمین کے طبعیاتی مشاہدات کرکے عالمی سطح پر موسمیات کی معلومات فراہم کرنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ موسمیات

سے متعلق تحقیق و تربیت کے کاموں کی ہمت افزائی کرنا اور اس تحقیق و تربیت کو بین الاقوامی طور پر مربوط رکھنے میں مدد دینا۔

۱۴- بین الحکومتی بحری مشاورتی ادارہ I.M.C.O.

۱۷ مارچ ۱۹۵۸ء کو اس ادارے کا قیام عمل میں آیا۔ ایسے فنی معاملات کے بارے میں جو جہاز رانی پر اثر انداز ہوں، حکومتوں کے مابین اطلاعات کے تبادلے اور تعاون کے لئے ایک نظام قائم کرنا اس ادارے کا مقصد ہے ادارے کا کام یہ بھی ہے کہ بین الاقوامی ضابطوں اور اقرار ناموں کے مسودات مرتب کرے اور جہاز رانی کے معاملات سے متعلق بین الاقوامی کانفرنسیں طلب کرے اس ادارے کی حیثیت مشاورتی قسم کی ہے۔

۱۵- عام معاہدہ برائے محصول اور تجارت GATT

یہ معاہدہ یکم جنوری ۱۹۴۸ء کو نافذ ہوا۔ اس کا مقصد عالمی تجارت اور باہمی ثقافتی تعاون و اتحاد پیدا کرنا ہے یہ ادارہ آزاد آمد و رفت کے لئے انتظام کرتا ہے اور اس آزادی کے حصول کے معقول طریقے مہیا کرتا ہے۔

۱۶- بین الاقوامی ادارہ مہاجرین IRO

اس ادارے کا مقصد مہاجرین کی ہر ممکن امداد کرنا اور ان کی آبادکاری کے سلسلے میں کوششیں وغیرہ کرنا شامل ہے۔

۱۷- بین الاقوامی ادارہ سیاحت TUOTO

اس ادارے کا مقصد یہ ہے کہ سیاحوں کی آمد و رفت کی ترقی کے لئے اقدامات کرنا۔ نیز یہ ادارہ ریاستوں کی معاشی و سماجی زندگی میں تعاون کے ذرائع بھی فراہم کرتا ہے

۱۸۔ اقوام متحدہ ترقیاتی پروگرام UNDP

ترقی پذیر ممالک کی آمدنی میں اضافے، افرادی اور قدرتی وسائل کے صحیح استعمال کے لیے ماہرین اور ٹریننگ کے ذریعے مدد کرتا ہے۔ نیو یارک نیویارک اس کا صدر دفتر ہے۔

۱۹۔ اقوام متحدہ ماحولیاتی پروگرام UNEP

یہ پروگرام اقوام متحدہ نے ۱۹۷۲ء میں تشکیل دیا۔ یہ ماحولیاتی پروگراموں میں مشینری فراہم کرتا ہے۔ تاکہ بین الاقوامی تعاون کو فروغ حاصل ہو۔ ۵۸ ممالک

اس کے رکن ہیں۔ نیروبی (کینیا) میں اس کا صدر دفتر ہے۔

۲۰۔ اقوام متحدہ فنڈ برائے آبادیاتی سرگرمیاں UNFPA

یہ ادارہ ۱۹۶۷ء میں قائم ہوا۔ رکن ممالک کے لیے منصوبہ بندی کے پروگراموں اور آبادی کے مسائل کے حل کیلئے امداد فراہم کرتا ہے۔ صدر دفتر نیویارک میں واقع ہے۔

۲۱۔ اقوام متحدہ ادارہ صنعتی ترقی UNID

اس ادارے کا مقصد ترقی پذیر ممالک میں افرادی اور قدرتی وسائل کا استعمال کرکے صنعتی ترقی کو فروغ دینا، صنعتوں کو جدید طرز پر قائم کرنا، صنعتی اور ترقی پذیر ممالک کے درمیان تجارت کو فروغ دینا ہے۔ اس کا صدر دفتر ویانا (آسٹریا) میں واقع ہے۔

۲۲ بین الاقوامی فنڈ برائے زرعی ترقی:۔

اس ادارے کا صدر دفتر روم (اٹلی) میں واقع ہے اور اس کا کام ترقی پذیر ممالک کو زرعی ترقی کے لئے قرضے اور امداد مہیا کرنا ہے اس کے ممبران کی تعداد ۱۳۲ ہے۔

۲۳ عالمی ادارہ برائے تحفظ حقوق دانشوراں:۔

یہ ادارہ دانشوروں کے حقوق کا تحفظ اور اُن کے کاموں کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ ٹریڈ مارکس، صنعتی ڈیزائن، ادبی اور فنی تخلیقات کو قانونی تحفظ فراہم کرتا ہے تاکہ ایجادات اور تخلیقات کا سلسلہ جاری رہے اور ماہرین و دانشوروں کو مناسب صلہ مل سکے۔ اِس کا صدر دفتر جنیوا میں ہے۔

خصوصی ایجنسیوں کے رابطے کی کمیٹیاں

۱ انتظامی رابطہ کمیٹی

۲ فنی امداد بورڈ

۴۔ امانتی کونسل

TRUSTEE SHIP COUNCIL

امانتی کونسل ان علاقوں اور مقبوضات کے انتظام کی ذمہ دار ہے جن پر اقوام متحدہ کی نگرانی میں حکومت کی جاتی ہے اس کی تفصیل حسب ذیل ہے
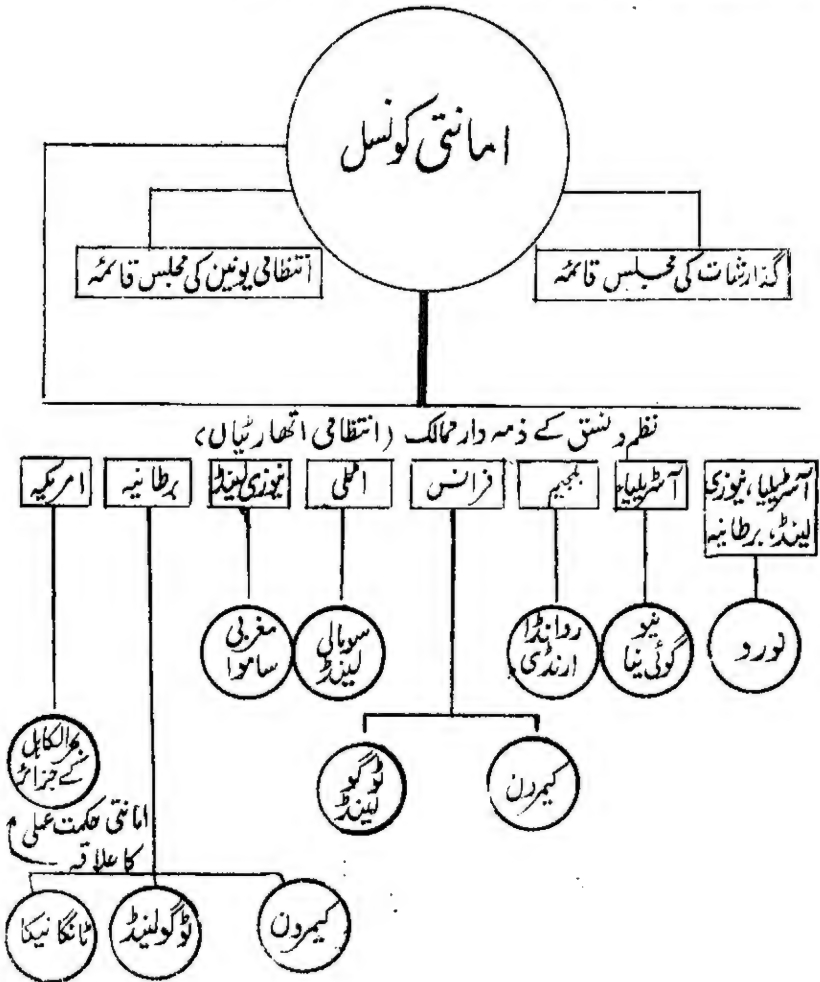
امانتی علاقے عام طور پر وہ ہیں جو دوسری جنگ عظیم سے قبل بڑی طاقتوں کے انتداب میں تھے اور اب کچھ مجلس اقوام کی حکمت عملی کا نتیجہ تھا۔ دوسری جنگ کے بعد فرانس اور برطانیہ جیسی اقوام ان پر اپنا انتداب رکھنے میں ناکام رہیں جس کی وجہ سے انھیں اقوام متحدہ کی نگرانی میں دے دیا گیا۔ اس کا مقصد علاقوں کو ترقی دے کر انھیں آزاد کرنا تھا۔

اس میں خاطر خواہ کامیابی ہوئی ہے قدیم گیارہ امانتوں میں سے صرف ایک امانت بحرالکاہل کا جزیرہ (مائیکرونیشیا) باقی رہ گیا ہے جس کا نظم و نسق امریکہ چلا رہا ہے۔ باقی تمام علاقے خود مختار حیثیت یا قرب و جوار کے خود مختار ممالک میں شامل ہو چکے ہیں۔

۲۶ مارچ ۱۹۴۷ء میں کونسل اپنے پہلے اجلاس میں صرف ۸ اراکین پر مشتمل تھی جن میں آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، برطانیہ اور امریکہ انتدابی علاقوں کے نظم و نسق کے ذمہ دار تھے۔ تین ارکان سلامتی کونسل کے مستقل نمائندے روس، چین، اور فرانس اس کونسل میں شامل تھے ایک ممبر جنرل اسمبلی ۳ سال کے لئے منتخب کرتی تھی۔ نگران چاروں پر نظم و نسق کی ذمہ داری نہیں تھی۔ منشور میں امانتی کونسل کے اراکین کی تعداد مستقل بنیادوں پر نہیں رکھی گئی تھی۔ اس لئے جوں جوں یہ علاقے آزاد ہوتے گئے کونسل کا سائز بھی چھوٹا ہوتا گیا۔ اب صرف ۵ اراکین رہ گئے ہیں۔ امریکہ (نظم و نسق چلانے والا) اور سلامتی کونسل کے چار مستقل اراکین برطانیہ، فرانس روس اور چین۔

فرائض و اختیارات

۱ امانتی علاقوں اور نظم و نسق چلانے والوں کی رپورٹوں کا جائزہ لینا۔

۲ نظم و نسق چلانے والوں کے مشورے سے پروگرام طے کر کے معائنے کے لئے وقتاً فوقتاً دورے کرنا۔

۳ امانتی علاقوں کے باشندوں کی سیاسی اقتصادی، معاشرتی اور تعلیمی ترقی کے بارے میں ایک سوالنامہ مرتب کرنا جس کی بنیادوں پر نظم و نسق چلانے والی حکومتیں سالانہ رپورٹیں تیار کریں۔

امانتی کونسل میں فیصلہ محض اکثریت رائے سے ہوتا ہے اور ہر رکن کا صرف ایک ووٹ ہوتا ہے۔

۵- بین الاقوامی عدالت انصاف

INTERNATIONAL COURT OF JUSTICE

بین الاقوامی عدالت انصاف ابتدا میں مستقل عدالت برائے بین الاقوامی انصاف کہلاتی تھی جس کو مجلس اقوام کے میثاق کے مطابق ۱۹۲۱ء میں قائم کیا گیا تھا۔ مجلس اقوام ختم ہوگئی مگر یہ عدالت بدستور قائم رکھی گئی اور جب ۱۹۴۵ء میں اقوام متحدہ وجود میں آئی تو اس کو اقوام متحدہ . . . . کی دفعہ ۱۴ کے تحت ایک ادارے کے طور پر اس میں شامل کر لیا گیا اور اب یہ اقوام متحدہ کا عدالتی حصہ ہے اقوام متحدہ کے تمام ممبر ممالک جن کی تعداد ۱۷۸ ہے اس میں شامل ہیں البتہ سوئیٹزرلینڈ ماریو اور ریخ ٹنس ٹین LIECHTENSTEIN عدالت کے ممبر ہیں۔ حالانکہ انہوں نے اقوام متحدہ کی ممبر شپ بھی حاصل نہیں کی۔

عدالت کی تنظیم

بین الاقوامی عدالت انصاف پندرہ ۱۵ ججوں پر مشتمل ہے۔ جن کو ۹ سال کے لئے سلامتی کونسل اور جنرل اسمبلی منتخب کرتی ہے یہ انتخاب دوبارہ بھی عمل میں آسکتا ہے بشرطیکہ اراکین کوئی نفع بخش ملازمت نہ کرلیں۔ ان کا انتخاب قومیت کی بجائے بلند و اعلیٰ کردار کی بدولت عمل میں آتا ہے ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے ملک میں اعلیٰ ترین عدالتی خدمات پر فائز ہوں یا رہے ہوں اور بین الاقوامی قانون سے متعلق مسلمہ مہارت رکھتے ہوں۔ عدالت کا صدر مقام نیدرلینڈ کا شہر ہیگ ہے۔

فیصلے کا طریقہ کار

کورم کے لئے ۹ ججوں کا ہونا ضروری ہے۔ فیصلہ ججوں کی اکثریت سے عمل میں آتا ہے اگر کسی مقدمے کے فیصلے کے بارے میں ججوں کی رائے میں اختلاف ہو اور اسے دونوں طرف ججوں کی تعداد برابر ہو تو پھر عدالت کا صدر اپنی رائے سے مقدمے کا فیصلہ کرتا ہے

عدالت کے قانونی ماخذ

بین الاقوامی عدالت انصاف کوئی فیصلہ کرتے وقت مندرجہ ذیل قانونی ماخذ استعمال کرتی ہے۔

(۳) قانون کے عام اصول جنھیں متمدن ریاستیں تسلیم کر چکی ہوں۔

(۴) قانون ساز معاہدوں کے اصول

(۵) عدالتوں کے فیصلے و نظیر PRECEDENCE

(۶) ماہرین قانون کی رائے اور ان کی درسی تصانیف۔

عدالت کا صدر اور نائب صدر

عدالت اپنے اراکین میں سے صدر اور نائب صدر کا انتخاب ۳ سال کے لئے کرتی ہے۔ منتخب شدہ اراکین کا دوبارہ انتخاب بھی عمل میں آ سکتا ہے۔ علاوہ ازیں عدالت اپنا رجسٹرار خود مقرر کرے گی اور ایسے دیگر عہدہ داروں کے تقرر کا انتظام کرے گی جو ضروری ہو۔

عدالت کی سرکاری زبانیں

عدالت کی سرکاری زبانیں فرانسیسی اور انگریزی ہیں۔ فریقین عدالت کی اجازت سے کوئی تیسری زبان بھی استعمال کر سکتے ہیں بہرحال فیصلہ صرف فرانسیسی اور انگریزی ہی میں صادر کیا جاتا ہے۔

عدالت کا دستور

بین الاقوامی عدالت انصاف کا تحریری دستور ۷۰ دفعات پر مشتمل ہے جس میں عدالت کے جملہ کوائف درج ہیں۔ دستور میں ترمیم اس ضابطے سے عمل میں آتی ہے جو اقوام متحدہ کے منشور میں ترمیم کے لئے مقرر کئے گئے ہیں۔

اراکین عدالت کا استعفیٰ

عدالت کا ہر رکن اپنا استعفیٰ چیف جسٹس کو بھیجے گا اور پھر چیف جسٹس سیکرٹری

(۱) بین الاقوامی قواعد و ضوابط جنھیں فریقین ریاستیں منضبط قوانین کے طور پر تسلیم کر چکی ہوں۔

(۲) بین الاقوامی رواجات جو قانونی طور پر تسلیم کئے جا چکے ہوں۔

جنرل کے مشورے سے یہ استعفیٰ قبول کرے گا۔

عدالت کا اختیار سماعت

بین الاقوامی عدالت انصاف کو دو طرح کے اختیار سماعت حاصل ہیں اوّل نزاعی اختیار سماعت اور دوئم مشاورتی اختیار سماعت یہاں ان کا الگ الگ جائزہ لیا جارہا ہے۔

نزاعی اختیار سماعت

صرف اقوام متحدہ کے ممبر ممالک بین الاقوامی عدالت انصاف سے انصاف کے طلبگار ہو سکتے ہیں لیکن جب کوئی ایسا ملک جو اقوام متحدہ کا رکن نہ ہو کسی مقدمے کا فریق ہو تو عدالت اس رقم کا تعین کرے گی۔ جو اس کو عدالت کے مصارف کی بابت ادا کرنی ہو گی اس حکم کا اطلاق اس وقت نہ ہو گا جب ایسی مملکت عدالت کے مصارف کا کوئی حصہ برداشت کر رہی ہو۔

جب دو یا دو سے زیادہ ممالک کے درمیان کسی مسئلہ پر قانونی اختلاف ہو یا بین الاقوامی قانون کی خلاف ورزی کی گئی ہو تو بین الاقوامی عدالت کا فیصلہ ہی آخری ہوتا ہے لیکن عموماً یہ ہوا ہے کہ کسی نزاعی مسئلے کو بجائے اس کے کہ عدالت میں پیش کیا جائے سلامتی کونسل اور خصوصاً اس کے مستقل اراکین نے ویٹو استعمال کر کے وہیں ختم کر دیا ہے اس طرح اس کی نوبت کم آتی ہے کہ کسی نزاعی مسئلہ کا آخری فیصلہ عدالت کرے۔

بہر حال اس کے باوجود جو تنازعات عدالت کے سامنے پیش کئے گئے ہیں۔ عدالت نے ان کے بارے میں اپنا فیصلہ سنایا ہے۔ جن میں سے بعض اہم مقدمات حسب ذیل ہیں۔

(۱) من کوئرز اور ایکری ہوس کے بارے میں فرانس اور برطانیہ کے مابین جھگڑا تھا جسے عدالت نے اپنے فیصلے کے ذریعے حل کیا۔

(۲) انگلستان کی بعض متنازعہ چٹانیں اور جزیرے برطانیہ کے زیر اقتدار میں بلجیم اور نیدرلینڈ کے درمیان خاص سرحدی زمین پر اقتدار کے متعلق معاملے میں عدالت نے دونوں ریاستوں کی درمیانی سرحد کے ساتھ ساتھ مخصوص علاقوں میں بلجیم کا اقتدار برقرار رکھا۔

(۳) ہونڈوراس اور نکاراگوا کے درمیان ایک جھگڑا چلا جو اسپین کے بادشاہ کی طرف سے ۲۳ دسمبر ۱۹۰۶ء کو دیئے جانے والے ثالثی حکم کے بارے میں تھا۔ جس کے تحت دونوں ملکوں کے سرحدی علاقوں کا تعین ہونا تھا۔ عدالت نے ہونڈوراس کا حق کالعدم کر دیا۔

(۴) کمبوڈیا اور تھائی لینڈ کے درمیان ایک مقدمہ "جو ہریہ دی ہیر مندر" کے بارے میں تھا۔ عدالت نے یہ رائے قائم کی کہ یہ ایک زیارت گاہ ہے جو کمبوڈیا کے زیر اقتدار علاقے میں واقع ہے۔

(۵) سمندری قانون سے متعلق برطانیہ اور البانیہ کے درمیان رودبار کورنو سے متعلق ایک مقدمہ قائم ہوا اس میں عدالت نے البانیہ کو اس نقصان کا ذمہ دار ٹھہرایا جو اس کے علاقائی سمندر میں برطانیہ کے بعض جنگی جہازوں کی لائینوں کو پہنچا تھا لیکن جنگی جہازوں کے اس حق کو بحال رکھا کہ وہ زمانہ امن میں بین الاقوامی آبناؤں میں سے ہو کر سیدھے بہاؤ گزر سکتے ہیں نیز اس مقدمے میں یہ فیصلے بھی دیا گیا کہ برطانیہ نے اس علاقے میں بچھی ہوئی سرنگوں کو ہٹا کر البانیہ کے اقتدار اعلیٰ کی خلاف ورزی کی ہے۔

(۶) برطانیہ اور ناروے کے مابین ماہی گیری کے مقدمے کا فیصلہ بھی عدالت نے سنایا ناروے اپنے ساحل کے ساتھ بعض علاقوں میں ماہی گیری کے حق سے تعلق رکھتا تھا اور جہاں ماہی گیری کا حق ناروے نے صرف اپنے شہریوں کے لئے مخصوص کیا ہوا تھا۔ عدالت نے فیصلہ دیا کہ علاقائی سمندر کی حد بندی کرنے کا جو طریقہ ناروے نے استعمال کیا ہے وہ قانون بین الاقوامی کی رو سے غلط نہیں ہے۔

(۷) عدالت نے بعض اقرار ناموں اور معاہدوں کے معانی و مفہوم سمجھانے کے لئے بھی فیصلے سنائے۔ مراکش میں رہنے والے باشندگانِ امریکہ کے حقوق (امریکہ کے خلاف فرانس) لاطینی امریکہ میں سفارت خانوں میں پناہ لینے کے حقوق (پیرو کے خلاف کولمبیا) ثالثی کے تنازعات پیش کرنے کا حق (برطانیہ کے خلاف یونان) برطانیہ کے زیر نگیں کیمرون کے علاقے کے لئے معاہدہ تولیت کے تحت برطانیہ کی ذمہ داریاں (برطانیہ کے خلاف کیمرون)۔ وغیرہ۔

مشاورتی اختیار سماعت:۔

عدالت مختلف موضوعات پر اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی اور مخصوص اداروں کی تحریری درخواست پر اپنی مشاورتی رائے بھی پیش کرتی ہے اس میں منشور کی بعض دفعات کا مفہوم سمجھنا بھی شامل ہے۔ دو دفعہ اقوام متحدہ کی رکنیت پر رائے لی گئی ہے۔ عدالت اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل، ارکان اور دیگر ملکوں اور بین الاقوامی تنظیموں سے براہ راست تعلق رکھنے والے نمائندوں کو اطلاع دے کر اپنی مشاورتی رائے کھلی عدالت میں صادر کرتی ہے

بین الاقوامی عدالت کا مستقبل:۔

FUTURE OF INTERNATIONAL COURT OF JUSTICE

بین الاقوامی عدالت انصاف کے بارے میں چیف جسٹس چھاگلہ نے اپنی تصنیف "قانون آزادی اور زندگی" میں لکھا ہے "بین الاقوامی عدالت انصاف اقوام متحدہ کا ایک انتہائی اہم ادارہ ہے۔ لیکن یہ کسی طرح مکمل نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس کو کوئی اختیار یا قوت حاصل نہیں ہے لیکن اس کے وجود سے ایک اچھے تصور کا تعین ہوتا ہے۔ ایک ایسے تصور کا جو ریاستوں کے مابین اعتماد و امن کو بڑھاتا ہے اور جب کبھی کوئی تنازعہ پیدا ہوتا ہے۔ افراد جس طرح ایک دوسرے کی گردن کاٹنے نہیں دوڑتے۔ اسی طرح ریاستیں بھی اختلاف کی وجہ سے ہتھیار نہیں اٹھاتیں۔ اور وہ کسی غیر جانبدار عدالت کے فیصلے پر بھروسہ رکھتیں ہیں۔ لیکن عدالت کو ہر حالت میں آزاد اور غیر جانبدار ہونا چاہیئے۔

موجودہ بین الاقوامی عدالت انصاف کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ اس میں قوت نافذہ کا فقدان ہے۔ یہ اپنے فیصلے پولیس فورس کے ذریعے نہیں منوا سکتی۔ کیونکہ اس کے پاس پولیس فورس نہیں ہے ضرورت اس بات کی ہے کہ تمام چھوٹی بڑی مملکتیں دل و جان سے عدالت کے دستور کا احترام کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ اس دنیا میں ہمہ گیر امن UNIVERSAL PEACE قائم نہ ہو۔

آج دنیا کے مسائل میں افغانستان کا بحران، کمپوچیا کا بحران، کشمیر کی آزادی۔ مشرق وسطیٰ کا تنازعہ، عراق ایران جنگ، لبنان میں اسرائیلی جارحیت، نمیبیا کے خلاف جنوبی افریقہ کی نسل پرست اور گوری اقلیتی حکومت کے مظالم، اری ٹیریا کی محاذ آزادی کی جدوجہد اور ان پر حبشہ اور سوویت فوجوں کے مظالم اور ایک بین الاقوامی اقتصادی نظام کا قیام وغیرہ شامل ہیں۔

میرے خیال میں عدالت جنگ کا متبادل اور دنیا کو مسائل سے تبھی نکال سکتی ہے۔ جب سبھی ممالک عدالت کے فیصلے کو دل سے اس طرح تسلیم کریں جس طرح وہ ملکی عدالتوں کے فیصلوں کو کرتے ہیں اور ظاہر ہے ایسا تبھی ہو سکتا ہے کہ ملکی عدالتوں کی طرح بین الاقوامی عدالت انصاف کی پشت پناہی کوئی انفعال قوت کر رہی ہو۔

THE SECRETRIAT

جنرل اسمبلی سلامتی کونسل اور اقوام متحدہ کے دیگر اداروں کا انتظام سنبھالنے کی ذمہ داری سیکرٹریٹ کی ہے جو ایک سیکرٹری جنرل کی نگرانی میں اپنے فرائض سرانجام دیتا ہے۔ سیکرٹری جنرل کا تقرر سلامتی کونسل کی سفارش پر جنرل اسمبلی پانچ سال کے لئے کرتی ہے۔

اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل

۱۔ مسٹر ٹرگوئے لی (ناروے) یکم فروری ۱۹۴۶ء۔ ستمبر ۱۹۵۲ء
۲۔ مسٹر ڈاگ ہیمرشولڈ (سویڈن) ۱۰ اپریل ۱۹۵۳ء ۔ ۱۷ ستمبر ۱۹۶۱ء
۳۔ مسٹر اوتھانٹ (برما) نومبر ۱۹۶۱ء ۔ ۳۱ دسمبر ۱۹۷۱ء
۴۔ مسٹر کرٹ والڈہائیم (آسٹریا) یکم جنوری ۱۹۷۲ء ۔ ۳۱ دسمبر ۱۹۸۱ء
۵۔ مسٹر پیریز ڈی کوئیار (پیرو) یکم جنوری ۱۹۸۲ء ۔ ۳۱ دسمبر ۱۹۹۱ء
۶۔ مسٹر پطرس غالی (مصر) یکم جنوری ۱۹۹۲ء ۔ تا حال

سیکریٹری جنرل کے فرائض

— • اقوام متحدہ کے ناظم الامور کی حیثیت سے فرائض سرانجام دینا۔
— • سلامتی کونسل کو ایسے معاملات کی اطلاع دینا جو امن و سلامتی کے قیام کے لئے خطرے کا باعث ہوں۔
— • اقوام متحدہ کی جملہ کارگزاریوں سے متعلقہ جنرل اسمبلی کے سامنے مختلف رپورٹ اور ضمنی رپورٹ پیش کرنا۔

سیکرٹریٹ کا عملہ دنیا کے تمام علاقوں کے افراد پر مشتمل ہوتا ہے اور ہر محکمے کو دنیا کے ماہرین کی خدمت حاصل ہوتی ہیں۔ سیکرٹریٹ کے عملے اور ماہرین کی جماعتوں میں افریقہ اور

ایشیاء کی نمائندگی ان ممالک کی آبادی کے لحاظ سے کم ہے۔ یہ ملازمین عالمی سول سروس کے ملازمین کی حیثیت سے اس ادارے کے لئے کام کرتے ہیں، ہر ملازم اس چیز کا حلف اٹھاتا ہے کہ وہ نہ تو کسی حکومت یا بیرونی طاقت سے ہدایات کا طالب ہوگا۔ اور نہ ہی ان کی ہدایات کو قبول کرے گا۔ اقوام متحدہ کے عملے کی ذمہ داریوں کی مخصوص بین الاقوامی نوعیت کا احترام کرے گا۔ اور ان کے فرائض کی بجا آوری میں کسی قسم کی مداخلت کا ارتکاب نہیں کرے گا۔

سیکرٹریٹ کی تشکیل

سیکریٹریٹ کے ساتھ دیگر شعبوں میں سیاسی معاملات، قانونی امور اور انتظامی معاملات کے لئے الگ الگ شعبے قائم کئے گئے ہیں جو حسب ذیل ہیں۔

۱۔ سیاسی اور سلامتی کے امور کا محکمہ۔
۲۔ اقتصادی و سماجی امور کا محکمہ
۳۔ امانتی اور غیر مختار علاقوں کا محکمہ
۴۔ اطلاع عامہ کا دفتر
۵۔ کانفرنس والے کاموں کا دفتر
۶۔ عام خدمات کا دفتر

منشور میں ترمیمات AMENDMENTS IN CHARTER

دفعہ نمبر ۱۰۸ اور نمبر ۱۰۹

جنرل اسمبلی کی ۲/۳ اکثریت اور سلامتی کونسل کے تمام ارکین اس ترمیم پر متفق ہوں تو منشور میں ترمیم ہو جاتی ہے۔

زبانیں

انگریزی، فرانسیسی، چینی، روسی اور ہسپانوی سرکاری زبانیں ہیں عملاً انگریزی اور فرانسیسی زبان ہی چلتی ہیں۔

انجمن اقوام متحدہ کا قیام امن میں کردار

THE ROLE OF U.N.O. TO CREATE PEACE

اقوام متحدہ کا سب سے اہم مقصد دنیا کو جنگ کی تباہ کاریوں سے بچانا ہے اور دنیا میں ایسے حالات پیدا کرنا ہے جن سے جنگ کے خطرات کم سے کم ہو جائیں۔ اقوام متحدہ اپنے اس مقصد میں کس حد تک کامیاب ہوئی ہے اس کا اندازہ اس وقت ہو گا جب بڑی طاقتیں اسلحہ کی تخفیف پر متفق ہو جائیں گی اور آلات حرب کی کمی اس بات کا ثبوت ہو گی کہ عالمی جنگ کے خطرات کم ہو گئے ہیں۔

گذشتہ نصف صدی سے اقوام متحدہ آئندہ نسلوں کو جنگ کی تباہ کاریوں سے محفوظ رکھنے اور عالمی امن کو برقرار رکھنے کی سرگرمیوں میں مصروف ہے مثال کے طور پر ۱۹۴۷ء میں جنرل اسمبلی نے اپنے دوسرے اجلاس میں ایسے پروپیگنڈے کی مذمت کی جن کا تعلق قیام امن سے ہے ۱۹۴۹ء میں جنرل اسمبلی نے اس قسم کے پروپیگنڈے کی مذمت کی دوبارہ توثیق کی اور تمام ملکوں پر زور دیا کہ ایسی اطلاعات کی تشہیر اور حوصلہ افزائی کی جائے جن سے امن کے خواہشمند لوگوں کے جذبات کی عکاسی ہوتی ہو۔ ۱۹۵۰ء میں اقوام متحدہ نے کسی ملک کی جانب سے دوسرے ممالک کی آئینی حکومت کو بدلنے کے لئے اس کے اندرونی معاملات میں مداخلت کی شدید مذمت کی۔ ۱۹۵۷ء میں تمام ممالک سے اپیل کی کہ وہ آپس میں تعلقات بڑھائیں اور پرامن ذرائع سے اپنے تنازعات کا حل تلاش کریں۔ اس بات پر خاص طور پر زور دیا گیا ہے کہ ملکوں کے داخلی امور میں مداخلت نہ کی جائے اور ان کی آزادی اور خودمختاری محفوظ رہے اس مقصد کے لئے جنرل اسمبلی نے ۱۹۶۵ء میں ایک اعلان بھی جاری کیا۔

۱۹۶۶ء میں جنرل اسمبلی نے اس امر پر اصرار کیا کہ داخلی اور خارجی امور میں مداخلت فوری طور پر ختم کر دی جائے اس سلسلے میں اس نے ہر قسم کی مداخلت کی مذمت کی کیونکہ یہ مداخلت عالمی امن کے لئے ایک بنیادی خطرے کی حیثیت رکھتی ہے ۱۹۷۰ء میں جنرل اسمبلی نے بین الاقوامی سلامتی کے استحکام سے متعلق اعلان کی منظوری دی۔ اس اعلان میں امن

سلامتی تخفیف اسلحہ و فوج اور تمام انسانوں کی اقتصادی و سماجی ترقی کے فروغ کے لئے نئے اقدامات کا مطالبہ کیا گیا۔ جنرل اسمبلی نے ۱۹۷۰ء میں ہی تمام ممالک کے درمیان دوستانہ تعلقات اور تعاون سے متعلق عالمی قانون کے اصولوں کے بارے میں اعلان کی منظوری دی۔ اس اعلان میں مندرجہ ذیل اصول بیان کئے گئے۔

۱ تمام ممالک کسی ملک کی علاقائی سالمیت یا سیاسی آزادی میں مداخلت . . . سے باز رہیں گے۔

۲ تمام ممالک اپنے عالمی تنازعات پرامن ذرائع سے اس طرح حل کریں گے تاکہ عالمی امن وسلامتی پر آنچ نہ آنے پائے۔

۳ تمام ممالک کسی کے اندرونی معاملات میں عدم مداخلت کو اپنا فرض سمجھیں گے۔

۴ تمام ممالک مساوی طور پر آزادی و خود مختاری سے بہرہ ور ہیں۔

۵ تمام ممالک ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کو اپنا فرض سمجھیں گے

۶ تمام ممالک مساوی حقوق، حق خود ارادیت کے اصولوں اور منشور کے مطابق کمال دیانتداری سے اپنے فرائض سرانجام دیں گے۔

۱۹۵۰ء میں اقوام متحدہ نے جس کٹھن کام کی ابتداء کی تھی ۱۹۷۴ء میں اسمبلی نے جارحیت کی تعریف منظور کرکے اس کی تکمیل کر دی۔ اس طرح اقوام متحدہ نے دنیا کے مختلف حصوں میں تنازعات کو روکنے اور ختم کرانے میں جو کردار ادا کیا ہے اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا

ا۔ مسئلہ کشمیر

KASHMIR PROBLEM

مسئلہ کشمیر پہلی بار جنوری ۱۹۴۸ء کو سلامتی کونسل میں پیش ہوا۔ جب بھارت نے شکایت کی کہ قبائلی اور دوسرے لوگ کشمیر پر حملہ کر رہے ہیں اور گھمسان کی جنگ ہو رہی ہے بھارت نے پاکستان پر الزام لگایا کہ اس حملے میں پاکستان امداد کر رہا ہے۔ پاکستان کا موقف یہ ہے کہ کشمیر کا الحاق بھارت کے ساتھ غیر قانونی ہے۔ سلامتی کونسل کے فیصلوں کے نتیجے میں اقوام متحدہ کا ایک کمیشن جولائی ۱۹۴۸ء کو برصغیر آیا۔ جس کے نتیجے میں یکم جنوری ۱۹۴۹ء کو کشمیر میں جنگ بندی قبول کی گئی۔ کمیشن کی تجاویز بھی منظور کر لی گئیں کہ مسئلہ کشمیر کے حل کے لئے استصواب رائے کے ذریعے فیصلہ کیا جائے گا۔ اس وقت فوجی مبصرین کی ایک جماعت بھی قائم کی گئی۔ تاکہ کمیشن استصواب رائے کروا سکے۔ تاہم کمیشن ریاست

سے فوجیں ہٹانے کی شرائط طے کرنے میں ناکام رہا اور فوجیں ہٹنے کے بعد استصواب رائے شماری ہو سکتی تھی
اقوام متحدہ کی ثالثی کے باوجود فریقین میں اختلافات برقرار رہے۔
اور یہ مسئلہ جو سرکاری طور پر پاک بھارت تنازعہ کہلاتا ہے کئی بار کونسل کے سامنے آیا۔ اسی
مسئلے کے پس منظر میں ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کو دونوں ملکوں کے مابین جنگ چھڑ گئی۔ جنگ بندی کے لئے
۲۰ ستمبر کو سلامتی کونسل نے مطالبہ کیا کہ دونوں فریقین ۲۲ ستمبر تک جنگ بند کریں اور ۵ ستمبر
۱۹۶۵ء سے پہلے والی سرحدوں پر واپس آ جائیں۔ ابھی فوجیں واپس نہیں ہوئیں تھیں کہ
۵ نومبر ۱۹۶۵ء کو سلامتی کونسل کا پھر اجلاس ہوا۔ جس میں اس بات پر زور دیا گیا کہ فریقین کے
درمیان جلد از جلد ملاقات ہو اور فوجوں کی واپسی کی معیاد مقرر کی جائے۔ سیکرٹری جنرل نے دونوں
ممالک کے مشورے سے ایک نمائندہ مقرر کیا۔ ۱۰ جنوری ۱۹۶۶ء میں صدر پاکستان اور وزیر اعظم
ہند کے مابین روس کے زیر اہتمام تاشقند میں ایک معاہدہ ہوا جس میں طے کیا گیا کہ ۲۵ فروری
تک فوجیں واپس بلائی جائیں گی۔ اس پروگرام پر عمل درآمد ہوا اور سلامتی کونسل کی قرارداد
کے مطابق فوجوں کی واپسی ممکن ہوئی

۲۳ نومبر ۱۹۷۱ء کو بھارت نے پاکستان کے اندرونی معاملات میں کھلم کھلا مداخلت کرکے
مشرقی پاکستان پر حملہ کر دیا اور ۳ دسمبر کو مغربی پاکستان پر بغیر کسی اعلان کے حملہ کر دیا۔
بھارت کے اس جارحانہ اقدام کا پاکستان نے اقوام متحدہ میں سخت نوٹس لینے کا مطالبہ
کیا اور سرحدوں پر امن فوج کو تعین کرنے کی درخواست کی بھارت نے پاکستانی موقف
کی شدید مخالفت کی۔ اس کے بعد پاکستان نے سلامتی کونسل سے رجوع کیا۔ سلامتی کونسل میں
پیش ہونے والی کئی قراردادوں کو روس نے ویٹو کر دیا۔ سلامتی کونسل کے رویئے سے مایوس ہو کر
پاکستان نے معاملے کو جنرل اسمبلی میں پیش کیا جنرل اسمبلی نے ۱۰۵ اراکین کی اکثریت کے ساتھ پاکستان
کے موقف کی حمایت میں ۷ دسمبر ۱۹۷۱ء کو جنگ بند کرنے کی قرارداد منظور کر لی۔ اس قرارداد
نے پاکستان کی سیاسی فتح کے ساتھ مشرقی پاکستان میں ہماری افواج پر ہتھیار ڈالنے کی
سازش کا جال بھی بچھا دیا۔ ۱۷ دسمبر کو جنگ بندی کے بعد سلامتی کونسل نے مصیبت زدوں
کی امداد کے لئے دنیا بھر کے ممالک سے اپیل کی اور کونسل نے جنرل سیکریٹری کو اس امر کا اختیار
بھی دے دیا وہ اپنا ایک خاص نمائندہ مقرر کرے جو اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر انسانی
مسائل کے حل کے بارے میں مدد دے۔ ۱۹۷۲ء کے دوران پناہ گزینوں کے لئے اقوام متحدہ کے

ہائی کمشنر کی مدد سے اپنے وطن واپسی کے لئے راہ ہموار ہوئی۔ اقوام متحدہ کی امدادی کاروائیوں سے بنگلہ دیش کی تباہ حال اقتصادی حالت کو بحالی ملی ۱۹۷۴ء میں بنگلہ دیش نے اقوام متحدہ کی رکنیت حاصل کر لی۔

آج بھی مسئلہ کشمیر پاکستان اور بھارت کے مابین تنازعہ کی شکل میں موجود ہے

۲ - مسئلہ قبرص : QUBRUS PROBLEM

قبرص ۱۹۶۰ء میں آزاد ہوا۔ اور مارچ ۱۹۶۴ء میں وہاں پر اقوام متحدہ کی امن فوج متعین کی گئی۔ اس فوج کا مقصد یونانی اور ترک قبرصیوں کے درمیان جنگ کا انسداد تھا۔ قبرص کے مسئلے پر اقوام متحدہ نے سب سے پہلے ۲۷ دسمبر ۱۹۶۳ء کو کاروائی کی تھی۔ جب کہ سلامتی کونسل کا اجلاس قبرص کی اس شکایت پر غور کرنے کے لئے ہوا تھا کہ ترکی نے اس کے داخلی معاملات میں مداخلت کی ہے۔ چنانچہ ۸ فروری ۱۹۶۴ء کو سلامتی کونسل کا اجلاس ہوا۔ برطانیہ کے مشورے کو منظور کرتے ہوئے ۴ مارچ ۱۹۶۴ء کو اقوام متحدہ کو اختیار دیا گیا سیکریٹری جنرل نے اقوام متحدہ کی طرف سے ایک ثالث مقرر کر دیا کہ وہ قبرص کے مسئلے کا ایسا پرامن حل معلوم کرے جو متعلقہ حکومتوں کے لئے قابل قبول ہو، اقوام متحدہ نے ۲۷ مارچ سے کام شروع کیا جس میں آسٹریا، کنیڈا، ڈنمارک، فن لینڈ، آئرلینڈ، سویڈن اور برطانیہ کے بھیجے ہوئے ۷ ہزار افسران اور فوجی جوان شامل تھے۔ ۲۰ جون کو سلامتی کونسل نے اپنی مدت انتداب کو مزید ۳ ماہ کے لئے بڑھا دیا۔ اگست ۱۹۶۴ء میں وہاں شدید فرقہ وارانہ فسادات شروع ہو گئے۔ تو سلامتی کونسل نے اپنا ایک ہنگامی اجلاس طلب کیا اور فسادات روکنے کو کہا۔ ۱۰ اگست کو قبرص اور ترکی نے جنگ بند کرنے کی تجویز مان لی تاہم "صلح نامہ" کی بارہا خلاف ورزی ہوتی رہی ۱۹۶۸ء سے اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل اور قبرص میں ان کے خصوصی نمائندے اس مسئلے کا حل تلاش کرنے کے لئے کوششیں کر رہے ہیں۔ لیکن اس مسئلے کا کوئی سیاسی حل تلاش نہیں ہوا۔

نومبر ۱۹۷۴ء میں جنرل اسمبلی نے متفقہ طور پر تمام ملکوں سے اپیل کی کہ وہ قبرص کی خود مختاری، علاقائی سالمیت، آزادی اور غیر جانبداری کا احترام کریں۔ اس بات پر بھی زور دیا کہ قبرص سے تمام غیر ملکی مسلح افواج فوری طور پر ہٹالی جائیں، بیرونی مداخلت ختم کر دی جائے اور تمام پناہ گزینوں کو بحفاظت ان کے گھروں کو واپس پہنچا دیا جائے مئی ۱۹۷۵ء

سے اپریل ۱۹۷۷ء کے درمیانی عرصہ میں یونانیوں اور قبرصیوں کے درمیان مذاکرات کے کامیاب چھ دور سیکرٹری جنرل کے زیر نگرانی ہوئے۔

۳۔ مشرق وسطیٰ MIDDLE EAST

مشرق وسطیٰ میں فلسطین، لبنان، اور نہر سویز کے بحران اقوام متحدہ کو پیش آئے۔ نومبر ۱۹۴۷ء میں جنرل اسمبلی نے فلسطین کی تقسیم کا منصوبہ تیار کیا اور ۱۴ مئی ۱۹۴۸ء میں اسرائیلی ریاست قائم ہوئی تو اسی دن یہودی اور عرب فلسطینیوں کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ ۱۱ جون ۱۹۴۸ء کو سلامتی کونسل نے عارضی طور پر یہ جنگ بند کرا دی۔ ۲۹ جولائی ۱۹۴۸ء کو پھر جنگ شروع ہو گئی۔ ۱۴ اکتوبر ۱۹۴۸ء کو سلامتی کونسل نے ایک بار پھر جنگ بند کروا دی اور اگست ۱۹۴۸ء کو مصر، شام، لبنان اور اردن کے ساتھ الگ الگ صلح نامے کئے۔

۱۹۵۶ء کو نہر سویز کا بحران پیدا ہوا۔ جو مصر کے خلاف اسرائیل، فرانس اور برطانیہ کی فوجی مداخلت کی وجہ سے پیدا ہوا تھا۔ اس بحران کو ختم کرنے کے لئے ایک معاہدہ ہوا جس میں طے پایا کہ مصر کی سرزمین سے اسرائیل، فرانس اور برطانیہ کی فوجیں واپس بلائی جائیں۔ اقوام متحدہ کی ایک ہنگامی فوج قائم کی جائے جو اس خطے میں امن قائم کرے۔ چنانچہ اقوام متحدہ کی امن فوج یہاں بھیجی گئی۔ فوج نے امن برقرار رکھنے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ نہر سویز کو آمد و رفت کے لئے دوبارہ کھولا گیا ۱۹۶۷ء تک امن فوج یہاں رہی۔ فوج کی واپسی کے ساتھ ہی جون ۱۹۶۷ء کو مصر اور اسرائیل کے مابین پھر جنگ چھڑ گئی۔ سلامتی کونسل نے ۶ جون ۱۹۶۷ء کو متعلقہ حکومتوں پر زور دیا کہ ابتدائی اقدام کے طور پر فوری جنگ بندی کے لئے تمام تدابیر اختیار کی جائیں۔ نومبر میں سلامتی کونسل نے مستقل پُرامن تصفیہ کیا۔ اس تصفیے میں طے یہ پایا کہ۔

- مقبوضہ علاقوں سے اسرائیلی فوج کی واپسی
- متعلقہ ملکوں کے درمیان حالت جنگ ختم کرنا۔
- بین الاقوامی آبی شاہراہوں پر آزادانہ جہاز رانی کی اجازت۔
- مہاجرین کی آبادکاری کا مسئلہ حل کرنا۔

اکتوبر ۱۹۷۳ء میں عرب فوج کے ساتھ جو مصر اور شام کے محاذوں پر اسرائیل سے برسر پیکار تھی دوبارہ جنگ کا آغاز ہوا۔ ۲۲ اکتوبر ۱۹۷۳ء میں سلامتی کونسل نے جنگ بندی کی اپیل کی۔

۲۱ دسمبر ۱۹۷۳ء کو مشرق وسطی سے متعلق امن کانفرنس جینوا میں اقوام متحدہ کے اہتمام سے روس اور امریکہ دونوں کی مشترکہ صدارت میں بلائی گئی تھی۔ اس کانفرنس میں ایک "فوجی ورکنگ گروپ" کا قیام عمل میں لایا گیا۔ جس کا کام فریقین کی افواج کو جنگ سے علیحدہ رکھنا تھا۔ ۱۸ جنوری ۱۹۷۴ء کو اقوام متحدہ کی ہنگامی فوج کے کمانڈر کی زیر صدارت فوجی ورکنگ گروپ کا ایک اجلاس ہوا جس میں مصر اور اسرائیل کی جانب سے اپنی اپنی فوجوں کو جنگ سے علیحدگی سے متعلق ایک معاہدے پر دستخط ہوئے۔ اقوام متحدہ کی ہنگامی فوج کی مدد سے ۴ مارچ ۱۹۷۴ء کو ان ممالک کی فوجوں کی جنگ سے علیحدگی کے مرحلے کی تکمیل ہو گئی۔

اسی طرح ۳۱ مئی ۱۹۷۴ء کو اسرائیل اور شام کے درمیان ایسا ہی معاہدہ طے پایا جیسا کہ مصر اور اسرائیل کے مابین طے پایا تھا۔ امن فوج کی مدد سے ۲۵ جون ۱۹۷۴ء تک اس علاقے سے افواج کا انخلا ہو گیا اور اس خطے میں مکمل امن و سکون بحال ہو گیا۔ جنرل اسمبلی نے نومبر ۱۹۷۴ء کو مشرق وسطی کے مسائل سے متعلق ایک قرارداد منظور کی جس میں فلسطینیوں کی حق خود ارادیت اور قومی آزادی اور خود مختاری کا اعادہ کیا گیا۔ اسمبلی نے فلسطین کی تنظیم آزادی کو بھی اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کی دعوت دی تھی۔ مشرق وسطی کے مسئلے کا فلسطینی عنصر ۷۶-۱۹۷۵ء کے دوران بہت زیادہ توجہ کا مرکز رہا ۱۹۷۵ء میں جنرل اسمبلی نے عرب علاقوں پر اسرائیل کے مسلسل قبضے کی مذمت کی اور تمام ممالک سے درخواست کی کہ

"جب تک اسرائیل عرب علاقوں پر قابض رہتا ہے اور فلسطینی عوام کو ان کے ناقابل انتقال قومی حقوق سے محروم رکھتا ہے وہ اسے فوجی اور اقتصادی امداد دینے سے باز رہیں"۔

فلسطین کے مسئلے کے حل کے لئے اسمبلی نے ایک ۲۳ رکنی کمیٹی تشکیل دی۔ اس کمیٹی نے جنرل اسمبلی کو سفارشیں پیش کیں کہ ۱۹۶۷ء میں جن عرب علاقوں پر اسرائیل نے قبضہ کر لیا تھا۔ وہ علاقے اسرائیلی افواج کو تنظیم آزادی فلسطین کے حوالے کر دینے چاہیں۔ تاکہ وہ اپنی آزاد اور خود مختار حکومت قائم کر سکے۔ اسمبلی نے ۱۹۷۶ء میں اس سفارش کی توثیق کر دی اور اسرائیلی اقدام پر افسوس کا اظہار کیا۔ مثلاً اسرائیلی بستیوں کا قیام، عرب باشندوں کا اخراج، عرب املاک کی ضبطی، مذہبی اور خاندانی حقوق میں مداخلت وغیرہ۔

سابق امریکی صدر جمی کارٹر نے مارچ ۱۹۷۹ء کو مشرق وسطی میں قیام امن کے سلسلے میں

مصر اور اسرائیل کے درمیان کیمپ ڈیوڈ سمجھوتہ کروا دیا تھا لیکن ۱۹۸۲ء میں اسرائیل نے لبنان پر حملہ کر کے اس امن کو خطرے میں ڈال دیا تھا۔ ۱۵ ستمبر ۱۹۸۲ء کو اسرائیل نے صابرہ اور شطیلا کیمپوں پر نہتے فلسطینیوں پر مظالم کیئے اور یہ جھڑپیں ۱۹۸۴ء تک جاری رہیں اسرائیل لبنان کی تقسیم چاہتا ہے اس سے اسرائیل کو یہ فائدہ پہنچے گا کہ اس کی سرحدوں میں اضافہ ہوگا۔ اور مسلمانوں کے دشمن لبنانی عیسائی بھی اس کی گود میں آگریں گے۔ اس سے فلسطین کے مجاہدین کی جدوجہد آزادی متاثر ہوگی۔ اسرائیل اپنے عزائم میں اس لئے کامیاب ہو رہا ہے کہ عربوں میں اتحاد نہیں ہے۔ اِس وقت جنوبی لبنان پر اسرائیل کا قبضہ ہے اور نام نہاد گرین لائن کے ساتھ جھڑپیں ہوتی رہتی ہیں۔

جون/جولائی ۱۹۸۴ء میں شام کے صدر حافظ الاسد کی کوششوں سے جناب رشید کرامے کی سربراہی میں عیسائیوں اور مسلمانوں کی ایک مشترکہ حکومت قائم ہوگئی۔ اس کی بڑی وجہ لڑائی میں امریکی میرین کی پسپائی، اسرائیل کا داخلی اقتصادی بحران اور مسلمان ملیشاؤں کی حیرت انگیز جنگی کامیابیاں ہیں۔ رشید کرامی چاہتے ہیں کہ لبنان کی ایک متحد فوج تیار کرلی جائے جس میں مسلمان اور عیسائی برابر ہوں۔ اس وقت لبنان کی سرکاری فوج تقریباً فلانجسٹ عیسائیوں پر ہی مشتمل ہے جسے مسلمان جانبدار فوج کہتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ وزیراعظم جناب رشید کرامے نے خانہ جنگی کو ختم کرانے اور بیروت کو ازسرنو متحد کرنے میں ابتدائی کامیابی حاصل کرلی ہے لیکن مبصرین کا کہنا ہے کہ جب تک فوج میں مکمل اصلاح کا کام نہیں ہوجاتا اور لبنانی عیسائی آئینی تبدیلیوں کو ذہنی طور پر تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہو جاتے اس وقت تک لبنان کی سرزمین پر خانہ جنگی کا خطرہ منڈلاتا رہے گا۔

۴ تخفیف اسلحہ

اسلحہ کی تخفیف کے سلسلے میں اقوام متحدہ کی یہی کوشش رہی ہے کہ عام اور خاص مکمل تخفیف اسلحہ پر سمجھوتا ہوجائے لیکن متعلقہ ریاستوں کے اختلاف کی وجہ سے اب تک اس سلسلے میں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔

۲۹ جنوری ۱۹۴۶ء کو U.N.O کی جنرل اسمبلی نے تخفیف اسلحہ سے متعلق پہلی تجویز منظور کی۔ اور اس کو اقوام متحدہ کے مقاصد میں شامل کیا۔ اس ضمن میں اقوام متحدہ نے دو کمیشن مقرر کیئے۔

۱۔ جوہری توانائی کا کمیشن

۲۔ عام ہتھیاروں کے استعمال سے متعلق کمیشن

جنرل اسمبلی نے ۱۹۵۲ء کو ان دونوں اداروں کو ختم کرکے ان کی جگہ ایک واحد ادارہ تخفیف اسلحہ کے نام سے سلامتی کونسل کے ماتحت قائم کر دیا۔ ۲۰ ر نومبر ۱۹۵۹ء میں جنرل اسمبلی نے اتفاق رائے سے یہ اعلان کیا کہ اسلحہ میں عام اور مکمل تخفیف کا سوال سب سے اہم مسئلہ ہے جو دنیا کو درپیش ہے۔ ۲۰ ر دسمبر ۱۹۶۱ء کو جنرل اسمبلی نے اتفاق رائے سے اس مشترکہ بیان کا خیر مقدم کیا جو روس اور امریکہ کی حکومتوں کی منظوری سے جاری ہوا۔ جس میں وہ اصول طے ہوئے تھے۔ جن کی بنیاد پر مکمل تخفیف اسلحہ کے لئے گفت و شنید ہونی تھی علاوہ ازیں اٹھارہ ملکوں کے نمائندوں پر مشتمل تخفیف اسلحہ کمیشن کی اطلاع کمیٹی کا قیام عمل میں آیا۔ اس کمیٹی میں برما، بھارت، حبشہ، فرانس، اٹلی، برازیل، پولینڈ، بلغاریہ کینیڈا، میکسیکو، چیکوسلواکیہ، نائیجیریا، سویڈن، متحدہ عرب جمہوریہ، رومانیہ، روس، برطانیہ اور امریکہ شامل ہوئے۔ اسمبلی اور تخفیف اسلحہ کی اطلاعی کمیٹی نے مارچ ۱۹۶۲ء میں جنیوا میں اپنے اجلاس شروع کر دیئے ان اجلاسوں میں فرانس کے علاوہ تمام ممالک کی شرکت ہوتی رہی۔ بہر حال فرانس کا رویہ مثبت رہا اس کمیٹی کی سب سے نمایاں کامیابی یہ رہی کہ ۱۰ر جون ۱۹۶۳ء کو روس اور امریکہ نے باہمی مفادات کے ایک معاہدے پر دستخط کئے۔ جس کی رُو سے ماسکو اور واشنگٹن کے درمیان چوبیس گھنٹے کھلی رہنے والی ٹیلی فون لائن قائم کر دی گئی تاکہ اتفاقی حادثے کے طور پر جنگ چھڑ جانے کا خطرہ نہ رہے۔

جولائی ۱۹۶۳ء کو ماسکو میں روس، امریکہ اور برطانیہ کا ایک اجلاس ہوا جس میں فضاء، بالائی خلا اور سمندر میں ایٹمی اسلحہ کے تجربات کی مخالفت کی گئی۔ اکتوبر میں اس معاہدہ کا اقوام متحدہ میں اندراج ہوا اس کی سو سے زائد ممالک نے توثیق کر دی۔

۱۹۶۶ء میں ایٹمی ہتھیاروں کے پھیلاؤ کو روکنے اور بالائی خلا سے ایٹمی اسلحہ کے استعمال پر پابندی کا جنرل اسمبلی کے اکیسویں اجلاس میں خیر مقدم کیا گیا اور طے یہ پایا کہ خلا میں کوئی بھی اپنی خود مختاری کا دعویٰ نہیں کرے گا۔ اس کے بعد ہی جنوری ۱۹۶۷ء میں اس معاہدہ پر ماسکو، لندن اور واشنگٹن میں دستخط کئے گئے۔

۱۹۶۸ء میں جنرل اسمبلی نے دوسری قراردادیں منظور کیں جن میں تمام ممالک سے

جینوا کے منشور ۱۹۲۵ء کے اصولوں پر سختی سے کاربند رہیں جس کے تحت جنگ کے دوران گیس اور اور مہلک جراثیمی اسلحہ کے استعمال کی ممانعت کر دی گئی تھی۔

مئی ۱۹۷۲ء میں روس اور امریکہ کے مابین ایک معاہدے پر دستخط ہوئے جس کے تحت دور مار کرنے والے میزائلوں کے نظام کی تنصیب اور ان کی تعداد کم کرنے نیز جارحانہ میزائلوں کی تعداد میں مناسب کمی کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔

۱۹۷۴ء کو دونوں طاقتیں دور مار کرنے والے میزائلوں کے نظاموں کی تنصیب میں مزید کمی کرنے اور ۱۹۸۵ء تک جنگی اہمیت کے حامل ہتھیاروں کی حد بندی سے متعلق زیادہ مکمل اقدامات کے رہنما اصولوں پر رضامند ہو گئیں چونکہ ان رہنما اصولوں پر مزید کوئی اقدام نہ ہوا۔ اس لئے جنرل اسمبلی نے گذشتہ ۳ سالوں میں "مثبت نتائج کے فقدان" پر ۱۹۷۶ء کے اجلاس میں افسوس کا اظہار کیا۔ اور تخفیف اسلحہ کے معاملات میں ماضی کی نسبت زیادہ توجہ صرف کی ان میں ایٹمی اسلحہ کے تجربات پر پابندی سے لے کر ایٹمی ہتھیاروں سے پاک خطوں کے قیام اور فوجی اخراجات کی تخفیف کے موضوعات پر قراردادیں منظور کیں۔ ناوابستہ ممالک کے سربراہوں کی پانچویں کانفرنس جس کا انعقاد کولمبو (سری لنکا) میں ۱۹۷۶ء میں ہوا تھا اس کی سفارش پر اسمبلی نے تخفیف اسلحہ کے لئے علیحدہ خصوصی اجلاس بلانے کا فیصلہ کیا جس کا انعقاد جون ۱۹۷۸ء کو نیویارک کے مقام پر ہوا۔ اس اجلاس میں کوئی مثبت نتائج برآمد نہ ہونے کے باعث جنرل اسمبلی نے جولائی ۱۹۸۲ء کو تخفیف اسلحہ کا دوسرا خصوصی اجلاس ۵ ہفتوں کے لئے طلب کیا اس میں فیصلہ کیا گیا . . . کہ ایٹمی ممالک اپنے فوجی اخراجات اور ایٹمی ہتھیاروں میں کمی کر دیں۔ اس اجلاس میں ۱۵۷ ممالک کے وفود نے شرکت کی۔ ان کے درمیان گہرے اختلافات ہونے کی وجہ سے یہ خصوصی اجلاس بھی بغیر کسی نتیجے کے ختم ہو گیا۔ اس کانفرنس کے اجلاس میں ڈی کوئیار نے اخبار نویسوں کو بتایا کہ۔

"اقوام عالم نے اپنی مکمل تباہی کا سامان کر لیا ہے پچاس ہزار ایٹم بموں کے ذخیرے کی طاقت ہیروشیما پر گرائے جانے والے ایٹم بم کے مقابلے میں دس لاکھ گنا زیادہ ہے۔ اسلحہ کے موجودہ ذخیرے کے علاوہ اس وقت سالانہ چھ سو ارب ڈالر کے اسلحہ کی مسابقت پر خرچ کئے جا رہے ہیں جب کہ ترقی پذیر ممالک میں ۴۰ ہزار بچے ناکافی غذا اور ناکافی سہولتوں کی وجہ سے

روزانہ مر جاتے ہیں"۔

۵ نسلی امتیاز کا مسئلہ RACIAL PROBLEMS

جمہوریہ جنوبی افریقہ کی نسلی امتیاز کی پالیسیوں کا مسئلہ کسی نہ کسی شکل میں ۱۹۴۹ء سے اقوام متحدہ کے سامنے وقتاً فوقتاً پیش ہوتا رہا ہے ۱۹۵۰ء سے ۱۹۶۰ء تک جنرل اسمبلی نے جنوبی افریقہ کی حکومت سے کئی بار اپیل کی کہ وہ اقوام متحدہ کے منشور کے فیصلوں کی روشنی میں اس سلسلے میں اپنی پالیسی پر نظر ثانی کرے۔ لیکن جنوبی افریقہ اسے اپنا داخلی معاملہ قرار دیتا ہے ۱۹۶۲ء میں جنرل اسمبلی نے تمام ممالک سے مکمل بائیکاٹ کی درخواست کی جنرل اسمبلی نے صورت حال پر برابر نظر رکھنے کے لئے ایک خصوصی کمیٹی قائم کردی۔ ۱۹۶۳ء میں سلامتی کونسل نے تمام ملکوں سے کہا کہ وہ جنوبی افریقہ کے لئے ہتھیاروں، گولہ بارود اور فوجی گاڑیوں کی فروخت اور رسد روک دیں، کونسل اور اسمبلی دونوں نے جنوبی افریقہ کی حکومت سے کہا کہ ان تمام لوگوں کو جنھیں نسلی امتیاز کی مخالفت کی وجہ سے جیل بھیجا گیا ہے چھوڑ دیا جائے۔ ۱۹۶۵ء میں جنرل اسمبلی نے دوسرے ممالک اور تجارتی اداروں کو جنوبی افریقہ سے تجارتی بائیکاٹ کرنے کی درخواست کی ۱۹۶۶ء میں جنرل اسمبلی نے جنوبی افریقہ کی نسل پرست پالیسیوں کی مذمت کی اور انھیں انسانیت کے خلاف ایک بہت بڑا جرم قرار دیا۔

۱۹۶۶ء میں اسمبلی نے نسلی امتیاز کے خلاف اطلاعات و اقدامات کی ایک بھرپور مہم چلانے کا مطالبہ کیا اور تمام ممالک سے اپیل کی کہ وہ اقوام متحدہ کے منشور میں تسلیم شدہ حقوق کے لئے جنوبی افریقہ کے عوام کی جائز جدوجہد میں ان کو اخلاقی، سیاسی اور مادی امداد فراہم کریں۔ اسمبلی نے اس پر تشویش کا اظہار کیا نسلی قوانین کا دائرہ نمیبیا اور جنوبی رہوڈیشیا (زمبابوے) تک پھیلتا جا رہا ہے۔ چنانچہ دسمبر ۱۹۶۸ء میں سلامتی کونسل پر زور دیا گیا کہ وہ جنوبی افریقہ کے حالات پر فوری طور پر دوبارہ غور کرنا شروع کردے۔ جولائی ۱۹۷۰ء میں سلامتی کونسل نے اسلحہ پر پابندی کی خلاف ورزیاں کرنے والے تمام ممالک کی مذمت کی اور تمام ممالک سے اپیل کی کہ وہ اسلحہ پر پابندی کو مستحکم کریں۔ نومبر ۱۹۷۱ء میں جنرل اسمبلی نے اعلان کیا کہ جنوبی افریقہ کے خلاف اسلحہ کی ترسیل پر جو پابندی لگائی گئی ہے اس میں بیرونی دفاع کے لئے اسلحے اور داخلی دباؤ کے لئے اسلحے کے درمیان کوئی خط امتیاز نہیں کھینچا گیا۔

۱۹۷۳ء میں جنرل اسمبلی نے نسلی امتیاز کے جرم کے انسداد اور اس کی تعزیر سے

متعلق عالمی معاہدے کی منظوری دی یہ معاہدہ ۱۸ر جنوری ۱۹۷۶ء کو نافذ العمل ہوا۔ جنوبی افریقہ میں سیاہ فام سیاسی قیدیوں کے ساتھ ساتھ مخلوط نسل کے رنگدار سیاسی کارکنوں پر عرصہ حیات تنگ کیا جا رہا ہے۔ جنوبی افریقہ میں خصوصی امتیازی قوانین کے تحت جن افراد کی نقل وحرکت پر پابندی لگائی جاتی ہے۔ ان کی تعداد سینکڑوں میں ہے ایسے افراد کسی دوسرے شخص سے ٹیلی فون پر بھی بات چیت نہیں کر سکتے۔

یہاں یہ واضح کرتا جاؤں کہ جنوبی افریقہ کی نسل پرست حکومت سیاہ فام خواتین پر بھی مظالم ڈھا رہی ہے ۱۹۸۰ء کے آخر تک اس امانتی فنڈ میں جو ۱۹۶۵ء میں قائم کیا گیا تھا۔ اس میں رضاکارانہ عطیات جو موصول ہوئے ان کی مجموعی مالیت ایک کروڑ ۱۴ر لاکھ ۶۷ر ہزار ۲ر سو ڈالر تھی اس وقت بہت سی خواتین اور بچے اس امانتی فنڈ کے توجہ کا مرکز ہیں۔ ان خواتین کا کہنا ہے کہ

"ہم اکثریتی راج سے التجاء نہیں کر رہی ہیں یہ تو ہمارا حق ہے اسے تو ہم بہر حال حاصل کر کے رہیں گے ہمیں اچھی طرح یہ علم ہے کہ ہمارا یہ رستہ بڑا کٹھن ہے لیکن ہم عدل وانصاف کے لئے آخری دم تک اپنی جدوجہد جاری رکھیں گے

ہر سال ۲۱ر مارچ کو اقوام متحدہ نسلی امتیاز کے خاتمے کا عالمی دن مناتی ہے اسی دن ۲۱ مارچ ۱۹۶۰ شارپ ویل کے مقام پر ۶۹ افریقی مظاہرین کے قتل عام کا بھیانک واقعہ پیش آیا تھا۔

۲۱ر مارچ ۱۹۸۹ء کے عالمی دن کے موقعہ پر سیکریٹری جنرل ڈی کوئیار کا پیغام!

"یہ غیر منصفانہ اور ظالمانہ نظام صرف بین الاقوامی قانون اور منشور کے بنیادی اصولوں کی نفی کرتا ہے بلکہ فی الحقیقت بنی نوع انسان کا مشترکہ کنبہ ہونے کے تصور ہی کے خلاف ہے۔

۶- نمیبیا NEMEBIA

ڈیموکریٹک ترنہال اتحاد جنوبی افریقہ کی زیر سرپرستی نمیبیا پر حکومت کر رہا ہے۔ مغربی رابطہ گروپ کی سفارتی سرگرمیوں کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ جنوبی افریقہ اور ڈیموکریٹک ترنہال اتحاد کو بین الاقوامی طے شدہ منصوبے کے تحت جنگ بندی پر راضی کر لیا جائے۔ اور پھر اقوام متحدہ کی زیر نگرانی نمیبیا میں الیکشن کروائے جائیں۔ لیکن جنوبی افریقہ کو اعتراض اس بنیاد پر ہے کہ اقوام متحدہ کی نگرانی میں "سواپو" کو اس طرح اکثریت سے کامیابی حاصل ہو جائے گی جیسے کہ ۱۹۸۰ء میں زمبابوے کے انتخابات میں "زانو" جیت گئی تھی۔

جنرل اسمبلی نے اکتوبر ۱۹۶۶ء میں جنوبی افریقہ کے وہ اختیارات ختم کر دیئے جو نمیبیا کے بارے میں اس کو حاصل تھے۔ مئی ۱۹۶۷ء میں ایک خصوصی اجلاس میں جنوب مغربی افریقہ کے لئے اقوام متحدہ نے ایک کونسل قائم کر دی جو بعد میں "کونسل برائے نمیبیا" کے نام سے موسوم ہوئی۔ اور وہاں کے باشندوں کی خواہش کے مطابق آزادی کی قطعی تاریخ جون ۱۹۶۸ء مقرر کی گئی لیکن اپریل میں جنوبی افریقہ نے نمیبیا سے متعلق کونسل کو علاقے میں داخل ہونے اور ونڈہوک WIND HOEK میں ہیڈ کوارٹر قائم کرنے سے روک دیا۔ اس پر جون میں جنرل اسمبلی نے یہ سفارش کی کہ نمیبیا سے جنوبی افریقہ کو خارج کرنے اور اسے آزاد کرانے کے لئے سلامتی کونسل فوری اقدامات کرے۔ ۱۹۶۷ء کے بعد سلامتی کونسل اقوام متحدہ کی قراردادوں پر عمل درآمد سے جنوبی افریقہ کے انکار کی بارہا مذمت کر چکی ہے ۱۹۷۲ء میں سیکریٹری جنرل والڈ ہائیم کے ساتھ جنوبی افریقہ کے حکام کے ناکام مذاکرات بھی ہوئے۔

اگست ۱۹۷۶ء میں جنوبی افریقہ کی نسل پرست حکومت نے سیکریٹری جنرل کو ایک بیان کا متن ارسال کیا۔ جو جنوبی افریقہ کی آئینی کانفرنس کی آئینی کمیٹی کی جانب سے جاری کیا گیا تھا۔ اس کے مطابق ۳۱ دسمبر ۱۹۷۸ء کو آزادی کے لئے ایک ممکنہ تاریخ قرار دیا گیا تھا۔ اور اس میں ایک ایسے نظام حکومت کو بروئے کار لانے کا امکان ظاہر کیا گیا تھا۔ جس میں خصوصاً مجوزہ مرکزی حکومت میں اقلیتی گروہوں کے "مناسب تحفظ" کا خاطر خواہ انتظام تھا۔ جنوب مغربی افریقہ اور جنوبی افریقہ کے مختلف مذاکرات کی تکمیل کے بعد اس نظام کا قیام عمل میں آنا تھا۔ کونسل برائے نمیبیا نے ان تجاویز کو مبہم ہونے کی وجہ سے مسترد کر دیا

۷۔ زمبابوے ZIMBABWE

جنرل اسمبلی نے ۱۹۶۲ء میں اس امر کا اعادہ کیا کہ اقوام متحدہ کے منشور کے مطابق زمبابوے ایک محکوم علاقہ ہے لیکن برطانیہ کا اصرار تھا کہ یہ خود مختار علاقہ ہے جس کی وجہ سے برطانیہ اس کے اندرونی معاملات میں مداخلت نہیں کر سکتا ۱۹۶۲ء سے ۱۹۶۴ء تک جنرل اسمبلی نے کئی قراردادیں منظور کیں جن میں برطانیہ سے کہا گیا کہ وہ زمبابوے کے ۱۹۶۱ء کا آئین معطل کر دے جس کے تحت افریقی اکثریت کو حق رائے دہی سے محروم کر دیا گیا تھا۔ ۱۱ نومبر ۱۹۶۵ء کو زمبابوے کی اقلیتی حکومت نے یکطرفہ اعلان آزادی کر دیا۔ اگلے روز جنرل

اسمبلی کی سفارش پر سلامتی کونسل نے اس یکطرفہ اعلان آزادی کی مذمت کی اور تمام ممالک سے "نسل پرست اقلیتی حکومت" کو تسلیم نہ کرنے کا مطالبہ کیا اور برطانیہ سے یہ مطالبہ کیا کہ غاصبوں کے اختیارات کو ختم کرنے کے لئے مناسب کاروائی کی جائے نیز ایسے اقدامات کئے جائیں جن کے تحت جنوبی رہوڈیشیاء کے عوام اعلانِ آزادی کی روشنی میں اپنے مستقبل کے بارے میں فیصلہ کر سکیں۔

۲ مارچ ۱۹۷۰ء کو رہوڈیشیاء نے جنرل اسمبلی کے فیصلوں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے برطانیہ کے ساتھ اپنے تعلقات قطعی طور پر ختم کر دیئے اور اپنے آپ کو جمہوریہ قرار دے دیا ۱۹۷۱ء میں جنرل اسمبلی نے برطانیہ کی حکومت اور جنوبی رہوڈیشیا کی ناجائز حکومت کی جانب سے طے شدہ "تجاویز برائے تصفیہ" کو یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ یہ زمبابوے کے افریقی عوام کے ناقابل انتقال حق خود ارادیت اور آزادی کی صریح خلاف ورزی ہے۔

۱۹۷۵ء میں جنرل اسمبلی نے مطالبہ کیا کہ یہ ناجائز اور نسل پرست حکومت آزادی کی جنگ ہارنے والوں کو قتل کرانے سے باز رہے۔ سیاسی آزادی اور اس سلسلے میں حراست میں لئے گئے دوسرے لوگوں کو غیر مشروط طور پر رہا کر دے۔ ایک بار پھر جنرل اسمبلی نے دنیا بھر کے ممالک سے اپیل کی کہ وہ زمبابوے کی قومی تحریک کو مالی، سیاسی، اقتصادی اور اخلاقی امداد دیں۔

مئی ۱۹۷۷ء میں زمبابوے اور نمیبیا کے عوام کی حمایت میں اقوام متحدہ کے زیر اہتمام ایک عالمی کانفرنس کا انعقاد "موزمبیق" میں ہوا۔ اس کانفرنس میں باہمی اتفاق رائے سے ان علاقوں کو آزادی دلانے کے لئے ایک منشور اور عملی پروگرام کو منظور کیا آخر ۱۹۷۹ء میں جنوبی رہوڈیشیا میں قومی تحریک نے کامیابی حاصل کی اور زمبابوے کے نام سے ایک علیحدہ آزاد مملکت قائم ہو گئی اور اس کے پہلے وزیر اعظم تحریک کے سرگرم رکن لیڈر مسٹر رابرٹ موگابے بنے۔

۸ - کوریا

دوسری جنگ کے خاتمے پر ۱۹۴۵ء میں ہی شمالی کوریا پر روس کا اور جنوبی کوریا پر امریکہ کا قبضہ ہو گیا۔ امریکہ اور روس نے ایک مشترکہ کمیشن قائم کیا تاکہ کوریا میں کوئی عارضی جمہوری حکومت بنائی جا سکے لیکن یہ مشترکہ کمیشن کسی نتیجے

پر نہ پہنچ سکا۔ امریکہ نے ۱۹۴۷ء میں اقوام متحدہ کے سامنے یہ مسئلہ پیش کیا۔ اقوام متحدہ کی کوشش تھی کہ قومی پیمانے پر انتخاب کے ذریعہ متحدہ ریاست قائم ہو جائے۔ لیکن یہ کوشش کامیاب نہ ہوئی جس کی وجہ سے ۱۹۴۸ء میں شمالی اور جنوبی کوریا میں الگ الگ حکومتیں وجود میں آئیں۔ ۲۵ جون ۱۹۵۰ء کو امریکہ اور اقوام متحدہ کے کمیشن برائے کوریا دونوں نے اقوام متحدہ کو مطلع کیا کہ شمالی کوریا کی فوجوں نے جنوبی کوریا پر حملہ کر دیا ہے۔ اسی دن سلامتی کونسل کا اجلاس ہوا جس میں اعلان کیا گیا کہ مسلح حملہ صلح کے سمجھوتے کی خلاف ورزی ہے۔ کونسل نے جنگ بندی کا مطالبہ کیا۔ لڑائی کا یہ سلسلہ جاری تھا کہ ۲۷ جون ۱۹۵۰ء کو سلامتی کونسل نے سفارش کی کہ ممبر ممالک جنوبی کوریا کو ایسی امداد فراہم کریں جو مسلح حملہ کو روکنے اور علاقے میں بین الاقوامی امن اور سلامتی کی فضاء بحال کرنے کے لئے ضروری ہو۔ امریکی حکومت نے اسی دن اپنی فضائی اور بحری افواج کو حکم دیا کہ وہ جنوبی کوریا کی حکومت کی مناسب امداد کریں نیز بعد میں امریکہ نے بری فوج کو کاروائی کرنے کا حکم دے دیا۔

۷ جولائی ۱۹۵۰ء کو سلامتی کونسل کے فیصلے کے مطابق سولہ ممالک آسٹریلیا، بلجیم، کینیڈا، کولمبیا، ایتھوپیا، فرانس، برطانیہ، یونان، لکسمبرگ ہالینڈ، فلپائن، نیوزی لینڈ تھائی لینڈ، ترکی، جنوبی افریقہ، امریکہ نے اپنی اپنی فوجیں بھیجیں۔ ان کے علاوہ ڈنمارک اٹلی، بھارت، ناروے اور سویڈن نے طبی دستے بھی فراہم کئے۔ جمہوریہ کوریا نے بھی اپنی ساری فوجی قوت اقوام متحدہ کے زیر کمان کر دی۔ روس، چین کی رکنیت کے سوال پر احتجاجاً کونسل کے اجلاسوں سے غیر حاضر رہا جس کی وجہ سے روس اور اس کے حلیفوں نے ان فیصلوں کو ماننے سے انکار کر دیا۔ ۶ نومبر ۱۹۵۰ء کو امن فوج نے سلامتی کونسل کو مطلع کیا کہ عوامی جمہوریہ چین بھی شمالی کوریا کی جانب سے اس جھگڑے میں شامل ہو گیا ہے۔

جنوری ۱۹۵۲ء میں سلامتی کونسل نے اتفاق رائے سے اس ایجنڈے کو ہٹا دیا لیکن مسئلہ جنرل اسمبلی کے ایجنڈے میں بھی شامل تھا۔ جنرل اسمبلی نے یکم فروری ۱۹۵۱ء کو قرارداد کے ذریعے چین کو جارح قرار دیا۔ کوریا کی لڑائی ۲۰ جولائی ۱۹۵۳ء تک جاری رہی اس کے بعد عارضی صلح کے ایک معاہدے پر دستخط ہو گئے۔ اس معاہدے کی رو سے ایک سال بعد ایک سیاسی کانفرنس منعقد ہوئی لیکن یہ کانفرنس کوریا کے مسئلے کا کوئی سیاسی حل تلاش کرنے میں ناکام رہی۔ کوریا کی عام بحالی اور اس کے اتحاد کے لئے اقوام متحدہ کا ایک کمیشن ۱۹۷۳ء تک اس ملک میں

مصروف رہا۔

۴ جولائی ۱۹۷۲ء کو شمالی اور جنوبی کوریا نے مشترکہ اعلامیہ جاری کیا جس میں کوریا کے دوبارہ اتحاد سے متعلق تین اصولوں کا ذکر کیا گیا۔

- • آزادانہ اتحاد غیر ملکی امداد پر انحصار کئے بغیر
- • پرامن ذرائع سے اتحاد۔
- • عظیم اتحاد کے لئے مسلسل کام

۱۹۷۴ء میں جنرل اسمبلی نے شمالی کوریا پر زور دیا وہ پرامن اتحاد کو جلد از جلد معرض وجود میں لانے کے لئے اپنے مذاکرات جاری رکھے اور جب دونوں ممالک میں اتحاد کی فضاء قائم ہو جائے گی تو اس وقت سلامتی کونسل اقوام متحدہ کی کمان کی تنسیخ کے معاملے پر غور کرے گی۔

۹ کانگو CONGO

جمہوریہ کانگو نے ۳۰ جون ۱۹۶۰ء کو بلجیم سے آزادی حاصل کی۔ آزادی کے بعد وہاں سماجی انتشار اور بدامنی کا دور شروع ہو گیا جس کی وجہ سے حکومت بلجیم نے کانگو میں اپنی فوجیں بھیج دیں۔ موقف یہ اختیار کیا کہ یورپی باشندوں کو وہاں سے نکالنے کے لئے یہ قدم اٹھایا گیا ہے۔

۲۲ جولائی کو کانگو کی حکومت نے اقوام متحدہ سے فوجی امداد طلب کی تاکہ کانگو کی قومی سلامتی و خودمختاری کا تحفظ ممکن ہو سکے۔ ۱۴ جولائی کو سلامتی کونسل نے بلجیم کو کانگو سے اپنی فوجیں ہٹانے کو کہا نیز سیکریٹری جنرل کو کونسل نے اختیار دے دیا کہ وہ حکومت کانگو کو اقوام متحدہ کی طرف سے فوجی اور فنی امداد دیں۔ تاکہ وہ اپنی ذمہ داریاں سنبھال سکے۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے ۲۰ ہزار سے زیادہ افسران اور جوانوں کی ایک فوج کانگو بھیجی گئی۔ ایک ہزار تین سو غیر فوجی ماہرین اس کے علاوہ تھے ان کے لئے سلامتی کونسل کو سب سے بڑی ہدایت یہ تھی کہ کانگو میں بیرونی مداخلت نہ ہونے پائے خاص طور پر کٹنگا سے کرائے کے غیر ملکی فوجی نکال دیئے جائیں جن کی وجہ سے ملک کی علاقائی سالمیت کو خطرہ لاحق ہے۔ فروری ۱۹۶۳ء میں یہ علاقہ دوبارہ کانگو کی قومی حدود میں آ گیا۔ ۳۰ جون ۱۹۶۴ء کو تمام فوجیں واپس چلی گئیں کیونکہ ان فوجوں کا مزید وہاں رہنا خود کانگو کے حق میں بہتر نہ تھا۔ فوجیں واپس بلانے کے باوجود

اقوام متحدہ نے کانگو کی غیر فوجی یعنی اقتصادی امداد جاری رکھی۔ اس سے قبل اقوام متحدہ نے اتنا بڑا پروگرام کبھی شروع نہیں کیا تھا۔

۱۰ مغربی ایریان WEST ARIAN (مغربی نیوگنی)

انڈونیشیا نے ۱۹۴۹ء میں جب نیدرلینڈ سے آزادی حاصل کی تو مغربی ایریان کے مستقبل کا فیصلہ ہوئے بغیر رہ گیا ۱۹۵۴ء میں انڈونیشیا نے یہ معاملہ اقوام متحدہ میں پیش کیا۔ نیدرلینڈ کا موقف یہ تھا کہ وہاں پر انڈونیشی آبادی نہیں ہے جس کی وجہ سے اس علاقے کو اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنا چاہیے۔ جنرل اسمبلی کے کئی اجلاسوں میں اس معاملے پر غور ہوا لیکن کوئی تصفیہ نہ ہوسکا دسمبر ۱۹۶۱ء میں دونوں ملکوں کے مابین جنگ چھڑ گئی تو قائم مقام جنرل سیکریٹری مسٹر اوتھانٹ نے دونوں حکومتوں سے استدعا کی کہ مصالحت کے پرامن طریقے اختیار کئے جائیں۔ چنانچہ اقوام متحدہ کی اعانت سے مذاکرات شروع ہوئے۔ ۱۵ اگست ۱۹۶۲ء کو کو ایک معاہدے پر دستخط ہوگئے۔ اور لڑائی رک گئی۔ معاہدے میں طے یہ پایا کہ ۱۹۶۳ء میں یہ علاقہ انڈونیشیا کے حوالے کردیا جائے گا اور ۱۹۶۹ء میں وہاں استصواب رائے ہوگا۔ اقوام متحدہ نے اس طے شدہ پروگرام کو عملی جامہ پہنایا۔

۱۱۔ نوآبادیاتی نظام کا خاتمہ THE END OF COLONIAL SYSTEM

نوآبادیاتی نظام کے خاتمے کے لئے اقوام متحدہ کی کوششیں باعث تحسین ہیں۔ اقوام متحدہ کے معرض وجود میں آنے کے بعد ۷۰ سے زیادہ علاقے آزاد اور خودمختار ممالک کی حیثیت سے اقوام متحدہ کے ممبر بن چکے ہیں اقوام متحدہ کی یہ کوششیں اس کے عالمی منشور پر مبنی ہیں۔ اس میں لوگوں کے مساوی حقوق اور حق خود ارادیت کے اصولوں پر زور دیا گیا ہے۔

۱۹۶۰ء میں اقوام متحدہ نے ایک اعلان جاری کیا جس میں نوآبادیات کی آزادی کی حمایت کی گئی جس کی وجہ سے ممبر ممالک نے اس نظام کے خاتمے کیلئے اپنی کوششیں تیز کردیں لیکن اس کے باوجود دنیا میں آج بھی کوئی ایک کروڑ کے لگ بھگ افراد غیر ملکی راج کے تحت زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ان میں اریٹریا، مکاؤ، فاک لینڈ اور گرین لینڈ وغیرہ کی نوآبادیاں سرفہرست ہیں۔

۱۲۔ بین الاقوامی امانتی نظام INTERNATIONAL TRUSTEESHIP SYSTEM

وہ علاقے جو انفرادی سمجھوتوں کے تحت اقوام متحدہ کی امانت میں آئے ان کے نظم و نسق کے لئے ایک بین الاقوامی امانتی نظام قائم کیا اس نظام کا اطلاق حسب ذیل علاقوں پر ہوتا

ہے۔

——۔ وہ علاقے جو مجلس اقوام کے انتداب میں تھے

——۔ وہ علاقے جو دوسری جنگ کے نتیجے میں دشمن ممالک کے تسلط سے نکالے گئے

——۔ وہ علاقے جنھیں ان کے حکمران ملکوں نے رضاکارانہ طور پر بین الاقوامی امانتی کونسل کے حوالے کر دیا تھا۔

امانتی کونسل ان کے نظم ونسق کی دیکھ بھال کرتی ہے اس امانتی کونسل نے کل ۱۱ علاقوں کو اپنے انتداب میں لیا ان میں سے ۱۰ علاقے آزاد ہو چکے ہیں تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) فرانسیسی ٹوگولینڈ (۲) برطانوی ٹوگولینڈ (۳) فرانسیسی کیمرون (۴) برطانوی کیمرون (۵) برطانوی ٹانگانیکا (۶) بلیجم کا علاقہ روانڈا ارنڈی (۷) نیوزی لینڈ کا مغربی ساموا (۸) نورو جس پر آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور برطانیہ کی طرف سے حکومت کرتا تھا (۹) آسٹریلیا کا پاپوا گنی (۱۰) اطالیہ کا سومالی لینڈ (۱۱) بحرالکاہل کے سابق جزائر مائکرونیشیا آخر الذکر کا انتظام امریکہ کے ہاتھ میں ہے ۱۹۷۷ء تک بقیہ دس علاقے آزاد یا پھر کسی آزاد ملک کے اتحادی بن چکے تھے۔

۱۳۔ پرتگال کے زیر انتظام علاقے TERRITORIES UNDER THE CONTROL OF PORTUGAL

نوآبادیاتی نظام کے خاتمے کے سلسلے میں اقوام متحدہ کو ایک بڑی کامیابی ۱۹۷۴ء میں اس وقت ہوئی جب حکومت کی تبدیلی کے بعد پرتگال کی جانب سے سیکرٹری جنرل کو یہ بتایا گیا کہ وہ اپنے افریقی علاقوں کی نوآبادیات کو اپنے تسلط سے آزاد کرنے کے بارے میں اقوام متحدہ کے ساتھ پوری طرح تعاون کرنے کو تیار ہے۔ اس سے پہلے ۱۹۵۵ء میں جب پرتگال اقوام متحدہ کا رکن بنا تو اس نے اپنے محکوم علاقوں سے متعلق معلومات فراہم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

یورپ کی نوآبادیاتی نظام کی سلطنتوں میں سے قدیم ترین اور آخری سلطنت کے خاتمے کا آغاز یوں ہوا۔

۱۔ گنی بساؤ ۱۰ ستمبر ۱۹۷۴ء ۲۔ موزمبیق ۲۵ جون ۱۹۷۵ء ۳۔ کیپ ورڈی ۵ جولائی ۱۹۷۵ء ۴۔ انگولا ۱۱ جولائی ۱۹۷۵ء ۵۔ ساؤ توے اور پرنسپ ۱۲ جولائی ۱۹۷۵ء

۱۴۔ ایران عراق جنگ

ایران عراق کے مابین ۲۲ ستمبر ۱۹۸۰ء کو شط العرب کی ملکیت کے مسئلے پر جنگ شروع ہوگئی۔ یہ جنگ تقریباً ۸ سال جاری رہی۔ جنگ عظیم دوئم کے بعد اس جنگ میں سب سے زیادہ جانی ومالی نقصان ہوا۔ تقریباً دو لاکھ افراد دونوں طرف سے لقمہ اجل بنے اور لاکھوں زخمی ہوئے۔ اس جنگ میں کوئی فریق اپنے مقاصد پورے نہ کر سکا۔

۱۹۱۳ء اور ۱۹۳۷ء کے ایران عراق سمجھوتوں کے مطابق شط العرب عراق کی ملکیت تھا۔ ۱۹۷۵ء میں الجزائر میں تیل پیدا کرنے والے ممالک کی سربراہ کانفرنس کے موقع پر ایران اور عراق کے مابین ایک معاہدے کے تحت شط العرب پر دونوں ممالک کا یکساں حق تسلیم کیا گیا۔ ۱۱ فروری ۱۹۷۹ء کو ایران میں انقلابی حکومت (خمینی گورنمنٹ) قائم ہوئی تو ایران کے امریکہ سے تعلقات خراب ہوگئے۔ عراق نے ان حالات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایران پر حملہ کر دیا۔

غیر وابستہ ممالک، ا۔۔۔ کانفرنس کی تنظیم اور دیگر بین الاقوامی تنظیمیں اس جنگ کو بند کرانے میں ناکام رہیں۔ جنگ بندی کے سلسلے میں بالآخر اقوام متحدہ کی کوششیں کامیاب ہوئیں اور ۲۰ اگست ۱۹۸۸ء کو ایران عراق جنگ سلامتی کونسل کی قرارداد ۵۹۸ کے تحت بند ہوگئی۔

۱۵۔ افغانستان کا بحران

دسمبر ۱۹۷۹ء کو روسی فوجیں افغانستان میں داخل ہوئیں۔ روس کی یہ فوجی مداخلت تسلیم شدہ بین الاقوامی اصولوں کے منافی تھی۔ اقوام متحدہ نے جنوری ۱۹۸۰ء میں بھاری اکثریت رائے کے ساتھ روس کی مذمت کی اور اسی سال نومبر میں روسی فوجوں کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ ۱۹۸۴ء میں پاکستان اور دوسرے ۴۶ غیر جانبدار ممالک کی ایما پر ایک قرارداد ۲۰ ووٹوں کے مقابلے میں ۱۱۹ ووٹوں سے منظور کی۔ جنرل اسمبلی کی قرارداد میں روسی فوج کی واپسی، افغانستان کی غیر جانبدارانہ اور آزاد حیثیت کی بحالی، افغان عوام کی حق رائے دہی اور مہاجرین کی حفاظت اور باعزت

واپسی پر زور دیا گیا۔

افغان بحران کے حل کے لیے جنیوا میں جون ۱۹۸۲ء سے اپریل ۱۹۸۸ء تک مذاکرات کے نو دور ہوئے۔ بالآخر ۱۴ اپریل ۱۹۸۸ء کو معاہدۂ جنیوا پر دستخط ہوئے۔ اس معاہدے کے تحت ۱۵ فروری ۱۹۸۹ء تک روس کی ایک لاکھ ۱۵ ہزار فوج افغانستان سے واپس اپنے وطن چلی گئی۔ اقوام متحدہ نے جنوبی ایشیاء میں افغانستان میں روسی مداخلت کا مسئلہ حل کر کے عالمی امن کے لیے ایک گراں قدر خدمت سرانجام دی ہے۔

۱۶۔ کویت پر عراقی قبضہ

جولائی ۱۹۹۰ء میں کویت اور عراق کے مابین تیل کی چوری اور سرحدوں پر فوجی تنصیبات کی بابت تنازعہ پیدا ہوا۔ عراق نے کویت پر الزام لگایا کہ کویت نے عراق کا ۲.۴ بلین ڈالر کا پیٹرول چوری کر لیا ہے۔ عراق نے قانونِ بین الاقوام کے ضابطوں کو نظرانداز کرتے ہوئے ۲ اگست ۱۹۹۰ء کو کویت پر قبضہ کر لیا۔ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل نے عراقی قبضہ کی مذمت کی اور عراقی فوج کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ ۲۹ نومبر کو سلامتی کونسل نے عراق کو الٹی میٹم دیا کہ اگر ۱۵ جنوری ۱۹۹۱ء تک عراقی فوجیں کویت سے واپس نہ گئیں تو عراق کے خلاف طاقت کا استعمال کیا جائے گا۔ عراق نے اس الٹی میٹم کو کوئی اہمیت نہ دی۔ ۱۷ جنوری ۱۹۹۱ء کو امریکہ برطانیہ اور فرانس کی فوج کی سربراہی میں ۳۰ ممالک کی فوج نے عراق کے خلاف کارروائی کی۔ اس جنگ کے نتیجہ میں بالآخر ۲۶ فروری کو عراق کویت خالی کرنے پہ تیار ہو گیا اور ۲۸ فروری کو امریکی صدر بش کے حکم سے جنگ بند ہو گئی۔ کویت سے عراقی فوجوں کی واپسی یقیناً اقوام متحدہ کی ایک بڑی کامیابی ہے۔

انجمن اقوام متحدہ و مجلس اقوام کے اختلافی نکات

MAIN POINTS OF DIFFERENCE BETWEEN U.N.O. AND LEAGUE OF NATIONS

مجلس اقوام اور انجمن اقوام متحدہ پر الگ الگ نظر ڈالنے کے بعد ان دونوں بین الاقوامی تنظیموں کے اختلافی نکات کا تجزیہ کیا جا سکتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اقوام متحدہ مجلس اقوام ہی کی جانشین ہے اور بنیادی طور پر ان کے مقاصد میں کوئی فرق نہیں ہے لیکن اس کے باوجود بعض اختلافی نکات موجود ہیں۔

(۱) منشور اقوام متحدہ کا ابتدائیہ مجلس اقوام کے میثاق سے مختلف ہے۔ میثاق میں مختلف حکومتوں پر بھروسہ کیا گیا ہے لیکن انجمن اقوام کے ابتدائیہ میں کہا گیا ہے۔

"ہم اقوام متحدہ کے سب افراد یہ طے کر چکے ہیں کہ آئندہ نسلوں کو جنگ کی تباہ کاریوں سے بچائیں گے"۔

اس طرح منشور جمہوری طریقہ سے صرف عوام کے بھروسے کی نمائندگی کرتا ہے اور اقوام متحدہ کے افراد نے جنگ کی روک تھام کی ذمہ داری اپنے کندھوں پر لی ہے۔

(۲) مجلس اقوام عہدنامہ ورسیلز کا حصہ تھی اور اس پر عملدرآمد کی پابند تھی۔ تمام طاقت ور قوموں نے شروع میں مجلس اقوام میں شمولیت اختیار کی۔ ان کا مقصد موجودہ علاقوں میں اضافہ کرنے کی خواہش تھی۔ لیکن اس کے مقابلے میں انجمن اقوام کا مقصد کسی ایسے عہدناموں پر عملدرآمد نہیں ہے، جو فاتح قوموں کی طرف سے تباہ حال مفتوحوں پر ٹھونسا گیا ہو بلکہ یہ متحدہ اقوام کا ایک عہد ہے جو آئندہ نسلوں کو جنگ کی تباہ کاریوں سے بچانے کے لئے کیا گیا ہے

(۳) دونوں انجمنوں کا بنیادی طور پر ایک ہی مقصد یعنی قیام امن ہے اور یہ کہ عالمی اتحاد کو ترقی دی جائے لیکن میثاق مجلس اقوام میں ان مقاصد کی انجمن اقوام کے منشور کے مقابلے میں واضح صراحت موجود نہیں تھی مجلس اقوام میں اسمبلی، کونسل اور انتدابی نظام قائم کیا گیا تھا۔ جب کہ انجمن اقوام متحدہ میں ایک نیا ادارہ معاشی و سماجی کونسل قائم کیا گیا ہے

جو مجلس اقوام میں موجود نہیں تھی ۔

(۴) اقوام متحدہ کے منشور میں رکن ریاستوں کی ذمہ داریوں کا تذکرہ ہے اور یہ عام ارکان پر منحصر ہے کہ عالمی بہتری کے لئے اپنی رکنیت سے پیدا ہونے والی ذمہ داریوں کو پورا کریں جب کہ مجلس اقوام میں ممبر ریاستوں کی ذمہ داریوں کا وسعت کے ساتھ ذکر نہیں کیا گیا ۔

(۵) مجلس کے میثاق میں معاشی و سماجی مسائل کے حل کی کوئی دفعہ موجود نہیں تھی۔ لیکن انجمن اقوام متحدہ اس بات کا اعلان کرتی ہوئی نظر آتی ہے کہ جنگ کے اثرات سے معاشی سماجی ثقافتی و انسانی مسائل کو معاشی و سماجی کونسل کے سامنے رکھا جائے گا ۔ جو ان مسائل کے مناسب حل کے لئے متعلقہ اداروں سے تعاون کرے گی ، عالمی ادارہ صحت بیماریوں سے متعلق اور عالمی بنک قرضہ جات کے مسائل کو طے کرتا ہے ۔

(۶) اقوام متحدہ کا منشور مقامی انتظامات کی دفعات مہیا کرتا ہے ۔ جس کا مقصد یہ ہے کہ مقامی طور پر تنازعات کے حل کے ادارے قائم ہوں اور عالمی امن و سلامتی قائم رہے ۔ مجلس اقوام کے میثاق میں ایسی کوئی دفعہ موجود نہیں تھی ۔

(۷) اقوام متحدہ کا منشور انسانی حقوق پر زور دیتا رہتا ہے اور انسانوں کی آزادی و بنیادی حقوق کا تعین کرنے کی سعی کرتا ہے ۔ جنرل اسمبلی نے انسانی حقوق کا اعلان بھی کیا ۔ ۱۹۵۰ء کا یورپی کنونشن برائے انسانی حقوق ایک اہم قدم ہے جو مقامی نفاذ کے لئے ہے جبکہ میثاق میں ایسی کوئی دفعہ شامل نہیں ہے ۔

(۸) میثاق میں مجلس اقوام میں ایسا کوئی اشارہ نہیں ملتا جس کے تحت انفرادی یا اجتماعی طور پر ذاتی حفاظت کی جا سکے ۔ لیکن منشور اقوام متحدہ کی دفعہ ۵۱ اس نقطے کی نہ صرف وضاحت کرتی ہے بلکہ اس کی حدود کا تعین بھی کرتی ہے اس وقت تک جب سلامتی کونسل بین الاقوامی امن کی بحالی کا مناسب طریقہ نہ اپنائے ۔ اگر کسی ریاست پر مسلح حملہ ہوتا ہے ۔ تو وہ اپنی حفاظت کا حق رکھتی ہے لیکن یہ حق صرف مسلح حملے کی صورت میں پیدا ہوتا ہے سرحدی فائرنگ وغیرہ سے نہیں تاہم اس قسم کے حفاظتی اقدامات کی اطلاع سلامتی کونسل کو فوری دینا چاہیئے

(۹) مجلس اقوام کے میثاق کے تحت اس بات کا اعادہ کیا گیا تھا کہ مختلف ریاستوں کے مابین اتحاد قائم کیا جائے ۔ مجلس ایک اتحادی باڈی نہیں تھی بلکہ ریاستوں پر مختلف یونٹوں کی حیثیت سے زور دیا گیا تھا جبکہ اقوام متحدہ بحیثیت مجموعی ایک انجمن ہے اور یہ ریاستوں کے درمیان

تعلقات قائم کرنے پر زور دیتی ہے۔

(۱۰) مجلس اقوام نے دستوری خلاف ورزی کا اختیار ارکان کی صوابدید پر چھوڑ دیا تھا کہ کسی رکن کی دستوری خلاف ورزی پر غور کریں اور اس کا سدباب کریں اس کے مقابلے میں اقوام متحدہ نے سلامتی کونسل کو مجاز گردانا ہے کہ وہ امن کے خطرے، حملہ آور یا امن شکنی کی صورت میں کوئی فیصلہ کرے اور اس کی بابت جو فیصلہ ہو اس کی تعمیل کرا دے ورنہ تمام ارکین اقوام متحدہ کا فرض بنتا ہے کہ وہ خلاف ورزی کو رد کریں۔

(۱۱) میثاق مجلس کے مطابق اسمبلی یا کونسل کے فیصلوں میں اس کے اجلاس میں شرکت کرنے والے تمام اراکین کی رضامندی ہوتی تھی۔ لیکن تجربات نے ثابت کر دیا ہے کہ کسی مسئلے پر سب ارکان کا متفق ہونا ناممکن تھا۔ مجلس کی ناکامی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی۔ اس لئے اقوام متحدہ کے منشور میں یہ گنجائش رکھی گئی کہ سلامتی کونسل میں ان امور پر جو ضابطہ کاروائی سے متعلق نہ ہوں۔ مستقل ارکان کی جزوی رضامندی ضروری ہے۔ ورنہ جنرل اسمبلی اکثریت رائے سے یہ فیصلہ کرسکتی ہے جس میں سب ریاستوں کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

(۱۲) اقوام متحدہ کے منشور کی رُو سے ایک فوجی اسٹاف کمیٹی قائم کی گئی تاکہ بین الاقوامی امن کی خاطر سلامتی کونسل کو مشورے دے اس کے حوالے فوجیں ہیں یہ قیام امن، پابندی اسلحہ کے لئے کوششیں کرتی ہے لیکن مجلس اقوام میں ایسا کوئی طریقہ کار نہ تھا۔

(۱۳) میثاق مجلس کی رُو سے ارکان کا طے کردہ کوئی عہدنامہ یا معاہدہ اس کے سکریٹریٹ میں درج ہونا ضروری نہیں تھا۔ لیکن اس کے برعکس اقوام متحدہ کے منشور کے تحت ہر عہد نامے یا معاہدے کا سکریٹریٹ میں رجسٹرڈ ہونا ضروری ہے اس لئے اگر کوئی عہدنامہ یا معاہدہ رجسٹرڈ نہ ہو تو کوئی فریق اقوام متحدہ کے کسی ادارے میں اس پر استدلال نہیں کرسکتا۔

(۱۴) میثاق کے تحت کوئی رکن دو سال کا نوٹس دے کر لیگ کی رکنیت سے دستبردار ہوسکتا تھا۔ لیکن اقوام متحدہ میں پابندی دستبرداری کی کوئی دفعہ نہیں ہے۔

(۱۵) میثاق کے تحت رکن ریاستوں کو سیاسی سالمیت و آزادی کی ضمانت مہیا کی گئی لیکن اقوام متحدہ کے منشور کے تحت اس قسم کی کوئی ضمانت مہیا کرنے کے بجائے رکن ریاستوں پر یہ ذمہ داری عائد کی گئی ہے کہ وہ کسی ریاست کی سیاسی سالمیت یا آزادی کے خلاف دھمکی یا طاقت کے استعمال سے باز رہیں۔

(۱۶) اقوام متحدہ عالمی سطح پر زیادہ نمائندہ باڈی ہے۔ اس میں ایشیائی ممالک کو بھی کافی نمائندگی دی گئی ہے۔ اس کے مقابلے میں مجلس اقوام صرف یورپی اقوام کا ادارہ تھی۔ اور انیسویں صدی کے سیاسی تصورات کی آئینہ دار بھی۔ گوڈ رچ ہمبرو GOOD RICH HAMBRO کے مطابق "مجلس اقوام پوری طرح یورپی ادارہ تھی" اور انیسویں صدی کے سیاسی اثرات کے مطابق جیسے "سفید فاموں کی دوسرے لوگوں کے مقابلے میں مخصوص ذمہ داری ہے" اب یہ نظریہ تبدیل ہو چکا ہے۔

(۱۷) مجلس اقوام کی اسمبلی اور کونسل قلیل مدت کے لئے اجلاس کرتی تھی جیسے کونسل کا سال میں تین چار مرتبہ اجلاس ہوتا تھا۔ اور ہر اجلاس ہفتے سے زیادہ طویل نہیں ہوتا تھا۔ اس کے مقابلے میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی مہینوں اجلاس کرتی ہے البتہ سلامتی کونسل کا اجلاس ہفتہ بھر رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر ریاست اقوام متحدہ کے صدر مقام پر اپنا ایک مستقل نمائندہ مقرر کرتی ہے۔ لیکن مجلس اقوام میں ایسا کوئی انتظام نہیں تھا۔

(۱۸) کہیں حملے کی صورت میں مجلس اقوام اس کے انسداد کے لئے بالکل بے دست و پا ہوتی تھی لیکن اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل فوری کارروائی کر سکتی ہے وہ انجمن کے ارکان سے فوجی قوت مہیا کرنے کا مطالبہ کر سکتی ہے اور یہ ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔

(۱۹) اگر لیگ کی کونسل میں کوئی قرارداد منظور نہیں ہوتی تھی اور اگر کوئی رکن یہ کوشش کرتا کہ مسئلے کو اسمبلی میں پیش کرے تو اسمبلی کو اس مسئلے پر کچھ حد تک اپیل سننے کا اختیار ہوتا تھا۔ لیکن اقوام متحدہ کے منشور کے تحت وہ اختیارات جو سلامتی کونسل کو دیئے گئے ہیں ان میں جنرل اسمبلی مداخلت نہیں کر سکتی۔ اس طرح رکنیت کی منظوری کا اختیار سلامتی کونسل کو ہے اگر سلامتی کونسل کسی ملک کی رکنیت سے انکار کر دے تو جنرل اسمبلی براہ راست اس کی رکنیت منظور نہیں کر سکتی

(۲۰) مجلس اقوام کے وفود کی صورت بھی اقوام متحدہ کے مقابلے میں مختلف تھی۔ مجلس کے وفود میں پیشہ ور ماہرین، جامعات کے پروفیسر اور اعلیٰ افسران ہوتے تھے۔ ان کا کوئی محاسبہ نہیں ہوتا تھا۔ اس طرح وہ بورژوا طبقے کی نمائندگی کرتے تھے اقوام متحدہ کے وفود میں نوجوان و تحریکی رہنما، ترقی پذیر ممالک کے اچھے ماہر نگران اور اکثر مزدور رہنماؤں کو بھی بھیجا جاتا ہے۔

ان اختلافات کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ انجمن اقوام متحدہ مجلس اقوام ہی کی ترقی یافتہ

شکل ہے۔ اور اس میں اُن تمام کمزوریوں کا ازالہ کرنے کی کوششیں کی گئی ہیں جو مجلس اقوام میں موجود تھیں۔ یہ ساری تبدیلیاں ضرورت و تجربے کی روشنی میں کی گئیں ہیں۔

انجمن اقوام متحدہ کا تنقیدی مطالعہ

A CRITIC STUDY OF U.N.O.

اقوام متحدہ مجلس اقوام کی واضح اور ترقی یافتہ شکل ہے اور یہ کئی معاملوں میں مجلس اقوام پر برتری کا دعویٰ کر سکتی ہے لیکن اس کے باوجود اقوام متحدہ کے نظام میں کئی خامیاں موجود ہیں جنھیں مختلف ماہرین نے سخت تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ یہاں تنقیدی نکات میں سے بعض کا تذکرہ کیا جا رہا ہے۔

(۱) بعض نقاد یہ نقطہ اٹھاتے ہیں کہ انجمن اقوام مجلس اقوام کی طرح مفتوحوں کے بجائے فاتحین کی انجمن ہے۔ یہ دوسری جنگ عظیم میں فتح حاصل کرنے والی ریاستوں پر مشتمل ہے۔

(۲) بعض مصنفین نے اقوام متحدہ کے نام کو ہی ہدف تنقید بنایا ہے ان کا خیال ہے کہ یہ ادارہ بکھری ہوئی اقوام کا ایک گٹھ جوڑ ہے۔ بینٹوچ BENTWICH. اور مارٹن MARTIN. کے مطابق "وہ ہتھیار جسے عالمی امن و بقا کے لئے بنایا گیا تھا عملاً وہ عالمی تنازعات کا باعث بنا ہے۔ آرتھر مور سے ARTHURMOORE کی رائے یہ ہے۔

> "اقوام متحدہ اس راہ پر چل رہی ہے جو مجلس اقوام کی تھی اور مسائل نے جو صورتحال پیدا کر دی ہے وہ پہلے سے کہیں زیادہ تیز ہے اس لئے اس کا اختتام بہت جلد ہو جائے گا۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ۱۹۶۵ء میں افرو ایشائی کانفرنس کی تشکیل کی کوشش کچھ ممالک کی طرف سے دراصل دوسری اقوام متحدہ کا تصور تھا جو حالات کی وجہ سے پورا نہ ہو سکا۔ لیکن اگر یہی صورتحال برقرار رہی تو مستقبل میں ایسا ہونا ناممکن نہیں ہوگا۔

(۳) اقوام متحدہ کی بنیاد مقتدر ریاستوں کی مساوات پر ہے اور قطع نظر اس کے کہ اس کی وسعت وسائل اور اقوام میں مقام کیا ہے لیکن عملاً ایسا نہیں ہے بڑی طاقتیں خاص کر

ویٹو پاورز اپنی من مانی کرتی پھرتی ہیں۔

(۴) سلامتی کونسل میں ۵ بڑی طاقتوں روس، امریکہ برطانیہ، فرانس، اور چین کو حق تنسیخ VETO POWER حاصل ہے جو آج مختلف بلاکوں میں تقسیم ہیں۔ جب بھی ایک بلاک کے خلاف قرار داد منظور ہونے لگتی ہے تو مخالف بلاک اس کو ویٹو کر دیتا ہے۔ جس کی وجہ سے جھگڑا جوں کا توں رہتا ہے نو آزاد اور ترقی پذیر ممالک میں یہ احساس پیدا ہو گیا ہے کہ کوئی معاملہ اس وقت تک طے نہیں ہو سکتا۔ جب تک بڑی طاقتیں نہ چاہیں۔ غرض ویٹو پاور سے اقوام متحدہ کا ادارہ بے معنی ہو کر رہ گیا ہے۔ کیونکہ چھوٹی ریاستوں کی کوئی نہیں سنتا۔ آج کل عالمی سیاست کا محور روس، چین اور امریکہ ہیں۔

(۵) اقوام متحدہ کوئی برتر ریاست نہیں ہے بلکہ ریاستوں کے درمیان ایک عالمی تنظیم ہے جس کی وجہ سے ہر مقتدر ریاست کو انکار کا حق ہے اس لئے اقوام متحدہ کے فیصلوں کی پابندی ان پر موثر نہیں ہو سکتی جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اقوام متحدہ میں ایک ایسا عالمی مباحثہ ہوتا ہے جس میں دنیا کی تقریباً سبھی ریاستیں حصہ لیتی ہیں۔

(۶) دنیا میں کوئی ادارہ بھی بغیر مالی فنڈ کے دیر تک قائم نہیں رہ سکتا انجمن اقوام متحدہ کو شدید مالی مشکلات کا سامنا ہے اس کے بجٹ کا بیشتر حصہ امریکہ ادا کرتا ہے اس لئے وہ اس ادارے پر اکثر اپنا دباؤ ڈالتا ہے۔ اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے مشرق وسطیٰ کے ممالک نے اقوام متحدہ کے جنرل سیکریٹری سے کہا تھا۔ کہ اگر امریکہ خرچ بند کر دے تو کوئی بات نہیں۔ ہم اس ادارے کا خرچ اٹھانے کے لئے تیار ہیں۔ مزید براں روس اور فرانس نے بھی اس ادارے کی مالی امداد میں نمایاں کمی کی۔ اور موقف یہ اختیار کیا کیا ہے کہ انجمن اقوام متحدہ نے امریکہ اور برطانیہ کے اشارے پر کانگو، کوریا، قبرص وغیرہ پر فوج کشی کی۔

(۷) انجمن اقوام متحدہ اپنی کوششوں کے باوجود ایٹمی اسلحہ وافواج پر کنٹرول کا مسئلہ حل نہیں کر سکی۔ بڑی طاقتیں تیسری دنیا کو بھاری مقدار میں اسلحہ برآمد کر رہی ہیں۔

(۸) سلامتی کونسل کے پاس ملزم ریاستوں کو سزا دینے کا کوئی موثر ہتھیار نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ منشور میں ایک ملٹری اسٹاف کمیٹی کی دفعہ موجود ہے لیکن بحرانی حالات میں اس پر زیادہ بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ اور اقوام متحدہ کے پاس کسی بے قصور ریاست کی

مدد کے لئے اپنی کوئی طاقت نہیں ہے۔

(۹) اقوام متحدہ میں چھوٹی اقوام کے نقطہ ہائے نظر کا احترام نہیں کیا جاتا۔ بڑی ریاستوں کا ہر معاملے میں اپنا نقطہ نظر ہوتا ہے تنزانیہ کے معاملے میں سلامتی کونسل نے افریقہ و ایشیاء کے نمائندوں کا متفقہ مطالبہ اور ان کا ایجنڈا صرف اس لیے مسترد کر دیا کہ برطانیہ اور امریکہ فرانس کو الجھن میں ڈالنا نہیں چاہتے تھے۔

(۱۰) اقوام متحدہ کی رکنیت انسانی اقدار کی بنیاد پر نہیں تجارتی مفاد کو سامنے رکھ کر طے کی جاتی ہے اس سلسلے میں سلامتی کونسل کے اختیارات غیر محدود ہیں۔ وہاں فیصلے ویٹو پاور کی حامل بڑی طاقتوں کی رضامندی کی مرہون منت ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی اچھی خاصی آبادی اقوام متحدہ کی رکنیت سے محروم ہے اس سلسلے میں کہا جاتا ہے کہ ویٹو پاور کو ختم کر دیا جائے اور مسئلہ پورے طور پر جنرل اسمبلی کی مرضی پر چھوڑ دیا جائے۔

(۱۱) سلامتی کونسل میں بعض علاقوں کی مناسب نمائندگی نہیں ہے باوجود یہ کہ اس کے منشور کی دفعہ ۲۳ (۱) میں یہ فارمولا ہے کہ "مناسب جغرافیائی تقسیم مختلف ریاستوں کی نمائندگی کے لئے پیش نظر رکھی جائے گی گذشتہ ۴۲ سالوں کے تجربہ سے ظاہر ہوا ہے کہ ۔ا غیر مستقل اراکین کی نمائندگی ایک نشست دولت مشترکہ کے ارکان کو اور ایک مشرق وسطیٰ میں دی جاتی رہی ہے عملاً ایشیاء و افریقہ کو بہت ہی کم نمائندگی ملی ہے۔

(۱۲) انجمن اقوام متحدہ کے پاس پولیس فورس نہیں ہے جس کے بل بوتے پر اپنے فیصلوں کو عملی جامہ پہنا سکے اور اگر کہیں فوج کی ضرورت پڑتی ہے تو انجمن رکن ریاستوں سے درخواست کرتی ہے تو وہ اپنی فوجیں بھیجتی ہیں۔ اس حقیقت سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ کوئی ادارہ اس وقت تک زندہ نہیں رہ سکتا جب تک اس کے فیصلوں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اس کے پاس طاقت نہ ہو۔ اقوام متحدہ کسی قرارداد کو متفقہ طور پر منظور کرتی ہے تو اس کو عملی جامہ پہنانے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ قوت نافذہ کا نہ ہونا ہے۔ مثال کے طور پر جنوبی افریقہ اور اسرائیل کے خلاف کئی قراردادیں منظور کی گئی ہیں۔ لیکن اقوام متحدہ کے پاس قوت نہ ہونے کی وجہ سے ان پر عمل درآمد نہیں ہو سکا۔

(۱۳) اقوام متحدہ کے منشور کی دفعہ ۲ (۷) پر بہت تنقید کی جاتی ہے۔ جس میں اقوام متحدہ کے حق اختیار سماعت کا ذکر کیا گیا ہے۔

دفعہ ۲ (۷)

"اس منشور کے کسی جز کا یہ منشأ نہیں ہے کہ اقوام متحدہ کو کسی مملکت کے خاص گھریلو اختیار سماعت کے معاملے میں مداخلت بیجا کا اختیار دیا جائے جو حالتاً اس مملکت کا داخلی معاملہ ہے اور نہ اپنے ارکان کو اس نوعیت کے معاملات کو تصفیہ کے لئے پیش کرنے پر مجبور کر سکتی ہے لیکن اس اصول سے کوئی دوسرا اختیار متاثر نہ ہوگا"

اس دفعہ کی آڑ میں ببرک کارمل افغانستان کے بحران کو اندرونی معاملہ قرار دیتا ہے اور بھارت مسئلہ کشمیر کو اپنا داخلی معاملہ کہتا ہے۔

(۱۴) تنازعات کے پرامن حل کی دفعات جو منشور میں موجود ہیں۔ وہ بڑی حد تک غیر یقینی معلوم ہوتی ہیں۔

(۱۵) بڑی اقوام سیکریٹری جنرل کے تقرر میں اپنے مفادات کو ترجیح دیتی ہیں۔ حالانکہ اس عہدے کا تقرر منصفانہ بنیادوں پر ہونا چاہیئے۔ ٹرگوےلی TRYGUELIE کے بعد سیکریٹری جنرل کے تقرر کا مسئلہ کھٹائی میں پڑ گیا تھا۔ روسی اقوام متحدہ کو چھوڑنے کے لئے تیار تھے۔ کیونکہ سیکریٹری جنرل ان کی مرضی کا آدمی مقرر نہیں ہو رہا تھا۔

(۱۶) بڑی طاقتوں نے اپنے مفادات کے پیش نظر اکثر اصولی مسائل پر قائم نہ رہنے کا طریقہ اختیار کیا ہوا ہے۔ جنوبی افریقہ کے انڈین کے مقابلے میں امریکہ و برطانیہ کا طرز عمل زیادہ حوصلہ افزا نہیں رہا ہے اور انصاف کی بنیاد پر مسائل کے حل پر زور نہیں دیا گیا۔

ان خامیوں اور کمزوریوں کے باوجود ہم اقوام متحدہ کی موجودہ دور میں افادیت سے انکار نہیں کر سکتے ایک مقولہ ہے۔

کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر ہے

SOMETHING IS BETTER THAN NOTHING

مطلب یہ ہے کہ اگر اس ادارے سے فائدہ نہیں ہے تو ریاستوں کو نقصان بھی نہیں ہے۔ میرے خیال میں یہ ادارہ وقت کی اہم ترین ضرورت ہے اس کو موثر اور باوقار بنانے کے لئے ضروری ہے کہ باہمی تنازعات کے تصفیہ کے لئے بین الاقوامی عدالت انصاف کے دائرہ سماعت کو زیادہ وسیع کر دیا جائے اور عالمی ادارہ کے فیصلوں کو منوانے اور انھیں نافذ کروانے کے لئے زیادہ سختی سے عمل کیا جانا چاہیئے۔

"انجمن اقوام متحدہ ماہرین کی نظر میں"

(۱) کنیتھ ینگو

اقوام متحدہ نے اپنے قیام کے دس سال بعد سے بنی نوع انسان کے ذہنوں میں جگہ بنالی ہے لوگ اس ادارے کو دو باتوں کی علامت سمجھتے ہیں۔ ۱۔ آئندہ جنگ کو روکنے کے لئے موثر ترین ذریعہ ۔۲۔ طاقتوں کے درمیان باہمی گفت وشنید کا بہترین مقام

(۲) صدر۔ پی ۔سی۔ پی ۔ رومولو:

اقوام متحدہ کے خاتمے کا مطلب یہ ہے کہ ہم وہ بند توڑ رہے ہیں جو کوریا، انڈونیشیا، کشمیر اور فلسطین کی جنگوں کے پھیلاؤ کو روکے ہوئے ہے۔ آئندہ بھی اس انجمن کو توڑنے کا مطلب جنگی سیلاب کو پھیلانا مقصود ہوگا۔ یہ ادارہ بھوک اور دکھ کے خاتمے کے لئے کوشاں ہے۔ تپ دق اور ملیریا جیسے امراض کے خاتمے کے لئے کنوؤں اور کارخانوں کے قیام کا سبب ہے۔ اگر اس ادارے کی قوت روز بروز کم ہوتی چلی گئی تو دنیا کے لاکھوں مصیبت زدہ اور بھوکے لوگ اشتراکیت کی طرف ردی کے لئے منہ موڑیں گے۔

(۳) فلر

اقوام متحدہ نے متعدد سیاسی بحرانوں کا سامنا کیا ہے جو جنگ عظیم دوئم کے بعد رُونما ہوئے۔ مثلاً بلقان، ایران، فلسطین، کشمیر، انڈونیشیا، برلن، کوریا اور کانگو وغیرہ کے مسائل۔ ان مسائل پر کئی جنگیں چھڑیں، کئی جنگیں چھڑنے والی تھیں۔ اور کئی گرما گرم مباحث ہوئیں، کئی معاملات کی شدت میں کمی آگئی۔ اور کئی مقامات پر امن کے متحارب گروپ جنگوں کی تاک میں ہیں۔ کشمیر کا مسئلہ اب تک کھٹائی میں پڑا ہوا ہے۔ اسرائیل کی سرحدوں کا تعین کرنا باقی ہے

ان تمام باتوں کے باوجود اقوام متحدہ کی ضرورت دکردار قابل قدر ہے۔

(۴) وی۔ ایل ینڈت

اقوام متحدہ میں نمائندے اپنے اختلافات کو ختم کرنے کے بجائے ہوا دیتے ہیں

(۵) رینڈن بوش اور ھوگن

اقوام متحدہ کی کامیابی جدید تہذیب کے مستقبل کے ساتھ وابستہ ہے۔

حقوق انسانی کا عالمی منشور

جنرل اسمبلی نے ۱۰ دسمبر ۱۹۴۸ء کو حقوق انسانی کا عالمی منشور منظور کیا گیا۔ جس کے تحت تاریخ میں پہلی بار انسانی حقوق کی وضاحت اور حصول کی ذمہ داری ایک بین الاقوامی تنظیم نے سنبھالی اور اسے ایک مستقل فرض کی حیثیت سے قبول کر لیا گیا اور ۱۹۷۶ء میں اس عالمی منشور کو قانون بین الاقوام کی ترقی میں ایک بڑی قوت کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ اس منشور سے عالمی معاشرے کو تین اہم فوائد حاصل ہوئے۔ انسان کے معاشی معاشرتی اور ثقافتی حقوق کا تحفظ۔ انسان کے شہری اور سیاسی حقوق کا تحفظ اور اس کے طریقہ کار کا تعین۔ اس کے ساتھ تمام ممالک پر یہ ذمہ داری عائد ہوئی۔ کہ وہ ان حقوق کو تسلیم کریں اور اس کے تحفظ کے لیے اپنے طور پر انتظام کریں۔

انسانی حقوق سے لاپرواہی اور ان کی بے حرمتی اکثر ایسے وحشیانہ افعال کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے جس سے انسانیت کے ضمیر کو سخت صدمہ پہنچتا ہے اس لئے یہ ضروری ہو گیا کہ انسانی حقوق کو قانون کی عملداری کے ذریعے محفوظ رکھا جائے اور قوموں کے درمیان دوستانہ تعلقات کو مضبوط کیا جائے۔ اقوام متحدہ کے رکن ممالک نے یہ تہیہ کیا ہے کہ وہ اقوام متحدہ کے ساتھ تعاون کریں گے۔ انسانی حقوق اور بنیادی آزادیوں کا احترام کرتے ہوئے ان کے فروغ کے لیے تعاون کریں گے۔ اس لئے جنرل اسمبلی یہ اعلان کرتی ہے کہ انسانی حقوق کا یہ عالمی منشور تمام قوموں کے لئے ایک مشترکہ فتح ہو گی اور نہ صرف رکن ممالک میں بلکہ ان علاقوں میں بھی جو ان کی حلقہ اثر میں ہوں ان پر عمل کیا جائیگا حقوق انسانی کے منشور کی تیس شقیں یوں ہیں۔

۱ تمام انسان آزاد پیدا ہوتے ہیں اس لئے انہیں ایک دوسرے کے ساتھ بھائی چارے کا سلوک کرنا چاہئے۔

۲ کسی شخص کو نسل، رنگ، زبان، مذہب یا عقیدے، قوم، معاشرے، دولت یا خاندانی حیثیت کے سبب فوقیت حاصل نہ ہو گی۔

۳ ہر شخص کو اپنی جان، آزادی، اور ذاتی تحفظ کا حق حاصل ہے۔
۴ غلامی، بردہ فروشی ممنوع قرار دی جائے گی۔
۵ کسی شخص کو جسمانی اذیت یا انسانیت سوز سزا نہیں دی جائے گی۔
۶ ہر فرد کی شخصیت کو قانوناً تسلیم کیا جائے گا۔
۷ قانون کی نظر میں سب برابر ہیں
۸ ہر شخص کو ان حقوق کی حق تلفی پر با اختیار قومی عدالتوں سے رجوع کرنے کا حق ہوگا۔
۹ حاکم وقت کی مرضی سے کسی کو گرفتار یا جلاوطن نہیں کیا جائے گا۔
۱۰ ہر فرد کے خلاف، عائد جرائم کے بارے میں مقدمہ کی سماعت آزاد اور غیر جانبدار عدالت میں منصفانہ طریقے پر ہوگی۔
۱۱ کوئی فرد اس وقت تک بے گناہ تصور ہوگا۔ جب تک اس پر قانون کے مطابق جرم ثابت نہ ہو جائے۔ اسے اپنی صفائی پیش کرنے کا پورا حق ہوگا۔
۱۲ کسی شخص کی نجی زندگی خط و کتابت اور خانگی معاملات میں مداخلت نہیں کی جائے گی۔ قانون اسے ہر قسم کے حملے یا مداخلت سے تحفظ فراہم کرے گا۔
۱۳ ہر فرد کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ ریاست کی حدود کے اندر نقل و حرکت اور سکونت اختیار کر سکے اسے حق ہے کہ وہ اپنے ملک سے چلا جائے اسی طرح اسے ملک میں واپس آنے کی آزادی ہوگی۔
۱۴ ہر شخص کو ایذا رسانی سے جو سیاسی افعال کی وجہ سے عمل میں آئے، دوسرے ملکوں میں پناہ حاصل کرنے کا حق حاصل ہے
۱۵ کوئی فرد حاکم کی مرضی سے اپنی قومیت سے محروم نہیں کیا جائے گا۔
۱۶ بالغ مردوں، اور عورتوں کو نسل، مذہب، اور قومیت کی پابندی کے سوا شادی کرنے، ازدواجی زندگی گزارنے اور نکاح فسخ کرنے میں برابر کا حق حاصل ہوگا۔
۱۷ ہر فرد کو جائداد رکھنے کا حق حاصل ہے اور اسے اس سے زبردستی محروم نہیں کیا

جائے گا۔

۱۸ ہر فرد کو آزادی فکر، آزادی ضمیر اور آزادی مذہب کا پورا پورا حق حاصل ہے اسے مذہب یا عقیدہ تبدیل کرنے اور مذہبی رسمیں ادا کرنے کی پوری آزادی ہو گی

۱۹ ہر فرد کو اظہار رائے کی آزادی ہے اور وہ اِن کی تبلیغ کر سکتا ہے۔

۲۰ ہر فرد کو پرامن طریقے سے ملنے جلنے انجمنیں قائم کرنے کی آزادی ہے۔

۲۱ ہر شخص کو ملک کی حکومت میں آزادانہ اور منتخب نمائندوں کے ذریعہ حصہ لینے کا حق ہے اور وہ آزادانہ اور مساوی رائے کے ذریعہ حکومت قائم کرنے کا حق رکھتا ہے۔

۲۲ ہر شخص کو معاشرتی تحفظ حاصل ہو گا اور بین الاقوامی تعاون سے اقتصادی معاشرتی اور ثقافتی حقوق حاصل کر سکے گا۔

۲۳ ہر شخص کو کام کاج اور روزگار کے مساوی مواقع حاصل ہوں گے اور بغیر کسی تفریق کے مساوی کام کے مساوی معاوضے کا حق ہو گا۔

۲۴ ہر شخص کو آرام اور فرصت کا حق ہے کام کے اوقات تنخواہ اور تعطیلات کی سہولتیں حاصل ہوں گی۔

۲۵ ہر شخص کو اپنے اور اپنے اہل و عیال کی صحت اور فلاح و بہبود کے لئے مناسب معیار زندگی کا حق ہو گا۔ بیروزگاری، بیماری، معذوری بڑھاپا، بیوگی اور ان حالات میں روزگار سے محرومی جو اس کے اختیار میں نہ ہوں کے خلاف تحفظ کا حق حاصل ہے۔

۲۶ ہر فرد کو تعلیم حاصل کرنے کا حق ہے، والدین کو بھی حق ہو گا کہ وہ اپنے بچوں کے لیے بہتر تعلیم کا انتخاب کر سکیں۔

۲۷ ہر شخص قوم کی ثقافتی زندگی میں آزادی سے حصہ لے سکے گا سائنس، ادب اور علمی تصانیف سے مستفید ہونے کا حق ہو گا۔

۲۸ ہر شخص ایسے معاشرتی بین الاقوامی نظام میں شامل ہونے کا حق رکھتا ہے جس میں وہ تمام حقوق اور آزادی حاصل کر سکے جو اس کے اعلان میں پیش کی گئی ہیں۔

۲۹ ہر شخص پر معاشرے کے حقوق ہیں اپنی آزادیوں اور حقوق سے فائدہ اٹھانے میں ہر شخص صرف ایسی حدود کا پابند ہوگا جو دوسروں کی آزادیوں اور حقوق کو تسلیم کرانے اور ان کا احترام کرانے کے لئے قانون کی طرف سے عائد کئے گئے ہوں۔

۳۰ اس اعلان سے کوئی ایسی مراد نہیں لی جا سکتی جس سے ملک گروہ یا شخص کو کسی ایسی سرگرمی میں مصروف ہونے کا حق مل سکے جس کی منشا ان حقوق اور آزادیوں کی نفی کرنا ہو۔

اقوام متحدہ ممبر ممالک کو مندرجہ بالا حقوق کی نگہداشت اور ان پر عمل کرنے کی سختی سے ہدایت کرتی رہتی ہے ہر سال ۱۰ دسمبر کو ساری دنیا میں یوم حقوق انسانی منایا جاتا ہے اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم انسان کی شخصی آزادی کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں اور ان ذمہ داریوں کو محسوس کرتے ہیں جو انسانی حقوق کے سلسلے میں ان اعلانات، ضوابط اور دستاویزات میں موجود ہیں۔

اس کے باوجود دنیا میں قدم قدم پر ایسے تلخ حقائق آج بھی موجود ہیں جو اس منشور حقوق انسانی کی واضح طور پر نفی کرتے نظر آتے ہیں ایسی اقوام آج بھی عالمی برادری میں پائی جاتی ہیں جو طاقت کے بل پر کمزور اقوام کے حقوق کو غصب کئے ہوئے ہیں۔ نسلی امتیاز کی لعنت آج بھی بعض علاقوں میں موجود ہے فلسطین، افغانستان، کمپوچیا، نمیبیا، اور لبنان، جیسے تشویشناک مسائل کے ساتھ ساتھ خوفناک جنگوں، قحط سالیوں، ایٹمی ہتھیاروں، اور بین الاقوامی جانکاہ خطرات اور معاشی افراط و تفریط کی شکل میں گوناگوں مسائل و مشکلات کا سامنا ہے۔ طاقت کے اندھا دھند استعمال نے دنیا کو تباہی کے کنارے لا کھڑا کیا ہے اس لئے ضرورت ہے کہ اسلام کے عطا کردہ اس چشمہ ہدایت کی طرف رجوع کیا جائے۔ جبر استحصال تشدد طاقت اور غصب و انحراف کی تاریکیوں سے نکلنا مقصود ہے تو فاران الٰہی کے اسی سرمدی نور کی طرف پلٹنا ہوگا۔ جو آج سے چودہ سو سال پہلے صحرائے عرب میں ظہور پذیر ہوا تھا اور اس سلسلے میں سب سے زیادہ مکلف خود پیروان اسلام ہیں جنہیں حقوق انسانی کے محافظ مثالی معاشرہ تشکیل دے کر دوسروں کی رہنمائی کرنی چاہیئے۔

باب نہم

غیر ملکی امداد اور معاشی انضمام

FOREIGN AID AND ECONOMIC INTEGRATION

۱۔ غیر ملکی امداد کا پس منظر

۲۔ امریکی امداد (مارشل پلان)

۳۔ روسی امداد (کومی کون کونسل)

۴۔ غیر ملکی امداد کے اثرات

۵۔ غیر ملکی امداد کا جائزہ

۶۔ یورپین آزاد تجارت ایسوسی ایشن

۷۔ تنظیم برائے اقتصادی تعاون و ترقی

۸۔ یورپی دفاعی کمیونٹی

۹۔ یورپی مشترکہ منڈی

غیر ملکی امداد کا پس منظر

انسان میں فطری طور پر خیر و شر کے دونوں جذبے پائے جاتے ہیں جہاں تاریخ میں ہمیں جنگ و جدل کی دردناک داستانیں ملتی ہیں وہاں انسان اپنے مفادات کی خاطر یا انسانی ہمدردی کی خاطر ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

تاریخ میں جتنی تباہی دوسری جنگ میں ہوئی اس سے پہلے اس طرح کی کوئی مثال نہیں ملتی متواتر کئی سال تک پوری دنیا میں انسانی زندگی کو مسلسل تباہ کرنے کے بعد جب ۱۹۴۵ء میں یہ جنگ اپنے اختتام پر پہنچی تو جو صورت حال تھی اس کا تجزیہ کرتے ہوئے بڑے بڑے سنگدل انسان بھی کانپ اٹھتے ہیں۔
بقول ایک سیاسی مفکر کے

"اس جنگ میں ہارنے والے تباہی کے کھنڈرات میں دفن ہو گئے تھے اور جیتنے والے زندگی کا آخری سانس لینے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے"۔

جنگ عظیم دوئم کے بعد اہم مسائل۔

۱ تباہ حال انسانوں کی زندگی کے لئے از سر نو ضروریات زندگی فراہم کرنا۔

۲ تباہ شدہ علاقوں کی از سر نو تعمیر نو کرنا۔

۳ نو آبادیات کی عوامی تحریکوں کو کچلنے کے بجائے آزادی کا حق دینا۔

۴ ریاستوں کے باہمی تنازعات کے حل کے لئے عالمی ادارہ تشکیل دینا۔

۵ عالمی سطح پر معاشی و سماجی ترقی پر زیادہ سے زیادہ توجہ دینا۔

ان مسائل کے حل کے لئے جہاں اقوام متحدہ کا قیام عمل میں آیا وہاں اس نظریئے کو بھی پیش کیا گیا کہ امیر اقوام پر مکمل اور غیر مشروط طور پر یہ اخلاقی ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ غریب اور پسماندہ ریاستوں کا معیار زندگی بہتر بنانے اور انھیں اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے کے لئے امداد فراہم کریں۔ جسے "ترقی پذیر ممالک کی امداد" کہا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں کہا تو یہ گیا تھا کہ یہ امداد محض مفادات کی بنیاد پر نہ دی جائے بلکہ خالص انسانی ہمدردی اور خلوص کی بنا پر غربت کو دور کرنے کے لئے دی جائے مگر وقت نے جلد ہی یہ ثابت کر دیا کہ اس قسم کے تمام نظریات کی خوبصورتی وقتی تھی۔ اولاً یہ امداد کتنی ہی خلوص اور انسانی ہمدردی جیسے جذبات پر مشتمل ہو

مگر بعد کے مفادات کی تکمیل اور اپنے حق میں وسائل حاصل کرنے کا ذریعہ ثابت ہوئی ۔ عالمی سیاست کا میدان دوسری عالمی جنگ کے بعد روس اور امریکہ کے زیر اثر ہے ۔ اور دونوں ممالک کے نظریاتی اختلافات نے تعاون و امداد کو دو مختلف سمتوں میں موڑ دیا ۔ روس اشتراکی نظام معاشرت اور اشتمالی طریقہ معیشت کو اپنانے والے ممالک کا حلیف بن گیا جب کہ امریکہ جمہوری طرز حکومت و سرمایہ دارانہ نظام معیشت کو اختیار کرنے والے ممالک کا حلیف بن گیا جس میں غیر ملکی امداد بھی بلاک سیاست کی بنیاد پر دی جانے لگی ۔ روس نے مشرقی یورپ کی ریاستوں کو مولوٹوپلان اور روراسا بیکیٹ کے تحت اپنے اثرات میں شامل کیا اور انھیں تعاون و امداد فراہم کی ۔ امریکہ نے بھی روس کی مخالفت میں مارشل پلان، ناٹو، سیٹو، سینٹو اور کئی دیگر معاہدات میں دوسری ریاستوں کے ساتھ مل کر ایک محاذ بنا دیا اس طرح دونوں ممالک اپنے اپنے حلیفوں کی معاشی و فوجی امداد کرنے لگے ۔

امریکی امداد AMERICAN AID

امریکہ نے ۱۹۴۷ء میں یورپ کی اقتصادی بحالی کے لئے وسیع پروگرام کا اعلان کیا ۔ جس میں امریکی حکومت نے یہ یقین دلایا کہ بڑے پیمانے پر اقتصادی امداد دی جائے گی ۔ چنانچہ ۱۵ جون ۱۹۴۷ء کو ہارورڈ یونی ورسٹی میں تقریر کرتے ہوئے امریکی وزیر خارجہ جارج مارشل نے کہا کہ

> " آئندہ تین چار برسوں کے دوران خوراک اور دوسری بنیادی ضروریات زندگی کے حصول میں یورپی ممالک کو سخت مصائب کا سامنا کرنا پڑے گا، یورپ کی معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی بحالی میں سرمائے اور وسائل کی شدید قلت کے باعث انھیں امریکہ کے تعاون کی ضرورت ہوگی اس لئے امریکی حکومت و عوام کو دنیا کے اقتصادی بحران پر قابو پانے اور معاشرتی زندگی کی بحالی میں ہر ممکن تعاون و امداد فراہم کرنا چاہئے ۔ کیونکہ اس کے بغیر دنیا میں سیاسی حالات میں عدم استحکام کے باعث امن و امان قائم رہنا مشکل ہو جائے گا ۔ تاہم ایسا پروگرام جس پر عمل درآمد کے لئے امریکہ دوستانہ امداد و تعاون فراہم کرے وہ متفقہ ہو یا کم از کم یورپی ممالک میں اکثریت اس کی تشکیل کی منصوبہ بندی سے ہم آہنگ ہو"۔

جارج مارشل کی اس تجویز پر غور کرنے کے لئے پیرس میں ۱۶ یورپی ممالک کا ایک اہم اجلاس ہوا ۔

جس کا مقصد یورپ کے اقتصادی پروگرام کے سلسلے میں منصوبہ بندی کرنا تھی چند دن تک روس بھی اس اجلاس میں شریک رہا۔ روسی وفد کی نمائندگی مسٹر مولوٹوف کر رہے تھے۔ چند ہی دنوں میں روس نے اجلاس کا بائی کاٹ کر دیا اور وجہ یہ بتائی کہ مارشل پلان روسی مفادات کے خلاف ہے اس پلان کا بنیادی مقصد روس اور اشتراکیت کے خلاف پروپیگنڈے کو فروغ دینا ہے اور یہ سامراجی منصوبہ ہے جس کی وجہ سے روس اور اس کے زیر اثر ممالک پولینڈ ہنگری، یوگوسلاویہ، چیکوسلواکیہ، رومانیہ، بلغاریہ، البانیہ اور فن لینڈ بھی کانفرنس میں شریک نہیں ہوئے۔

روسی وفد کے بائی کاٹ کے باوجود اجلاس جاری رہا۔ اجلاس میں "وزرائے خارجہ" کی ایک کمیٹی تشکیل دی گئی۔ اس کمیٹی نے جارج مارشل کے اعلان میں باضابطہ اقتصادی بحالی کا پروگرام مرتب کیا۔ جہاں تک مارشل پلان کا تعلق ہے۔ اس کی بنیاد تو اقتصادی بحالی تھی لیکن اس کو امریکی خارجہ پالیسی سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اس طرح اس منصوبے کے سیاسی اور بین الاقوامی مقاصد بھی تھے اور اس پالیسی کے ذریعے امریکہ اشتراکیت کا گھیراؤ کرنا چاہتا تھا امریکہ کی اس پالیسی کو POLICY OF CONTAINMENT کہتے ہیں۔

مارشل پلان کے مقاصد

مارشل پلان کا ایک مقصد اشتراکیت کو روکنا اور غیر اشتراکی ممالک کو اشتراکیت کے تسلط سے آزاد رکھنا ہے۔ غیر اشتراکی ممالک کی اقتصادی اور فوجی امداد کی جاتی ہے تاکہ وہ اشتراکیت کو روکنے میں ایک ڈھال ثابت ہوں اس منصوبے کے تحت یونان اور ترکی کو بڑے پیمانے پر امداد دی گئی ۱۹۵۰ء میں ہی واضح ہو گیا تھا کہ امریکی پالیسی کے باعث ان ممالک میں حالات بدل گئے ہیں یونان کے گوریلے ختم ہو گئے اور وہاں پر مکمل امن و امان بحال ہو گیا۔ اسی طرح ترکی میں حالات بہتر ہوئے۔ قومی زندگی میں امن و سکون کی فضا قائم ہونے سے معاشرتی توازن بحال ہو گیا انتشار ختم ہوا۔ عام انتخابات منعقد کرائے گئے اور ۲۷ سال بعد پہلی بار ترکی میں ایک سیاسی جماعت کی حکومت قائم ہوئی۔

(۲) امریکہ کا مفاد یورپ سے وابستہ تھا اور اس طرح امریکہ کے بہتر تعلقات ہی اس کے لئے فائدہ مند ثابت ہو سکتے تھے۔ چنانچہ امریکہ نے اپنی بیرونی تجارت کے فروغ کے لئے یہاں نئی نئی منڈیاں تلاش کیں۔ اس طرح سے مارشل پلان کے تحت امریکہ نے اتنا سرمایہ فراہم کیا کہ سرمایہ کاری

کی ایسی مثال اس سے پہلے کہیں نہیں ملتی اس سے افراط زر کا رکنا، روزگار کے مواقع میسر آنا اور توازن ادائیگی کے درست ہونے میں بڑی مدد ملی۔

(۳) پروفیسر ایرل کے خیال کے مطابق اس منصوبے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ

"امریکی عوام یورپ کو آزاد دیکھنا چاہتے ہیں کیونکہ ان کے خیال میں ان کی اپنی آزادی بھی اس سے مشروط و منسلک ہے۔"

مارشل پلان کے تحت جہاں یورپ کو آزادی میسر آئی وہاں یورپ والوں میں اقتصادی اتحاد بھی قائم ہوا۔ لیکن یہ مقصد فوری طور پر حل نہ ہو سکا۔ امریکہ نے تین سال کے دوران ۱۰ ہزار ملین ڈالر مغربی ممالک کو امداد کے طور پر فراہم کیے۔ جس کے نتیجے میں مغربی ممالک اس قابل ہوئے کہ روسی اشتراکیت کو روک سکیں اس طرح اشتراکی پھیلاؤ کی رفتار بہت کم ہو گئی۔

روسی امداد RUSSIAN AID

عالمی سیاست میں ایک ملک کے عمل سے دوسرے ملک کو جو نقصان پہنچتا ہے تو اس کی جوابی کاروائی رد عمل کہلاتی ہے۔ امریکی امداد کے مقابلے میں روسی امداد دی جاتی ہے۔ اس کا مقصد ترقی پذیر ممالک کو امداد کے ذریعے اشتراکیت کی طرف مائل کرنا ہے جس طرح امریکہ نے مغربی یورپ کی اقتصادی بحالی کے لئے مارشل پلان تیار کیا اس کے جواب میں روس نے مشرقی یورپ کی اقتصادی بحالی کے لئے مولوٹو پلان پیش کیا۔ کیونکہ مارشل پلان روس کے نزدیک سامراجی منصوبہ تھا اور اشتراکیت کے خلاف تھا۔ ظاہری طور پر روس نے مارشل پلان سے الگ ہوتے ہوئے یہ موقف اختیار کیا کہ امریکہ جو امداد دینا چاہتا ہے وہ دو طرفہ ہونی چاہئیے لیکن حقیقی معنی میں روس کا مقصد اشتراکی ممالک کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنا تھا۔

روسی امداد کے مقاصد:

۱ غیر جانبدار ممالک کو غیر جانبدار رکھنے کے لئے
۲ تجارتی منڈیوں کی تلاش کے لئے
۳ اشتراکیت کا پھیلاؤ اور لوگوں کو اس طرف راغب کرنا
۴ اپنے وجود اور عظمت کو دوسری ریاستوں سے تسلیم کرانا۔
۵ چین کا عظیم طاقت بننے کے بعد روس پُرامن بقائے باہمی کی پالیسی کی طرف گامزن ہے۔

کومی کون کونسل (کونسل برائے اقتصادی تعاون)

روس نے ۱۹۴۹ء میں مارشل پلان کا بائیکاٹ کرنے اور مشرقی یورپی ممالک ہنگری، چیکوسلواکیہ، رومانیہ، بلغاریہ اور پولینڈ کے ساتھ مل کر ایک کونسل قائم کی، البانیہ اور مشرقی جرمنی ایک سال کے اندر اندر اس میں شریک ہو گئے ۱۹۷۲ء میں کیوبا ۱۹۷۸ء میں ویت نام اور چند دوسرے ممالک جن میں منگولیا بھی شامل ہے کومی کون کونسل COME-CON. COUNCIL کے ممبر بن گئے۔ ۱۹۶۱ء میں البانیہ کونسل سے علیحدہ ہو گیا۔

کونسل کے مقاصد

جہاں تک کومی کون کے بنیادی مقاصد کا تعلق ہے یہ مارشل پلان والے ہی تھے مشترکہ منصوبہ بندی، ممبر ممالک کی اقتصادی پالیسی کو مربوط کرنا، اقتصادی بحالی، ثقافتی ترقی وغیرہ ہے عملی طور پر کونسل کا بنیادی مقصد مشرقی یورپ کے ممالک کو متحد کرنا اور امریکہ کا مقابلہ ہے۔

کونسل کی کارکردگی

کومی کون کے ممبر ممالک کی تجارتی پالیسیوں میں اہم تبدیلیاں ہوئیں مشرقی یورپی ممالک کی جو تجارت مغربی یورپی ممالک کے ساتھ تھی اس میں تخفیف ہوئی اور اس کے ممبر ممالک نے روس کے ساتھ تجارت کو فروغ دیا۔ نیز روس چاہتا بھی یہی تھا اس بات کا اندازہ اس چیز سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ مشرقی یورپ کے ساتھ ہنگری کے تعلقات برائے نام تھے لیکن اس فیصلے کے بعد روس اور ہنگری کی تجارت ۳۶٪ سے ۶۰٪ فیصد تک بڑھ گئی۔ روس نے سیاسی لحاظ سے بھی معاہدے کئے اور اس طرح ممبر ممالک نے آپس میں تعاون و دوستی کے کئی معاہدے کئے جس سے مشرقی یورپ کے ممالک آپس میں متحد ہو کر ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو گئے جس کی قیادت روس کر رہا تھا۔

۲ ۱۹۵۳ء تک کومی کون کی کاروائیاں مبہم رہیں اور اقتصادی میدان میں نمایاں اور اہم اقدامات نہیں کئے گئے۔ لیکن ۱۹۵۳ء کے بعد کومی کون کے باقاعدہ اجلاس ہونا شروع ہو گئے تھے۔ اسٹالن کی موت کے بعد جب خروشیف ۱۹۵۶ء میں برسر اقتدار آیا تو اس نے کومی کون کی کاروائیوں میں زیادہ دلچسپی نہیں لی اور یہ تجویز پیش کی کہ ممبر ممالک کی صنعتوں میں سرمایہ لگایا جائے اور ممبر ممالک کے وسائل کے حساب سے وہاں سرمایہ کاری کی جائے جیسے مشرقی جرمنی اور چیکوسلواکیہ دوسرے ممالک سے آگے ہیں اس لئے ان میں بڑی صنعتیں لگائی جائیں۔ خروشیف کی اس

تجویز کا مثبت جواب اس لئے ملا کہ ممبر ممالک کو روسی تسلط کا خطرہ ہو چکا تھا۔ اور کوئی ممبر ملک اقتصادی میدان میں روسی برتری نہیں چاہتا تھا۔

۳ مشرقی جرمنی سے ہالینڈ تک ۱۹۶۳ء میں ایک پائپ لائن تعمیر کی گئی۔ اس کا مقصد روسی تیل کو مشرقی یورپ کے ممالک تک پہنچانا تھا۔

۴ مشرقی یورپ کے ممالک کو سرمایہ فراہم کرنے کے لئے "بین الاقوامی بینک" قائم کیا گیا۔ اس سے اقتصادی تعلقات میں بڑی مدد ملی۔

آج کومی کون کی حیثیت پہلے کی سی نہیں رہی ۱۹۶۱ء میں البانیہ اس سے بالکل الگ ہو گیا۔ چین نے بھی اس کے اجلاس میں شرکت کرنا بند کر دی ہے۔ علاوہ ازیں ہنگری اور ہالینڈ نے بھی روسی پالیسی سے اختلاف کرنا شروع کر دیا ہے مشرقی یورپ میں مشرقی جرمنی واحد ملک ہے جو روس کی ہر بات پر رضامند نظر آتا ہے۔ ہنگری، چیکوسلواکیہ اور ہالینڈ میں بھی کئی دفعہ ہنگامے ہو چکے ہیں ان ہنگاموں اور بغاوتوں کا واحد مقصد سیاسی اور معاشی نظام میں لچک پیدا کرنا ہے اور روسی بالادستی سے نجات حاصل کرنا ہے۔ پولینڈ پہلا ملک ہے۔ جہاں ان ہنگاموں کی وجہ سے دسمبر ۱۹۸۱ء کو مارشل لاء لگا ہے۔

2. INFLUENCE OF FOREIGN AID غیر ملکی امداد کے اثرات

غیر ملکی امداد کا مقصد صرف تباہ حال قوموں کی تعمیر نو ہے اور ترقی پذیر ریاستوں کے ترقیاتی منصوبوں کی تکمیل ہی نہ تھا بلکہ اسے ایک پالیسی کے تحت قومی برتری کے لئے استعمال کیا گیا اور لایا جا رہا ہے۔ آج جمہوری ممالک کمیونسٹوں کو موردِ الزام ٹھہراتے ہیں اور کمیونسٹ ممالک سرمایہ داروں کو فتنے کی جڑ قرار دیتے ہیں۔ روسی اور امریکی امداد کا جائزہ پچھلے صفحات پر لیا جا چکا ہے۔ یہاں ہم امداد دینے والی اقوام کے فوائد کا ذکر یں گے۔

۱ ۔ امداد دینے والے ملک کو سب سے اہم فائدہ یہ ہوتا ہے کہ امداد لینے والے ملک کی خارجہ پالیسی بلکہ اندرونی پالیسی بھی کسی حد تک اس کی ہم نوائی میں مرتب ہونے لگتی ہے اکثر و بیشتر ترقی پذیر ممالک کی خارجہ پالیسیوں کی بنیادیں ہی ان کی وضع کردہ مقاصد کی روشنی میں مرتب کی جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بلاک سیاست میں حلیفوں کی بڑی تعداد طاقتور ریاستوں کی پالیسیوں کی تشہیر اور ترقی میں اپنے اپنے طور پر حصہ لیتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ یہ

بالکل ایسی ہی بات ہے کہ جس طرح ایک سرمایہ دار اپنی دولت کے بل بوتے پر اپنی برتری کو منواتے ہوئے غریب آدمی کی خودی کو بھی ختم کر دیتا ہے۔ یہاں تک کہ غریب آدمی اپنی مرضی سے سوچ بھی نہیں سکتا۔ یہی حیثیت ان ممالک کی ہوتی ہے جو بیرونی امداد پر گزارہ کرتے ہیں۔

۲ امداد دینے والی ریاست کو معاشی میدان میں یہ فائدہ ہوتا ہے کہ اسے اپنی مصنوعات اور خام مال کی کھپت کے لئے ایک بہت بڑی مارکیٹ مل جاتی ہے۔ جس سے معاشی مفادات کا تحفظ، بیرونی تجارت میں ترقی، محفوظات میں اضافہ، سرمایہ کاری میں وسعت اور ملکی معیشت کو استحکام حاصل ہوتا ہے۔

۳ دفاعی اعتبار سے امداد دینے والے ممالک کو یہ فائدہ ہوتا ہے کہ اکثر اوقات ان کا اپنا ملک براہ راست جنگ میں شریک نہیں ہوتا بلکہ اکثر و بیشتر ایسے ترقی پذیر ممالک جنگ میں ملوث ہوتے ہیں جو سرمایہ دار اور بڑے ممالک سے امداد حاصل کر رہے ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر کوریا کی جنگ ۱۹۵۰ء میں امریکہ جنوبی کوریا کو امداد دے رہا تھا اور روس شمالی کوریا کو۔

غریب ممالک کو ادھار بڑی مقدار میں اسلحہ فراہم کیا جاتا ہے تاکہ وہ اپنے استحکام اور قومی سلامتی کے چکر ہی میں پڑے رہیں پاکستان کو امریکہ اور بھارت کو روس۔ آج کل جو اسلحہ فراہم کر رہے ہیں وہ اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔

۴ بیرونی امداد کا ایک مقصد اپنے حلقہ اثر میں وسعت ہے۔ کوئی بڑی طاقت جس ملک پر اپنی چودھراہٹ قائم کرتی ہے وہاں اپنے نظریات، تہذیب و تمدن، نظام معاشرت اور طریقہ زندگی کو بھی آہستہ آہستہ فروغ دیتی ہے۔ کبھی کبھی بڑی طاقتیں بیرونی امداد کے ذریعے اپنے ہم خیال لوگوں کے ساتھ مل کر حکومتوں کا تختہ بھی الٹ دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر روس ابھی تک انگولا، ایتھوپیا، جنوبی یمن، موزمبیق، لاؤس، کمبوڈیا اور جنوبی ویت نام کے ۱۰ کروڑ آدمی کمیونزم کے زیر اثر آ چکے ہیں اس طرح دنیا کے ۱۵۹ میں سے تقریباً ۲۱ ممالک کمیونزم کے تحت زندگی بسر کر رہے ہیں۔

اسی طرح امریکہ نے ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ میں بعض ممالک کے ساتھ اچھے تعلقات قائم کر رکھے ہیں اور ان ترقی پذیر ممالک کی اقتصادی امداد اور قرضہ جات کے ذریعے امریکہ تعاون فراہم کرتا ہے۔

غرض یہ کہ امداد دینے والی ریاستوں کی پالیسیوں پر بے پناہ مثبت اثرات مرتب ہوتے ہیں ان کی قومی خود مختاری، شان و شوکت، عظمت وقار، معاشی ترقی، تہذیب و تمدن اور ثقافت کو پھولنے پھلنے کا موقع ملتا ہے جو بہر حال کسی ریاست کے قومی مقاصد کے لئے سب سے زیادہ ضروری چیز ہے۔

اس کے برعکس تصویر کا دوسرا رُخ دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ امداد لینے والی کئی ریاستوں کی قومی پالیسیوں پر کئی منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں ان کا سیاسی نظام کبھی مستحکم بنیادوں پر قائم نہیں ہوتا۔ یہ ریاستیں امداد دینے والی ریاستوں کی ہاں میں ہاں ملانے کو ہمیشہ تیار رہتی ہیں جس سے ان ریاستوں کی قومی انفرادیت ختم ہو کر رہ جاتی ہے کبھی کبھی بعض ایسی اقوام سے دشمنی پیدا ہو جاتی ہے جن سے کسی قسم کے مفاد کا ٹکراؤ نہیں ہوتا ماضی میں دفاعی معاہدہ مثلاً سیٹو، سینٹو کے باعث پاکستان کو روس کی دشمنی کا سامنا کرنا پڑا۔ روسی امداد ہی کی وجہ سے بھارت کے لئے کہا جاتا ہے کہ اس کی خارجہ پالیسی کا تعین روسی وزیر خارجہ کرتا ہے۔ لیکن بعض ریاستیں بیرونی امداد کو بروئے کار لا کر اس سے زیادہ سے زیادہ آفادہ حاصل کرتے ہوئے خود کفیل بھی ہو جاتی ہیں اور خود کو ترقی یافتہ ریاستوں کی صف میں لے آتی ہیں اور روایتی طریقے سے نکل کر جدید تقاضوں کے مطابق زندگی کے لوازمات کو اپناتی ہیں جس سے ریاست پر معاشرتی جمود ختم ہو کر ایک قسم کی حرکت پیدا ہو جاتی ہے اور قوم میں بھرپور جدوجہد کا احساس ابھرتا ہے۔ موجودہ دور میں اس کی سب سے بڑی مثال چین ہے۔

غیر ملکی امداد کا ایک جائزہ:۔

انسانیت کی تاریخ میں کبھی بھی اتنی زیادہ قومیں اتنی بھاری رقم کے لئے اتنی تھوڑی اقوام کی مقروض نہیں رہیں۔ اس وقت عالمی سطح پر اس خوف کا بھی اظہار کیا جا رہا ہے اگر وقت پر کچھ نہ کیا گیا۔ تو بین الاقوامی منڈی اقتصادی بحران کا شکار ہو جائے گی۔ اس کے اثرات اتنے گہرے ہوں گے کہ پوری دنیا ایک لمبی کساد بازاری کی لپیٹ میں آ جائے گی۔ تیسری دنیا میں قرضوں کا بوجھ غیر مساوی لین دین کے نتیجے میں اکٹھا ہو رہا ہے۔ یہ وہی غیر مساوی لین دین ہے۔ جس کا سہارا لے کر صدیوں سے غریب اقوام کا استحصال کیا جا رہا ہے۔

تیسری دنیا کے ممالک پر یہ بوجھ نہ صرف بین الاقوامی افراط زر کی وجہ سے دن بدن

بڑھ رہا ہے۔ بلکہ اس میں صنعتی ممالک کی حفاظتی پالیسی بھی شامل ہے جس کے تحت وہ اپنی درآمدات اور ہماری برآمدات کی قیمتوں میں مسلسل کمی کرتے جا رہے ہیں۔

تیسری دنیا کے بیرونی تمام قرضوں پر سرسری نگاہ ڈالی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ۱۹۸۳ء میں قرضوں کی کل رقم ۸۶۰ بلین ڈالر کو چھو رہی تھی اور ۱۹۸۷ء میں یہی رقم ۱۵۰۰ بلین ڈالر تک پہنچ گئی یہ ایک حقیقت ہے کہ ۱۹۸۳ء میں ۳۰ ترقی پذیر ممالک اس بات پر مجبور ہو گئے کہ ایک سو بلین ڈالر تک کے تمام قرضوں کے لئے از سر نو شرائط پر بات چیت کریں جو رقم بنکوں نے ان ممالک کو ۱۹۸۳ء میں قرض میں دی تھی۔ اس پر ۲۱ بلین ڈالر سرچارج کا مطالبہ کیا جانے لگا۔ اس مطالبے کی وجہ سے پیسے کا جو منفی بہاؤ پیدا ہوا وہ اقتصادی ترقی کی راہ میں رکاوٹ بنا جو ان ملکوں میں ایک طویل مدت میں ہوئی تھی۔ یہ ایک ایسا نقصان ہے جسے دور کرنے کے لیے عرصہ لگے گا۔ تیسری دنیا کے ۱۴۱ ممالک تو صاف طور پر یہ ظاہر کر چکے ہیں کہ وہ کسی طرح بھی اپنے قرضے چکانے کی حالت میں نہیں ہیں کیونکہ جب تک ان کی برآمدات کی آمدنی بڑھتی نہیں اور درآمدات کی قیمت گھٹتی نہیں ان کی اقتصادی حالت بد سے بدتر ہوتی چلی جائے گی۔

اس اقتصادی بحران پر قابو پانے کے لئے جنوری ۸۳ء میں دنیا کے دس بڑے صنعتی ممالک آپس میں اکٹھے ہوئے اور انھوں نے ۹ بلین ڈالر کا ایک ہنگامی فنڈ تشکیل دیا تاکہ آئی ایم ایف کی مدد کی جا سکے اور اس خطرے کا تدارک ہو جائے۔ جو بین الاقوامی مالیاتی نظام کی سلامتی پر منڈلا رہا ہے ان ممالک نے یہ فیصلہ بھی کیا کہ آئی ایم ایف کے ممبر ممالک کے کوٹوں میں اضافہ کیا جائے۔ اور آئی ایم ایف کے اقتصادی ذرائع کو خاطر خواہ بڑھایا جائے۔ ۱۹۸۵ء میں آئی ایم ایف کو ۳۲ بلین ڈالر کی امداد دی گئی۔ لیکن اس سے کوئی خاطر خواہ نتائج برآمد ہوتے ہوئے نظر نہیں آ رہے کیونکہ تیسری دنیا کے ممالک کے قرضوں کی رقوم میں بھی مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔

لاطینی امریکہ کے ایک مشہور ماہر معاشیات سیلسو فرٹینڈو کے مطابق

"تیسری دنیا کے ممالک کے سامنے موجودہ اقتصادی بحران سے نکلنے کا اب صرف یہی ایک راستہ ہے کہ وہ بین الاقوامی مالی نظام کو بنیادی طور پر بدلنے اور از سر نو بالکل نئے خطوط پر استوار کرنے پر زور دیں"۔

قرضوں کی نئی فہرستیں مرتب کرنا ان کی میعادوں میں توسیع کرنا اور اصل زر کو ایک طرف رکھ کر

سود ادا کرنے کے لئے نئے قرضے دیتے چلے جانا اس یورپی حکمت عملی کو فروغ دینے کا ایک ذریعہ ہے جسے دنیا "تقسیم کردار در حکومت کرو" کے نام سے جانتی ہے۔

تیسری دنیا کے ممالک کے لئے یہ ضروری ہو گیا ہے کہ وہ یہ مطالبہ کریں کہ مغربی بین الاقوامی انتصادی ادارے اور کمرشل بنک اپنے اپنے قرضے منسوخ کر دیں۔ اگر یہ ادارے یہ مطالبہ تسلیم کرتے (یقیناً وہ خود ایسا نہیں کریں گے) تو تیسری دنیا کے ممالک کو چاہیئے کہ پھر وہ قرض کے اس بم کا دھماکہ کر ہی ڈالیں۔ تیسری دنیا کے پاس "قرض کے جال" سے نکلنے کا یہی ایک راستہ ہے جس میں کہ صنعتی ممالک نے انھیں پھنسایا ہوا ہے۔ ان کے پاس صدیوں کی محتاجی اور انحصار سے نکلنے کا واقعی یہی ایک راستہ ہے۔ ہر طرف خطرے کی گھنٹیاں بج رہی ہیں اور کہا جا رہا ہے کہ قرض کا یہ آتش گیر مادہ بن چکا ہے کہ جس کے پھٹنے سے سارا بین الاقوامی مالیاتی نظام اور دنیا کا استحکام بھک سے اڑ جائے گا ہمیں اس پروپیگنڈے پہ بالکل کان نہیں دھرنے چاہئیں اور یقین رکھنا چاہیئے کہ اگرچہ بین الاقوامی مالیاتی نظام از سر نو ضرور ترتیب دیا جائے گا۔ لیکن یہ بھی نہ ہو گا کہ اس کی عمارت بالکل گر جائے۔ کیونکہ بین الاقوامی سرمایہ دارانہ نظام کے محافظ ایسا کبھی نہ ہونے دیں گے اور اصل بات یہ ہے کہ ہمیں اپنے مستقبل کی فکر کرنی چاہیئے مغربی مالیاتی نظام کی نہیں۔ اگر اسے چھوٹی موٹی تکلیف بھی پہنچ جاتی ہے تو وہ اسے برداشت کرے گا۔ لیکن ہم نے اگر قرض کے اس جال سے چھٹکارا نہ پایا تو ہمارا دم گھٹ جائے گا۔

یورپین آزاد تجارت ایسوسی ایشن:۔

EUROPEAN FREE TRADE ASSOCIATION (EFTA)

اس ایسوسی ایشن کا قیام ۴ جنوری ۱۹۶۰ء کو عمل میں آیا۔

اراکین:۔

۱۔ آسٹریا ۲۔ آئس لینڈ ۳۔ ناروے ۴۔ پرتگال
۵۔ سویڈن ۶۔ سوئٹزرلینڈ ۷۔ فن لینڈ (ایسوسی ایٹ ممبر)

مقاصد:۔

۱۔ ممبر ممالک کے مابین کسٹم ڈیوٹی کو بتدریج کم کرنا
۲۔ ممبر ممالک کے مابین صنعتی پیداوار کی حد متعین کرنا۔

یکم جنوری ۱۹۷۳ء کو EFTA کے ممبر ممالک یورپین مشترکہ منڈی میں ایک معاہدے کے ذریعے شامل ہو گئے لیکن برطانیہ اور ڈنمارک (مشترکہ منڈی کے ممبر) نے EFTA میں شامل ہونے سے انکار کر دیا۔ یکم جنوری ۱۹۷۷ء سے EFTA اور مشترکہ منڈی کے ممالک کے درمیان "صنعتی کسٹم" مکمل طور پر ختم کر دیا گیا۔

تنظیم برائے اقتصادی تعاون و ترقی:۔

ORGANIZATION FOR ECONOMIC CO-OPERATION AND DEVELOPMENT

یہ تنظیم ۳۰ ستمبر ۱۹۶۱ء کو قائم کی گئی اس کا صدر مقام پیرس میں ہے اس کا مقصد ممبر ممالک کی اقتصادی اور سماجی فلاح و بہبود ہے۔

تنظیم کے اراکین:

(۱) آسٹریا (۲) آسٹریلیاء (۳) بلجیم (۴) کینیڈا (۵) ڈنمارک (۶) فن لینڈ (۷) فرانس (۸) مغربی جرمنی (۹) یونان (۱۰) آئس لینڈ (۱۱) آئرلینڈ (۱۲) اٹلی (۱۳) جاپان (۱۴) لکسمبرگ (۱۵) نیدرلینڈ (۱۶) نیوزی لینڈ (۱۷) ناروے (۱۸) پرتگال (۱۹) اسپین (۲۰) سویڈن (۲۱) سوئٹزرلینڈ (۲۲) ترکی (۲۳) برطانیہ (۲۴) امریکہ (۲۵) یوگوسلاویہ اس کا خاص ممبر ہے۔

مقاصد

— • امریکی امداد کو یورپی ممالک میں منصوبہ بندی کے ذریعے تقسیم کرنا تاکہ اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کیا جا سکے۔

— • بیرونی تجارت کی پابندیوں کو نرم کرنا تاکہ ممبر ممالک کی بیرونی تجارت کو فروغ حاصل ہو اور چھ سال کے عرصے میں یورپی ممالک کی تجارت دوگنی ہو جائے۔

— • توازن ادائیگی کو متوازن کرنا اور تجارتی خسارے کو دور کرنا تھا۔ اس کی کامیابی کی ایک وجہ یہ ہے کہ اس تنظیم میں غیر یورپی ممالک بھی شامل ہو گئے ہیں جس سے امریکی امداد سے

تیسری دنیا کے ممالک بھی مستفید ہونے لگے اور امریکہ کا اثر و رسوخ بڑھنے لگا۔
اس کی کارکردگی سے امریکہ کے وقار میں اضافہ ہوا۔ اور امریکہ کے اتحادیوں کو سکون حاصل ہوا۔

یورپی دفاعی کمیونٹی
EUROPEAN DEFENCE COMMUNITY

مئی ۱۹۵۲ء میں ایک دفاعی معاہدے کے ذریعے "یورپی دفاعی کمیونٹی" تشکیل پائی۔
اس معاہدے کا مقصد یہ تھا کہ مغربی ممالک کے درمیان مشترکہ سیاسی اداروں کو مستحکم کیا جائے مشترکہ مسلح افواج، مشترکہ بجٹ اور ہتھیاروں کا مشترکہ پروگرام مرتب کیا جائے۔ اس معاہدے کے تحت فیصلہ کیا گیا کہ مغربی یورپ کی ایک متحدہ فوج ہو جو ایک منظم بازو کی حیثیت رکھتی ہو اور اس کے نگرانی کے لئے سیاسی اداروں کی تشکیل کا منصوبہ بنایا جائے۔
طے کیا گیا کہ کوئلے اور فولاد کی یورپی کمیونٹی (اپریل ۱۹۵۱ء میں چھ ممالک فرانس، مغربی جرمنی، اٹلی، بلجیم، لکسمبرگ اور نیدرلینڈ کے مابین تشکیل پائی) کی اسمبلی ہی "یورپی دفاعی کمیونٹی کی اسمبلی کے طور پر کام کرے گی۔ مغربی جرمنی اور نیدرلینڈ کے معاہدے کی توثیق کر دی۔ جب کہ فرانس نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا چنانچہ ۲۸ ستمبر اور ۳ اکتوبر ۱۹۵۴ء کو لندن میں ایک کانفرنس منعقد ہوئی جس میں معاہدہ براسلز (مارچ ۱۹۴۸ء میں پانچ ممالک بلجیم، فرانس، نیدرلینڈ، لکسمبرگ اور برطانیہ کے مابین متحدہ دفاع اقتصادی اور معاشرتی تعاون کا معاہدہ) کی حدود کے اندر رہتے ہوئے نئی تنظیم مغربی یورپی یونین W.E.U. بنائی۔ اس کی کونسل کو وسیع اختیارات دیئے گئے۔ اس وقت برطانیہ میں لیبر پارٹی کی حکومت تھی جس کی وجہ سے حکومت نے اپنی پالیسی کے تحت جہاں اس کونسل کی مخالفت نہیں کی وہاں اس کو وسعت دینے کے لئے کوئی اہم کردار بھی ادا نہیں کیا۔ اس وقت برطانیہ کا مفاد امریکہ سے وابستہ تھا۔ نیز وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ ہماری خارجہ پالیسی آزاد رہے۔ برطانیہ کی اس پالیسی کے باوجود کونسل نے ترقی کی اور آج تک برقرار ہے۔
کونسل کے دو اہم شعبے وزراء کی کونسل اور پارلیمنٹ ہے۔ جو عالمی مسائل حل کرتے ہیں اب تک اس کے تحت یورپی ممالک نے آپس میں ۷ معاہدے کئے ہیں۔ علاوہ ازیں اس کا اہم کارنامہ انسانی حقوق سے متعلق منشور تیار کرنا ہے۔

یورپی مشترکہ منڈی/یورپین کمیونٹیز :-

EUROPEAN COMMON MARKET/EUROPEAN COMMUNITIES

یورپی مشترکہ منڈی مندرجہ ذیل تین کمیونٹیوں کی عام رکنیت کا نام ہے :-

۱۔ یورپی معاشی برادری THE EUROPEAN ECONOMIC COMMUNITY

۲۔ یورپی کوئلہ اور فولاد برادری THE EUROPEAN COAL AND STEEL COMMUNITY

۳۔ یورپی ایٹمی توانائی برادری THE EUROPEAN ATOMIC ENERGY - COMMUNITY

یورپی مشترکہ منڈی کے مکمل دس ممبران حسب ذیل ہیں :-

۱۔ بلجیئم ۲۔ ڈنمارک ۳۔ فرانس ۴۔ مغربی جرمنی ۵۔ یونان
۶۔ آئرلینڈ ۷۔ اٹلی ۸۔ لکسمبرگ ۹۔ نیدرلینڈ ۱۰۔ برطانیہ

افریقہ شمالی وجنوبی امریکہ (CARIBBEAN) اور بحرالکاہل کی ۶۰ اقوام نے "لیمے کنونیشن" LEMÉ CONVENTION میں اس کے ساتھ اپنی رضامندی کا اظہار کیا۔ یکم جولائی ۱۹۶۷ء کو تینوں کمیونٹیوں کا انضمام عمل میں آیا اس سے قبل ۱۹۵۱ء اور ۱۹۵۸ء میں بھی اس قسم کی کوششیں کی گئی تھیں۔

منڈی کے بنیادی مقاصد

۱۔ یورپی ممالک کے اقتصادی تعلقات کو فروغ دینا۔

۲۔ درآمدات و برآمدات پر نرخ ناموں کی پابندی ختم کرنا اور مشترکہ کسٹم نرخ نامہ وجود میں لانا۔

۳۔ ممبر ممالک کے شہریوں کے درمیان افراد کی آمد و رفت، خدمات اور سرمائے کی ترسیل پر پابندیاں ختم کرنا۔

۴۔ مزدوروں کی اجرت میں اضافہ کرنا تاکہ عام معیار زندگی بہتر ہو۔

۵۔ زرعی میدان میں مشترک پالیسی اختیار کرنا۔

۶۔۔۔یورپی سرمایہ کاری فنڈ کا قیام تاکہ اقتصادی ترقی کے لئے مناسب منصوبہ بندی ہو سکے
۷۔۔۔مشترکہ کسٹم ڈیوٹی اور مشترکہ تجارتی پالیسی مرتب کرنا تاکہ کمیونٹی عالمی تجارت میں ایک وحدت کی حیثیت سے موثر کردار ادا کر سکے۔
۸۔۔۔یورپی ممالک کا اقتصادی اتحاد کے ساتھ ساتھ سیاسی اتحاد پیدا کرنا بھی منڈی کا ایک مقصد تھا۔ تاکہ کچھ عرصہ بعد "ریاست ہائے متحدہ یورپ" وجود میں آسکے۔

منڈی کا ڈھانچہ

منڈی مندرجہ ذیل اداروں پر مشتمل ہے

(ا) وزراء کی کونسل (ب) اسمبلی (ج) عدالت انصاف (د) انتظامی کمیشن

(ا) وزراء کی کونسل

ہر ممبر ملک وزراء کی کونسل میں ایک نمائندہ بھیجتا ہے رائے شماری میں ہر ریاست کو اس کی اقتصادی حالت کے اعتبار سے حق رائے دہی دیا گیا ہے۔ فرانس، مغربی جرمنی اور اٹلی کے چار چار ووٹ ہیں جبکہ بلجیم اور نیدرلینڈ کے دو دو ووٹ لکسمبرگ کا ایک ووٹ ہے۔

(ب) اسمبلی

اسمبلی کے ۱۴۲ اراکین کا انتخاب مشترکہ منڈی کی رکن ریاستوں کی پارلیمان کرتی ہیں تاہم اٹلی، فرانس اور مغربی جرمنی میں سے ہر ایک ۳۶ بلجیم و نیدرلینڈ میں سے ہر ایک ۱۴ لکسمبرگ ۶ ارکان منتخب کر کے اسمبلی میں بھیجتا ہے۔ یورپی مشترکہ منڈی کا صدر دفتر بلجیم کے دارالحکومت برسلز میں واقع ہے۔ جہاں رکن ممالک کے نمائندے بنیادی پالیسیاں بنانے کے لئے باہمی اتفاق سے فیصلے کرتے ہیں اور اسمبلی کے باقاعدہ اجلاس ہوتے رہتے ہیں۔

(ج) عدالت انصاف

منڈی کی عدالت انصاف ۷ ججوں پر مشتمل ہے عدالت کا کام معاہدے کی تشریح کرنا اور قانون کی حکمرانی کو برقرار رکھنا ہے۔ اس کے فیصلے فریقین پر قانونی پابندی کی حیثیت رکھتے ہیں۔

(د) انتظامی کمیشن

کمیشن کے کل ۹ اراکین ہیں۔ جن کا کام مشترکہ منڈی کی نگرانی اور کارکردگی کا جائزہ لینا ہے۔ کمیشن جو قوانین و ضوابط مرتب کرتا ہے۔ وزراء کی کونسل اس پر غور کرتی ہے۔ کمیشن

کے اختیارات جنرل ڈیگال کی پالیسی کی بدولت شروع میں محدود رہے حالانکہ دیگر ممالک شروع ہی سے کمیشن کو وسیع اختیارات دینا چاہتے تھے۔

منڈی کے مسائل

۱۹۶۳ء تک مشترکہ منڈی کے ممبر ممالک نے صنعت میں اپنے بیشتر مقاصد میں کافی کامیابی حاصل کی، کسٹم ڈیوٹی ختم ہوئی عالمی تجارت میں رکاوٹیں کم ہوئیں اور آزاد تجارت کو فروغ ملا۔ لیکن جہاں تک زرعی میدان کا تعلق ہے۔ اس سلسلے میں جو مشترکہ پالیسی تھی اس میں منڈی کو کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہیں ہوئی مجموعی طور پر ۱۹۶۰ء میں منڈی کو حسب ذیل مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔

۱ منڈی کا ایک مسئلہ یہ تھا کہ برطانیہ نے اس میں شمولیت اختیار نہ کی۔ اس کی دو وجوہات تھیں اول یہ کہ برطانیہ آزاد خارجہ پالیسی کا خواہاں تھا۔ اس کا خیال تھا کہ منڈی میں شمولیت اختیار کرنے پر شاید مجھے اپنے اقتدار اعلیٰ کے کسی حصے سے دستبردار ہونا پڑے۔ دوئم یہ کہ دولت مشترکہ کے ممالک کے ساتھ برطانیہ کے اقتصادی تعلقات تھے۔ اس بارے میں برطانیہ کی پالیسی یہ تھی کہ منڈی میں شامل ہونے کی وجہ سے ان کے اعتماد کو ٹھیس پہنچے گی۔

۲ برطانیہ نے سوئٹزرلینڈ، آسٹریا، پرتگال اور کوئس کیتول (آئس لینڈ، سویڈن، ناروے، فن لینڈ) کے ممالک کے ساتھ مل کر ایک ایسوسی ایشن قائم کی۔ اس ایسوسی ایشن کا بنیادی مقصد ممبر ممالک کی تجارت کو فروغ دینا تھا جن کو مشترکہ منڈی سے خطرہ لاحق تھا۔ مشترکہ منڈی کے وہ ممالک جو منڈی کے غیر ممبر ممالک سے ساتھ تجارت کرتے تھے۔ ان ممالک سے درآمدی ڈیوٹی لی جاتی تھی۔ نیز یہ کہ برطانیہ کی قائم کردہ یہ ایسوسی ایشن آبادی اور ذرائع کے لحاظ سے بھی منڈی کے مقابلے میں بہت کم اہمیت رکھتی تھی اور یہ کہ ایسوسی ایسویشن کے ممبر ممالک کے مابین تجارت کے سلسلے میں کوئی مشترکہ پالیسی بھی قائم نہ تھی۔ منڈی کے چھ ممالک ۱۶۵ ملین آبادی کی نمائندگی اور یورپ کے ۲/۳ ذرائع پر قابض تھے۔ جبکہ ایسوسی ایشن کے ممبر ممالک ۸۰ ملین آبادی کی نمائندگی کرتے تھے۔

۳ ۱۹۶۱ء تک جب برطانوی مصنوعات کی کھپت کے علاقوں پر مشترکہ منڈی کا قبضہ ہوگیا تو برطانیہ نے منڈی میں شمولیت کے لئے مذاکرات کا آغاز کیا۔ کیونکہ اس سے برطانیہ پر اقتصادی دباؤ بڑھ گیا تھا۔ اور دوسری طرف امریکہ کے لئے یہ خطرہ پیدا ہوگیا تھا کہ کہیں فرانس اور مغربی

جرمنی مل کر کوئی ایسا محور نہ قائم کر لیں جو مستقبل قریب میں طاقت کے میدان میں بھی اس کا مقابلہ کرنے لگیں۔ اس وجہ سے امریکہ برطانیہ کی یورپی مشترکہ منڈی میں شمولیت کے حق میں ہو گیا۔ فرانس کے سابق صدر جنرل ڈیگال اور مغربی جرمنی کے چانسلر ایڈنیوز برطانیہ کی شمولیت کے خلاف تھے۔ لہذا جنرل ڈیگال کے مستعفی ہونے کے بعد جب پامپیڈو فرانس کے صدر بنے تو برطانیہ منڈی کا ممبر بنا۔ برطانیہ کی شرکت کے بعد ۱۹۷۲ء میں ڈنمارک اور آئرلینڈ بھی منڈی میں شامل ہو گئے۔ جس سے منڈی کے ممبر ممالک کی تعداد ۹ ہو گئی۔ جہاں تک ناروے کا تعلق ہے تو ناروے نے شامل ہونے سے پہلے اپنے ہاں اس بات پر ریفرنڈم کروایا۔ عوام کی مخالفت کی وجہ سے ناروے اس منڈی کا ممبر نہ بن سکا۔ بعد ازاں ناروے نے بھی منڈی میں شمولیت اختیار کر لی۔

باب دہم

بین الاقوامی دفاعی معاہدات

INTERNATIONAL DEFENCE TREATIES

۱۔ معاہدہ تنظیم جنوب مشرقی ایشیاء (سیٹو)

۲۔ معاہدہ بغداد (سینٹو)

۳۔ آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور امریکی معاہدہ (انزوز پیکٹ)

۴۔ تنظیم معاہدہ شمالی اوقیانوس (ناٹو)

۵۔ معاہدہ وارسا

ا۔ معاہدہ تنظیم جنوب مشرقی ایشیاء

SOUTH EAST ASIAN TREATY ORGANISATION

۸ ستمبر ۱۹۵۴ء کو منیلا میں اس تنظیم کا قیام عمل میں آیا۔ اس معاہدے میں کل آٹھ ممالک امریکہ برطانیہ، فرانس، فلپائن، نیوزی لینڈ، فرانس، آسٹریلیا اور پاکستان شامل تھے۔

وجوہات

نظریاتی اختلاف، مختلف پالیسیاں، ثقافتی اختلاف، غربت، پست تعلیمی معیار، وغیرہ یہ وہ عوامل تھے جو ایشیائی ممالک کو ایک پلیٹ فارم تلے جمع کرنے کے سلسلے میں بہت بڑی رکاوٹ تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ ایشیاء میں کوئی ایسا ملک نہیں تھا جو اپنی برتری کا دعویٰ کرسکے۔ چنانچہ ۱۹۴۹ء میں سرخ چین کا قیام عمل میں آیا تو اس کے ساتھ ہی جنوب مشرقی ایشیاء میں سوشلزم کے نظریات و اثرات کے تحفظ کا مسئلہ پیدا ہوگیا۔ اشتراکی چین نے کوریا کی جنگ ۱۹۵۱ء میں شمولیت اختیار کی تو مغربی بلاک یہ سوچنے پر مجبور ہوگیا کہ یورپ کے علاوہ ایشیاء کو بھی سرخ خطرے سے بچانا ضروری ہے۔ اس لئے امریکہ اس طرف متوجہ ہوا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ ہند چینی میں بھی کمیونزم فروغ پا رہا تھا۔ یعنی کمیونسٹ عناصر کا غلبہ ہو رہا تھا۔ تھائی لینڈ اور ملائیشیا میں باقاعدہ کمیونزم گوریلا تنظیم کام کر رہی تھی۔

پاکستان کی شمولیت

پاکستان کا اس معاہدے میں شامل ہونے کی بنیادی وجہ ہندوستان کے ساتھ پاکستان کے اختلافات تھے۔ اس سلسلے میں پاکستان امریکہ سے تحفظ کا طلبگار تھا۔ اس طرح سے ہم دیکھتے ہیں کہ پاکستان کا مقصد سیٹو کے دیگر ممبر ممالک کے مقاصد سے مختلف تھا۔

تنظیم کے ادارے ڈھانچہ یا تنظیم

سیٹو کا ہیڈکوارٹر تھائی لینڈ میں قائم کیا گیا تھا۔ ناٹو کے مقابلے میں سیٹو میں محدود ادارے تھے۔ اس میں وزرائے خارجہ کی کونسل سب سے اہم تھی علاوہ ازیں تعلیمی کمیٹی، ثقافتی کمیٹی اعلانات فراہم کرنے کی کمیٹی شامل تھیں۔

کارکردگی

سیٹو میں تخریب کاری کا کوئی ذکر نہیں ملتا جبکہ ناٹو میں کہا گیا کہ اس کا مقصد تخریب کاری

کو روکنا ہے۔ سیٹو کا اگر ہم ناٹو سے مقابلہ کریں تو ہم دیکھیں گے کہ ناٹو ایک یورپی تنظیم ہے اور سیٹو ایشیائی تنظیم ہے۔ ناٹو کے مقابلے میں یہ کمزور ممالک کا معاہدہ تھا۔ ناٹو کے ممبر ممالک میں علاقائی تنازعات نہیں تھے۔ ان ممالک کو صرف سوویت یونین سے خطرہ تھا۔ اس کے مقابلے میں سیٹو کے ممبر ممالک کے درمیان "ثقافتی تعلقات" میں اختلافات تھے اور اس میں کوئی مشترکہ فوج قائم نہیں کی گئی تھی۔ اس لئے یہ کمزور معاہدہ تھا۔

سیٹو ہر آزمائش کے وقت ہمیں ناکام نظر آتا ہے ۱۹۶۵ء سے ۱۹۷۰ء تک جنوبی لبنان میں کمیونسٹ عناصر کی جنگ، ہند چین کو دوبارہ امریکی اثر میں لانے کے لئے سیٹو کی کونسل کا اجلاس ہوا کہ ہند چین میں کمیونزم کو روکا جائے۔ لیکن برطانیہ اور فرانس نے امریکہ کی یہ بات ماننے سے انکار کر دیا۔ جس کی وجہ سے کونسل ملتوی ہو گئی ۱۹۶۵ء میں جس وقت جنوبی ویت نام اور شمالی ویت نام میں جنگ شدید ہو گئی اس وقت لندن میں سیٹو کے ممبران کی ایک کانفرنس بلائی گئی جس میں تمام ممبر ممالک اس بات پر متفق ہوئے کہ ویت نام میں کمیونزم کو روکنے کے لئے مشترکہ کوششیں کی جائیں لیکن فرانس نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے اس نے اس قرارداد پر اپنی رائے کو محدود رکھا۔ کیونکہ اس وقت پاکستان اور چین کے تعلقات بڑھ رہے تھے۔

۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ میں پاکستان کو نہ صرف یہ کہ معاہدہ کے فریقین کی طرف سے کوئی امداد نہ ملی بلکہ پاکستان کے مدمقابل بھارت کو مختلف طریقوں سے امداد بہم پہنچائی گئی ۱۹۶۵ء کے بعد پاکستان امریکہ سے بدظن ہو گیا تھا پاکستان نے ۷ ستمبر ۱۹۷۳ء میں سیٹو سے علیحدگی کا اعلان کر دیا تھا پاکستان نے یہ فیصلہ مشرقی حصہ کی علیحدگی یعنی بنگلہ دیش کے قیام کے بعد کیا۔ ان تمام باتوں پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس تنظیم میں جب بھی کبھی کمیونزم کو روکنے کے لئے کوشش کی گئی اس کو ہمیشہ دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ فرانس نے ۱۹۶۵ء کے بعد سے اپنے وزیر خارجہ کو سیٹو کے اجلاس میں بھیجنا بند کر دیا تھا۔

معاہدے کا خاتمہ

۲۴ ستمبر ۱۹۷۵ء کو اس معاہدے کو ختم کر دیا گیا۔ اس طرح یہ معاہدہ ۲۱ سال برقرار رہا معاہدہ کے خاتمے کی وجوہات حسب ذیل تھیں۔

۔ فرانس اور برطانیہ کی مشرق بعید کے علاقوں سے دلچسپی ختم ہو گئی تھی۔

۔ نیوزی لینڈ، آسٹریلیا، اور فلپائن کو معاہدہ انزوز کے ذریعے اپنے مفادات کا تحفظ حاصل ہو چکا تھا۔

۔ ۰ امریکہ اور چین میں تعلقات کا آغاز ہو گیا تھا۔

۔ ۰ امریکہ اور سوویت یونین پُرامن بقائے باہمی کی پالیسی اختیار کر لی تھی

معاہدے کی دفعات

معاہدے میں شامل تمام فریقین عہد کرتے ہیں کہ

ا۔ وہ تمام ارکان کی مقتدر حیثیت کو مساوی طور پر تسلیم کرتے ہیں۔

ب۔ اقوام متحدہ کے منشور و مقاصد و اصول پر اعتماد کرتے ہیں اور اس بات کے خواہشمند ہیں کہ تمام حکومتوں کے عوام کے ساتھ پرامن طریقہ سے زندگی بسر کریں۔

ج۔ منشور اقوام متحدہ کے مطابق وہ اس بات کا اعادہ کرتے ہیں کہ عوام کے حق خود ارادیت اور مساوی اصولوں پر عمل درآمد کریں گے اور اعلان کرتے ہیں کہ ان تمام ممالک جن کے عوام ذمہ داریوں کو قبول کرنے کی خواہش اور تکمیل کی صلاحیت رکھتے ہیں، کی آزادی کے تحفظ میں بھرپور مدد کریں گے اور امن و سلامتی کی خاطر مشترکہ کوششوں اور اجتماعی تحفظ کے اصولوں پر کاربند رہیں گے۔

ان امور پر اتفاق کی بنا پر انہوں نے عہد کیا کہ

ا۔۔۔۔ فریقین منشور اقوام متحدہ میں بیان کردہ طریقہ سے بین الاقوامی تنازعہ کے تصفیہ کے لئے پرامن ذرائع کو اس طرح اپنائیں گے کہ بین الاقوامی امن و سلامتی اور انصاف کو کوئی خطرہ پیش نہ آئے بین الاقوامی تعلقات میں طاقت کے استعمال یا دھمکی سے گریز کریں گے۔

۲۔۔۔۔ فریقین باہمی تعاون کے تمام اداروں کی ترقی و استحکام کے لئے کام کریں گے تاکہ مزید ترقی کے لئے معاشی طریقوں کو مضبوط بنایا جا سکے۔ اس میں معاشی و ثقافتی ترقی کے لئے بھی تعاون شامل ہے۔

۳۔۔۔۔ اس معاہدے کو زیادہ سے زیادہ موثر بنانے کے لئے فریقین انفرادی و اجتماعی طریقہ سے مسلسل اپنی مدد آپ اور باہمی امداد کے ذریعے اپنی انفرادی و اجتماعی صلاحیت کو فروغ دیں گے تاکہ کسی بھی جارحانہ حملہ کے مقابلہ کے لئے اپنی علاقائی سالمیت اور

سیاسی استحکام کو مستحکم کیا جائے۔

۴۔۔۔ (ا) تمام فریقین اس بات پر متفق ہیں کہ کسی بھی رکن ریاست یا ارکان کی سالمیت کے خلاف مسلح حملہ یا اقدام جس سے امن و تحفظ کا مسئلہ کھڑا ہوتا ہے دستوری طریقہ سے سلامتی کونسل کو دی جائے گی۔

(ب) اگر فریقین کے خلاف کسی فریق کی سالمیت، سیاسی آزادی یا علاقائی سالمیت جو معاہدہ کے علاقہ ریاست کے علاقہ جو دفعہ کی شق (ا میں واضح کیا گیا ہے، میں ملوث ہو یا کسی طرح خطرے میں ہو جو مسلح حملے کے علاوہ یا کسی ایسی صورت سے متاثر ہو یا دھمکی دی گئی ہو جس سے علاقے کے امن کو خطرہ لاحق ہو تو فریقین فوری طور سے مشترکہ کارروائی پر عمل درآمد کا تعین کرنے کے لئے ایک دوسرے سے صلاح مشورہ کریں گے۔

(ج) یہ واضح کیا جاتا ہے کہ تمام ریاستیں یا علاقے جو شق ا کے تحت آئیں گے، کے معاملے میں اقدامات درخواست پر کئے جائیں گے یا اس حکومت کی منظوری کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھایا جائے گا۔

۵۔۔۔ فریقین ایک کونسل کے قیام پر متفق ہیں۔ جس میں تمام ارکان کو معاہدہ پر عمل درآمد کے معاملات کا تعین کرنے کے لئے نمائندگی حاصل ہو گی کونسل علاقے کی صورت حال اور آئے دن کی ضرورت کے پیش نظر فوجی اسکیموں کے معاملات سے متعلق صلاح مشورہ کرے گی اور اس کو اس طرح منظم کیا جائے گا کہ وہ کسی بھی وقت اپنا اجلاس طلب کر سکتی ہے۔

۶۔۔۔ اس معاہدے کی تشریح سے فریقین کے وہ حقوق و فرائض متاثر نہیں ہوں گے۔ جو انھیں اقوام متحدہ کے منشور کے تحت حاصل ہیں اس سے اقوام متحدہ کے بین الاقوامی امن و سلامتی کے اقدامات پر کسی قسم کے اثرات مرتب نہیں ہوں گے۔ فریقین اعلان کرتے ہیں کہ ان کا آپس میں یا کسی دوسری ریاست سے کوئی بھی ایسا بین الاقوامی سمجھوتہ نہیں ہے جو اس معاہدہ کی دفعات سے متضاد ہو اور یہ بھی وعدہ کرتے ہیں کہ وہ آئندہ کسی بھی بین الاقوامی معاہدے یا سمجھوتے میں شامل نہیں ہوں گے جو اس معاہدے کی شرائط سے مختلف ہو۔

۷۔۔۔ اس معاہدے کے مقاصد کے پیش نظر کوئی اور ملک جو اس علاقے کی امن و سلامتی

میں مدد دے سکتا ہو فریقین کی باہمی رضا مندی سے اس معاہدے میں شامل کیا جائے گا۔ کوئی ریاست جو اس میں شمولیت کے لئے مدعو کی گئی ہو اپنی شمولیت کے لوازمات کو حکومت جمہوریہ فلپائن کے پاس جمع کرا کر رکن بن سکتی ہے جس کی اطلاع حکومت فلپائن تمام ارکان کو دیگی۔

۸ ۔ اس معاہدہ میں جنوب مشرقی ایشیا کا تمام علاقہ شامل ہے۔ جس میں ایشیائی ارکان کے علاقے اور جنوب مشرقی بحرالکاہل کا عام علاقہ شامل ہے۔ بحرالکاہل کے علاقے میں ۲۱ درجہ شمال سے ۳۰ سینٹ شمال کا دائرہ شامل نہیں ہے۔ فریقین باہمی اتفاق سے اس دفعہ میں ترمیم کرکے دفعہ نمبر ۷ کے تحت معاہدہ میں کسی بھی نئی ریاست کو شامل کر سکتے ہیں یا موجودہ علاقہ کی حدود میں تبدیلی کر سکتے ہیں۔

۹ ۔ (ا) اس معاہدہ کی اصل حکومت جمہوریہ فلپائن کے پاس جمع رہے گی جبکہ اس کی نقول شدہ کاپیاں معاہدے کے دستخط کنندگان کو دی جائیں گی۔

(ب) اس معاہدے پر عمل درآمد اس دن سے شروع ہوگا۔ جس دن معاہدہ کی توثیق معاہدہ میں شامل ریاستوں کی اکثریت کی طرف سے موصول ہو جائے گی۔

(ج) اس معاہدے کی توثیق تمام فریقین اپنے اپنے دستوری طریقہ سے کریں گے۔ اور توثیق کا تصدیق نامہ جلد از جلد حکومت فلپائن کے پاس جمع کرا دیا جائے گا۔ جس کی اطلاع حکومت فلپائن تمام فریقین کو دے گی۔

۱۰ ۔ یہ معاہدہ غیر معینہ مدت تک برقرار رہے گا۔ لیکن کوئی بھی فریق حکومت فلپائن کو ایک سال پہلے نوٹس دے کر اس سے علیحدہ ہو سکتا ہے حکومت فلپائن اس کی اطلاع باقی تمام دوسرے فریقین کو دے گی۔

۱۱ ۔ معاہدہ کا انگریزی اور فرانسیسی متن بالترتیب مستند تسلیم کیا جائے گا۔ معاہدہ میں امریکہ کی طرف سے اس میں اضافہ کیا گیا کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا نمائندہ وفد اس معاہدے پر دستخط کرتے وقت یہ خیال ظاہر کرتا ہے کہ اس کے تحت حملے کے خطرے یا مسلح حملہ جو دفعہ نمبر ۴ کے پیراگراف (۱) کے تحت تسلیم کیا گیا ہے، کا تعلق کمیونسٹ حملہ سے ہے۔ لیکن وہ عہد کرتا ہے کہ کسی اور حملہ یا جارحیت کی صورت میں دفعہ نمبر ۴ کی شقوں کے تحت صلاح مشورہ کرے گا۔

۲۔ معاہدہ بغداد یا سینٹو

BAGHDAD PACT OR CENTO

عراق کے شہر بغداد میں ۲۴ فروری ۱۹۵۴ء کو ترکی اور عراق کی حکومتوں نے باہمی اتحاد و تعاون کی خاطر اس معاہدے پر دستخط کئے۔ تھوڑے ہی عرصے کے بعد اس میں برطانیہ، ایران اور پاکستان بھی شامل ہو گئے۔ اسی طرح ۱۹۵۵ء تک معاہدہ بغداد میں پانچ ممالک شامل ہو چکے تھے اپریل ۱۹۵۶ء میں امریکہ اس معاہدے کی معاشی کمیٹی اور جون ۱۹۵۷ء میں ملٹری کمیٹی کا رکن بنا اس طرح امریکہ نے اس معاہدے میں سرکاری طور پر شمولیت اختیار نہیں کی بلکہ ایک مبصر کی حیثیت سے شریک رہا۔ امریکہ اس معاہدے میں باقاعدہ شامل ہو کر ہندوستان، مصر اور سعودی عرب کو ناراض کرنا نہیں چاہتا تھا۔ یہ ممالک سینٹو کے قیام کی وجہ سے ناراضگی کا اظہار کر چکے تھے۔

۴ مارچ ۱۹۵۹ء میں امریکہ نے ایران، ترکی اور پاکستان سے ایک باہمی تحفظ کے معاہدے پر دستخط کئے۔ جس کے تحت امریکہ ان تینوں ممالک کو فوجی ساز و سامان اور دفاعی تعاون مہیا کرنے کا پابند ہو گیا۔ اسی دوران عراق میں انقلاب آ گیا۔ جس کی بدولت ۲۶ مارچ ۱۹۵۹ء کو عراق اس "معاہدہ بغداد" سے الگ ہو گیا۔ تو اس معاہدے کا نام "معاہدہ بغداد" کے بجائے سینٹو CENTRAL TREATY ORGANISATION رکھا گیا۔

سینٹو کا صدر مقام

عراق کی علیحدگی کے بعد اس کا صدر مقام بغداد سے انقرہ منتقل کر دیا گیا۔

معاہدے کی وجوہات

امریکی انتظامیہ مشرق وسطیٰ میں کمیونزم کو روکنا چاہتی تھی اور یہ معاہدہ امریکہ کی "گھیراؤ کی پالیسی" POLICY OF CONTAINMENT کا نتیجہ تھی۔ امریکہ نا ٹو کے طرز پر تنظیم قائم کرنا چاہتا تھا۔ لیکن مصر کے صدر ناصر کے انکار کی وجہ سے امریکہ اس میں کامیاب نہ ہو سکا۔

معاہدے کے مقاصد

ا۔ سینٹو کے منشور میں اس تنظیم کو دفاعی اور علاقائی تعاون کی تنظیم قرار دیا گیا ہے

کسی بھی ممبر ممالک پر جارحیت کی صورت میں ممبر ممالک کی مدد کی جائے۔ جہاں تک جارحیت کا تعلق ہے اس کی معاہدے میں تعریف نہیں کی گئی اس چیز کا ذکر بھی نہیں کیا گیا کہ یہ تنظیم کمیونسٹ یا غیر کمیونسٹ جارحیت کے خلاف ہے۔ علاوہ ازیں اقتصادی، ثقافتی اور سائنسی میدان میں تعلقات کو فروغ دیا جائے گا۔

۲۔ ممبر ممالک کے معاملات میں اراکین کو مداخلت کی اجازت نہ تھی۔ معاہدے کے منشور میں کہا گیا تھا کہ تنازعات کا پُر امن حل تلاش کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ معاہدے کے مطابق دوسرے ممالک خصوصاً عرب لیگ کے ارکان کسی بھی وقت معاہدے میں شامل ہو سکتے تھے۔ اس معاہدے کے تحت قائم کیا جانے والا سب سے اہم ادارہ "وزراتی کونسل" تھا۔

۳۔ کمیونزم کی روک تھام کے لئے مختلف کمیٹیاں قائم کی گئیں جو حسب ذیل تھیں۔

- فوجی کمیٹی
- اقتصادی کمیٹی
- ثقافتی کمیٹی
- رابطہ کمیٹی
- سائنسی کمیٹی
- تخریب کاری کو روکنے کے لئے کمیٹی

سینٹو اور روس کی پالیسی

اس معاہدے کا بنیادی مقصد کمیونزم جارحیت کو روکنا تھا اس لئے روس کی طرف سے اس معاہدے کی مذمت کی گئی ایران اور ترکی سے روس نے احتجاج کیا ۱۹۵۵ء میں سوویت وزیر اعظم نے ہندوستان اور افغانستان کا دورہ کیا۔ اور انتقامی کاروائی کے طور پر سوویت یونین نے ہندوستان کے حق میں کشمیر کی اور پختونستان کے سلسلے میں افغانستان کی حمایت کا اعلان کیا۔ اس وقت چین اور روس میں دوستی تھی اور پاکستان روسی پالیسی کی مخالفت کی زد میں تھا۔ اس تنظیم میں جو ممالک شامل تھے وہ سب کمیونزم کے خلاف تھے اور چند ایک کی سرحدیں روس سے ملتی تھیں۔ غیر جانبدار ممالک نے چین سمیت اس معاہدے کی مذمت کی کہ اس طرح دنیا کو دو بلاکوں میں تقسیم کیا جا رہا ہے۔ ہندوستان نے خصوصاً اس معاہدے پر برہمی کا اظہار کیا۔ کیونکہ اسے پاکستان سے خطرہ محسوس ہو رہا تھا اور حقیقت بھی یہی ہے کہ پاکستان اس تنظیم میں اس لئے شامل ہوا کہ ہندوستان کے خلاف موثر دفاع کر سکے۔

تنظیم کی کارکردگی

اس معاہدے میں شامل تیسری دنیا کے ممالک ایران، ترکی اور پاکستان جن مسائل و حالات سے دوچار ہوئے اس سے نمٹنے اور باہمی اتحاد و تعاون کے فقدان نے سرے سے ہی اس تنظیم کی

اہمیت و ضرورت کے دامن کو تار تار کر دیا ہے اس معاہدے کی کارکردگی پر اثر انداز ہونے والے دو عوامل سب سے اہم ہیں۔ اول تو یہ کہ امریکہ نے اس تنظیم میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔ دوئم یہ کہ سیٹو کی طرح سینٹو میں بھی کوئی مشترکہ دفاعی کمان قائم نہ کی گئی تھی۔

جہاں تک جارحیت کے خلاف امداد دینے کا تعلق ہے۔ تو یہ ایک ڈھیلا ڈھالا نظام تھا۔ نیز یہ ہر ایک ملک کی مرضی پر مشتمل تھا۔ مزید یہ کہ جو اراکین اس معاہدے میں شامل تھے وہ صرف سینٹو کے بنیادی مقصد پر متفق تھے۔ مثلاً ایران کو سوویت یونین سے خطرہ لاحق تھا۔ ترکی کے بارے میں بھی کہا جاتا ہے کہ سلطنت عثمانیہ کے ساتھ روس کی ۸ جنگیں ہو چکی تھیں۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد روس نے ترکی کو دھمکی دی تھی کہ درہ دانیال پر مشترکہ کنٹرول ہوگا۔

پاکستان کی اس تنظیم میں شمولیت کی وجہ روسی جارحیت سے خطرہ نہ تھا بلکہ ہندوستانی جارحیت کا مقابلہ کرنے کے لئے اس تنظیم میں شامل ہوا تھا۔ پاکستان نے کوشش کی کہ جارحیت کی تعریف میں کمیونسٹ اور غیر کمیونسٹ جارحیت کی وضاحت ہو جائے لیکن اسے کامیابی حاصل نہ ہو سکی اس کا مطلب یہ ہوا کہ سینٹو کے اراکین پر اگر کوئی غیر کمیونسٹ مملکت حملہ آور ہوتی ہے تو سینٹو کے اراکین اس کے خلاف کوئی کاروائی نہیں کریں گے۔ ثبوت کے طور پر ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی پاک و ہند کی جنگ کو دیکھا جا سکتا ہے۔

معاشی میدان میں اس معاہدے کے تحت کچھ اقدامات کئے گئے تھے جن میں خاص طور پر ایران، پاکستان اور ترکی کی ٹیلی کمیونیکیشن نظام کی تشکیل بہت اہم ہے۔

سینٹو کا خاتمہ :۔

۱۹۷۹ء میں پاکستان نے اور ۱۹۸۰ء میں ایران کی انقلابی حکومت نے سینٹو سے علیحدگی اختیار کر لی اس طرح یہ معاہدہ ۱۹۸۰ء میں ختم ہو گیا۔ امریکہ نے خود بھی اس تنظیم کو قائم رکھنے کے لئے کوئی دلچسپی نہیں لی کیونکہ بین الاقوامی سیاست میں اہم تبدیلیاں آ چکی تھیں۔ امریکہ اور روس کے مابین سرد جنگ کا خاتمہ ہو رہا ہے اور اس کی جگہ "پرامن بقائے باہمی" کی پالیسی پر عمل درآمد کیا جا رہا ہے۔ چین دنیا کی تیسری طاقت بن کر میدان میں آ چکا ہے۔ اب صرف دو اہم تنظیمیں ناٹو اور وارسا پیکٹ ہیں۔ اکثر ممالک کی طرف سے یہ تجویز پیش کی گئی ہے کہ ان دونوں تنظیموں کو ایک ساتھ ختم کر دیا جائے۔

معاہدے کی دفعات

اس معاہدے میں آٹھ دفعات اور دو تشریحی گوشوارے شامل ہیں۔ عربی، ترکی اور انگریزی زبانوں میں اس کے متن کو مستند تسلیم کیا گیا۔ لیکن شک کی صورت میں انگریزی متن کو فوقیت دی گئی ہے۔

۱۔۔۔ اقوام متحدہ کے منشور کی دفعہ ۵۱ کے تحت فریقین اپنی سلامتی اور حفاظت کے لئے باہمی تعاون کریں گے اور باہمی سمجھوتوں کے ذریعے اتحاد کو موثر طریقے سے عمل میں لائیں گے۔

۲۔۔۔ دفعہ نمبر۱ میں بیان کردہ اتحاد کو موثر بنانے کے لئے جلد از جلد فریقین کے ذمہ دار مدبرین موثر اقدامات کریں گے۔ بشرطیکہ فریقین حکومتیں ان کی باقاعدہ منظوری دے دیں۔

۳۔۔۔ فریقین ایک دوسرے کے اندرونی معاملات میں ہر قسم کی مداخلت سے گریز کریں گے۔ اور آپس میں پیدا ہونے والے تنازعات کو اقوام متحدہ کے منشور کے تحت باہمی صلاح و مشورے سے پُر امن طریقے سے طے کریں گے۔

۴۔۔۔ دستخط کنندہ اعلان کرتے ہیں کہ وہ موجودہ معاہدے کی شرائط سے متضاد کسی بھی بین الاقوامی معاہدہ یا سمجھوتہ میں شریک نہیں ہوں گے اور نہ اس معاہدے کے تحت کوئی ایسی تشریح کی جا سکتی ہے جو فریقین کی بین الاقوامی ذمہ داریوں اور اقوام متحدہ کے تحت حقوق و فرائض کو متاثر کرتی ہو۔ فریقین اس کا بھی اعلان کرتے ہیں کہ وہ آئندہ کسی بھی ایسے بین الاقوامی معاہدہ میں شامل نہیں ہوں گے۔ جس میں اس معاہدہ سے متضاد شرائط شامل ہوں گی۔

۵۔۔۔ اس معاہدے میں عرب لیگ کے ارکان اور ہر وہ ریاست جو اس علاقے کی امن و سلامتی میں موثر کردار ادا کر سکتی ہو شامل ہو سکتی ہے۔ لیکن اس سلسلے میں معاہدے کے فریقین کی رضامندی ضروری ہے اور شمولیت اس دن سے تصور کی جائے گی جس دن اس کا تصدیق نامہ حکومت عراق کے پاس جمع کرا دیا جائے گا۔ معاہدہ کے ارکان دفعہ نمبر ۲ کے تحت کسی مخصوص سمجھوتے کو بھی عمل میں لا سکتے ہیں۔ فریقین کی حکومتوں کی منظوری کے بعد اقدامات پر عمل درآمد شروع ہو جائے گا۔ کونسل کو اپنے طریقہ کار اور فوائد کا تعین کرنے کا اختیار حاصل ہو گا۔

۶۔۔۔ یہ معاہدہ پانچ سال تک برقرار رہے گا اس کے بعد قابل تجدید ہو گا کوئی بھی ریاست تجدید کے وقت سے ۶ ماہ قبل نوٹس دے کر اس معاہدے سے الگ ہو سکتی ہے جس کی اطلاع وہ تمام اراکین کو تحریری طور پر دے گی۔ تاہم معاہدہ باقی فریقین کے درمیان برقرار رہے گا۔

۷۔۔۔۔ جب کم از کم چار ریاستیں اس معاہدے میں شامل ہو جائیں گی تو ایک مستقل کونسل وزراتی سطح پر قائم ہوگی تاکہ اس معاہدے کے مقاصد کو روبہ عمل لانے کے لئے کام کیا جا سکے۔

۸۔۔۔۔ اس معاہدے کی توثیق تمام فریقین اپنے طریقہ دستور کے تحت کریں گے۔ جس کی تصدیق دہ انقرہ میں تبادلے کے لئے بھیجیں گے۔ تصدیقات کے تبادلے کے ساتھ معاہدہ پرعمل درآمد شروع ہو جائے گا۔

۳۔ آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور امریکی معاہدہ (انزوز پیکٹ)

AUSTRALIAN, NEWZEALAND AND U.S. PACT (A.N.Z.U.S.PACT)

جنوب مشرقی ایشیاء میں ناٹو کے قیام کے بعد امریکہ نے اس بات کی ضرورت محسوس کی کہ بحرالکاہل کے علاقے میں امریکی مفادات کے تحفظ اور چین کے سرخ خطرے کو آگے بڑھنے سے روکنے کے لئے اس خطے کے ممالک سے اجتماعی سلامتی کا نظام قائم کرنا چاہیئے اس کے لئے ضروری تھا کہ ایوان نمائندگان کی وزرائے خارجہ کمیٹی سے منظوری لی جائے چنانچہ امریکی حکومت نے اس تجویز کو قبول کر لیا۔ اور یہ اجازت دے دی کہ بحرالکاہل کے علاقے میں واقع بیشتر ممالک مثلاً فلپائن، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، جاپان، جنوبی کوریا اور فارموسا (قوم پرست چائنا) کے ساتھ اجتماعی معاہدے کئے جائیں۔ ۱۹۵۱ء میں باہمی اتفاق سے معاہدہ انزوز عمل میں لایا گیا۔

معاہدہ انزوز کے اراکین

آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور امریکہ

اس معاہدہ کے تحت امریکہ نے ممبر ممالک کو کمیونسٹ جارحیت کے خلاف دفاع کی ضمانت دی اور جاپان سے خطرے کا جو تصور نیوزی لینڈ اور آسٹریلیاء کو تھا اس سلسلے میں امریکہ نے وعدہ کیا۔ حالانکہ آسٹریلیاء اور نیوزی لینڈ کی یہ تشویش حقیقت پر مبنی نہیں تھی اول یہ کہ جاپان پر اسلحہ کی پابندی ہے اور دوئم یہ کہ امریکہ کو جاپان کی دفاعی پالیسی پر مکمل کنٹرول ہے اس وجہ سے یہ تینوں ممالک بحرالکاہل کے علاقے کے اجتماعی تحفظ سے مطمئن نہ ہوئے اور اسی

DEFENCE GROUP FOR THE SECURITY OF THE PACIFIC کہا جاتا ہے۔

معاہدہ کی شرائط

دفعہ نمبر ۱ ۔ فریقین معاہدہ اعلان کرتے ہیں کہ کسی بھی بین الاقوامی تنازعہ جس میں وہ ملوث ہوں کا تصفیہ کرانے کے لئے اقدامات کو اس طرح اپنائیں گے کہ بین الاقوامی امن، سلامتی اور انصاف کو خطرہ لاحق نہ ہو۔ بین الاقوامی تعلقات میں طاقت کے استعمال دھمکی کے طرز عمل کو ترک کرنے کا اعلان کرتے ہیں اور منشور اقوام متحدہ کی روشنی میں پرامن ذرائع کو تمام معاملات میں اولیت دی جائے گی۔

دفعہ نمبر ۲ :۔ معاہدہ کی ذمہ داریوں کو موثر طور پر پورا کرنے کے لئے انفرادی یا اجتماعی ذرائع سے مسلسل اپنی مدد آپ اور باہمی تعاون سے انفرادی و اجتماعی صلاحیت کو ترقی دیں گے جو کسی بھی جارحانہ حملہ کا مقابلہ کرنے کے لئے ضروری ہو۔

دفعہ نمبر ۳ :۔ بحرالکاہل کے علاقے میں قیام امن کے لئے فریقین باہمی تعاون و اتفاق کو اجاگر کریں گے اور ان میں سے کسی کی بھی علاقائی سالمیت و سیاسی آزادی کو کسی بھی حملہ یا خطرہ یا دھمکی کا سامنا ہو تو فریقین فوری طور پر باہمی صلاح و مشورہ کریں گے۔ اور ضرورت ہوئی تو اجتماعی اقدامات کریں گے۔

دفعہ نمبر ۴ :۔ فریقین میں سے ہر ایک تسلیم کرتا ہے کہ بحرالکاہل کے علاقہ میں کسی رکن پر مسلح حملہ ہر ایک کے لئے خطرہ ہوگا اس لئے اعلان کیا کہ وہ دستوری طریقہ سے مشترکہ خطرہ کا مقابلہ کرنے کے لئے اجتماعی اقدامات کریں گے اور کسی مسلح حملہ کی اطلاع فوری طور پر سلامتی کونسل کو مناسب اقدامات کے لئے دی جائے گی۔

دفعہ نمبر ۵ :۔ اس دفعہ میں یہ تعین کیا گیا کہ مسلح حملہ میں کسی فریق کے ام البلاد علاقہ و جزائر کے علاقہ جو اس کے اختیار سماعت میں ہو۔ افواج، بحری جہاز یا ہوائی جہاز وغیرہ سب شامل ہیں جو بحرالکاہل میں ہوں گے۔

دفعہ نمبر ۶ :۔ اس دفعہ کے تحت یہ واضح کیا گیا کہ یہ معاہدہ کسی طرح بھی فریقین کی اُن ذمہ داریوں کو متاثر نہیں کرتا جو انھیں منشور اقوام متحدہ کے تحت حقوق و فرائض کی صورت میں حاصل ہیں اور نہ ہی یہ اقوام متحدہ کی ان ذمہ داریوں کو متاثر کرتا ہے جو امن و سلامتی کو قائم کرنے کے لئے اسے حاصل ہیں۔

دفعہ نمبر ۷:۔ فریقین اس معاہدے پر عمل درآمد کے لئے اپنے وزراء خارجہ یا ان کے نائبین کی ایک کونسل تشکیل کریں گے۔ کونسل کو اس طرح منظم کیا جائے گا جو کسی بھی وقت اجلاس کرنے کے قابل ہو۔ معاہدہ کی دفعہ نمبر ۱ کے تحت یہ معاہدہ غیر معینہ مدت کے لئے برقرار رہے گا۔ لیکن کوئی رکن ایک سال سے پہلے حکومت آسٹریلیاء کو نوٹس دینے کے بعد اس سے علیحدہ ہو سکتا ہے۔

اس معاہدے کی تنظیم ناٹو کے طرز پر کی گئی لیکن یہ ناٹو جتنی اہم نہیں ہے یہ تین ممالک پر مشتمل آج بھی قائم ہے جو بحرالکاہل کے علاقے میں اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

اس معاہدے کے رد عمل کے طور پر روس نے ۱۹۵۱ء کو سرخ چین سے ایک ۳۰ سالہ معاہدہ کیا جس کے تحت جاپان کی طرف سے یا کسی دوسری ریاست کی طرف سے حملہ کا مقابلہ کیا جا سکے گا۔

۔۔۔ اب چین کی پالیسی کی وجہ سے یہ معاہدہ غیر موثر ہو گیا ہے۔

نیوزی لینڈ کا اخراج:۔

۱۹۸۵ء میں نیوزی لینڈ نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنی بندرگاہوں پر ایٹمی قوت سے چلنے والے جنگی جہازوں کو نہیں آنے دے گا۔ اس فیصلے کے تحت اس نے امریکہ کے ایٹمی جنگی بحری بیڑے کی آمد پر بھی پابندی لگا دی۔ اس واقعہ کو امریکہ نے اپنی ہتک سمجھا چنانچہ امریکہ نے ۱۲ اگست ۱۹۸۶ء کو نیوزی لینڈ کو معاہدہ انزوز سے نکال دیا۔

۴۔ تنظیم معاہدہ شمالی اوقیانوس

NORTH ATLANTIC TREATY ORGANISATION

قیام اور اراکین

۴؍اپریل ۱۹۴۹ء کو مغربی بلاک کے دس ممالک نے روسی خطرے کے پیش نظر اجتماعی تحفظ کے لئے واشنگٹن میں ایک دفاعی تنظیم ناٹو پر دستخط کئے۔ ان دس ممالک کو ناٹو کے ابتدائی اراکین کہا جاتا ہے ناٹو کے ابتدائی اراکین ۱۔ امریکہ ۲۔ ڈنمارک ۳۔ فرانس ۴۔ آئس لینڈ ۵۔ اٹلی ۶۔ لکسمبرگ ۷۔ پرتگال ۸۔ نیدرلینڈ ۹۔ ناروے اور ۱۰۔ برطانیہ ہیں۔ بعدازاں ۱۱۔ کینیڈا ۱۲۔ مغربی جرمنی ۱۳۔ بلجیم ۱۴۔ ترکی ۱۵۔ یونان اور ۱۶۔ اسپین بھی اس تنظیم کے ممبر بن گئے۔

مقاصد

جہاں تک ناٹو کے بنیادی مقاصد کا تعلق ہے تو اس سے ممبر ممالک کا بیرونی جارحیت (روس کے حلیفوں) سے دفاع مقصود تھا۔ اس کے منشور میں کہا گیا ہے کہ اگر ممبر ممالک کے کسی رکن پر حملہ ہوا تو اسے تمام ممبران پر حملہ تصور کیا جائے گا۔ اس صورت میں تمام ممبران کا فرض ہوگا کہ وہ مشترکہ طور پر فوجی کارروائی کے ذریعے سے حملے کا دفاع کریں گے۔ یہ ایک اجتماعی سلامتی کا نظام ہے اور اس کی اجازت اقوام متحدہ کے منشور کی دفعہ ۵۱ میں دی گئی ہے۔

علاوہ ازیں ذیلی مقاصد میں اقتصادی ترقی، تجارتی ترقی اور سیاسی تعلقات کو فروغ دینا ہے۔ شہری اداروں کا دفاع مغربی تہذیب کا تحفظ وغیرہ بھی اس میں شامل ہے۔

وجوہات

(۱) بین الاقوامی سیاسیات میں طاقت کا توازن روسی افواج کی موجودگی سے بگڑ رہا تھا۔ لہذا اس توازن کو متوازن کرنے کے لئے اس معاہدے کا قیام عمل میں آیا۔

(۲) ناٹو کا قیام اقوام متحدہ میں غیر یقینی کیفیت کو ظاہر کرتا ہے حالانکہ مجلس اقوام میں بھی دفاعی تنظیم کو اپنایا گیا تھا ۱۹۴۹ء میں ایسے حالات پیدا ہوگئے جس سے مغربی ممالک کو یہ احساس ہوا کہ اقوام متحدہ بھی مجلس اقوام کی طرح ان کا دفاع نہیں کر سکتی۔

(۳) امریکی خارجہ پالیسی میں اہم تبدیلیاں ہوئیں۔ عدم مداخلت کی پالیسی کو ایک بار پھر ختم کر دیا گیا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد امریکہ نے یورپ کے معاملات میں ملوث ہونے کے لئے پہلا قدم مارشل پلان کی صورت میں اٹھایا اور سینیٹ سے اس کی بعد میں اجازت بھی حاصل کر لی کہ امریکہ علاقائی دفاعی تنظیموں میں شامل ہو سکتا ہے۔ اس طرح امریکی پالیسی میں یہ انقلابی قدم تھا۔ جس کا عالمی سیاست پر بہت گہرا اثر پڑا۔ سرد جنگ میں تیزی آئی۔ مختلف بحرانوں کا آغاز ہوا۔ یورپ میں محدود پیمانے پر جو تنظیمیں (برسیلز پیکٹ ۱۹۴۸ء BRUSSELS PACT 1948) کام کر رہی تھیں انھیں عدم تحفظ کا احساس ہوا۔ یورپی ممالک نے امریکہ کی مدد سے اپنے دفاع کو مضبوط بنانا چاہا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ مغربی ممالک نے اپنی فوج کو مشترکہ کمان کے تحت رکھنے کی منظوری دی

ناٹو کا تنظیمی ڈھانچہ
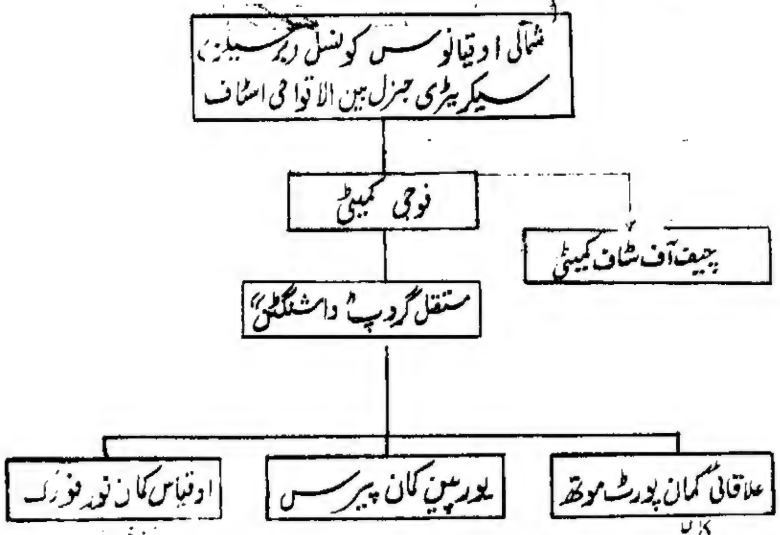
شمالی اوقیانوس کونسل NORTH ATLANTIC COUNCIL

اس کونسل کا قیام معاہدے کے ساتھ ہی وجود میں آیا تھا۔ اس میں عموماً پاپا سنو

کے وزراء خارجہ وزراء دفاع اور دیگر ریاستی وزیر شرکت کرتے ہیں ۔ کونسل کے پاس یورپ کے دفاع، اقتصادیات و سیاسیات کے معاملے میں وسیع اختیارات ہیں ۔ اگر یہ محسوس کرے تو کوئی نیا ادارہ بھی قائم کر سکتی ہے

فوجی کمیٹی MILITARY COMMITTEE اس میں ممبر ممالک کے چیف آف اسٹاف شامل ہوتے ہیں اس کمیٹی کے تحت ایک مستقل گروپ STANDING GROUP واشنگٹن میں قائم کیا گیا ہے ۔ اس میں برطانیہ، فرانس، اور امریکہ شامل ہیں ۔ یہ گروپ فوجی حکمت عملی میں راہنمائی کرتا ہے لیکن زیادہ تر دفاعی منصوبہ بندی اور نازک مسائل پر پالیسی بناتا ہے ۔

ناٹو کی دفاعی تقسیم

(۱) یورپی کمان :۔ اس کے ذمے برطانیہ، فرانس بلجیم اور نیدرلینڈ کا دفاع ہے ۔

(۲) اوقیانوسی کمان :۔ یہ فضائیہ اور بحریہ پر مشتمل کمان ہے اس کے ذمہ پورے اوقیانوس کا دفاع کرنا ہے ۔

(۳) علاقائی کمان :۔ اس کمان میں امریکہ اور کینیڈا شامل ہیں اور ان کے ذمہ شمالی امریکہ کا دفاع ہے ۔

اس معاہدے میں امریکہ کو فرانس کے مقابلے میں اہم مقام حاصل ہے جس پر فرانس کو اعتراض ہے ———— فرانس نے متحدہ کمان سے اپنی فوج کو واپس بلا لیا ہے ۔ ماہرین کا خیال ہے کہ اب یورپ کے حالات ۱۹۴۹ء کے مقابلے میں بہت تبدیل ہو چکے ہیں ۔ جرمنی کا معاملہ ابھی طے نہیں ہوا ۔ سرد جنگ کے بجائے پرامن بقائے باہمی کی پالیسی پر عمل درآمد ہو رہا ہے ۔ چین اور فرانس بھی ایٹمی طاقتیں بن چکی ہیں ۔ امریکہ بیرونی دنیا (کیوبا، کوریا اور ویت نام) وغیرہ میں اپنے تنازعات بڑھا رہا ہے جن سے فرانس کا کوئی تعلق نہیں ان حالات کے پیش نظر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ فرانس کب ناٹو سے الگ ہو جائے ۔

تجدید و علیحدگی

معاہدے کی تجدید دس سال کے بعد ہوتی ہے اور کوئی رکن ۲۰ سال بعد ایک سال کا نوٹس دے کر معاہدے سے الگ ہو سکتا ہے ۔

معاہدہ کی دفعات

۱ ۔ فریقین معاہدہ اعلان کرتے ہیں کہ وہ اقوام متحدہ کے منشور کے مطابق بین الاقوامی

تنازعات کو حل کریں گے ۔ اور پر امن ذرائع کو اپنایا جائے گا تاکہ امن، سلامتی اور انصاف کسی خطرے سے دوچار نہ ہو۔ بین الاقوامی تعلقات میں طاقت کے استعمال اور ناجائز ذرائع جو اقوام متحدہ کے ضابطوں کے خلاف ہوں گے ان سے گریز کیا جائے گا۔

۲۔۔۔ فریقین مزید ترقی کے لیے پر امن ذرائع سے بین الاقوامی تعلقات کو فروغ دیں گے تاکہ آزاد اداروں اور اصولوں کو عام کرنے میں مدد مل سکے فریقین معاہدہ آپس میں معاشی تصادم کی پالیسی سے گریز کرتے ہوئے معاشی تعاون کی فضا ہموار کریں گے ۔

۳۔۔۔ فریقین اپنے مقاصد کے حصول و ترقی کے لئے جدا گانہ یا مشترکہ طور پر ہمیشہ "اپنی مدد آپ" کے تحت باہمی امداد سے جارحانہ اقدامات کا مقابلہ کرنے کے لئے انفرادی اور اجتماعی کوششیں جاری رکھیں گے ۔

۴۔۔۔ معاہدے میں شامل اگر کسی فریق کی آزادی و قومی سلامتی کو خطرہ لاحق ہو تو تمام ممالک آپس کے صلاح مشورے سے لائحہ عمل طے کریں گے ۔

۵۔۔۔ فریقین اس بات پر متفق ہیں کہ یورپ یا اوقیانوس میں سے کسی ایک ریاست پر حملہ معاہدے میں شامل تمام ریاستوں پر حملہ تصور کیا جائے گا۔ مزید یہ کہ اگر ایسی صورت حال پیدا ہوتی ہے تو تمام اراکین اقوام متحدہ کے منشور کی دفعہ نمبر ۵۱ کے تحت تسلیم حق خود حفاظتی و اجتماعی تحفظ کے تحت متاثر فریق یا فریقین کی ہر ممکن مدد کریں گے۔ اس مدد میں افواج کی کارروائی بھی شامل ہے ۔ کسی حملہ کی صورت میں کارروائی و اقدامات کی اطلاع سلامتی کونسل کو دی جائے گی ۔ اگر سلامتی کونسل خود " امن و سلامتی" بحال کرنے کے لئے کوئی کارروائی کرے تو اقدام معطل ہو جائے گا ۔

۶۔۔۔ دفعہ نمبر ۵ کے مقصد کے مطابق کسی فریق یا فریقین پر حملہ جس میں کلی طور سے یورپ یا اوقیانوس میں کسی فریق پر مسلح حملہ، یا فرانس پر الجزائر کی طرف سے حملہ یا فریقین کے یورپ میں کسی زیر قبضہ علاقہ، یا شمالی اوقیانوس میں کسی فریق کے اختیار سماعت میں جزیرہ یا فریقین کے علاقے، ہوائی جہاز بحری جہاز وغیرہ سب ہی شامل ہوں گے ۔

۷۔۔۔ اس معاہدے کے تحت کوئی ایسا تاثر یا تشریح نہیں ہو گی جس سے اقوام متحدہ کی رکن ریاستوں کو منشور کے تحت حاصل حقوق و فرائض متاثر ہوتے ہوں یا سلامتی کونسل کو بین الاقوامی امن و سلامتی کو برقرار رکھنے میں مشکلات پیدا ہوں ۔

۸ــــ فریقین نے یہ بھی اعلان کیا کہ اس دفعت اس معاہدے کی وجہ سے کوئی بھی بین الاقوامی ذمہ داری ان کے یا کسی دوسری ریاست کے درمیان اس معاہدے کی دفعات کو متاثر نہیں کرتی اور نہ اختلاف رکھتی ہے مزید یہ کہ فریقین میں سے کوئی بھی اس معاہدے کی دفعات سے متصادم یا متضاد کسی بھی بین الاقوامی معاہدے میں شریک نہیں ہوگا۔

۹ــــ فریقین ایک کونسل کا قیام عمل میں لائیں گے جس میں سب کو نمائندگی حاصل ہوگی یہ کونسل فوری اقدامات کی اہل ہوگی۔ کونسل کو حسب ضرورت ثانوی ادارے بنانے کا اختیار حاصل ہوگا۔ کونسل فوری طور پر ایک کمیٹی بنائے گی۔ جو معاہدے کی دفعہ نمبر۳ اور دفعہ نمبر۵ پر عمل درآمد کی سفارشات کو عملی شکل دے گی۔

۱۰ــــ فریقین عہد کرتے ہیں کہ سمجھوتے میں شامل ہونے کے لئے شمالی اوقیانوس میں امن و سلامتی کی بحالی میں مدد دینے کے لئے یورپ کی کسی بھی طاقت کو مزید تعاون مہیا کرنے کی دعوت دے سکتے ہیں اس طرح کوئی بھی ریاست تنظیم میں شامل ہونے کی شرائط کی تکمیل کے بعد تنظیم کی ممبر بن سکتی ہے۔ امریکی حکومت باقی فریقین کو اس کی اطلاع دے گی۔ تقرری یا شمولیت کی کاروائی سے آگاہ کرے گی۔

۱۱ــــ معاہدے کی توثیق تمام فریقین اپنے دستوری نظام کے تحت کریں گے اور توثیق کا صداقت نامہ جلد از جلد حکومت امریکہ کے پاس جمع کرادیں گے۔ امریکہ تمام اراکین کو اس کی اطلاع دے گا۔

۱۲ــــ معاہدے کے وجود میں آنے کے دس سال بعد یا بعد میں فریقین میں سے کسی کی درخواست پر اس معاہدے کی تجدید کی بات چیت ہوگی۔ جس میں شمالی اوقیانوس کے علاقہ میں امن و سلامتی کے عوامل اور اثرات پر غور کیا جائے گا۔ اس بات چیت میں عالمی و مقامی انتظامات کے امور بھی زیر بحث آئیں گے۔ جو اقوام متحدہ کے منشور کے تحت بین الاقوامی امن و سلامتی کے لئے کئے گئے ہوں۔

۱۳ــــ اس معاہدے کے عمل میں آنے کے بیس سال بعد کوئی رکن ملک امریکہ کو ایک سال کا نوٹس دیکر معاہدہ سے الگ ہوسکتا ہے۔ امریکہ باقی فریقین کو اس کی اطلاع دے گا۔

۱۴ــــ معاہدہ کی انگریزی فرانسیسی نقول جنھیں امریکہ کے پاس جمع کرایا جائے گا۔ مساوی مستند سمجھی جائیں گی اور اس کی تصدیق شدہ نقول تمام معاہدے کے رکن ممالک کو فراہم کی جائیں گی۔

ناٹو کے مسائل اور کردار

موجودہ دور میں ناٹو مسائل کا شکار رہے ممبر ممالک کے درمیان اختلافات بڑھ رہے ہیں۔ اور عالمی مسائل سے متعلق مختلف پالیسیاں اختیار کرنے سے ناٹو کا اتحاد متاثر ہوا ہے لیکن جہاں تک بنیادی مقاصد کا تعلق ہے کہ اشتراکیت کے پھیلاؤ کو روکنا اور باقی ممالک کو اس سے بچانا تو اس میں اُسے کامیابی ہوئی ہے۔ یورپ کا کوئی بھی ملک اشتراکیت کا شکار نہیں ہوا ہے۔ ۱۹۵۲ء تک ناٹو کے ممبران میں اتحاد و تعاون کی فضا برقرار رہی اس کی بنیادی وجہ ممبر ممالک کا سوویت یونین سے خوف اور حملے کا خطرہ تھا۔ ۱۹۵۵ء تک ناٹو کی فوجی قوت میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا جس وقت ناٹو قائم ہوا تھا مشترکہ افواج سے متعلق وضاحت نہیں کی گئی تھی۔ کوریا کی جنگ کے بعد ممبران نے اس ضرورت کو محسوس کیا کہ ناٹو کی مشترکہ فوجی کمان ہو کیونکہ روس مشرقی یورپ کے ذریعے کوریا والی کاروائی یورپ میں بھی دہرا سکتا ہے۔ دوسرا مسئلہ جرمنی (مغربی) کو دوبارہ مسلح کرنا تھا تاکہ مشرقی یورپ سے اس کا تحفظ ممکن ہو سکے۔

دفاعی تنظیم کے بارے میں اختلاف نہیں تھا لیکن اس کی نوعیت کے سلسلے میں مختلف رائے تھی۔ فرانس چاہتا تھا کہ دفاعی تنظیم صرف یورپ تک محدود ہو۔ جبکہ امریکہ اور برطانیہ کا خیال تھا کہ اگر دفاعی تنظیم صرف یورپ تک محدود رکھی گئی تو کامیابی ممکن نہیں ہوگی۔ اس لئے دفاعی تنظیم ممبر ممالک پر مشتمل ہونی چاہیئے۔ اس کا ہیڈ کوارٹر پیرس کو قرار دیا گیا ۱۹۵۰ء میں یہ تجویز تھی کہ ناٹو کی فوج ۲۹۶ ڈویژن ہو لیکن اتنی فوج آج تک قائم نہیں ہوسکی۔ ناٹو کی افواج کے تین علاقائی یونٹ قائم کئے گئے ۱۔ وسطی یورپ کی دفاعی تنظیم ۔۲۔ جنوبی علاقوں کی دفاعی تنظیم ۳۔ شمالی علاقوں کی دفاعی تنظیم ۔ تینوں یونٹوں کو جدید ہتھیاروں سے لیس کیا گیا ہے۔

مغربی جرمنی کو دوبارہ مسلح ہونے کی اجازت دی گئی اس پر فرانس کو اعتراض تھا۔ لیکن اس کی دفاعی قوت کو ناٹو کے تحت کردیا گیا ۱۹۵۵ء تک ناٹو کی افواج یورپی ممالک کا سوویت یونین کے خلاف دفاع کرتیں رہیں۔

اسٹالن کی موت ۱۹۵۳ء کے بعد خروشیف نے خارجہ پالیسی میں نمایاں تبدیلی کی۔ مغربی بلاک کے ساتھ مفاہمت کا آغاز کیا۔ سرد جنگ و عالمی کشیدگی میں کمی ہوئی اس سے ناٹو کا اتحاد متاثر ہوا کیونکہ اب انھیں روس سے کسی قسم کا خطرہ نظر نہیں آرہا تھا۔ علاوہ ازیں کئی یورپی ممالک غیر یورپی ممالک کے مسائل میں ملوث ہو چکے تھے۔ فرانس اور الجیریا کی جنگ آزادی

اور ہند چین کی جنگ آزادی وغیرہ ۱۹۵۵ء کے بعد ممبر ممالک میں مختلف سیاسی تنازعات پیدا ہو گئے مثلاً۔

(۱) یونان اور ترکی کے مابین ۱۹۵۵ء میں قبرص کے مسئلے پر تنازع پیدا ہو گیا جو آج تک برقرار ہے اس وجہ سے ناٹو کی فوجی مشقیں نہ ہو سکیں۔

(۲) دوسرا مسئلہ ۱۹۵۶ء میں برطانیہ اور آئی لینڈ کے درمیان ماہی گیری سے متعلق ہوا۔ آئی لینڈ کا زیادہ تر انحصار ماہی گیری پر ہے جھگڑے کے بعد آئی لینڈ کی زائد پیداوار برطانیہ نے خریدنے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ سوویت یونین جو موقع کی تلاش میں تھا۔ اس نے زائد پیداوار خریدنی شروع کر دی جس کی وجہ سے ناٹو اور چھوٹے ممالک کے درمیان تلخیاں پیدا ہوئیں۔ جس کی وجہ سے چھوٹے ممالک میں یہ احساس پیدا ہوا کہ ناٹو اینگلو امریکن کلب ہے جس میں چھوٹے ممالک کی رائے اور آزادی کو مدنظر نہیں رکھا جاتا

یہ احساس شدت اختیار کر گیا اس سلسلے میں امریکی قیادت کو جس شخص نے کھلم کھلا چیلنج کیا وہ فرانس کے صدر جنرل ڈیگال تھے اس سے ناٹو کے اتحاد پر منفی اثرات پڑے ڈیگال نہیں چاہتا تھا کہ فرانس چھوٹا ملک رہے اور ناٹو میں فرانس کی آواز دب جائے صدر ڈیگال نے زور دیا کہ امریکی تسلط کو کم کرنے کے لئے ناٹو کو دوبارہ سیاسی طور پر منظم کیا جائے۔ امریکہ برطانیہ اور فرانس پر مشتمل کمیٹی مرتب کی جائے جو اہم فیصلے کرنے کی مجاز ہو یہ بات قبول نہیں کی گئی۔ فرانس نے قومی سلامتی کی ذمہ داری ناٹو کے سپرد کرنے سے انکار اور امریکہ سے مطالبہ کر دیا کہ مہلک ہتھیار اور ناٹو کی افواج کو فرانس کی حدود سے ہٹا لیا جائے یا فرانس کے کنٹرول میں دیا جائے اس کے ساتھ ہی فرانس نے ایٹمی میدان میں پنج سالہ منصوبے کا اعلان کیا۔ تاکہ فرانس کو ایٹمی قوت بنا کر امریکی ایٹمی برتری کو توڑا جائے۔ چنانچہ فرانس نے ۱۹۶۶ء میں ناٹو کی مشترکہ کمان سے علیحدگی اختیار کر لی جس کی وجہ سے ناٹو کا ہیڈ کوارٹر پیرس سے برسیلز (بلجیم) منتقل کر دیا گیا۔

فرانس اور چھوٹے ممالک کی احساس محرومی کو ختم کرنے کے لئے امریکی صدر جان کینیڈی نے تجویز پیش کی کہ تمام ممبر ممالک کو ایٹمی کنٹرول میں شریک کیا جائے اور ایک مسلح افواج قائم کی جائے جو ایٹمی ہتھیاروں سے لیس ہو۔ ۲۵ جہازوں پر مشتمل ایک بحریہ قائم کی جائے اور ہر جہاز پر تقریباً ۸ پرشنگ میزائیل لگے ہوں۔ لیکن ڈیگال نے اس کی مخالفت کی کہ اس سے مزید امریکی تسلط مستحکم ہو گا۔ برطانوی وزیراعظم نے جان کینیڈی کی تجویز کو منظور کیا لیکن چھوٹے ممالک

اس سے مطمئن نہ ہوئے جس کی وجہ سے یہ تجویز آگے نہ بڑھ سکی۔ کینیڈی کے بعد جانسن بھی اس خواب کو شرمندہ تعبیر نہ کر سکے۔
یہ تمام مسائل ۱۹۵۳ء سے ۱۹۶۵ء کی پیداوار ہیں۔

۱۹۷۰ء کے بعد ناٹو کے مسائل

۱۹۷۰ء کے عشرے میں ناٹو مزید تنقید کا نشانہ بنا۔ اس کی بنیادی وجہ امریکی خارجہ پالیسی کی تبدیلی تھی۔ نکسن ڈاکٹرین میں کہا گیا کہ

"اتحادی ممالک میں بیرونی حملے یا دفاع کی صورت میں امریکہ منصوبہ بندی یا مداخلت نہیں کرے گا۔ صرف فوجی اور اقتصادی امداد دیتا رہے گا۔ صرف ایک صورت میں امریکہ مداخلت کر سکتا کہ اتحادی ملک پر کسی ایٹمی طاقت نے حملہ کیا ہو اور وہ ملک براہ راست امریکی مفاد سے وابستہ ہو"۔

اس پالیسی کے تحت جنوبی ویت نام سے فوجی انخلاء، فلپائن اور تھائی لینڈ سے فوجی اڈوں کی کمی، کوریا میں فوج کی کمی وغیرہ شامل ہے۔ یورپی ممالک میں امریکی پالیسی کی وجہ سے تشویش پیدا ہوئی کہ امریکہ ایشیاء کی طرح یورپ سے بھی اپنے آپ کو دستبردار کر رہا ہے اور دوبارہ عدم مداخلت کی پالیسی کی طرف گامزن ہوا ہے ۱۹۶۹ء میں ایک قرارداد پاس ہوئی کہ امریکہ یورپ میں اپنی ۱۵ ہزار افواج میں کمی کرے گا۔ یہ وہ وقت تھا جب امریکہ افراط زر کا شکار تھا۔ چنانچہ اس طرح یورپ میں اپنے دفاعی اخراجات کو کم کر کے اپنی اقتصادیات کو بحال کرنا چاہتا تھا۔ یہ قرارداد پہلی بار تو پاس نہیں ہوئی البتہ دوسری بار پاس ہو گئی اس قرارداد کے پاس ہونے کے بعد امریکی صدر نے اعلان کیا کہ اس سے امریکی خارجہ پالیسی متاثر نہیں ہوگی۔ مگر ان باتوں سے یورپی ممالک نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ وہ اب امریکہ پر زیادہ عرصہ انحصار نہیں کر سکتے ۱۹۷۳ء کو کانگریس نے ایک جنگی قرارداد منظور کی امریکہ براہ راست اپنی فوج کو باہر نہیں بھیجے گا اور اگر حالات زیادہ خراب ہوئے تو امریکی صدر صرف ۹۰ دن کے لئے امریکی فوج بھیج سکتا ہے اور اگر اس سے زیادہ مدت درکار ہو تو کانگریس سے منظوری لینا ہوگی۔ اس کے علاوہ کچھ اور بھی وجوہات تھیں۔

(۱) اگست ۱۹۷۴ء میں یونان اور ترکی کے درمیان دوبارہ قبرص کے مسئلے پر کشیدگی پیدا ہوئی جس کی وجہ سے یونان نے ناٹو سے علیحدگی اختیار کر لی اس سے ناٹو کی جنوبی کمان

متاثر ہوئی ۔ یونان کی علیحدگی کی وجہ یہ تھی کہ امریکہ ترک جارحیت پر دباؤ ڈالنے میں ناکام رہا ہے ۔ یونان کو خوش کرنے کے لئے ترکی کی فوجی امداد بند کر دی گئی جس کے جواب میں ترکی نے اپنی زمین پر موجود امریکی اڈوں کو اپنی تحویل میں لے لیا ۔

۱۹۷۹ء میں جب روس نے افغانستان میں مداخلت کی اور ۱۹۸۰ء میں ایرانی حکومت نے امریکی سفارت کاروں کو یرغمالی بنایا تو امریکہ نے ترکی کے دفاع کو مضبوط کرنے کے لئے فوجی امداد جاری کر دی جس سے امریکہ اور ترکی کے تعلقات بحال ہو گئے ۔ لیکن قبرص کا مسئلہ جوں کا توں رہا ۔ یونان اکتوبر ۱۹۸۰ء میں دوبارہ ناٹو میں شامل ہو گیا ۔

(۲) ۱۹۸۰ء میں حکومت ایران نے امریکی سفارت کاروں کو یرغمالی بنایا جس کی تمام ناٹو ممالک نے مذمت کی ۔ ایرانی حکومت کا موقف یہ تھا کہ یہ سفارت کار امریکہ کے لئے جاسوسی کر رہے ہیں ۔ امریکہ نے سابق شاہ کے اثاثے منجمد کر دیئے اور تجارتی معاہدے ختم کر دیئے ۔ نیز مغربی ممالک سے امریکہ نے اپیل کی کہ ایران سے تجارتی تعلقات منقطع کر لئے جائیں ۔ مغربی ممالک نے امریکی اقدام کی مخالفت تو نہیں لیکن ایران سے تجارتی تعلقات بحال رکھے ۔ اس کی تین وجوہات تھیں ۔

(ا) مغربی ممالک کا تیل پر انحصار (ب) ایران کا روس سے مل جانے کا خطرہ

(ج) خلیج کی کشیدگی سے روس کا فائدہ اٹھانا ۔

(۳) تیسرا مسئلہ یورپ میں میزائیل کی تنصیب کا تھا ۔ یہ فیصلہ ایران میں انقلاب آنے کے بعد خلیج میں مغربی مفادات کے تحفظ کے لئے صدر کارٹر کی تجاویز کے مطابق ہوا ۔ ایک سریع الحرکت فوج قائم کرنے کی تجویز بھی پیش کی گئی ۔ مغربی ممالک نے اس تجویز کا جواب افغانستان میں روسی مداخلت کے بعد دیا ۔ اور یورپ میں ۵۷۲ پرشنگ اور کروز میزائیل لگائے گئے ۔ ریگن انتظامیہ کا کہنا ہے کہ روس ہر سال ۵۵۲۰ میزائیل مشرقی یورپ میں لگا رہا ہے جس کے جواب میں اب امریکہ بھی میزائیل لگا رہا ہے ۔ اس نقطہ نظر کی وجہ سے مغربی ممالک نے امریکہ کو مجبور کیا کہ وہ سوویت یونین سے دفاعی قوت میں کمی کا معاہدہ کرے ۔ چنانچہ دباؤ کے تحت صدر ریگن نے زیرو آپشن کا نظریہ پیش کیا ۔ لیکن سوویت یونین اسے قبول نہیں کر رہا ۔ اس کا مطلب یہ ہے روس مشرقی یورپ میں میزائیل نہ لگائے تو امریکہ بھی مغربی یورپ میں میزائیل نہیں لگائے گا ۔

(۵) مشرق وسطی میں پائیدار امن کے لئے مغربی بلاک کی رائے یہ ہے کہ پی ۔ ایل ۔ او کو تسلیم کیا جائے اور فلسطینیوں کے لئے ان کی ریاست بنائی جائے ۔ امریکہ مشرق وسطی کا حل عرب

ممالک سے علیحدہ ہو کر کرانا چاہتا ہے وہ تنظیم آزادی فلسطین کو تسلیم نہیں کرتا اس سلسلے میں پہلا معاہدہ "کیمپ ڈیوڈ معاہدہ" تھا۔ دوسری طرف عرب اور مغربی ممالک نے ۱۹۷۳ء کی عرب اسرائیل جنگ کے بعد سے لے کر آج تک جتنی بھی تجاویز پیش کی ہیں انہوں نے امریکہ سے مشورہ کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ جس کی وجہ سے امریکہ میں ناراضگی پائی جاتی ہے۔

(۵) ۱۹۷۹ء میں سوویت یونین نے افغانستان میں مداخلت کی تو ناٹو کے ممالک میں اتحاد پیدا ہوا چند فیصلے ہوئے جن کے تحت یورپ میں نئے پرشنگ میزائیل اور کروز میزائیل لگائے جائیں گے۔ بحر ہند کے ممالک برطانیہ، فرانس، سوئٹزرلینڈ، اٹلی وغیرہ اپنی دفاعی قوت بڑھائیں گے تاکہ سوویت یونین کی گلف میں ممکنہ کاروائی کو روکا جا سکے۔ ۲۰ ہزار سریع الحرکت فوج کا قیام۔ ۳ فیصد دفاعی اخراجات میں اضافہ۔ یہ ضرور ہے کہ افغانستان ناٹو کے دفاعی علاقے میں شامل نہیں ہے۔ لیکن اس علاقے میں سوویت یونین کی آمد سے مغربی یورپ کے مفادات خطرے میں پڑ جاتے ہیں یعنی انھیں اپنے تیل کی حفاظت درکار ہوتی ہے۔ مغربی یورپ اور امریکہ میں سوویت یونین کو افغانستان سے باہر نکالنے کے طریقہ کار پر اختلاف ہے امریکہ نے سالٹ دوم STRATEGIC ARMS LIMITATION TALKS TREATY-II کو معطل کیا جس کی وجہ سے روس کو اناج کی فراہمی ہو رہی تھی وہ بند ہو گئی۔ امریکہ نے مغربی ممالک کو بھی مجبور کیا لیکن امریکہ اس میں ناکام رہا البتہ اسرائیل اور ایک دوسرے ملک نے امریکہ کی بات رکھ لی۔ ماسکو اولمپک میں بھی ناٹو کے ممالک نے شرکت کی سوائے اٹلی اور ترکی کے یہ چند مثالیں ایسی ہیں جن سے اختلافات کی نشاندہی ہوتی ہے۔

(۶) ایک اور مسئلہ جو ۱۹۸۰ء میں پیدا ہوا وہ مغربی یورپ اور سوویت یونین کے درمیان تیل کی سپلائی اور پائپ لائین کی تعمیر سے متعلق تھا۔ مغربی یورپ اور سوویت یونین کے درمیان معاہدہ ہوا تھا کہ سوویت یونین مغربی ممالک کو گیس فراہم کرے گا۔ اور مغربی ممالک تیل سپلائی کریں گے۔ مغربی ممالک اور سوویت یونین کے درمیان یہ معاہدہ اس وقت ہوا جب امریکہ نے پولینڈ کے بحران کے اس سے فنی معاہدے منسوخ کر دیئے تھے۔ اس وجہ سے بھی تلخیاں پیدا ہوئیں امریکی تلخی کی دوسری وجہ یہ تھی کہ اگر سوویت یونین نے مغربی یورپ کی گیس کی ضرورت پوری کی تو وہ بوقت ضرورت گیس کی سپلائی روک کر دباؤ ڈال سکے گا۔ جس کی وجہ سے یہ صحیح نہیں ہے۔ حالانکہ مغربی یورپ صرف ۷ فیصد گیس کا انحصار سوویت یونین پر کر رہا ہے۔

(۷) جہاں تک پولینڈ کا تعلق ہے تو پولینڈ میں جب اندرونی اختلافات پیدا ہوئے تو ناٹو نے سوویت یونین کو دھمکی دی کہ وہ پولینڈ کے بحران سے فائدہ نہ اٹھائے۔ پولینڈ کے عوام اپنے مسائل خود حل کریں گے۔ لیکن جب وہاں مارشل لا لگا تو امریکہ نے فنی معاہدے منسوخ کر دیئے

(۸) مغربی یورپ اس بات پر اب بھی متفق ہے کہ سوویت یونین اور مشرقی یورپ کے ساتھ تجارتی تعلقات کو فروغ دیا جائے مشرقی اور مغربی یورپ کے درمیان اتحاد کی ایک اور وجہ یہ ہے کہ اب بین الاقوامی تعلقات میں دو قطبی نظام ختم ہو چکا ہے اور اس کی جگہ کثیر قطبی نظام نے لے لی ہے۔ اور مختلف طاقت کے مراکز وجود میں آچکے ہیں۔ مثلاً اسلامی بلاک، غیر جانبدار بلاک چینی بلاک، روسی بلاک، امریکی بلاک، مغربی بلاک وغیرہ

لہٰذا آج مغربی ممالک چاہتے ہیں کہ مغربی یورپ پر امریکی تسلط برقرار نہ رہے اور روس کے ساتھ تجارتی تعلقات بڑھائے جائیں اور بین الاقوامی مسائل میں آزادانہ پالیسی کو اپنایا جائے۔ ۳؍اکتوبر ۱۹۹۰ء کو مشرقی اور مغربی جرمنی کا انضمام اور اتحاد ناٹو ممالک کے لئے پریشانی کا باعث بنا سب سے زیادہ پریشانی فرانس کو ہے کیونکہ تاریخی اعتبار سے وہ جانتا ہے کہ مضبوط اور عظیم جرمنی فرانس کے لئے کتنا خطرناک ہے۔ معاہدہ وارسا کی تحلیل (فروری ۱۹۹۰ء) کے بعد ناٹو کی اہمیت بھی کم ہو گئی ہے۔ آج یورپی ممالک امریکی پالیسیوں کو دل سے تسلیم نہیں کرتے اور وقتی مصلحت کے تحت اس معاہدے کو برقرار رکھے ہوئے ہیں

۵۔ معاہدہ وارسا

WARSA PACT

قیام

معاہدہ وارسا یورپ میں ناٹو کے مقابل دوسری دفاعی تنظیم ہے۔ روس نے مشرقی یورپ کے ممالک کے ساتھ مل کر ۱۴ مئی ۱۹۵۵ء کو یہ دفاعی تنظیم قائم کی۔ روس نے ناٹو کی سخت الفاظ میں مذمت کہتے ہوئے اسے جارحانہ معاہدہ قرار دیا۔ روس نے یہ تجویز بھی پیش کی کہ ناٹو کو توڑا جائے اور تمام ممالک مل کر ایک معاہدہ کریں۔ لیکن اس تجویز کو مغربی ممالک نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

معاہدہ کے اراکین

(۱) روس (۲) پولینڈ (۳) البانیہ (۴) بلغاریہ (۵) ہنگری (۶) مشرقی جرمنی (۷) رومانیہ (۸) چیکوسلواکیہ

معاہدے کی وجوہات :۔

معاہدہ کے منشور میں اسے ناٹو کی جوابی تنظیم قرار نہیں دیا گیا۔ مشرقی یورپ کے اجتماعی تحفظ کی تجدید کے پیش نظر یہ معاہدہ کیا گیا ہے اس کے علاوہ معاہدہ پیرس کی توثیق سے مغربی جرمنی کو ازسرنو مسلح ہونے کا موقعہ مل گیا تھا اور اوقیانوسی بلاک کی تشکیل سے امن پسند ریاستوں کے لئے ایک خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ ان حالات میں تمام یورپی ریاستوں کو اس معاہدہ میں شامل ہونے کی دعوت دی گئی تاکہ یورپ میں امن و آشتی کے لئے مؤثر لائحہ عمل تیار کیا جا سکے۔ جو اقوام متحدہ کے منشور کے مطابق ہو۔ اراکین معاہدہ نے عہد کیا کہ تمام ریاستوں کی آزادی و خود مختاری کا احترام کیا جائے گا اور اُن کے اندرونی معاملات میں مداخلت نہیں کی جائے گی۔ یہ معاہدہ باہمی اتفاق سے اتحاد و تعاون کے لئے عمل میں لایا گیا۔ چین نے کچھ عرصہ تک اس کے اجلاسوں میں شرکت کی۔ لیکن بعد میں عالمی حالات کی وجہ سے چین معاہدہ میں شریک نہ ہوا۔ البانیہ ۱۹۶۸ء میں معاہدہ وارسا سے علیحدہ ہو گیا۔

شمولیت کی شرائط

اس معاہدہ میں اشتراکی و غیر اشتراکی دونوں طرح کے ممالک شریک ہو سکتے ہیں ۔ اس تنظیم میں بھی ناٹو والی یہ شق موجود ہے کہ ممبر ملک پر حملہ تمام ممبر ممالک پر تصور کیا جائے گا ۔ اس طرح یہ تنظیم بھی اقوام متحدہ کی دفعہ ۵۱ کے تحت وجود میں آئی ۔

ذیلی ادارے

تنظیم کے ذیلی ادارے حسب ذیل ہیں ۔

(۱) مشاورتی کونسل :-

اس کونسل میں ممبر ممالک کی کمیونسٹ پارٹیوں کے فرسٹ سیکرٹری حکومتوں کے سربراہ اور وزرائے خارجہ شامل ہوتے ہیں ۔ اس کا بنیادی مقصد ممبر ممالک کی پالیسیوں میں ہم آہنگی پیدا کرنا ہے ۔

(۲) دفاعی کونسل :-

یہ معاہدہ وارسا کا ایک اہم ادارہ ہے ۔ اس میں ممبر ممالک کی افواج کے کمانڈر ان چیف ، ڈپٹی کمانڈر اور وزرائے خارجہ شامل ہوتے ہیں ۔ معاہدہ وارسا کے زیر اثر تقریباً ۴۸ لاکھ فوج ہے جسے آٹھ روسی جنرل کنٹرول کرتے ہیں ۔

روسی تسلط :-

معاہدے کی سربراہی آج تک روس کے پاس ہے ۔ اس پر احتجاج بھی ہوا لیکن کوئی فرق نہیں پڑا ، ۱۹۶۹ء میں اس معاہدے کے تحت پہلے وزرائے خارجہ کی کونسل اور پھر بعد میں وزراء دفاع کی کونسل قائم کی گئی ۔ اس طرح سے روس کو مشرقی یورپ میں اپنی فوج رکھنے کا قانونی جواز مل گیا ہے ۔

ماہرین کا خیال ہے کہ مشرقی یورپ کی اشتراکی ریاستوں کی طرف سے مغربی طاقتوں سے جنگ کی صورت میں ایک متحدہ اقدام ہے روس نے پہلے ہی ان ریاستوں کے ساتھ باہمی تعلقات کے معاہدے کر رکھے تھے ۔ تاہم یہ اشتمالی ریاستیں روسی قیادت میں ناٹو کے مقابلے میں بہت زیادہ متحد نظر آتی ہیں ۔

معاہدے کی دفعات

(۱) فریقین معاہدہ اعلان کرتے ہیں کہ وہ اقوام متحدہ کے منشور کے مطابق بین الاقوامی تعلقات میں لڑائی جھگڑے اور دھمکیوں کے طرز عمل سے گریز کریں گے ۔ اور تمام تنازعات کو عالمی سطح پر

ایسے پرامن ذرائع سے طے کریں گے کہ بین الاقوامی امن کو خطرہ لاحق نہ ہو۔

(۲) مقاصد کی تکمیل کے لئے فریقین تمام بین الاقوامی اقدامات میں تعاون مہیا کرنے کا اعلان کرتے ہیں اس طرح فریقین ان ریاستوں سے سمجھوتہ کرنے کو تیار ہیں جو تخفیف اسلحہ، ایٹمی اسلحہ، ہائیڈروجن بم اور تباہی کے دوسرے ہتھیاروں پر پابندی عائد کرنے کے خواہشمند ہوں۔

(۳) فریقین تمام اہم بین الاقوامی مسائل پر باہمی صلاح و مشورہ کریں گے۔ جن سے ان کے مشترکہ مفادات متاثر ہوتے ہوں اور بین الاقوامی امن و سلامتی کے تحفظ کو راہنما اصول کے طور پر اپنائیں گے۔ وہ کسی ایک یا ایک سے زیادہ اراکین پر مسلح حملہ کی صورت میں فوری طور پر ایک دوسرے سے صلاح و مشورے کریں گے۔ اور فریقین معاہدہ اپنے باہمی تحفظ اور امن و سلامتی کی حفاظت کے لئے مناسب اقدامات پر عمل درآمد کے لئے باہمی صلاح و مشورے کریں گے۔

(۴) فریقین میں سے کسی ایک ریاست یا زیادہ پر مسلح حملہ خواہ کسی بھی ایک ریاست کی طرف کی طرف سے ہو یا بہت سی ریاستوں کی طرف سے متحدہ طور پر ہو معاہدے کی رکن ریاستوں میں ہر ایک انفرادی و اجتماعی تحفظ کے اصولوں کے تحت جو منشور اقوام متحدہ کی دفعہ پانچ کے تحت انھیں حاصل ہے فوری طور پر باہمی اتحاد سے اس لائحہ عمل کو اپنائیں گی جو اس حملے کو روکنے کے لئے ضروری ہو اس میں طاقت کا استعمال بھی شامل ہے۔ اس دفعہ کے تحت جو اقدامات کئے جائیں گے وہ منشور اقوام متحدہ کے تحت تحفظ امن کے لئے ہوں گے۔ لیکن جونہی سلامتی کونسل بین الاقوامی امن و سلامتی کے لئے اقدامات کرے گی۔ فریقین کی اپنے طور سے کی گئی کارروائی بند کر دی جائے گی۔

(۵) فریقین اپنی افواج کو ایک متحدہ کمان کی تشکیل پر بھی اتفاق کرتے ہیں اور طاقتوں کے باہمی سمجھوتے سے یہ کمان متحدہ طور پر وضع کردہ اصولوں کے تحت کام کرے گی۔ فریقین اتفاق سے ایسے ضروری اقدامات بھی کریں گے۔ جو اپنے دفاع کے تحفظ، عوامی ترقی، سرحدوں کی سالمیت اور بیرونی حملوں سے بچاؤ کے لئے ضروری سمجھے جاتے ہیں۔

(۶) معاہدے میں شریک تمام فریقین کے درمیان گفت و شنید کے مقاصد کے پیش نظر اور معاہدے کی تکمیل سے متعلق پیدا ہونے والے سوالات کے تجزیہ کے لئے ایک سیاسی مشاورتی کمیٹی تشکیل دی جائے گی۔ جس میں ہر فریق ریاست کا ایک نمائندہ شامل ہوگا۔ یہ کمیٹی حسب ضرورت ملحقہ اداروں کو بھی قیام میں لا سکتی ہے۔

(۷) اس معاہدے کے فریقین یہ بھی عہد کرتے ہیں کہ وہ کسی ایسے اتحاد یا یونین میں شامل نہیں ہوں گے اور نہ ہی کسی ایسے سمجھوتے کو قبول کریں گے۔ جو اس معاہدے کی شرائط سے متصادم ہو۔ اور یہ بھی اعلان کرتے ہیں کہ ان کے موجودہ کسی بین الاقوامی سمجھوتے کے تحت ذمہ داریاں اس معاہدے سے متضاد نہیں ہیں۔

(۸) فریقین باہمی ثقافتی و معاشی تعاون و ترقی کے لئے دوستی و اتحاد کے جذبے کو اجاگر کریں گے اور باہمی احترام کے اصول پر عمل پیرا ہوتے ہوئے ایک دوسرے کے اندرونی معاملات میں مداخلت نہیں کریں گے۔

(۹) یہ معاہدہ تمام ریاستوں کے لئے کھلا ہوا ہے خواہ ان کا معاشرتی و سیاسی نظام کچھ بھی ہو جو ہم اس معاہدے کی شرائط کے تحت امن کے تحفظ و عوام کی سلامتی کے لئے ان کے حالات کو برقرار رکھنے کا اعلان کرتے ہیں۔ کسی بھی ریاست کی طرف سے اس معاہدے میں شرکت کا معاملہ فریقین کے سمجھوتے کے بعد اس وقت عمل میں آئے گا۔ جب حکومت پولینڈ کی حفاظت میں رکھنے کے لئے دے دیا جائے گا۔

(۱۰) یہ معاہدہ توثیق کے بعد عمل میں آئے گا۔ جس کی توثیق کی تصدیق حکومت پولینڈ کو حفاظت کے لئے دی جائے گی۔ پولینڈ کو تمام توثیقوں کی وصولیابی کے بعد اس معاہدے پر عمل درآمد شروع ہو جائے گا۔

(۱۱) یہ معاہدہ بیس سال کی مدت کے لئے قابل عمل ہے۔ یہ مدت ختم ہونے سے ایک سال قبل اگر کوئی بھی ریاست اس سے علیحدگی کا نوٹس نہیں دیتی تو مزید دس سال تک اس میں رہنے کی پابند ہوگی۔ اجتماعی تحفظ کے نظام کے عائل کے طور پر جو یورپ میں قائم کیا جا رہا ہے اور اس سلسلہ میں معاہدے پر دستخط کئے جا رہے ہیں۔ جس کے تحت ہر فریق اس معاہدے کی تکمیل کے لئے اپنے وسائل کو روبۂ عمل میں لائے گا۔

اس معاہدے کی نقلیں روسی، پولش، چیک اور جرمنی میں تیار کی گئیں جو سب کی سب مساوی طور پر مستند ہیں۔ اس معاہدے کی تصدیق شدہ نقول حکومت پولینڈ کی طرف سے ہر حکومت کو دی گئی ہیں۔ معاہدہ کی بیان کردہ شرائط میں فریقین کے اندرونی معاملات میں مداخلت نہ کرنے کی ضمانت کے باوجود کچھ عرصہ پہلے چیکوسلواکیہ میں معاہدہ وارسا کے ارکان نے جو مسلح چڑھائی کی اور اسے من مانی شرائط پر مجبور کیا وہ اس بات کا ثبوت ہیں۔

کہ دراصل اس معاہدہ میں شمولیت سے چھوٹے ممالک مکمل طور پر روس کے حلقہ اثر میں آگئے ہیں جن سے ان کی انفرادی حیثیت ختم ہو کر رہ گئی ہے۔

معاہدہ وارسا کے مسائل اور کردار

ناٹو کی طرح معاہدہ وارسا بھی چند مسائل سے دوچار رہا ہے لیکن وارسا کے مسائل ناٹو جتنے شدید نہیں ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے۔

۱۔ معاہدہ وارسا تقریباً ۱۰ سال بعد تک سوویت مقاصد کی تکمیل کرتا رہا ہے اور سوویت یونین نے اس پر اپنا تسلط برقرار رکھا ہے۔ اس معاہدے کے تحت سوویت یونین کو اس بات کی اجازت ملی کہ وہ معاہدہ وارسا کے ممبر ممالک میں اپنی فوج تعینات کرے۔ اسٹالن کی موت کے بعد جب خروشیف اور ماؤ کے درمیان اختلافات پیدا ہوئے تو اشتراکیت کی تحریک کو فروغ حاصل ہوا۔ تو وارسا کے ممبر ممالک نے بھی سوویت یونین کے تسلط کو کم کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔

۲۔۔۔ سوویت افواج کی اپنی زمین پر موجودگی کا سب سے پہلے اعتراض رومانیہ کے صدر چاؤ شسکو نے کیا۔ چاؤ شسکو نے وہی کردار وارسا میں کیا جو ڈیگال نے ناٹو میں کیا تھا۔ چنانچہ ۱۹۵۸ء میں رومانیہ سے سوویت افواج کی واپسی ہوئی اس کے ساتھ ساتھ رومانیہ نے معاہدہ وارسا کی جنگی مشقوں میں حصہ لینا بھی چھوڑ دیا۔ مزید یہ کہ ہتھیاروں پر کنٹرول کے لئے تمام ممبر ممالک کو شامل کیا جائے۔ اور سوویت یونین کی برتری کم کی جائے۔ (رومانیہ کا مطالبہ)

۳۔۔۔ رومانیہ نے سب سے پہلے مغربی جرمنی کو تسلیم کیا یہ ایک انقلابی قدم تھا اس کے بعد چیکوسلواکیہ نے بھی جرمنی کے ساتھ تعلقات استوار کرنے کی کوشش کی۔ نتیجتاً سوویت یونین نے چیکوسلواکیہ کی مخالفت کی اور سوویت افواج ۱۹۶۸ء میں چیکوسلواکیہ میں داخل ہو گئیں۔ رومانیہ کے صدر نے اس کی مخالفت کی اور اپنی فوج بھیجنے سے انکار کر دیا۔ ۱۹۷۹ء میں جب سوویت افواج نے افغانستان میں مداخلت کی تو رومانیہ نے اس کی بھی بھرپور مذمت کی اور اقوام متحدہ پر بھی سوویت افواج کی واپسی کے لئے زور دیا۔

۴۔۔۔ ۱۹۶۸ء میں البانیہ وارسا تنظیم سے علیحدہ ہو گیا۔ اس کی بنیادی وجہ اس کی چین کے ساتھ دوستی تھی۔ کیونکہ البانیہ نے خروشیف کی پالیسی کی حمایت کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس سے وارسا کی رکنیت میں کمی ہو گئی۔

۵۔۔۔ ۱۹۸۰ء میں پولینڈ کا بحران پیدا ہوا جس کی بنیادی وجہ بگڑی ہوئی اقتصادی

حالت تھی۔ اس بحران کے خاتمے کے لئے حکومت اور سولیڈ یرٹی کے درمیان ناکام مذاکرات ہوئے جس کی وجہ سے ۱۳ دسمبر ۱۹۸۱ء کو پولینڈ میں مارشل لاء لگا دیا گیا۔ جنرل جیروزلیسکی نے سولیڈیرٹی کو ممنوع قرار دے دیا۔ پولش عوام پر ظلم کے پہاڑ توڑے گئے اس بحران سے نمٹنے کے لئے وارسا کونسل کا اجلاس ہوا جس میں طے کیا گیا کہ پولینڈ ایک اشتراکی ملک ہے۔ اور یہ اشتراکی رہے گا اور تنظیم وارسا پولینڈ کو اپنی حمایت کا یقین دلاتی ہے۔ پولینڈ میں سوویت یونین یا معاہدہ وارسا کے رکن کی فوجی عدم مداخلت کی وجہ یہ ہے کہ پولینڈ کا بحران اتنا شدید نہیں ہے اور نہ ہی اس میں اشتراکیت کو کوئی خطرہ لاحق ہے ایک اور وجہ یہ بھی تھی کہ تاریخی لحاظ سے پولش عوام روس کو سخت ناپسند کرتے ہیں

۶۔ معاہدہ وارسا کے ارکان سیاسی بحرانوں کے علاوہ اقتصادی بحرانوں کا بھی شکار رہیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ یہ مغربی بلاک کے قرض دار ہیں انکے ہاں پیداوار کی کمی ہے، خوراک اور تیل باہر سے درآمد کرنا پڑتا ہے، جس پر بھاری زرمبادلہ خرچ ہوتا ہے، ہنگری اور پولینڈ کے بحرانوں کی بنیادی وجہ اقتصادی بدحالی تھی۔ اس اقتصادی بدحالی پر قابو پانے کیلیے معاہدہ وارسا کے ممبر ممالک بین الاقوامی مالیاتی فنڈ I.M.F. میں شامل ہونے کی کوشش کر رہے ہیں رومانیہ اور ہنگری اس میں شامل ہو چکے ہیں۔

۱۹۸۵ء میں گورباچوف کے برسر اقتدار آنے کے بعد ان کی گلاسناسٹ اور پیرسٹرائیکا[1] کی پالیسی کے نتیجہ میں عسکری سرگرمیوں کو محدود کرنے میں بڑی تقویت ملی۔ اس پالیسی کے تحت ۱۹۹۰ء تک سوویت یونین اپنی ۴۲ لاکھ فوج میں سے ۵ لاکھ فوج کم کر چکا ہے نیوکلیر اور کیمیکل ہتھیاروں کو بتدریج کم کر رہا ہے۔ مشرقی یورپ اور افغانستان سے فوج واپس بلائی جا چکی ہے۔ سرد جنگ کی جگہ "بین الاقوامی امن" سوویت خارجہ پالیسی کا محور بن چکا ہے۔

گورباچوف کی متذکرہ پالیسی کا ہی نتیجہ تھا کہ ۲۵ فروری ۱۹۹۰ء کو ہنگری کے دارالحکومت بڈاپسٹ میں معاہدہ وارسا کے ممبر ممالک کے وزرائے خارجہ اور وزرائے دفاع نے اپنے ایک اجلاس میں اس فوجی معاہدے کو باضابطہ طور پر ختم کر دیا اور ایک دستاویز پر دستخط کئے کہ غیر ملکی حملے کی صورت میں یہ ممبر ممالک ایک دوسرے کی مدد کرنے کے پابند نہیں ہوں گے۔ تاہم معاہدے کے ممبر ممالک سیاسی تعاون جاری رکھیں گے۔

---

[1] پیرسٹرائیکا کے معنی تشکیل نو کے ہیں اور گلاسناسٹ سے مراد عوام کو تنقید کا حق دینا ہے۔

باب یازدہم

بین الاقوامی معاشرے کے مسائل

THE PROBLEMS OF INTERNATIONAL SOCIETY

۱۔ بندونگ کانفرنس / افروایشیائی کانفرنس

یہ کانفرنس ۲۴/اپریل ۱۹۵۵ء کو انڈونیشیا کے شہر بندونگ میں عالمی امن کے فروغ کے لیے منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس نے ایشیاء و افریقہ کے ان ممالک کو جذبۂ آزادی و ترقی سے سرشار کیا تھا جو اس وقت تک آزاد نہیں ہوئے تھے افروایشیائی ممالک کے درمیان تعاون و اتحاد کا خیال دوسری عالمی جنگ ۴۵-۱۹۳۹ء کے بعد کی پیداوار ہے۔ انڈونیشیاء پہلا ملک ہے جس نے ۱۹۵۵ء میں بندونگ کانفرنس کے انعقاد کی تجویز پیش کی تھی۔ یہ جاننا دلچسپی کا باعث ہو گا کہ انڈونیشیاء کے ذہن میں کس طرح اس تاریخی اجتماع کا خیال آیا جبکہ اس سے قبل اس قسم کی کوئی نظیر اور مثال نہیں ملتی۔ واقعہ یہ ہے کہ پانچ ایشیائی ممالک انڈونیشیاء، پاکستان، سری لنکا، برما اور بھارت کے وزرائے اعظم نے سری لنکا کے دارالحکومت کولمبو میں ۲۸/اپریل تا ۲ مئی ۱۹۵۴ء میں کئی مسائل کے تجزیہ کے لیے اور ہندچین کی صورتحال پر غور کرنے کے لیے ایک ملاقات کی۔ اس اجلاس میں انڈونیشیا کے وزیراعظم ڈاکٹر علی ساسٹروڈمڈ نے سوال اٹھایا کہ ہم ایشیائی اقوام کا اس وقت کی دنیا میں کیا مقام ہے۔ درحقیقت اب ہم بنی نوع انسان کی تاریخ کے دوراہے پر پہنچ گئے ہیں۔ اس لیے ہم پانچ ایشیائی ممالک کے وزرائے اعظم ان اقوام کے اہم مسائل پر غور کرنے کے لیے ملاقات کر رہے ہیں۔ جن کی ہم نمائندگی کرتے ہیں یہی وہ مسائل ہیں جن کے باعث انڈونیشیا یہ تجویز پیش کرتا ہے کہ افروایشیائی اقوام کی ایک کانفرنس زیادہ بڑے پیمانے پر بلائی جائے۔ پاکستان کے وزیراعظم محمد علی بوگرہ نے اس تجویز کی سب سے پہلے حمایت کی اجلاس کے دیگر وزرائے اعظم نے بھی اس خیال تجویز کو پسند کیا۔ بعد ازاں ۲۸ اور ۲۹ دسمبر ۱۹۵۴ء کو بوگور (انڈونیشیاء) میں تمام وزرائے اعظم کی ایک اور ملاقات ہوئی۔ اس میں فیصلہ کیا گیا کہ افروایشیائی کانفرنس انڈونیشیاء میں بندونگ کے مقام پر ۱۸ تا ۲۴ اپریل

سنہ ۱۹۵۵ء کو منعقد کی جائے اور اس کانفرنس کے مندرجہ ذیل چار مقاصد بیان کیئے گئے۔

کانفرنس کے مقاصد:

۱۔ ایشیاء اور افریقہ کے ممالک کے درمیان خیر سگالی اور تعاون کو فروغ دیا جائے تاکہ وہ اپنے مشترکہ مفادات کو آگے بڑھا سکیں اور مزید دوستی اور ہمسائیگی کے تعلقات کو قائم کر سکیں۔

۲۔ نمائندہ ممالک کے سماجی، اقتصادی اور ثقافتی تعلقات کے بارے میں غور کیا جائے گا۔

۳۔ ایشیائی اور افریقی اقوام کی خصوصی دلچسپی کے مسائل پر غور کیا جائیگا یعنی ان مسائل پر جن کا تعلق قومی خود مختاری، نسلی امتیاز اور نو آبادیاتی نظام سے ہے

۴۔ آج کی دنیا میں ایشیاء، افریقہ اور ان کی اقوام کی حیثیت پر نظر ڈالی جائے اور اس امر کا جائزہ لیا جائے کہ عالمی امن و تعاون کے فروغ کے لیے وہ کیسا کردار ادا کر سکتی ہیں۔

افتتاح:

ان مقاصد کی تکمیل کے لیے ۱۸ اپریل سنہ ۱۹۵۵ء کو اس تاریخی کانفرنس کا افتتاح اس وقت کے انڈونیشیاء کے صدر ڈاکٹر احمد سوئیکارنو نے کیا۔ اس تاریخی کانفرنس میں ایشیاء اور افریقہ کے مندرجہ ذیل ممالک نے شرکت کی۔

ایشیاء:

(۱) افغانستان (۲) ایران (۳) انڈونیشیاء (۴) اردن (۵) برما (۶) بھارت (۷) پاکستان (۸) ترکی (۹) تھائی لینڈ (۱۰) جاپان (۱۱) چین (۱۲) سعودی عرب (۱۳) سری لنکا (۱۴) شام (۱۵) عراق (۱۶) کمبوچیا (۱۷) لاؤس (۱۸) لبنان (۱۹) نیپال (۲۰) ویت نام جمہوریہ (۲۱) ویت نام قومی (۲۲) یمن۔

افریقہ:

(۲۳) ایتھوپیا (۲۴) آئیوری کوسٹ (۲۵) سوڈان (۲۶) لائبیریا

(۲۷) لیبیا (۲۸) مصر۔

اعلان بندونگ:

بندونگ کانفرنس نے اپنے ۲۴ اپریل ۱۹۵۵ء کے آخری اجلاس میں دنیا کے سامنے ایک تاریخی دستاویز پیش کی۔ جس میں اقتصادی تعاون، ثقافتی تعاون، انسانی حقوق، حق خود ارادی، محکوم اقوام کے مسائل اور دوسرے مسائل پر زور دیا۔ دس اصولوں پر مشتمل ایک تاریخی اعلان بھی کیا۔ جنہیں ہم "بندونگ اصول" بھی کہتے ہیں یہ دس اصول مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ بنیادی انسانی حقوق کا احترام اور اقوام متحدہ کے چارٹر کے اصولوں اور مقاصد کا احترام۔

۲۔ تمام اقوام کی علاقائی سالمیت اور خودمختاری کا احترام۔

۳۔ تمام نسلوں اور چھوٹی بڑی تمام اقوام کی برابری کو تسلیم کرنا۔

۴۔ کسی دوسرے ملک کے اندرونی معاملات میں مداخلت سے باز رہنا۔

۵۔ اقوام متحدہ کے چارٹر کے مطابق ہر قوم کے دفاع کے حق کو تسلیم کرنا خواہ وہ اپنا دفاع خود کرے یا دوسرے سے مل کر کرے۔

۶۔ مجموعی دفاع کے ان انتظامات سے احتراز جو کسی بڑی طاقت کے مخصوص مفادات کا تحفظ کرتے ہوں۔

۷۔ کسی ملک کی علاقائی سلامتی کے خلاف طاقت کے استعمال یا جارحانہ اقدامات یا دھمکی سے احتراز کرنا۔

۸۔ اقوام متحدہ کے چارٹر کے مطابق پرامن ذرائع سے بین الاقوامی تنازعات کا حل جن میں مذاکرات مفاہمت ثالثی۔ عدالتی فیصلہ یا فریقین کی پسند کے پُرامن ذرائع شامل ہیں۔

۹۔ باہمی مفادات و تعاون کو فروغ

۱۰۔ انصاف اور بین الاقوامی فرائض کا احترام۔

تبصرہ و تجزیہ:

اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں کہ بندونگ کانفرنس ایشیاء و افریقہ کی یکجہتی کا پہلا سفارتی مظاہرہ ہے۔ جس نے ایشیاء اور افریقہ کے دو براعظموں کی بیداری کا دنیا کے سامنے اعلان کیا۔ اس کانفرنس نے ایشیاء اور افریقہ کی اقوام کو ایک قوت محرکہ عطا کی۔ جس نے ایشیاء و افریقہ کے بے شمار مسائل کو حل کرنے میں مدد دی مثلاً

- مغربی ایریان یعنی ایریان جاوا پر انڈونیشیا کا حق تسلیم کر لیا گیا۔
- تیونس، مراکش، الجزائر، نائیجیریا اور دوسری محکوم اقوام کو آزادی حاصل ہو گئی۔
- کانفرنس نے اقوام متحدہ کی روح کے عین مطابق معاملات پر غور و خوض کیا اس طرح اس نے اقوام متحدہ کو ایک مضبوط بنیاد فراہم کی۔
- اس کانفرنس نے دنیا کے دور دراز علاقوں سے آئے ہوئے شرکاء کو یہ موقع فراہم کیا کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ رابطہ قائم کر سکیں اور آزادانہ طور پر تبادلہ خیال کریں۔
- بندونگ کانفرنس کے فیصلوں نے بین الاقوامی امن و تعاون کے مقصد میں بڑی مدد دی۔
- اس کانفرنس کی بدولت شرکاء کے اندر یہ احساس پیدا ہوا کہ ان کی ملکی حدود سے باہر بھی ایک دنیا ہے اور وہ دنیا ایشیاء اور افریقہ میں ہے۔ جس میں مختلف عقائد، روایات پس منظر اور نظریات کے افراد بستے ہیں اور جس کی آبادی اس قدر گنجان ہے کہ اس کی افرادی قوت دنیا کی آبادی کا تین چوتھائی ¾ ہے۔
- اس کانفرنس نے صیہونیت کی لعنت کا بھی پرجوش انداز میں ذکر کیا۔ جو نسلی امتیاز کے ساتھ دنیا کے امن کو تہہ و بالا کرنے والی ہے اور جو بہ ذاتہ نو آبادیاتی نظام کی کتاب میں ایک آخری باب کی حیثیت رکھتی ہے۔ آج کی

انسانی تاریخ میں صیہونیت ایک سیاہ ترین باب ہے۔ اس امر کی ضرورت ہے کہ ایشیائی و افریقی ممالک ایک مضبوط اور متحدہ جذبے کے تحت اسے محدود کر دیں۔

● اس کانفرنس میں کمیونزم کو دنیا میں بے چینی پھیلانے والی تیسری قوت کا نام دیا گیا جو ایک یک طرفہ "مادی مذہب" ہے۔ اللہ تعالیٰ کے وجود سے انکاری ہے انسانی تہذیب کے روحانی ورثہ کی بھی نفی کرتا ہے اور جس نے کسی بھی دوسری نوآبادیاتی طاقت کے مقابلے میں ایشیاء، افریقہ اور مشرقی یورپ کی اقوام کو سب سے زیادہ محکوم بنایا ہے۔

● بندونگ کانفرنس کا اصل مقصد ایشیاء اور افریقہ کے پڑوسی ممالک کے درمیان خیرسگالی اور دوستانہ گرم جوشی کو فروغ دینا تھا۔ ان کے روزمرہ مسائل کا جائزہ لینا تھا اور یہی وہ مقصد ہے جو انسانی حقوق کے عالمگیر اعلان کے عین مطابق ہے اور جس کا مقصد امن، آزادی اور انصاف قائم کرنا ہے۔ اس میں ذرا برابر شبہ نہیں کہ بندونگ کانفرنس زبردست کامیابی کی حامل رہی ہے۔ ۔ ۔ اس لیے کے بعد کے برسوں میں اس نے دوسری بین الاقوامی تحریکوں کے لیے راہ ہموار کی۔ جن میں ناوابستہ ممالک کی تحریک، ۷۷ ممالک کا گروپ، اسلامی کانفرنس کی تنظیم وغیرہ شامل ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ بندونگ کانفرنس نے جو عظیم خیالات تجاویز اور اصول پیش کیے۔ اگر دنیا ان اصولوں پر عمل پیرا ہوتی تو کم از کم موجودہ ہیجان اور شکوک وشبہات دنیا سے ختم ہو جاتے اور ساتھ ہی نئے نوآبادیاتی نظام کے خطرات بھی ایشیاء اور افریقہ سے ختم ہو جاتے۔ جن میں کمیونزم صیہونیت اور نسل پرستی شامل ہیں۔

۲۔ ناوابستہ ممالک کی تحریک

NON-ALIGNMENT MOVEMENT

جہاں تک غیر جانبدار بلاک کا تعلق ہے تو اس سے متعلق کوئی واضح تعریف و تشریح نہیں کی جا سکتی البتہ چند اصول اخذ کئے گئے ہیں۔

۱۔ ناوابستہ ملک کسی دفاعی معاہدے کا ممبر یا رکن نہیں ہوتا جیسے ناٹو اور معاہدہ وارسا وغیرہ اور نہ ہی خود کسی دوسرے ملک سے دفاعی معاہدہ کرتا ہے۔

۲۔ ناوابستہ ممالک دوسرے ممالک سے بڑے پیمانے پر امداد نہیں لیتے اور نہ ہی تجارتی میدان میں کسی بڑی طاقت پر انحصار کرتے ہیں نیز اقوام متحدہ میں دونوں طاقتوں سے آزاد رہ کر ووٹ دیتے ہیں۔

اگر ہم ان اصولوں کا موازانہ ناوابستہ ممالک کی تحریک سے کریں تو کسی بھی ملک کو ہم مکمل طور پر غیر جانبدار نہیں کہہ سکتے یہ ضرور ہے کہ وہ کثیر طرفہ معاہدات کے رکن نہیں ہوتے لیکن جہاں تک غیر جانبدار تحریک کا تعلق ہے تو اس کے ممبر ممالک ہمیں واضح طور پر اشتراکی اور سرمایہ دارانہ بلاک میں بٹے ہوئے نظر آتے ہیں مثلاً کیوبا ویتنام یوگوسلاویہ لاؤس وغیرہ عام طور پر سوویت پالیسی کی حمایت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں جبکہ عرب ممالک مصر انڈونیشیا، ملائشیا، ملائی، ہوائی اور پاکستان وغیرہ امریکی موقف کے طرفدار ہوتے ہیں۔ جہاں تک دوسرے اصول کا تعلق ہے ہندوستان برما اور عراق کا معاہدہ سوویت یونین سے ہے پاکستان غیر جانبدار تحریک میں اس وقت شامل ہوا جب سینٹو سے الگ ہوا لیکن آجکل پاکستان امریکہ سے دفاعی امداد لے رہا ہے۔

اگر قانون بین الاقوام کے تحت غیر جانبدار تحریک کا جائزہ لیا جائے تو ہمیں ناوابستہ تحریک میں غیر جانبداری نظر نہیں آتی کیونکہ بقول اوپن ہیم۔

"غیر جانبداری کا مطلب کسی ریاست کا وہ طرز عمل ہے جو وہ شریک جنگ حربیوں کے معاملات سے الگ رہ کر اختیار کرے۔ جسے بہر حال حربیوں نے بھی تسلیم

کیا ہو" اس تعریف کے بعد ہم ناوابستہ ممالک کی تحریک کو ایک تیسرا بلاک کہہ سکتے ہیں۔ ناوابستہ ممالک کی تحریک کا کوئی منشور نہیں کوئی واضح لٹریچر نہیں ہے اس کا کوئی مستقل اور باقاعدہ سیکرٹریٹ نہیں ہے جو اس تنظیم کو بین الاقوامی شخصیت قرار دے جیسا کہ اقوام متحدہ، ناٹو معاہدہ وارسا اسلامی کانفرنس کی تنظیم وغیرہ کا ہے۔ لیکن اس کے باوجود غیر جانبدار تحریک کو کامیابی حاصل ہوئی ہے اور اس تحریک نے مقبولیت حاصل کی ہے حالانکہ عام خیال یہ تھا کہ ۱۹۷۰ء میں جب دو بڑی طاقتوں روس اور امریکہ کے درمیان مفاہمت کا آغاز ہو گیا ہے تو یہ تحریک ختم ہو جائے گی لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ اس کی رکنیت میں باقاعدہ اضافہ ہوتا رہا ہے۔

ناوابستہ ممالک کی تحریک کا ارتقاء :

۱۹۵۰ء کے عشرے میں یوگوسلاویہ کے صدر مارشل ٹیٹو۔ مصر کے صدر کرنل جمال عبد الناصر انڈونیشیا کے صدر سیکارنو اور بھارت کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے غیر جانبدار تحریک کے لئے بھرپور کردار ادا کیا۔ عبد الناصر نے امریکی تجویز کو رد کیا جس کے تحت امریکہ مصر کو دفاعی تنظیم میں شامل کرنا چاہتا تھا مارشل ٹیٹو نے سوشلسٹ ہونے کے باوجود سوویت لیڈر شپ کو تسلیم نہ کر کے غیر جانبداری کا ثبوت فراہم کیا۔ غیر جانبدار تحریک کو آگے بڑھانے کے لئے دوسرا اہم قدم بنڈونگ کانفرنس ۱۹۵۵ء تھی۔ اس میں تقریباً سبھی ایشیائی اور افریقی ممالک شامل تھے۔ بعد ازاں ان ممالک نے جنرل اسمبلی میں اپنا ایک گروہ بنا لیا تھا یہ گروہ جنرل اسمبلی کے اندر اور باہر مؤثر کردار ادا کرنے لگا اور اس وقت یہ گروہ بڑی طاقتوں کے درمیان ایک تیسری طاقت بن گیا۔ مثال کے طور پر ۱۹۶۰ء میں جنرل اسمبلی کے اجلاس میں نہرو، عبد الناصر، سیکارنو اور مارشل ٹیٹو نے روس اور امریکہ کے لیڈروں سے اعلیٰ سطح پر گفت و شنید کی اس سے پہلے بڑی طاقتیں ان ممالک کو کوئی وقعت نہیں دیتی تھیں۔

ناوابستہ ممالک کی تحریک کے مقاصد:

ناوابستہ ممالک کی تحریک کے اہم مقاصد حسب ذیل ہیں۔

۱۔ بین الاقوامی سطح پر کشیدگی ختم کرنا۔

۲۔ جنگ کے امکانات کو روکنا۔

۳۔ نئے آزاد ہونے والے ممالک کو ہر قسم کے استحصال سے پاک تعمیر نو کا حق دلانا۔

۴۔ بین الاقوامی سطح پر سپر پاور کے غلبہ کو روکنا۔

۵۔ ایٹمی اسلحہ پر مکمل پابندی عائد کرنا اور اسلحہ کی دوڑ کو روکنا۔

۶۔ ایٹمی ہتھیاروں سے پاک علاقوں کے قیام کے لیے کوششیں کرنا۔

۷۔ بحر ہند میں سپر پاور کی موجودگی کو مرحلہ وار ختم کرنا۔

۸۔ عالمی امن کے قیام کے لیے جدوجہد کرنا۔

تحریک کے سربراہی اجلاس اور کارکردگی:

ناوابستہ ممالک کی تحریک کے حسب ذیل سربراہی اجلاس ہو چکے ہیں۔

۱۔ سنہ ۱۹۶۱ء میں پہلا سربراہی اجلاس بلغراد (یوگوسلاویہ) میں ہوا۔ اس میں تحریک کے ممبران کی تعداد صرف ۲۵ تھی۔ ان میں بیشتر ممالک ایسے تھے جنہوں نے نئی نئی آزادی حاصل کی تھی۔ نوآبادیاتی نظام کے زخم ابھی ان کے دلوں پر تازے تھے۔ یہ اپنے سفید فام سابقہ آقاؤں کے خلاف انتہائی بدترین جذبات رکھتے تھے۔ اس اجلاس میں طے کیا گیا کہ ہر چار سال بعد تحریک کا سربراہی اجلاس ہوا کرے گا۔ جس ملک میں یہ اجلاس ہوگا اس کا سربراہ حکومت چار سال کے لیے تحریک کا چیئرمین ہوگا۔

۲۔ سنہ ۱۹۶۴ء میں اس تحریک کا دوسرا سربراہی اجلاس قاہرہ (مصر) میں ہوا اس میں طے پایا۔

محکوم قوموں کی آزادی کی جدوجہد میں مدد کرنا۔

- تیسری دنیا کے ممالک میں آزادی کی تحریکوں کی حمایت کرنا۔
- ہمسایہ ممالک کے تنازعات کا تصفیہ کرنا۔
- جنوبی افریقہ میں نسلی امتیاز کے رویہ پر پابندیاں عائد کرنا۔

۳۔ ۱۹۷۰ء میں تیسرا سربراہی اجلاس لوساکا (زمبیا) میں ہوا۔ اس میں ممبر ممالک تعداد ۷۶ ہو گئی اس اجلاس میں طے پایا کہ۔

- جارحانہ کارروائیوں کی روک تھام کے لئے کوشش کرنا۔
- طاقت کے استعمال پر پابندی عائد کرنا۔
- نو آبادیاتی نظام کے خلاف جہاد کرنا۔
- لاؤس، کمبوچیا اور ویتنام کا پُرامن تصفیہ کرانا۔

۴۔ ۱۹۷۳ء میں چوتھا سربراہی اجلاس الجیرس (الجیریا) میں ہوا۔ جس میں ۹۶ نکاتی اعلان منظور کیا گیا۔

۵۔ ۱۹۷۶ء میں پانچواں سربراہی اجلاس کولمبو (سری لنکا) میں ہوا۔

۶۔ ۱۹۷۹ء میں چھٹا سربراہی اجلاس ہوانا (کیوبا) میں ہوا۔ اس اجلاس میں پاکستان نے پہلی بار مکمل رکن کی حیثیت سے شرکت کی۔

۷۔ مارچ ۱۹۸۳ء میں ساتواں سربراہی اجلاس نئی دہلی (بھارت) میں ہوا۔ اس اجلاس میں ناوابستہ ممالک کی تحریک کی کل تعداد ایک سو ایک ہو گئی کانفرنس کے میزبان بھارت نے روس نواز سمرین حکومت (کمبوچیا) اور ببرک کارمل حکومت (افغانستان) کو صرف دعوت ہی نہیں دی بلکہ انہیں تسلیم بھی کیا ہے جبکہ ہوانا کانفرنس میں کمبوچیا کی نشست خالی رہی تھی۔

۸۔ ستمبر ۱۹۸۶ء میں آٹھواں سربراہی اجلاس ہرارے (زمبابوے) میں ہوا اس اجلاس میں پچاس سربراہوں سمیت ایک سو سے زائد ممالک کے مندوبین نے شرکت کی۔ اجلاس میں پہلی بار ممبران کا فکری انتشار اور تصادم واضح طور پر ابھر کر سامنے آیا۔ لیبیا کے صدر کرنل قذافی نے کہا کہ حقیقتاً اس دنیا میں دو ہی کیمپ ہیں۔ اوّل لبریشن کیمپ اور دوم سامراجی کیمپ۔ اور میرا مقصد ناوابستہ ممالک کی تحریک کو ختم کرنا ہے۔ افغانستان کے مسئلے پر روس کا نام لیے بغیر قرارداد پیش کی گئی۔ کیونکہ کچھ ممالک روس کی

ناراضگی مول لینا نہیں چاہتے تھے۔ اس طرح ان ممالک نے حق و انصاف کے تقاضوں کو نظرانداز کیا۔

۹۔ ستمبر ۱۹۸۹ء میں نواں سربراہی اجلاس بلغراد میں ہوا۔ اس اجلاس میں ۱۰۲ ممبر، مبصرین اور خصوصی مہمانوں کے علاوہ ۱۰۲ ممالک کے وفود نے شرکت کی۔ ان میں ۴۴ سربراہان حکومت اور ۱۲ سربراہان مملکت بھی شامل تھے۔ اس کانفرنس میں ناوابستہ ممالک کے وفات پانے والے رہنماؤں ایران کے روحانی قائد آیت اللہ خمینی پاکستان کے صدر ضیاء الحق اور موزمبیق کے صدر سمورا مشل کے سوگ میں ایک منٹ کی خاموشی اختیار کی گئی۔ یوگوسلاویہ کے صدر جینز ڈرنوسک کے تحریک کی چیئرمین شپ سنبھالنے کے بعد اپنے خطاب میں کہا کہ ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک کے درمیان اقتصادی ناہمواری آج کی دنیا کا سب سے اہم مسئلہ ہے اور جب تک اسے ختم نہیں کیا جائے گا اس وقت تک تیسری دنیا کے ممالک اپنی انفرادی کوششوں سے اپنے مسائل حل نہیں کر سکتے۔

۱۰۔ ستمبر ۱۹۹۲ء میں دسواں سربراہی اجلاس جکارتا (انڈونیشیا) میں ہوا۔ اس اجلاس میں ۱۰۸ ممبر ممالک کے وفود نے شرکت کی۔ اس کانفرنس میں افغانستان، مشرق وسطیٰ، بوسنیا ہرزیگوینا، جنوبی افریقہ، تخفیف اسلحہ، عالمی اقتصادی نظام اور دیگر مسائل زیر بحث آئے۔ اس کانفرنس میں پاکستانی وفد کی قیادت وزیراعظم محمد نواز شریف نے کی۔

ناوابستہ ممالک کی تحریک کے مسائل:۔

باوجود اس حقیقت کے کہ ناوابستہ ممالک کی تحریک کی رکنیت ۷ سے ۱۰۸ ہو گئی ہے اس طرح یہ اقوام متحدہ کی دو تہائی اکثریت کے قریب ہو گئی ہے جو جنرل اسمبلی میں کوئی قرارداد منظور کروانے کے لئے ضروری ہوتی ہے لیکن اب یہ تنظیم سیاسی طور پر اتنی موثر نہیں جتنی کہ ابتدائی عشرے میں تھی۔ کیونکہ اس وقت تنظیم کے ارکین کے مابین مختلف مسائل ہیں جس کی وجہ سے اعلیٰ صفات کی قیادت کا بہت بحران ہے تنظیم کے ارکین باقاعدہ طور پر تین حصوں میں بٹ چکے ہیں ان میں اکثر

پرو امریکن اور پرو سوویت ہے چند ممالک ایسے بھی ہیں جو بڑی طاقتوں کے دباؤ سے آزاد ہو کر خارجہ پالیسی میں توازن برقرار رکھے ہوئے ہیں مثلاً سوئٹزرلینڈ یہ ضرور ہے کہ تنظیم میں ایسا کوئی رکن نہیں ہے جو کسی کثیر طرفہ معاہدے میں ملوث ہو تنظیم کے اراکین ممالک نے بڑی طاقتوں کو فوجی اڈے دینے سے بھی گریز کیا ہے لیکن اس کے باوجود کچھ ممالک ایسے بھی ہیں جن سے بڑی طاقتوں نے فوجی نوعیت کی مراعات حاصل کی ہوئی ہیں اور بعض ممالک فوجی ساز و سامان کے سلسلے میں کسی ایک بڑی طاقت پر انحصار کر رہے ہیں۔

جہاں تک ان مسائل کا تعلق ہے جن کے بارے میں تنظیم نے اتفاق رائے سے کوئی قدم اٹھایا ہے اس میں ضرور کامیابی حاصل ہوئی ہے مثال کے طور پر نوآبادیاتی نظام کے خلاف آزادی کی تحریک کے سلسلے میں یا بڑی طاقتوں کا ترقی پذیر ممالک کے استحصال کے سلسلے میں ایک آواز ہو کر تنظیم نے قراردادیں منظور کیں جن میں گنی بساؤ، انگولہ اور موزنبیق میں پرتگال کے خلاف آزادی کی تحریک چل رہی تھی تو افریقی ممالک خصوصاً سینیگال، تنزانیہ، ماریطانیہ وغیرہ نے پرتگال پر مشترکہ دباؤ ڈالا۔ اور تنظیم نے بھی ان تحریکیوں کی کھل کر حمایت کی۔ اسی طرح جب ترکی نے قبرص پر حملہ کیا، امریکہ نے ویتنام کی فوجی امداد بڑھائی تو تنظیم نے ان ممالک کی مذمت کی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس تنظیم کی مجموعی کارکردگی خاصی حوصلہ افزا رہی ہے اور اس کے بیشتر فیصلے اس کے بنیادی اصولوں ہی کی ترجمانی کرتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود بھی یہ حقیقت بھی اپنی جگہ ہے کہ اب تنظیم کے بیشتر ممبر ممالک نے سپر طاقتوں کے ساتھ کثیر المقاصد معاہدے بھی کر رکھے ہیں۔ جن میں تجارتی اور اقتصادی مقاصد کے علاوہ دفاعی مقاصد بھی شامل ہیں۔ اس چیز نے ناوابستہ تحریک کے اندر گروہ بندیوں کو جنم دیا ہے اور اراکین کے مابین شکوک و شبہات پیدا ہو گئے ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ تحریک نے افغانستان کمبوچیا گریناڈا انکارا گوا اور فلسطین کے مسائل پر حقیقت پسندانہ یا انصاف پر مبنی رد یہ اختیار کیا ہے۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ تحریک میں ایسے ممالک بھی شامل ہیں جنہوں نے افغانستان میں سوویت مداخلت میں ایک لفظ بھی نہیں کہا بلکہ دبے لفظوں میں سوویت اقدام کی حمایت کرتے رہے۔

اگر ہم تحریک کی تقریباً تین دہائیوں پر محیط کارکردگی کا جائزہ لیں تو ہمیں یہ تسلیم

کرنا پڑے گا کہ تحریک اپنے اعلیٰ ارفع مقاصد کے حصول میں ناکام رہی ہے اور اس کے اراکین میں فکری انتشار اور تصادم واضح طور پر ابھر کر سامنے آیا ہے۔ اس فکری انتشار کی نمایاں وجوہات حسب ذیل ہو سکتی ہیں۔

۱۔ ممبر ممالک کی تعداد میں اضافہ۔

۲۔ بعض ممبران کا تحریک کے اصول سے انحراف۔

۳۔ ممبر ممالک کا اپنے علاقائی مفاد کے لیے تحریک کا استعمال۔

۴۔ ممبر ممالک کا کسی ایک پاور بلاک کی طرف جھکاؤ۔

۵۔ ممبر ممالک سیاسی مصلحتوں کے تحت فیصلہ کن کردار ادا کرنے سے قاصر ہیں۔

۶۔ ممبر ممالک کے علاقوں میں سیاسی بحران جنگی کارروائیاں اور اسلحہ کی دوڑ۔

۷۔ ممبر ممالک کا ایک دوسرے کے خلاف پروپیگنڈا اور اندرونی معاملات میں مداخلت۔

۸۔ قومی قیادت کا فقدان اور بحران وغیرہ۔

ناوابستہ ممالک کی تحریک پر اس تنقید کے باوجود یہ نکتہ بھی محل نظر ہے کہ اقوام متحدہ کے بعد یہ سب سے بڑی عالمی تنظیم ہے۔ جس کا آغاز ۱۹۶۱ء میں ۲۵ ممالک کی رکنیت سے ہوا تھا اور آج سو سے زائد ممالک اس میں شامل ہیں۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دنیا والے یہ چاہتے تو ہیں کہ ترقی پذیر ممالک بڑی طاقتوں کے تسلط، جبر اور استحصال سے محفوظ رہیں۔ غیر وابستہ تحریک کی تیزی اس لیے بھی آگے چل کر ختم ہو گئی کہ بڑی طاقتوں کے درمیان پرامن بقائے باہمی کے معاہدے نے سرد جنگ کی کیفیت کو ختم کر دیا اور اس کے بعد تحریک سیاسی معاملات کی بجائے عادلانہ اقتصادی نظام پر زور دینے لگی اور ایک نئے عالمی اقتصادی نظام کی ضرورت کو محسوس کیا جانے لگا۔ تاکہ تیسری دنیا کے ممالک قرض کے جال سے نکل سکیں۔ اگر ہم جکارتا کانفرنس ۱۹۹۲ء کا مشاہدہ کریں تو اس سے بھی اس بلند پایا نصب العین کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کانفرنس میں کہا گیا ہے کہ تیسری دنیا کے غریب اور پسماندہ ممالک پر ایک کھرب تیس ارب ڈالر کا قرضہ ہے جو کسی بھی طرح یہ ممالک ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ

ان قرضوں پر شرح سود کم کی جائے اور غریب ترین ممالک کا قرضہ بالکل معاف کر دیا جائے۔

جہاں تک پاکستان اور ناوابستہ تحریک کا تعلق ہے بلاشبہ پاکستان نے اس کا رکن بننے میں کئی سال ضائع کئے۔ ۱۹۷۹ء میں جنرل محمد ضیاء الحق نے کیوبا میں سربراہ کانفرنس میں شرکت کر کے پہلی بار پاکستان کی نمائندگی کی۔ اس وقت سے آج تک پاکستان نے ہمیشہ اس تنظیم کے بنیادی مقاصد سے ہم آہنگی کا اظہار کیا ہے اور یہ کوشش بھی کی ہے کہ اس تحریک کو بڑی طاقتوں کی حاشیہ برداری سے دور رکھا جائے اور عالمی معاملات میں ظالم کو ظالم کہنے میں کوئی جھجک محسوس نہ کی جائے۔ خواہ یہ ظلم امریکہ کی طرف سے ہو یا کسی اور کی طرف سے۔

حالیہ کانفرنس میں پاکستان کے حوالے سے مسئلہ کشمیر انتہائی اہمیت کا حامل تھا۔ لیکن بدقسمتی سے کسی دوسرے ملک نے مسئلہ کشمیر کا ذکر اپنی تقریر میں نہ کیا۔ حالانکہ اس سے قبل او آئی سی اور یورپی پارلیمنٹ اس سوال پر قراردادیں منظور کر چکی ہیں۔ ارشاد احمد حقانی نے بالکل ٹھیک کہا ہے کہ اگر پاکستان نے کانفرنس سے پہلے مناسب لابنگ کی ہوتی تو چند ممالک کو مسئلہ کشمیر کا ذکر کرنے پر آمادہ کرنا ناممکن نہ تھا۔

المختصر یہ کہ اپنی خامیوں کے باوجود ناوابستہ تحریک کا وجود بین الاقوامی سیاست میں ایک غنیمت ہے۔ اگر اس تنظیم سے زیادہ فائدہ نہیں تو نقصان بھی نہیں ہے۔ اس نے تیسری دنیا کے ممالک کو ایک زبان دی ہے۔ عالمی امن کا پرچار کیا ہے یہی وجہ ہے کہ سو سے زائد ممالک اس کے ممبر بن گئے ہیں اور یہ اقوام متحدہ کے بعد دنیا کی سب سے بڑی تنظیم ہے۔ توقع ہے کہ مستقبل میں یہ تنظیم بین الاقوامی تعلقات میں مؤثر اور فعال کردار ادا کرے گی۔

۳ - اقوام کی دولت مشترکہ
COMMON WEALTH OF NATIONS

سب سے پہلے کینیڈا نے ۱۸۶۷ء میں دولت مشترکہ قائم کی۔ بعدازاں نیوزی لینڈ آسٹریلیا اور جنوبی افریقہ نے اس تجربے کو آزمایا۔

برطانوی دولت مشترکہ کی تشکیل میں ۱۹۲۱ء کے ویسٹ منسٹر کے قانون کو بڑا دخل ہے۔ برطانوی دولت مشترکہ کا ہر رکن ملک تاج برطانیہ سے وفاداری کا حلف اٹھاتا تھا لیکن جب برطانیہ سے نوآبادیات و مقبوضات نے آزادی حاصل کرنی شروع کی اور اپنے ہاں بادشاہت کی بجائے جمہوریت کو ترجیح دی تو اپریل ۱۹۴۹ء میں یہ ادارہ "اقوام کی دولت مشترکہ" کے نام سے یاد کیا جانے لگا[1] اور ملکہ برطانیہ اس ادارے کی بحیثیت مجموعی سربراہ قرار پائیں۔ دولت مشترکہ کا ہر رکن اندرونی اور بیرونی پالیسی میں خود مختار ہے۔ ہر رکن کا لندن میں ایک ہائی کمشنر مقیم ہے۔ اسی طرح برطانیہ کا بھی ہر مقبوضہ یا آزاد علاقے میں ہائی کمشنر تعینات ہوتا ہے۔ دولت مشترکہ زیادہ تر تاریخی واقعات کی پیداوار ہے۔ ہر رکن ممالک کی اقوام متحدہ میں اپنی الگ نشست ہے۔ کئی موقعوں پر کینیڈا اور آئرلینڈ کے نمائندوں نے برطانیہ کے خلاف ووٹ دیا ہے۔ دولت مشترکہ کی حیثیت پر تبصرہ کرتے ہوئے اشارک کہتا ہے: "جہاں تک دولت مشترکہ کا تعلق ہے یہ نہ تو وفاق ہے اور نہ ہی برتر ریاست بلکہ صرف آزاد مساوی ریاستوں کا خاندان ہے۔"

یہ ادارہ کرۂ ارض کے مختلف حصوں میں واقع ممالک کی ایک عظیم برادری کی حیثیت سے عالمی مسائل و معاملات میں اقوام متحدہ اور ناوابستہ ممالک کی تحریک کے بعد سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ اس ادارے میں ہونے والے فیصلوں سے تمام ممالک متفق ہوتے ہیں۔ اور تمام ممالک کے اتفاق رائے کے بغیر کوئی نیا ملک اس کا ممبر نہیں بن سکتا۔ تاہم جمہوریت کی بحالی، برقراری اور استحکام کے باعث یہ ادارہ اپنی نظیر آپ ہے اور اقوام متحدہ کی تسلیم شدہ علاقائی تنظیموں پر فوقیت رکھتا ہے

---

[1] دولت مشترکہ کے ابتدائی اراکین کی تعداد صرف ۸ تھی۔ پاکستان بھی ان میں شامل تھا

جو دنیا کے مختلف علاقوں میں واقع ممالک کی نمائندگی کی دعویدار ہیں جیسے افریقی یا امریکی ممالک کی تنظیم، اسلامی ممالک کی تنظیم، عرب ممالک کی تنظیم، جنوبی ایشیائی ممالک کی تنظیم وغیرہ۔

اراکین

اس ادارے کے اراکین کی تعداد ۴۹ ہے جن کی مجموعی آبادی ڈیڑھ ارب سے زائد ہے۔ اس طرح اقوام کی دولت مشترکہ دنیا کے مجموعی آبادی کے ایک چوتھائی (۱/۴) حصے کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس کی عالمی اہمیت کے ثبوت میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اس میں شمالی اور جنوبی امریکہ اور ملحقہ علاقوں کے ۱۴ ممالک، افریقہ کے ۱۵ ممالک، یورپ کے ۳ ممالک، ایشیاء کے ۸ ممالک اور براعظم اسٹریلیا کے ۹ ممالک وعلاقے شامل ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

● شمالی و جنوبی امریکہ کے ممالک

۱۔ کینیڈا۔ ۲۔ اینٹی گوا اینڈ باربوڈا۔ ۳۔ بہاماز۔ ۴۔ باربا ڈوس۔ ۵۔ بیلیزی ۶۔ ڈومینیکا۔ ۷۔ گرینیڈا (غرناطہ)۔ ۸۔ گویانا۔ ۹۔ جمیکا۔ ۱۰۔ سینٹ کٹس نیوس۔ ۱۱۔ سینٹ لوسیا۔ ۱۲۔ سینٹ ونسنٹ۔ ۱۳۔ ٹرینی ڈاڈ اور ٹوباگو۔ ۱۴۔ وانا تو۔

● افریقہ کے ممالک

۱۔ بوتسوانا۔ ۲۔ گیمبیا۔ ۳۔ گھانا۔ ۴۔ کینیا۔ ۵۔ لوسوتھو۔ ۶۔ ملاوی۔ ۷۔ ماریطانیہ۔ ۸۔ نائیجیریا۔ ۹۔ سوازی لینڈ۔ ۱۰۔ تنزانیہ۔ ۱۱۔ یوگنڈا۔ ۱۲۔ زیمبیا۔ ۱۳۔ زمبابوے۔ ۱۴۔ سیرالیون۔ ۱۵۔ موریشیس۔

● یورپ کے ممالک

۱۔ برطانیہ۔ ۲۔ سپرس (قبرص)۔ ۳۔ مالٹا

● ایشیاء کے ممالک

۱۔ پاکستان۔ ۲۔ بنگلہ دیش۔ ۳۔ بھارت۔ ۴۔ سری لنکا۔ ۵۔ مالدیپ
۶۔ ملائشیا۔ ۷۔ سنگاپور۔ ۸ برونئی۔

● آسٹریلیاء کے ممالک

۱۔ آسٹریلیا۔ ۲۔ نیوزی لینڈ۔ ۳۔ کیری باتی۔ ۴۔ ناؤرو۔ ۵۔ پپوا نیوگنی
۶۔ سولومون جزائر۔ ۷۔ ٹونگا۔ ۸۔ ٹووبلو۔ ۹۔ مغربی سموا۔

دولت مشترکہ کو خیر باد کہنے والے ممالک:

۱۔ برما ۱۹۴۷ء
۲۔ جمہوریہ آئرلینڈ ۱۹۴۹ء
۳۔ سوڈان ۱۹۵۶ء
۴۔ برطانوی صومالی لینڈ ۱۹۶۰ء
۵۔ جنوبی افریقہ ۱۹۶۱ء
۶۔ جنوبی کیمرون ۱۹۶۱ء
۷۔ رہوڈیشیا ۱۹۶۵ء
۸۔ جنوبی یمن (سابقہ عدن) ۱۹۶۷ء
۹۔ فیجی ۱۹۸۷ء۔

نوٹ:۔ پاکستان ۳۰ جنوری ۱۹۷۲ء کو برطانیہ کی طرف سے بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے پر "دولت مشترکہ" سے علیحدہ ہوگیا تھا۔ یکم اکتوبر ۱۹۸۹ء (۱۷ برس بعد) کو پاکستان دوبارہ دولت مشترکہ میں شامل ہوگیا۔ اس طرح پاکستان پہلا ملک ہے جو دوبارہ دولت مشترکہ میں شامل ہوا۔

عملہ

اس ادارے کا سربراہ سیکرٹری جنرل ہوتا ہے۔ اس کے لیے برطانوی نژاد ہونا ضروری نہیں ہے۔ اس کے موجودہ سیکرٹری جنرل مسٹر ایمکا آنیاکو ہیں۔ اور اسٹاف کی نفری ۴۱۱ ہے جس کا تعلق مختلف ممبر ممالک سے ہے۔ تمام ممبر ممالک کی عملہ میں نمائندگی ضروری نہیں ہے۔

سربراہی اجلاس

دولت مشترکہ کا سیکرٹریٹ یوں تو تمام اہم عالمی اقتصادی اور معلوماتی شعبوں میں رکن ممالک کے درمیان ربط و تعاون کا ایک موثر ذریعہ ہے۔ تاہم ادارے کے تمام اہم اور اعلیٰ سطحی فیصلے سربراہی اجلاس میں ہوتے ہیں۔ جو ہر دوسرے سال منعقد ہوتا ہے ابتداء میں یہ اجلاس صرف لندن میں ہوا کرتے تھے۔ لیکن اب اس سلسلے میں لندن کی چودھراہٹ باہمی رضامندی اور منظوری سے ختم ہو چکی ہے۔ اب اس کا اجلاس کسی بھی ممبر ملک میں منعقد ہو سکتا ہے۔

کارکردگی : ایک جائزہ

دولت مشترکہ کی تاریخ کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ۱۹۴۷ء سے پہلے یہ صرف سفید فام قوموں کی ایک تنظیم تھی۔ جن میں ساؤتھ افریقہ، آئرش فری سٹیٹ، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور نیو فاؤنڈ لینڈ شامل تھے۔ اس کی حیثیت ایک امیر آدمی کے کلب سے زیادہ نہیں تھی۔ ۴۸-۱۹۴۷ء میں پاکستان، ہندوستان، سری لنکا اور بعض دیگر ممالک نے اس تنظیم میں شمولیت اختیار کی تو یہ کثیر القومیتی (MULTINATIONAL) تنظیم بن گئی۔ جدید دولت مشترکہ برطانوی شہنشاہیت کے خاتمے کا نتیجہ ہے۔ لیکن اس میں تمام نو آبادیات شامل نہیں ہیں۔ ۹ ممالک یا سابقہ نو آبادیات اسے چھوڑ چکی ہیں۔ سابقہ برطانوی نو آبادیات نے مختلف وجوہات کی بناء پر دولت مشترکہ میں شمولیت اختیار کی۔ ان میں باہمی تجارت کا فروغ تعلیمی پروگرام کی بہتری، فنی سہولتیں اور سماجی تعلقات کا فروغ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ دولت مشترکہ کے موجودہ اراکین کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

i۔ پرانی یا سفید فام قومیں۔

ii۔ ترقی یافتہ یا ترقی پذیر ممالک

iii ۔ قوم پرست تنظیمیں جنہوں نے دولت مشترکہ میں اپنا تشخص قائم کر لیا ہوا ہے ۔

دولت مشترکہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ دنیا میں امن قائم رکھنے کے لئے کوشش کرتی ہے اور اس کی حیثیت ایک سوشل کلب یا گپ شپ سینٹر GOSSIP CENTRE سے زیادہ نہیں ہے ۔ جہاں اِس اہم تنظیم کی اہم ترین شخصیات وقتاً فوقتاً جمع ہوتی رہتی ہیں ۔ مختلف مسائل پر رائے زنی کرتی ہیں اور کسی نتیجہ پر پہنچے بغیر اجلاس برخاست کر دیتی ہیں ۔

دولت مشترکہ کی تاریخ میں اس کے دو ہنگامی اجلاس ہو چکے ہیں ۔

○ پہلا ہنگامی اجلاس جنوری ۱۹۶۶ء میں رہوڈیشیا (زمبابوے) کے معاملے پر غور کرنے کے لئے لاگوس (نائیجیریا) میں ہوا تھا ۔ اِس ہنگامی اجلاس میں برطانوی وزیر اعظم ہیرولڈ ولسن نے کہا تھا کہ پابندیوں سے آیان سمتھ کی بغاوت مہینوں کے بجائے ہفتوں میں ختم ہو جائے گی ۔ لیکن آیان سمتھ کی بغاوت مزید ۱۴ سال جاری رہی ۔

○ دوسرا ہنگامی اجلاس اگست ۱۹۸۶ء کو جنوبی افریقہ کے خلاف اقتصادی پابندیاں لگانے کے سلسلے میں لندن میں ہوا ۔ برطانوی وزیر اعظم مسز مارگریٹ تھیچر کی عدم دلچسپی کی وجہ سے دولت مشترکہ کے اِس ہنگامی اجلاس کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا ۔ نسلی امتیاز کے خاتمہ کے لئے جنوبی افریقہ پر دباؤ ڈالنے کی غرض سے بڑے پیمانے پر پابندیاں عائد کئے جانے کے فیصلے سے اتفاق نہ کرنے پر دولت مشترکہ کے رکن ممالک کے سربراہوں نے برطانیہ پر شدید نکتہ چینی کی ۔

چھوٹے ممالک کے مسائل :-

دولت مشترکہ نے چھوٹے ممالک کے مسائل کا جائزہ لینے کے لئے اپنے ۲۴ ویں اجلاس منعقدہ نئی دہلی نومبر ۱۹۸۳ء میں ۱۴ ارکان پر مشتمل ایک مشاورتی گروپ بنایا ۔ جس کے سربراہ بہاماز کے چیف جسٹس ہیں ۔ اس گروپ کا کام چھوٹے

ممالک کے مسائل کی نشاندہی کرنا ہے۔ اس کا پہلا اجلاس جولائی ۱۹۸۴ء کو لندن میں ہوا۔ اس گروپ نے ایک "مطالعاتی گروپ" تشکیل دیا۔ مطالعاتی گروپ نے چھوٹے ممالک کے مسائل پر جو رپورٹ تیار کی ہے اس میں کہا ہے کہ "کوئی بھی چھوٹا ملک اپنے طور پر اپنا دفاع نہیں کر سکتا اور جب کوئی چھوٹا ملک ہنگامی حالات میں پھنس جاتا ہے تو بین الاقوامی تنظیمیں فوری تحفظ فراہم کرنے کے سلسلے میں ناکام رہتی ہیں۔ جیسے لسوتھو اور بوٹسوانا کو جنوبی افریقہ نے اقتصادی پریشانیوں کا نشانہ بنا رکھا ہے۔ اس گروپ نے "مشترکہ فوج" قائم کرنے کی سفارش بھی کی۔ جس میں کسی طاقت کو بھی ویٹو کا اختیار نہ دیا جائے" لیکن ابھی تک اس رپورٹ پر عملدرآمد شروع نہیں ہوا۔

مطالعاتی گروپ نے تسلیم کیا ہے کہ چھوٹی مملکتوں کو محض فوجی اعتبار سے ہی خطرہ نہیں ہے بلکہ ان کے معاشی و سیاسی استحکام کو بھی خطرات لاحق ہوئے ہیں بہت سارے چھوٹے ممالک کی برآمدی تجارت پر کسی بڑے ملک کا تسلط ہے ان کے قدرتی وسائل محدود ہیں اس وجہ سے یہ بین الاقوامی اقتصادیات کے زیر اثر رہتے ہیں۔ رپورٹ میں یہ تجویز پیش کی گئی کہ ایسی مشترکہ حکمت عملی تیار کی جائے کہ برآمدی اشیاء کی مناسب قیمتیں مل سکیں۔ نیز دولت مشترکہ کے ممالک چندے سے ایک فنڈ قائم کریں تاکہ چھوٹے ممالک کی اقتصادی ترقی ممکن ہو سکے۔ بہرحال دولت مشترکہ کے ممالک اب اس بات سے بخوبی واقف ہو چکے ہیں کہ چھوٹے ممالک کے مسائل حل ہونے چاہئیں۔ ستمبر ۱۹۸۴ء کے اجلاس میں پنجاب سے آئے ہوئے ایک ممبر سردار جی نے دوسرے بہت سارے مندوبین کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا تھا

> "ہم ان چھوٹی چھوٹی کشتیوں کی حیثیت رکھتے ہیں جو سمندری طوفان میں پھنس جاتی ہیں وہ آزاد دکھائی دیتی ہیں لیکن جہازرانی نہیں کر سکتیں"

دولت مشترکہ کا ۲۷ واں سربراہی اجلاس اکتوبر ۱۹۸۹ء میں ملائشیا کے دارالحکومت کوالالمپور میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں پاکستان کی وزیراعظم محترمہ بے نظیر بھٹو سمیت ۴۹ ممالک کے وفود نے شرکت کی۔ پاکستان کی درخواست پر اسے دوبارہ دولت مشترکہ

کا ممبر بنایا گیا۔ دولت مشترکہ کو پاکستان نے ۱۹۷۲ء میں محترمہ کے والد جناب ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کی قیادت میں چھوڑ دیا تھا۔ حقیقتاً نہ تو اس وقت چھوڑنے کا کوئی جواز تھا اور نہ ہی دوبارہ شمولیت کا کوئی جواز تھا۔ بھٹو صاحب نے دولت مشترکہ کو اس لیے خیرباد کہا تھا کہ برطانیہ نے بنگلہ دیش کو تسلیم کر لیا تھا۔ جسے بعد میں خود بھٹو صاحب نے بھی تسلیم کیا اور عرب و دیگر ممالک سے بھی تسلیم کروایا۔

پاکستان کی دوبارہ دولت مشترکہ میں شمولیت سے برطانیہ میں پاکستانی طلبہ کو یقیناً وہ تمام سہولتیں حاصل ہو جائیں گی جو دولت مشترکہ کے دیگر ممالک کے طلبہ کو حاصل ہیں اور ہمارے حکمرانوں کو یہ فائدہ حاصل ہو گا کہ وہ ہر دو سال بعد اپنے سابق آقاؤں کے ساتھ ڈنر یا لنچ کھا کر یا تصویر بنوا کر فرحت حاصل کر سکیں گے۔ جس سے وہ ۱۹۷۲ء سے محروم چلے آ رہے تھے۔

دولت مشترکہ کا ۲۹واں سربراہی اجلاس اکتوبر ۱۹۹۳ء میں قبرص میں منعقد ہوا۔ اجلاس میں شرکت سے قبل ہمارے وفد نے اعلان کیا کہ اس دفعہ کشمیر کا مسئلہ قبرص کانفرنس میں بھرپور طریقے سے اٹھایا جائے گا اور شاید اس خوف سے بھارتی وزیراعظم نرسمہا راؤ قبرص کانفرنس میں شریک نہیں ہوئے۔ وہ شاید بھول گئے تھے کہ پاکستان ہمیشہ ہر کانفرنس سے پہلے یہ کہتا ہے مگر وہاں جا کر اس کا ذکر تک نہیں کرتا، حالانکہ مسئلہ کشمیر اٹھانے کے لیے اس دفعہ فضا بہت سازگار تھی اور سوائے بھارت کے شاید ہی کوئی ملک اس کی مخالفت کر پاتا۔ کیونکہ حضرت بل کے محاصرہ کی وجہ سے پوری دنیا کی نظریں بھارتی مظالم پر مرکوز تھیں۔

۴ ۔ اسلامی کانفرنس کی تنظیم

THE ORGANISATION OF THE ISLAMIC CONFERENCE

اسلامی کانفرنس کی تنظیم پر روشنی ڈالنے سے پہلے ایک نظر عالم اسلام پر ڈالنا اس لئے ضروری ہے تاکہ مسلمانوں کے وسائل اور ان کی کارکردگی کی باآسانی جائزہ لیا جاسکے ۔

عالم اسلام درحقیقت اپنی جگہ ایک مستقل دنیا ہے ۔ اس کی اپنی قدریں ہیں اپنا اخلاقی ضابطہ ہے اس کے اپنے جائز و ناجائز کے قوانین ہیں ۔ المختصر یہ ایک ایسی دنیا ہے جو عقیدہ اعمال آئین اور ضابطہ کے نقطہ نگاہ سے ایک الگ دنیا ہے ۔

عالم اسلام بحر الکاہل سے بحر متوسط تک مختلف ممالک پر پھیلا ہوا ہے اور اگر اس کی جغرافیائی ساخت پر غور کیا جائے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس نے ساری دنیا کو کمر سے پکڑ رکھا ہے ۔ اس وسیع و عریض علاقے میں تقریباً ۴۴ ممالک ایسے ہیں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور وہ آزاد بھی ہیں اور صرف آزاد ہی نہیں بلکہ انجمن اقوام کے ممبر بھی ہیں ۔ اس کے مقابلے میں لاطینی امریکہ کے ممالک کی تعداد ۲۲ کے قریب ہے ۔ انہیں دونوں بڑی طاقتیں اپنے ساتھ ملانے کے چکر میں لگی رہتی ہیں تاکہ جنرل اسمبلی کی رائے شماری کے موقع پر ووٹ حاصل کر سکیں ۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ان میں اتحاد ہے اور الاماشاء اللہ ان کے پورے ووٹ ایک ہی جھولی میں جاتے ہیں ۔ ہمارے ۴۴ ووٹ ہونے کے باوجود ہمیں کوئی نہیں پوچھتا کہ تم کس کھیت کی مولی ہو ہماری جتنی تعداد ہے ہم تقریباً اتنی ہی سمتوں میں بکھرے ہوئے ہیں لہٰذا ہم اپنے عددی دباؤ کا بوجھ کسی بھی سپر پاور یا ان کے حلیفوں پر نہیں ڈال سکتے ورنہ اقوام متحدہ میں ۴۴ ووٹوں کے بل بوتے پر ہم اقوام عالم کی قسمتوں کا فیصلہ کر سکتے ہیں لیکن افسوس کہ ہم میں اتحاد نہیں ہے ۔ جس کی وجہ سے ہم دوسروں کی تقدیروں کے بجائے اپنی تقدیر کا فیصلہ بھی نہیں کر سکتے ۔

ممالک عالم کی تعداد کو چھوڑ کر اگر ہم دنیا میں بسنے والی آبادی کا حساب لگائیں تو ۵ ارب انسانوں میں مسلمانوں کی آبادی تقریباً ایک ارب کے قریب ہے اور اتنی بڑی آبادی کے ساتھ ہم دنیا میں ذلیل و خوار ہو رہے ہیں۔ ہماری حیثیت "دم ہلانے والوں" کی سی ہے ہم زندہ ہیں لیکن ہمارا قبلہ اول ہم سے چھین لیا گیا ہے۔ حرم نبی کو اسرائیل کبریٰ میں شامل کرنے کی پکار لگائی جاتی ہے اور ایک بہت بڑے طبقے کی طرف سے مذہب کو افیون کا نام دیا جا رہا ہے خاکم بدہن اللہ پر لعن طعن کی جاتی ہے۔ اگر ہم اس طرح ہر چیز کو برداشت کرتے رہے تو نہ معلوم یہ لامتناہی سلسلہ کہاں جا کر ختم ہوگا اور ہمیں کن کن ذلتوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ لیکن نہیں نہیں۔

"مسلمان غفلت میں ہے مرا نہیں"

اگر ہم مادی نقطہ نگاہ سے ایک چھلکتی ہوئی نظر عالم اسلام پر ڈالیں تو آپ کو یہ سن کر مسرت ہوگی کہ اس روغنی دور OIL AGE میں عالمی پٹرول کے ذخائر کا ۷۰٪ تیل ہمارے ہی ممالک میں ہے۔ اسی طرح دنیا کے قدرتی ربڑ کا ۷۰٪ ٹین کا ۵۲٪ پٹ سن ۵۰٪ کھجور ۹۳٪ پام آئل ۶۰٪ ناریل کا تیل ۲۲٪ پیدا کرتے ہیں۔ زنجبار لونگ کا گھر ہے اور مختلف گرم مصالحوں کے لئے انڈونیشیا کو جو مقام حاصل ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ غذاؤں میں اناج کی مختلف اقسام مثلاً گیہوں چاول جوار باجرہ ہم اپنی عالمی تعداد کے نقطہ نگاہ سے خود مکتفی ہی نہیں بلکہ اپنی ضروریات سے زیادہ پیدا کرتے ہیں۔

لیکن اس معاشی دور میں ہم ترقی یافتہ اقوام کے مقابلے میں پیچھے ہی نہیں بلکہ بہت پیچھے ہیں اس کی بڑی وجہ ہمیں دشمنانِ اسلام کی منڈیوں پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے اور اگر ہم تھوڑی سوجھ بوجھ سے کام لیں تو ہم عالم اسلام کی منڈی کو بہترین خطوط پر منظم کر سکتے ہیں اور اگر ہم نے ایسا کر لیا تو یہ ایک بہت بڑا کارنامہ ہوگا۔

سیاسی میدان میں بھی مسلمانوں میں بعد اور دوری ہے کہیں شہنشاہیت ہے اور کہیں آمریت کہیں جمہوریت ہے کہیں اشتراکیت بلکہ اشتمالیت۔ روز بروز دنیا کے نتائج اس قدر کھنچے جا رہے ہیں کہ آزاد ہونے کے باوجود اغیار کے افکار کے

ہم بُری طرح شکار ہوتے جا رہے ہیں۔ چنانچہ جب جمہوریت کی بات ہم کرتے ہیں تو اکثر و بیشتر انگریزی جمہوریت کا ذکر ہوتا ہے یا امریکی جمہوریت کا یا کسی اور فکر غیر کا گویا ہمارے پاس اپنی کوئی چیز اپنا کوئی نظام نہیں ہے۔ دراصل اس ساری گڑبڑ کی وجہ یہ ہے کہ عالم اسلام کے پاس کوئی متفقہ مجلس شوریٰ نہیں ہے۔ جو وقت اور حالات کے تقاضوں کے مطابق اجتماع اور قیاس کے فرائض انجام دیتی رہے ہم نے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے سلیق کو بھی بھلا دیا ہے۔ جس کی وجہ سے ایک مسلمان دوسرے مسلمان کی جان کا دشمن ہوا ہے۔

اسلامی کانفرنس کی تنظیم کا قیام:

۲۱ راگست ۱۹۶۹ء میں صیہونیوں کی طرف سے مسجد الاقصیٰ کی بے حرمتی نے عالم اسلام میں یہ احساس پیدا کیا کہ وہ صیہونیوں اور دوسرے دشمن عناصر کے جارحانہ عزائم کے خلاف امت مسلمہ کے مفادات کے تحفظ کے لیے خود کو منظم کریں۔ مسجد اقصیٰ کے سانحہ پر عرب وزرائے خارجہ کی کانفرنس میں غور کیا گیا۔ وزرائے خارجہ کی کانفرنس نے یہ تجویز پیش کی کہ اس واقعہ سے پیدا شدہ صورت حال پر غور کرنے کے لیے اسلامی ممالک کے سربراہان ریاست و حکومت کی کانفرنس بلائی جائے۔ کانفرنس کے سلسلے میں ابتدائی اقدامات کرنے کی ذمہ داری سعودی عرب اور مراکش کے وزرائے خارجہ کے سپرد کی گئی۔ انہوں نے باہمی مشورے سے ایک سات رکنی کمیٹی بنائی جس کا کام کانفرنس بلانے کے جملہ امور کی نگرانی کرنا تھا۔ اس کمیٹی نے اسلامی ممالک کے سربراہوں کے مشورے سے ۲۲ ستمبر ۱۹۶۹ء کو رباط (مراکش) میں پہلی اسلامی کانفرنس منعقد کی اور اسلامی کانفرنس کی تنظیم کی داغ بیل پڑی۔

تنظیم کے موجودہ اراکین:

اسلامی کانفرنس کی تنظیم کے اراکین حسب ذیل ممالک ہیں۔

● ایشیاء۔

۱۔ افغانستان ۲۔ ایران ۳۔ اردن ۴۔ انڈونیشیا ۵۔ بحرین

۶۔ بنگلہ دیش ۷۔ پاکستان ۸۔ ترکی ۹۔ سعودی عرب ۱۰۔ شام
۱۱۔ عراق ۱۲۔ عمان ۱۳۔ قطر ۱۴۔ کویت ۱۵۔ گیبون ۱۶۔ گیمبیا ۱۸۔ گنی بساؤ
۱۹۔ لیبیا ۲۰۔ لبنان ۲۱۔ ملائشیا ۲۲۔ مالایپ ۲۳۔ متحدہ عرب امارات
۲۴۔ یمن شمالی ۲۵۔ یمن جنوبی۔

● افریقہ۔

۲۶۔ الجیریا ۲۷۔ اپروولٹا ۲۸۔ برونائی ۲۹۔ تیونس ۳۰۔ جبوتی
۳۱۔ چاڈ ۳۲۔ سینیگال ۳۳۔ سیرالیون ۳۴۔ سوڈان ۳۵۔ صومالیہ
۳۶۔ کومارو ۳۷۔ کیمرون ۳۸۔ مالی ۳۹۔ ماریطانیہ ۴۰۔ مراکش
۴۱۔ مصر ۴۲۔ نائیجیر ۴۳۔ یوگنڈا۔

● یورپ۔

۴۴۔ البانیہ۔

نوٹ:۔ تنظیم آزادی فلسطین کو بھی مکمل رکنیت دی گئی ہے۔

تنظیم کے اعضاء:۔ اسلامی کانفرنس کی تنظیم کے حسب ذیل تین ادارے یا اعضا ہیں۔

(۱) سیکرٹریٹ (۲) اسلامی وزرائے خارجہ کی کانفرنس (۳) اسلامی سربراہ کانفرنس

۱۔ سیکرٹریٹ:۔

اسلامی تنظیم کا انتظامی شعبہ سیکرٹریٹ کہلاتا ہے۔ اس کا مرکزی دفتر جدہ میں ہے اس ادارے کا سربراہ سیکرٹری جنرل ہوتا ہے۔ اس کے پہلے سیکرٹری جنرل ملائیشیا کے تنکو عبدالرحمٰن تھے اور موجودہ سیکرٹری جنرل نائیجیریا کے جناب حامد الغا مد ہیں

۲۔ اسلامی وزرائے خارجہ کی کانفرنس:۔ اسلامی وزرائے خارجہ کی کانفرنس کے لئے باقاعدہ طے شدہ شیڈول نہیں ہے۔ بہر حال بوقت ضرورت وزرائے خارجہ کی کانفرنس بلائی جاسکتی ہے۔ تنظیم کی سربراہی کانفرنسوں کو کامیاب بنانے میں بھی اسلامی وزرائے خارجہ کی کانفرنس اہم کردار ادا کرتی ہے۔ وزرائے خارجہ کی کانفرنس میں مختلف ایجنڈے

تیار ہوتے ہیں۔ اور انہیں سربراہی کانفرنس میں پیش کیا جاتا ہے۔
وزرائے خارجہ کی کانفرنس کا سال میں کم از کم ایک اجلاس ہونا ضروری ہے اور بوقت ضرورت خصوصی اجلاس بھی بلایا جاسکتا ہے۔

۳۔ اسلامی سربراہ کانفرنس:۔ تنظیم اسلامی کانفرنس کا یہ سب سے با اختیار ادارہ ہے اس میں صرف اہم فیصلے ہی نہیں کئے جاتے بلکہ انہیں عملی جامہ پہنانے کے لئے بعض اقدامات بھی کئے جاتے ہیں۔ امن عالم کے سلسلے میں اہم قرارداد یں منظور کی جاتی ہیں۔ اسلامی کانفرنس منعقدہ ۱۹۸۱ء کے فیصلے کے مطابق اب سربراہ کانفرنس ہر تین سال بعد ہوتی ہے۔

کانفرنس کے رہنما اصول:

۱۔ تمام ممبر ممالک خواہ وہ بڑے ہوں یا چھوٹے ان کی حیثیت مساوی ہوگی۔
۲۔ ممبر ممالک حق خود اختیاری کا احترام کریں گے اور کسی بھی ممبر ممالک کے اندرونی معاملات میں مداخلت نہیں کریں گے۔
۳۔ تمام ممبر ممالک ایک دوسرے کے اقتدار اعلیٰ علاقائی سلامتی اور آزادی کا احترام کریں گے۔
۴۔ ممبر ممالک کے درمیان اگر کوئی تنازع ہوگا تو اسے پُر امن طور پر حل کیا جائے گا اور فوجی طریقہ اختیار کرنے سے گریز کیا جائے گا۔
۵۔ ممبر ممالک کے خلاف دھمکی آمیز رویہ یا طاقت کے استعمال سے گریز کیا جائے گا۔ دوسرے ممالک کی علاقائی سلامتی آزادی اور قومی یکجہتی کو تباہ کرنے کے لیے اقدامات نہیں کیے جائیں گے۔

ذیلی تنظیمیں:

اسلامی کانفرنس نے کئی ذیلی تنظیمیں بھی قائم کی ہوتی ہیں ان میں سے چند کے نام حسب ذیل ہیں۔

۱۔ اسلامی ترقیاتی بنک کا قیام

۲۔ بین الاقوامی خبر رساں ایجنسی (دی وائس آف اسلام مکہ مکرمہ)

۳۔ اسلامی ریاستوں کی براڈ کاسٹنگ کی تنظیم

۴۔ اسلامی ممالک کے دارالحکومتوں کی تنظیم

۵۔ اسلامی اتحاد فنڈ

۶۔ القدس فنڈ

۷۔ اسلامی عدالت انصاف کا قیام

سربراہی کانفرنسوں کا ایک جائزہ:

تنظیم اسلامی کانفرنس کی پانچ سربراہی کانفرنسیں ہو چکی ہیں۔

۱۔ ستمبر ۱۹۶۹ء میں اسلامی کانفرنس کی تنظیم کا پہلا سربراہی اجلاس مراکش کے دارالحکومت رباط میں ہوا۔ جس میں ۲۴ مسلم ممالک کے سربراہان مملکت و حکومت نے شرکت کی اس اجلاس میں مسجد اقصیٰ میں آتشزدگی کے واقعہ اور عرب اسرائیل تنازعہ پر غور کیا گیا۔ اسلامی ممالک میں قریبی تعلقات کو فروغ دینے کی ضرورت پر زور دیا گیا۔

۲۔ فروری ۱۹۷۴ء میں اسلامی کانفرنس کی تنظیم کا دوسرا سربراہی اجلاس پاکستان کے تاریخی شہر لاہور میں ہوا۔ اس اجلاس میں ۳۷ مسلم ممالک کے سربراہان مملکت و حکومت نے شرکت کی۔ اس کانفرنس میں عالم اسلام کو درپیش جن مسائل پر غور کیا گیا ان میں سے چند اہم حسب ذیل ہیں۔

(i) مشرق وسطیٰ کا مسئلہ خصوصاً فلسطینیوں کے حقوق کا مسئلہ

(ii) یروشلم اور عربوں کے دیگر مقبوضہ علاقوں سے اسرائیل کا اخراج

(iii) مسلم دنیا میں غربت و افلاس اور جہالت کے خاتمے کے لیے اقدامات

(iv) ترقی یافتہ ممالک کے ہاتھوں ترقی پذیر ممالک کے استحصال کا خاتمہ

(v) آپس میں دوستی اور تعاون کی ضرورت۔

۳۔ جنوری ۱۹۸۱ء میں اسلامی کانفرنس کی تنظیم کا تیسرا سربراہی اجلاس سعودی عرب

کے مشہور شہر طائف میں ہوا۔ اس میں ۳۸ اراکین اور کئی مبصرین نے شرکت کی کانفرنس میں مندرجہ ذیل مسائل پر غور کیا گیا۔

— مسئلہ افغانستان کا سیاسی تصفیہ
— ۱۹۸۰ء سے جاری ہونے والی ایران عراق جنگ
— مسئلہ فلسطین اور مقبوضہ عرب علاقے اسرائیل سے خالی کروانا۔
— دفاعی میدان میں اسلامی ممالک کے مابین تعاون بڑھانے کے لیے سیکرٹریٹ میں ایک فوجی شعبہ قائم کرنے کی متفقہ منظوری دی گئی۔

۴۔ جنوری ۱۹۸۴ء میں اسلامی کانفرنس کی تنظیم کا چوتھا سربراہی اجلاس مراکش کے شہر کیسابلانکا میں ہوا۔ اس میں ۴۲ ممبران اور بعض مبصرین نے شرکت کی اس اجلاس میں کانفرنس نے متعدد فیصلے کیے جو قراردادوں کی صورت میں ہمارے سامنے ہیں۔

— مشرق وسطی کے مسئلے کا کوئی ایسا حل قابل قبول نہیں ہوگا جس میں تنظیم آزادی فلسطین (P.L.O) کو فلسطینیوں کا نمائندہ تسلیم نہ کیا گیا نیز فلسطینیوں کی علیحدہ ریاست کے قیام کی ضمانت موجود نہ ہو۔
— بیت المقدس کی بازیابی اور مقبوضہ عرب علاقوں کی واپسی کے لیے سفارتی کوششیں جاری رکھنے کا اعادہ کیا گیا۔
— افغانستان سے روسی فوجوں کے انخلا کا مطالبہ کیا گیا۔
— ایران عراق جنگ کی ضمن میں مسلمان رہنماؤں نے ۹ رکنی اسلامی امن کمیٹی سے کہا کہ وہ اس جنگ کو ختم کرانے کے لیے جس میں ناحق مسلمانوں کا خون بہہ رہا ہے۔ اپنی کوششیں جاری رکھے۔ کانفرنس نے ایران اور عراق سے بھی اپیل کی کہ وہ جنگ بند کر دیں اور اپنی فوجیں بین الاقوامی طور پر تسلیم شدہ سرحدوں پر واپس لے جائیں۔
— کانفرنس کا ایک اہم فیصلہ سائنسی اور فنی تعاون کے ۲ سالہ منصوبہ کی منظوری سے متعلق ہے۔ اس منصوبے کو صدر ضیاء الحق کی سربراہی میں قائم کردہ ایک

مجلس قائمہ نے مرتب کیا تھا۔ اس منصوبے پر پہلے پانچ سالوں میں ۴۵ کروڑ ڈالر خرچ ہوں گے۔

— ● کانفرنس نے مسلم ممالک کے مابین ثقافتی سرگرمیوں کو مربوط بنانے کے لیے ایک ثقافتی حکمت عملی تیار کرنے بھی اتفاق کیا۔

اس کانفرنس کے موقع پر مصر کو اسلامی کانفرنس کی تنظیم میں دوبارہ شامل کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ یاد رہے کہ مصر کو مئی ۱۹۷۹ء میں کیمپ ڈیوڈ سمجھوتے کی وجہ سے عرب لیگ اور اسلامی کانفرنس کی تنظیم سے علیحدہ کر دیا گیا تھا۔

۵۔ جنوری ۱۹۸۷ء میں اسلامی کانفرنس کی تنظیم کا پانچواں سربراہی اجلاس کویت میں منعقد ہوا افغانستان کے علاوہ تمام ممبران نے اس میں شرکت کی۔ اس اجلاس میں اسلامی سربراہ کانفرنس نے بین الاقوامی عدالت انصاف کا منشور منظور کیا۔ اعلامیہ کے نکات حسب ذیل تھے۔

— ● ایران و عراق سے فوری جنگ بند کرنے کی اپیل کی گئی۔

— ● اسلامی ممالک پر زور دیا گیا کہ وہ افغان مجاہدین سے اپنے رابطہ بڑھائیں اور جنیوا مذاکرات کے آئندہ اجلاس میں افغانستان سے سوویت فوجوں کی واپسی کا نظام اوقات طے ہونا چاہیے۔ اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل کی کوششوں کو سراہا گیا۔

● اسلامی ممالک کو متنبہ کیا گیا کہ وہ اسرائیل کے ساتھ سفارتی تعلقات قائم کرنے سے باز رہیں۔

● امریکہ لیبیا کے جانی و مالی نقصان کا تاوان ادا کرے۔

● اعلامیہ میں اسرائیل کے لیے امریکہ کی لامحدود حمایت کی مذمت کی گئی۔

● اعلامیہ میں غیر مسلم ممالک میں بسنے والے مسلمانوں کی حالت کے بارے میں بھی ایک قرارداد منظور کی گئی۔ جس میں ان کے مذہبی ثقافتی سیاسی اور اقتصادی حقوق کی حمایت کی گئی۔

۶۔ دسمبر ۱۹۹۱ء کو اسلامی کانفرنس کی تنظیم کا چھٹا سربراہی اجلاس سینیگال کے دارالحکومت ڈاکار میں منعقد ہوا۔ اس کانفرنس میں مسلم امۃ کو درپیش سیاسی، اقتصادی و ثقافتی مسائل

سے متعلق ۲۹ قراردادیں متفقہ طور پر منظور کی گئیں۔ سربراہ کانفرنس میں مسئلہ کشمیر کو پہلی بار باضابطہ طور پر پیش کیا گیا۔ ایک قرارداد کے ذریعے مقبوضہ کشمیر میں بھارتی جبر و تشدد کی مذمت کرتے ہوئے انسانی حقوق کے احترام پر زور دیا گیا۔

کانفرنس کے مشترکہ اعلامیہ میں عہد کیا گیا ہے کہ ۳۰ کروڑ مسلم اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ کیا جائے گا۔ تمام اسلامی ممالک دفاع، غربت، مسائل اور بیماریوں کے خاتمے کے لئے مل کر کوششیں کریں گے۔ تمام تصفیہ طلب مسائل اور تنازعات، انصاف اور مساوات کی بنیاد پر حل کئے جائیں گے۔ اسلامی ممالک کے خلاف دھمکیوں یا خطرے کو ختم کرنے کے لئے کوششوں کی حمایت اور آئی او سی کے رکن ممالک کے درمیان مشترکہ صنعتی منصوبے شروع کرنے پر زور دیا گیا۔

تبصرہ

اسلامی کانفرنس کی تنظیم کا قیام ستمبر ۱۹۶۹ء میں اسرائیل کے توسیع پسندانہ عزائم اور کھلی دہشت گردی کو روکنے کے لئے عمل میں آیا تھا۔ آج اس تنظیم کے قیام کو ۲۰ سال سے زائد عرصہ گزر چکا ہے۔ اس کے چھ سربراہی اجلاس ہو چکے ہیں۔ اس پورے عرصے میں اس تنظیم نے کوئی نمایاں کارنامہ سرانجام نہیں دیا۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اس کے اراکین میں عالمی صورت حال کے حوالے سے وحدت فکر و نظر و یکسانیت نہیں پائی جاتی۔ کچھ ممالک مثلاً سعودی عرب خلیجی ریاستیں اور مصر وغیرہ امریکہ کے زیر اثر ہیں۔ اور افریقہ کی بیشتر ریاستیں برطانیہ اور فرانس کے حلقہ اثر میں ہیں۔ سوویت یونین کے زوال سے قبل بعض اسلامی ممالک کا جھکاؤ اس کی طرف تھا۔ مختلف بلاکوں میں بٹی ہوئی اسلامی دنیا آج تک کوئی مشترکہ لائحہ عمل بنا کر اس پر عمل درآمد نہیں کروا سکی۔ عراق ایران جنگ، کیمپ ڈیوڈ سمجھوتے میں مصر کی شمولیت، مشرق وسطیٰ میں اسرائیلی جارحیت، کشمیر میں بھارتی جبر و تشدد، صحارا کا مسئلہ، افغانستان کا مسئلہ اور حال ہی میں کویت پر عراقی قبضہ کے مسئلے پر تنظیم قراردادیں پاس کرنے اور اپیلیں جاری کرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکی۔

اس تنظیم کا ایک اور افسوسناک پہلو یہ ہے کہ اس تنظیم کے پاس اتنے اختیارات بھی نہیں ہیں کہ ان فیصلوں کو نافذ کرا سکے جو اس نے اتفاق رائے سے کئے ہوں۔ ممبر

ممالک کو یہ زیادہ سے زیادہ یہ سزا دے سکتی ہے کہ ان کی ممبر شپ معطل یا ختم کر دے جیسا کہ افغانستان اور مصر کے معاملے پر تنظیم اپنا یہ اختیار استعمال کر چکی ہے۔ لیکن جن وجوہات کی بنا پر ۱۹۷۹ء میں مصر کی ممبر شپ معطل کی گئی تھی ان وجوہات کے برقرار ہوتے ہوئے ۱۹۸۱ء میں مصر کی ممبر شپ بحال کر دی گئی۔

۵۔ عرب لیگ

THE ARAB LEAGUE

عرب اتحاد کا تصور زیادہ پرانا نہیں ہے۔ سب سے پہلے عراق کے وزیر اعظم مرحوم نوری السعید نے ۱۹۴۳ء میں عرب اتحاد کا منصوبہ پیش کیا۔ پہلے مرحلے میں شام لبنان فلسطین اور مشرقی اردن کو ملا کر ایک مملکت بنانا تھا۔ جس میں عیسائی اور یہودی اقلیتوں کے حقوق کی مناسب ضمانت ہوتی۔ دوسرے مرحلے میں یہ مملکت اور عراق مل کر عرب لیگ کی تشکیل کرتے اس عرب لیگ میں مصر کی شمولیت کے سوال پر کوئی روشنی نہیں ڈالی گئی۔ لیکن مصر کے وزیر اعظم نحاس پاشا نے اصرار کیا کہ عرب اتحاد کے کسی بھی منصوبے میں ان کے ملک کو نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیئے۔ اس وقت مصر عرب دنیا کا سب سے طاقتور ملک تھا معاشی اعتبار سے وہ بقیہ عرب ممالک کے مجموعے کے برابر تھا۔ دو سال کی گفت و شنید کے بعد بالآخر ۲۲ مارچ ۱۹۴۵ء میں عرب لیگ عالم وجود میں آگئی۔ بنیادی طور پر یہ تعاونی تنظیم ہے نا کہ دفاعی۔ اس تنظیم کے قیام میں عرب ممالک کے علاوہ مغربی ممالک کی کوششیں بھی شامل ہیں لیکن برطانوی رویہ کی وجہ سے ہم اسے مغربی حمایت کی تنظیم قرار نہیں دے سکتے۔

لیگ کے اراکین:۔ لیگ کے ابتدائی اراکین میں مصر[1]، عراق[2]، اردن[3]، لبنان[4]، سعودی عرب[5]، شام[6] اور شمالی یمن شامل ہیں جب کہ الجیریا[8] بحرین[9]، جبوتی[10]، کویت[11]. لیبیا[12]، ماریطانیہ[13]، مراکش[14]، عمان[15]، قطر[16]، صومالیہ[17]، سوڈان[18] تیونس[19]. متحدہ عرب امارات[20] اور جنوبی یمن[21] نے اس کے منشور سے اتفاق کرتے ہوئے اس کی رکنیت قبول کی تنظیم آزادی فلسطین کو بھی مکمل ممبر شپ عطا کی گئی ہے۔

لیگ کے مقاصد:۔

- عرب ممالک کے باہمی تعلقات کو فروغ دینا۔

- تمام ممالک کی پالیسیوں میں ربط پیدا کرنا۔
- ارکین کے باہمی جھگڑوں کو ختم کرنا۔
- آزادی و علاقائی سالمیت کا تحفظ کرنا۔
- سیاسی، سماجی ثقافتی اقتصادی سائنسی و تیکنیکی میدان میں تعاون کو فروغ دینا۔

انتظامی ڈھانچہ:۔ جہاں تک لیگ کے انتظامی ڈھانچے کا تعلق ہے تو اس کے اہم اداروں میں کونسل اور سیکرٹریٹ ہیں کونسل تمام عرب ممالک کے نمائندوں پر مشتمل ہے۔ کونسل کے فیصلے اتفاق رائے سے ہوتے ہیں کوئی فیصلہ کسی ممبر پر زبردستی نہیں تھوپا جاتا۔ لیکن کونسل کو لیگ کا فیصلہ نافذ کرنے کا اختیار نہیں ہے۔

تنظیم کا سیکرٹریٹ دوسرا اہم شعبہ ہے اور اس کے ماتحت عملہ تمام عرب ممالک کے شہری حکمرانوں پر مشتمل ہے اس پر ۱۹۷۹ء تک مصر کا غلبہ رہا۔ میرے خیال میں مصر ہی وہ واحد ملک ہے جو عربوں کو لیڈرشپ فراہم کر سکتا ہے اور کوئی ملک یہ کام سرانجام نہیں دے سکتا۔ عراق کو اس سلسلے میں دوسرے نمبر پر لایا جا سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ آج ایک بار پھر مصر اور دیگر عرب ممالک ایک دوسرے کے قریب آرہے ہیں۔ انتظامی سہولتوں کے لئے عرب لیگ میں مختلف کمیٹیاں بھی قائم کی گئی ہیں مثلاً سیاسی کمیٹی، اقتصادی کمیٹی، پریس کمیٹی، سائنس اور قانونی کمیٹی وغیرہ۔ یہ کمیٹیاں مختلف امور کا جائزہ لیتی ہیں اور اجلاس میں ان پر بحث کر کے آئندہ کا لائحہ عمل مرتب کیا جاتا ہے اور بعض امور کو عملی جامہ بھی پہنایا جاتا ہے۔

لیگ کی کارکردگی:۔ عرب لیگ کی کارکردگی بہت حوصلہ افزا تو نہیں ہے مگر پھر بھی بعض امور میں اس نے گراں قدر خدمات انجام دی ہیں ان کا یہاں مختصراً جائزہ لیا جا رہا ہے۔

۱۔ ۱۹۴۶ء میں تمام ارکین کے درمیان ایک ثقافتی معاہدہ ہوا۔ جس کے تحت ثقافتی اداروں کو فروغ دینے کے لئے ایک ادارہ قائم کیا گیا۔ اس ادارے کا ایک مقصد ماہرین تیار کرنا بھی ہے۔

۲۔ ۱۹۵۰ء میں عرب ممالک کے درمیان ایک دفاعی معاہدہ ہوا۔ جس کا مقصد جارحیت کے خلاف ممبر ممالک کا تحفظ کرنا تھا لیکن باہمی اختلافات کی وجہ سے مشترکہ فوجی کمان قائم نہ ہو سکی۔

۳۔ ۱۹۵۰ء کے عشرے میں بہت سارے عرب ممالک آزاد ہوئے جس سے لیگ کی رکنیت میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ لیگ نے تمام ممالک کی تحریک آزادی کی نہ صرف حمایت کی بلکہ ان کے ساتھ عملی تعاون بھی کیا۔

۴۔ ۱۹۵۷ء میں ممبر ممالک نے ایک مالیاتی ادارہ قائم کیا۔ جس کو بعد ازاں "عرب بنک" میں تبدیل کر دیا گیا۔

۵۔ عرب لیگ نے ممبر ممالک کی مشترکہ منڈی کے سلسلے میں بھی کاغذی کارروائی کی مگر ممبران کی خود غرضی اور ذاتی مفاد پرستی کی وجہ سے یہ منڈی قائم نہ ہو سکی۔

۶۔ عرب لیگ کے دو ممبر ممالک مصر اور شام کے مابین ۱۹۵۸ء میں ایک متحدہ ریاست قائم ہوئی۔ صدر عبد الناصر کو اس کا پہلا سربراہ منتخب کیا گیا۔ شام نے ناصر کی بالادستی کو پسند نہیں کیا جس کی وجہ سے ۱۹۶۱ء میں یہ الحاق ختم ہو گیا۔

۷۔ ستمبر ۱۹۶۲ء میں مصر اور یمن کے مابین بھی ایک وفاق قائم ہوا۔ مگر جلد ہی یمن اور مصر کی حکومتوں کے درمیان اختلاف کی خلیج حائل ہو گئی۔ یمن کی حکومت اور عوام لادینی نظریات کو پسند نہ کرتے تھے۔ یہی بات اختلاف کا باعث بنی اور یہ الحاق زیادہ عرصہ نہ چل سکا۔

۸۔ ۱۹۶۸ء میں عراق اور اردن نے ایک متحدہ مملکت قائم کی۔ یہ الحاق دراصل مصر اور شام کے الحاق کے جواب میں ہوا تھا۔ کیونکہ مصر اور عراق کے مابین عربوں کی قیادت کے سلسلے میں کشمکش پائی جاتی ہے۔ عراق اور اردن کے وفاق کا سب سے بڑا سقم یہ تھا کہ اس کے تحفظ کے لئے عملاً کوئی اقدام نہ کیا جا سکے۔ ۱۴ر جولائی ۱۹۵۸ء کو عراق میں ایک انقلاب آیا تو انقلابی حکومت نے اس وفاق کے خاتمے کا اعلان کر دیا۔

۹۔ ۱۹۷۲ء میں مصر، شام اور لیبیا نے ایک مشترکہ حکومت قائم کی مگر انور سادات اور کرنل قذافی کے اختلافات کی وجہ سے یہ منصوبہ پایہ تکمیل تک نہ پہنچ سکا۔

۱۰۔ جہاں تک اسرائیل کا تعلق ہے۔ عرب ممالک نے اس کے قیام کی شدید مخالفت کی مگر جب عملی کارروائی کی بات آتی ہے تو وہاں ہمیں مایوسی نظر آتی ہے کیونکہ نہ تو عرب لیگ ۱۹۴۸ء میں اس کے قیام کو روک سکی اور نہ ہی ۱۹۴۸ء، ۱۹۵۶ء، ۱۹۶۷ء، ۱۹۷۳ء اور ۱۹۸۲ء کی جنگوں میں کوئی مشترکہ لائحہ عمل تیار کر سکی۔ جس کی وجہ سے ان پانچوں جنگوں میں عربوں کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔

۱۱۔ نہر سوئز کے بحران میں بھی عرب لیگ کوئی اہم کردار ادا نہ کر سکی۔ اس حقیقت کے باوجود کے عرب ممالک کے مسائل مشترکہ ہیں۔ اس بحران کی بدولت مشرق وسطی میں روس کے اثر و رسوخ میں اضافہ ہوا۔ عربوں کو یقین ہو گیا کہ برطانیہ اور فرانس اسرائیل کے دوست ہیں۔ اس لئے یہ کبھی عربوں کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ جس سے ان کی خارجہ پالیسی کا جھکاؤ کمیونسٹ بلاک کی طرف ہو گیا۔ اور مصر نے روس کے ساتھ دوستی کا ایک معاہدہ بھی کر لیا مگر افسوس کہ ۱۹۷۳ء کی عرب اسرائیل جنگ میں روس کی طرف سے وہ سب کچھ نہیں کیا گیا جس کا اس نے وعدہ کیا تھا۔ جس کی وجہ سے ۱۹۷۶ء میں مصر کو دوستی کا یہ معاہدہ ختم کرنا پڑا۔ صدر سادات نے ایک بار پھر اپنی پالیسی کا جھکاؤ امریکہ کی طرف کر دیا۔ اور امریکہ کی مدد سے مارچ ۱۹۷۹ء میں اسرائیل کے ساتھ کیمپ ڈیوڈ سمجھوتے پر دستخط کئے۔ جس سے عربوں میں شدید اختلافات پیدا ہو گئے مصر کو اسلامی کانفرنس کی تنظیم اور عرب لیگ سے نکال دیا گیا۔ چین نے ان حالات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مصر کے ساتھ فوجی امداد اور فاضل پرزہ جات کی فراہمی کا ایک معاہدہ کر لیا۔ جس سے مصر کے ایک طرف امریکہ سے اور دوسری طرف چین سے تعلقات بہت اچھے ہو گئے۔

۱۲۔ اگست ۱۹۹۰ء میں عراق نے کویت پر فوجی قبضہ کر لیا وہ مزید عرب ممالک کو اپنے زیر نگین لانا چاہتا تھا۔ عرب لیگ کویت کو عراقی قبضہ سے آزاد کرانے کے لئے کوئی لائحہ عمل تیار نہ کر سکی۔ اس صورت حال میں سعودی عرب اور دیگر عرب ممالک نے امریکہ کو اپنا ہمنوا سمجھ کر امداد طلب کی۔ ۲۹ نومبر کو سلامتی کونسل نے عراق کو الٹی میٹم دیا۔ کہ اگر ۱۵ جنوری ۱۹۹۱ء تک

عراقی فوجیں کویت سے واپس نہ گئیں تو عراق کے خلاف طاقت کا استعمال کیا جائے گا۔ عراق نے اس الٹی میٹم کو کوئی اہمیت نہ دی چنانچہ ۱۷ر جنوری کو امریکہ برطانیہ اور فرانس کی فوج کی سربراہی میں ۳۰ ممالک کی فوج نے عراق کے خلاف کارروائی کی۔ ۲۶ر فروری کو عراق کویت خالی کرنے پر تیار ہو گیا اور ۲۸ر فروری کو جنگ بند ہو گئی۔ اس ۴۲ روزہ جنگ میں عراق کا تقریباً ۲۰۰ سو ارب ڈالر کا حربی و غیر حربی نقصان ہوا اور ۵۰ ہزار سے زیادہ شہری ہلاک ہوئے۔ اس جنگ سے عرب کاز کو شدید نقصان پہنچا ہے اور آنے والے زمانے میں "عظیم عرب اتحاد" مشکل ہو گیا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ عرب ممالک کے مسائل مشترکہ ہیں۔ لیکن اس کے باوجود عرب سیاسی لحاظ سے دو بلاکوں میں تقسیم ہیں۔ ایک قدامت پسند اور دوسرا ترقی پسند بلاک ہے۔ ان کی اس تقسیم کا براہ راست اثر عرب لیگ کی کارکردگی پر بھی پڑ رہا ہے ممبر ممالک کی پالیسی کو جس سے ربط قائم کرنا مشکل ہو گیا ہے۔ عرب ممالک کے مابین علاقائی تنازعات بھی ہیں۔ اور سیاسی تصادم بھی۔ چند عرب ممالک میں بادشاہت ہے اور بیشتر ممالک میں نہ جمہوریت ہے اور نہ بادشاہت بلکہ وہاں شخصی حکمرانی ہے۔ یہ تصادم بھی عرب لیگ کی کارکردگی پر اثر انداز ہو رہا ہے۔ گروہ بندیوں اور سیاسی تصادم کی وجہ سے لیگ ایک کمزور ادارہ ہے۔ لیکن اس کے ذریعے عربوں کو ایک سیاسی پلیٹ فارم ضرور مل گیا ہے اور اس کے قیام سے مشترکہ تہذیب اور نسل سے عرب ممالک کی وابستگی کا اظہار ہوتا ہے۔

۶۔ تنظیم آزادی فلسطین

PALESTINE LIBERATION ORGANISATION

فلسطین کی جدوجہد آزادی کی ابتدا ۲۱ر نومبر ۱۹۱۷ء سے ہی شروع ہوگئی تھی۔ جب انگریزوں نے ارض فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن بنانے کا اعلان کیا۔ فلسطینی حریت پسندوں کے مفتی اعظم فلسطین مرحوم جناب امین الحسینی نے عرب اڈہاک کمیٹی بناکر اتحاد کی داغ بیل ڈالی۔ موجودہ صدی کی تیسری اور چوتھی دہائیوں میں اس کمیٹی نے کافی کام کیا۔ مگر یہ کام صرف عرضداشتیں مرتب کرنے اور عرب و عالمی رائے عامہ کی توجہ فلسطینیوں کے ساتھ ناانصافی کی طرف مبذول کرانے تک ہی محدود رہی۔

تنظیم آزادیٔ فلسطین ۱۹۶۴ء میں ہونے والی عرب سربراہ کانفرنس میں قائم کی گئی۔ اسی سال فلسطین کی "فوج آزادی" کا قیام عمل میں آیا۔ دنیا کے تقریباً ۱۲۰ر ممالک نے تنظیم آزادی فلسطین کو فلسطینی عوام کی واحد نمائندہ جماعت کی حیثیت سے تسلیم کر لیا ہے تنظیم کو عرب لیگ اور تنظیم اسلامی کانفرنس کی مکمل رکنیت دی گئی ہے۔ جبکہ اقوام متحدہ اور اس کے ذیلی اداروں میں اسے مبصر کا درجہ دیا گیا ہے۔

فلسطینی عوام کے تمام مزاحمتی گروپ پی ایل او میں شامل ہیں۔ اہم مزاحمتی گروپ حسب ذیل ہیں۔

۱۔ فلسطین کی تحریک قومی آزادی۔

اس تحریک کو عرف عام میں الفتح کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ یہ سب سے بڑا اور منظم گروپ ہے۔ اسے ۱۹۵۶ء میں تشکیل دیا گیا۔ اسے گوریلا تنظیموں میں اولیت کا شرف بھی حاصل ہے۔

۲۔ العاصفہ۔

یہ الفتح کا عسکری بازو ہے یاسر عرفات اس کے کمانڈر ہیں۔

۳۔ عوامی محاذ برائے آزادی فلسطین۔

۱۹۶۷ء میں قائم شدہ اس تنظیم کی قیادت ڈاکٹر جارج جبش کے ہاتھ میں ہے یہ انتہائی نظریات رکھنے والی تنظیم ہے۔

۴۔ فلسطین کی آزادی کے عوامی محاذ کی جنرل کمان۔

عوامی محاذ سے علیحدہ ہونے والے بعض فلسطینی رہنماؤں نے اس کی داغ بیل ڈالی تھی۔ اس محاذ کو شام کی حمایت حاصل ہے۔ احمد جبریل اس کے سربراہ ہیں۔

۵۔ صاعقہ۔

یہ گروپ بھی ۱۹۶۷ء میں قائم کیا گیا تھا۔ نظریاتی طور پر یہ شام کے زیادہ قریب ہے۔ اس کی قیادت سیمی عطاری کے پاس ہے۔

۶۔ جمہوری محاذ برائے آزادی فلسطین۔

یہ گروپ ۱۹۶۹ء میں عوامی محاذ سے کٹ کر بنا تھا۔ انتہائی نظریات کا حامل ہے۔ نائف حواطمع اس کے رہنما ہیں۔

۷۔ عرب محاذ آزادی۔

اس محاذ کے سربراہ عبدالرحیم ہیں۔ انہیں عراق کی حمایت حاصل ہے۔

۸۔ محاذ قومی جد وجہد۔

یہ محاذ ۱۹۶۷ء میں قائم ہوا اس کے سیکریٹری جنرل سمیر غوشیہ ہیں۔

۹۔ محاذ آزادی۔

یہ گروپ بھی عراق کا حامی ہے۔ محاذ آزادی، عوامی محاذ کی جنرل کمان سے الگ ہو کر اپریل ۱۹۷۷ء میں وجود میں آیا۔ طلعت یعقوب اس کے سیکریٹری جنرل ہیں۔

تنظیم کا جمہوری طرز عمل:۔ پی ایل او کے عہدے دار باقاعدہ انتخابات کے ذریعے مقرر کئے جاتے ہیں۔ تمام اہم فیصلے تنظیم کے پالیسی ساز اداروں میں باقاعدہ بحث کے بعد کئے جاتے ہیں۔ چیئرمین یاسر عرفات سمیت تمام عہدہ داروں کا بڑی بیرحمی کے ساتھ احتساب کیا جاتا ہے۔ یہی جمہوری طرز عمل فلسطینیوں کو دوسرے عربوں سے ممتاز کرتا ہے اور یہی اس تحریک کی کامیابی کا
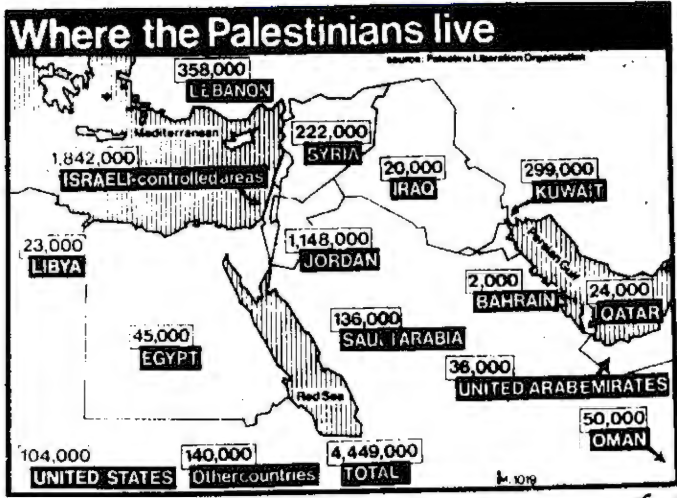
ضامن بھی ہے۔

فلسطینیوں کی آبادی:۔ پی ایل او کے ذرائع سے مطابق فلسطینیوں کی کل آبادی ۴۴ لاکھ ۴۹ ہزار ہے جو مختلف عرب اور دیگر ممالک میں پھیلی ہوئی ہے۔

پی ایل او کا قومی منشور:۔ بقول یاسر عرفات کہ "ہم فلسطین میں ایک جمہوری ریاست قائم کرنا چاہتے ہیں۔ جس میں رنگ نسل اور مذہب کے امتیاز کے بغیر ہر شخص کو مساوی حقوق حاصل ہوں گے۔

۱۷ جون ۱۹۶۸ء کو تنظیم کی قومی کونسل نے ایک قومی منشور کی منظوری دی جس کے اہم نکات حسب ذیل ہیں۔

۱۔ فلسطین عرب عوام کا وطن ہے۔ عرب سرزمین کا ناقابل تقسیم حصہ ہے اور فلسطین لوگ عرب قوم کا ایک جزو لاینفک ہیں۔

۲۔ فلسطینی عوام کو اپنے وطن پر قانونی حق حاصل ہے۔ تاکہ وہ اپنی مرضی و منشا کے مطابق آزادانہ فیصلے کر سکیں۔

۳۔ فلسطین برطانوی تولیت کے دور کی اپنی سرحدوں کے ساتھ ایک ناقابل تقسیم جغرافیائی اکائی ہے۔

۴۔ فلسطینی شناخت بنیادی لازمی اور جبلی امتیازی خصوصیت ہے جو نسل در نسل منتقل ہوتی ہے صیہونی قبضہ اور تشدد کے ذریعے اسے ختم نہیں کیا جا سکتا۔

۵۔ وہ عرب باشندے جو ۱۹۴۷ء تک فلسطین میں رہائش پذیر تھے وہ اور ان کی اولاد خواہ کہیں بھی ہو فلسطینی ہے۔

۶۔ وہ یہودی جو صیہونی حملے سے قبل فلسطین میں رہتے تھے وہ بھی فلسطینی ہیں۔

۷۔ فلسطینی عوام کے جدوجہد آزادی کی خاطر باہمی اختلافات ختم ہو جانے چاہئیں۔

۸۔ فلسطین کی آزادی کے لئے مسلح جدوجہد ہی واحد ذریعہ رہ گیا ہے۔

۹۔ فلسطینیوں کے تین اصول ہیں۔

(۱) اتحاد (۲) قومی تنظیم (۳) آزادی۔

۱۰۔ عرب قوم کی قسمت اور بقا کا دارومدار فلسطینی کاز کی کامیابی میں پوشیدہ ہے۔

۱۱۔ روحانی نقطہ نظر سے فلسطین کی آزادی سے ارض مقدس میں تحفظ اور امن کی فضا پیدا ہوگی۔ یہی وجہ ہے فلسطینی عوام دنیا کے تمام ہی روحانی طاقتوں سے حمایت کی توقع کرتے ہیں۔

۱۲۔ ۱۹۴۷ء میں فلسطین کی تقسیم اور اسرائیلی مملکت کا قیام وقت گزر جانے کے باوجود غیر قانونی اقدامات ہیں۔ کیونکہ یہ فلسطینی قوم کی مرضی اور اپنے وطن میں فطری حقوق کے خلاف مسلط کئے گئے تھے اور یہ اقوام متحدہ کے منشور سے بھی مطابقت نہیں رکھتے جس کے تحت قوموں کے حق خود ارادی کو تسلیم کیا گیا ہے۔

۱۳۔ اعلان بالفور۔ فلسطین پر نظام تولیت اور ان کی بنیاد پر جو کچھ کیا گیا ہے غیر موثر اور غیر قانونی قرار دیئے جاتے ہیں۔

۱۴۔ فلسطینی قوم انصاف آزادی خود مختاری۔ حق خود ارادی اور انسانی وقار کے اصولوں پر ایمان رکھتی ہے اور سمجھتی ہے کہ تمام قوموں کو ان اصولوں کو روبۂ عمل لانے کا حق ہونا چاہیئے۔

قومی منشور کے متذکرہ بالا اصولوں سے فلسطینی انقلاب اور تحریک مزاحمت کے حقیقی خدوخال نمایاں نظر آتے ہیں۔

اقتصادی تعاون کی تنظیم (ایکو)

ECONOMIC CO-OPERATION ORGANISATION (E.C.O)

اقتصادی تعاون کی تنظیم کا قیام جنوری ۱۹۸۵ء میں علاقائی تعاون برائے ترقی (Regional Co-operation for Development) کی جگہ عمل میں آیا۔

۲۱ جولائی ۱۹۶۴ء کو پاکستان، ایران اور ترکی کے سربراہوں نے علاقائی تعاون برائے ترقی (آر۔ سی۔ ڈی) کے معاہدے پر دستخط کئے۔ اس معاہدے کے اہم مقاصد حسب ذیل تھے۔

1۔ مشترکہ مقاصد کے حصول کے لئے مشترکہ منصوبہ بندی کرنا۔
2۔ باہمی تجارت کو فروغ دینا۔
3۔ تینوں ممالک کے درمیان سفری سہولتیں بہتر بنانا اور سیاحت کو فروغ دینا۔
4۔ جہاز رانی میں تعاون اور مشترکہ جہاز راں ادارے کا قیام۔
5۔ صنعتی، تیکنیکی، ثقافتی اور تعلیمی شعبوں میں قریبی تعاون

آر سی ڈی کا صدر دفتر تہران میں قائم کیا گیا اور اس ادارے کا سربراہ سیکریٹری جنرل کہلاتا تھا۔

آر سی ڈی کی تنظیم فروری ۱۹۷۹ء میں ایرانی انقلاب کے ظہور پذیر ہونے تک قائم رہی۔ اس عرصے میں اس تنظیم نے تینوں ممالک کے عوام کو قریب تر لانے اور ان کی معاشی حالت کو بہتر بنانے کے لئے اہم کردار ادا کیا۔ تنظیم نے پیٹرولیم، تجارت، بینکنگ اور انشورنس، سیر و سیاحت، ہوائی رابطہ، جہاز رانی، ڈاک و تار اور ذرائع نقل و حرکت کے میدانوں میں گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔

تینوں ممالک کے درمیان خشکی کے سفر کی سہولتوں کو بہتر کرنے کے لئے آر سی ڈی شاہراہ تعمیر کی جو کراچی کو تہران اور انقرہ سے ملاتی ہے۔ اس معاہدے کی روشنی میں کئی مشترکہ صنعتی منصوبے تیار کئے گئے۔ ان میں کھاد تیار کرنا، کیمیکلز، کاریں بنانا، آئرن اور اسٹیل کی مصنوعات، بجلی کا سامان، ادویات، نوٹوں کے کاغذ کی تیاری اور بجلی سے متعلق مشینری شامل ہے۔

ایرانی انقلاب ۱۹۷۹ء کے بعد ایران کی نئی مذہبی قیادت نے اس تنظیم کو شاہ اور استعماریت کا ورثہ سمجھ کر اپنانے سے انکار کر دیا۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ جوں جوں ایرانی قیادت کو پڑوسی مسلمان ہمسایہ ممالک کے ساتھ تعاون بڑھانے کی ضرورت کا احساس ہوا تو چھ سال بعد یعنی ۱۹۸۵ء میں آر سی ڈی کی جگہ ایکو (ECO) قائم کرنے کا اصولی فیصلہ کیا گیا۔ اور اسے باقاعدہ رسمی شکل جون ۱۹۹۰ء میں ایکو کے وزراء کی کونسل کے ایک غیر معمولی اجلاس منعقدہ اسلام آباد میں "معاہدہ ازمیر" (1) میں ترمیم کر کے دی گئی۔

خوش قسمتی سے دسمبر ۱۹۹۱ء میں سوویت یونین کی تحلیل کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ وسطی ایشیاء میں چھ نئی آزاد مسلم ریاستیں آذر بائیجان، ازبکستان، تاجکستان، ترکمانستان، قازقستان اور کرغستان ظہور پذیر ہوئیں۔ حصول آزادی کے بعد فطری طور پر یہ ریاستیں اپنی ہمسایہ مسلم ریاستوں کے ساتھ اچھے تعلقات کی خواہش مند ہیں۔ فروری ۱۹۹۲ء میں ایکو کے سربراہان کا پہلا اجلاس تہران میں منعقد ہوا اس موقع پر پانچ دیگر ارکان آذر بائیجان، ازبکستان، تاجکستان، ترکمانستان اور کرغستان کو تنظیم میں شامل کیا گیا اور نومبر ۱۹۹۲ء میں اسلام آباد کے وزارتی اجلاس میں افغانستان سمیت مذکورہ ممالک کو ایکو کا باقاعدہ ممبر بنایا گیا۔ قازقستان بطور مہمان اس اجلاس میں شریک ہوا۔

---

(1) ترکی کے شہر ازمیر میں آر سی ڈی کے سربراہان نے اپریل ۱۹۷۶ء میں معاہدہ ازمیر پر دستخط کر کے آر سی ڈی کو قانونی بنیاد فراہم کی اور دس سال کے عرصے کے لئے رکن ممالک کو آزاد تجارتی خطہ قرار دیا۔

توسیع کے بعد ایکو کے رکن ممالک کی آبادی ۳۰ کروڑ اور رقبہ تقریباً ۶۰ لاکھ مربع کلومیٹر ہو گیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اپنے محل وقوع، آبادی اور معدنی، تجارتی اور دیگر وسائل کی بنا پر ایکو ایک بڑے اقتصادی بلاک کے طور پر ابھرنے کے بھرپور امکانات رکھتا ہے اور اگر خلوص دل اور نیک نیتی سے کوششیں کی جائیں تو باہمی تجارت اور قریبی تعاون سے یہ ممالک نہ صرف ایک دوسرے کی تعمیر و ترقی میں بھرپور مدد دے سکتے ہیں بلکہ غیر ملکی امداد اور دباؤ سے بھی بڑی حد تک آزاد ہو سکتے ہیں۔ موجودہ دور اقتصادی بلاک کا دور ہے اس کی واضح مثال یورپی اقتصادی کمیونٹی (EEC) جنوب مشرقی ایشیائی اقوام کی ایسوسی ایشن (ASEAN) اور یورپین آزاد تجارتی ایسوسی ایشن (EFTA) ہے اور اب تو خود امریکہ بھی کینیڈا اور میکسیکو کے اشتراک سے تجارتی بلاک قائم کر رہا ہے۔ چنانچہ اس عالمی رجحان اور ترقی پذیر ممالک کے لئے بین الاقوامی منڈی میں محدود مواقع کے باعث ضروری ہے کہ ایکو کے رکن ممالک باہمی تجارت کو زیادہ سے زیادہ فروغ دیں۔

جولائی ۱۹۹۳ء میں استنبول میں ہونے والے ایکو سربراہی اجلاس میں ممبر ممالک کے درمیان مختلف اقتصادی شعبوں میں قریبی تعاون اور نئے منصوبوں کے آغاز کے علاوہ عالم اسلام کو درپیش مختلف اہم سیاسی اور علاقائی مسائل پر غور کیا گیا۔ علاوہ ازیں اس ضمن میں ایک پیش رفت یہ ہوئی ہے کہ تنظیم کے ممالک نے "ایکو ٹریڈ اینڈ ڈیولپمنٹ بنک قائم کرنے کا فیصلہ کیا جو ممبر ممالک کے ترقیاتی منصوبوں میں سرمایہ کاری کرے گا۔ بنک کا صدر دفتر ترکی میں ہو گا، پاکستان اور ایران میں اس کی شاخیں ہوں گیں۔

جنوبی ایشیائی ایسوسی ایشن برائے علاقائی تعاون (سارک)

SOUTH ASIAN ASSOCIATION FOR REGIONAL CO-OPERATION.

جنوبی ایشیاء میں نو آبادیاتی ورثے کی وجہ سے اختلافات عدم اعتماد مخاصمت تنازع اور حتیٰ کہ کھلم کھلا مناقشہ کی فضا رہی ہے۔ اس خطے میں چار باقاعدہ بین الاقوامی جنگیں ہو چکی ہیں۔

۱۔ پاک بھارت جنگ ۱۹۴۸ء

۲۔ چین بھارت جنگ ۱۹۶۲ء

۳۔ پاک بھارت جنگ ۱۹۶۵ء

۴۔ پاک بھارت جنگ ۱۹۷۱ء

۱۹۷۱ء کی پاک بھارت جنگ کے بعد وزیر اعظم پاکستان اور بھارت نے جولائی ۱۹۷۲ء کو شملہ معاہدے پر دستخط کیے۔ اس معاہدے کے تحت دونوں ممالک نے جنگ نہ کرنے اور پُر امن تعلقات قائم رکھنے کا عہد کیا۔ شملہ معاہدہ کے بعد امن کی فضاء کو مزید بہتر بنانے کے لیے بنگلہ دیش کے ایک سابق صدر جناب ضیاء الرحمٰن نے اپریل ۱۹۸۰ء میں سارک کا تصور پیش کیا۔ اس کے بعد سارک کی تنظیم کے قیام کے لیے مندرجہ ذیل کانفرنس ہوئیں۔

۱۔ سیکریٹری خارجہ کی کانفرنس		کولمبو	اپریل ۱۹۸۱ء
۲	" " "	کھٹمنڈو	نومبر ۱۹۸۱ء
۳	" " "	اسلام آباد	اگست ۱۹۸۲ء
۴۔ وزرائے خارجہ کی کانفرنس		نئی دہلی	اگست ۱۹۸۳ء
۵۔ وزرائے خارجہ کی کانفرنس		مالے	جولائی ۱۹۸۴ء

(اس کانفرنس میں سارک کا واضح تصور ابھر کر سامنے آیا۔)

۶۔ وزرائے خارجہ کی کانفرنس تھمفو مئی ۱۹۸۵ء

۷۔ جنوب ایشیائی سربراہی کانفرنس ڈھاکہ ۸ و ۹ دسمبر ۱۹۸۵ء

قیام:

ڈھاکہ کانفرنس ۸، ۹ دسمبر ۱۹۸۵ء میں سارک کے قیام کا اعلان کیا گیا۔

سارک کے اراکین:

۱۔ بھارت ۲۔ بنگلہ دیش ۳۔ بھوٹان ۴۔ پاکستان ۵۔ سری لنکا ۶۔ مالدیپ ۷۔ نیپال۔

اراکین سارک کے اہم سیاسی جھگڑے:

۱۔ پاکستان اور بھارت کے مابین سرحدی جھڑپیں، مسئلہ کشمیر، سیاچن گلیشیئر اور خالصتان کے سلسلے میں الزام تراشیاں۔

۲۔ پاکستان اور بنگلہ دیش کے مابین ۲½ لاکھ بہاریوں کا مسئلہ۔

۳۔ بنگلہ دیش اور بھارت کے مابین دریا گنگا کے پانی کی تقسیم اور سرحد پر خاردار تاروں کی تنصیب کا مسئلہ۔

۴۔ اسلحہ اور ایٹمی اسلحہ کے حصول کے لیے جدوجہد۔

۵۔ چین اور بھارت کے سرحدی جھگڑے۔

۶۔ بھارت اور نیپال کا تجارتی جھگڑا۔ نیپال نے چین سے تعلقات زیادہ بہتر کیوں کر لیے ہیں۔

۷۔ بھارت اور سری لنکا کے مابین بھارت کی طرف سے تامل باشندوں کی امداد کرنے کا مسئلہ (بھارت سری لنکا معاہدہ جولائی ۱۹۸۷ء میں اس مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے)۔

اراکین سارک کے اہم سیاسی، سماجی اور معاشی مسائل:

۱۔ معاشی بدحالی
۲۔ غذائیت کی کمی
۳۔ ناخواندگی
۴۔ بدعنوانیاں
۵۔ ترقی پذیر ممالک
۶۔ سماجی پسماندگی
۷۔ فوجی تیاریاں
۸۔ باہمی جھگڑوں میں بڑی طاقتوں کی مداخلت
۹۔ باہمی علاقائی تنازعات
۱۰۔ غلط فہمیاں
۱۱۔ اداروں کی ناقص منصوبہ بندی وغیرہ۔

اراکین سارک کے لیے باہمی دلچسپی کے امور:

۱۔ مواصلات
۲۔ موسمیات
۳۔ ٹرانسپورٹ
۴۔ جہازرانی
۵۔ سیاحت
۶۔ زرعی تحقیق
۷۔ باہمی تجارت کو وسعت
۸۔ سائنسی اور فنی تعاون
۹۔ شہری ہوابازی
۱۰۔ تعلیمی اور ثقافتی تعاون
۱۱۔ مشابہات کا خاتمہ

۱۲۔ دہشت گردی کا خاتمہ۔

سارک کا ڈھانچہ:

سارک کا ڈھانچہ تین اداروں پر مشتمل ہے۔

۱۔ وزرائے خارجہ کی کونسل:۔

اس کونسل کا اجلاس سال میں کم از کم دو مرتبہ ہونا ضروری ہے۔

۲۔ خارجہ سیکریٹریوں کی مجلس قائمہ:۔

بوقت ضرورت خارجہ سیکریٹریوں کی مجلس قائمہ کا اجلاس بلایا جاسکتا ہے۔

۳۔ سربراہ اجلاس:۔

ہر سال ایسوسی ایشن کا سربراہ اجلاس ہوتا ہے۔

صدر مقام:

جنوری ۱۹۸۷ء میں سارک سیکریٹریٹ / صدر دفتر کھٹمنڈو میں قائم کیا گیا۔

سارک کے اغراض و مقاصد:

منشور میں سارک کے حسب ذیل مقاصد بیان کئے گئے ہیں۔

۱۔ جنوبی ایشیا میں عوام کی بہبود کا فروغ اور ان کا معیار زندگی بہتر بنانا۔

۲۔ علاقہ میں اقتصادی ترقی، سماجی عمل و ثقافتی پیش رفت کو تیز کرنا اور تمام افراد کو اپنی صلاحیتوں کے ادراک کے ساتھ باوقار طور پر رہنے کا موقع فراہم کرنا۔

۳۔ جنوبی ایشیاء کے ملکوں میں اجتماعی خود انحصاری کو فروغ دینا اور انہیں مستحکم کرنا۔

۴۔ باہمی اعتماد مفاہمت اور ایک دوسرے کے مسائل کو سمجھنے کے سلسلے میں کردار ادا کرنا۔

۵۔ اقتصادی سماجی ثقافتی تکنیکی اور سائنسی میدانوں میں امداد باہمی اور فعال تعاون کو فروغ دینا۔

۶۔ دیگر ترقی پذیر ممالک سے تعاون کو مستحکم کرنا۔
۷۔ بین الاقوامی اداروں میں مشترکہ مفاد کے معاملات میں باہمی تعاون کو مستحکم بنانا۔
۸۔ یکساں مقاصد و عزائم کی حامل علاقائی تنظیموں اور بین الاقوامی اداروں سے تعاون کو فروغ دینا۔

منشور میں تعاون کے تین اصول:

و۔ ایسوسی ایشن کے دائرہ اختیار میں تعاون مساوی خودمختاری، علاقائی یکجہتی، سیاسی آزادی، دوسرے ممالک کے داخلی معاملات میں عدم مداخلت اور باہمی منفعت کی بنیاد پر ہوگا۔
ب۔ یہ تعاون دوطرفہ یا کثیرطرفہ تعاون کا بدل نہیں ہوگا بلکہ ایسے تعاون میں معاون ہوگا۔
ج۔ یہ تعاون دوطرفہ یا کثیرطرفہ ذمہ داریوں سے متصادم نہیں ہونا چاہیئے۔

سارک کے سربراہی اجلاس:۔

سارک کے مندرجہ ذیل سربراہی اجلاس ہو چکے ہیں۔

۱۔ پہلی سارک سربراہی کانفرنس

سارک کا پہلا سربراہی اجلاس ۷ اور ۸ دسمبر ۱۹۸۵ئہ کو ڈھاکہ میں ہوا اس میں ایسوسی ایشن کے منشور، مقاصد اور تنظیم کے باضابطہ اعلان کی منظوری دی گئی اس اجلاس میں بھارت کے وزیراعظم راجیو گاندھی، بنگلہ دیش کے صدر حسین محمد ارشاد بھوٹان کے شاہ جگمے سنگے وانگچوک، پاکستان کے صدر ضیاءالحق سری لنکا کے صدر جے وردھنے مالدیپ کے صدر مامون عبدالقیوم اور نیپال کے شاہ بریندر اسبر بکرم شریک ہوئے۔ اس اجلاس میں تمام سربراہان حکومت و مملکت نے اپنی تقریروں میں کہا کہ تنظیم کے منشور سے علاقے میں امن دوستی اور تعاون کے ایک نئے دور کا آغاز ہوگا۔ رہنماؤں نے عالمی سطح پر بگڑتی

ہوئی سیاسی صورت حال ہتھیاروں کی دوڑ میں اضافہ خاص طور پر اس کے ایٹمی پہلوؤں پر گہری تشویش کا اظہار کیا۔ انہوں نے عالمی معیشت کی بگڑتی ہوئی صورتحال پر بھی تشویش کی اور کہا کہ عالمی اقتصادی نظام میں عدم توازن اور ناانصافی کو دور کیا جائے ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک کے درمیان فوری طور پر مذاکرات شروع کیے جائیں اور جلد از جلد ایک عالمی کانفرنس بلائی جائے۔ جس میں تمام ممالک شریک ہوں۔ کانفرنس کے شرکاء منشیات اور عالمی دہشت گردی کے موضوعات کو بھی علاقائی تعاون کے دائرہ میں شامل کرنے پر رضامند ہو گئے۔

۲۔ دوسری سارک سربراہی کانفرنس

سارک کا دوسرا سربراہی اجلاس ۱۶، ۱۷ نومبر ۱۹۸۶ء کو بنگلور میں ہوا۔ بنگلہ دیش کے ابوالحسن کو سارک کا پہلا سیکریٹری جنرل مقرر کیا گیا اور طے پایا کہ سارک کا سیکریٹریٹ (صدر دفتر) جنوری ۱۹۸۷ء سے کھٹمنڈو میں کام کرنا شروع کر دے گا۔ پروگرام کے مطابق دفتر ہذا نے کام کرنا شروع کر دیا ہے۔ علاوہ ازیں البسوسی ایشن کے مقاصد کے حق میں قرارداد منظور کی گئی۔

۳۔ تیسری سارک سربراہی کانفرنس

سارک کا تیسرا سربراہی اجلاس ۲ تا ۴ نومبر ۱۹۸۷ء کو کھٹمنڈو میں ہوا۔ اس کے اختتام پر جو مشترکہ اعلان جاری کیا گیا۔ اس میں سارک کے قیام کو علاقائی تعاون امن اور اعتماد کے سلسلے میں ایک نئے دور کا آغاز قرار دیا گیا اور سارک کے چارٹر کے تحت تعاون بڑھانے اقوام متحدہ اور غیر جانبدار تحریک کے اصولوں پر کاربند رہنے کے عزم کا اعادہ کیا گیا اس امر کو دہرایا گیا کہ سارک کے ممالک صرف باہمی تعاون کے ذریعے ہی بھوک بیماری ناخواندگی بے روزگاری اور ماحولیاتی آلودگی جیسے مسائل پر قابو پا سکتے ہیں۔

۴۔ چوتھی سارک سربراہی کانفرنس

سارک کا چوتھا سربراہی اجلاس ۲۹ تا ۳۱ دسمبر ۱۹۸۸ء کو اسلام آباد میں ہوا۔ یہ اجلاس پاکستان کے لیے دوہری اہمیت رکھتا تھا۔ ایک تو محترمہ بے نظیر بھٹو کی نئی حکومت کے لیے یہ پہلا بڑا سفارتی واقعہ تھا۔ کیونکہ وہ آئندہ سال کے لیے سارک کی چیئر پرسن بنیں اور اس کانفرنس نے ۲۸ سال بعد پاکستان کی زمین پر پاک بھارت سربراہ

کانفرنس کا موقع بھی فراہم کیا۔ اس اجلاس نے "پروگرام سارک . . . ۲۰۰۰ء" کی منظوری دی۔ جس کے تحت اس صدی کے اختتام تک جنوبی ایشیا کے ملکوں کے سماجی شعبوں میں بنیادی ضرورتیں فراہم کرنے کے لیے ایک منصوبے کے تحت مقررہ ہدف حاصل کیا جائے گا۔ ہدف کا تعلق خوراک، کپڑے، رہائش، تعلیم، علاج معالجہ کی بنیادی سہولتوں، آبادی کی منصوبہ بندی اور ماحول کے تحفظ کے شعبوں سے ہے۔ اجلاس میں سیکرٹری جنرل کو ہدایت کی گئی کہ وہ "سارک . . . ۲۰۰۰ء منصوبہ پر عملدرآمد کا طریقہ کار طے کرنے کے لیے رکن ممالک کے ماہرین کا اجلاس طلب کریں

۵۔ پانچویں سارک سربراہی کانفرنس

سارک کی پانچویں سربراہی کانفرنس ۲۱ تا ۲۳ نومبر ۱۹۹۰ء کو مالے میں منعقد ہوئی اس اجلاس کے آخری دن سارک کے رکن ممالک نے ایک سمجھوتے پر دستخط کئے جس کے تحت منشیات کے استعمال اور اس کی اسمگلنگ کی روک تھام کی کوششوں میں علاقائی تعاون کو فروغ دیا جائے گا۔ اس سربراہ کانفرنس نے جن اہم علاقائی اداروں کی منظوری دی۔ ان میں اسلام آباد میں انسانی وسیلوں کی ترقی کا مرکز، کھٹمنڈو میں ٹی بی کا ایک علاقائی مرکز اور نئی دہلی میں دستاویز کا ایک علاقائی مرکز شامل ہے۔ سارک کانفرنس نے خصوصی سفری دستاویز کے اجراء کا فیصلہ کیا جس کے تحت سپریم کورٹ کے ججوں، ارکان پارلیمنٹ، قومی اور تعلیمی اداروں کے سربراہان اور ان کے زیر کفالت بچے خطے میں کسی بھی جگہ جانے کے لئے ویزے سے مستثنیٰ ہونگے۔

۶۔ چھٹی سارک سربراہی کانفرنس

سارک کی چھٹی سربراہی کانفرنس ۲۱ دسمبر ۱۹۹۱ء (ایک روزہ) کو کولمبو میں منعقد ہوئی۔ کانفرنس کے اختتام پر مشترکہ اعلامیہ میں رکن ممالک سے کہا گیا کہ وہ حقوق انسانی کے مسئلے کو محدود اور سیاسی نقطہ نظر سے نہ دیکھیں۔ اس ضمن میں رکن ممالک پر زور دیا گیا کہ وہ اپنے ملکوں میں حقوق انسانی کی مکمل ضمانتیں فراہم کریں۔ مشترکہ اعلان میں خطے سے غربت، بھوک افلاس ناخواندگی اور بیماریوں کے خاتمے کے لئے مشترکہ کوششوں پر بھی زور دیا گیا۔

سارک کا تجزیہ

سارک کے قیام سے لے کر آج تک پاکستان اس کو مضبوط مزید فعال اور با عمل ادارہ بنانے کے لئے بھرپور کوشش کرتا رہا ہے تاکہ اس علاقے کے عوام کی خواہشات اور ضروریات پوری کرنے میں یہ تنظیم مؤثر کردار ادا کر سکے۔ پاکستان کے برعکس بھارت سراسر غیر ذمہ دارانہ اور تنظیم کے اصولوں کے خلاف اقدام کر رہا ہے بھارت نے آزادی کے وقت سے کشمیر پہ غاصبانہ قبضہ کیا ہوا ہے۔ لیکن اب چند برسوں سے (۱۹۸۴ء) پاکستان کے زیر قبضہ سیاچن گلیشئر کے علاقے میں بھی بھارت نے فوجی کارروائی کر کے اس پر اپنا حق جتانا شروع کر دیا ہے۔ ظاہر ہے جب پڑوسی ملک کے ساتھ بھارت کا یہ سلوک ہوگا تو پھر سارک کے مقاصد کا حصول کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔

ان حالات میں سارک کے چیئرمین کا فرض ہے کہ وہ عالمی امن اور علاقائی یکجہتی کے لئے اپنا اثر و رسوخ استعمال کریں۔ عالمی سطح پر بھارت کے اس سراسر جارحانہ طرز عمل کے خلاف مؤثر مذمت کا اہتمام کیا جانا چاہیئے اور اگر پھر بھی بھارت باز نہ آئے تو مزاحمت کی جانی چاہیئے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سارک ممالک کے درمیان دوطرفہ تنازعات کے باعث سارک کی رفتار سست ہے اور اگر اس سلسلے میں جلد کچھ نہ کیا گیا تو یہ رفتار رک بھی سکتی ہے۔ مختصر یہ کہ سارک کی کامیابی صرف اور صرف دوطرفہ مساوی خوشگوار اور دوستانہ تعلقات پر ہی منحصر ہے۔ کسی کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ کسی دوسرے ملک کے اقتدار اعلیٰ کا مذاق اڑائے اور نہ ہی اس سوچ کی پذیرائی کی جانی چاہیئے کہ کوئی پڑوسی ملک اپنے ہمسائے ملک پر چڑھائی کر دوڑے۔ سارک کی یہی روح ہے۔

افریقی اتحاد کی تنظیم

ORGANIZATION OF AFRICAN UNITY

بیسویں صدی میں جہاں اور اہم واقعات پیش آئے وہاں نئے نظریات نے بھی سیاسیات عالم پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ انیسویں صدی کے آخر تک افریقہ میں موجود تمام ریاستیں برطانوی فرانسیسی اور اطالوی حکمرانوں کے ماتحت تھیں۔ لیکن موجودہ صدی میں ان میں سے بیشتر ریاستیں آزاد ہو گئیں۔ دوسری عالمی جنگ ۱۹۳۹ - ۴۵ء کے بعد برطانیہ فرانس اور اٹلی اس قابل نہ رہے کہ ان مقبوضات پر اپنا کنٹرول قائم رکھ سکیں۔ علاوہ ازیں اس خطے کے باشندوں میں سیاسی آزادی کا شعور پروان چڑھ چکا تھا جس کی وجہ سے انہیں آزاد کرنا پڑا۔

افریقی ریاستوں میں نسلی طور پر امتیاز نہیں ہے۔ لیکن مذہب زبان اور رنگ کے لحاظ سے ایک دوسرے سے ضرور مختلف ہیں اور جہاں تک قومی شعور اور سیاسی آزادی کا تعلق ہے سب میں یکساں پایا جاتا ہے۔ چنانچہ اس مقصد کے حصول کے لئے ایک تنظیم قائم کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی۔ واضح رہے کہ ۱۹۳۷ء میں لندن میں افریقی سروس بیورو قائم کیا گیا تھا۔ جسے پان افریقن ازم کی شکل دے دی گئی جس میں ڈاکٹر انکروما اور رجا موکنیا جیسے قوم پرست رہنماؤں نے شرکت کی ۱۹۴۵ء میں افریقہ کی غیر فطری تقسیم کے خلاف احتجاج کرنے کے لئے ایک کانفرنس منعقد کی گئی جس میں گھانا کے انکرومانے زور دیا کہ ساحل گولڈ کی آزادی کو بلکہ پورے افریقہ کی آزادی اور بین الاقوامی معاملات میں افریقی ممالک کے آزادانہ عمل دخل کے لئے جدوجہد کی جائے۔ چنانچہ دسمبر ۱۹۵۸ء میں پان افریقن کانفرنس منعقد ہوئی۔ جس میں ۲۸ ممالک کی ۶۲ تنظیموں نے شرکت کی۔ اس میں ایک قرارداد کے ذریعے افریقی کمیونٹی کی بین الاقوامی تنظیم کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اس میں تمام افریقی ممالک شامل تھے لیکن بعض اختلافات کی وجہ سے یہ تنظیم دو گروپوں میں تقسیم ہو گئی ایک کا نام کیسا بلانکا گروپ (مراکش) اور دوسرے

کا نام مون رو ڈیا گروپ (لائبیریا) رکھا گیا۔

جہاں تک پہلے گروپ کا تعلق ہے اس میں گھانا۔ مالی۔ مصر۔ مراکش الجزائر اور کچھ چھوٹی ریاستیں شامل تھیں یہ گروپ ۱۹۶۱ء میں قائم ہوا اور ۱۹۶۳ء میں ختم ہو گیا۔ دوسرے گروپ میں ۲۰ سے زائد ممالک شامل تھے۔ اس کا اجلاس مون رو ڈیا میں ۱۹۶۱ء میں ہوا۔ اس اجلاس میں کئی کمیٹیاں بنائی گئیں ۱۹۶۳ء کے ابتدائی مہینوں میں تنظیم کا منشور تیار کر لیا گیا اور اس کا نام افریقی اتحاد کی تنظیم (OAU) رکھا گیا۔ ۲۵ مئی ۱۹۶۳ء کو باقاعدہ ۳۰ ممالک نے تنظیم کے قیام کا اعلان کیا جنوبی افریقہ کو چھوڑ کر افریقہ کے ۵۱ ممالک اس کے ممبر ہیں۔ تنظیم کا صدر مقام عدیس ابابا (ایتھوپیا) میں ہے۔

اغراض و مقاصد۔

۱۔ افریقہ سے نو آبادیاتی نظام کا خاتمہ۔

۲۔ ممبر ممالک کے آزادانہ دفاع کو بہتر بنانا۔

۳۔ ممبران کی ثقافتی، سیاسی، سائنسی اور معاشی پالیسیوں میں ربط پیدا کرنا۔

ڈھانچہ:۔ دیگر علاقائی بابین الاقوامی تنظیموں کی طرح اس کے انتظامی ڈھانچے کے تین اعضاء ہیں اسمبلی کونسل اور سیکرٹریٹ اسمبلی تمام ممبر ممالک کے نمائندوں پر مشتمل ہے اور اس کا سال میں ایک مرتبہ اجلاس ہوتا ہے۔ اسمبلی کا سب سے اہم کام ممبر ممالک کے مابین تعاون پیدا کرنا ہے۔

کونسل میں ممبر ممالک کے وزیر خارجہ یا کوئی اور وزیر ہوتا ہے۔ اس کی یہی حیثیت اسے با اختیار بنا دیتی ہے۔ تنظیم کی کارکردگی بہتر بنانے کے لئے کونسل مختلف کمیٹیاں بھی تشکیل دیتی ہے ان کمیٹیوں میں لبریشن کمیٹی سب سے زیادہ افعال رہی اس نے ایک مشترکہ منڈی قائم کرنے کے سلسلے میں جدوجہد بھی کی۔ لیکن اس میں اسے ناکامی ہوئی۔ یہ کمیٹی افریقی ممالک سے امداد حاصل کر کے حریت پسندوں کے ساتھ تعاون کرتی ہے۔ مہاجرین کے مسائل سے متعلق کمیٹی کی کارکردگی بھی باعث تحسین ہے۔

تنظیم کی کارکردگی کا ایک جائزہ :- ماضی میں بہت سارے اختلافات سے اس محصور تنظیم کو خطرہ پیدا ہوتا رہا ہے تنظیم کے اہم سیاسی تنازعات کا تعلق حد بندی سے ہے۔ کیونکہ سامراجی طاقتوں نے افریقی ممالک کی سرحدیں تہذیبی اور ثقافتی لحاظ سے مقرر نہیں کی ہیں۔ جس کی وجہ سے حد بندی کا مسئلہ پیدا ہوا اس مسئلے کو حل کرنے کے لئے تنظیم نمایاں کردار ادا نہیں کر سکی۔ دراصل یہ امریکہ اور سوویت روس کی حکمت عملی کا نتیجہ بھی ہے۔

یہاں افریقی اتحاد کی تنظیم کے اہم مسائل کا جائزہ لیا جا رہا ہے۔

۱۔ پولی ساریو فرنٹ کا مسئلہ :- اس تنظیم کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ فروری ۱۹۸۲ء میں اس وقت پیش آیا جب لیبیا میں منعقد ہونے والی اعلیٰ سطحی کانفرنس میں سیکریٹری جنرل نے یہ متنازعہ فیصلہ صادر کیا تھا کہ پولی ساریو فرنٹ کو افریقی اتحاد کی تنظیم کا ۵۱ واں رکن تسلیم کر لیا جائے۔ اس گوریلا تنظیم نے مغربی صحارا پر اپنی جلاوطن حکومت (صحرائے عرب جمہوریہ) قائم کر رکھی ہے سیکریٹری جنرل کی ۲۶ ترقی پسند ریاستوں نے تائید کی اور ۲۴ قدامت پسند ریاستوں نے اس فیصلے کی مخالفت کی۔

مغربی صحارا براعظم افریقہ کے شمال مغرب میں ایک نہایت کم آبادی والا (۵۰ لاکھ تقریباً) دور دراز ریگستانی علاقہ ہے۔ یہ علاقہ دور غلامی میں اسپین کے زیر ماتحت رہا ہے۔ اس کی نوآبادیاتی حیثیت کو تبدیل کرنے کے لئے کسی قسم کے جوش و جذبے کا اظہار نہیں کیا گیا۔ مارچ ۱۹۷۵ء میں مغربی صحارا پر کنٹرول حاصل کرنے کے لئے مراکش اور پولی ساریو کے گوریلوں کے درمیان ایک علاقائی جنگ شروع ہو گئی اس وقت کسی کو بھی یہ خیال نہیں ہو سکتا تھا کہ یہ تنازعہ تقریباً ایک عشرہ تک جاری رہے گا جس سے قرب و جوار کا ہر ملک متاثر ہوگا اور بالآخر افریقی اتحاد کی تنظیم کو خطرہ لاحق ہو جائے گا۔ یہاں یہ بتا تا چلوں کہ مغربی صحارا پر کنٹرول کے سلسلے میں مراکش اور اسپین کے مابین ایک معاہدہ بھی ہوا تھا جس کے تحت مغربی صحارا کو مراکش کی تحویل میں دیا گیا تھا۔ اس وقت مغربی صحارا دو بنیادی

اصولوں کی آزمائش کا باعث ہے جو افریقی اتحاد کی تنظیم کے چارٹر میں درج ہیں ان میں سے ایک اصول تو قومی حق خود ارادی کا ہے اور دوسرا اصول ان سرحدوں کی سلامتی کا ہے جو نو آبادیاتی دور سے ورثے میں ملی ہیں۔ یہ دونوں نکات پولی ساریو فرنٹ کے حق میں جاتے ہیں۔

اقوام متحدہ نے ایک تحقیقاتی مشن ۱۹۷۵ء کے موسم گرما میں اس علاقے میں بھیجا اس مشن نے اپنی رپورٹ میں تحریر کیا کہ علاقے میں آزادی کی زبردست خواہش پائی جاتی ہے اور عوام پولی ساریو کے زبردست حامی ہیں۔ اقوام متحدہ کے مشن کی رپورٹ کی اشاعت کے چند روز کے اندر ہی صحارا کے قوم پرستوں کو ایک دوسری جانب سے بھی حمایت حاصل ہوگئی۔ جب بین الاقوامی عدالت انصاف نے ہیگ میں علاقہ کی قانونی حیثیت کے متعلق اپنا فیصلہ دیا۔ عدالت نے کہا جنوب میں مغربی صحارا اور ماریطانیہ اور شمال میں مغربی صحارا اور مراکش کے تاریخی روابط وہاں کی آبادی کے حق خود ارادی کے حق میں روڑا نہیں اٹکا سکتے۔

۱۹۷۹ء میں جب مراکش اور پولی ساریو کی جنگ ختم ہوئی تو بحرانی صورت پیدا ہو چکی تھی۔ مراکش نے علاقے کے دارالحکومت العیون اور گندھک کی کانوں پر کنٹرول حاصل کر لیا حالانکہ پولی ساریو کے حملوں کے باعث ان کانوں سے گندھک نہیں نکالی جا سکتی تھی جبکہ گوریلے صحارا کے مالک بن چکے تھے۔

جون ۱۹۸۳ء میں عدیس ابابا میں ہونے والی اعلیٰ سطحی کانفرنس نے مراکش اور پولی ساریو سے اپیل کی کہ وہ مذاکرات کریں اور مغربی صحارا میں رائے شماری کرائیں تاکہ وہاں کے باشندے اس امر کا فیصلہ کر سکیں کہ آیا وہ آزادی چاہتے ہیں یا مراکش کے ساتھ مغربی صحارا کا انضمام" اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیئے گنی، کینیا، مالی، نائیجیریا، سیرالیون، سوڈان اور تنزانیہ کے نمائندوں پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی گئی۔ لیکن جلد ہی رنگ میں بھنگ پڑ گئی۔ مراکش نے مغربی صحارا سے اپنی فوجیں واپس بلانے سے انکار کر دیا اور پولی ساریو فرنٹ سے مذاکرات کرنے سے بھی گریز کیا۔ افریقی قائدین یہ چاہتے ہیں کہ سیاسی جوڑ توڑ سے کسی طرح یہ مسئلہ حل ہو جائے پولی ساریو فرنٹ کے طرفداروں کی تعداد اب ۲۸ ہو

گئی ہے اس غیر معروف جنگ کو شروع ہوئے دس سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے لیکن اس کے خاتمے کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔

۲۔ چاڈ کا مسئلہ :- چاڈ شمالی افریقہ میں فرانس کی سابق نوآبادی تھا اگست ۱۹۶۰ء میں حصول آزادی کے بعد چاڈ کو بہت مختصر عرصہ کے لئے امن و سکون نصیب ہوا ۱۹۶۶ء میں شمالی علاقے کے مسلمانوں اور جنوبی علاقے کے عیسائیوں اور قدیم افریقی مذہب کے پیروکاروں کے درمیان جھڑپوں کی وجہ سے ملک خانہ جنگی کا شکار ہو گیا۔ مسٹر گوکونی کی حکومت نے اس خانہ جنگی پر قابو پانے کے لئے ۱۹۸۰ء میں لیبیا سے فوجی امداد طلب کی۔ لیبیا کے فوجی دستوں کی چاڈ میں تعیناتی پر پڑوسی ملکوں بالخصوص سوڈان کو سخت اعتراض ہوا۔ اس وجہ سے افریقی اتحاد کی تنظیم میں اختلافات پیدا ہونے شروع ہو گئے۔ اسی اثنا میں لیبیا کے صدر کرنل قذافی نے چاڈ اور لیبیا کے انضمام کی تجویز پیش کی۔ جسے صدر گوکونی نے بھی مسترد کر دیا۔ افریقی اتحاد کی تنظیم کی تجویز پر صدر گوکونی نے چاڈ سے لیبیا کی فوج کی واپسی کا مطالبہ کیا چنانچہ ۱۹۸۱ء کے اواخر میں لیبیا کی فوج چاڈ سے واپس ہو گئی اور اس کی جگہ تنظیم کی طرف سے چند ممبر ممالک کی فوج وہاں تعینات کی گئی اس اقدام کے بعد افریقی اتحاد کی تنظیم نے صدر گوکونی کو چاڈ کا قانونی اور ذہنی حکمران تسلیم کر لیا۔ سابق وزیر دفاع حسنے ہبرے کی وفادار فوج کی طرف سے چاڈ پر حملے شروع ہو گئے۔ صدر گوکونی نے ایک بار پھر لیبیا سے فوجی امداد طلب کی مگر اس دفعہ صدر قذافی نے یہ درخواست مسترد کر دی۔ اس کے بعد ہی حسنے ہبرے کی باغی فوج کی چھاپہ مار سرگرمیوں میں اضافہ ہوا۔ حتیٰ کہ جنوری ۱۹۸۳ء حسنے ہبرے نے طاقت کے ذریعے دارالحکومت پر قبضہ کر لیا اور مسٹر گوکونی کو کیمرون میں سیاسی پناہ حاصل کرنا پڑی۔

سب سے پہلے فرانس نے نئی انقلابی حکومت کو تسلیم کیا بعد ازاں امریکہ اور دیگر مغربی ممالک نے اس کی تقلید کی۔ لیبیا کی حکومت پر الزام ہے کہ وہ چاڈ کی موجودہ حکومت کی مخالفت اور سابق صدر گوکونی کی حامی ہے۔ ۱۹۸۵ء میں فرانس اور لیبیا کے مابین ایک معاہدہ ہوا تاکہ چاڈ سے دونوں ملکوں کی فوجیں

واپس بلائی جائیں اور افریقی اتحاد کی تنظیم کو یہ موقع دیا جائے کہ وہ اس مسئلے پر پردہ ڈال سکے۔ اس معاہدے کے بعد چند ماہ تک حالات پرسکون رہے لیکن ۱۹۸۶ء میں چاڈ ایک بار پھر خانہ جنگی کا شکار ہوا۔ برسراقتدار طبقے نے لیبیا پر الزام لگایا کہ وہ علاقے میں امریکی رسوخ روکنے کے لیے چاڈ میں مخالف گروپ دگوکونی گروپ کی مدد کر رہا ہے جبکہ صدر معمر قذافی نے اس الزام کو رد کرتے ہوئے کہا کہ چاڈ کی حکومت اپنی سرزمین پر امریکی اڈے قائم کرنے کے لیے راہ ہموار کر رہی ہے اور لیبیا کی افواج کے داخلے کا محض پروپیگنڈا کر رہی ہے۔ لیبیا کا یہ الزام بہت سارے حوالوں سے درست معلوم ہوتا ہے۔ اس بیرونی مداخلت کی وجہ سے تنظیم چاڈ کے مسئلے کو حل کرتے کرتے ناکام ہو گئی ہے۔

حالیہ برسوں میں چاڈ میں بیرونی مداخلت میں امریکہ بھی فرانس کے ساتھ شریک ہو گیا ہے اور دونوں ممالک اپنی سامراجی ذہنیت کی بنا پر افریقی ریاستوں کو اپنا مطیع اور منڈی تصور کرتے ہیں۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ پسماندہ ترین ملک امریکہ کے لیے تو بہر حال لیبیا کی وجہ سے کشش اور دلچسپی کا باعث ہو سکتا ہے لیکن فرانس کا اس سے دلچسپی لینا حیرت کا باعث ہے بہر طور یہ سب جانتے ہیں کہ چاڈ ماضی میں فرانس کی نوآبادی تھا اور اب بھی براہ راست نہ سہی بلواسطہ طور پر اقتصادی اور فوجی لحاظ سے یہ فرانس کی نوآبادی ہے۔ اس پس منظر میں چاڈ کے اندرونی معاملات کا پرامن تصفیہ فوجی قوت کے بجائے افریقی ثالثین کے ذریعے ہونا چاہیئے اور یہاں سے امریکی اور فرانسیسی فوج کو فوری طور پر نکل جانا چاہیئے کیونکہ موجودہ دور ایسے سنگین دور سے گزر رہا ہے جس میں کوئی مقامی جنگ عالمی سلامتی کے لیے خطرہ ثابت ہو سکتی ہے۔

۳۔ **رہوڈیشیا کا مسئلہ:۔** افریقی اتحاد کی تنظیم کا بنیادی مقصد نسلی امتیاز کے خلاف جدوجہد کرنا اور اس کے شکار عوام کو تحفظ فراہم کرنا ہے۔ رہوڈیشیا میں نسلی امتیاز کے حوالے سے یہ یاد رہے کہ رہوڈیشیا اور نا سا لینڈ کی ۱۹۵۳ء میں فیڈریشن بنائی گئی تھی۔ مگر یہ فیڈریشن افریقیوں کی حمایت حاصل نہ کر سکی۔ اور یہ ایک طرح سے مقامیوں پر گورے یورپیوں کی اقلیت کا تسلط قائم کرنے کا ذریعہ بن گئی۔ اس فیڈریشن کے خلاف

عوامی سطح پر شدید رد عمل ہوا تو ۱۹۶۲ء کی لندن کانفرنس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ فیڈریشن کی وحدتوں کو آزادی دے دی جائے۔ چنانچہ جنوبی رہوڈیشیا اور ناسالینڈ کو آزاد کر دیا گیا۔ جنوبی رہوڈیشیا کو ۱۹۷۹ء میں آزادی نصیب ہوئی آزادی کے بعد اس نئی ریاست کا نام "زمبابوے" رکھا گیا اور اس کے پہلے وزیر اعظم مسٹر رابرٹ موگابے بنے زمبابوے کے معاشی استحکام کے لئے افریقی اتحاد کی تنظیم نے مالی امداد کی۔

گذشتہ بیس برس ۸۷-۱۹۶۷ء سے جنوبی افریقہ میں بھی جدوجہد آزادی کا سلسلہ جاری ہے وہاں سفید فام حکمران سیاہ فام لوگوں کے ساتھ حد درجہ غیر انسانی سلوک روا رکھے ہوئے ہیں۔ جنوبی افریقہ میں یونائیٹڈ ڈیموکریٹک فرنٹ اور ازانیئن پیپلز آرگنائزیشن دو ایسی تنظیمیں ہیں جو سفید فام اقلیت کی حکمرانی کی شدید مخالفت کرتی ہیں ان دونوں تنظیموں کے ہزاروں کارکنان اور قائدین جیلوں میں بند ہیں۔ نئے نسلی دستور ۱۹۸۴ء کے تحت نظر بندوں کو غیر معینہ مدت تک نظر بند رکھا جا سکتا ہے اور ان کی کلاء خاندان کے افراد اور نجی ڈاکٹروں تک رسائی ممکن نہیں۔ ۸۷-۱۹۶۳ء تک نظر بند مرنے والوں کی تعداد ۶۰ سے زائد ہو گئی ہے۔

افریقی اتحاد کی تنظیم نمیبیا پر مسلط غلامی کے خاتمے کے لئے سیاہ فام عوام کی ایک تنظیم ساؤتھ ویسٹ پیپلز آرگنائزیشن (سواپو) کے ساتھ بھی تعاون کر رہی ہے۔ سواپو کے عظیم جانباز رہنما سام نجوما ہیں جو ایک بہترین سپاہی ہونے کے ساتھ ساتھ مدبر اور سیاستدان بھی ہیں۔ ان کی حکمت عملی کا نتیجہ ہے کہ اقوام متحدہ سواپو کو نمیبیا کے عوام کی سرکاری تنظیم تسلیم کرتی ہے۔

تاہم بہت سارے افریقی ممالک کے بنیادی مسئلے علاقائی جھگڑے نہیں بلکہ قرضوں کے حصول اور غلے کے بحران سے تعلق رکھتے ہیں۔ اگر افریقی قائدین ۱۹۹۰ء کے عشرے میں بہتری کے لئے کچھ کام کرنا چاہتے ہیں تو انہیں علیحدہ طور پر یا شمال و جنوب کے مذاکرات کا ایک حصہ بن کر ان مسائل پر غور کرنا ہی پڑے گا۔

۴۔ معاشی مسئلہ:۔ افریقی ممالک کی تنظیم اگر سنجیدگی سے غور کرنے پر آمادہ ہو جائے تو دو گھریلو مسئلے بھی غور طلب ہیں اول یہ کہ ممبر ممالک اپنے حصے کی رقم ادا نہیں کر رہے اور دوئم یہ کہ جو ممالک قرضے واپس نہیں کر رہے ان پر ۲۵ سے ۳۰ ملین ڈالر کے قرضے واجب الادا ہیں۔ جن کی عدم ادائیگی کے بحث یہ تنظیم اپنی بین الاقوامی ذمہ داریاں پوری کرنے سے قاصر ہے حقیقت یہ ہے کہ افریقہ کے طفیلی ممالک سخت اقتصادی مشکلات میں گھرے ہوئے ہیں ان کے پاس قرضہ واپس کرنے کے وسائل نہیں ہیں اور بعض ممالک تنظیم کے فنڈ میں اپنے حصے کی رقم ادا کرنے سے بھی انکار کر رہے ہیں۔ کیونکہ وہ اس تنظیم کو اپنی ضرورت کے مطابق اہل نہیں سمجھتے۔ افریقی ممالک کے باوقار قائدین جیسے کینیتھ کو انڈا آف زیمبیا تنزانیہ کے جولیس نائرے اور کینیا کے ڈینیل اراپ موئی تک اپنے اندرونی مسائل میں زیادہ دلچسپی لے رہے ہیں اور افریقی اتحاد کی تنظیم کے امور کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ اس سے تنظیم کو زبردست خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔

جولائی ۱۹۸۷ء کو افریقی اتحاد کی تنظیم کا اجلاس عدیس آبابا (ایتھوپیا) میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں زیمبیا کے صدر کینیتھ کوانڈا کو تنظیم کا چیئرمین منتخب کیا گیا اس کے علاوہ تنظیم کے ممبر ممالک کے معاشی مسائل موضوع بحث تھے۔

امریکی ریاستوں کی تنظیم

ORGANISATION OF AMERICAN STATES

جنگ عظیم دوئم کے بعد جہاں یورپ، افریقہ اور ایشیا میں علاقائی تنظیمیں بننے لگیں۔ وہاں جنوبی امریکہ کے ممالک میں بھی یہ احساس پیدا ہوا کہ وہ اپنے براعظم میں ایک علاقائی تنظیم قائم کریں۔ جس کا مقصد ممبر ممالک میں تعاون اور مشترکہ لائحہ عمل تیار کرنا ہو۔ چنانچہ جنوبی امریکہ کے تحفظ اور سلامتی کے لیئے ریو ڈی جیرو میں منعقدہ بین الامریکی کانفرنس میں ریو پیکیٹ ۱۹۴۷ء پر دستخط ہوئے۔ معاہدہ کے ابتدائیہ میں واضح کیا گیا کہ کسی بھی امریکی ریاست پر حملہ جارحانہ اقدام یا دھمکی کی صورت میں فریقین امن کے تحفظ اور سالمیت کی بقاء کے لئے مشترکہ اقدام کریں گے۔ اس معاہدے کی کل دفعات ۲۶ ہیں اس معاہدے کے تحت امریکی ریاستوں نے جنگ کو قومی پالیسی کے آلہ کے طور پر استعمال کرنے کی مذمت کی۔ بین الاقوامی تعلقات میں جارحانہ حملہ، جنگ یا دھمکی اقوام متحدہ کے منشور کی خلاف ورزی قرار دیا۔ اس معاہدے کے تحت فریقین نے اتفاق کیا کہ امریکی ریاستوں کے مابین کسی اختلافی مسئلہ کو اقوام متحدہ میں پیش کرنے سے پہلے امریکی سطح پر پرامن ذرائع کو بروئے کار لاکر حل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ اس معاہدے کے تحت اجتماعی سلامتی کے اصول کو اپنایا گیا۔ اور یہ عہد کیا گیا کہ ایک ممبر ریاست پر حملہ تمام ممبران پر حملہ تصور کیا جائے گا۔ اس صورت میں ممبران حملے کا شکار ہونے والے ملک کی مدد کریں گے۔ جب تک اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی طرف سے کوئی انتظام نہیں ہو جاتا۔ ریو پیکیٹ پر دستخط ہونے کے بعد بگوٹہ BOGOTA کولمبیا میں ممبر ممالک کی ۱۹۴۸ء کو ایک کانفرنس بلائی گئی جس میں امریکی ریاستوں کی تنظیم کے منشور پر دستخط کیئے گئے۔ منشور میں اس چیز کا اعادہ کیا گیا کہ جب تک ۱۴ ممالک منشور کی توثیق نہ کر دیں۔ تنظیم کا قیام عمل میں نہیں آئے گا چنانچہ ۱۹۵۱ء میں ۱۴ ممالک نے اس دستاویز کی توثیق کی اور امریکی ریاستوں کی تنظیم کا باقاعدہ قیام عمل میں آیا۔

۱۔ تنظیم کا دستور:

امریکی ریاستوں کا دستور ۱۸ ابواب اور ۱۱۲ دفعات پر مشتمل ہے۔

۲۔ تنظیم کے اراکین (۲۸):

مندرجہ ذیل ممالک امریکی ریاستوں کی تنظیم کے ممبر ہیں۔

تنظیم کے موجودہ اراکین: (۲۸)

(۱) ارجنٹائن (۲) بارباڈوس (۳) بولیویا (۴) برازیل (۵) چلی (۶) کولمبیا (۷) کوسٹاریکا (۸) کیوبا (۹) ڈومینیکن جمہوریہ (۱۰) ایکوسے ڈور (۱۱) السلواڈور (۱۲) گرینا ڈا (۱۳) گوئٹے مالا (۱۴) ہیٹی (۱۵) ہونڈوراس (۱۶) جمیکا (۱۷) میکسیکو (۱۸) نکاراگوا (۱۹) پانامہ (۲۰) پیراگوئے (۲۱) پیرو (۲۲) سینٹ لوسیا (۲۳) سوری نام (۲۴) ٹرینی ڈاڈ (۲۵) ٹوبیگو (۲۶) امریکہ (۲۷) یوراگوئے (۲۸) وینزویلا۔

۳۔ صدر مقام:

ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا دارالحکومت واشنگٹن تنظیم کا صدر مقام ہے۔

تنظیم کا ڈھانچہ:

یہ تنظیم ایک چھوٹی اقوام متحدہ ہے اس کے تین اہم شعبے جنرل اسمبلی، کونسل اور سیکرٹریٹ ہیں جن کی مدد کے لئے کچھ دوسری کمیٹیاں بھی بنائی گئی ہیں۔

۱۔ انٹر امریکن کانفرنس:۔ یہ تنظیم کی جنرل اسمبلی ہے اس کی ساخت ہیبت اور فرائض کافی حد تک اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی سے بہت مشابہ رکھتے ہیں اس میں تمام ممالک کے اراکین شامل ہوتے ہیں جو مسائل پر بحث کرتے ہیں۔ اس کا سب سے اہم کام جنرل سیکریٹری کا ۱۰ سال کے لئے تقرر ہوتا ہے۔ مسائل کے حل کے لئے وزراء خارجہ کا مشاورتی اجلاس بھی بلایا جا سکتا ہے۔

۲۔ **تنظیم کی کونسل:۔** کونسل میں ہر ریاست کا صرف ایک نمائندہ ہے۔ اس کی حیثیت عاملہ کی سی ہے اس کے سربراہ کو چیرمین کہتے ہیں۔ بہرحال اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی طرح اسے ویٹو کا اختیار حاصل نہیں ہے اور نہ ہی اپنا فیصلہ منواسنے کے لئے کوئی انتظامی قوت رکھتی ہے اس نے اپنے کامو کی دیکھ بھال اور انہیں افعال بنانے کے لئے مختلف کونسلیں بنائی ہوئی ہیں جن میں ثقافتی کونسل، عدالتی کونسل اور معاشی و سماجی کونسل شامل ہیں۔

۳۔ **پین امریکن یونین:۔** یہ تنظیم کا جنرل سیکرٹریٹ ہے اس کا سربراہ جنرل سیکرٹری ہوتا ہے سیکرٹریٹ کے اہم شعبے حسب ذیل ہیں

(۱) قانون بین الاقوام و تنظیم کا شعبہ (۲) معاشی و سماجی امور کا شعبہ (۳) ثقافتی امور کا شعبہ (۴) اطلاعات کا شعبہ (۵) انتظامی خدمات کا شعبہ۔ ہر شعبے کا سربراہ ایک ڈائریکٹر (DIRECTOR) ہوتا ہے۔

۴۔ **تنظیم کی رکنیت:۔** دستور کے تحت امریکی براعظم کی تمام ریاستیں اس کی ممبر بن سکتی ہیں لیکن اس کے لئے دستور سے متفق ہونا ضروری ہے۔

۵۔ **تنظیم کی کارکردگی:۔** یہ تنظیم براعظم امریکہ میں امن و سلامتی کی فضا کو برقرار رکھنے کے لئے بنائی گئی۔ اس نے کئی تنازعات کو مصلحت کے ذریعے حل کیا مگر بعض اندرونی بحران کو حل کرنے میں ناکام رہی یہاں مختصراً اس کی کارکردگی کا جائزہ لیا جا رہا ہے۔

۱۔ ۱۹۵۴ء میں پانامہ بحران میں براہ راست مداخلت کر کے اس مسئلے کو حل کیا۔ ۱۹۸۴ء میں یہاں ۱۶ سال میں پہلی دفعہ صدارتی انتخاب ہوئے۔ اس وقت نہر پانامہ پر امریکی کنٹرول ہے۔ امریکہ اس نہر سے ۱۹۹۹ء میں دستبردار ہو جائے گا۔

۲۔ کیوبا میں فیڈرل کاسترو نے ۱۹۵۴ء میں اشتراکی حکومت قائم کی تو یہ خیال عام ہوا کہ اس سے پورا لاطینی امریکہ متاثر ہوگا۔ جس کی وجہ سے امریکہ کو سخت تشویش ہوئی۔ اس مسئلے پر تنظیم کا اجلاس بلایا گیا۔ اس اجلاس میں ماسوائے میکسیکو کے تمام ممالک نے کیوبا سے سفارتی تعلقات ختم کرنے کا فیصلہ کیا۔ ۱۹۶۲ء

انٹر امریکن کانفرنس
(جنرل اسمبلی)
اعلیٰ اختیاراتی ادارہ
وزراء خارجہ کا
مشاورتی اجلاس اہم
اور ضروری مسائل
کے لئے
خصوصی اجلاس
(خصوصی اور ٹیکنیکل
مسائل کے لئے
تنظیم کی کونسل
(مستقل انتظامی و مشاورتی باڈی)
رہبر دفاعی کمیٹی
بین الامریکی دفاعی
بورڈ
خصوصی تنظیمیں
خصوصی فرائض کے
لئے ایجنسیاں
بین الامریکی
معاشی و سماجی
کونسل
بین الامریکی
عدالتی کونسل
عدالتی کمیٹی
دی پین امریکن
(جنرل سیکرٹریٹ)
بین الامریکی ثقافتی
کونسل
ثقافتی ایکشن کمیٹی
بین الاقوامی قانون و تنظیم کا شعبہ
معاشی و سماجی امور کا شعبہ
ثقافتی امور کا شعبہ
اطلاعات کا شعبہ
انتظامی خدمات کا شعبہ

میں کیوبین میزائیل کا بحران پیدا ہوا۔ تو روس نے کیوبا کے تحفظ کے لئے میزائیل نصب کئے۔ امریکہ نے اس کے خلاف سخت پالیسی اختیار کی تنظیم نے قرارداد کے ذریعے کیوبا سے میزائیل اور مہلک ہتھیار ہٹانے کو کہا۔ یہ مسئلہ اقوام متحدہ کے ملوث ہونے سے ختم ہو گیا۔ اس کے بعد کیوبا کی سرگرمیوں پہ پابندی لگا دی گئی لیکن اس کی رکنیت معطل نہیں کی گئی۔

۳۔ ۱۹۵۵ء میں نکاراگوا نے کوسٹاریکا پر حملہ کیا تو تنظیم کی مداخلت کی وجہ سے یہ بحران ختم ہو گیا۔ آج کل ۱۹۷۹ء سے نکاراگوا سیاسی انتشار اور اندرونی بحران کا شکار ہے۔ یہاں اشتراکی عناصر برسر اقتدار ہیں۔ امریکہ چاہتا ہے کہ برسر اقتدار طبقہ اپنی سوچ اور سیاسی فکر میں تبدیلی لائے اور مغرب سے ملتا جلتا جمہوری نظام قائم کرے اس سے امریکی فتح اور بائیں بازو کی حوصلہ شکنی ہو گی۔ اس سلسلے میں امریکہ مسلسل نکاراگوا کی حکومت پر دباؤ ڈال رہا ہے۔ علاوہ ازیں نکاراگوا کی معیشت بھی برے حال میں ہے۔ وہاں افراط زر کی شرح ۷۵ فیصد ہے اور بنیادی اشیا کی سخت قلت ہے۔ نکاراگوا کے باغیوں کو سی۔ آئی۔ اے کی اعانت پر اگرچہ کانگریس نے پابندی لگا دی ہے مگر یہ سب کچھ عارضی ہے نکاراگوا میں برسر اقتدار انقلابی حکومت رسینڈ نیشا نے نومبر ۱۹۸۴ء میں انتخابات کروائے ہیں ریگن گورنمنٹ اُسے اس وجہ سے ناجائز تصور کرتی ہے کہ اس میں حزب اختلاف کے سب سے بڑے گروپ نے بائی کاٹ کیا تھا۔ نکاراگوا کی حکومت اس الزام کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ یکم اگست ۱۹۸۶ء کو امریکہ نے سلامتی کونسل کی اس قرارداد کو ویٹو کر دیا جس میں عالمی عدالت کے اس فیصلے کی پابندی کرنے کو کہا گیا تھا کہ نکاراگوا کے باغیوں کی مالی امداد اور فوجی اعانت غیر قانونی ہے۔ ۱۳ اگست کو امریکی سینٹ نے نکاراگوا کے باغیوں کے لیے دس کروڑ امریکی ڈالر کی فوجی امداد کے بل کی منظوری دی۔ امریکی صدر ریگن نے ۱۴ اگست کو اس بل کی توثیق کر دی۔ صدر ریگن نے نکاراگوا کے باغی لیڈروں کی تربیت کے لیے فوج کے خصوصی دستے بھیجنے کا اعلان بھی کیا۔ خلیج فونسیکا کے جزیرہ امپالا میں امریکہ نے اپنے بحری سپاہی

تنصیبات کر رکھے ہیں جن کا مقصد نکاراگوا کے خلاف ایک جاسوسی مرکز قائم کرنا ہے۔ اس کے علاوہ امریکہ نے نکاراگوا کے باغیوں کو امریکی ۴۷-C اور DC-3 ٹرانسپورٹ ایئر کرافٹ مہیا کیے اور انہیں A اور C کا مکمل تعاون حاصل ہے۔

۴۔ ۱۹۶۴ء میں جمہوریہ ڈومینیکن اور ہیٹی کے درمیان تنازعہ پیدا ہوا جسے گفت و شنید کے ذریعے حل کر دیا۔ ۱۹۶۵ء میں پہلی بار ڈومینیکن جمہوریہ سے امریکی فوج کی واپسی کے لئے تنظیم کی فوج بھیجی گئی۔ اس وقت کے امریکی صدر جانسن نے تنظیم کے ارکان سے مشورہ کئے بغیر یہ قدم اٹھایا تھا۔ دلیل یہ دی کہ خانہ جنگی کی وجہ سے وہاں پر موجود امریکی افواج کی جان و مال کو خطرہ لاحق تھا۔ دوسرا یہ کہ روس براہ راست اس میں مداخلت کر سکتا تھا۔ بہر حال تنظیم کی مشترکہ کاروائی کی بدولت امریکہ کو اپنی فوج واپس بلانی پڑی۔

۵۔ السلواڈور کی خانہ جنگی میں امریکہ ڈارٹے گروپ کی حمایت کر رہا ہے اور اسے فوجی و اقتصادی امداد دے رہا ہے۔ صدر ریگن کا خیال ہے کہ ڈارٹے گروپ سنڈنیٹا حکومت کا تختہ الٹ دے گا۔ امریکی وزیر دفاع مسٹر واٹن برگر کا کہنا ہے کہ السلواڈور کی حکومت کو کمیونسٹ سرطان لاحق ہو گیا ہے جس کے پھیلنے اور مریض کی جان لینے سے پہلے بنیادی جراحت کی ضرورت ہے۔ دوسری طرف کمیونسٹ عناصر کی حمایت کیوبا اور روس کر رہے ہیں۔ جس سے وسطی امریکہ کی اس جنگ نے "مشرق و مغرب کی جنگ" کی شکل اختیار کر لی ہے۔ السلواڈور کے گوریلوں کا کہنا ہے کہ ڈارٹے کی صدارت میں خانہ جنگی ختم ہونے کا امکان صفر کے برابر ہے۔ امریکی فوجی ہونڈوراس میں سلواڈورین باشندوں کو تربیت بھی دے رہے ہیں تاکہ بوقت ضرورت نکاراگوا اور سلواڈور کے محاذ پر استعمال کیا جا سکے۔

۶۔ واشنگٹن اور ماسکو کی لاطینی امریکہ میں کشمکش کی وجہ سے تنظیم کے ممبران میں یہ احساس پیدا ہوا ہے کہ لاطینی امریکہ کو اپنے مسائل خود حل کرنے چاہئیں۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے ۱۹۸۵ء میں پانامہ کے جزیرہ کنٹاڈورا میں ایک سربراہی

کانفرنس میں کنٹاڈورا گروپ قائم کیا۔ اس میں کولمبیا، وینزویلا، میکسیکو اور پانامہ شامل تھے۔ اس گروپ کو ثالث کا درجہ دیا گیا۔ یہ گروپ اگرچہ نکاراگوا اور السلواڈور کی لڑائی کو ختم تو نہیں کرا سکا تھا لیکن اب اس کی شدت میں کمی ضرور آگئی ہے۔

گورباچوف کے دورِ اقتدار میں (۱۹۸۵ - ۱۹۹۱ء) اشتراکیت کے اثرات لاطینی امریکی ریاستوں پر کم ہو گئے۔ اس سے کیوبا اور امریکہ کے مابین وہ تلخی بھی خاصی کم ہو گئی ہے جو کاسترو کے دورِ حکومت (۱۹۵۹ء) سے چلی آ رہی تھی۔ دنیا کے بدلتے ہوئے حالات میں جہاں سرد جنگ کی جگہ بقائے باہمی اور تعاون نے لے لی ہے۔ وہاں یہ امید کی جاتی ہے کہ آنے والے زمانے میں امریکی ریاستوں کی تنظیم علاقائی اور بین الاقوامی مسائل کے حل کے لئے موثر کردار ادا کرے گی۔

○

نظریہ ٹرومین

THE TRUMAN DOCTRINE

دوسری عالمگیر جنگ ۴۵-۱۹۳۹ء کے بعد روس ایک بڑی طاقت بن گیا اور اس نے اپنے حلقہ اثر کو جنگ کے دوران ہی وسیع کرنا شروع کر دیا تھا جیسے جنگ کے دوران روسی فوجیں جرمنوں کا پیچھا کرتی ہوئیں مشرقی یورپ میں داخل ہوئیں اور وہیں قیام پذیر ہو گئیں اس طرح پولینڈ ہنگری چیکوسلواکیہ یوگوسلاویہ رومانیہ بلغاریہ البانیہ مشرقی جرمنی نیز لاٹویا کھیتوانیا اسٹونیا وغیرہ روس کے زیر اثر آ گئے۔ جنگ کے بعد اٹلی اور فرانس کو کمیونسٹ عناصر نے اپنے نشانے کا مرکز بنایا اور وہاں کی انتظامیہ کو مفلوج کر کے رکھ دیا۔ یونان اور ترکی میں حالات خراب کرنے کے لئے تیرہ ہزار سے زیادہ گوریلوں کو تربیت دی اور انہیں ہر طرح کی امداد فراہم کی جس سے اہل مغرب کا خوفزدہ ہونا ایک قدرتی امر تھا۔ ۱۹۴۶ء میں حکومت یونان نے سلامتی کونسل کو اطلاع دی کہ اس کے پڑوسی ممالک اس کی سرحدوں کی خلاف ورزی کر رہے ہیں چنانچہ سلامتی کونسل نے حالات کا جائزہ لینے کے لئے ایک سیاسی کمیشن اور اگلے سال ۱۹۴۷ء میں ایک اقتصادی کمیشن یونان بھیجا۔ تاکہ یونان کی باقاعدہ امداد کی جائے اور اسے تباہی سے بچایا جائے۔

اسی دوران برطانوی پالیسی میں تبدیلی آئی تو اس نے یونان کے تحفظ اور اس کی دفاعی ضروریات کی ذمہ داری واپس لے لی اس اعلان سے روسی حکومت کا خوش ہونا قدرتی امر تھا لیکن جب امریکی حکومت نے یہ ذمہ داریاں اٹھانے کا اعلان کیا تو روس کی امیدیں خاک میں مل گئیں۔

اس دوران ترکی میں بھی حالات خراب ہو رہے تھے۔ روس نے مارچ ۱۹۴۵ء میں ہی ترکی کے ساتھ دوستی کا پرانا معاہدہ ۱۹۲۵ء کالعدم قرار دیدیا۔ حالانکہ ۱۹۲۵ء کے بعد کئی بار اس کی تجدید ہو چکی تھی اس معاہدے کی تنسیخ نے ترکی اور روس کے

تعلقات کو ایک نازک اور نئے موڑ پر لا کھڑا کیا۔ ۱۹۴۵ء کے وسط میں روس نے ترکی کے ساتھ "معاہدہ امن" کی تجدید کے لئے کچھ شرائط پیش کیں۔ مثلاً

- روس کو کارز اور اردہان کے علاقے واپس کئے جائیں۔
- روس کو باسفورس اور دانیال میں فوجی اڈے بنانے کی اجازت دی جائے۔
- مانٹریاکس سٹریٹس کنونشن اور تھریس کی سرحدوں پر نظر ثانی کی جائے۔

روس آئندہ سال بھی ان شرائط کی منظوری کے سلسلے میں ترکی پر دباؤ ڈالتا رہا لیکن ترکی نے روس کے یہ تمام مطالبات مسترد کر دیئے جس کے ردِعمل کے طور پر روس نے ترکی کے خلاف سخت پروپیگنڈے کی مہم کا آغاز کر دیا۔ روس ہمیشہ سے اپنے پروپیگنڈہ کے بل پر ان ممالک میں جہاں اس کے مفادات وابستہ ہوتے ہیں وہاں بے اطمینانی پیدا کرنے اور حکومت و عوام کے درمیان غلط فہمیاں پیدا کر کے ہنگامہ کرانے کی پالیسی پر گامزن رہا ہے ایسے تمام ممالک میں روس کے کارندے تندہی کے ساتھ اپنے فرائض سرانجام دیتے ہیں۔ ترکی کے خلاف پروپیگنڈہ نسلی بنیادوں پر کیا جا رہا تھا حکومت ترکی نے اس کا جواب مختلف انداز میں دیا۔ دسمبر ۱۹۴۶ء میں ترکی کی مختلف روس نواز تنظیموں کے تقریباً ۰۰ افراد گرفتار کر لیئے گئے دو جماعتوں کو کالعدم قرار دے دیا گیا۔ ان کے ترجمان اخبار بند کر دیئے گئے اس کے بعد روس اور ترکی کے تعلقات اتنے کشیدہ ہو گئے کہ ترکی کو روس کی طرف سے مسلح جارحیت کا شدید خطرہ پیدا ہو گیا حکومت ترکی نے درخواست کی کہ اسے روسی ریشہ دوانیوں سے بچنے کے لئے تعاون و امداد فراہم کی جائے۔

چنانچہ مارچ ۱۹۴۷ء میں امریکی صدر ٹرومین نے کانگریس سے خطاب کرتے ہوئے ترکی اور یونان کی سالمیت کے خطرے کے پیش نظر ترکی اور یونان کو امداد دینے کی تجویز پیش کی۔ صدر امریکہ نے کہا۔

"ہزاروں مسلح ہنگامہ پروروں کے ہاتھوں جن کی قیادت کمیونسٹ کر رہے ہیں یونان کی سالمیت خطرے میں پڑی ہوئی ہے ایسے وقت میں ہمیں حکومت یونان کی مدد کرنا چاہیئے تاکہ وہ خود کفیل اور مستحکم ہو سکے۔ ترکی نے برطانیہ اور امریکہ سے اقتصادی

امداد کی درخواست کی ہے تاکہ وہ کمیونسٹوں سے اپنی قومی سلامتی کا تحفظ کر سکے۔
مشرق وسطیٰ میں بھی سالمیت کے تحفظ کی ضرورت ہے۔ ہم اعلیٰ مقاصد کبھی حاصل نہیں کر سکتے اگر ہم آزاد لوگوں کو آمر حکومتوں کی طرف سے ان پر مسلط کردہ خطرات اور طاقتوروں کی جارحیت سے اپنی قومی سلامتی کا تحفظ اور اپنے اداروں کے لئے امداد اور تعاون نہ کریں یہ عام تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ آمر حکومتیں آزاد عوام پر بالواسطہ یا بلاواسطہ جارحیت مسلط کر کے بین الاقوامی امن و سلامتی کو خطرے میں ڈال رہی ہیں۔ جس سے امریکہ کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔
امریکہ نے پولینڈ رومانیہ اور بلغاریہ کے معاملوں میں معاہدہ مالٹا کی خلاف ورزی پر کھلا احتجاج کیا ہے۔

میرا ایمان ہے کہ ہمیں ایسے آزاد لوگوں کی مدد کرنا چاہیئے۔ جو بیرونی دباؤ کے خلاف مزاحمت کر رہے ہیں چونکہ آزاد دنیا کے لوگ ہماری مدد کے طلب گار ہیں اور اگر ہم نے ان کی آزادی اور قیادت کو پس پشت ڈال دیا تو ہم نہ صرف امن کو بلکہ اپنی قوم کی فلاح و بہبود کو بھی خطرے میں ڈال دیں گے۔"
امریکی صدر کی اس تجویز سے روس اور ترکی کے درمیان کشیدگی کم تو نہ ہوئی تاہم روس کو یہ احساس ہو گیا کہ ترکی کے تحفظ کے لئے کچھ اور طاقتیں بھی موجود ہیں اس سے ترک عوام خاص کر طلباء میں روس کے خلاف سخت نفرت پیدا ہوئی اور قدرتی طور پر امریکیوں کے قریب آ گئے اگست ۱۹۴۷ء کو امریکی حکومت نے روس پر واضح کر دیا کہ وہ فوجی اہمیت کی آبناؤں پر روس کی اجارہ داری کا مخالف ہے اور رہے گا۔ صدر ٹرومین چاہتے تھے کہ یونان اور ترکی میں امریکی فوج بھیجی جائے تاکہ آزاد دنیا کے عوام کو کمیونسٹوں کے چنگل سے بچایا جا سکے۔ مئی ۱۹۴۷ء میں امریکی کانگریس نے ایک قانون منظور کر کے ترکی اور یونان کو اقتصادی امداد فراہم کرنے کی اجازت دے دی۔ ترکی کے لئے ۔ ۲ کروڑ ڈالر کی امداد منظور کی گئی ۱۹۴۷ء میں ایک امریکی فوجی مشن انقرہ بھیجا گیا جسے مستقل طور پر ایک امریکی سفارت خانے کے ساتھ منسلک کر دیا گیا ۱۹۴۸ء میں امریکہ نے ترکی کو جنگی جہازوں کا ایک بحری

بیڑہ دیا جس میں آب دوز کشتیاں بھی شامل تھیں۔

۱۹۵۰ء کے وسط تک ترکی اور یونان کو امریکہ کی طرف سے زبردست اقتصادی اور فوجی امداد ملتی رہی جس سے یہ واضح ہو گیا تھا کہ امریکی پالیسی کی بدولت ان ممالک کے حالات بدل گئے ہیں۔ یونان سے گوریلا کاروائیاں ختم ہو گئیں اور وہاں پہ مکمل طور پر امن و امان ہو گیا۔

اسی طرح ترکی میں قومی زندگی معمول پر آگئی معاشرتی توازن بحال ہوا اور فوجی پوزیشن مستحکم ہوئی جون ۱۹۵۰ء میں جب کوریا کی جنگ کا آغاز ہوا تو ترکی نے ۴½ ہزار افراد پر مشتمل ایک مسلح بریگیڈ اقوام متحدہ کے حوالے کیا یکم اگست ۱۹۵۰ء کو ترکی نے ناٹو کی رکنیت کے لئے درخواست دی ۱۹۵۲ء میں یونان اور ترکی باقاعدہ ناٹو کے ممبر بن گئے۔

چار نکاتی پروگرام

POINT FOUR PROGRAMME

دوسری عالمی جنگ ۱۹۳۹-۴۵ء کے بعد دنیا نظریاتی طور پر دو بلاکوں میں تقسیم ہو گئی۔ روس اشتراکی اور امریکہ سرمایہ دارانہ بلاک کی قیادت کرنے لگا۔ ان حالات میں امریکی صدر ٹرومین نے اپنا حلقہ اثر بڑھانے کے لیے ۲۰ جنوری ۱۹۴۹ء کو ایک پالیسی کا اعلان کیا۔ اس پالیسی کا چوتھا نکتہ ایشیا، مشرق بعید اور لاطینی امریکہ کے پسماندہ ممالک کو فنی اور اقتصادی امداد دینے سے متعلق تھا۔ اسی لیے اسے "پوائنٹ فور پروگرام" کہا جاتا ہے۔ اس نکتہ میں کہا گیا۔

"امریکی حکومت اقوام متحدہ کو امداد دیتے، بین الاقوامی اقتصادی پروگرام کو مستحکم بنیادوں پر استوار کرنے آزادی اور جمہوریت پسند اقوام کو بیرونی حملوں سے تحفظ فراہم کرنے اور ترقی پذیر ممالک کو اقتصادی اور فنی امداد فراہم کرنے کے سلسلے میں اپنی ذمہ داریاں پوری کرتی رہے گی۔"

امریکی کانگریس نے اس پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ضروری قانون سازی کرنے کے بعد سرمایہ فراہم کرنے کی اجازت دے دی۔ اس پروگرام کو کامیاب بنانے کے لیے "ادارہ امداد فنی تعاون" بھی قائم کیا گیا۔ جو براہ راست وزارت خارجہ کی نگرانی میں اپنا کام سرانجام دے رہا ہے۔ اس پروگرام کے تحت امریکہ نے بین الاقوامی سطح پر امن و سلامتی کی فضا کو برقرار رکھنے میں اپنی ذمہ داریاں خوش اسلوبی سے پایہ تکمیل تک پہنچانے کی کوشش کی ہے امریکہ کی اس پالیسی کو بنیاد بنا کر اقوام متحدہ نے بھی پسماندہ ممالک کی اقتصادی بحالی کے لیے طویل المیعاد معاشی اور فنی امداد کے پروگرام شروع کیے۔ افرو ایشیائی اور لاطینی امریکہ کے پسماندہ ممالک میں فنی، معاشی اور صحت عامہ کے ماہرین اقوام متحدہ کی طرف سے بھیجے گئے۔

۱۲- نیو ورلڈ آرڈر / نیا عالمی فرمان

نیو ورلڈ آرڈر کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں امریکہ سب سے بڑی قوت ہے اور اسی کا آرڈر چلے گا۔

دوسری عالمی جنگ (۴۵-۱۹۳۹ء) کے بعد امریکہ اور روس دو بڑی طاقتوں کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آئے۔ جاپان کو ایٹم بموں نے غیر مشروط ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا اور وہ امریکہ کا طفیلی ملک بن گیا۔ جرمنی دو لخت ہو گیا اور ۱۹۹۰ء کے اواخر تک روسی شکنجوں میں جکڑا رہا۔

دو قطبی نظام میں ایک نیا اقتصادی نظام وجود میں آیا۔ امریکہ اور روس بیرونی امداد کے ذریعے اپنا اپنا حلقہ اثر بڑھانے لگے۔ امریکہ مغربی یورپ کی اور روس مشرقی یورپ کی قیادت کرنے لگا۔ سرد جنگ کی اس ۴۵ سالہ (۹۰-۱۹۴۵ء) طویل کشمکش میں بالآخر امریکہ اپنے بے پناہ مادی وسائل کے بل بوتے پر روس کو پیچھے ہٹانے میں کامیاب ہو گیا۔

روسی کامریڈ میخائل گورباچوف نے اپنے دور اقتدار (۹۱-۱۹۸۵ء) میں ۷۰ سالہ پرانے اشتراکی نظام کے تحت چلنے والے معاشی، سیاسی اور سماجی نظام میں تبدیلیوں کی ضرورت محسوس کی۔ سوویت معاشرے کی اصلاح کے لئے پرسٹرائیکا (تشکیل نو) اور گلاسناسٹ (کھلی تنقید) کا پروگرام پیش کیا۔ اس پروگرام کے تحت سیاسی سطح پر جمہوریت لائی گئی۔ معیشت میں دور رس تبدیلیاں کی گئیں۔ اور نجی سرمایہ کاری کی راہ ہموار کی گئی۔ خارجہ پالیسی کے میدان میں یورپ سے درمیانے فاصلے تک مار کرنے والے میزائلوں پر زیرو آپشن (یعنی مکمل خاتمہ) کا نظریہ پیش کیا۔ اور اسے امریکی اسٹار وار پروگرام سے آزاد قرار دیا۔ مشرقی یورپ اور افغانستان وغیرہ سے سوویت فوج واپس بلانے کا اعلان کیا۔ نیز چین سے تعلقات کو فروغ دینے کے لئے گفتگو کا آغاز کیا۔

گوربا چوف کی پالیسیوں نے سوویت یونین کو سیاسی اور اقتصادی محاذ پر ایک شکست خوردہ منتشر قوت بنا دیا۔ اپریل ۱۹۹۱ء میں سوویت پارلیمان نے ایک مسودہ قانون کی منظوری دی جس سے سوویت ریاستوں کو وفاق سے علیحدگی کا حق مل گیا۔ ۷ ستمبر ۱۹۹۱ء میں تینوں بالٹک ریاستیں، لیتھونیا، اسٹونیا اور لٹویا سوویت یونین سے الگ ہو گئیں۔ ۱۲ دسمبر ۱۹۹۱ء کو سوویت یونین کی ۱۱ جمہوریاؤں نے باضابطہ طور پر سوویت یونین کے خاتمے اور اس کی جگہ آزاد ملکوں کی دولت مشترکہ کے قیام کے ایک معاہدے پر دستخط کئے[1]۔ ۲۶ دسمبر ۱۹۹۱ء کو گوربا چوف مستعفی ہو گئے۔ اور اس کے ساتھ ہی کریملن پر سے ۷۰ سال بعد پہلی بار درانتی اور ہتھوڑے کے نشان والا سرخ پرچم اتار دیا گیا۔ سپریم سوویت نے ووٹنگ کے ذریعے خود اپنے وجود کو ختم کیا۔ آخری اجلاس میں صرف ۲۰ ارکان نے شرکت کی اور ہاتھ اٹھا کر سپریم سوویت کے خاتمے کا اعلان کیا۔

عام خیال یہی ہے کہ امریکہ کا مجوزہ عالمی نظام دس پندرہ سال سے زیادہ نہیں چل سکے گا۔ کیونکہ یہ مضبوط اخلاقی، تمدنی اور مذہبی بنیادوں پر قائم نہیں ہوا۔ وقت آنے پر جرمنی، جاپان، چین اور تیسری دنیا کے ممالک وغیرہ اس کے خلاف بغاوت کریں گے۔ جاپان کو ابھی تک ناگاساکی اور ہیروشیما کے سانحات نہیں بھولے۔ متحدہ جرمنی میں پھر سے نازی جراثیم پرورش پانے لگے ہیں۔۔ یہ دونوں ممالک امریکہ کے سب سے بڑے اقتصادی حریف ہیں۔ امریکہ کے ستائے ہوئے

---

[1] روسی دولت مشترکہ میں ۵ ایشیائی جمہورتیں (۱) قازقستان (۲) ازبکستان (۳) کرغستان (۴) تاجکستان (۵) ترکمانستان اور ۶ یورپی جمہورتیں (۱) رشین فیڈریشن (۲) یوکرین (۳) بائیلو رشیا (۴) آذربائیجان (۵) مالڈونیا اور (۶) آرمینیا شامل ہیں۔ جارجیا دولت مشترکہ میں شامل ہونے کے لئے تیار نہیں ہے (یکم جنوری ۱۹۹۲ء)

بعض ترقی یافتہ ممالک بھی نئے عالمی فرمان کے حوالے سے مستقبل میں سنگین خطرات محسوس کرتے ہیں۔ تیسری دنیا کے ممالک کا ردعمل حوصلہ افزا ہے۔ اسلامی بلاک گو ابھی تک منتشر اور افلاس کا شکار ہے۔ مگر آنے والے زمانے میں پاکستان، ترکی، الجزائر اور مصر ایٹمی قوت بن سکتے ہیں۔ ایٹمی طاقت بننا اب مشکل کام نہیں رہا۔ یہ ٹیکنیک اب "کھلا راز" بن گئی ہے۔

چین امریکہ کی من مانی کے سامنے سینہ سپر ہے اور اس وقت چین دنیا کا واحد اور نمائندہ کمیونسٹ ملک ہے۔ چینی قیادت اعلان کر چکی ہے کہ سوشلسٹ نظام کے دائرے میں رہتے ہوئے اقتصادی اصلاحات جاری رکھی جائیں گی۔ چینی قیادت نے یہ دعویٰ بھی کیا کہ روس میں کبھی مارکسزم اور لینن ازم نافذ نہیں رہا۔ ماؤ نے ۱۹۶۰ء کے عشرے میں سوویت کمیونسٹوں کو ترمیم پسندی کا طعنہ دیا تھا۔ امریکی غلبے کے پروگرام کے خلاف چینی صدر یانگ شانگ نے اکتوبر ۱۹۹۱ء میں دورہ پاکستان کے دوران لاہور میں کہا تھا کہ

"نئے عالمی فرمان کی بنیاد اقوام متحدہ کے منشور اور مسلمہ بین الاقوامی اصولوں پر ہونی چاہیئے۔ اور اس نظام سے تمام قوموں کی امنگوں کی ترجمانی ہونی چاہیئے۔"

بابِ دوازدہم

امنِ عالم کے مسائل

THE PROBLEMS OF WORLD PEACE

تخفیف اسلحہ کا مسئلہ

THE PROBLEM OF DISARMAMENT

آج دنیا کو جو انتہائی پیچیدہ مسائل درپیش ہیں ان میں سب سے زیادہ اہمیت کا حامل اسلحہ پر کنٹرول کا مسئلہ ہے۔ اس مسئلہ میں اس وقت تک کوئی کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی جب تک دو طرفہ دلچسپی نہ پیدا ہو اور اس کی دل سے حمایت نہ کی جائے۔

اپریشن مین ہٹن کے مطابق امریکہ نے ۱۹۴۵ء میں دنیا کا سب سے پہلا ایٹم بم بنایا اور اگست ۴۵ء میں اسے ہیروشیما اور ناگاساکی پر استعمال کر کے دوسری جنگ عظیم ۱۹۳۹-۴۵ء میں فتح حاصل کی۔ کوئی تین برس تک امریکہ دنیا کا واحد ایٹمی چودھری بنا رہا مگر جلد ہی ۱۹۴۹ء میں سوویت روس نے ایٹمی دھماکہ کر کے امریکہ کی اس اجارہ داری کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔ یہ سب کچھ ان کوششوں کے باوجود ہو کر رہا جو ایٹمی اسلحہ کے پھیلاؤ کو روکنے کے لئے کی جا رہی تھیں۔ اس ضمن میں سرفہرست نام برنارڈ بروچ کا آتا ہے۔ جس کے اپنے ہی نام پر بروچ منصوبہ تیار ہوا۔ بروچ منصوبہ کا مرکزی نکتہ یہ تھا کہ تمام ایٹمی قوت اور طاقت کے استعمال کا اختیار اقوام متحدہ کے اٹامک انرجی کمیشن کے سپرد کیا جائے۔ مزید براں دنیا میں اس وقت تک جتنے بھی ایٹمی ہتھیار موجود ہیں۔ انہیں تباہ کر دیا جائے اقوام متحدہ کے اراکین کی اکثریت کی حمایت کے باوجود بروچ منصوبہ ناکام ہو گیا اور ایٹمی اسلحہ کے پھیلاؤ اور بہتر معیار میں مسابقت کی دوڑ پورے زور و شور سے جاری رہی۔ ایٹم بم کے بعد ۵۳ء میں روس اور امریکہ نے ہائیڈروجن بم بنائے۔ ۵۷ء میں روس نے دنیا کا پہلا خلائی جہاز مدار میں بھیج کر پوری دنیا خاص کر امریکہ کو بھونچکا کر رکھ دیا۔ روس یہ واضح کرنا چاہتا تھا۔ کہ اس کے پاس صرف ایٹم بم ہی نہیں بلکہ اسے ہدف تک لے جانے کا ذریعہ بھی ہے۔

تخفیف اسلحہ کے سلسلے میں اقوام متحدہ کی کمیٹی کا ایک ایڈ ہاک عامل گروپ بھی ہے جو اسلحہ کی تنسیخ کے مسئلے پر غور کر رہا ہے مگر ہنوز اس سے کوئی خاطر خواہ نتیجہ

نہیں نکل سکا۔

تخفیف اسلحہ کے سلسلے میں جو مختلف معاہدات و دستاویزات ابھی تک طے پائے ہیں ان کی مختصراً تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۔ معاہدہ انٹارٹک ۱۹۵۹ء ANTARTIC TREATY

اس معاہدہ کی رو سے قطب جنوبی کو اسلحہ سے پاک علاقہ قرار دیا گیا۔ عملاً اس معاہدے کا ہونا نہ ہونا برابر تھا۔ البتہ اصولی طور پر اس کی اتنی اہمیت ضرور تھی کہ اور کچھ نہیں تو اس مسئلے کی اہمیت اور سنگینی کا اعتراف کر لیا گیا۔ اس معاہدہ کا تعلق روایتی اور غیر ایٹمی اسلحہ سے تھا۔

۲۔ جزوی تجربہ کی ممانعت کا معاہدہ ۱۹۶۳ء PARTIAL TEST BAN TREATY

اس معاہدہ کی رو سے فضاء بیرونی خلا اور سمندر میں ایٹمی اسلحے کے تجربات پر پابندی لگا دی گئی۔

۳۔ معاہدہ فضائے بسیط ۱۹۶۷ء OUTER SPACE TREATY

اس معاہدہ کی رو سے فضائے بسیط میں ایٹمی اسلحہ کے استعمال اور آزمائش پر پابندی لگا دی گئی۔

۴۔ معاہدہ ٹولی ٹولوکو ۱۹۶۷ء TLATALOLCO TREATY

اس معاہدہ کی رو سے جنوبی امریکہ کو ایٹمی اسلحہ سے پاک علاقہ قرار دیا گیا۔

۵۔ معاہدہ عدم افزائش NON-PROLIFICUTION TREATY

اس معاہدہ پر ۶۸ء میں ایٹمی طاقتوں یعنی امریکہ سوویت روس اور برطانیہ نے دستخط کئے۔ ۱۹۷۰ء میں اس معاہدہ کی توثیق ہوئی۔ چین ہندوستان اور پاکستان سمیت دنیا کے کئی ممالک نے ابھی تک اس معاہدے کی رکنیت قبول نہیں کی موقف

یہ ہے کہ اس معاہدہ میں صرف بڑی طاقتوں کی جوہری قوت اور صلاحیت کو تحفظ فراہم کیا گیا ہے جبکہ چھوٹی اور غیر جوہری قوتوں کے خلاف امتیاز برتا گیا ہے ستم ظریفی کی بات یہ ہے کہ اس معاہدہ پر دستخط ہونے کے بعد اب تک خود ان طاقتوں کی جوہری قوت میں نمایاں اضافہ ہوا ہے اور مستقل ہو رہا ہے اور عملاً اس کا مقصد صرف یہ رہ گیا ہے کہ تیسری دنیا کے ممالک کو مجبور کیا جائے کہ وہ اپنے جائز مقاصد کے لئے بھی ایٹمی توانائی حاصل نہ کر سکیں۔ پاکستان کی مثال اس میں سر فہرست ہے۔ یاد دہانی کے لئے عرض کرتا چلوں کہ اگست ۱۹۷۶ء میں جب ہنری کسنجر پاکستان آئے تو انہوں نے واضح الفاظ میں پاکستان کو دھمکی دی کہ اگر پاکستان نے فرانس سے ری پروسیسنگ پلانٹ کے حصول کی کوشش جاری رکھی تو اس کا عبرتناک انجام ہو گا۔

۶۔ معاہدہ فرش سمندر ۱۹۷۱ء SEA BED TREATY

اس معاہدہ کی رو سے ایٹمی ہتھیاروں اور عالمگیر تباہی کے دیگر اسلحے کا سمندر کی سطح پر یا زیر آب استعمال پر پابندی لگا دی۔

۷۔ معاہدہ زہریلی گیس ۱۹۷۵ء BW CONVENTION

اس معاہدے کے تحت جراثیمی ہتھیاروں کی ترقی ساخت اور ذخیرہ اندوزی کی ممانعت کر دی گئی۔ اس کی ابتدائی بات چیت ۱۹۷۱ء میں شروع ہوئی اور ۱۹۷۵ء کو یہ معاہدہ عملاً نافذ العمل ہوا۔ یہ پہلا معاہدہ تھا جس میں عالمگیر تباہی کے موجودہ ہتھیاروں کے استحصال کا اہتمام کیا۔

۸۔ معاہدہ تحفظ قدرتی ماحول ۱۹۷۸ء ENMOND CONVENTION

یہ معاہدہ ماحول کی فلاح و بہبود کے سلسلے میں ماحول کے تغیر میں فوجی یا کوئی دوسرا معاندانہ طریقہ اختیار کرنے کی ممانعت کے بارے میں ہے

۹۔ سالٹ اول ۱۹۷۲ء
STRAREGIC ARMS LIMITATION TALKS TREATY-I

یہ مذاکرات ۱۹۶۹ء میں شروع ہوئے اور ۱۲۷ طویل نشستوں کے بعد ۱۹۷۲ء میں ان میں شامل جن معاہدوں پر دستخط ہوئے ان میں ایک معاہدہ کا تعلق ایٹمی ہتھیاروں سے لیس حملہ آور میزائیل کے مقابلے میں دفاعی میزائیل کے نظام کو مستحکم کرنے اور میزائیلوں کی تعداد کو محدود کرنے کے بارے میں تھا۔ واضح رہے کہ ایٹمی جنگ کا خطرہ صرف ان صورتوں میں ٹالا جا سکتا ہے پہلا اور آسان طریقہ تو یہ ہے کہ ایٹمی اسلحہ کو مکمل طور پر ترک اور ختم کر دیا جائے۔ دوسرا یہ کہ اس کے خلاف دفاعی نظام کو اس حد تک کمزور کر دیا جائے کہ ہر حملہ کی کامیابی کا یقین ہو جائے۔ اور اس طرح جوہری یا ایٹمی طاقتوں کو پتہ چل جائے کہ اگر ایک بار ایٹمی جنگ شروع ہو گئی تو اس کے خلاف دفاع ناممکن ہو گا۔ چنانچہ بہتر یہی ہو گا کہ جنگ شروع ہی نہ ہونے پائے بصورت دیگر دو طرفہ مکمل تباہی یقینی ہو گئی۔

سالٹ اول میں جس معاملہ پر سب سے پہلے اتفاق رائے ہوا اس کا تعلق ان دفاعی میزائیلوں سے تھا۔ جو حملہ آور میزائیل کے خلاف استعمال کئے جا سکتے ہیں اس طرح ایٹمی جنگ کو روکنے کے بجائے اس کے لئے ایک جواز پیدا کیا گیا۔ اسی خدشہ کی بنیاد پر A B M یعنی ANTI BALASTIC MISSILE معاہدہ ہوا جو آج تک کسی نہ کسی صورت میں قائم ہے۔ سالٹ اول کا دوسرا حصہ ایک عارضی معاہدہ کی شکل میں تھا۔ جس کا تعلق دور تک مار کرنے والے حملہ آور میزائیل کی تعداد پر پابندی یا ان کی موجود تعداد کو منجمد کرنے سے تھا۔ علاوہ ازیں معاہدہ میں ایک شق یہ بھی تھی کہ چھوٹے اور ہلکے میزائیل کو چلانے والے لانچر کو بدل کر اور بہتر بنا کر بڑے اور بھاری میزائیل کے واسطے استعمال نہیں کیا جائے گا۔ سالٹ اوّل پر دستخطوں کے وقت روس کے پاس جو بین البراعظمی میزائیل تھے۔ ان کی تفصیل یہ ہے کہ ایس ایس (یعنی میزائیل جو سطح زمین سے سطح زمین پر واقع نشانوں پر چھوڑے جائیں) ۷، ۸، ۹، ۱۱، ۱۳ اور ۱۹۔ ان میں ایس ایس ۱۹ اس وقت کے لحاظ سے زیادہ بھاری اور جدید تھے۔ میزائیل کے ہلکے اور بھاری ہونے کا تعلق صرف اس کے وزن ہی سے

نہیں ہوتا بلکہ اس کی ہلاکت خیز آتشیں قوت اور اس کے بارودی دھماکہ سے بھی ہوتا ہے۔

امریکہ کے پاس جو میزائیل تھے ان میں منٹ مین اور ٹیٹان شامل تھے یہ دونوں بھی سطح زمین سے سطح زمین پر پھینکے جانے والے بین البراعظمی میزائیل تھے۔ چھوٹے اور درمیانہ فاصلہ کے میزائیل ان میں شامل نہیں تھے۔ اس وقت امریکہ اور سوویت روس کے پاس آبدوز لانچر اور بین البراعظمی میزائیل لانچر کی تعداد حسب ذیل تھی۔

تعداد	امریکہ	روس
۱- بین البراعظمی میزائیل اور لانچر	۱۰۵۴	۱۴۰۸
آبدوز لانچر	۶۵۶	۹۵۰
کل	۱۷۱۰	۲۳۵۸

تاہم امریکہ کے حساب سے روس کے پاس ۲۱۰ اور ایسے بین البراعظمی میزائیل تھے جنہیں وہ چھپا رہا تھا۔ سالٹ اول اور دوم کی سب سے بڑی قباحت یہی جانچ پڑتال اور تصدیق کا مسئلہ رہی ہے ہرچند کہ دونوں طاقتوں کے پاس اپنا اپنا مصنوعی سیاروں پر مبنی مکمل تشریاتی اور جاسوسی نظام موجود ہے۔ جو ہر وقت اہم اطلاعات حاصل کرنے اور فراہم کرنے میں لگا رہتا ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ ہلکے اور بھاری ہتھیاروں میں تمیز نہیں کر سکتا ہے۔

سالٹ اول کا معاہدہ پانچ سال کے لئے تھا۔ مگر اس دوران روس اور امریکہ دونوں ہی نے عملاً اس کی جتنی بھی خلاف ورزی کر نا تھی کی اور میزائیل کی متعین شدہ تعداد کو خاموشی سے بڑھانے کے علاوہ ان کو جدید تر اور زیادہ سے زیادہ مہلک بنانے کا اہتمام بھی کیا۔ سائنس اور نئی تحقیق و تجربہ کو زیادہ سے زیادہ وسعت دی گئی۔

سالٹ اول کا معاہدہ ہونے کو تو ہو گیا مگر اس پر عمل کرنے کے بجائے دونوں طاقتوں نے سودے بازی کے لئے اپنی اپنی پوزیشن کو مستحکم کرنا شروع رکھا امریکہ نے اپنے Mx میزائیل پر کام کرنا شروع کیا اور اس میں خاطر خواہ کامیابی بھی

حاصل کی جبکہ روس نے اپنے بموں کی آتشیں قوت کو بڑھانے کے ساتھ ساتھ ان کے معیار اور کارکردگی کو بھی بہتر بنانا شروع کیا۔

۱۰۔ سالٹ دوم ۱۹۷۹ء S.A.L.T.II

یہ معاہدہ ابھی تک غیر توثیق شدہ ہے اور ناکام بھی اس کی وجہ بتانے سے پہلے ضروری ہے کہ یہ بتایا جائے کہ سالٹ دوم پر عمل درآمد کیوں نہیں ہوا قصہ مختصر یہ ہے کہ دونوں طاقتوں کا خیال تھا کہ جب آئندہ سالٹ دوم کے لئے گفت وشنید ہو تو ہر اک کے پاس سودے بازی کے لئے زیادہ سے زیادہ مواقع ہوں۔ اس معاملے میں امریکی کانگریس نے انتظامیہ کا پورا پورا ساتھ دیا۔ اور کم وبیش اسی پالیسی کو روس نے اپنایا۔ جس سے ایک طرف تو معاہدہ کی طرف پیش رفت ہوتی رہی اور دوسری طرف اسلحہ سازی کے نت نئے منصوبوں پر جدید ترین مہلک جوہری ہتھیاروں کے انبار بھی لگتے رہے۔ ۱۹۷۴ء کے آخر میں صدر فورڈ اور بریژنیف کے مابین ولاڈی واسٹک کے مقام پر سراہی کانفرنس ہوئی۔ جس کے بعد دونوں سربراہوں نے اتفاق کیا کہ برابری کے اصول پر اسلحہ کی مجموعی تعداد کو متعین اور منجمد کر دیا جائے۔ اس طرح کہ ہر اک کے پاس ابتداً ۲۴۰۰ مہلک اور بھاری ایٹمی ہتھیاروں سے زیادہ نہ رہیں۔ اس کے بعد ان کی تعداد بتدریج گھٹا کر ۲۲۵۰ تک لائی جائے ان میں تینوں قسم کے جوہری بم لانے اور برسانے والے ذرائع شامل ہوں گے یعنی زمین پر تنصیب شدہ آبدوز کشتیوں میں لگے ہوئے اور طیارہ بردار جوہری میزائیل اور بم۔

ہر چند کہ مہلک اور بڑے جوہری ہتھیاروں کی مجموعی تعداد پر اصولی طور پر اتفاق رائے ہو گیا مگر حتمی طور پر یہ فیصلہ نہ ہو سکا کہ کس ہتھیار کو بھاری اور کسے ہلکا قرار دیا جائے اول الذکر ہتھیاروں کی مار اور آتشیں قوت آخر الذکر سے تقریباً تین گنا زیادہ ہوتی ہے۔ بڑے اسلحہ کی مار اکثر سات ہزار میل تک ہوتی ہے اور یہ واشنگٹن اور ماسکو کے درمیان فاصلہ تقریباً آدھ گھنٹہ میں طے کر سکتے ہیں جبکہ نسبتاً چھوٹے اور ہلکے ہتھیار کا رینج تقریباً ڈھائی تین ہزار میل ہوتا ہے۔ اس

ضمن میں اصل وجہ نزاع سوویت روس کا نیا بمبار جہاز BACKFIRE بنا۔ امریکہ کا اصرار تھا کہ اس جہاز کو اسٹریٹجک ہتھیاروں کی صف میں شمار کیا جائے جبکہ روس اسے ٹیکنیکل ہتھیاروں کی فہرست میں رکھنا چاہتا تھا۔ اور یہ بحث تقریباً دو سال تک جاری رہی آخر کار ۱۹۷۹ء میں سالٹ دوم کا مسودہ تیار ہو گیا۔ اس وقت امریکہ میں فورڈ کی جگہ جمی کارٹر صدر بن چکے تھے۔ اسی سال جون میں آسٹریلیا کے دارالحکومت ویانا میں کارٹر بریژنیف ملاقات ہوئی اور دونوں سربراہوں نے سالٹ دوم کے مسودہ پر دستخط کر دیئے۔

سالٹ دوم، سالٹ اول سے بھی کہیں زیادہ الفاظ کی بازی گری اور نکتہ قریبی کا شاہکار تھا۔ دونوں طاقتوں کے مسودہ نویسوں نے پوری کوشش کی تھی کہ کم از کم نقصان اور تہمت پر زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جائے۔ ابتداً میزائیلوں کی کل تعداد ۲۴۰۰ مقرر کی گئی مگر ساتھ ہی یہ بھی طے پایا کہ یکم جنوری ۱۹۸۱ء سے ان کی تعداد بتدریج گھٹا کر ۲۲۵۰ کر دی جائے گی یعنی کل کو ملا کر ۱۵۰ مختلف میزائیلی نظام گھٹا دیئے جائیں گے۔ اس وقت امریکہ کے پاس ۲۰۸۵ میزائیل اور ان کو لانے اور لے جانے والے نظام تھے۔ جبکہ روس کے پاس ۲۵۰۰ میزائیل تھے۔ سالٹ دوم کے تحت یہ سسٹم ۱۹۸۵ء تک گھٹتے گھٹتے بالترتیب ۲۰۶۴ اور ۲۲۴۶ تک جاتا۔ تخفیف کی اس شرح کے مطابق امریکی سسٹم میں بجائے کمی کے چھ کا اضافہ ہوتا جبکہ روس کے ایٹمی نظام میں ۲۵۴ کی کمی واقع ہو جاتی الفاظ اور ہندسوں کا یہ کھیل واقعی بہت عجیب اور پر اسرار تھا اور کھٹکتا بھی تھا۔ مگر خدشہ یہ تھا کہ سالٹ دوم معاہدہ کے بغیر اسلحہ کی دوڑ دیوانگی کی حد تک بڑھ جائے گی اور ۱۹۸۰ء کی دہائی کے اندر اندر روس اپنے ہتھیاروں کی تعداد تین ہزار تک لے جا سکے گا اور خود امریکہ بھی اس سے پیچھے نہیں رہے گا۔

سالٹ دوم کے تحت ہتھیاروں کے لئے ۲ حدیں مقرر کی گئیں ایک بالائی حد CEILING اور دوسری ذیلی حد SUB-CEILING بالائی حد کا تعلق ہتھیاروں کی کل اور زیادہ سے زیادہ تعداد سے تھا۔ جبکہ ذیلی حد کا تعلق مخصوص نظام کی تعداد سے تھا مگر اس طرح کہ وہ بالائی حد سے کسی طرح تجاوز نہ کر پائے۔ البتہ ان حدود میں رہتے

ہوئے دونوں طاقتوں کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ اپنی اپنی ضرورت کے مطابق مخصوص اسلحہ کو گھٹا بڑھا سکیں۔ بالائی حد کے تحت ہتھیاروں کی کل اور زیادہ سے زیادہ تعداد ۲۲۵۰ مقرر کی گئی اور ذیلی حد کے تحت مررڈ MIRRED (ایسے میزائیل جو بیک وقت ایک سے زیادہ ایٹمی ہتھیار لے جا سکتے ہیں) قسم کے ہتھیاروں کی تعداد کو ۱۳۲۰ فی فریق کی شرح پر منجمد کر دیا۔ اس میں کل ملا کر ۱۲۰۰ مررڈ زمین اور بحری میزائیل شامل تھے جبکہ ۱۲۰ کے قریب مسافت والے بمبار طیارے شامل تھے۔ ان بمبار طیاروں پر فضا سے فضا میں چھوڑے جانے والے کروز میزائیل نصب تھے۔ نیز زمینی میزائیل کی کل تعداد ۸۲۰ فی فریق مقرر کی گئی تھی۔ لطف یا افسوس کی بات یہ ہے کہ ان بالائی اور ذیلی حدود میں رہتے ہوئے فریقین نے اپنے پرانے ہتھیاروں کو ترک کر کے ان کی جگہ نئے اور زیادہ مہلک ہتھیاروں کو اختیار کرنے کا منصوبہ بنایا اور خاص طور پر پرانے قسم کے نان مررڈ میزائیل جن کی تعداد ۹۲۰ بنتی تھی بتدریج ختم کرنے کا فیصلہ کیا۔

یہ بھی سالٹ دوم کی ریاضی اور اعداد و شمار کی کہانی جس پر مکمل طور پر عمل درآمد موجودہ سال یعنی ۱۹۸۵ء تک ہوتا تھا۔ اس سے پہلے کہ امریکی کانگریس اس کی توثیق کرتی۔ دسمبر ۱۹۷۹ء میں افغانستان پر روس نے حملہ کر دیا اور سب کچھ دھرا کا دھرا رہ گیا الٹا ایٹمی اسلحہ کی دوڑ میں زبردست اضافہ ہونا شروع ہو گیا۔ روس نے یورپ میں اپنے درمیانی مار والے ایس ایس ۲۰ میزائیل نصب کرنا شروع کر دیئے اور امریکہ نے بیک وقت دس ایٹم بم لے جانے والے ایم ایکس میزائیل پر توجہ دینا شروع کر دی۔ ستم یہ ہے کہ اس خطرناک میزائیل کا نام امن دوست PEACE MAKER رکھا گیا یعنی جیسے زنگی کا نام کافور رکھ دیا جائے۔

۱۹۸۲ء میں صدر ریگن نے ایک بار پھر تخفیف اسلحہ کے لئے خواہشات کا اظہار کیا اس میں بھاری اور دور مار کرنے والے ہتھیاروں کے ساتھ ساتھ ۵۰۰ کلو میٹر سے کم مار کرنے والے چھوٹے ہتھیاروں کو بھی شامل کر لیا گیا۔ یہ مذاکرات نومبر ۸۳ء اور جنوری ۸۵ء میں جنیوا میں ہوئے

۱۱۔ تخفیف اسلحہ کے جنیوا مذاکرات
STRATEGIC ARMS REDUCTION TALKS (GENEVA)

یہ مذاکرات سالٹ اوّل اور دوم سے براہ راست تعلق رکھتے تھے ۱۹۷۲ء میں ساری بات چیت اینٹی بلاسٹک میزائیل کو محدود کرنے ایٹمی ہتھیاروں کی تعداد کو کم کرنے اور ایک دوسرے کے ہم پلہ رہنے کے لئے کیا اقدامات کرنے چاہیں پر محیط تھی۔ مگر حالیہ یعنی نومبر ۱۹۸۳ء کے اسٹارٹ مذاکرات میں دونوں ممالک نئی ترجیحات اور نئے نکات کے ساتھ سامنے آئے۔ اس میں امریکہ اسٹار وار کو ایک دفاعی پروگرام دے کر مذاکرات کے ایجنڈے سے خارج کرنا چاہتا تھا۔ جب کہ روس اس کو سودے بازی کا ایک سیب بنانا چاہتا تھا۔ کانفرنس سے صرف ایک دن پہلے روس کے صدر نے ایک بیان میں اسٹار وار کی سخت مذمت کی اور اعلان کیا کہ اس سے ایٹمی قوت میں جو عدم توازن پیدا ہو گیا ہے اس کے نتائج انتہائی خطرناک ہوں گے۔ اس لئے ایسے اقدامات کی ضرورت ہے کہ حربی عدم توازن کا بڑھتا ہوا یہ عمل یہیں رک جائے اور فضائے محیط ہتھیار بندی سے محفوظ رہے۔ مذاکرات میں روسی قیادت نے اعلان کیا کہ امریکہ ناٹو ممالک سے نئے میزائیل ہٹائے ورنہ تخفیف اسلحہ کے مذاکرات کا سلسلہ دوبارہ شروع نہیں ہو سکے گا امریکہ اور اس کے اتحادی اپنے موقف پر ڈٹے رہے کیونکہ روس نے ایس ایس ۲۰ کے میزائیل ۱۹۷۷ء میں ہی مشرقی یورپ کے ممالک میں نصب کر دیئے تھے۔ جن کا دائرہ کار ۸۰۰ سے ۱۰۰۰ کلومیٹر تھا۔ جبکہ امریکہ نے افغان بحران دسمبر ۱۹۷۹ء پر یورپ میں ۱۰۸ پرشنگ دوم میزائیل اور ۴۶۴ کروز میزائیل نصب کئے یہ مذاکرات کچھ طے کئے بغیر ہی ختم ہو گئے۔

ستمبر ۸۴ء میں صدر ریگن کی دعوت پر اعلیٰ سطحی رابطہ واشنگٹن میں دوبارہ قائم ہوا۔ گرومیکو اور صدر ریگن کے مابین کوئی ۲½ گھنٹے تک بات چیت ہوئی۔ دونوں رہنما ایک دوسرے پر الزام تراشیاں اور بالاتری ثابت کرنے کے چکر میں لگے رہے بہر حال دونوں قائدین کے مابین مصالحت آمیزہ لہجہ برقرار رہا۔

جنوری ۱۹۸۵ء کے پہلے ہفتے میں جنیوا میں چودہ گھنٹے کے طویل اور پیچیدہ مذاکرات کا سلسلہ شروع ہوا۔ جس میں طے پایا کہ آئندہ مذاکراتی وفود تین گروپوں میں تقسیم ہوں گے۔ جو درمیانی مار کرنے والے اسلحہ، دور مار کرنے والا اسلحہ اور خلائی اسلحہ پر الگ الگ گفت و شنید کریں گے۔ آئندہ اجلاس مارچ ۱۹۸۵ء کو ہونا تھا مگر ۱۱ مارچ کو صدر چرننکو کی موت کی وجہ سے یہ مذاکرات تعطل کا شکار ہو گئے۔

۱۲۔ جنیوا مذاکرات نومبر ۱۹۸۵ء:

نومبر ۱۹۸۵ء میں ایٹمی اسلحہ کی تخفیف کے مسئلے پر ریگن اور گورباچیف کے درمیان مذاکرات ہوئے اس میں صدر ریگن نے تجویز پیش کی۔ کہ

- ایٹمی میزائلوں کی تعداد ۶ ہزار سے زیادہ نہ ہو اور زمین سے مار کرنے والے میزائلوں کی تعداد ۳ ہزار ہونی چاہیئے لیکن اس میں مغربی یورپ میں نصب امریکی میزائل شامل نہیں ہوں گے۔
- امریکہ کی خواہش ہے کہ بین البراعظمی ایٹمی میزائلوں کی تعداد کم کی جائے۔ امریکہ کے پاس بین البراعظمی میزائلوں کی تعداد ۲۱۱۹ ہے جبکہ روس کے پاس ۶۴۰۰ ہے امریکہ اس بنا پر ۵۳ فیصد تخفیف کا مطالبہ کرتا ہے۔

اس کے جواب میں روسی قائد گورباچیف نے کہا۔

- ۶ ہزار ایٹمی میزائلوں میں وہ میزائل بھی شامل کئے جائیں جو مغربی یورپ میں نصب ہیں۔

۲۱ نومبر ۱۹۸۵ء کو جو مشترکہ اعلامیہ جاری ہوا اس میں کہا گیا کہ دونوں قائدین ایٹمی ہتھیاروں اور خلائی اسلحہ پر کنٹرول کے مذاکرات میں تیز رفتاری پیدا کرنے اور دونوں ملکوں کے تعلقات کو بہتر بنانے پر رضامند ہو گئے ہیں۔

۲۶ مئی ۱۹۸۶ء کو ایٹمی ہتھیاروں کی روک تھام کے سات سالہ پرانے غیر توثیق شدہ معاہدہ سالٹ دوم کو صدر ریگن نے ختم کرنے کا اعلان کیا۔ اسٹار وار کو تیز تر کرنے اور کیمیائی ہتھیاروں کو ۱۶ سال کی پابندی کے بعد دوبارہ بنانے کا ارادہ ظاہر کیا۔

۲۳ جولائی ۱۹۸۶ء کو جنیوا میں سالٹ دوم کے بارے میں امریکہ اور روس کے درمیان مذاکرات دوبارہ شروع ہوئے ۔ سیاسی مفکرین نے ان مذاکرات کو امریکہ اور روس کے مابین تخفیف اسلحہ کے معاہدے کا حصہ قرار دیا۔

۱۴۔ ایٹمی میزائلوں کے خاتمے کا معاہدہ:

INTERMEDIATE RANGE NUCLEAR FORCES TREATY.

امریکہ کے صدر رونالڈ ریگن اور سوویت یونین کے قائد میخائل گوربا چیف نے ۸ دسمبر ۱۹۸۷ء کو واشنگٹن میں درمیانے اور کم فاصلے تک مار کرنے والے ایٹمی میزائلوں کے خاتمے کے سمجھوتے پر دستخط کئے ۔ اس معاہدے کے مطابق ۳ سال میں وہ تمام ایٹمی میزائل تباہ کر دیئے جائیں گے جو ۳ میل سے ۳ ہزار میل کے فاصلے تک مار کر سکتے ہیں ۔ اس معاہدے کے تحت سوویت یونین ۱۵۰۰ ایٹمی میزائل اور امریکہ ۳۵۰ کروز اور پرشنگ میزائل تباہ کرے گا۔ امریکہ کے ۱۰۸ پرشنگ II میزائل مغربی جرمنی میں اور ۲۰۴ کروز میزائل جو اٹلی (۱۱۲) برطانیہ (۹۶) بلجیم (۱۶) اور مغربی جرمنی (۱۶) میں نصب ہیں ۔

روس کے ایٹمی میزائلوں میں ایس ایس ۲۰ تین وارہیڈ والے ایس ایس IV ایس ایس ۱X ، ایس ایس ۱XX اور ایس ایس XXIII ایک وارہیڈ والے شامل ہیں یہ میزائل روس کے اتحادی ممالک (یورپ اور ایشیا) میں نصب ہیں صدر ریگن نے اس معاہدہ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا یہ ایک مشترکہ قدم اور تاریخی سمجھوتہ ہے اور اس سے ایک اور سمجھوتے پر دستخطوں کی راہ ہموار ہو گی جس میں طویل فاصلے تک مار کرنے والے میزائلوں کی تعداد میں نصف کمی کی جائے گی ۔ روسی قائد مسٹر گوربا چیف نے کہا کہ درمیانے فاصلے تک مارنے والے ایٹمی میزائلوں کے خاتمے کا سمجھوتہ ایٹمی ہتھیاروں سے پاک دنیا کے مقصد کے حصول کے سلسلے میں پہلا قدم ہے ۔ انہوں نے مزید کہا کہ میں اور ریگن اپنا یہ فرض سمجھتے ہیں کہ نیک نیتی کے ساتھ مل کر ہتھیاروں کی جاری دوڑ ختم کرنے کی کوشش کریں ۔

COLD WAR

سرد جنگ سے مراد دو رقیب طاقتوں کے درمیان تعلقات کی کشیدگی ہے جسے بغیر کسی ہتھیار کے جاری رکھا جاتا ہے۔ سرد جنگ میں اجتماعی سلامتی کے معاہدے اقتصادی میدان میں بڑے پیمانے پر دوست ممالک کو امداد اور پروپیگنڈے کے ذریعے دوسری طاقت کا اثر و رسوخ کم کیا جاتا ہے۔

ابتداء:- بالشویک پارٹی کی سربراہی میں ۱۹۱۷ء میں مارکس کے نظریات پر مبنی دنیا میں پہلا اشتمالی انقلاب آیا تو یہاں سے ہی روس اور مغربی دنیا کے مابین نظریاتی جنگ کی ابتداء ہوتی ہے۔ اس انقلاب کو یورپین ممالک مسلسل تین سال تک ناکام بنانے کی کوشش کرتے رہے انہوں نے لاتعداد آدمی روس بھیجے لیکن انقلابی بالآخر انہیں ملک سے باہر نکالنے میں کامیاب ہو گئے۔ انہوں نے اپنے مخالفین کو سرمایہ دار، بورژوائی اور سامراجی وغیرہ کے خطابات سے نوازا اور انہیں عالمی مسائل کا ذمہ دار ٹھہرایا۔

دوسری عالمی جنگ کے بعد روس اور امریکہ دو بڑی طاقتیں ابھر کر سامنے آئیں جنگ میں حالانکہ دونوں طاقتیں اتحادی کیمپ میں شامل تھیں لیکن یہ صرف مقاصد کے حصول کے لئے اتحاد کیا گیا یعنی ہٹلر کو شکست دینا۔

وجوہات:-

۱- دوسری جنگ کے دوران اسٹالن نے اتحادیوں پر الزام لگایا کہ ہٹلر کے حملے کے بعد اتحادیوں نے اپنی فوجیں بھیجنے میں تاخیر کی۔ اسٹالن کا خیال تھا کہ امریکہ چاہتا ہے کہ ہٹلر مکمل طور پر روس پر قبضہ کر لے۔

۲- اقوام متحدہ کی تشکیل و ساخت سے متعلق بھی روس کو اعتراض تھا۔

۳- دوسری جنگ عظیم میں جس وقت جاپان نے جنرل میک آرتھر کے سامنے ہتھیار

ڈالے تو روس کا مطالبہ یہ تھا کہ اس کی فوج کو بھی جاپان میں رہنے کی اجازت دی جائے۔ اس مسئلے پر بھی امریکہ اور روس میں شدید شک وشبے پیدا ہوئے۔

۴۔ پولینڈ اور جرمنی کی حکومت، سرحدوں کا تعین اور تاوان سے متعلق چند امور پوٹسڈیم کانفرنس میں طے کر لئے گئے تھے لیکن روسی قائدین چاہتے تھے کہ روسی مفادات کو مدنظر رکھا جائے چونکہ روس فوجی اور اقتصادی لحاظ سے امریکہ کے مقابلے میں کمزور تھا۔ جس کی وجہ سے روس اپنی افواج کو یورپ سے واپس نہیں بلانا چاہتا تھا۔ جبکہ امریکہ کا اصرار تھا کہ روس اپنی فوج واپس بلائے۔ روس پولینڈ میں اشتراکی حکومت کا قیام چاہتا تھا جبکہ امریکہ جلاوطن نمائندوں کو حکومت میں شامل کرتے ہوئے انتخابات چاہتا تھا۔ جرمنی سے روس بڑے پیمانے پر تاوان کی رقم وصول کرنا چاہتا تھا جبکہ مغربی یورپ کے ممالک اور امریکہ اتنی بھاری رقم وصول کرنا مناسب نہیں سمجھتے تھے۔

۵۔ جنگ عظیم دوئم کے بعد جرمنی کو چار زونوں میں تقسیم کیا گیا۔ اس سلسلے میں امریکہ برطانیہ فرانس اور روس نے ایک مرکزی کمان قائم کی۔ اس مرکزی کمان نے طے پایا کہ جرمنی کی انتظامی تقسیم کی جائے نہ کہ سیاسی تقسیم اور تمام زونوں کے لئے یکساں پالیسی اختیار کی جائے روس نے بعد میں اس پالیسی سے بھی انحراف کیا اور روس جرمنی کے خلاف سخت گیر پالیسی کا قائل تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ روس کو جرمنی سے خوف تھا کہ کہیں جرمنی دوبارہ طاقت میں آ کر روس پر حملہ نہ کر دے۔ اس لئے روس اس پر شدید قسم کی شرائط عائد کرنا چاہتا تھا۔

یہ وہ عوامل تھے جنہوں نے جنگ کے دوران اور بعد میں روس اور امریکہ کے درمیان اختلافات کو ہوا دی۔ اب جنگ کے بعد کے حالات میں سرد جنگ کا جائزہ لیا جائے گا۔

۱۔ مشرقی یورپ میں اشتراکی حکومتوں کا قیام

روس نے مشرقی یورپ میں سب سے پہلے رومانیہ میں اپنی حکومت قائم کی۔ اس کے بعد بلغاریہ، ہنگری، چیکو سلواکیہ، یوگوسلاویہ میں کمیونسٹ عناصر

برسراقتدار آئے۔ پولینڈ پر روس کا اثر ورسوخ ۵۰ ہزار تھا اس میں مغربی ممالک انتخابات کے ذریعے آزاد حکومت قائم کرنا چاہتے تھے۔ روس نے اس معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے وہاں کمیونسٹ حکومت قائم کی اور مشرقی یورپ میں اپنی پوزیشن مستحکم کرلی۔

روس کا ایسا کرنے کی دو وجوہات تھیں اوّل تو یہ کہ وہ واحد کمیونسٹ ملک تھا اور اسے اپنے حلیفوں کی ضرورت تھی تاکہ اقوام متحدہ میں اس کے حلیفوں کا اضافہ ہوسکے۔

دوئم یہ کہ امریکہ ایٹمی میدان میں روس سے برتر حیثیت رکھتا تھا اسٹالن کو یہ خیال اکثر تنگ کیا کرتا تھا کہ کسی بھی وقت ماسکو اور لنین گراڈ امریکی ایٹمی حملے کا شکار ہوسکتے ہیں۔ روس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ بھی ایٹمی دھماکہ کرے۔ چنانچہ اسٹالن کی کوششوں سے ۱۹۴۹ء میں ہی پہلا ایٹمی دھماکہ کرتے ہوئے ۱۹۵۴ء تک اپنی پوزیشن امریکہ کے ہم پلہ کرلی۔

امریکہ کی جوابی کارروائی

POLICY OF CONTAINMENT

اشتراکیت کے گھیراؤ کے لئے امریکہ نے تین اہم اقدامات کئے۔

۱۔ ٹرومین ڈاکٹرین۔

۲۔ مارشل پلان۔

۳۔ ناٹو کا قیام۔

۱۔ نظریہ ٹرومین: نظریہ ٹرومین مارچ ۱۹۴۷ء میں پیش کیا گیا۔ اس کے تحت یورپ کے دو غیر کمیونسٹ ملکوں یونان اور ترکی کو بڑے پیمانے پر امریکہ کی طرف سے فوجی اور اقتصادی امداد فراہم کی گئی۔ ان دونوں ممالک کی سلامتی کو امریکہ نے بہت اہم تصور کیا۔ چونکہ ان دونوں ممالک کو کمیونسٹ عناصر سے خطرے کا سامنا تھا۔ حکومت ترکی کو روس دھمکی دے چکا تھا کہ بحیرہ روم میں بھی روسی تسلط قائم کیا جائے روس اس خطے میں اپنی پوزیشن مستحکم کرنا چاہتا تھا۔ ۱۹۵۰ء میں ہی امریکی امداد کی وجہ سے یہ چیز واضح ہوگئی تھی کہ ان ممالک کے

حالات بدل گئے ہیں اور وہاں پر امن وسکون قائم ہو گیا۔

۲۔ مارشل پلان:۔ امریکہ کی طرف سے کمیونسٹ گھیراؤ کی پالیسی کے تحت ٹرومین ڈاکٹرین کے تین ماہ بعد جون ۱۹۴۷ء کو مارشل پلان کا اعلان کیا گیا اس منصوبے کا مقصد اشتراکیت کو روکنے کے لئے ترقی پذیر ممالک کی امداد کرنا تھا۔ امریکہ نے تین سال میں ۱۰ ہزار ملین ڈالر کی مغربی ممالک کو امداد دی۔ جس سے اشتراکی پھیلاؤ کی رفتار کم ہو گئی۔

۳۔ ناٹو کا قیام:۔ اسی پالیسی کے تحت اپریل ۱۹۴۹ء کو اجتماعی تحفظ کی خاطر ایک دفاعی معاہدے کا قیام عمل میں آیا۔ اس میں اس وقت کل ۱۵ ارکین شامل ہیں۔ اس معاہدے کے مقاصد میں اقتصادی ترقی تجارتی ترقی سیاسی تعلقات میں اضافہ، دفاعی ترقی اور مغربی تہذیب کی احیا بھی شامل ہے۔ یہ پہلا موقعہ تھا جب مغربی ممالک ایک دفاعی تنظیم بنانے کے لئے رضامند ہوئے جس میں امریکہ اور کینیڈا غیر یورپی ممالک بھی شامل تھے۔ مغربی ممالک امریکی ایٹمی برتری کی بدولت عالمی سیاست میں توازن پیدا کرنے کے لئے امریکہ کے زیر اثر ناٹو کی تنظیم قائم کرنے پر متفق ہو گئے تھے۔ اس معاہدے کے قیام کی اصل وجہ یہ تھی کہ روسی فوج مشرقی یورپی ممالک سے واپس نہیں جا رہی تھی جبکہ امریکہ نے اپنی فوج کو واپس بلا لیا تھا۔ اس سے مغربی ممالک کی دفاعی پوزیشن بھی کمزور ہو گئی تھی۔

سرد جنگ میں شدت

ناٹو کے قیام کے ساتھ ہی یورپ دو فوجی کیمپوں میں بٹ گیا جس سے دونوں گروپوں کے مابین سرد جنگ نے شدت اختیار کر لی۔ امریکہ نے اقوام متحدہ کے تحت ہونے والے بین الاقوامی جوہری توانائی کمیشن کے اجلاس میں تجویز پیش کی کہ ممبر ممالک کی ایٹمی پالیسی اور ایٹمی توانائی پر کنٹرول کیا جائے اور ان پر نگرانی کے لئے ایک آزاد توانائی ایجنسی قائم کی جائے جو اقوام متحدہ کے دائرے سے

یاہر رہ کر کام کرے ایجنسی کے قیام کے بعد امریکہ نے اس بات کا یقین دلایا کہ وہ اپنے ایٹمی ہتھیار تباہ کر دے گا اور مزید اسلحہ سازی نہیں کرے گا لیکن روس کی طرف سے اس تجویز کی شدید مخالفت ہوئی۔

اس کی دو وجوہات تھیں۔

ا۔ روس کا خیال تھا کہ امریکہ ایٹمی برتری برقرار رکھنا چاہتا ہے۔ چونکہ امریکہ کے پاس ایٹمی اسلحہ کی ٹیکنالوجی ہے اور روس ابھی اس سلسلے میں تجرباتی مرحلے سے گزر رہا ہے جس کی وجہ سے امریکی برتری برقرار رہے گی۔

۲۔ ایجنسی کی مخالفت کی وجہ یہ تھی کہ اگر ایجنسی اقوام متحدہ کے دائرہ اختیار سے باہر رہ کر کام کرے گی تو اس میں سرمایہ دار ممالک کی اکثریت ہو گی جس سے بعض منفی فیصلے بھی روس پر ٹھونپے جائیں گے یا جا سکتے ہیں۔ چنانچہ روسی وزیر خارجہ گرومیکو نے یہ تجویز پیش کی کہ تمام ممبر ممالک سلامتی کونسل کے تحت بین الاقوامی ایٹمی ادارے کا قیام عمل میں لائیں۔ گرومیکو کا مقصد یہ تھا کہ اس طرح سے روس کو ویٹو کا اختیار مل جائے گا چنانچہ اس وجہ سے روس اقوام متحدہ سے باہر رہ کر کام نہیں کرنا چاہتا تھا۔

دونوں ممالک کے مابین اختلافات کی وجہ سے بین الاقوامی توانائی کے ادارے کا اجلاس ملتوی ہو گیا۔ روسی رویئے سے امریکی حکومت کو یقین ہو گیا کہ روس سے کسی قسم کے تعاون کی امید نہیں رکھنی چاہیئے۔ دوسری طرف روس کے جو شبہات امریکہ سے متعلق تھے ان کو بھی مزید تقویت ملی اس طرح دونوں ممالک کے درمیان اختلافات کی جو خلیج حائل تھی وہ مزید وسیع ہو گئی۔

سرد جنگ کا پھیلاؤ:۔ دوسری عالمی جنگ میں جاپان کو کوریا میں روس اور امریکہ کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ جس سے شمالی حصے پر روسی اور جنوبی حصے پر امریکی فوج قابض ہو گئی۔ یہ حد بندی انتظامی تھی لیکن سرد جنگ کی شدت نے کوریا کو مستقل طور پر دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ حد بندی کے وقت دونوں فوجوں کا مقصد ایک مرکزی حکومت کا قیام تھا اختلافات کی وجہ سے امریکہ اس مسئلے کو سلامتی کونسل میں لے گیا۔ چنانچہ سلامتی کونسل کی تحقیقاتی

کمیٹی کے تحت جنوبی کوریا میں تو انتخابات ہوئے لیکن شمالی کوریا میں روس نے اقوام متحدہ کی نگرانی میں انتخابات کی اجازت نہ دی اور وہاں کمیونسٹ حکومت قائم کر دی ۱۹۴۸ء میں دونوں ممالک کی فوجیں واپس بلالی گئیں۔

کوریا کی جنگ ۱۹۵۰ء:۔ شمالی کوریا نے کوریا کو متحد کرنے کے لئے جنوبی کوریا کو دو تجاویز پیش کیں اول یہ کہ عام انتخابات کرائے جائیں دوئم دونوں حصوں کی اسمبلیوں کو ایک دوسرے میں ضم کر دیا جائے۔ یہ دونوں تجاویز جنوبی کوریا کے لئے قابل قبول نہ تھیں چنانچہ پروپیگنڈے میں شدت پیدا ہوئی اور شمالی کوریا نے اپنی مہم کی ناکامی کو محسوس کرتے ہوئے جنوبی کوریا پر حملہ کر دیا۔ یہ جنگ امریکی کمزوری اور روس کی حمایت کی وجہ سے ہوئی۔ امریکہ نے جنگ بندی کے لئے شمالی کوریا کے خلاف سلامتی کونسل میں قرارداد پیش کی اور منظور کروالی کیونکہ روس اس وقت کونسل میں موجود نہ تھا بلکہ قوم پرست چائنا کی نشست کی وجہ سے اس نے اقوام متحدہ کا بائی کاٹ کیا ہوا تھا۔ جبکہ امریکہ اشتراکی چین کو تسلیم نہیں کرتا تھا۔ شمالی کوریا نے قرارداد کی پرواہ نہ کرتے ہوئے جنگ جاری رکھی۔

ان حالات میں امریکہ نے سلامتی کونسل میں دوسری قرارداد منظور کروا کر اقوام متحدہ کی امن فوج کو جنوبی کوریا کی حمایت میں بھیج دیا اور یہ قرارداد بھی روس کی عدم موجودگی کی وجہ سے منظور ہو گئی۔ جس سے روس کو احساس ہو گیا کہ اس تنازعے میں بڑی طاقتوں کو شامل نہیں ہونا چاہیئے قرارداد کے منظور ہوتے ہی امریکہ برطانیہ آسٹریلیا فرانس اور ترکی نے اپنے فوجی دستے اقوام متحدہ کی نگرانی میں جنوبی کوریا بھیج دیئے۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ اقوام متحدہ کی امن فوج کو جنرل میک آرتھر کی سربراہی میں جنوبی کوریا بھیجا گیا۔ جنرل میک آرتھر جنوبی کوریا کے علاقے واپس لینے کے بعد چین سے کمیونسٹ حکومت ختم کرنا چاہتا تھا۔ جس سے چین براہ راست جنگ میں ملوث ہو گیا۔ اور اب یہ جنگ چین اور امریکہ کے مابین لڑی جانے لگی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ تیسری عالمی جنگ شروع ہو گئی ہے۔ لیکن ابھی دوسری عالمی جنگ کو ختم ہوئے تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا جس کی وجہ سے امریکہ اپنے آپ کو جنگ میں ملوث نہیں کرنا چاہتا تھا۔ جنرل میک آرتھر کو مستعفی ہونے پر مجبور کیا گیا

اور امریکہ نے چین کے ساتھ ۱۹۵۳ء کو جنگ بند کر لی۔ اس جنگ کی بدولت سرد جنگ یورپ سے نکل کر ایشیا میں بھی پھیل گئی جس سے امریکہ کو دو طرفہ اور کثیر طرفہ معاہدے کرنے پڑے معاہدہ انزوز سیٹو سینٹو اس سلسلے کی کڑیاں ہیں جرمنی بھی کوریا کی جنگ سے متاثر ہو کر ناٹو کا ممبر بن گیا کہ کہیں مشرقی جرمنی کی طرف سے ایسا کوئی اقدام نہ ہو جائے۔

امریکہ کا جاپان اور جنوبی کوریا سے معاہدہ:۔ امریکہ نے ۱۹۵۱ء میں جاپان اور جنوبی کوریا سے الگ الگ معاہدہ کیا۔ جس سے امریکہ کی فوج اور فضائی اڈے ان دونوں ممالک میں موجود رہے۔ ابھی بھی امریکہ کی ۴۵ ہزار فوج جنوبی کوریا میں موجود ہے اور جاپان نے امریکہ کو اجازت دی ہوئی ہے کہ وہ ان اڈوں میں ایف۔۱۶ طیارے تک رکھ سکتا ہے۔

روس کی جوابی کارروائی:۔ روس نے اس کے جواب میں چین ہندوستان اور افغان کے ساتھ اپنے تعلقات میں اضافہ کیا۔ پاکستان کی سیٹو اور سینٹو میں شمولیت کی وجہ سے بھارت میں کشمیر کی حمایت اور افغانستان میں پختونستان کا اعلان کیا۔ ۱۹۵۶ء میں ہند چینی جنگ کا خاتمہ ہوا اس کے بعد ویت نام میں جو کمیونسٹ عناصر موجود تھے چین اور روس کی طرف سے ان کی حوصلہ افزائی کی گئی اور ۱۹۵۶ء سے لے کر ۱۹۶۰ء تک ہند چین کی روس حمایت کرتا رہا۔

سرد جنگ میں کمی:۔ کوریا کی جنگ کی وجہ سے سرد جنگ جو یورپ سے نکل کر ایشیا تک پھیل گئی تھی اس کے باعث دونوں ملکوں کے تعلقات میں ۱۹۵۵ء تک کشیدگی رہی لیکن جنیوا کانفرنس ۱۹۵۵ء میں امریکہ روس اور برطانیہ کے نمائندوں کو مشترکہ طور پر گفت و شنید کرنے کا موقعہ ملا اس کانفرنس کا مقصد تو تخفیف اسلحہ اور جرمنی کو دوبارہ متحد کرنا تھا جس میں کوئی خاص کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ بہر حال روس نے آسٹریا سے فوج واپس بلالی اور خروشیف نے امریکی

صدر آئزن ہاور سے واشنگٹن میں ملاقات کے دوران خروشیف نے امریکی صدر کی ایٹمی قوت سے متعلق تجاویز کو قبول کر لیا۔

اگر ۱۹۵۵ء کے بعد روس اور امریکہ کے تعلقات کا جائزہ لیا جائے تو اس میں صاف نظر آتا ہے کہ ان دونوں ممالک نے آپس میں پرامن بقائے باہمی PEACEFUL CO-EXISTENCE کی پالیسی کا آغاز کیا ہے اس کی وجوہات مندرجہ ذیل ہو سکتی ہیں۔

۱۔ دونوں ممالک کے پاس انتہائی طاقت ہے جس کی وجہ سے ان میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کو تباہ و برباد نہیں کر سکتا۔ دوسرا یہ کہ نظریاتی پروپیگنڈے میں بھی کوئی زیادہ جاذبیت نہیں رہی کیونکہ بلاک پہلے ہی بن چکے ہیں۔ تاہم معاشی میدان اور حلقہ ہائے اثر بڑھانے کے سلسلے میں ان ممالک کے درمیان اب بھی مقابلہ جاری ہے۔

۲۔ مشرقی یورپ میں ۱۹۵۵ء میں روس کے تسلط کے خلاف مزاحمت کا آغاز ہوا اور ۱۹۵۶ء میں اس میں شدت پیدا ہونا شروع ہو گئی۔ مشرقی برلن ہنگری رومانیہ اس مزاحمت میں پیش پیش رہے چنانچہ خروشیف کو اس بات کا خطرہ تھا کہ اگر مغرب کے ساتھ تعلقات استوار نہ کئے تو مغرب اس چیز کو اس کے خلاف استعمال کرے گا۔

۳۔ ۱۹۵۳ء میں روس ایٹمی میدان میں بھی امریکہ کا ہم پلہ ہو چکا تھا۔ جس سے روس کو ایٹمی برتری کے سلسلے میں جو تشویش تھی وہ کم ہو گئی۔ اس طرح جب روس کا خوف دور ہوا تو اختلافات بھی کم ہو گئے۔

۴۔ کمیونزم تحریک ۱۹۵۵ء تک ایشیا میں کافی کامیابی حاصل کر چکی تھی جس سے روس تنہا نہیں رہا تھا ایک طرف چین تھا اور دوسری طرف ہند چین میں کمیونسٹ عناصر کا غلبہ تھا سیٹو سے تعلقات استوار ہو چکے تھے۔ معاہدہ وارسا (مئی ۱۹۵۵ء) کی تنظیم قائم ہو چکی تھی۔ اس وجہ سے روس کو جارحیت کی پالیسی یا نفرت کے ساتھ عدم تعاون کی پالیسی کو جاری رکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔

یہی وجہ ہے کہ ۱۹۵۵ء کے بعد اس میں بتدریج کمی واقع ہوئی۔

۵۔ چین کا عالمی طاقت بن جانے کے بعد ۲ قطبی سیاست سہ قطبی سیاست میں تبدیل ہو گئی اور اب چین بھی اپنا دائرہ اختیار بڑھانے کی کوشش کر رہا ہے۔ ترقی پذیر ممالک کو امداد دے رہا ہے۔ روس سے چین کے تعلقات ۱۹۶۰ء سے کشیدہ آرہے ہیں اب ان میں بھی بہتری آنی شروع ہو گئی ہے چین امریکہ سے تعلقات استوار کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اپریل ۱۹۸۴ء میں امریکی صدر ریگن نے چین کا دورہ بھی کیا۔ جس سے تجارتی اور دوستی کے معاہدے بھی ہوئے جولائی ۱۹۸۵ء میں چین کے صدر لی شیان نیان نے امریکہ کا دس روزہ دورہ کیا۔ دونوں ملکوں کے درمیان ایٹمی تعاون کے ایک سمجھوتے پر بھی دستخط ہوئے اس معاہدے کی بدولت ۲ ارب ڈالر کا سامان امریکہ چین کو برآمد کر سکے گا جنگ معاشی دوڑ کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ جس سے سیاسیات عالم میں اپنے مال کی کھپت کے لئے منڈیاں اور حلقہ اثر میں اضافہ کیا جا رہا ہے۔

۶۔ واشنگٹن اور ماسکو کے درمیان نئے تعلقات کا مظاہرہ مئی ۱۹۸۸ء میں اس وقت ہوا۔ جب صدر ریگن نے ماسکو کا دورہ کیا اور روسیوں کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کیا۔ صدر ریگن نے واپس واشنگٹن پہنچ کر کہا۔ یہ دوسری عالمی جنگ کا خاتمہ ہے۔ ماسکو پریس نے اسے بین الاقوامی تعلقات میں ایک بالکل نئی وابستگی قرار دیا اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دونوں ملکوں کے درمیان علاقائی تنازعات کو حل کرنے کا رجحان پیدا ہوا ہے۔ اور ایسا اس وقت ہوا جب ماسکو اور واشنگٹن دونوں نے اس نظریہ کو اپنا لیا ہے کہ ہماری دنیا دو سے زائد قطبین ہے اور ہماری دنیا کے بہت سے رخ ہیں۔ اور وہ اندرونی طور پر ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔

مگر طاقتوں نے اگرچہ اپنے درمیان تعلقات استوار کر کے سرد جنگ کو ختم کر دیا ہے۔ مگر تیسری دنیا میں وہ آج بھی اپنے نمائندوں (چیلوں) کو بھاری سیاسی، اقتصادی اور فوجی امداد دے کر برسر اقتدار رکھنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ سرد جنگ کے مکمل خاتمے کے لیے ضروری ہے کہ تیسری دنیا کے ممالک کے تنازعات میں حصہ

لینے کے لیے فوج بھیجنے سے گریز کیا جائے اور ان کے نظریاتی اختلاف کو کم کرنے کی کوشش کی جائیں۔ تیسری دنیا پر دائیں اور بائیں بازو جیسے بہت سے لیبل چسپاں کیے جاتے ہیں۔ حالانکہ تیسری دنیا کی حکومتوں کا مقصد صرف اپنے مقاصد کے حصول کے لیے اپنے عوام پر ظلم کر کے برسراقتدار رہنا ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر روسیوں نے افغانستان میں بائیں بازو پر تنقید کی اور امریکہ نے چلی میں دائیں بازو پر تنقید کی۔ اس طرح بڑی طاقتوں کو ظاہری اتفاق رائے کے باوجود ایک اہم اور بنیادی مسئلے سے نمٹنا ہے اور وہ ہے تیسری دنیا کو بلاک سیاست سے نکالنا ــــ ایک ایسی عالمی برادری قائم کرنا ــــ جہاں تمام ممالک کے حقوق کی حفاظت ہو اور استحصال سے پاک عالمی معاشرہ قائم ہو جہاں نہ تنازعات ہوں نہ تصادم ہو۔ انسان کی تخلیق خالق حقیقی نے یقیناً ایسی ہی دنیا کے لیے کی تھی۔

افروایشیائی قومی ریاستیں

AFRO-ASIAN NATIONAL STATES

افروایشیائی ریاستوں کے پس منظر میں جاتے سے پتہ چلتا ہے کہ دنیا کا یہ خطہ ہمیشہ استحصال کا شکار رہا ہے۔ سیاسی عدم استحکام معاشی حالات میں کہیں توازن اور کہیں عدم توازن رہا ہے۔ پندرہویں صدی سے لے کر موجودہ صدی کے نصف تک ایشیاء و افریقہ کے علاقے سامراجیت کا شکار رہے اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ یہاں غربت اور ناخواندگی تھی۔ یہاں بادشاہتیں، شخصی آمریت یا پھر مذہبی و نسلی برتری کے اصولوں کے تحت حکومتیں قائم رہیں۔ سیاسی نظام حیات و معاشرت میں ایک طرح کا جمود طاری تھا۔ سادگی اور محنت کشی زندگی میں بنیادی حیثیت رکھتے تھے۔

یورپ کو صنعتی انقلاب کے بعد خام مال اور توسیع پسندی کے لئے ان علاقوں کی ضرورت تھی۔ اہل مغرب نے جدید اسلحہ اور ٹیکنالوجی کی بدولت جو فوجی قوت میں اضافہ کرلیا تھا۔ اس کی بنیاد پر اپنی سرحدوں سے دور ایشیاء افریقہ اور لاطینی امریکہ میں اپنی نوآبادیات قائم کیں۔ کہیں طاقت استعمال کی گئی اور کہیں امداد قرضہ و تجارت کے بہانے ایشیاء و افریقہ کے ممالک کو آزادی سے محروم کردیا۔

برطانیہ نے مصر، سنگاپور، ملایا، ہانگ کانگ اور دوسرے چھوٹے چھوٹے جزائر پر قبضہ کیا جبکہ فرانس نے ہند چینی انام، لاؤس، کوچین، کمبوڈیا، ٹونگنگ۔ تیونس اور مراکش پر انڈونیشیا پر ولندیزی حکمران اور فلپائن پر امریکہ قابض ہوگیا ہندوستان جو برطانوی شہنشاہیت کا ایک قابل فخر علاقہ تھا یہاں تک پہنچنے کا راستہ بڑا اہم تھا اور یہ راستہ صرف اس وقت محفوظ رہ سکتا تھا جب مصر اردن عراق اور خلیج فارس اس کے ہاتھوں میں محفوظ ہو۔ دوسری طرف شمال مغرب کی طرف سے ہندوستان کو روس کا خطرہ لاحق تھا۔ چنانچہ افغانستان کی جنگیں اسی

سلسلے کی کڑی تھیں۔

۱۸۵۰ء تک اہل مغرب افریقہ کے اہم مقامات کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے مگر ۱۹۰۰ء تک افریقہ کا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ یورپی ممالک کی آپس میں سخت مخالفت کے باوجود تمام افریقہ کو اچھی طرح ناپا اور تقسیم کیا جا چکا تھا۔ اسی چھینا جھپٹی میں وہاں کے اصل باشندوں کی کچھ پروا نہیں کی گئی۔ ان لوگوں کے ساتھ اتنے مظالم کئے گئے جن کو سن کر آج کے نوجوان یقین نہیں کر سکتے۔

یہ سب کچھ ربڑ، کوئلہ، ناریل، کپاس، سونے اور ہیرے کی کانوں پر قبضہ کرنے کے لئے کیا گیا۔ بلجیم نے کانگو، جرمنی نے مشرقی افریقہ، فرانس نے مدغاسکر اور اٹلی نے سومالی لینڈ کو اپنی نو آبادیات بنایا۔ اس طرح ضرورت اور لالچ نے یورپ کو بندوق کے ذریعے تیسری دنیا کو تقسیم کرنے پر مجبور کیا۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد اگرچہ یہ ممالک یکے بعد دیگرے آزاد ہونے شروع ہو گئے تھے مگر ان علاقوں کو ابھی تک سیاسی استحکام نصیب نہیں ہوا۔ ان علاقوں میں بے شمار نسلوں ثقافتوں اور مذاہب کے لوگ رہتے ہیں جو غربت اور جہالت کی وجہ سے اکثر بحرانی کیفیت کا شکار ہیں۔

افروایشیائی ریاستوں پر نوآبادیاتی غلامی کے اثرات:۔

افروایشیائی ریاستوں پر صدیوں کی نو آبادیاتی غلامی کی وجہ سے حسب ذیل اثرات مرتب ہوئے۔

۱۔ نو آبادیاتی غلامی کی وجہ سے ان علاقوں میں صنعتی ترقی بالکل نہیں ہوئی کیونکہ یہاں سے خام مال یورپ اور امریکہ کو جایا کرتا تھا۔ انگریز اس بات سے واقف تھے کہ ایک نہ ایک دن ہمیں یہاں سے واپس جانا ہے۔ اس وجہ سے انہوں نے ان خطوں کی صنعتی ترقی پر بالکل توجہ نہ دی صرف اتنی سڑکیں اور عمارتیں تعمیر کیں جو ان کے رہنے سہنے کے لئے بہت ضروری تھیں۔ اس کا اثر یہ پڑا کہ آزادی کے بعد نئی حکومتوں کے لئے محدود وسائل سے عوام کی معاشی ضروریات کو پورا کرنا ایک بہت بڑا مسئلہ بن گیا۔

۲۔ صدیوں کی غلامی نے ان لوگوں کو اتنا جذباتی بنا دیا، کہ یہاں کے عوام اکثر علاقائی، نسلی، قومی اور طبقاتی کشمکش کا شکار رہتے ہیں۔ جس کی وجہ سے ان ریاستوں کو سیاسی استحکام نصیب نہیں ہوتا۔ جمہوری اداروں کے استحکام اور تعلیمی ترقی کے لئے اگر بڑی طاقتیں اقتصادی امداد اور قرضے وغیرہ فراہم کرتی ہیں لیکن دوسری طرف یہی بڑی طاقتیں اپنی ریشہ دوانیوں اور مفادات کی وجہ سے ان ریاستوں کو استعمال کرتی ہیں۔

۳۔ سامراجی قوتوں کا نافذ کردہ نظام تعلیم نے ان ممالک کی نوجوان نسل پر منفی اثرات ڈالے۔ انگریزوں کے نظام تعلیم کا مقصد صرف کلرکوں اور فرمانبرداروں کی ایک فوج تیار کرنا تھا اس میں وہ اپنے مقاصد میں کامیاب رہے آزادی دینے کے بعد بھی ایسے کارندے چھوڑ گئے جو انہی کی تقلید کرنا چاہتے ہیں اگر آج یہ افرو ایشیائی ریاستیں جسمانی طور پر آزاد بھی ہو چکی ہیں تو ان سے کی اکثریت ابھی تک ذہنی طور پر غلام ہے۔

۴۔ نوآبادیاتی غلامی کی وجہ سے ان خطوں کا معاشرتی نظام درہم برہم ہو گیا ہے نظام معاشرت اخلاقیات مذہب اقتصادیات ثقافت رسم و رواج اور سب سے بڑھ کر اتحاد اور یکجہتی کے احساسات ایسی دو رخی راہ اختیار کر چکے ہیں کہ زندگی کے توازن کا شیرازہ بکھر گیا ہے۔ سماجی لحاظ سے تمام افراد دو طبقوں میں تقسیم ہو چکے ہیں ایک رجعت پسند CONSERVATIVE اور دوسرا ترقی پسند RADICAL قوم کا پڑھا لکھا طبقہ ترقی پسندی کے زمرے میں آتا ہے جبکہ پرانے خیالات اور صدیوں پرانے رسم و رواج کا قائل طبقہ رجعت پسند کہلاتا ہے ان دونوں طبقوں میں باہمی کشمکش کی وجہ سے قومی زندگی پر منفی اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ جس کی وجہ سے یہاں کی قومی زندگی میں سیاسی انتشار رہتا ہے۔

۵۔ افرو ایشیائی ممالک کی آزادی کے وقت سرحدیں اس طرح مقرر کی گئیں کہ انہیں آزادی حاصل کرنے کے بعد اپنی علاقائی خود مختاری اور قومی سلامتی کے تحفظ کے لئے اپنے ملک کے وسائل کا ضرورت سے زیادہ حصہ دفاعی ضروریا

پر خرچ کرتا پڑ رہا ہے۔ اور ان کی سلامتی کے لئے ضروری ہو گیا ہے کہ کسی بڑی طاقت کا حلیف بن کر رہیں۔

۶۔ دورِ غلامی میں ان علاقوں کے ذرائع نقل و حرکت و مواصلات کے نظام بہتر بنانے کے لئے کوئی خاطر خواہ قدم نہیں اٹھایا گیا جس کی وجہ سے آزادی حاصل کرنے کے فوراً بعد ان ریاستوں کے لئے ضروری ہو گیا کہ بڑی اور طاقتور ریاستوں سے امداد اور قرضہ جات حاصل کریں۔ معاشی ترقی، ملکی سالمیت، بیماریوں و تباہ کاریوں سے بچانے کے لئے تعلیم و ترسیل کی ترقی کے لئے ان نو آزاد ریاستوں کو کسی نہ کسی بڑی ریاست کا حلیف بننا پڑا۔

۷۔ نو آبادیاتی غلامی کی وجہ سے ان ریاستوں کو آزادی کے بعد سیاسی انتشار، معاشی عدم استحکام معاشرتی منفی تحریکیں اور سینکڑوں چھوٹے موٹے مسائل مل کر ان ریاستوں کی قومی زندگی پر اس طرح پھیل گئے جس سے ان کی ترقی کی رفتار بری طرح متاثر ہوئی۔ بین الاقوامی تعلقات میں ان ریاستوں کی حیثیت صرف بڑی ریاستوں کی حلیف بن کر رہ گئی۔ اس طرح یہ ریاستیں عالمی سیاسیات میں بڑی ریاستوں کی آلہ کار کی حیثیت سے سرگرم نظر آتی ہیں ان ہی وجوہات کی بنا پر بڑی طاقتیں ان ریاستوں کے داخلی معاملات سے لے کر بیرونی معاملات تک بالواسطہ اور بلاواسطہ ملوث نظر آتی ہیں۔

۸۔ ۱۹۴۵ء میں انجمن اقوامِ متحدہ کی تشکیل کے بعد ان ریاستوں کو مقتدرانہ حیثیت سے اس کا ممبر بنایا جاتا رہا ہے لیکن بلاک سیاست کے چکر میں ان ریاستوں نے اپنی مقتدرانہ حیثیت بھی کھو دی۔ اس وقت ان کی حیثیت ایک زندہ لاش کی سی ہے۔ جس میں خون کی کمی ہے۔ موجودہ عالمی حالات کا تجزیہ کرنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اگر یہ ریاستیں اپنی انفرادیت کو برقرار رکھنا چاہئیں بھی تو اس میں ان کا کامیاب ہونا مشکل نظر آتا ہے کیونکہ ظالم اور مظلوم ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔

عالمی برادری میں افروایشیائی ریاستوں کا کردار!

ROLE OF AFRO-ASIAN STATES IN INTERNATIONAL SOCIETY

بین الاقوامی تعلقات میں تمام ریاستیں اپنے وسائل کے مطابق اپنے قومی مفاد کو ترقی دینے کے لئے کوشاں رہتی ہیں۔ ان میں بڑی اور ترقی یافتہ ریاستیں چھوٹی اور ترقی پذیر ریاستوں کو اپنا حلیف بنا کر ان کے ساتھ مختلف معاہدات کر کے انہیں اپنے قومی مفاد کے لئے استعمال کرتی ہیں۔ عالمی برادری میں دوسری جنگ کے بعد سب سے اہم کردار روس اور امریکہ سر انجام دے رہے تھے ۱۹۷۰ء کے بعد چین بھی اس میں شامل ہو گیا ان کے علاوہ برطانیہ فرانس جرمنی اور جاپان کی حیثیت بھی بڑی مستحکم ہے افروایشیائی ریاستوں کا ابھی عالمی معاشرے میں کوئی اہم کردار نہیں ہے۔

اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ آزادی کے بعد ابھی تک یہ اپنے پاؤں پر کھڑی نہیں ہوئیں ابھی انہیں اپنے استحکام اور معاشی ترقی کے لئے اپنے آقاؤں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ یہ ریاستیں اپنی خارجہ پالیسی اس طرح مرتب کرتی ہیں جس سے انہیں زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچے۔ اس پالیسی کا واحد مقصد اپنی پوزیشن کو مستحکم کرنا ہے تاکہ عالمی برادری میں کوئی کردار ادا کیا جا سکے۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ افروایشیائی ریاستوں کی جغرافیائی تقسیم میں کئی بے قاعدگی ہوئی ہیں جن کی وجہ سے ان ریاستوں کے مابین کئی تنازعات پیدا ہو گئے ہیں اور آئے دن چھوٹی بڑی جنگوں میں مصروف رہتی ہیں۔ جس کا انہیں واحد حل اپنے آپ کو مسلح کرنے میں نظر آتا ہے اس مقصد کی تکمیل کے لئے انہیں بڑی ریاستوں سے سودی قرضہ اور فوجی ساز و سامان لینا ہوتا ہے جس سے ان کی قومی آمدنی کا ایک بڑا حصہ دفاع کی نظر ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ریاستیں اپنی خارجہ پالیسیاں آزادانہ مرتب نہیں کر سکتیں۔

افروایشیائی ریاستوں کا عالمی برادری میں غیر مستحکم کردار کی سب سے بڑی وجہ معاشی مسائل ہیں۔ ان ریاستوں کی آبادی زیادہ ہے اور مخصوص آب و ہوا کی وجہ

سے افزائش نسل کی شرح بھی دیگر خطوں کے مقابلے میں زیادہ ہے جبکہ وسائل محدود اور غیر ترقی یافتہ ہیں۔ یہاں کے عوام ان پڑھ غیر ترقی یافتہ اور جذباتی قسم کے ہیں جس کی وجہ سے انہیں معاشرتی استحکام معاشی ترقی اور منصوبہ بندی کے لئے قرضہ جات اور ماہرین کی خدمات حاصل کرنا پڑتی ہیں یہ ماہرین بھی اپنی حکومت کی برتری کا پروپیگنڈا کرتے ہیں۔ مجبوری اور بے بسی کی وجہ سے قومی پالیسی میں مغلوبیت کا احساس پیدا ہوتا ہے اور یہ ریاستیں بڑی ریاستوں کی صرف ہاں میں ہاں ملانے کا کام کرتی ہیں یہی وجہ ہے کہ یہ ریاستیں عالمی امن میں کوئی مثبت کردار ادا نہیں کر سکتیں اب بین الاقوامی سیاست میں کچھ تبدیلیاں ہو رہی ہیں یعنی دو قطبی نظام جو قائم ہوا تھا اب کثیر قطبی نظام بن چکا ہے۔ یورپ فیصلوں کے مرکز کی حیثیت سے ابھر رہا ہے۔ تیسری دنیا کا ایک الگ بلاک بن گیا ہے دنیا کی دو بڑی طاقتوں کے درمیان چین اور جاپان بھی اب عظیم طاقتیں بن چکے ہیں۔ چنانچہ یورپ کے ابھرنے سے یہاں دو بڑی طاقتوں کی اہمیت کم ہوئی ہے وہاں خیال کیا جاتا ہے کہ آنے والے وقت میں افرو ایشیائی ریاستیں بھی اپنی حیثیت منوا لیں گی بشرطیکہ انہیں صحیح قیادت میسر آجائے۔

جنوبی افریقہ میں نسلی امتیاز کا مسئلہ

جمہوریہ جنوبی افریقہ کا رقبہ ۴۷۱۴۴۵ مربع میل اور آبادی تین کروڑ سے زائد ہے۔ یہ علاقہ معدنی دولت (سونا کوئلہ، ہیرے، یورینیم، پلاٹینم اور تانبا وغیرہ) سے مالا مال ہے۔ کیپ ٹاؤن قانون ساز دارالحکومت پریٹوریا انتظامی دارالحکومت اور بلوم فاؤنٹین عدالتی دارالحکومت ہے۔ جنوبی افریقہ کی گوری اقلیتی حکومت نے سیاہ فام باشندوں کو تیسرے درجے کا شہری بنا دیا ہے اور ان کے ساتھ انتہائی غیر انسانی سلوک روا رکھے ہوئے ہے۔ جنوبی افریقہ کی آبادی میں سیاہ فاموں کی تعداد ۷۰٪ ہے اور سفید فام محض ۱۸٪ ہیں۔ لیکن ۸۷٪ زمینیں سفید فاموں کے لیے وقف ہیں۔ افریقیوں کی غالب اکثریت سفید فام مالکوں کے مزدوروں کی حیثیت سے کام کرتی ہے۔

پس منظر

۱۶۵۲ء میں ولندیزی ایسٹ انڈیا کمپنی نے راس امید Cape of Good Hope پر قبضہ کر لیا۔ تاکہ ان کے بحری جہازوں کا عملہ اپنے طویل سفر کے دوران یہاں ٹھہر کر آرام کر لیا کرے۔ اٹھارویں صدی کے ابتدا تک یہاں دو ہزار ولندیزی آباد ہو گئے تھے۔ نپولیائی جنگوں کے نتیجہ میں برطانیہ نے ۱۸۱۴ء میں کیپ ٹاؤن میں اپنی حاکمیت قائم کی اور سات سال کے عرصہ میں تقریباً ۷ ہزار برطانوی باشندے یہاں آ کر آباد ہو گئے۔ برطانیہ نے ولندیزوں کو اس کے عوض ۶۰ لاکھ پونڈ ادا کر دیئے۔ موجودہ صدی کے شروع میں جنرل بوتھا نے ایک جماعت بنا کر اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ ۳۱ مئی ۱۹۱۰ء کو جنوبی افریقہ کی نو آبادیوں کا اتحاد عمل میں آیا تو لوئیس بوتھا اس کے پہلے وزیراعظم بنے۔ دوسری عالمی جنگ (۴۵-۱۹۳۹ء) کے بعد سفید فام قوم پرست جنوبی افریقہ کے اقتدار پر چھا گئے اور مقامی سیاہ فام اکثریت کے خلاف ظلم و زیادتی اور امتیاز کا نیا دور شروع ہوا جو آج تک جاری ہے ۱۹۴۸ء میں برسراقتدار آنے والی انتہا پسند نیشنل پارٹی کا موقف یہ تھا کہ

جنوبی افریقہ میں "سفید فام تہذیب" کے مستقبل کی ضمانت فقط اس کی وضع کردہ نسلی تفریق کی پالیسی کے ذریعے ہی دی جا سکتی ہے۔ اس کی غایت یہ ہے کہ جنوبی افریقہ میں ایک دوسرے سے الگ اور بند نسلی معاشرے تشکیل کیے جائیں۔ نیشنل پارٹی کی حکومت نے نسلی تفریق کی پالیسی کو عمل میں لانے کے لیے بہت سے قوانین نافذ کیے جن میں :

— سیاہ فاموں اور سفید فاموں کے درمیان شادی بیاہ کی ممانعت کا قانون ۱۹۴۹ء ۔

— شیوعیت پر پابندی کا قانون ۱۹۵۰ء

— ملزموں کو بغیر عدالت کی منظوری حاصل کیے حراست میں رکھنے کا قانون ۱۹۶۳ء شامل ہیں۔

— ۱۹۵۹ء کے نام نہاد "بنٹوستان کی خود مختاری کے قانون"[۱] کے ذریعے افریقیوں کو الگ تھلگ نسلی آبادیوں میں جنہیں بنٹوستان کا نام دیا گیا ہے محصور کر دیا گیا ہے حکومت کا دعویٰ ہے کہ ان علاقائی اکائیوں کے ذریعے افریقیوں کو خود ان کے طور طریقوں کے مطابق اندرونی خود مختاری اور ترقی کا موقع دیا جائے گا۔ لیکن یہ خود مختاری برائے نام اور محدود پیمانے کی ہے اور اس کا مقصد محض سفید فاموں کی حکمرانی قائم رکھنا ہے

۲۱ مارچ ۱۹۶۰ء کو شارپ ویل ٹاؤن میں پان افریکن کانگریس کی قیادت سیاہ فاموں نے پاس ضوابط کے خلاف پر امن مظاہرہ کیا تو سفید فام سرکاری پولیس نے خود کار ہتھیاروں سے گولیاں برسا کر ۱۶۹ مظاہرین کو ہلاک کر دیا۔ اس خونیں واقعہ کے بعد سارے جنوبی افریقہ میں ہنگامی حالت کا اعلان کر دیا گیا۔ سیاہ فاموں پر پابندیاں سخت کر دی گئیں۔ عوامی سطح پر گرفتاریاں ہوئیں اور پان افریکن کانگریس کے ساتھ افریکن نیشنل کانگریس کو خلاف قانون قرار دیدیا گیا۔ اس کے بعد اس کے جلاوطن رہنماؤں نے دوسری جلاوطن تنظیموں کے ساتھ مل کر جنوبی افریقہ کی نسلی امتیاز کی پالیسی

---

[۱] اس قانون کے تحت ۸ بنٹو قومی منطقے بنائے گئے ہیں جنہیں محدود پیمانے پر صوبائی خود مختاری دی گئی ہے ان میں ہر ایک منطقہ میں حکومت کی نمائندگی کے لیے ایک سفید فام رزیڈنٹ تعینات کیا گیا ہے۔

کے خلاف جدوجہد کرنی شروع کی۔

جنوبی افریقہ کی نسل پرست حکومت کی نسلی امتیاز کی پالیسیوں سے دنیا بھر کی سفید فام اقوام بھی نالاں ہیں اور انہوں نے جنوبی افریقہ کے خلاف اقتصادی پابندیاں بھی عائد کی ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے اہم اور نمایاں اقدام مغربی بنکوں کی طرف سے ۱۹۸۵ء میں اٹھایا گیا۔ اور جنوبی افریقہ کو دیئے جانے والے تمام قرضے روک دیئے گئے اور چودہ بلین ڈالر کے قلیل المیعاد قرضوں کی واپسی کا جلد مطالبہ کیا۔ جس سے جنوبی افریقہ کی معیشت پر برا اثر پڑا۔ اقوام عالم نے جنوبی افریقہ سے تجارتی تعلقات اور ثقافتی رشتے منقطع کر لئے ہیں۔ ادھر ملک میں سیاہ فام اکثریت نسل پرست حکومت کے ظلم و زیادتی کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئی۔ لہٰذا ۲۰ جولائی ۱۹۸۵ء کو ملک میں ہنگامی حالت کا اعلان کر دیا گیا۔ ۷ مارچ ۱۹۸۶ء کو ہنگامی حالت ختم کر دی گئی۔ سیاہ فاموں کی تحریک کو کچلنے کے لیے ۱۲ جون ۱۹۸۶ء کو دو مزید سخت قانون بنائے گئے۔

- پولیس اور سیکیورٹی فوج کو اختیار دیا گیا کہ وہ جس شخص کو بھی "ناپسندیدہ فرد" سمجھیں اسے مقدمہ چلائے بغیر ۱۸۰ دن حراست میں رکھ سکے گی۔
- حکومت ملک کے کسی بھی حصہ کو بدامنی کا علاقہ قرار دے سکے گی۔ فوج اور پولیس اس علاقے میں بدامنی پھیلانے والے یا ان کے معاون بننے والوں کو اپنی حراست میں رکھ سکے گی۔

نہتی سیاہ فام اکثریت نے صرف دنیا بھر کی حمایت ہی حاصل نہیں کر لی بلکہ جنوبی افریقہ کی سفید فام اقلیت میں سے بھی بعض سیاہ فام آبادی کے حق میں آوازیں بلند کر رہے ہیں۔ حتیٰ کہ جنوبی افریقہ کے موجودہ صدر ایف ڈبلیو کلارک کے بھائی ولیم ڈی کلارک بھی اپنے بھائی کی پالیسیوں کے خلاف سراپا احتجاج بن گئے ہیں۔ اپریل ۱۹۸۹ء میں سفید فاموں نے لبرل ڈیموکریٹک کے نام سے ایک جماعت بنائی ہے۔ جس نے مطالبہ کیا ہے کہ نسلی امتیازات پر مبنی تمام قوانین کا خاتمہ کیا جائے۔ ۱۶ ستمبر ۱۹۸۹ء کو جنوبی افریقہ میں نئے انتخابات منعقد ہوئے جس میں حسب معمول ملک کی ۲ کروڑ ۲۶ لاکھ سیاہ فام اکثریت کو نظر انداز کر کے صرف ۵۰ لاکھ سفید فام نسل کو حق رائے دہی

دیا گیا جو ملک کی کل آبادی کا صرف ۱۸٪ ہے۔ ان محدود انتخابات کو دیکھتے ہوئے کسی تبدیلی کی امید نہیں لگائی جا سکتی۔ مگر اس لحاظ سے یہ انتخابات خوش آئند ہیں کہ ۱۹۵۳ء کے بعد پہلی دفعہ برسراقتدار نیشنل پارٹی کو سفید فاموں کے ووٹوں کی ایک بڑی تعداد سے محروم ہونا پڑا ہے۔ ۱۶۶ کے ایوان میں اس کی نشستیں ۱۲۳ سے گھٹ کر صرف ۹۳ رہ گئی ہیں اور اپریل میں قائم ہونے والی لبرل ڈیموکریٹک پارٹی جس نے نسلی امتیاز کی کھلم کھلا مذمت کی ہے۔ ایک دم ۳۳ نشستیں حاصل کر لی ہیں۔ جبکہ کنزرویٹو پارٹی نے ۳۹ نشستیں حاصل کی ہیں۔

صدر ڈی کلارک نے سیاہ فام آبادی کو مطمئن کرنے اور مغرب کی اقتصادی پابندیوں سے بچنے کے لیے بعض ڈرامائی اقدامات کیے ہیں مثلاً ۲۵ سال سے نظر بند افریقین نیشنل کانگریس کے کئی رہنماؤں کو اچانک رہا کر دیا ہے۔ رہا ہونے والوں میں اے این سی کے سابق سیکرٹری جنرل والٹر سسلو بھی شامل ہیں جو جنوبی افریقہ میں نسلی امتیاز کے خلاف جدوجہد میں نیلسن منڈیلا کے بعد دوسرا معتبر نام ہے۔ ان رہنماؤں نے صدر کلارک کو مذاکرات کے لیے ایک ۳ نکاتی ایجنڈا پیش کیا ہے جس میں مطالبہ کیا گیا ہے کہ ایک ووٹ ایک فرد کی بنیاد پر سیاہ فام اکثریت کو اقتدار سونپا جائے افریقین نیشنل کانگریس اور دیگر جماعتوں کی قانونی حیثیت تسلیم کی جائے۔ نیلسن منڈیلا اور دوسرے قیدیوں کو رہا کیا جائے اور ان کی سرگرمیوں پر عائد پابندیاں ختم کی جائیں اور نسلی امتیاز پر مبنی تمام قوانین ختم کیے جائیں۔ ان رہنماؤں نے اس عزم کا اعادہ کیا ہے کہ جب تک حکومت ان مطالبات کو تسلیم نہیں کر لیتی مسلح جدوجہد جاری رہے گی صدر کلارک نے بات چیت سے قبل پیشگی شرائط اور دھمکیوں کو مسترد کر دیا ہے اور کہا ہے کہ ایک تنظیم کے بجائے سیاہ فاموں کے تمام نمائندوں کو مذاکرات کی دعوت دینی چاہیے۔ تاہم ان میں سے چند منتخب نمائندے نئے آئین کی تیاری میں شریک ہو سکتے ہیں انہوں نے آئین میں کم از کم ۲۰ سال کے لیے "گروپ حقوق" کی ضمانت دینے پر اصرار کیا ہے اور کہا ہے کہ حالیہ اقدامات کے مثبت نتائج دیکھنے کے بعد ہی اگلے قدم کا فیصلہ کریں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ ڈی کلارک ایک سے زیادہ جماعتوں کو سیاہ فاموں کا نمائندہ قرار دے کر ان کے درمیان اختلافات کو ہوا دینا چاہتے ہیں۔ تاکہ ان کا مثالی اتحاد پارہ

پارہ ہو جائے۔ یہ تمام اقدامات ڈی کلارک کے اس خوف کا نتیجہ ہیں کہ کہیں مغربی ممالک جنوبی افریقہ کے خلاف مزید اقتصادی پابندیاں عائد نہ کر دیں۔ موصوف اپنے ان نمائشی اقدامات کے نتیجہ میں کوالالمپور میں ہونے والی دولت مشترکہ کی کانفرنس ۱۹۸۹ء میں مزید بندیوں کی راہ روکنے میں کامیاب ہو گئے ہیں اور قرضے دینے والے بینکوں نے ۶،۵ بلین ڈالر تک کے طویل المیعاد قرضوں کی منظوری دے دی ہے لیکن اب دیکھنا یہ ہے کہ ڈی کلارک اقتصادی پابندیوں میں نرمی کے لیے یہ کھیل کھیل رہے ہیں یا واقعی وہ اس مسئلے کا حل چاہتے ہیں۔ یہ آنے والا وقت ہی بتائے گا۔

نمیبیا۔ (جنوب مغربی افریقہ)

براعظم افریقہ کے جنوب مغرب میں جنوبی افریقہ کے جنوب میں واقع ایک ملک ہے۔ اس کا رقبہ ۳۱۸۲۵۲ مربع میل ہے اور آبادی تقریباً ۱۴ لاکھ افراد پر مشتمل ہے آبادی کا ۸۸٪ حصہ سیاہ فام اور ۱۲٪ حصہ سفید فام باشندوں پر مشتمل ہے دارالحکومت ونڈہوک ہے سرکاری زبان افریکانس اور انگریزی ہے۔

نمیبیا پہلی جنگ عظیم تک (۱۸۸۴ تا ۱۹۱۵ء) ایک جرمن نوآبادی تھا۔ ۱۹۰۸ء میں اس کے مغربی ساحل سے ہیرے دریافت ہوئے پہلی جنگ کے دوران اس کی معدنی دولت حاصل کرنے کی غرض سے جنوبی افریقہ نے جرمن فوجوں کو شکست دے کر اس علاقے پر قبضہ کر لیا۔ ۱۹۲۰ء میں مجلس اقوام نے اسے جنوبی افریقہ کے انتداب میں دے دیا۔ اپریل ۱۹۴۹ء میں جنوبی افریقہ نے اقوام متحدہ کے اصولوں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ایک قانون پاس کر کے نمیبیا کو جنوبی افریقہ میں ضم کر لیا اور اسے اپنی پارلیمان میں نمائندگی بھی دے دی۔ اقوام متحدہ افریقی ممالک اور نمیبیا کے سیاہ فام باشندوں نے جنوبی افریقہ کے اس اقدام کے خلاف شدید احتجاج کیا۔ مگر یہ احتجاج بے سود رہا۔ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے اکتوبر ۱۹۶۶ء میں انتداب کو ختم کر دیا۔ اور جنوب مغربی افریقہ کے لیے ۱۹۶۷ء میں اقوام متحدہ کی انتظامی کونسل مقرر کی اور

ملک کا سرکاری نام دسمبر ۱۹۶۸ء میں نمیبیا کر دیا۔ انتدابی اختیار ختم ہونے کے باوجود ساؤتھ افریقہ کی حکومت بدستور اس پر قابض ہے۔ نمیبیا میں جنوبی افریقہ کی نسلی امتیاز کی پالیسی اور اقتدار کو بین الاقوامی عدالت انصاف غیر قانونی قرار دے چکی ہے۔

۱۹۷۴ء میں سلامتی کونسل نے جنوبی افریقہ سے مطالبہ کیا کہ وہ مئی ۱۹۷۵ء تک اختیارات نمیبیا کے عوام کو منتقل کر دے یا پھر اقوام متحدہ کی کارروائی کا سامنا کرنے کو تیار ہو جائے۔ مگر جنوبی افریقہ کے وزیراعظم نے قرارداد کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ ۱۹۷۷ء میں بین الاقوامی احتجاج کے باوجود نمیبیا کے دارالحکومت ونڈھوک میں منعقدہ ٹرن ہال کانفرنس نے ایک آئین کی منظوری دی۔ جس کا مقصد نسلی امتیاز پر مبنی عارضی حکومت کا قیام تھا۔ سلامتی کونسل کے پانچ مستقل اراکین کے احتجاج پر جنوبی افریقہ کی حکومت نے اس آئین کو منظور نہیں کیا اور نمیبیا کی سیاہ فام جماعت سوالپو د ساؤتھ ویسٹ افریقین پیپلز آرگنائزیشن، قیام ۱۹۶۶ء) سے گفت وشنید پر آمادگی ظاہر کی۔ طویل مذاکرات میں جنوبی افریقہ، مغربی طاقتیں اور افریقی ممالک شریک رہے۔ ۱۹۸۵ء میں ایک کٹھ پتلی حکومت کو محدود اختیارات منتقل کر دیئے گئے۔ مگر اکثر معاملات پر ویٹو کا اختیار بدستور جنوبی افریقہ ہی کے پاس رہا۔ بالآخر ۱۹۸۸ء میں نمیبیا کی آزادی کے امکانات روشن ہو گئے۔ جنوبی افریقہ انگولا اور کیوبا کے درمیان مذاکرات کے کئی دور ہوئے۔ اس سلسلے میں دسمبر ۱۹۸۸ء میں تینوں ممالک کے درمیان ایک سمجھوتہ ہوا۔ جس میں کہا گیا کہ جنوبی افریقہ اپنی ۵۰ ہزار افواج انگولا اور نمیبیا سے نکال لے گا۔ جس کے جواب میں کیوبا بھی اپنے ۵۰ ہزار فوجی انگولا اور نمیبیا سے نکال لے گا۔ اس معاہدے پر عمل درآمد کے لیے اقوام متحدہ کو نگران مقرر کیا گیا۔ اقوام متحدہ کی امن فوج (۵ ہزار) کی زیر نگرانی نومبر ۱۹۸۹ء میں نمیبیا میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات میں سیاہ فام باشندوں کی نمائندہ جماعت سواپو نے کل ووٹوں کا ۵۷ ٪ کے ساتھ ۷۲ میں سے ۴۱ نشستیں حاصل کیں۔

اقوام متحدہ کی کوششوں سے ۲۱ مارچ ۱۹۹۰ء کو نمیبیا نے آزادی حاصل کی اور وہاں نسلی امتیاز کا مسئلہ ختم ہو گیا بعد ازاں جون ۱۹۹۱ء میں جنوبی افریقہ میں بھی گوری اقلیتی حکومت نے نسلی امتیاز پر مبنی قوانین منسوخ کر دیئے۔ نسلی امتیاز کے خاتمے کے سلسلے میں اقوام متحدہ کی کوششیں یقیناً لائق ستائش ہیں۔

قبرص کا مسئلہ

PROBLEM OF CYPRUS

قبرص بحر متوسط کے مشرق میں ترکی سے ساٹھ میل دور واقع ایک جزیرہ ہے۔ صقلی اور سارڈینیا کے بعد بحر متوسط (Mediterranean Sea) کا یہ تیسرا بڑا جزیرہ ہے۔ اس کا رقبہ ۳۵۷۲ مربع میل اور آبادی تقریباً سات لاکھ ہے۔ آبادی میں اکثریت یونانیوں کی ہے جو قدیم یونانی روایات (Orthodox) کے حامی ہیں اور یونانی بولتے ہیں۔ ترک اقلیت ۱۸ فیصدی ہے اور ترکی بولتی ہے۔ باقی آرمینین اور مارونیٹ (Maronite) ہیں۔ دارالحکومت نکوشیا ہے۔

تاریخی پس منظر:۔ ۱۹ فروری ۱۹۶۰ء کو برطانیہ یونان ترکی اور قبرص کے قائدین کے درمیان ایک معاہدہ طے پایا۔ جس کی رو سے قبرص کو آزادی دی گئی۔ معاہدے میں یہ بھی طے پایا کہ حکومت میں یونانیوں اور ترکوں کو بالترتیب سات اور تین کے تناسب سے نمائندگی دی جائے گی۔ ملک کا صدر یونانی قبرصی اور نائب صدر ترک قبرصی ہوگا۔ موخرالذکر کو امور خارجہ، دفاع اور قانون سازی کے امور میں ویٹو کا حق حاصل ہوگا تاہم قبرصی یونانیوں کی نیت ٹھیک نہ تھی۔ یونانی قبرصی رہنما آرچ بشپ میکاریوس (Archbishop Makarios) نے ترک اقلیت سے متعلق معاہدے کی دفعات میں ترامیم کرنا چاہیں۔ تاکہ ترک اقلیت کی مراعات کو کم کیا جائے۔ ترک اقلیت میں اس کا فوری ردعمل ہوا اور انہوں نے دسمبر ۱۹۶۳ء میں اپنے حقوق کے تحفظ کیلئے جدوجہد شروع کی۔ اس کے نتیجے میں انتہا پسند یونانیوں نے ترک اقلیت پر حملے تیز کر دیئے۔ ہزاروں ترکوں کو جزیرے کے شمالی حصے میں پناہ لینا پڑی۔ ان حالات میں ترکی نے مداخلت کی۔ ۲۷ دسمبر ۱۹۶۳ء کو قبرص کا مسئلہ سلامتی کونسل میں پیش ہوا۔ ۱۸ فروری ۱۹۶۴ء کو اس مسئلے پر دوبارہ بحث ہوئی۔ سلامتی کونسل کی کوششوں سے ترک اقلیت اور یونانی قبرصی جنگ بندی پر آمادہ ہوگئے۔ مارچ ۱۹۶۴ء میں قبرص میں

اقوام متحدہ کی امن فوج متعین کی گئی۔ سلامتی کونسل کی درخواست پر سیکریٹری جنرل مسٹر اوتھانٹ (برما) نے اقوام متحدہ کا ایک ثالث مقرر کیا تاکہ قبرص کے مسئلے کا پرامن حل تجویز کیا جا سکے۔ اگست ۱۹۶۴ء میں قبرص میں دوبارہ شدید فرقہ ورانہ فسادات شروع ہو گئے سلامتی کونسل کا ہنگامی اجلاس طلب کیا گیا۔ ۱۰ اگست کو ترک قبرصیوں اور یونانیوں نے جنگ بندی کی تجویز مان لی اور عارضی طور پر جنگ بند ہو گئی۔

ترک جمہوریہ شمالی قبرص کا قیام:۔ قبرص کے بارے میں یونانی قبرصیوں کے خطرناک عزائم اور ترک قبرصیوں کی نسل کشی کے سبب ۲۰ جولائی ۱۹۷۴ء کو ترکی نے اپنی ۴۰ ہزار فوج جزیرے پر اتار دی۔ جولائی اور اگست کے حملوں کے دوران ترکی کی فوج نے ۴۰ فیصدی حصے پر جو شمالی قبرص پر مشتمل تھا قبضہ کر لیا اس کے نتیجے میں تقریباً دو لاکھ یونانی قبرصیوں کو شمالی قبرص چھوڑنا پڑا۔ پھر قبرص کے مسئلے کو اقوام متحدہ میں اٹھایا گیا۔ چنانچہ جنرل اسمبلی نے عالمی برادری سے اپیل کی کہ وہ قبرص کی علاقائی سالمیت، حق خود ارادیت اور غیر جانبداری کو ملحوظ رکھتے ہوئے جنرل اسمبلی کی قرار دادوں کا احترام کریں اور تمام غیر ملکی فوجیں قبرص سے باہر نکل جائیں تاکہ امن و امان کی صورت حال کو یقینی بنایا جا سکے۔ لیکن اس پر بوجوہ عمل نہ ہو سکا۔ ترک قبرصی لیڈر روف ڈینکتاش (Rauf Denktash) نے ۱۳ فروری ۱۹۷۵ء کو ایک خود مختار ترک قبرصی ریاست کے قیام کا دعویٰ کیا۔

تاہم قبرص کی حکومت نے اس مسئلے کو حل کرنے کے لئے ایک بار پھر مذاکرات شروع کئے لیکن یہ مذاکرات اس مسئلے کا کوئی باعزت حل تلاش کرنے میں ناکام رہے۔ چنانچہ ۱۵ نومبر ۱۹۸۳ء کو ڈینکتاش نے ترک جمہوریہ شمالی قبرص کی آزادی کا اعلان کیا۔ اس ریاست کو بین الاقوامی سطح پر اگرچہ تسلیم نہیں کیا گیا تاہم بعض ممالک کے ساتھ اس نے تجارتی تعلقات قائم کر لئے ہیں۔ ترک جمہوریہ شمالی قبرص کا علاقہ ۱۲۹۵ مربع میل اور آبادی تقریباً دو لاکھ ہے۔ آبادی میں ۹۹ فیصدی ترک ہیں۔

۱۸ نومبر ۱۹۸۳ء کو ترک جمہوریہ شمالی قبرص کے مسئلے کو سلامتی کونسل میں

پیش کیا گیا۔ برطانیہ اور پاکستان نے مسودہ قرارداد کو متوازن بنانے کی کوشش کی کیونکہ اس قرارداد میں ترک قبرصیوں کے یکطرفہ اعلان آزادی کی مذمت کی گئی تھی۔ ۱۹ نومبر ۱۹۸۳ء کو سلامتی کونسل نے ترک قبرصیوں کے یکطرفہ اعلان آزادی کو غیر قانونی قرار دیا بعد ازاں ترک جمہوریہ شمالی قبرص اور قبرصی حکومت کے درمیان متعدد بار مذاکرات ہوئے لیکن ہنوز نومبر ۱۹۹۳ء کسی نتیجے پر نہیں پہنچے۔

بوسنیا ہرزیگووینا کا مسئلہ

PROBLEM OF BOSNIA HERZEGOVINA

بوسنیا ہرزیگووینا نے اپریل ۱۹۹۲ء میں یوگوسلاویہ سے علیحدگی اور اپنی آزادی کا اعلان کیا۔ بوسنیا ایسی ریاست ہے جہاں مسلمانوں کی آبادی سب سے زیادہ ہے۔ ۸۵ لاکھ آبادی میں سے ۴۵ فیصدی مسلمان ہیں۔ ایک دوسری ریاست سربیا جو یوگوسلاویہ ہی کی جانشین ہے۔ بوسنیا کے مسلمانوں کو ان کی آزادی سے محروم کرنے پر تلی ہوئی ہے اور اس نے بوسنیا کے خلاف جارحیت کا آغاز کر رکھا ہے۔

سابق یوگوسلاویہ (۱۹۱۹ء۔ ۱۹۹۲ء) جزیرہ نما بلقان کا ایک ملک تھا اس کے شمال میں آسٹریا اور ہنگری، مشرق میں رومانیہ اور بلغاریہ، مغرب میں بحر اڈریاٹک (Adriatic Sea) اور اٹلی، جنوب میں یونان اور البانیہ واقع تھے۔ یوگوسلاویہ چھ جمہوریتوں سربیا، کروشیا، مقدونیہ، مانٹی نیگرو، سلووینیا، بوسنیا اور دو خود مختار صوبوں کوسووا اور وجودونیا پر مشتمل تھا۔ ۱۹۹۱ء کی مردم شماری کے مطابق آبادی کی نسلیاتی اور مذہبی تقسیم حسب ذیل تھی۔

کل آبادی ۲۴۰۰۰۰۰۰

نسلی تقسیم

۱۔ سربی	۳۶ فیصد
۲۔ کروشی	۲۰ فیصد
۳۔ بوسینی مسلمان	۹ فیصد
۴۔ سلووینی	۸ فیصد
۵۔ مقدونی	۸ فیصد
۶۔ مقدونی	۶ فیصد
۷۔ دیگر	۱۳ فیصد

مذہبی تقسیم

۱۔ مسیحی آرتھوڈکس	۴۱ فیصد
۲۔ رومن کیتھولک	۳۲ فیصد
۳۔ مسلمان	۱۲ فیصد
۴۔ دہریے / دیگر	۵ فیصد

یو گوسلاویہ کا خطہ تقریباً ساڑھے پانچ سو سال سلطنت عثمانیہ کا حصہ رہا اور یہاں مسلمانوں نے ایک طویل عرصہ تک حکومت کی۔ جس کے اثرات آج بھی محسوس کئے جا سکتے ہیں۔ پہلی عالمی جنگ (۱۸-۱۹۱۴ء) میں سلطنت عثمانیہ نے اس دور کی عظیم طاقت انگریز کے خلاف جرمنی کا ساتھ دیا۔ اس وجہ سے جنگ کے خاتمہ کے بعد سلطنت عثمانیہ کی قوت کو پاش پاش کرنے کے لئے انگریزوں نے اس کو مختلف چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا۔ دسمبر ۱۹۱۸ء میں سربوں، کروشوں اور سلووینوں نے ایک مشترکہ بادشاہت قائم کی۔ جسے بعد ازاں ۱۹۲۹ء میں یوگوسلاویہ کا نام دیا گیا۔

دوسری عالمی جنگ (۴۵-۱۹۳۹ء) کے دوران ۱۹۴۱ء میں یوگوسلاویہ پر نازی جرمنی نے قبضہ کیا تو مارشل ٹیٹو (کروشین) نے ملک کی آزادی کے لئے جدوجہد کا آغاز کیا۔ ۱۹۴۳ء میں ٹیٹو کو قومی آزادی کی کمیٹی کا صدر چنا گیا اور وہ ۱۹۴۶ء میں اتحادیوں بالخصوص سوویت یونین کی مدد سے یوگوسلاویہ کو آزاد کرانے میں کامیاب ہو گیا۔ مارشل ٹیٹو نے ۲۹ نومبر ۱۹۴۵ء کو بادشاہت کو ختم کر کے جمہوریت کا اعلان کیا اور جنوری ۱۹۴۶ء کو یوگوسلاویہ کو وفاقی جمہوریہ قرار دیا گیا۔ ۵۳-۱۹۴۵ء تک مارشل ٹیٹو یوگوسلاویہ کے وزیراعظم ۱۹۵۳ء میں صدر جمہوریہ اور ۱۹۷۴ء میں تاحیات صدر چنے گئے۔ سابق سوویت یونین (۹۱-۱۹۱۷ء) کی بالادستی نہ قبول کرنے کی پاداش میں یوگوسلاویہ کو ۱۹۴۸ء میں کومن فارم (Comin form) سے خارج کر دیا گیا۔(1) اس کے بعد وہ اپنی وفات تک مشرق اور مغرب کے درمیان ناوابستگی کی پالیسی پر عمل پیرا رہے۔ انہوں نے یوگوسلاویہ میں فلاحی کمیونسٹ سماج قائم کیا۔

مارشل ٹیٹو کی وفات (۴ مئی ۱۹۸۰ء) کے بعد جتن میجاتوک یوگوسلاویہ کے صدر چنے گئے۔ لیکن یہ ٹیٹو کی طرح ایک اچھے منتظم اور مدبر ثابت نہ ہوئے۔ چنانچہ سیاسی بحران اور امن وامان کا مسئلہ پیدا ہوا۔ کمیونسٹ پارٹی کی گرفت کمزور ہو گئی مختلف قومیتوں کے مطالبے کے پیش نظر جنوری ۱۹۹۰ء میں کمیونسٹ پارٹی نے پارلیمان سے کثیر جماعتی نظام کے لئے ایک قانون پاس کرایا۔

---

(1) کامن فارم (کمیونسٹ انفارمیشن بیورو (۵۶-۱۹۴۷ء) کا مقصد کمیونسٹ نظریات کی تشہیر تھا۔

روسی کامریڈ میخائل گورباچوف (۹۱-۱۹۸۵ء) کی پریسٹرائیکا (تشکیل نو) اور گلاسناسٹ (کھلی تنقید) کی پالیسیوں کی وجہ سے مشرقی یورپ میں آزادی کی تحریکیں زور پکڑ گئیں سابقہ یوگوسلاویہ بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ سب سے پہلے ۲۵ جون ۱۹۹۱ء کو سلووینیا اور کروشیا نے یوگوسلاویہ سے علیحدگی اور آزادی کا اعلان کیا۔ یہ دونوں عیسائی ریاستیں تھیں لہذا اس بنا پر پورے یورپ نے انہیں فوراً تسلیم کر لیا۔ سربیا نے جسے سابق یوگوسلاویہ میں مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ مذکورہ دونوں ریاستوں پر قبضہ کرنے کی کوشش کی۔ تاکہ ان دونوں جمہوریتوں کو آزادی کا اعلان واپس لینے پر مجبور کیا جائے۔ لیکن ہم نے دیکھا کہ جب سربیا نے اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے فوجیں روانہ کیں اور یورپی عیسائی ممالک اور اقوام متحدہ کی فوجیں ان کے درمیان آکر کھڑی ہو گئیں تاکہ سرب فوجی سلووینیا اور کروشیا پر حملہ نہ کر سکیں۔ یورپی عیسائی ممالک اور اقوام متحدہ کے اقدام سے سلووینیا اور کروشیا کے عوام سربوں کے ظلم وستم سے بچ گئے اور انہیں آزادی کی ضمانت مل گئی۔

۱۷۔ اپریل ۱۹۹۲ء کو سربیا اور مانٹی نیگرو نے ایک نئی وفاقی جمہوریہ یوگوسلاویہ کی ازسرنو تشکیل کی۔ بوسنیا نے یوگوسلاویہ سے علیحدگی اور آزادی کا اعلان کیا۔ بوسنیا کے علان آزادی کو نہ صرف اقوام متحدہ اور اقوام عالم نے تسلیم کیا بلکہ بوسنیا کو ایک آزاد اور خودمختار ریاست کے طور پر اقوام متحدہ نے سند بھی عطا کی (۲۲ مئی ۱۹۹۲ء) لیکن اس کے باوجود سرب فوجوں نے بوسنیا کے مسلمانوں کے خلاف جارحیت کا آغاز کر رکھا ہے۔ ۴۰ ہزار سے زائد مسلمان شہید کر چکے ہیں۔ لاکھوں بے گھر ہو کر جگہ جگہ پناہ کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ عیسائی یورپی ممالک کو اندیشہ ہے کہ اگر بوسنیا کے مسلمانوں کو ان کے حقوق حاصل رہے تو وہ یورپ کی سرزمین پر ایک مسلمان ریاست جود د میں لے آئیں گے۔ بلکہ سرب عیسائی تو یورپ کو خوفزدہ کرنے کے لئے یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ بوسنیا ایک عظیم تر یورپی اسلامی ریاست کا نقطہ آغاز بنے گا۔ اس میں البانیہ، بلغاریہ کے ترک اور خود ترکی شامل ہو جائے گا۔ بوسنیا کی بد قسمتی ہے کہ سابقہ یوگوسلاویہ کی فوج میں ۹۰ فیصد سے زیادہ سرب تھے۔ بوسنیا کی مقامی پولیس اور

پیراملٹری فورس میں بھی ان ہی کی اکثریت ہے اس لئے بوسنیا کی حکومت سربوں کا مقابلہ کرنے کی استطاعت نہیں رکھتی۔

بوسنیا کی خانہ جنگی اور سنگین بحران کو ختم کرانے کے لئے یورپی برادری نے جولائی ۱۹۹۳ء میں متحارب فریقین کے درمیان ایک سمجھوتہ کرایا ہے اس کے تحت بوسنیا کو مسلم، سرب اور کروش ریاستوں کی ایک ڈھیلی ڈھالی یونین کی شکل دی جائے گی۔ سمجھوتے کے تحت مسلمانوں کو صرف ۲۹ فیصد علاقہ ملے گا جبکہ ان کی آبادی ۴۵ فیصد ہے اور باقی علاقہ سربوں اور کروشوں میں تقسیم کر دیا جائے گا۔ جو باالفاظ دیگر سربوں کو ان کی دہشت گردی اور انسانیت کے خلاف سنگین جرائم پر انعام دینے کے مترادف ہو گا چنانچہ بوسنیا کے صدر جناب عزت بیگ نے مصالحت کاروں سے یہ ضمانت طلب کی ہے کہ مجوزہ یونین ایک مکمل ریاست ہو گی کیونکہ مبصرین کی رائے یہی ہے کہ یہ سمجھوتہ مسلمانوں کے لئے ایک سنہری جال ہے اور اس کا مقصد بوسنیا کی مسلمان ریاست کا خاتمہ ہے۔ اب یہ مسلم امہ کی ذمہ داری ہے کہ اس نازک وقت پر بوسنیا کو تنہا نہ چھوڑے۔ بوسنیا کی آزاد مملکت کو بچانے کے لئے مسلمانوں کو متحد ہو جانا چاہیے۔

افغانستان کا مسئلہ

روسیوں نے اپنے طویل المدت منصوبے کے تحت افغانستان میں خلق پارٹی اور پرچم پارٹی پر مسلسل کروڑوں روبل خرچ کئے سردار داؤد ۱۹۷۳-۷۸ء کے دور میں ان پارٹیوں پر کچھ زیادہ ہی سرمایہ کاری کی گئی۔ داؤد نے اپنے آخری ایام میں بڑھتے ہوئے روسی دباؤ کو محسوس کر لیا تھا۔ اس دباؤ سے بچاؤ کے لئے جنوری ۱۹۷۸ء میں سردار داؤد سعودی عرب اور دیگر اسلامی ممالک کے دورے پر بھی گئے۔ اس دورے کا مقصد تیل کی دولت سے مالا مال عرب ملکوں سے روسی دباؤ کے پیش نظر ہنگامی معاشی امداد حاصل کرنا تھا۔ داؤد اس نظریے کے تحت مغربی ممالک سے بھی اپنے تعلقات میں اضافہ کر رہے تھے۔ داؤد کی اس حرکت نے کریملن کے حکمرانوں کو سخت ناراض کر دیا۔ روسی لیڈروں کی ناراضگی کا سبب افغانستان میں تیل اور گیس کی تلاش کے ٹھیکے فرانسیسی کمپنیوں کو دینا تھا۔ انجہانی بریژنیف نے اس کی سخت مخالفت کی اور فرانسیسی ٹھیکوں کو ختم کرنے کا مطالبہ بھی کیا۔ لیکن داؤد نے ایسا کرنے سے یکسر انکار کر دیا۔

نتیجتاً چند ماہ بعد اپریل ۱۹۷۸ء کو داؤد، اس کے خاندان اور تمام قریبی ساتھیوں کو کابل کے صدارتی محل میں بیدردی سے قتل کر دیا گیا۔ ان کی لاشوں کو کابل کی سڑکوں پر گھسیٹا گیا تاکہ دیکھنے والے عبرت حاصل کریں۔ اس سانحہ کے بعد فرانسیسی ٹھیکے خود بخود ہی ختم ہو گئے۔ نئے ترقی پسند سربراہ نور محمد ترہ کی مقرر ہوئے ان کے دور میں پیپلز ڈیموکریٹک پارٹی آف افغانستان دو حصوں میں تقسیم ہوئی اول خلق پارٹی جس کے سربراہ نور محمد ترہ کی تھے دوم پرچم پارٹی جس میں حفیظ اللہ امین اور ببرک کارمل وغیرہ شامل ہیں

افغان روس دوستی معاہدہ:۔ انقلاب کے ۸ ماہ بعد دسمبر ۱۹۷۸ء میں افغانستان کا ایک وفد صدر نور محمد ترہ کئی کی سربراہی میں ماسکو گیا۔ ۴ دسمبر کو دونوں ملکوں کے قائدین کے مابین بات چیت ہوئی۔ ۵، دسمبر کو معاہدہ دوستی پر دستخط ہوئے۔ افغانستان کی طرف سے ترہ کی حفیظ اللہ امین اور مشہور سفارتکار عبدالمجید بتیکل اور روس کی طرف سے برزنیف وزیر خارجہ گرومیکو و دیگر قائدین شامل تھے اس معاہدہ کی شق نمبر ۴ غیر ضروری اہمیت کی حامل ہے۔

شق نمبر ۴ "معاہدہ میں شریک دونوں میں سے کسی ایک ملک کی سلامتی کو اگر خطرہ لاحق ہو گیا تو دوسرا فریق اس خطرہ سے نمٹنے کے لئے ضروری اقدامات کرے گا۔"

ہر ذی فہم آدمی سمجھ سکتا ہے کہ یہ امر غیر یقینی تھا کہ روس کبھی افغانستان کو اپنی مدد کے لئے بلائے گا۔ جس کا واضح مطلب یہ تھا کہ روس کو افغانستان میں مداخلت کا موقع فراہم کیا جا رہا ہے عبدالمجید مینکل نے معاہدہ کے بعد یہ سوال بھی اٹھایا تھا کہ ہمیں شق نمبر ۴ کی وضاحت چاہنی چاہیئے تاکہ معاہدہ میں شریک ملکوں کی سلامتی خود مختاری اور علاقائی سالمیت پر کوئی آنچ نہ آنے پائے۔ ترکئی اور امین نے اس کا جواب یہ دیا کہ ہم نے روسی کامریڈز سے اس سلسلے میں بات کر لی ہوئی ہے۔

اکتوبر ۱۹۷۹ء میں نور محمد ترہ کو قتل کر دیا گیا اور ان کی جگہ عنان حکومت کی باگ ڈور حفیظ اللہ امین نے سنبھالی۔ اس انقلاب کی بظاہر جو حقیقت نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ خلق اور پرچم پارٹی کے درمیان اختلافات پائے جاتے تھے۔ دونوں پارٹیوں کے مابین ایک سال قبل ایک تشدد آمیز جھڑپ بھی ہو چکی تھی۔ جب خلق پارٹی کے نائب وزیر دفاع خلیل اللہ نے حملہ کر کے اپنے لوس پرچم پارٹی کے جنرل سیکریٹری عبدالقادر کو ان کے دفتر میں زخمی کر دیا تھا اس طرح ترہ کی کے زوال کی وجہ اندرونی اختلافات تھے۔ روسیوں کو امید تھی کہ امین بھی ان کے لئے ویسا ہی ثابت ہو گا جیسا کہ اس کا پیشرو ترہ کی۔ لیکن نامعلوم وجوہات کی بنا پر ایسا نہیں ہوا ترہ کی کے دور میں سب سے

اہم کام یہ ہوا کہ دسمبر ۱۹۷۹ء میں افغان روس دوستی معاہدہ کو اقوام متحدہ میں رجسٹرڈ کروایا گیا۔

برزنیف نے معاہدہ کی شق نمبر ۴ کو عملی شکل پہنانے کے لئے اقدامات شروع کر دیئے۔ ۲۱ دسمبر ۱۹۷۹ء کو روسی ٹرانسپورٹ طیارے افغانستان کی فضا میں اڑنے شروع ہو گئے۔ ان میں روسی سپاہیوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ عام خیال یہ تھا کہ یہ امین کے اقتدار کو مستحکم کرنے آئے ہیں مگر ۲۸ اور ۲۹ دسمبر ۱۹۷۹ء کی درمیانی رات کو ایک اور انقلاب آ گیا۔

۲۷ دسمبر کو پرچم پارٹی کے جلاوطن کمیونسٹ لیڈر ببرک کارمل کو افغانستان کی حکومت کا سربراہ مقرر کیا۔ ان کا ٹیپ شدہ پیغام ریڈیو سے جاری کیا گیا کیونکہ ببرک کارمل اس وقت تاشقند میں تھے۔ اسی دوران روسی اپنی ۸۰ ہزار فوج کی نفری کے ساتھ افغانستان میں داخل ہو گئے۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد ہنگری ۱۹۵۶ء اور چیکوسلواکیہ ۱۹۶۸ء کے بعد روس کی طرف سے کسی بیرونی ملک میں یہ تیسری باقاعدہ فوجی مداخلت تھی۔ افغانستان میں روسی مداخلت نے پوری دنیا میں زبردست ہل چل مچادی۔ کمیونسٹ حکومت نے پورے ملک میں سماجی و اقتصادی اصلاحات نافذ کرنا چاہیں تو افغان عوام کی طرف سے اس کی سخت مخالفت کی گئی۔ ان میں کٹر مذہبی گروہ فوجی افسران اور روایتی افراد پیش پیش تھے ۴ مئی ۱۹۸۶ء کو ببرک کارمل کو اقتدار سے الگ کر دیا گیا اور ان کی جگہ ڈاکٹر نجیب اللہ کو لایا گیا افغانستان میں گذشتہ تیرہ ۱۳ سال کے دوران اقتدار کی یہ اولین پرامن تبدیلی ہے نئے حکمران بھی افغان عوام کی مؤثر جدوجہد کو کچلنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔

افغانستان میں روسی مداخلت کی وجہ سے تقریباً ۴۰ لاکھ مہاجرین نے افغانستان سے ترک مکانی کی۔ ان میں سے ۳۰ لاکھ افغان مجاہدین پاکستان میں اور ۱۰ لاکھ ایران میں پناہ لیے ہوئے ہیں۔

افغان بحران پر عالمی رد عمل

جنوری ۱۹۸۰ء میں پہلی مرتبہ جنرل اسمبلی نے بھاری اکثریت سے افغانستان

پر روسی جارحیت کی مذمت کی۔ اسی سال نومبر میں ایک دوسری قرارداد کے ذریعے روسی فوجوں کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ ۱۹۸۴ء میں پاکستان اور دوسرے ۴۶ غیر جانبدار ممالک کی ایما پر ایک قرارداد ۲۰ ووٹوں کے مقابلے میں ۱۱۹ ووٹوں کی اکثریت سے منظور کی گئی جنرل اسمبلی کی قرارداد کے خاص اجزا حسب ذیل تھے۔

۱۔ افغانستان سے غیر ملکی فوج کی مکمل واپسی۔

۲۔ افغانستان کی غیر جانبدار اور آزاد حیثیت کی بحالی۔

۳۔ افغان عوام کے لیے حق رائے دہی کا حصول۔

۴۔ مہاجرین کی حفاظت اور باعزت واپسی۔

اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کی کوششوں سے جون ۱۹۸۲ء میں پاکستان اور افغانستان کے مابین جنیوا میں مذاکرات شروع ہوئے۔ ایران اور روس نے ان مذاکرات میں شرکت نہ کی۔ اس معاہدے میں ثالثی کا کردار اقوام متحدہ کے نمائندے ڈیگو کارڈو ویز نے ادا کیا۔ بین الاقوامی سیاست میں تبدیلی (امریکہ اور روس میں مفاہمت) کی وجہ سے مئی ۱۹۸۶ء کو ماسکو میں افغانستان اور روس کے مابین روسی فوجوں کی مرحلہ وار واپسی کا معاہدہ طے پایا گیا اور اعلان کیا گیا کہ اس معاہدے پر اس وقت عمل درآمد ہوگا۔ جب پاکستان اور افغانستان کے مذاکرات کسی حتمی نتیجہ پر پہنچیں گے۔ طویل جنیوا مذاکرات کے نتیجہ میں بالآخر ۱۴ اپریل ۱۹۸۸ء کو معاہدہ جنیوا پر دستخط ہوئے۔

اس معاہدے پر روس کے وزیر خارجہ ایڈورڈ شیورناڈزے افغانستان کے وزیر خارجہ عبدالوکیل اور پاکستان کے وزیر خارجہ زین نورانی نے دستخط کئے۔ امریکہ کے وزیر خارجہ جارج شلز اور انجمن اقوام متحدہ کی طرف سے سیکرٹری جنرل پیریز ڈی کویار نے ضامن کی حیثیت سے دستخط کئے۔

معاہدے کی اہم دفعات

اس معاہدے میں طے پایا گیا کہ :۔

— ایک لاکھ ۱۵ ہزار فوج ۱۵ مئی ۱۹۸۸ء کے بعد زیادہ سے زیادہ ۹ ماہ میں چلی جائے گی جب کہ ۵ ہزار فوجیوں پر مشتمل پہلا دستہ ۳ ماہ میں افغانستان سے

چلا جائے گا۔

— دونوں ممالک پاکستان اور افغانستان ایک دوسرے کے معاملات میں کسی قسم کی جارحیت نہیں کریں گے۔

— امریکہ اور روس پاکستان اور افغانستان کے معاملات میں مداخلت سے باز رہیں گے۔ دونوں بڑی طاقتیں دیگر ممالک پر بھی زور دیں گی کہ وہ بھی عدم مداخلت کے سلسلے میں اقدامات کریں۔

— دونوں ممالک (پاکستان اور افغانستان) طاقت کے استعمال یا طاقت کے استعمال کی دھمکی سے گریز کریں گے خواہ یہ کسی طریقے سے ہو۔ ایک دوسرے کی سرحدی سلامتی، قومی یکجہتی، خود مختاری استحکام اور غیر جانبداری کا احترام کریں گے۔

— دونوں ممالک نے وعدہ کیا کہ وہ اپنی حدود میں دوسرے ملک میں مداخلت کیلئے کسی کو تربیت، سرمایہ اور اسلحہ فراہم نہیں کریں گے۔

— پاکستان میں مقیم ۳۰ لاکھ مہاجرین کی منظم واپسی کے لیے انتظامات کیے جائیں گے۔ کابل انتظامیہ مہاجرین کی آزادانہ واپسی کے انتظامات کرے گی۔ انہیں کام کرنے ڈومیسائل حاصل کرنے اور برابری کی بنیاد پر شہری حقوق حاصل ہوں گے پاکستان بھی اس سلسلے میں ہر ممکن تعاون کرے گا۔ اقوام متحدہ کا کمشنر برائے مہاجرین پاکستان کی معاونت کرے گا۔

— معاہدے پر عمل درآمد کے لیے ۱۵ مئی کو دونوں ممالک کا مشترکہ کمیشن تشکیل دیا جائے گا۔ یہ کمیشن واپسی کے راستوں کا تعین کرے گا اور معاہدے کی خلاف ورزی کی صورت میں پاک افغان نمائندے باہمی گفت وشنید سے اطمینان بخش حل تلاش کریں گے۔ ملاقات میں اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کا نمائندہ بھی شریک ہو گا۔

— اقوام متحدہ کا ایک سینئر فوجی افسر پاکستان اور افغانستان میں قائم ہیڈ کوارٹرز کی نگرانی کرے گا۔ یہ فوجی ہیڈ کوارٹر جنیوا معاہدہ کی خلاف ورزی کی چیکنگ کے لیے نگران ٹیمیں قائم کریں گے۔ اس کے تمام اخراجات پاک افغان حکومتیں

برداشت کریں گی۔

○ امریکہ اور روس نے اپنی ضمانتوں کی دستاویز میں افغان مسئلے کے سیاسی تصفیے کے سلسلے میں ہر ممکن تعاون کا یقین دلایا۔

اس معاہدے میں کہا گیا کہ پاکستان اور افغانستان اقوام متحدہ کے چارٹر کے مطابق ایک دوسرے کی سرحدی حدود اور داخلی معاملات میں مداخلت نہیں کریں گے اور اس سلسلے میں چارٹر کے مطابق ایک دوسرے سے تعاون کرنا دونوں ممالک کا فرض ہے معاہدے کی جن شقوں میں افغان مہاجرین کی واپسی کے انتظامات کرنے کے لیے کمیشن بنانے کا فیصلہ کیا گیا ہے وہ شقیں آٹھ ماہ تک موثر رہیں گی۔ اس کے بعد دونوں ممالک معاہدے پر عمل درآمد کا جائزہ لیں گے اور ضروری اقدامات کریں گے۔

جنیوا مذاکرات کی کامیابی اور اس کے نتیجے میں سمجھوتے پر دستخط ہونا مذاکرات کی تاریخ میں ایک عہد ساز کارنامہ ہے اور ان قوتوں کے لیے ایک نفسیاتی جیت اور اخلاقی فتح ہے۔ جو دنیا کے کسی بھی حصے میں جارح طاقتوں سے نبرد آزما ہیں۔ جنیوا سمجھوتے نے یہ اصول تسلیم کر لیا ہے کہ دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت دنیا کے چھوٹے سے چھوٹے اور کمزور ملک کو بھی اپنی طاقت کے بل بوتے پر زیر نگین نہیں رکھ سکتی۔

اس سمجھوتے کے تحت روسی افواج کا انخلا ۱۵ مئی کو شروع ہوا اور ۱۵ فروری ۱۹۸۹ء کو سوویت فوج کا آخری دستہ بھی افغانستان سے کوچ کر گیا۔ روس افغانستان جیسے کمزور ملک میں ۱۰ سال تک اپنی زبردست فوجی کارروائیوں کے باوجود کامیابی حاصل نہ کر سکا۔ روسی افواج مگ طیاروں گن شپ ہیلی کاپٹروں کے سائے میں ٹینکوں پر بیٹھ کر افغانستان میں داخل ہوئی تھی اور مجاہدین نے ان کا رائفلوں سے مقابلہ کیا۔ تقریباً ۵ سال بعد امریکہ کی طرف سے اسٹنگر میزائل ملے اور بیرونی اسلحہ ۱½ سال بعد ملنا شروع ہو گیا تھا۔

ویت نام کی جنگ میں ۱۲ لاکھ افراد ہلاک ہوئے تھے۔ جو ویت نام کی کل آبادی کا دو فیصد تھے۔ جب کہ افغانستان میں ۱۳ لاکھ افراد شہید ہوئے جو کل افغان آبادی کا سات فیصد ہیں۔ ویت نام کے مہاجرین کی تعداد ۷ لاکھ تھی۔ جب کہ افغانستان کے مہاجرین کی تعداد ۴۰ لاکھ رہی۔

فلسطین کا مسئلہ

PROBLEM OF PALESTINE

فلسطین کا رقبہ ۱۰۴۲۹ مربع میل ہے۔ جو بحر متوسط (Mediterranean Sea) کے مشرق میں واقع ہے۔ اس کی سرحدیں اردن، مصر، شام اور لبنان سے ملتی ہیں۔ پہلے یہ سلطنت عثمانیہ کا حصہ تھا اور پہلی عالمی جنگ تک اس کی یہی حیثیت رہی۔ اب حکومت اسرائیل فلسطین کے زیادہ تر حصے پر قابض ہے۔

تاریخی پس منظر:۔ اسرائیلی یا یہودی بنیادی طور پر عراقی باشندے تھے۔ اور یہ دوسری صدی ہزارویں قبل مسیح میں شام اور فلسطین میں آباد ہوئے۔ حضرت سلیمان کے عہد (۹۷۳ق م تا ۹۳۳ق م) میں یہودی ریاست خوب پھلی پھولی۔ یروشلم کا مشہور ہیکل سلیمانی تعمیر ہوا۔ لیکن حضرت سلیمان کی وفات کے بعد یہودیوں کا یہ اتحاد برقرار نہ رہ سکا۔ ۴۰ قبل مسیح میں رومی تسلط کے بعد یہودیوں کی طویل غلامی کا دور شروع ہوا دور غلامی میں یہودیوں پر اسپین، پرتگال اور جرمنی میں بڑے مظالم ڈھائے گئے۔ فرانس میں ان کے ساتھ قدرے ہمدردی برتی گئی۔ یہودیوں پر سارے مظالم کی وجہ یہ تھی کہ ان کے پاس نظریہ قومیت موجود تھا اور مملکت نہیں تھی۔

۱۸۸۲ء میں ایک روسی یہودی لیو پنکر (Leo Pinker) نے اس طویل غلامی سے نجات حاصل کرنے کے لئے "زیون کو واپسی" (Back to Zion) کے نام سے ایک تحریک شروع کی۔ یہ تحریک دنیا بھر کے یہودیوں میں بہت جلد مقبول ہو گئی لیو پنکر کے بعد اس تحریک کی قیادت ہنگری کے ایک یہودی تھیوڈور ہرزل (Theodor Harzel) نے سنبھالی۔ اس نے ۱۸۹۱ء میں عالمی یہودی فاؤنڈیشن کی بنیاد ڈالی اور یہودی ریاست کے قیام کے لئے ۱۸۹۱ء میں ہی بیسل (سوئٹزرلینڈ) میں "پہلی عالمی صیہونی کانگریس" کا اہتمام کیا۔ اس میں کل ۲۰۴ یہودی وفود نے شرکت کی۔ اس کانفرنس میں فیصلہ کیا گیا کہ یہودیوں کو ان کے دو ہزار سال پہلے کے وطن یعنی

فلسطین میں واپس لا کر آباد کیا جائے۔ لیکن سلطنت عثمانیہ نے یہودیوں کو فلسطین میں بڑی تعداد میں آباد ہونے کی اجازت نہ دی۔ صیہونی فیڈریشن نے جب فلسطین کو بحیثیت ریاست بنانے کا فیصلہ کیا تو ہرزیل نے ۱۸۹۶ء میں یہودیوں کی ریاست (The State of Jewish) کے عنوان سے ایک کتابچہ شائع کیا۔ جس سے تجویز کردہ ریاست کی حد بندی کرنے میں کافی مدد ملی۔ ہرزل کا نظریہ یہ تھا کہ "سلیمان اور ڈیوڈ کا فلسطین" اس طرح ہرزل کیمطابق شمالی سرحد وہ پہاڑ ہوں گے جو کیادوسیا (ترکی) کے بالمقابل تھے اور جنوب کی طرف نہر سویز تک پھیلی ہوئی تھی۔ ۱۹۰۴ء میں ہرزل کا انتقال ہو گیا۔ لیکن یہودی ازم کی افادیت اور مقبولیت میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا۔ فلسطین میں زمین حاصل کرنے کے لئے قومی فنڈ اور فلسطینی فاؤنڈیشن فنڈ قائم کئے گئے۔

یہودی وطن کے لئے انگریزوں کی حمایت:۔ پہلی عالمی جنگ (۱۹-۱۹۱۴ء) میں سلطنت عثمانیہ برطانیہ (اتحادیوں) کے خلاف جرمنی (محوریوں) کی حمایتی تھی۔ برطانوی حکومت نے عرب ممالک کی امداد اور حمایت حاصل کرنے کے لئے مکہ کے شریف حسین سے گفت و شنید کی۔ شریف مکہ نے دوسرے عرب سرداروں اور حکمرانوں سے مشورہ کرنے کے بعد برطانوی حکومت کو مطلع کیا کہ عرب ممالک صرف اسی صورت میں برطانوی حکومت کی امداد کر سکتے ہیں کہ جنگ کے بعد ان کے آزادی اور خود مختاری کے اعلان کا وعدہ کیا جائے۔ برطانوی حکومت نے جنگ جیتنے کے لئے عربوں کی یہ شرط منظور کر لی اور کچھ عرصہ بعد عرب ممالک کی سرحدوں کا تعین کر دیا۔

عربوں سے آزادی کا وعدہ کرنے کے بعد برطانوی حکومت نے دو خفیہ معاہدے کئے جس سے عربوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچی۔ پہلا خفیہ معاہدہ سائیکس پیکٹ (Sykes Pact) ۱۹۱۶ء میں طے پایا۔ جس کے تحت عرب علاقوں کو برطانیہ اور فرانس کے مابین تقسیم کرنے کا منصوبہ بنایا گیا۔ دوسرا خفیہ معاہدہ ۱۹۱۷ء کا اعلان بلفور (Balfour Declaration) تھا۔ بالفور اس خط کا متن ہے جو برطانوی وزیر خارجہ آرتھر جیمس بالفور نے برطانوی حکومت کی جانب سے برطانیہ میں مقیم

یہودیوں کی فاؤنڈیشن کے چیئرمین لارڈ راتھس چائلڈ کو لکھا تھا۔ اس خط میں وعدہ کیا گیا تھا کہ حکومت برطانیہ فلسطین میں یہودیوں کے لئے ایک قومی وطن (National Home) قائم کرنے میں مدد دے گی۔ یہ اعلان یہودی مملکت کے مطالبے کو بین الاقوامی پیمانے پر تسلیم کئے جانے کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ اتحادی طاقتوں نے اعلان بالفور کی تائید کی۔

محوریوں کی شکست کے بعد جنوری ۱۹۱۹ء میں معاہدہ امن (معاہدہ ورسائی) کی سپریم کونسل نے یہ فیصلہ کیا کہ عرب مفتوحہ علاقوں کو جن میں فلسطین بھی شامل تھا ترکوں کے حوالے نہیں کیا جائے گا۔ اتحادی طاقتوں نے عربوں کی آزادی کے اپنے وعدے کو پورا کرنے اور سائیکس پیکٹ ۱۹۱۶ء پر عمل درآمد کرانے کے لئے انتدابی (Mandatory) طرز حکومت قائم کیا۔ ۲۴ جولائی ۱۹۲۲ء کو برطانیہ نے مجلس اقوام کے سامنے ایک انتدابی مسودہ برائے فلسطین پیش کیا۔ ۲۹ ستمبر ۱۹۲۳ء کو مجلس نے اس کی توثیق کر دی اور اس طرح انتداب کا قیام ظہور میں آیا۔ انتدابی فرمان کے ابتدائیہ میں اعلان بالفور کا متن شامل تھا۔ انتدابی فرمان کی شق نمبر ۲ کے تحت برطانیہ کو یہ اختیار تفویض کیا گیا کہ وہ فلسطین میں ایسے سیاسی، انتظامی اور اقتصادی حالات پیدا کرے۔ جس سے یہودیوں کے لئے قومی وطن کے قیام کی ضمانت کا تحفظ ہو اور اس کے ساتھ ساتھ تمام فلسطینی باشندوں کے ملکی اور مذہبی حقوق بھی محفوظ رہیں۔

اس شرط کے ساتھ یہودیوں کا داخلہ فلسطین میں شروع ہوا اس داخلے کے لئے ایک محدود تعداد مقرر کی گئی تھی۔ لیکن برطانیہ نے یہودیوں کی سیاسی تنظیم "جیوئش ایجنسی" کو دوسرے ممالک سے یہودیوں کو لا کر فسلطین میں بسانے کی کھلی چھٹی دے دی۔ علاوہ ازیں شہری نظم و نسق چلانے کے لئے نیم غیر سرکاری اختیارات دے دیئے۔ اس سے رفتہ رفتہ بڑی تعداد میں یورپی ممالک سے یہودی آنے لگے اور جب نازی جرمنی اور مشرقی یورپ میں یہودیوں پر مظالم ڈھائے جانے لگے تو فلسطین میں یہودی پناہ گزینوں کا سیلاب آ گیا۔ ۱۹۴۴ء کے ختم ہونے تک فلسطین میں یہودیوں کی تعداد تین لاکھ کے قریب پہنچ گئی۔ عربوں نے انتدابی مدت کے دوران انتداب اور اعلان

بالفور کے خلاف سخت مہم جاری رکھی۔ عرب جذبات کا پہلا ملک گیر احتجاج اپریل ۱۹۲۰ء کو ہوا اسی طرح دوسرا ۱۹۲۱ء کو اور تیسرا ۱۹۲۹ء کو ہوا۔ پھر ۱۹۳۶ء اور ۱۹۳۹ء کے دوران بغاوت رونما ہوئی۔ جس کے تحت چھ ماہ کی ہڑتال کی گئی۔ عربوں نے تین مطالبات پرزور طریقے سے پیش کئے۔

(i) یہودیوں کی فلسطین آمد فوری روکی جائے۔

(ii) عرب زمین یہودیوں کو الاٹ نہ کی جائے۔

(iii) جمہوری حکومت کا قیام، جس میں عربوں کو آبادی کے تناسب سے نمائندگی دی جائے۔

ابتدائی عرصے کے دوران عربوں کی مسلح جدوجہد اور ہڑتالوں کی وجہ سے ۱۹۳۹ء میں برطانیہ نے اعلان کیا کہ فلسطین کی پالیسی میں یہ بات شامل نہیں ہے کہ اس کو یہودی حکومت بنا دیا جائے۔ برطانیہ نے عرب حکومت بنائے جانے کے مطالبے کو بھی نامنظور کر دیا اور کہا کہ ایک خود مختار فلسطینی حکومت بنانا مقصود ہے جس میں دونوں قوموں (فلسطینی عرب اور یہودی) کو اختیارات اس طرح تفویض کئے جائیں گے کہ ضروری مفادات ہر ایک کے محفوظ رہیں۔ ایسی فلسطینی ریاست دس سال کے اندر قائم کر دی جائے گی۔

دوسری عالمی جنگ (۱۹۳۹-۴۵ء) کے حالات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہودی لیڈروں نے برطانیہ کو قائل کر لیا کہ ہٹلر کے خلاف لڑنے کے لئے فلسطین میں ایک یہودی فوج تیار کی جائے۔ چنانچہ برطانیہ نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے فلسطین کی برطانوی رجمنٹ میں الگ الگ عرب اور یہودی بٹالین بنا دیئے۔ علاوہ ازیں جنگ کے دوران ہی یہودی قائدین امریکہ کو بھی اپنا ہمنوا بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ اس سے کروڑ پتی امریکی یہودیوں نے بھی "یہودی تحریک" کی مدد کرنی شروع کر دی۔ جنگ کے بعد ابتدائی حکومت نے مسئلہ فلسطین کے حل کے لئے آخری کوشش کی۔ اس میں عربوں اور یہودیوں دونوں کو یہ تجویز کیا گیا کہ برطانوی تولیت (Trusteeship) اس علاقے پر مزید پانچ سال رہے گی تاکہ ملک کو مکمل طور پر آزادی کے لئے تیار کیا جا

سکے۔ لیکن ۱۸ فروری ۱۹۴۷ء کو برطانوی وزیر خارجہ نے اعلان کیا کہ برطانیہ یہ محسوس کرتا ہے کہ انتداب عملی طور پر ناقابل عمل ثابت ہوا ہے اور دونوں قوموں سے کئے گئے وعدوں کی تکمیل ناممکن ہے۔ اپریل ۱۹۴۷ء میں برطانیہ نے بحیثیت انتہارٹی کے اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل سے درخواست کی کہ فلسطین کے مسئلے کو جنرل اسمبلی کے ایجنڈے میں شامل کیا جائے۔ اقوام متحدہ نے مسئلہ فلسطین کی جانچ کے لئے ایک خصوصی کمیٹی مقرر کی اس کمیٹی نے فلسطین کو عرب اور یہودی دو مملکتوں میں تقسیم کرنیکی سفارش کی۔ اس سفارش کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے نومبر ۱۹۴۷ء میں منظور کیا۔ ۱۵ مئی ۱۹۴۸ء کو برطانیہ نے انتداب کے خاتمے اور فلسطین سے تخلیہ کا اعلان کیا۔ اس تاریخ سے ایک دن پہلے یعنی ۱۴ مئی کو یہودیوں نے برطانیہ اور امریکہ کی حکومتوں سے ساز باز کر کے تل ابیب کے مقام پر مملکت اسرائیل کے قیام کا اعلان کیا اور فلسطین میں فوجی کارروائیاں شروع کر دیں۔ اس کے جواب میں مصر، عراق، اردن، لبنان اور شام کی فوجوں نے اسرائیل پر حملہ کر دیا۔ اس جنگ میں اسرائیل نے ان علاقوں پر قبضہ کر لیا جو مجوزہ عرب مملکت کو دیئے جانے تھے۔ اور اپنے واجب حصے میں ۴۰ فیصد کا اضافہ کیا۔ اردن نے دریائے اردن کے مغرب میں جو علاقہ فلسطین کا تھا اس پر قبضہ کر لیا اور مصر نے غزہ کے اس علاقے پر قبضہ کر لیا جو عرب مملکت کے حصے میں آنا تھا۔ اقوام متحدہ کی کوششوں سے جنوری ۱۹۴۹ء میں جنگ بندی ہو گئی اسرائیل اور عرب ممالک کے درمیان جنگ بندی لائنوں کی نشاندہی بھی کر دی گئی تب سے ۱۹۶۷ء تک یہی لائنیں سرحد کا کام دیتی رہیں۔

۱۹۶۷ء اور ۱۹۷۳ء کی عرب اسرائیل جنگیں:۔ جون ۱۹۶۷ء میں اسرائیل نے مصر، اردن اور شام پر حملہ کر کے صحرائے سینا، دریائے اردن کے مغربی کنارے اور گولان پہاڑوں پر قبضہ کر لیا اور عرب علاقے سے تخلیہ کی یہ شرط لگائی کہ عرب ممالک اسرائیل کو تسلیم کر لیں۔ جب اس قبضے کو ختم کرانے کی تمام پرامن کوششیں ناکام ہو گئیں تو مصر اور شام نے اکتوبر ۱۹۷۳ء میں اسرائیل پر ایک زبردست حملہ کیا۔ عرب سرزمین اور یروشلم سے یہودیوں کو نکل جانے پر مجبور کیا۔ بڑی طاقتوں

نے مداخلت کر کے شام اور مصر کے محاذوں پر دونوں فوجوں کو ایک دوسرے سے جدا کرنے اور درمیان میں اقوام متحدہ کے زیر نگرانی غیر فوجی منطقے قائم کرانے کے معاہدے کرائے اور مستقل امن کی بات چیت کے لئے جینوا کانفرنس کا افتتاح کیا۔ اقوام متحدہ کے ماتحت جینوا امن کانفرنس روس اور امریکہ دونوں کی مشترکہ سربراہی میں بلائی گئی۔ اس کانفرنس میں فوجی ورکنگ گروپ کا قیام عمل میں لایا گیا۔ جس کا کام فریقین کی فوج کو جنگ سے الگ رکھنا تھا۔ جنوری ۱۹۷۴ء کو اقوام متحدہ کی ہنگامی فوج کے کمانڈر کی زیر صدارت فوجی ورکنگ گروپ کا ایک اجلاس ہوا جس میں مصر اور اسرائیل کی جانب سے اپنی اپنی فوجوں کو جنگ سے علیحدگی سے متعلق ایک معاہدے پر دستخط ہوئے۔ اس طرح کا ایک معاہدہ مئی ۱۹۷۴ء میں اسرائیل اور شام کے درمیان طے پایا اور اس علاقے میں عارضی امن و سکون بحال ہو گیا۔

معاہدہ کیمپ ڈیوڈ ۱۹۷۹ء سے معاہدہ واشنگٹن ۱۹۹۳ء تک:۔ امریکہ کے سابق صدر جمی کارٹر نے مشرقی وسطیٰ کے مسئلے کو مستقل بنیادوں پر حل کرنے کے لئے مارچ ۱۹۷۹ء میں کیمپ ڈیوڈ (امریکہ) کے مقام پر مصر اور اسرائیل کے سربراہوں کی کانفرنس بلائی۔ اس کانفرنس کے نتیجے میں ۲۷ مارچ ۱۹۷۹ء کو معاہدہ کیمپ ڈیوڈ پر دستخط ہوئے اس معاہدے کے اہم نکات حسب ذیل تھے۔

1 ۔ پانچ سالہ عبوری مدت کے دوران دریائے اردن کے مغربی کنارے والے علاقے اور غزہ کے علاقے کے باشندوں کو مکمل خود مختاری اور حکومت خود اختیاری کے حقوق حاصل ہوں گے۔

2 ۔ اسرائیل اپنے تحفظ کے لئے مخصوص جگہوں پر اپنی فوج متعین رکھے گا۔

3 ۔ آئندہ مذاکرات میں اردن کو بھی دعوت دی جائے گی

اس معاہدے کے بعد بھی اسرائیل نے اپنے توسیع پسندانہ عزائم جاری رکھے۔ جولائی ۱۹۸۰ء کو یروشلم کو اسرائیل کا دارالحکومت قرار دیا۔ اپریل ۱۹۸۲ء میں اسرائیل نے اگرچہ صحرائے سینا کا علاقہ خالی کر دیا تھا لیکن ستمبر ۱۹۸۲ء میں لبنان میں مقیم فلسطینیوں کے صابرہ اور شطیلا کیمپوں پر شدید حملے کئے اور انہیں لبنان چھوڑنے اور ان

کا ہیڈ کوارٹر کسی اور ملک میں منتقل کرنے پر مجبور کیا۔ یہ لڑائی مہینوں جاری رہی اور اس کے نتیجے میں ۱۴ ہزار فلسطینی لبنان سے شام اور دوسرے ممالک کو چلے گئے۔ تنظیم آزادی فلسطین کے سربراہ تیونس چلے گئے اور انہوں نے وہاں اپنا ہیڈ کوارٹر قائم کیا۔

۵ نومبر ۱۹۸۸ء کو الجزائر میں فلسطین کی قومی کونسل کا ایک غیر معمولی اجلاس ہوا۔ اس اجلاس میں مغربی اردن اور غزہ کی پٹی کے علاقوں پر مشتمل ایک آزاد فلسطینی مملکت کے قیام کا اعلان کیا گیا۔ اس اعلان کے فوراً بعد سعودی عرب الجزائر کویت، ایران، عراق، ملائشیا، اور انڈونیشیا کی طرف سے آزاد فلسطینی مملکت کو باقاعدہ طور پر تسلیم کر لیا گیا۔ اس موقع پر پی ایل او کے سربراہ اور عبوری حکومت کے صدر جناب یاسر عرفات نے اقوام عالم سے آزاد فلسطینی مملکت کو تسلیم کر لینے کی اپیل کرتے ہوئے کہا کہ اب امریکہ اور اسرائیل کو بھی فلسطینی مملکت کے وجود کو تسلیم کر کے مشرق وسطیٰ میں پائیدار امن کے قیام میں تعاون کرنا چاہئے۔

ستمبر ۱۹۹۳ء میں اسرائیل اور تنظیم آزادی فلسطین نے ایک دوسرے کو تسلیم کرنے پر اتفاق کیا۔ پی ایل او مسلح جدوجہد ترک کرنے اور اپنے منشور میں سے اس شق کو ختم کرنے پر رضامند ہو گئی جس میں اسرائیل کو برباد کرنے کیلئے کہا گیا تھا۔ اسرائیلی حکومت نے بھی پی ایل او کو فلسطینی عوام کے نمائندے کی حیثیت سے باضابطہ طور پر تسلیم کیا۔ ۱۳ ستمبر کو تنظیم آزادی فلسطین اور اسرائیل نے ایک دوسرے کو تسلیم کرنے کے تاریخی معاہدہ واشنگٹن پر باقاعدہ دستخط کئے۔(1) معاہدے پر دستخطوں کی تقریب وہائٹ ہاؤس کے سبزہ زار پر ہوئی۔ جس میں پی ایل او کے چیئرمین یاسر عرفات، اسرائیلی وزیراعظم اسحاق رابن اور امریکی صدر کلنٹن کے علاوہ سابق صدر جارج بش اور جمی کارٹر، امریکہ اور روس کے وزرائے خارجہ، مختلف ممالک کے وزرائے خارجہ اور سفارتکاروں سمیت تین ہزار مہمانوں نے شرکت کی۔ معاہدے پر اسرائیل کے وزیر خارجہ شمعون پیریز اور پی ایل او کی طرف سے محمود عباس نے دستخط

---

(1) ۱۴ ستمبر ۱۹۹۳ء کو اردن اور اسرائیل نے مشرق وسطیٰ میں قیام امن کے لئے ایک علیحدہ امن سمجھوتے پر بھی دستخط کئے۔

گئے۔ جبکہ امریکہ اور روس کے وزیر خارجہ گواہوں کے طور پر موجود تھے۔ معاہدے کے تحت اسرائیل فلسطینیوں کو غزہ کی پٹی اور دریائے اردن کے مقبوضہ مغربی کنارے کے شہر الریحا (جریکو) میں محدود خود مختاری دے گا اس کے علاوہ اسرائیل پہلے قدم کے طور پر غزہ اور الریحا سے اپنی فوجیں واپس بلائے گا۔

اس تاریخی امن سمجھوتے کے موقع پر صدر کلنٹن نے اپنی تقریر میں کہا کہ اسرائیل پی ایل او معاہدہ ایک جرات مندانہ جوا ہے تاکہ مستقبل ماضی سے بہتر ہو۔ انہوں نے کہا کہ جس سرزمین پر امن کے لئے معاہدہ ہوا ہے وہ سرزمین مسلمانوں، یہودیوں اور عیسائیوں کے لئے یکساں طور پر مقدس ہے۔ لیکن بدقسمتی سے اس مقدس سرزمین نے خاصا خون بہتا دیکھ لیا ہے۔ اپنی تقریر میں انہوں نے قرآن کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ قرآن بھی کہتا ہے کہ "اگر دشمن امن مانگے تو تم بھی امن کی راہ اختیار کرو"

تنظیم آزادی فلسطین کے چیئرمین نے اس موقع پر کہا کہ اسرائیل نے غیر معمولی جرات مندانہ فیصلہ کیا ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ مشرق وسطیٰ میں قیام امن کے بغیر دنیا میں امن قائم نہیں ہو سکتا۔

اسرائیلی وزیراعظم رابن نے اپنی تقریر میں کہا کہ سمجھوتے پر دستخط کرنا آسان نہیں تھا۔ یہودیوں کے زخم کبھی نہیں بھریں گے اور خود اے فلسطینیو! تم نے بھی تو کتنے دکھ اٹھائے ہیں۔ ہم نے تمہارے خلاف جنگیں بھی لڑی ہیں لیکن ہم آج تم سے صاف اور بلند آواز سے یہ کہتے ہیں کہ کافی آنسو اور خون بہہ چکا ہے آج ہم امن قائم کرنے اور دوستی کا ہاتھ بڑھانے آئے ہیں۔ آؤ! امن وچین اور وقار کے ساتھ اچھے پڑوسیوں کی طرح رہیں۔ ہمیں اسلحہ کو الوداع کہنا چاہیے۔ ہمیں انسانوں کی طرح رہنا ہوگا امن کا موسم آگیا ہے۔

کشمیر کا مسئلہ

PROBLEM OF KASHMIR

پاکستان اور بھارت کے درمیان مسئلہ کشمیر بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی وجہ سے دونوں ممالک کے تعلقات میں کشیدگی پائی جاتی ہے اور دونوں ممالک کی دوستی کی راہ میں رکاوٹ بنا ہوا ہے۔ ریاست جموں و کشمیر برصغیر جنوبی ایشیاء کے انتہائی شمال میں کوہ ہمالیہ کے دامن میں واقع ہے۔ اس کا کل رقبہ ۸۴۴۷۱ مربع میل ہے۔ جس میں چھوٹے بڑے ۹۰ شہر اور ۹ ہزار دیہات ہیں۔ ریاست کے کل آبادی ۱۹۴۱ء کی مردم شماری کے مطابق ۴۰ لاکھ ۲۱ ہزار ۶۱۶ افراد پر مشتمل تھی۔ اس میں مسلم آبادی کا تناسب ۸۰ فیصد تھا۔ صرف وادی کشمیر میں مسلمانوں کی آبادی ۹۳ فیصدی تھی۔ ریاست کے تینوں راستے سری نگر سیالکوٹ، سری نگر راولپنڈی اور سری نگر ایبٹ آباد پاکستان کو آتے ہیں۔ مزید براں پاکستان کے تین بڑے دریاؤں (سندھ، جہلم اور چناب) کے منبع بھی کشمیر میں ہی ہیں۔ اس طرح ریاست جموں و کشمیر پاکستان کے لئے شہ رگ کی حیثیت رکھتی ہے۔

تاریخی پس منظر:۔ تیسری صدی قبل مسیح میں وادی کشمیر کو اشوک سلطنت (۲۶۹۔ ۲۳۲ ق م) میں شامل کیا گیا۔ کنشک کے عہد (۱۲۰ء تا ۱۶۲ء) میں بدھ مت کے مرکز کی حیثیت سے اسے بڑی شہرت ملی۔ کشمیر میں مسلم حکومت کا آغاز ۱۳۲۰ء میں سلطان صدر الدین رینچن شاہ کے اسلام قبول کر لینے سے ہوا۔ الناس علی دین ملوکھم کے مصداق عوام راجہ کی تقلید میں مذہب اسلام کی طرف مائل ہوئے اور بیشتر نے اس نئے مذہب کو اختیار کر لیا۔ اکبر بادشاہ کے عہد میں ۱۵۸۶ء میں کشمیر کو سلطنت مغلیہ میں ایک صوبے کی حیثیت سے شامل کیا گیا۔ مغل شہنشاہ اورنگ زیب کی وفات کے بعد مغلیہ سلطنت بتدریج زوال پذیر ہوئی اور کشمیر بھی خانہ جنگی کی لعنت سے دوچار ہوا اور ۱۷۵۲ء میں ابدالی فوج نے کشمیر کو سلطنت کابل میں شامل کر لیا۔

کشمیر پر افغانیوں کی عملداری ۶۷ برس تک قائم رہی۔ ۱۸۱۹ء میں پنجاب کے سکھ حکمران مہاراجہ رنجیت سنگھ نے کشمیر پر قبضہ کر لیا اسے کشمیر پر حملہ کرنے کی ترغیب ایک کشمیری پنڈت بیربل نے دی تھی۔ سکھوں اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی پہلی جنگ ۴۶-۱۸۴۵ء کے نتیجے میں کشمیر کو تاوان جنگ کے طور پر انگریزوں کے حوالے کر دیا گیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ۱۶ مارچ ۱۸۴۶ء کو معاہدہ امرتسر کے تحت کشمیر کو اپنی فوج کے ایک ہندو ڈوگرہ افسر مہاراجہ گلاب سنگھ (۵۷-۱۸۴۶ء) کے ہاتھوں میں ۷۵ لاکھ روپے (نانک شاہی) کے عوض فروخت کر دیا۔

گلاب سنگھ اور اس کے ساتھی ڈوگروں نے ۴۶-۱۸۴۵ء کی جنگ میں انگریزوں کی سکھوں کے خلاف مدد کی تھی۔ اس طرح گلاب سنگھ جس نے ۱۸۰۸ء میں ایک معمولی سپاہی کی حیثیت سے رنجیت سنگھ کی فوج میں شمولیت اختیار کی تھی انگریزوں کے ساتھ مل کر ۸۴ ہزار مربع میل علاقے کا مختار کل بن گیا۔ چونکہ کشمیر کی آبادی غریب مسلمانوں پر مشتمل تھی اس لئے ہندو راج طرح طرح کے مظالم ان پر ڈھاتا تھا۔ ریاست کی سول اور فوجی ملازمتوں کے دروازے مسلمانوں پر بند تھے۔ گلاب سنگھ رنبیر سنگھ اور پرتاب سنگھ کے بعد ۱۹۲۵ء میں راجہ ہری سنگھ کشمیر کا حکمران بنا۔ ہری سنگھ اپنے پیش رو راجوں سے زیادہ متعصب تھا اس نے مسلمان رعایا پر پہلے سے زیادہ زیادتیاں شروع کر دیں اور مذہبی معاملات میں دست اندازی کی۔

کشمیری مسلمانوں کی تحریک آزادی:۔ کشمیر میں ڈوگرا راج کے جبر و استبداد کے خلاف تحریک آزادی کا آغاز ۲۹ اپریل ۱۹۳۱ء کو جموں میں خطبہ عید کی بندش سے ہوا۔ کچھ دن بعد سنٹرل جیل جموں و کشمیر میں ایک ہندو انسپکٹر کی طرف سے پاؤں سے ٹھوکر مار کر "توہین قرآن" کے واقعہ نے اس تحریک میں مزید شدت پیدا کر دی۔ یہ تحریک ۱۳ جولائی ۱۹۳۱ء کو اس وقت جذباتی دور میں داخل ہو گئی جب ۲۲ افراد کو محض اذان دینے کی بنا پر شہید کر دیا گیا۔ یہ واقعات ریاست میں بنیادی حقوق کے حصول کی جدوجہد کا نقطہ آغاز بن گئے۔ ریاست بھر میں پامالی حقوق کے خلاف عوامی تحریک کو اکتوبر ۱۹۳۲ء میں آل جموں و کشمیر مسلم کانفرنس کی صورت میں منظم کیا گیا۔ مسلم

کانفرنس کی تشکیل میں شیخ عبداللہ، چوہدری غلام عباس، میر واعظ محمد یوسف، سردار عبدالقیوم اور سردار ابراہیم نے اہم کردار ادا کیا۔ ۱۹۳۴ اور ۱۹۳۸ء کے انتخابات میں مسلم کانفرنس کی کامیابی نے ڈوگرہ حکومت کے اوسان خطا کر دیئے سو چنانچہ حکومت اور کانگریسی عناصر نے مسلمانوں کے اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کے لئے شیخ عبداللہ سے گٹھ جوڑ کر کے جون ۱۹۳۹ء میں نیشنل کانفرنس کے نام سے ایک دوسری تنظیم قائم کروائی۔

مارچ ۱۹۴۰ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے جب قرارداد پاکستان منظور کی گئی تو کشمیری مسلمانوں کے تخیل کو پاکستان کے تصور نے فوراً مسحور کر لیا۔ مسلم کانفرنس کشمیر میں مسلم لیگ کا دوسرا نام تھا۔ مسلم کانفرنس اور نیشنل کانفرنس کی نظریاتی رقابت نے ریاست میں اس کشمکش کی صورت اختیار کر لی جو برطانوی ہند میں مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان بپا تھی۔ نیشنل کانفرنس کی پشت پر ڈوگرہ حکومت کا دبدبہ، کانگریس کا سرمایہ اور پروپیگنڈہ تھا۔ جس کا مسلم کانفرنس نے بڑی پامردی اور ثابت قدمی سے مقابلہ کیا۔

تقسیم ہند اور الحاق کشمیر:۔ ۳ جون ۱۹۴۷ء کے اعلان آزادی ہند کے تحت ۵۶۵ ہندوستانی ریاستوں کو اختیار دیا گیا کہ وہ اپنی مرضی سے بھارت اور پاکستان میں سے جس ملک میں شامل ہونا چاہیں ہو جائیں۔ کشمیر کی نمائندہ مسلم کانفرنس نے عوام کی خواہش کے مطابق ۱۹ جولائی ۱۹۴۷ء کو سری نگر کے مقام پر پاکستان کے ساتھ الحاق کی قرارداد منظور کی۔ بھارت کے ساتھ کشمیر کی سرحد کسی جگہ سے نہیں ملتی تھی۔ لیکن لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے کہنے پر ریڈ کلف نے حد بندی ایوارڈ میں آخری وقت ترمیم کر کے گورداسپور کا مسلم اکثریتی ضلع بھارت کے حوالے کر دیا جس سے بھارت کو کشمیر تک پہنچنے کا راستہ مل گیا۔ ماؤنٹ بیٹن پاکستان اور مسلمانوں کا دشمن بن گیا تھا کیونکہ اس کو پاکستان کا گورنر جنرل مقرر نہیں کیا گیا تھا۔ اس کا بدلہ وہ کشمیری اور پاکستان کے مسلمانوں سے لینا چاہتا تھا۔

راجہ ہری سنگھ بھارت سے الحاق پر پہلے ہی راضی تھا اور بھارت کشمیر میں فوجی

کارروائی کرنے سے پیشتر "کشمیر بھارت الحاق" ضروری سمجھتا تھا۔ چنانچہ وی پی مینن کے ذریعے الحاق کی کارروائی عمل میں آئی اور ۲۷ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو ماؤنٹ بیٹن نے الحاق کی دستاویز پر دستخط کئے۔ اس کے ساتھ ہی بھارتی فوجیں کشمیر میں داخل ہو گئیں۔ بھارتی فوج نے کشمیری مسلمانوں پر طرح طرح کے مظالم ڈھائے۔ جس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ لاکھوں کی تعداد میں مسلمان لوٹ مار، بربادی اور موت کے ڈر سے اپنے گھر چھوڑنے پر مجبور ہو گئے اور انہوں نے پاکستان میں آکر پناہ لی۔

بھارت نے اپنی طاقت کے بل بوتے پر کشمیری مسلمانوں کو محکوم بنانے کی کوشش کی۔ اس موقع پر پاکستان کا خاموش تماشائی بنا رہنا مشکل تھا وہ اپنے کشمیری بھائیوں اور مجاہدین کی مدد کرنے کے لئے کشمیر میں داخل ہو گیا۔ پاکستانی فوج نے کشمیر مجاہدین کے ساتھ مل کر ڈوگرہ اور بھارتی فوج کو عبرتناک شکست دی اور ۳۲ ہزار مربع میل علاقہ بھارتی فوجوں سے آزاد کرا لیا جس کو آج کل "آزاد کشمیر، گلگت و بلتستان" کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ ۲۴ اکتوبر ۱۹۴۸ء کو سردار ابراہیم کی زیر قیادت ایک عارضی حکومت کا قیام عمل میں آیا۔ ابتداء میں اس حکومت نے اپنا کام چلانے کے لئے تراڑ خیل کو دارالحکومت بنایا جو بعد میں مستقل طور پر مظفر آباد منتقل کر دیا گیا۔

مسئلہ کشمیر اور اقوام متحدہ:۔ بھارتی وزیر اعظم پنڈت نہرو نے جنگ میں فوجی لحاظ سے اپنی مخدوش حالت کو دیکھتے ہوئے یکم جنوری ۱۹۴۸ء کو اقوام متحدہ میں پاکستان کے خلاف شکایت کی اور کہا چونکہ ریاست کشمیر کا ہندوستان کے ساتھ الحاق ہو چکا ہے لہذا پاکستانی فوج نے کشمیر میں داخل ہو کر جارحیت کا ارتکاب کیا ہے۔ پاکستان نے بھارت کا یہ الزام ماننے سے انکار کر دیا اور اپنے جواب میں ریاست کشمیر کا پورا مسئلہ، مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کا قتل عام، جونا گڑھ اور حیدر آباد دکن پر ہندوستان کے غاصبانہ قبضے کا ذکر کیا اور کہا کہ کشمیر کا حل کشمیریوں کی رائے شماری سے ہونا چاہیئے۔ سلامتی کونسل میں پاکستانی وفد کی قیادت پاکستان کے وزیر خارجہ سر ظفر اللہ خان نے کی انہوں نے بڑے مدلل انداز میں کشمیر کا مسئلہ سلامتی کونسل کے

سامنے بیان کیا اور سلامتی کونسل کو اپنا ہم خیال بنالیا۔

۲۰ جنوری ۱۹۴۸ء کو سلامتی کونسل نے ایک قرارداد کے ذریعے کشمیر کے لئے ایک ثالثی کمیشن کا اہتمام کیا جس نے ۱۳ اگست ۱۹۴۸ء اور یکم جنوری ۱۹۴۹ء کو دو قراردادیں منظور کیں جن کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

1۔ جنگ فوراً بند کر دی جائے اور اقوام متحدہ کمیشن برائے پاک و ہند کی نگرانی میں جنگ بندی لائن کھینچ دی جائے۔

2۔ کشمیر سے دونوں ممالک کی فوجوں کا انخلاء ہو اور وہ جنگ سے پہلے والی پوزیشن پر واپس چلی جائیں۔

3۔ کشمیر میں مارچ ۱۹۴۹ء میں رائے شماری کرائی جائے گی۔

پاکستان نے اپنی بہتر پوزیشن کے باوجود جنگ بندی کو منظور کر لیا کیونکہ پاکستان نیک نیتی سے کشمیر کا پرامن تصفیہ چاہتا تھا۔ بھارت نے بھی جنگ بندی کو منظور کیا کیونکہ اس وقت جنگ بندی بھارت کے حق میں تھی۔ دونوں ممالک نے سلامتی کونسل کی قرارداد کو تسلیم کرتے ہوئے ۵ جنوری ۱۹۴۹ء کو کشمیر میں جنگ بند کر دی۔

جنگ بندی کے بعد مارچ ۱۹۴۹ء میں اقوام متحدہ کا کمیشن برائے پاک و ہند نے پاکستانی اور بھارتی نمائندوں پر مشتمل ایک اجلاس طلب کیا کہ دونوں ممالک فوجوں کے انخلاء سے متعلق اپنی اپنی تجاویز پیش کریں بھارتی طرز عمل سے کمیشن اس نتیجے پر پہنچا کہ بھارت کشمیر سے اپنی فوج کا انخلاء اور رائے شماری نہیں چاہتا۔ بھارت نے رائے شماری کے ضمن میں سلامتی کونسل کی کسی قرارداد کی پرواہ نہیں کی۔ جس کی وجہ سے یہ مسئلہ آج بھی جوں کا توں برقرار ہے اور دونوں ممالک کے درمیان نزاع کا باعث ہے۔ اقوام متحدہ کے کئی وفد مسئلہ کشمیر کے پرامن حل کے لئے پاکستان اور بھارت آئے لیکن ہر مرتبہ بھارت کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے کوئی پیش رفت نہ ہو سکی۔ اس ضمن میں اقوام متحدہ کی کوششیں ذیل میں درج کی جا رہی ہیں۔

دسمبر ۱۹۴۹ء میں سلامتی کونسل کے صدر جنرل میگناٹن نے کشمیر سے فوجوں

کے انخلاء سے متعلق چند تجاویز پیش کیں پاکستان نے ان تجاویز کو منظور کر لیا لیکن بھارت نے مسترد کر دیا۔

مارچ ۱۹۵۰ء میں سلامتی کونسل نے آسٹریا کے ایک جج سر اوین ڈکسن Sir Owen Dixon کو اپنا نمائندہ بنا کر پاکستان اور بھارت بھیجا۔ سر ڈکسن نے دونوں ممالک کے وزرائے اعظم سے ملاقات کی۔ لیاقت علی خان نے انہیں پیش کش کی کہ پاکستان کشمیر سے اپنی فوجیں واپس بلانے کو تیار ہے بشرطیکہ بھارت بھی ایسا کرے۔ لیکن بھارتی وزیر اعظم پنڈت نہرو نے اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

۱۹۵۴ء میں بھارت نے اپنی فوجوں کی نگرانی میں نام نہاد انتخابات کرائے اور ایک نام نہاد اسمبلی وجود میں آئی۔ اکتوبر ۱۹۵۶ء میں مسٹر جی ایل ڈوگرہ نے نام نہاد اسمبلی میں اعلان کیا کہ کشمیر بھارت کا اٹوٹ انگ ہے۔ بھارتی وزیر اعظم نے پاکستان کے سیٹو اور سینٹو میں شامل ہونے سے یہ بہانہ تراشا کہ پاکستان کو امریکہ سے فوجی امداد مل رہی ہے اس لئے بھارت کی سلامتی کو خطرہ لاحق ہو گیا ہے اور کشمیر میں رائے شماری کرانا ناممکن ہے۔

۱۹۵۷ء میں حکومت پاکستان نے سلامتی کونسل سے درخواست کی کہ مسئلہ کشمیر کو حل کرنے کے لئے عملی اقدامات کرے۔ جنوری ۱۹۵۷ء میں سلامتی کونسل نے اصولی طور پر مسئلہ کشمیر کو حل کرانے کے لئے قرار داد پیش کی۔ فروری ۱۹۵۷ء میں برطانیہ، امریکہ اور کیوبا نے ایک قرار داد پیش کی کہ کشمیر میں اقوام متحدہ کی فوج تعینات کی جائے۔ لیکن روس نے اس قرار داد کو ویٹو کر دیا۔ روس کے ویٹو کے بعد امریکہ اور آسٹریلیا نے ایک دوسری قرار داد پیش کی جس کے مطابق مسٹر جیرنگ کو مسئلہ کشمیر کا حل تلاش کرنے کے لئے بھارت اور پاکستان بھیجا گیا۔ ۱۹۵۸ء میں مسٹر جیرنگ نے پاکستان اور بھارت کا دورہ کیا اور سلامتی کونسل کو ایک رپورٹ پیش کی جس میں اس نے بتایا کہ پاکستان ہر تجویز کو ماننے کیلئے تیار ہے لیکن بھارت کسی بھی تجویز کو ماننے کے لئے تیار نہیں۔ بھارت نے کشمیر میں مسلمانوں کی تعداد کم کرنے کیلئے باہر سے ہندو لا کر بسانے شروع کر دیئے۔ پاکستان نے سلامتی کونسل کی توجہ اس

امر کی طرف دلائی۔ نومبر ۱۹۵۷ء میں برطانیہ، امریکہ، آسٹریلیا، فلپائن اور کیوبا نے ایک قرار داد سلامتی کونسل کے سامنے پیش کی جس کے تحت مسٹر گراہم کو بھارت اور پاکستان کا دورہ کرنے کے لئے بھیجا گیا اور انہیں اپنی سفارشات مسئلہ کشمیر کے حل کرانے کے سلسلے میں سلامتی کونسل کے سامنے پیش کرنے کے لئے کہا گیا۔ مسٹر گراہم کا یہ دورہ بھی ناکام رہا۔ کیونکہ بھارت نے سب تجاویز ٹھکرا دیں۔

صدر ایوب خان نے مارچ ۱۹۵۹ء میں بھارت کو متحدہ دفاع کی پیش کش کی اور مسئلہ کشمیر کے حل پر زور دیا۔ پنڈت نہرو نے متحدہ دفاع کی پیش کش کو ٹھکرا دیا اور کہا کہ پاکستان امریکہ سے فوجی ساز و سامان حاصل کر رہا ہے جس سے بھارت کی سلامتی کو خطرہ ہے اور مسئلہ کشمیر کو حل کرنے سے انکار کر دیا۔ حالانکہ پاکستان کے برخلاف بھارت روس اور امریکہ دونوں سے فوجی امداد حاصل کر رہا تھا۔

پاک بھارت جنگیں اور مسئلہ کشمیر:۔ ۱۹۶۵ء میں کشمیری مسلمانوں نے کشمیر کو آزاد کرانے کے لئے ایک انقلابی کونسل تشکیل دی اور گوریلا کارروائیوں کا آغاز کیا۔ گوریلا کارروائیوں نے بھارتی فوج میں افراتفری مچا دی۔ بھارت نے آزاد کشمیر کی چوکیوں درہ حاجی پیر کارگل اور ٹیٹوال پر قبضہ کر لیا پاکستان اور کشمیر کی فوجوں نے جوابی کارروائی کی اور چھ دن کے اندر چھمب اور جوڑیاں پر قبضہ کر لیا کشمیر میں عبرتناک شکست کے بعد بھارت نے ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کو بین الاقوامی سرحد عبور کر کے پاکستان پر حملہ کر دیا۔ پاکستانی فوج نے جوابی کارروائی کر کے بھارتی حملے کو پسپا کر دیا سترہ روزہ جنگ کے بعد سلامتی کونسل نے دونوں ملکوں کے درمیان جنگ بند کرا دی صدر ایوب خان نے جنرل اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان بھارت کے ساتھ جنگ نہ کرنے کے معاہدہ پر دستخط کرنے کو تیار ہے بشرطیکہ کشمیر کا معاملہ سلامتی کونسل کی قرار دادوں کے مطابق حل کیا جائے۔ لیکن بھارت نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ روسی وزیراعظم کوسیجن کی کوششوں کے باعث جنوری ۱۹۶۶ء میں صدر ایوب خان اور بھارتی وزیراعظم لال بہادر شاستری نے معاہدہ تاشقند پر دستخط کئے اس کے مطابق دونوں ممالک اپنے تمام تنازعات پرامن طریقے سے حل کریں گے اور آپس میں

خوشگوار تعلقات قائم کریں گے۔ معاہدہ تاشقند کے بعد پاکستان نے تعلقات معمول پر لانے کی بہت کوشش کی۔ بھارت پھر پرانے ہتھکنڈوں پر اتر آیا اور مشرقی پاکستان میں اس نے کھل کر جارحیت کا ارتکاب کیا۔ ۱۹۷۱ء میں بھارت نے مشرقی پاکستان پر حملہ کر دیا مشرقی پاکستان کی مکمل طور پر ناکہ بندی ہو جانے کے باعث پاکستانی فوج کو مجبوراً ہتھیار ڈالنے پڑے اور پاکستان کا ایک بازو کٹ گیا۔ دونوں ممالک کے سفارتی تعلقات منقطع ہو گئے اور کشمیر کا مسئلہ پھر کھٹائی میں پڑ گیا۔ جولائی ۱۹۷۲ء میں دونوں ممالک نے شملہ معاہدہ پر دستخط کئے اس معاہدے میں بھی دونوں ممالک نے کشمیر کے پرامن حل کا اعادہ کیا۔

کشمیری عوام کی حالیہ جدو جہد آزادی:۔ دسمبر ۱۹۸۹ء میں کشمیری عوام نے اپنے حق خود ارادیت کے حصول کے لئے بھارت کے خلاف بھرپور جدوجہد کا آغاز کیا یہ وہ زمانہ تھا جب امریکہ اور مغربی بلاک سوویت یونین کے خلاف افغانستان کی امداد کر رہا تھا۔ بھارت کے خلاف سکھوں اور کشمیریوں کی جدوجہد آزادی کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ لیکن دسمبر ۱۹۹۱ء میں سوویت یونین کے زوال کے بعد امریکی پالیسی میں تبدیلی آئی اور اس نے بھارت سے تعلقات استوار کرتے ہوئے پاکستان پر دہشت گردی کا الزام لگایا۔ حالانکہ پاکستان کا ہمیشہ سے یہ مؤقف رہا ہے کہ مسئلہ کشمیر کو سلامتی کونسل کی قراردادوں کے مطابق حل کیا جائے۔ آج ۵ لاکھ بھارتی فوج کشمیر میں موجود ہے۔ جس پر ۲۵ کروڑ روپے یومیہ خرچ ہو رہا ہے۔ یہ سب کچھ عالمی برادری دیکھ رہی ہے مگر خاموش ہے۔ ہم عالمی برادری اور اقوام متحدہ کی طرف دیکھ رہے ہیں کہ وہ انصاف کریں گے مگر امریکہ ابھی ایسا نہیں چاہتا۔ اس کے بعد ایک ہی راستہ باقی رہ جاتا ہے اور جیسا کہ ہمارا مذہب بھی کہتا ہے کہ مظلوموں کی مدد کے لئے آگے بڑھو اور ظالم کے ہاتھ توڑ دو۔

خالصتان کا بحران

سترہویں صدی کے آغاز تک سکھوں نے ایک علیحدہ مذہبی فرقے کی شکل اختیار کرلی تھی۔ مذہبی منصب غیر موروثی تھا۔ گردواروں میں فرقے کے اراکین کا کنٹرول تھا یہ عبادت گاہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک سماجی مرکز بھی تھا اور سکھ فرقے کے سیاسی خیالات کے انعکاس کا ذریعہ بھی۔ اس فرقے کے بڑھتے ہوئے اثرات کو دیکھ کر ۱۶۰۶ء

میں پنجاب کے مغل گورنر کی توجہ اس جانب مبذول کرائی گئی۔ سکھوں کی کارروائیوں کو روکنے کے لئے بعض گوروں کو سزائے موت بھی دی گئی۔ جس سے سکھ مسلح مزاحمت پر اتر آئے۔ درمیان میں بہت سارے منافشات کے بعد سکھوں کے دسویں گورو گوبند سنگھ نے خالصہ تنظیم قائم کی۔ یہ ایک فوجی نوعیت کی تنظیم تھی۔ جس کا مقصد ایک سکھ ریاست کا قیام تھا۔ مغلوں نے ۱۷۰۵ء میں اسے شکست دی اور ۱۷۰۸ء میں گورو گوبند سنگھ کو قتل کر دیا گیا۔ اس کے بعد ہی سلطنت مغلیہ کا زوال شروع ہوا جس سے سکھوں کو جا بجا چھوٹے چھوٹے آزاد علاقے قائم کرنے کا موقعہ مل گیا۔ خالصہ کو دوبارہ منظم کیا گیا۔ جس نے پنجاب سے افغانوں کو نکال باہر کیا۔ ۱۷۹۹ء تک سکھوں نے ایک اچھی خاصی ریاست قائم کرلی۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ۱۷۹۹ء۔۱۸۳۲ء تک بڑے طمطراق انداز میں پنجاب پر حکومت کی اس دور میں سکھوں کے علیحدہ تشخص کو اجاگر کیا گیا۔ ان کی ریاست میں موجودہ مشرقی و مغربی پنجاب کے علاوہ کشمیر اور شمال مغربی سرحدی علاقہ بھی شامل تھا۔ فرانسیسی مشیروں کی مدد سے رنجیت سنگھ نے انتظامیہ کی از سر نو تنظیم کی اور ایک پائیدار ریاست کے استحکام کے لئے کام کیا لیکن سکھ امراء کے مابین اختلافات کی وجہ سے یہ کوششیں زیادہ بارآور نہیں ہوسکیں۔
رنجیت سنگھ کی موت کے بعد فوج نے خود کو مجسم خالصہ سمجھ لیا۔ اس صورت حال سے خائف
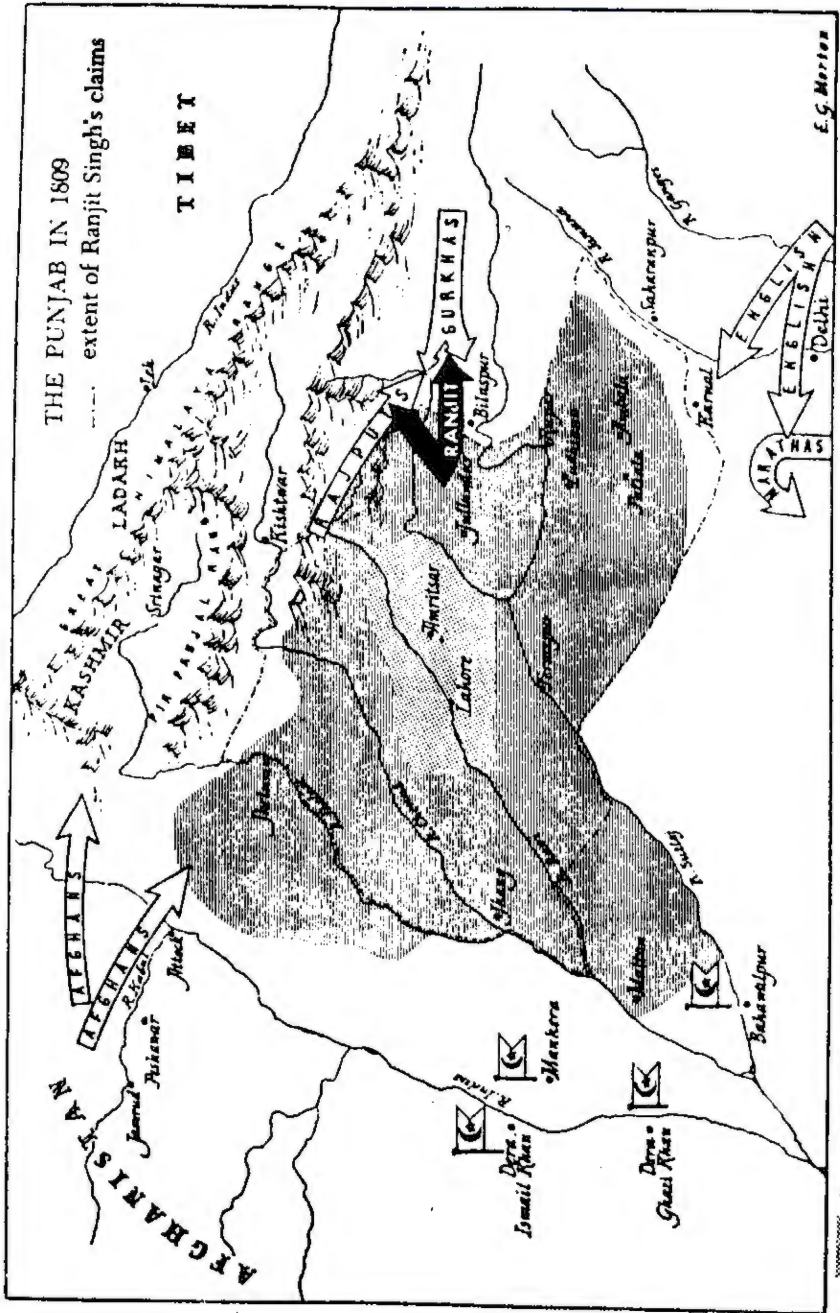
ہو کر طبقہ امراء نے انگلستان سے رجوع کیا۔ برطانیہ نے اس علاقے میں متعددہ فتوحات کیں۔ ان کی کامیابی ممکن نہ ہوتی اگر سکھ فوج متحد ہوتی۔ ۳۰ مارچ ۱۸۴۹ء کو لارڈ ڈلہوزی نے پنجاب کو باقاعدہ سلطنت برطانیہ میں شامل کر لیا۔ اور خالصہ تحریک کو کچل دیا۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے نتیجے میں برطانیہ نے ہندوستانی افواج کی بیشتر رجمنٹیں توڑ دیں۔ اور ان کی جگہ پر کرنے کے لئے پنجابیوں خاص کر سکھوں کو بڑی تعداد میں فوج میں بھرتی کرنا شروع کر دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سکھوں نے جنگ آزادی میں حصہ نہیں لیا تھا۔ سکھ کاشتکار روایتی طور پر فوجی تھے۔ برطانوی اقتدار کے ماتحت پنجاب غلہ بالخصوص گندم کی پیداوار کا سب سے بڑا مرکز بن گیا۔ اس کی مزید حوصلہ افزائی آبپاشی کے نہری نظام کی تعمیر سے ہوئی۔ ۱۹۳۹ء تک مجموعی اراضیات میں ۷ء۴ ء تک توسیع ہو گئی۔ اس میں سرمایہ کاری نفع بخش رہی۔

پنجاب کی ہندوستان میں شمولیت سے اس کی منڈی وسیع ہو گئی اور ہندوستان کا سرمایہ پنجاب پہنچنا شروع ہو گیا۔ مگر اس کے نتیجے میں کثیر قرضہ جات اور لگان داری کے مسئلے کا رجحان بھی پیدا ہوا۔ جسے برطانوی عمل داری حل نہ کر سکی۔ حالانکہ قانون سازی اور امداد باہمی کی انجمنیں قائم کر کے اس سمت میں غیر معمولی کوششیں بھی کی گئیں۔ ۳۰-۱۹۲۰ء کے دوران جو انحطاط آیا۔ اس سے حالات اور خراب ہو گئے اور اناج کی قیمتوں میں ۴۰ فیصد تک کمی واقع ہو گئی جس سے سکھ کاشتکاروں کے بڑے جتھوں نے بڑھتی ہوئی کانگریس تحریک کی حمایت شروع کر دی۔ کیونکہ کانگریس نے اصلاحات اراضی اور حکومت کی طرف سے ٹھوس مالی اعانت کے وعدے کئے تھے بعض سکھ جتھوں نے دوبارہ خالصہ تحریک کو منظم کرنے کے لئے بھی کام شروع کر دیا جس کی بدولت ۱۹۲۰ء میں اکالی تحریک معرض عمل میں آیا۔ یہ سکھوں کی حق خود مختاری کی حامی تحریک ہے۔

قانون آزادیٔ ہند کے تحت سکھوں کے بعض قائدین نے خالصتان کا نعرہ لگایا۔ قائد اعظم محمد علی جناح نے سکھوں کے قائد ماسٹر تارا سنگھ کو الگ وطن

CLAIM MAP FOR
PARTITION OF PUNJAB
JAMMU AND KASHMIR
CHAMBA
Chenab R.
Beas R.
Sutlej R.
BHAKRA DAM
EAST
STATES
AMBALA
Jumna R.
Delhi
PUNJAB
KARNAL
ROHTAK
GURGAON
JIND
HISSAR
PATIALA
Pathankot
MADHOPUR H.W.
GURDASPUR
HOSHIARPUR
JULLUNDUR
FEROZEPORE H.W.
FEROZEPORE
Batala
AMRITSAR
Sialkot
SIALKOT
LAHORE
Lahore
MANGLA H.W.
MARALA H.W.
BALLOKI H.W.
Jhelum
JHELUM
Rawalpindi
ATTOCK
WEST
PUNJAB
SARGODHA
Jhelum R.
FAISALABAD
Chenab R.
SAHIWAL
SULEMANKI H.W.
MULTAN
Ravi R.
Sutlej R.
MIANWALI
MUZAFFARGARH
Indus R.
NW FRONTIER PROVINCE
DG KHAN
BAHAWALPUR
Radcliffe's Award
Muslim League's Claim
Congress-Sikh's Claim
State Boundary
District Boundary
Canal
Headworks (H.W.)
0
50
100 km

کے سلسلے میں اپنی حمایت کا یقین دلایا لیکن اس نے قائد اعظم کی بات نہ مانی۔ پنجاب میں تشدد کا بدترین سلسلہ شروع ہو گیا۔ سکھوں کے اس غیر عقلمندانہ سلوک کے بارے میں قائد اعظم نے فرمایا۔

"سکھ اپنی ہوش و حواس میں نہیں ہیں۔ اپنے غیر عقلمندانہ سلوک سے وہ اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی مار رہے ہیں۔ آپ اس وقت کا انتظار کریں۔ اور دیکھیں جب ہندو ہندوستان اور مسلمان پاکستان کے مالک ہوں گے اور سکھ سر پکڑ کر روئیں گے۔ جب ان کی جداگانہ اور موثر قوم کی حیثیت ختم ہو جائے گی۔"

آج سکھ ہندوؤں کے غلام بن کر رہ گئے ہیں اور حضرت قائد اعظم کی پیشن گوئی پوری ہو گئی ہے ۱۹۴۷ء میں پنجاب میں سکھوں کی آبادی ۵۵ لاکھ سے کچھ زیادہ تھی جواب ۲ کروڑ کے قریب پہنچ رہی ہے۔ مشرقی پنجاب میں سکھوں کی آبادی ۷۹ فیصد ہے ہندو سرکار کی کوشش یہ ہے کہ ہندوؤں کی آبادی کا پنجاب میں اضافہ کیا جائے سکھوں کے دو سو کے قریب متبرک مقامات پاکستان میں ہیں وہ کم از کم سال میں چار مرتبہ گوردواروں کے موقع پر ان کی زیارت کے لئے پاکستان آتے ہیں۔ اور جب لاہور میں مسلمانوں کا رہن سہن اور طمطراق انداز دیکھتے ہیں تو انہیں یہ خیال ستاتا ہے کہ ان کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے جو مسلمانوں نے نہیں بلکہ خود ان کی قیادت نے کی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ انہیں جو روحانی تسکین لاہور، شیخوپورہ اور حسن ابدال میں ملتی ہے وہ پورے ہندوستان میں نہیں ملتی ننکانہ صاحب اور پنجہ صاحب کی سکھوں کے لئے وہی حیثیت ہے جو ہمارے لئے مکہ اور مدینہ کی ہے۔

ہندوؤں کی جارحانہ استحصالی کوششوں نے سکھوں کو مجبور کیا کہ وہ اپنی سیاسی، اقتصادی آزادی کے لئے چارٹر واضع کریں اس سلسلے میں انندپور صاحب کی قرارداد حسب ذیل ہے۔

۱۔ سکھوں کی سیاسی منزل خالصہ پنتھ کی بالادستی ہے۔

۲۔ اس مقصد کے حصول کے لئے سکھ ایک ہم نوع ریاست پنجاب کا مطالبہ کرتے ہیں جس میں موجودہ پنجاب کے علاوہ وہ تمام علاقے شامل ہوں جو پنجاب سے ناانصافی کرتے ہوئے ہماچل پردیش راجستھان اور ہریانہ میں شامل کئے گئے ہیں۔

۳۔ پنجاب ایک ایسی لسانی ریاست ہوگی جہاں سکھ مذہب ثقافت اور حقوق کو مرکزی حکومت اور ہندو اکثریت سے محفوظ رکھ سکیں گے۔

۴۔ نئے پنجاب کو دستوری طور پر سکھ ہوم لینڈ کے طور پر تسلیم کیا جائے کا صرف دفاع۔ امور مواصلات اور کرنسی کے معاملات مرکزی حکومت کی صوابدید پر ہوں گے۔ باقی تمام محکمے صوبے کے اختیار میں ہوں گے (یہ چارٹر ٹرانسفر آف پاور ایکٹ ۱۹۴۷ء کے عین مطابق ہے)

دریائی پانی کا جھگڑا :۔

پنجاب اپنی تین چیزوں کی وجہ سے دنیا بھر میں مشہور رہے۔ بہادر جوان، زرخیز زمین اور پانی و آبی قوت کے بے پناہ وسائل۔ لیکن پانی کی تقسیم نے آخری دو چیزوں میں خاصا بحران پیدا کر دیا ہے۔ قصہ یوں ہے کہ آزادی کے ۱۳ سال بعد ۱۹۶۰ء میں مشرقی و مغربی پنجاب کے درمیان دریاؤں کے پانی کی تقسیم کے سلسلے میں سندھ طاس معاہدہ ہوا۔ جس کی رو سے تین دریاؤں راوی ستلج اور بیاس کے پانی کے غیر مشروط استعمال کا حق مشرقی پنجاب کو دیا گیا اور دریائے جہلم اور چناب مغربی پنجاب کے حصے میں آئے۔ بھارت نے پاکستان کو ۶۲ ملین ڈالر کی رقم ادا کی۔ واضح رہے کہ یہ رقم راوی ستلج اور بیاس کے پانیوں کی نہیں تھی بلکہ جہلم اور چناب کے پانیوں کو پرانے پنجاب کی نہروں سے ملانے کے لئے ضروری کاموں کے لئے تھی۔ چشمہ جہلم رابطہ نہر اسی منصوبے کی کڑی ہے اس کا مقصد پنجاب کے سرائیکی حصے کو سیراب کرنا تھا۔ کیونکہ ستلج اور بیاس اس علاقے کو سیراب کرتے تھے۔ بعد ازاں پیپلز پارٹی کے دور حکومت میں اس نہر پر حکومت سندھ کی بالادستی قائم کر دی گئی۔ جون ۱۹۸۵ء میں جب حکومت سندھ نے اس نہر کو بند کیا تو پاکستان میں اس مسئلے نے

ایک بین الصوبائی بحران پیدا کر دیا بہر حال ہم اپنے اصل موضوع کی طرف آتے ہیں بھارتی آئین کی لسٹ ۱۱ کی شق نمبر ۱۷ کے تحت دریاؤں کے پانی اور آبپاشی کے معاملات کلیتاً ریاستوں (صوبوں) سے متعلقہ ہیں۔ اور مرکزی حکومت کو ان میں دخل اندازی کا حق نہیں ہے اس کے برعکس پاکستان کے آئین کے مطابق پانی اور بجلی کے تمام امور مرکزی حکومت کے سپرد ہیں۔

۱۹۶۶ء میں زبان کی بنیاد پر پنجاب کی تشکیل تو ہوئی تو ہماچل پردیش کو پنجاب سے نکال کر الگ صوبے کی حیثیت دے دی گئی اور اسی طرح ہریانہ (ہندی بولنے والا علاقہ) کو ایک الگ صوبہ بنایا گیا۔ جس سے پنجاب ایک چھوٹا سا صوبہ ہو کر رہ گیا۔ لیکن اس کو تین مشرقی دریاؤں کا پانی ملتا رہا جبکہ ہریانہ صوبے کو دریائے جمنا پر پورا حق عطا کیا گیا۔ جس سے ان دونوں صوبوں میں پانی کا کوئی تنازعہ پیدا نہ ہوا بھارتی حکومت پنجاب کے دریاؤں سے دہلی اور راجستھان کو بھی استفادہ کرنے کا موقع دینا چاہتی تھی۔ جو دیہاتی کسانوں کے لئے بڑی تکلیف دہ بات تھی بھارتی وزیراعظم آنجہانی اندرا جی نے ۱۹۷۶ء کو پنجاب کے دو دریاؤں راوی اور بیاس کے پانی اور توانائی کے وسائل کو اس طرح تقسیم کرنے کا اعلان کیا۔

۱۔ راجستھان	۸،۰۰	ملین ایکڑ فٹ
۲۔ ہریانہ	۳،۵۰	〃 〃 〃
پنجاب	۳،۵۰	〃 〃 〃
دہلی	۰،۲۰	〃 〃 〃

بھارت کے کسی دوسرے صوبے میں ایسے امتیازی سلوک کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ ۱۹۷۸ء میں پنجاب میں اکالی برسر اقتدار آئے تو انہوں نے وزیراعظم ایوارڈ کو امتیازی اور غیر منصفانہ قرار دیتے ہوئے عدالت میں چیلنج کیا۔ موقف یہ اختیار کیا کہ جب مدراس کو آندھرا پردیش سے علیحدہ کیا گیا تھا تو وہ آندھرا پردیش کے دریاؤں کرشنا اور پانیر کے پانیوں پر اپنے حقوق سے محروم ہو گیا چونکہ یہ دریا اس کے علاقے سے نہیں گزرتے تھے۔ اس طرح بیاس اور راوی کے پانی کی تقسیم کسی

POLITICAL DIVISIONS OF THE PUNJAB, 1956-1966

طرح بھی جائز نہیں ہو سکتی تھی۔ پانی کی اس تقسیم سے پنجاب کی معیشت پر گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے اگر پانی کی موجودہ شرح کے مطابق ۱۹ ملین ایکڑ فٹ پانی پنجاب میں استعمال کیا جاتا ہے تو اس سے ہر سال ۷۵ لاکھ ایکڑ رقبہ سیراب ہو گا۔ حسابی عمل سے پتہ چلتا ہے کہ آبپاسی والے علاقوں میں پنجاب میں فی ایکڑ ۲۲ ٹن غلہ پیدا ہوتا ہے اور اس سے ۳۴۰۰ روپے فی ایکڑ زائد آمدنی ہو گی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ پنجاب کو ہر سال ۲۵۰۰ کروڑ روپے کا نقصان ہوتا ہے اور دوسری ریاستوں کو اتنا ہی فائدہ۔ بجلی کا سالانہ نقصان اور اسی تناسب سے صنعتی پیداوار دوبارہ سرمایہ کاری اور روزگاری کی سہولتوں میں کمی سے کئی گنا زیادہ نقصان ہوتا رہا ہے۔ یہ نقصان اس وقت ہو رہا ہے جب پنجاب کے کسان اور صنعت کار پانی اور بجلی کی ضروریات کو ترس رہے ہیں۔ ان کی زراعت اور صنعت بری طرح تباہ ہو رہی ہے اور پھر لطف کی بات اس پر پنجابیوں کو جشن منانے کے لئے کہا جا رہا ہے۔

جدوجہد خالصتان

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے۔ اکالی وزارت نے ۱۹۷۸ء میں دریائی پانی کے معاملے میں انصاف کی غرض سے سپریم کورٹ میں مقدمہ دائر کر دیا تو اندرا گاندھی نے ۱۹۸۰ء میں پنجاب سے اکالیوں کی وزارت ختم کر دی اور دربار سنگھ کی مدد سے کانگریس کی وزارت قائم کر دی جس طرح مسٹر بھٹو نے مفتی محمود کی صوبہ سرحد میں وزارت ختم کر دی تھی۔ نئی وزارت کی تشکیل سے نہری پانی کا مقدمہ واپس ہو گیا۔ مگر اس سے سکھ سیاست میں زبردست ہل چل مچ گئی۔ اکالی باقاعدہ طور پر تین جتھوں میں تقسیم ہو گئے۔

۱۔ ماسٹر تارا سنگھ جتھہ ۲۔ تلونڈی جتھہ ۳۔ لونگوال جتھہ۔

سنت جرنیل سنگھ نے ان حالات کو دیکھتے ہوئے کانگریس کو چھوڑ دیا۔ مائی اندرا انہیں لونگوال اور توہرہ گروپ کے خلاف استعمال کرنا چاہتی تھی۔ ۳۷ سالہ جرنیل سنگھ
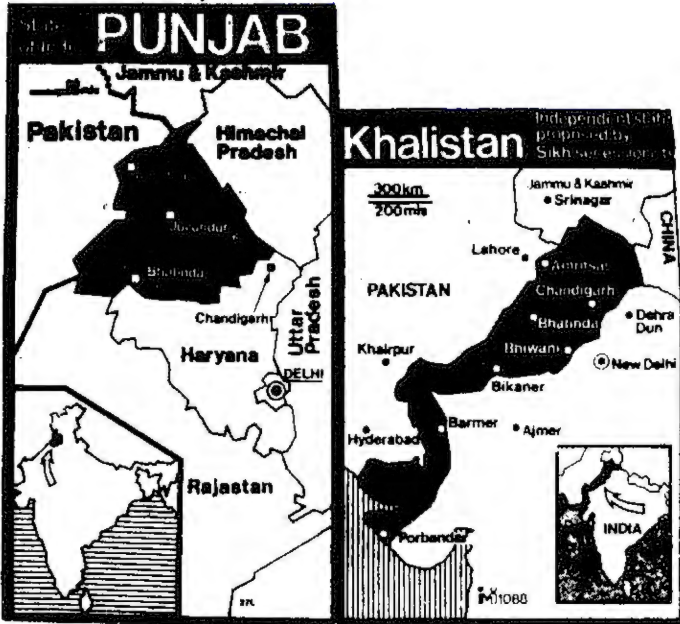
بھنڈراں جس کا تعلق جاٹ برادری سے تھا۔ ۱۹۷۸ء میں سکھوں کا نجات دہندہ بن گیا۔

ڈاکٹر جگجیت سنگھ چوہان ۱۹۴۷ء میں ماسٹر تارا سنگھ کے نفس ناطقہ تھے اور مسلم دشمنی کی وجہ سے بڑے مشہور تھے۔ مگر بعدِ ازاں ہندو رویے کی وجہ سے آزاد سکھ ریاست "خالصتان" کے حامی ہو گئے۔ انہوں نے کیلی فورنیا میں ۲۵ ایکڑ پر ایک بہت بڑا گوردوارہ بابا نانک کمپلیکس تعمیر کروایا ہے۔ وہ تمام سکھ جتھوں کی مالی امداد بھی کرتے ہیں۔ ارب پتی سردار گنگا سنگھ ڈھلون (نومبر ۸۴ء میں امریکی پاسپورٹ پر پاکستان میں بھی زیارت کی غرض سے آئے) اور دیگر یورپ و امریکہ میں مقیم سکھ اندرا گاندھی کی تشدد آمیز فسطائی پالیسی اور دربار صاحب کی توہین کی وجہ سے سنت جرنیل سنگھ کے ہم نوا ہو گئے۔ صوبہ پنجاب میں سکھ ہندوؤں کے خلاف متحد ہوئے اور انہیں اپنے انتقام کا نشانہ بنایا۔ ۹ ستمبر ۱۹۸۰ء کو لالہ جگت نارائن کو قتل کر دیا جو جالندھر سے تین روز نامے اردو پنجابی اور ہندی نکالتے تھے ان میں سکھ جنتا کے خلاف شرمناک مضامین اور کالم لکھے جاتے تھے۔ ان کے

قاتل کی تو خبر نہیں ہوئی۔ بہر حال مقدمہ جرنیل سنت پر قائم کر لیا گیا سنت صاحب نے ۱۶ ستمبر ۱۹۸۱ء کو چوک مہتہ پر اپنے لاکھوں ساتھیوں کے سامنے گرفتاری پیش کی۔ پولیس نے پُر امن ہجوم پر فائرنگ کر دی جیسا کہ عام طور پر پولیس کیا کرتی ہے جس سے پنجاب کے حالات بہت سنگین ہو گئے ہنگاموں ہڑتالیوں اور تشدد کے سلسلے میں اضافہ ہوتا گیا۔ لونگوال نے پُر امن ایجی ٹیشن کے تمام طریقے آزمائے مگر اندرا جی ٹس سے مس نہ ہوئیں ممکن ہے ان کی اس نفسیاتی کشمکش میں ان کی بیوہ بہو کا معاملہ بھی ہو جو سکھ قوم سے تعلق رکھتی ہیں انجہانی اندرا گاندھی نے سکھوں کو سبق سکھانے کے لئے ۲ جون ۱۹۸۴ء کو پنجاب میں فوج داخل کر دی فوج نے ۵ جون کی رات سے ۶ جون کی رات تک اپنی کارروائی جاری رکھی۔ اس مشن میں تقریباً ۸ سو فوجیوں نے حصہ لیا۔ بھارت کے بہادر فوجیوں نے پہلے گیس کے کیسنٹر پھینکے۔ مگر سخت حفاظتی اقدامات کی وجہ سے یہ اسکیم فیل ہو گئی۔ سنہرے مندر میں اکالیوں کی قیادت ایک سابق میجر جنرل شاہ بیگ سنگھ کر رہے تھے اس کارروائی میں کوئی ۵ فوجی مارے گئے اور ۲۰ کے قریب زخمی ہوئے۔ مقابلے میں ۱۵ سو کے قریب سکھ شہید ہوئے۔ خالصہ تحریک کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ جب بھی اس تحریک کو فیصلہ کن شکست دینے کی کوشش کی گئی ہے یہ مرکزی حکومت کے خلاف پہلے سے زیادہ شدت سے ابھری ہے۔

خالصہ راج کے قیام کے لئے ۱۳ اپریل ۱۶۹۹ء کو گورو گوبند سنگھ نے جس عظیم قربانی کا آغاز کیا تھا اس کے دو سو ۸۵ سال بعد ۶ جون ۱۹۸۴ء کو سنت جرنیل سنگھ بھنڈرانوالہ نے خون کا نذرانہ پیش کر کے خالصہ روایت کو حیات نو بخشی ہے۔

گولڈن ٹیمپل پر حملہ کے بعد (اپریشن بلیو سٹار) :۔

اس حملے کے ۵ ماہ بعد ۳۰ اکتوبر ۱۹۸۴ء کو مسز گاندھی کو قتل کر دیا گیا۔ اس سانحہ کے بعد ہندوستان کی تاریخ میں ہندو سکھ فرقہ وارانہ فساد کا بدترین سلسلہ شروع ہوا۔ جس میں کوئی ڈھائی تین ہزار سکھ موت کی گھاٹ اتار دیئے گئے مسز گاندھی

کے بعد ان کے پتر راجیو گاندھی۔ دسمبر ۸۴ء کے انتخابات جیتنے کے بعد سکھوں کو مطمئن کرنے کے لئے کچھ مزید اقدامات کئے۔ دہلی میں سکھوں کے خلاف بلوے کی سپریم کورٹ کے جج کے ذریعے تحقیقات۔ حراست سے سکھ لیڈروں کی رہائی اور کل ہند سکھ فیڈریشن پر سے پابندی ختم کرنا شامل ہے۔ راجیو گاندھی نے پارلیمنٹ میں یہاں تک کہا کہ وہ پنجاب کے مسئلے کے حل کے لئے "کسی حد تک" جانے کو تیار ہیں۔ بشرطیکہ اس سے ملک کی سلامتی ویک جہتی متاثر نہ ہو۔ سکھ لیڈروں ہرچند سنگھ لنگوال اور گرچرن سنگھ تو ہر اتنے رہائی کے بعد غیر مصالحانہ بیان دیئے اور اپنی جنتا کو ماضی کی پیروی کرتے ہوئے دہلی کے حکمرانوں سے لڑنے کو کہا۔ جیسا کہ وہ مغلوں اور انگریزوں کے خلاف لڑتے رہے ہیں۔

راجیو، لونگووال سمجھوتہ :۔

بھارتی وزیر اعظم اور اکالی دل کے صدر کے مابین ۲۴، جولائی ۸۵ء کو پنجاب کے مسئلے کے حل کے لئے ایک معاہدہ پر دستخط ہوئے جس کی اہم شرائط حسب ذیل ہیں۔

۱۔ یکم اگست ۸۲ء کے بعد کے ہنگاموں میں ہلاک شدگان کے ورثاء کی مالی اعانت کی جائے گی اس کے علاوہ جائیداد کا نقصان بھی پورا کیا جائے گا۔

۲۔ فوج سے بھاگنے والے افراد کی بحالی اور ملازمتوں کے لئے ہر ممکن کوشش کی جائے۔

۳۔ چندی گڑھ کا کیپیٹل پروجیکٹ ایریا مشرقی پنجاب کو دے دیا جائے گا۔ جو پہلے ہندی یا پنجابی علاقوں میں شامل تھے۔ ایسے کچھ علاقے یو ٹین علاقہ میں شامل ہوں گے۔ دوسرے علاقوں میں بھی ردوبدل ہوگا۔

۴۔ مرکز اور صوبوں کے تعلقات کو حقیقی بنایا جائے گا۔ ریاستوں کو زیادہ خود مختاری دی جائے گی اتند پور صاحب کی قرارداد کی روشنی میں مرکز اور ریاست

کے تعلقات کا تعین ہو گا۔

۵۔ راجستھان پنجاب اور ہریانہ کو راوی بیاس کے نظام سے اتنا ہی پانی ملے گا جتنا وہ یکم جولائی ۱۹۸۵ء کو لے رہے ہیں۔ مزید جھگڑوں کو حل کرنے کے لئے سپریم کورٹ کے جج کی سربراہی میں کمیشن بنایا جائے گا یہ چھ ہفتے میں فیصلہ دے گا۔

۶۔ پنجابی زبان کی ترویج و ترقی کے لئے اقدامات کئے جائیں گے۔

راجیو گاندھی کی سیاسی بصیرت دیکھیے انہوں نے لونگووال سے اس معاہدے پر دستخط کروانے کے بعد اپنی بلٹ پروف جیکٹ دی اور یہ کہا کہ اب اس کی آپ کو ضرورت ہو گی۔ یہ گویا اشارہ تھا کہ یہ معاہدہ آپ کی موت کا پروانہ بھی ہو سکتا ہے۔ لونگووال اس معاہدے پر سکھ جنتا کی حمایت حاصل نہ کر سکے۔ بھنڈرانوالہ کے باپ بابا جوگندر سنگھ بھنڈرانوالہ نے اس پر اپنے فوری ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے اس معاہدے کو سکھوں کے لئے انتہائی شرمناک اور سکھ قوم کو فروخت کرنے کے مترادف قرار دیا۔ سکھوں کے عمومی ردعمل کا اظہار بالآخر ۲۰ اگست کو لونگووال کے افسوسناک قتل کی صورت میں ظاہر ہوا۔

۲۷ ستمبر ۱۹۸۵ء کو راجیو حکومت سخت حفاظتی اقدامات کے تحت پنجاب میں انتخابات کروانے میں کامیاب ہو گئی۔ "لونگووال گروپ" نے صوبائی اسمبلی کی ۱۱۷ نشستوں میں سے ۷۳ نشستیں اور لوک سبھا کی ۱۳ نشستوں میں سے ۷ نشستیں حاصل کیں اکالی سربراہ سرجیت سنگھ برنالہ کو وزیر اعلیٰ نامزد کیا گیا۔ انتہاپسندوں نے انتخابات کو ایک دھوکہ قرار دیا ہے۔

مئی ۱۹۸۷ء میں حالات کو کنٹرول کرنے کے لیے صوبے میں صدر راج نافذ کر کے برنالہ حکومت کو معطل کر دیا گیا۔ مرکز کے اس اقدام سے بھی حالات میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ممتاز انگریزی روزنامہ اسٹیٹس مین کے مطابق پنجاب میں دہشت گردوں کی پولیس کے ہاتھوں ہلاکت اور گرفتاریوں کے باوجود ان واقعات میں کمی

نہیں آرہی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک انتہا پسند مارا جاتا ہے تو اس کی جگہ دو انتہا پسند پیدا ہو رہے ہیں۔ اخبار نے مزید لکھا کہ پنجاب کی صورت حال کا سب سے افسوسناک پہلو یہ ہے کہ کسی کو یہ معلوم نہیں کہ اس مسئلے کا حل کیا ہے۔

خالصتان کے قیام سے پاکستان کو سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ آزادی کشمیر کے امکانات زیادہ روشن ہو جائیں گے۔ ایسی صورت میں کشمیر سے بھارت کا رابطہ بالکل منقطع ہو جائے گا۔ بعض اہل وطن خالصتان کے قیام کو پاکستان کے لئے خطرے کی گھنٹی قرار دیتے ہیں۔ اس میں پہلے گروہ کا موقف یہ ہے کہ سکھوں کی اگلی منزل ننکانہ صاحب اور پنجہ صاحب ہوگی۔ اس سلسلے میں صرف اتنا عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ سکھ قائدین نے ایسے جذبات کا اظہار کبھی نہیں کیا اور اگر وہ کبھی ایسا کرنے کے لئے سوچیں بھی تو ۹ کروڑ میاں ۲ کروڑ خالصوں کا مقابلہ بڑی آسانی کے ساتھ کر سکتے ہیں۔ دوسرے گروہ کو اس کے پس منظر میں ۱۹۴۷ء کے واقعات یاد آتے ہیں جن میں سکھوں نے بے گناہ مسلمانوں کے خون سے ہاتھ رنگے تھے مگر ۱۹۴۷ء کے بعد آج تک ہم دیکھتے ہیں کہ بھارت میں ایک مسلمان کو بھی کسی سکھ سے گزند نہیں پہنچا۔ اس عرصہ میں ان کا قتل عام سیکولر بھارت میں وہی لوگ کرتے رہے جو آج سکھوں کے بھی قاتل ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ آج ان سکھوں کو دہشت گرد، انتہا پسند اور قانون شکن کہا جا رہا ہے حالانکہ ہندی پڑھنے والوں کو اس محاورے سے واقف ہونا چاہیئے کہ اگر صاحب خانہ طبلہ بجانا شروع کر دیں تو گھر کے بچوں کو ناچنے گانے سے منع نہیں کیا جا سکتا۔

باب سیزدہم

پاکستان کی خارجہ پالیسی

THE FOREIGN POLICY OF PAKISTAN

پاک خارجہ پالیسی کے بنیادی اصول

پاکستان کی خارجہ پالیسی کے اہم بنیادی اصول مندرجہ ذیل۔

۱۔ آزاد خارجہ پالیسی:

پاکستان ابتداء ہی سے آزاد خارجہ پالیسی پر گامزن رہا ہے بین الاقوامی مدوجزر کے باوجود اس اصول پر سختی سے عمل پیرا ہے۔ پاکستان کی خارجہ پالیسی کے بارے میں قیام پاکستان کے فوراً بعد قائداعظم محمد علی جناح نے فرمایا۔ پاکستان کی خارجہ پالیسی کی کلید یہ ہو گی کہ ہم دنیا کی تمام اقوام کے ساتھ انتہائی دوستانہ تعلقات قائم کرنا اور اس کے ساتھ ساتھ ہم پوری دنیا میں امن کے تمنائی ہیں۔ عالمی امن قائم کرنے کے لیے اپنی استطاعت اور توفیق کے مطابق اپنے حصے کا کردار خوش اسلوبی سے انجام دیں گے۔

۲۔ مسلم ممالک سے تعلقات:

ایک نظریاتی مملکت ہونے کی وجہ سے مسلم ممالک سے خصوصی تعلقات قائم کرنا ہمیشہ پاکستان کی خارجہ پالیسی کا بنیادی اصول رہا ہے۔ پاکستان نے بہت سے اسلامی ممالک کی جدوجہد آزادی میں اہم کردار ادا کیا ہے جن میں انڈونیشیا الجزائر اور لیبیا وغیرہ شامل ہیں۔ فلسطین کی جدوجہد آزادی میں پاکستان کی خارجہ پالیسی کو تمام مسلم ممالک نے سراہا۔ پاکستان کے تمام اسلامی ممالک سے بلا امتیاز رنگ ونسل کے قریبی تعلقات قائم ہیں۔ مسلم ممالک کے ساتھ باہمی اشتراک وتعاون نہ صرف پاکستان بلکہ ملت اسلامیہ کے مفاد میں ہے۔ اس لئے قیام پاکستان کے فوراً بعد ہی سے مسلم ممالک سے نہایت قریبی اور خوشگوار تعلقات رہے ہیں۔ قائداعظم نے مسلم ممالک سے تعلقات کی اہمیت کا ذکر ان الفاظ میں کیا تھا۔

"سیاسی اقتدار کا جو ڈرامہ فلسطین، انڈونیشیا اور کشمیر میں کھیلا جا رہا ہے وہ ہماری آنکھیں کھولنے کے لئے کافی ہونا چاہیئے۔ ہم اپنے مسلم اتحاد ہی کے ذریعے دنیا کے مشورہ خانوں میں اپنی آواز کی قوت

کو منوا سکتے ہیں"۔

قائداعظم کے یہ خیالات درست ثابت ہوئے جب یہودیوں نے ۲۱ جون ۱۹۶۷ء کو بیت المقدس مسجد اقصیٰ کو آگ لگائی تو ۱۹۶۹ء کی رباط کانفرنس نے مسلم ممالک کو ایک مرکز پر جمع ہونے اور باہمی اشتراک و عمل کی ترغیب دی بعد ازاں ۱۹۷۴ء کی لاہور کانفرنس ۱۹۸۱ء کی طائف کانفرنس اور جنوری ۱۹۸۴ء کی کیسا بلانکا کانفرنس نے مسلم ممالک کے درمیان اشتراک و تعاون کی ٹھوس بنیادیں فراہم کردیں۔

۳۔ پڑوسی ممالک سے تعلقات:۔

پاکستان جغرافیائی طور پر جس خطے میں واقع ہے وہ بہت ہی اہمیت کا حامل ہے اس کے اطراف میں دنیا کی تین بڑی طاقتیں سوویت روس، چین اور بھارت کے علاوہ ایران اور افغانستان دو مسلم ممالک بھی ہیں۔ پاکستان ہمیشہ سے پڑوسی ممالک سے خوشگوار تعلقات قائم کرنے کی پالیسی پر کامزن رہا ہے اب افغانستان میں روسی جارحیت سے اس کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی ہے ماضی میں تباہ کن جنگوں اور تلخ تجربات کے باوجود پاکستان نے بھارت کے ساتھ خوشگوار تعلقات قائم کرنے کے لئے بیشمار کوششیں کیں نئے حالات کے تحت صدر پاکستان نے بھارت کو عدم جارحیت کے معاہدے کی پیش کش بھی کی ہے۔ لیکن بھارت ابھی تک اس پر رضامند نہیں ہوا۔ چین کے ساتھ پاکستان کے شروع سے ہی خوشگوار اور قریبی تعلقات قائم ہیں چین نے ہر مشکل گھڑی میں پاکستانی عوام کا بھرپور ساتھ دیا ہے پاکستان کی اقتصادی اور بھاری صنعتوں کے قیام میں مدد دی ہے ایران کے ساتھ تعلقات بھی مثالی ہیں البتہ افغانستان کے تعلقات میں بین الاقوامی حالات کی وجہ سے اونچ نیچ آتی رہی ہے لیکن افغانستان میں روسی جارحیت سے پاکستان نے انسانی ہمدردی کی بنا پر ۳۰ لاکھ مہاجرین کو اپنی سرزمین پر پناہ دی۔

۱۹۵۵ء کی بنڈونگ کانفرنس کے بعد روس اور پاکستان میں اشتراک و تعاون بڑھنا شروع ہو گیا ہے۔ دسمبر ۱۹۵۶ء کو دونوں ممالک کے مابین تعلقات و تعاون اس حد تک بڑھ گیا ہے کہ روس نے اپنے پرانے موقف کو تبدیل کر دیا ہے

روس نے کشمیری عوام کی حق خود ارادیت کی حمایت کی۔ دونوں ممالک کے تعلقات میں مُدوجزر آتا رہا ہے۔ ان حالات کے باوجود روس نے پاکستان کی اقتصادی امداد جاری رکھی۔

۴۔ غیر جانبدار تحریک میں شمولیت:۔

پاکستان اپنے قیام کے بعد دفاعی ضروریات کے پیش نظر بعض مغربی ممالک کے معاہدوں سے منسلک رہا لیکن بدلتے ہوئے حالات کے تحت پاکستان کو اپنی خارجہ پالیسی پر نظر ثانی کرنا پڑی۔ بڑی طاقتوں کی باہمی رقابت میں غریب اور پسماندہ ممالک بری طرح متاثر ہو رہے تھے۔ امداد کے بہانے ان اقوام پر اپنا تسلط قائم کر رہے تھے چنانچہ چند ممالک نے مل کر ایک غیر جانبدار تحریک کا آغاز کیا۔ اس تحریک میں عرب اور مسلمان ممالک کی اکثریت کے علاوہ تقریباً افریقہ و ایشیا کے بھی غریب ممالک شامل ہیں ۱۹۸۵ء میں اس تحریک کے کل ۱۰۱ ممبر ہیں۔ پاکستان امریکہ کے رویے کی وجہ سے عرصہ دراز تک اس غیر جانبدار تحریک کا بغور مطالعہ کرتا رہا ہے بالآخر اس تحریک کی چھٹی کانفرنس جو کیوبا کے شہر ہوانا میں ۱۹۷۹ء کو منعقد ہوئی پاکستان اس تحریک کا باقاعدہ رکن بن گیا اور دفاعی معاہدوں سے علیحدگی اختیار کرلی۔ اس طرح اب پاکستان مکمل طور پر ایک آزاد اور غیر جانبدار پالیسی پر گامزن ہے۔

۵۔ تیسری دنیا سے تعلقات:۔

تیسری دنیا میں غریب اور افریقہ و ایشیا کی ریاستیں شامل ہیں۔ پاکستان نے ابتدا ہی سے تیسری دنیا کے ممالک کے ساتھ قریبی تعلقات قائم رکھے ہوئے ہیں اور ان ممالک کو درپیش مسائل کے حل کے لئے ہمہ وقت کوشاں ہے پاکستان نے اقوام متحدہ کے اندر تیسری دنیا کی پالیسیوں کی ہمیشہ حمایت کی ہے اور انہیں ایک مرکز تلے جمع کرنے اور ترقی یافتہ ممالک کے استحصال سے بچانے کے لئے باہمی اتحاد پر زور دیا ہے۔

قائداعظم نے تیسری دنیا اور ایشیائی ممالک سے قریبی تعلقات قائم کرنے پر

زور دیتے ہوئے فرمایا تھا۔

"میں ایشیائی اقوام اور بالخصوص مسلم اقوام میں ہم آہنگی، مقصد کی وحدت اور مکمل افہام و تفہیم کی ضرورت پر زور دیتا ہوں کیونکہ ایشیائی اتحاد عالمی امن اور خوشحالی کے حصول میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔"

۶۔ عالمی طاقتوں سے تعلقات:۔

پاکستان کی سرحدیں دنیا کے طاقتور ترین ممالک روس اور چین سے ملتی ہیں اس لئے پاکستان کی ہمیشہ یہ پالیسی رہی ہے کہ تمام عالمی طاقتوں سے خوشگوار تعلقات قائم رکھے پاکستان کی اس پالیسی پر ابتدائی دور میں امریکہ کافی ناراض تھا لیکن بعد میں امریکی چینی مفاہمت کے باعث امریکہ کا رویہ تبدیل ہو گیا۔ اب پاکستان کے تمام بڑی طاقتوں کے ساتھ خوشگوار تعلقات ہیں۔

۷۔ حق خود ارادیت کی حمایت:۔

پاکستان نے ہمیشہ دنیا کی مظلوم اقوام کی بھرپور حمایت کی ہے اور ان کی آزادی و حق خود ارادیت کا علمبردار رہا ہے پاکستان نے ہمیشہ فلسطین کے عوام کی آزادی جنوبی افریقہ کے عوام پر ظلم کے خلاف آواز بلند کی اور ان کی جدوجہد آزادی میں بھرپور کردار ادا کیا۔ موزمبیق پر ظلم اور زمبابوے کی تحریک آزادی میں پاکستان نے نمایاں خدمت انجام دیں۔

قائداعظم نے اس اصول کی حمایت کرتے ہوئے امریکی عوام کے نام ایک پیغام میں کہا تھا۔

"ہماری خارجہ پالیسی کی بنیاد تمام اقوام عالم کے ساتھ دوستی اور خیرسگالی ہے ہم دنیا کے کسی ملک یا قوم کے خلاف جارحانہ عزائم نہیں رکھتے۔ ہم قومی اور بین الاقوامی معاملات میں دیانت اور انصاف کے اصولوں پر یقین رکھتے ہیں ہم دنیا میں امن و خوشحالی میں اضافہ کے لئے ہر ممکن امداد کو تیار ہیں پاکستان کبھی بھی دنیا کے مظلوم اور کمزور لوگوں کو امداد دینے اور اقوام متحدہ کے اصولوں کی پابندی کرنے میں کوئی کمی نہیں چھوڑے گا۔"

پاکستان اور بھارت کے تعلقات

پاکستان اور بھارت کے تعلقات کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ بھارت نے پاکستان کے وجود کو روز اول سے ہی تسلیم نہیں کیا۔ اس وجہ سے پاکستان کی قومی سلامتی اور تحفظ کا مسئلہ انتہائی اہم رہا ہے۔ قیام پاکستان کے فوراً بعد بھارت نے پاکستان کے لئے مشکلات پیدا کرنی شروع کر دیں تھیں۔ فرقہ وارانہ فسادات۔ کی وجہ سے لاکھوں مسلمان بے سرو سامانی کی حالت میں پاکستان آئے۔ حکومت پاکستان کو ان مہاجرین کی آباد کاری کے لئے بڑی محنت اور جانفشانی سے کام لینا پڑا۔

ابتدائی دور میں پاکستان اور بھارت کے درمیان جو اہم مسائل تھے وہ نہری پانی کا تنازعہ اور مسئلہ کشمیر تھا۔ پانی کا تنازعہ حل کرنے کے لئے ستمبر ۱۹۶۰ء کو انڈس واٹر ٹریٹی" پر کراچی میں صدر ایوب خان، بھارتی وزیراعظم جواہر لال نہرو اور چیئرمین عالمی بنک اسے بی ایلف نے دستخط کئے

بھارت کا ابتداء میں یہ موقف تھا کہ کشمیریوں کو استصواب رائے کا حق دیا جائیگا لیکن ۱۹۴۸ء کی جنگ بندی کے بعد بھارت اپنے وعدہ سے منحرف ہو گیا۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے لئے اقوام متحدہ نے کئی ثالث مقرر کئے۔ لیکن بھارتی ہٹ دھرمی کے سامنے ان کی کوئی پیش نہیں گئی۔ اکتوبر ۱۹۶۰ء میں ایوب خان نے مسئلہ کشمیر پہ تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔

"ہمارے ذرائع نقل و حمل، ہمارے دریا اور کشمیر میں فائر بندی لائن ایسے تمام عوامل اس بات کی غمازی کرتے ہیں۔ کہ ہماری گردن دوسروں کی پکڑ میں ہے۔"

۱۹۶۲ء میں پاکستان نے سلامتی کونسل کا اجلاس بلانے کا مطالبہ کیا اور روس نے اسے ویٹو کر دیا۔ ایوب خان نے اسے براہ راست حل کرنے کی کوشش کی۔ جس کے تحت دسمبر ۱۹۶۲ء سے مئی ۱۹۶۳ء تک دونوں ممالک کے وزراء خارجہ کے مابین بات چیت ہوتی رہی۔ لیکن اس سے کوئی حل نہ نکلا۔

مسئلہ کشمیر ہی کی بدولت ستمبر ۱۹۶۵ء کو دونوں ملکوں کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔

دونوں متحارب ممالک نے ۱۹۶۶ء کو معاہدہ تاشقند پر دستخط کئے اعلان تاشقند کے بعد بھی دونوں ممالک کے تعلقات کو دوستانہ یا خوشگوار نہیں کہا جا سکتا کیونکہ پنڈت نہرو کی طرح ان کی بیٹی اندرا گاندھی بھی کشمیر کو بھارت کا اٹوٹ انگ قرار دیتی رہی۔

پاک بھارت تعلقات ۱۹۷۱ء کے شروع میں ایک بار پھر نازک رخ اختیار کر گئے جب بھارت کے ایک مسافر بردار طیارہ فوکر فرینڈشپ کو اغوا کر کے لاہور میں اتار لیا گیا۔ بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ یہ بھارت کی ایک چال تھی۔ بہر حال اس طیارے کے اغواء کا بہانہ بنا کر بھارت نے فروری ۱۹۷۱ء کو اپنے علاقوں پر سے پاکستانی طیاروں کی پروازیں بند کر دیں۔ اس سے پاکستان کے دونوں بازوؤں کے درمیان فضائی رابطہ میں رکاوٹ ڈالنے کا بھارتی منصوبہ پورا ہو گیا۔ بھارت نے مشرقی پاکستان میں حالات خراب کئے بالآخر مشرقی پاکستان ہم سے الگ ہو کر ایک آزاد ملک بنگلہ دیش بن گیا

شملہ معاہدہ ۱۹۷۲ء

پاک بھارت جنگ ۱۹۷۱ء کے نتیجہ میں پاکستان کے ۹۳ ہزار قیدی مشرقی پاکستان کے علاوہ مغربی پاکستان کا ۵ ہزار مربع میل کا علاقہ بھارت کی تحویل میں چلا گیا۔ جنگ سے متعلقہ امور طے کرنے کے لئے ۲۸ جون سے ۲ جولائی تک دونوں ممالک کے مابین بات چیت ہوئی اس بات کے نتیجہ میں ۲ جولائی ۱۹۷۲ء کو معاہدہ شملہ پر دستخط ہوئے۔ پاکستان کی طرف سے صدر مسٹر بھٹو (بعد میں وزیر اعظم) اور ہندوستان کی طرف سے مسز اندرا گاندھی نے دستخط کئے اس معاہدے کے اہم نکات حسب ذیل ہیں۔

۱۔ دونوں ممالک نے اس سے اتفاق کیا کہ باہمی جھگڑوں اور تصادم کی کیفیتوں کو ختم کر دیں گے۔ جو ان کے باہمی تعلقات میں حائل رہی ہیں دوستانہ تعلقات کو فروغ دینے اور برصغیر میں پائیدار امن کے لئے اقدامات کریں گے۔

۲۔ باہمی اختلافات پُرامن ذرائع سے بات چیت اور دوسرے پرامن طریقوں سے حل کریں گے۔ اور ایسے اقدامات سے اجتناب کریں گے۔ جو باہمی جنگ کا باعث بن سکتے ہیں۔

۳۔ دونوں ممالک ایک دوسرے کی قومی استحاد، علاقائی سالمیت، سیاسی

آزادی اور مساوی خود مختاری کا احترام کریں گے۔

۴۔ دونوں ممالک ایک دوسرے کے خلاف طاقت استعمال کرنے کی دھمکیاں دینے سے باز رہیں گے اور ایک دوسرے کے خلاف غلط قسم کا پروپیگنڈہ نہیں کرینگے۔

۵۔ دونوں ممالک نے تعلقات معمول پر لانے کے لئے اس بات پر اتفاق کیا کہ پاکستانی اور بھارتی فوجیں بین الاقوامی سرحدوں پر واپس بلالی جائیں گی۔ اور ۱۷ر دسمبر ۱۹۷۱ء کی جنگ بندی کی بنیاد پر جموں وکشمیر میں ہونے والی کنٹرول لائن کا فریقین احترام کریں گے ۔[1]

۶۔ اس سمجھوتے کے نافذ ہونے کے ۳۰ دن کے اندر اندر فوجوں کی واپسی عمل میں آجائے گی۔ معاہدہ میں گنجائش رکھی گئی کہ حکومتوں کے سربراہ پھر ملاقات کریں گے لیکن اس سے پہلے فریقین کے نمائندے پائیدار امن کے قیام اور تعلقات کو معمول پر لانے کی تفصیلات اور انتظام کریں گے۔

شملہ معاہدہ پر عملدرآمد کے لئے ۲۸ر اگست ۱۹۷۳ء کو "معاہدہ دہلی" پر دستخط ہوئے۔ اس معاہدے کے تحت بھارت نے ۵ ہزار مربع میل کا علاقہ پاکستان کو واپس کر دیا اور ۹۳ ہزار جنگی قیدیوں کی واپسی کا سلسلہ ستمبر ۱۹۷۳ء میں شروع ہو گیا۔ اس معاہدے کے تحت ۱۹۵ جنگی قیدیوں کو بھی رہائی مل گئی جن پر بنگلہ دیش کی حکومت مقدمہ چلانا چاہتی تھی۔

۱۸ر مئی ۱۹۷۴ء کو بھارت نے ایٹمی دھماکہ کیا جس سے نہ صرف پاکستان بلکہ جنوبی ایشیا کا امن تباہ ہونے کے خطرات سامنے آگئے۔ پاکستان نے جنوبی ایشیا کو ایٹم سے پاک علاقہ قرار دینے کی جدوجہد کی۔ جنوب مشرقی ایشیا کے تمام ممالک نے پاکستان کے موقف کی حمایت کی۔ بھارت نے بین الاقوامی سطح پر اعلان کیا۔ کہ وہ ایٹمی توانائی کو صرف پرامن مقاصد کے لئے استعمال کرے گا۔ اس کے ساتھ ہی پاکستان اور بھارت کی حکومتوں کے مابین مذاکرات کا سلسلہ جاری رہا جس کے

---

[1] اس دفعہ کے تحت بھارت جموں وکشمیر میں جنگ بندی لائن کو کنٹرول لائن کے طور پر قبول کرانے میں کامیاب ہو گیا۔ دوسرے الفاظ میں مسئلہ کشمیر معاہدہ شملہ کی نظر ہو گیا۔

نتیجہ میں مواصلات، تجارت اور سفارتی تعلقات بحال ہو گئے۔

۵ر جولائی ۱۹۷۷ء کو جنرل ضیاء الحق کے برسراقتدار آنے کے بعد بھارت سے تعلقات استوار کرنے کے لئے متعدد کوششیں کی گئیں۔ لیکن بھارت نے سرد مہری کا رویہ اپنائے رکھا۔ اکتوبر ۱۹۸۴ میں اندرا گاندھی کے قتل کے بعد ان کے بیٹے راجیو گاندھی برسراقتدار آئے تو امید تھی کہ موصوف اپنے رویے میں تبدیلی پیدا کریں گے۔ لیکن انہوں نے بھی اپنی ماں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ضیاء دور میں ہٹ دھرمی کا رویہ اختیار کئے رکھا اور پاکستان پر مختلف الزام لگائے کہ پاکستان خالصتان تحریک میں ملوث ہے۔ پاکستان ایٹمی ہتھیار بنا رہا ہے پاکستان جارحانہ عزائم رکھتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

سیاچن گلیشیئر پر بھارت نے ۱۹۸۲ء میں پہلی بار فوجی کارروائی کی اور جون ۱۹۸۴ء تک اس گلیشیئر کے شمال مغرب میں واقع تین پہاڑوں پر قبضہ کر لیا ۱۹۸۴ء میں اس مسئلے پر دونوں ممالک کے مابین فوجی جھڑپیں بھی ہوئیں۔ عالمی رائے عامہ کے دباؤ پر بھارت نے بات چیت کے ذریعے اس مسئلے کو حل کرنے کے لئے آمادگی ظاہر کی۔ مگر بالآخر اس علاقے کو مقبوضہ کشمیر کا حصہ قرار دے کر بات چیت سے انکار کر دیا

دسمبر ۱۹۸۵ء میں قائم ہونے والی جنوبی ایشیائی ایسوسی ایشن برائے علاقائی تعاون (سارک) کے بھارت اور پاکستان ممبر ہیں۔ اس ایسوسی ایشن کا مقصد جنوبی ایشیا کے ممالک کے مسائل باہمی گفت و شنید کے ذریعے حل کرنا ہے اور ان کے اتحاد کو فروغ دینا ہے۔ دسمبر ۱۹۸۸ء کو سارک کانفرنس کا چوتھا سربراہی اجلاس پاکستان کے دارالحکومت اسلام آباد میں ہوا۔

۱۶ر نومبر کے عام انتخابات میں پیپلز پارٹی کی کامیابی کی وجہ سے محترمہ بے نظیر بھٹو وزیر اعظم پاکستان کا عہدہ سنبھال چکی تھیں۔ اس کانفرنس نے ۲۸ سال بعد پاک بھارت سربراہ کانفرنس کا موقع بھی فراہم کیا۔ سارک اجلاس ۲۹ر تا ۳۱ر دسمبر جاری رہا ۳۱ر دسمبر کو پاکستان اور بھارت نے تین معاہدوں پر دستخط کئے۔

۵۳۔ برفانی تودہ (طول ۷۰ کلومیٹر اور عرض ۲ کلومیٹر)

۱- ایٹمی تنصیبات پر حملہ نہ کرنے کا سمجھوتہ

اس سمجھوتے کے تحت دونوں فریق بلاواسطہ یا بالواسطہ ایسی کارروائی سے سے باز رہیں گے۔ جس کا مقصد ایک دوسرے کی ایٹمی تنصیبات یا سہولتوں کو نقصان پہنچانا یا تباہ کرنا ہو۔

۲- ثقافتی تبادلوں کے فروغ کا سمجھوتہ

اس سمجھوتے کی رو سے دونوں ممالک فنون لطیفہ، ثقافت، آثار قدیمہ، تعلیم ابلاغ عامہ اور کھیلوں کے سلسلے میں تعلقات کو فروغ دیں گے۔ معاہدے کے تحت ماہرین تعلیم، دانشور اور پروفیسر حضرات ایک دوسرے ملک کا دورہ کر کے لیکچر دے سکیں گے۔ اور مطالعاتی دورے کر سکیں گے مذہبی اسکالروں، فنکاروں، کھلاڑیوں اور صحافیوں کی تنظیمیں باہمی انتظامات کے تحت دورے کر سکیں گی۔ معاہدے کے تحت اس بات کا خیال رکھا جائے گا۔ کہ دونوں ملکوں کے تعلیمی اداروں میں پڑھائی جانے والی نصابی کتب میں ایک دوسرے کی دل آزاری کا سبب بننے والا مواد شامل نہ ہو۔

۳- دوہرے ٹیکسیشن سے بچاؤ کا سمجھوتہ

اس سمجھوتے کا تعلق بین الاقوامی فضائی ٹرانسپورٹ سے حاصل ہونے والی آمدنی پر دوہرے ٹیکس سے بچاؤ سے ہے۔ اس سمجھوتے کا اطلاق پاکستان میں انکم ٹیکس سپر ٹیکس اور سرچارج پر اور بھارت میں انکم ٹیکس بشمول سرچارج اور سپر ٹیکس پر ہوگا۔ سمجھوتے کے مطابق کسی ایک ملک کے تجارتی ادارہ کو بین الاقوامی ٹریفک آپریشن سے حاصل ہونے والی آمدنی دوسرے ملک میں ٹیکس سے مستثنیٰ ہوگی۔ اس کا اطلاق "پول" میں شراکت مشترکہ بزنس یا بین الاقوامی آپریٹنگ ایجنسی پر بھی ہوگا۔

ان سمجھوتوں پر دونوں ممالک کے سیکرٹری خارجہ ہمایوں خان اور مسٹر مہیتی نے وزیر اعظم محترمہ بینظیر بھٹو اور راجیو گاندھی کی موجودگی میں دستخط کئے۔ یہ تقریب ایوان صدر میں ہوئی۔

بھارتی وزیراعظم راجیو گاندھی نے باہمی تعلقات کو بہتر بنانے کے لئے جولائی ۱۹۸۹ء میں بھی پاکستان کا دورہ کیا۔ دونوں ممالک کے وزرائے اعظم نے بات

چیت میں باہمی تعلقات کو بہتر بنانے کے لئے اتفاق کیا۔ محترمہ بے نظیر نے کہا کہ پاکستان بھارت کے ساتھ برابری اور خودمختاری کی بنیاد پر اچھی ہمسائیگی اور تعاون پر مبنی تعلقات کو بڑی اہمیت دیتا ہے اور پاکستان بھارت کے ساتھ جموں و کشمیر کے مسئلے سمیت تمام تصفیہ طلب مسائل کو شملہ سمجھوتے کے تحت قدم بہ قدم حل کرنا چاہتا ہے تاکہ دونوں ملکوں کے درمیان پائیدار تعلقات قائم ہو سکیں۔ راجیو گاندھی نے اس کے جواب میں کہا۔ ہم بالادستی قائم کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔ پاکستان کی خودمختاری کا احترام کرتے ہیں۔ ہم چھوٹی چھوٹی باتوں پر ایک دوسرے سے دور رہے تو بہت پیچھے رہ جائیں گے۔ راجیو گاندھی کے اس دورے سے یہ امید کی جانی چاہئے کہ جلد دونوں ممالک کے تعلقات معمول پر آ جائیں گے اور دونوں ممالک کے عوام ترقی کی راہ پر گامزن ہو سکیں گے۔

پاکستان اور امریکہ کے تعلقات

پاکستان کے پہلے وزیراعظم جناب لیاقت علی خاں کو روس کے اسٹالن اور امریکہ کے صدر ٹرومین نے دورہ کرنے کی دعوت دی۔ لیاقت علی خان روس کو چھوڑ کر امریکہ چلے گئے جس سے ابتدائی دور میں ہی امریکہ اور پاکستان کے تعلقات بہت اچھے ہو گئے۔

۱۹۵۴ء میں پاکستان اپنی سالمیت اور اقتصادی بحالی کے لیے سیٹو[۴] اور سینٹو[۵] کا ممبر بنا تو اس کا مغربی بلاک سے مضبوط رشتہ قائم ہو گیا۔ ان معاہدوں کی بدولت پاکستان کو ۱۹۵۴ء سے ۱۹۶۵ء تک امریکہ سے ڈیڑھ ارب ڈالر کی فوجی اور تین ارب ڈالر کی اقتصادی امداد ملی۔ ان معاہدوں سے پاکستان، ایران اور ترکی ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔ پاکستان کو ان معاہدوں کی بدولت سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ اس کی غیر جانبدارانہ حیثیت ختم ہو گئی۔

۱۹۶۰ء میں امریکہ میں جان کینیڈی نے اقتدار سنبھالا تو انہوں نے بھارت کی طرف داری شروع کر دی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ امریکہ بھارت کے ذریعے چین پر دباؤ ڈالنا چاہتا تھا۔ ان حالات میں پاکستان کو بھی اپنی پالیسی تبدیل کرنا پڑی اور پاکستان نے روس اور چین سے تعلقات بڑھانا شروع کر دیئے۔ ۱۹۶۲ء میں چین اور بھارت کے مابین جھڑپیں ہونے لگیں تو بھارت کو امریکہ اور روس سے بھاری امداد ملنے لگی۔ صدر ایوب کو خدشہ لاحق ہوا کہ بھارت یہ ہتھیار کہیں پاکستان کے خلاف استعمال نہ کرنے لگے۔ صدر ایوب خان کے یہ خدشات درست ثابت ہوئے اور ۱۹۶۵ء کی جنگ میں امریکی ہتھیار پاکستان کے خلاف استعمال ہوئے۔ پاکستان نے امریکہ کی ویت نام پالیسی کو بھی تنقید کا نشانہ نہ بنایا۔ صدر ایوب نے کہا۔

۴۔ سیٹو کا قیام ۸ ستمبر ۱۹۵۴ء میں آیا۔ ستمبر ۱۹۷۲ء میں پاکستان اس معاہدہ سے الگ ہو گیا۔

۵۔ سینٹو کا قیام ۲۴ فروری ۱۹۵۴ء میں آیا۔ ۱۹۷۹ء میں پاکستان اس سے علیحدہ ہو گیا۔

"پاکستانی عوام اپنے ملک کی سالمیت کے لیے اقتصادی مشکلات کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہیں وہ دوستی کے خواہاں ہیں نہ کہ غلامی کے"!

۱۹۶۸ء میں نکسن کے برسر اقتدار آنے کے بعد اگرچہ دونوں ممالک کے تعلقات بہت اچھے ہو گئے۔ لیکن امریکہ نے ۱۹۷۱ء کی پاک بھارت جنگ میں پاکستان کی کوئی مدد نہ کی۔ دوسری طرف بھارت روس کی مدد سے مشرقی پاکستان کو ایک علیحدہ مملکت بنگلہ دیش بنانے میں کامیاب ہو گیا۔

۱۹۷۱ء کے المیہ کے بعد مسٹر بھٹو نے ۱۹۷۳ء میں امریکہ کا دورہ کیا۔ نکسن دوبارہ منتخب ہو چکے تھے۔ امریکی صدر نے بحالی جمہوریت اور شملہ معاہدہ جولائی ۱۹۷۲ء کی تعریف کی اور بھرپور امداد کا یقین دلایا۔

۱۹۷۴ء میں امریکی وزیر خارجہ ہنری کسنجر نے پاکستان کا دورہ کیا۔ بھٹو کسنجر مذاکرات میں جنوبی ایشیا کو ایٹمی ہتھیاروں سے پاک علاقہ قرار دینے۔ پاکستان کی امداد اور مشرق وسطیٰ کا پرامن منصفانہ تصفیہ وغیرہ کے امور زیر بحث آئے۔ اسی دوران مئی ۱۹۷۴ء میں بھارت نے پہلا ایٹمی دھماکہ کیا۔ تو پاکستان کے لیے ایٹمی میدان میں پیش رفت کرنا نہایت ضروری ہو گیا۔

چنانچہ پاکستان نے فرانس سے ری پروسیسنگ پلانٹ کی خریداری کا ۱۹۷۶ء میں ایک معاہدہ کیا۔ امریکہ نے پاکستان کے اس معاہدے کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا اور ۱۹۷۶ء میں برسر اقتدار آنے والے صدر جمی کارٹر نے فرانس کی حکومت پر شدید دباؤ ڈالا کہ وہ اس معاہدے کو منسوخ کر دے۔ فرانس نے امریکی دباؤ کے تحت معاہدہ کو منسوخ تو نہ کیا البتہ فی الوقت اس پر عملدرآمد سے معذوری ظاہر کر دی۔ ۱۹۷۷ء میں بھٹو حکومت کو زوال ہوا اور جنرل ضیاء الحق نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی۔

۲۱ دسمبر ۱۹۷۹ء کو روس نے کھلی جارحیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے افغانستان پر چڑھائی کر دی۔ امریکی مفادات کو خطرہ لاحق ہوا تو دسمبر ۱۹۸۰ء میں صدر ریگن نے برسر اقتدار آنے کے بعد خارجہ پالیسی کا از سر نو جائزہ لیا۔ اس میں پاکستان کو فوجی لحاظ سے مضبوط کرنا سر فہرست رکھا گیا۔ ۱۹۵۹ء کے پاک امریکی باہمی تعاون کے معاہدے کی تجدید کی گئی تاکہ پاکستان کو اقتصادی امداد بھی دی جا سکے۔ دسمبر ۱۹۸۲ء میں صدر پاکستان جناب

ضیاء الحق نے امریکہ کا دورہ کیا۔ دونوں ممالک کے تعلقات ایک بار پھر بحال ہو گئے پاکستان نے امریکہ سے ۳ ارب ۲۰ کروڑ ڈالر کی اقتصادی اور فوجی امداد کا سمجھوتہ کیا۔ پاک بحریہ کے لئے چار جنگی جہاز اور پاک فضائیہ کے لئے چالیس ایف ۱۶ خریدے گئے۔

مارچ ۱۹۸۶ء میں امریکی کانگریس نے چھ سالہ مدت (۱۹۸۷-۹۳ء) کے لئے پاکستان کو چار ارب دو کروڑ ڈالر مالیت کی امداد دینا منظور کی۔ اس میں دو ارب ۲۸ کروڑ اقتصادی امداد کے لئے مخصوص کئے اور ایک ارب ۷۴ کروڑ ڈالر فوجی سامان کی خریداری کے لئے مؤخرالذکر قرضہ ۵ بز کی رعایتی شرح سود پر مہیا کیا گیا۔

جولائی ۱۹۸۶ء کو وزیر اعظم محمد خان جونیجو کی سربراہی میں ایک وفد امریکہ گیا امریکی صدر ریگن اور ان کے رفقاء کار نے پاکستانی وفد کا گرمجوشی سے خیر مقدم کیا ۱۷ جولائی کو واشنگٹن میں پاکستان اور امریکہ کے مابین جدید ترین اور حساس ٹیکنالوجی کی منتقلی کے معاہدے پر دستخط ہوئے۔ اس موقع پر پاکستان کے ساتھ ۱۹۵۹ء کے سلامتی کے سمجھوتے کی از سر نو تجدید بھی ہوئی۔ یہ بھی طے پایا گیا کہ غیر ملکی جارحیت کی صورت میں امریکہ پاکستان کی مدد کرے گا۔

جون ۱۹۸۹ء میں وزیر اعظم پاکستان محترمہ بے نظیر بھٹو کی قیادت میں ایک وفد امریکہ گیا۔ امریکی صدر جارج بش نے وائٹ ہاؤس میں استقبالی اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔ جمہوریت بہت اچھی چیز ہے۔ یہ قوم کے لئے توانائی کا باعث ہوتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ امریکہ پاکستان میں بحالی جمہوریت کی قدر کرتا ہے۔ صدر موصوف نے ... بارے میں وزیر اعظم پاکستان کو، پاکستانی عوام کو اور مسلح افواج کو سلام پیش کرتا ہوں جنہوں نے آئینی طریقے پر عمل کرتے ہوئے دوبارہ پاکستان میں جمہوریت قائم کی ہے۔ وزیر اعظم محترمہ بے نظیر بھٹو نے جوابی تقریر میں کہا کہ امریکہ اور پاکستان دوست بھی ہیں اور شریک کار بھی۔ پاکستان سے آمریت اور ڈکٹیٹر شپ کا دور ختم ہو گیا ہے میں انسانی وقار اور قانون کی بالادستی کے لئے یہاں موجود ہوں۔

محترمہ بے نظیر بھٹو کے دورہ امریکہ کے دوران امریکہ اور پاکستان میں تعلیم انسداد منشیات اور ہاؤسنگ میں تعاون کے ۴۶۵ ملین ڈالر کے معاہدوں پر

دستخط ہوئے۔ معاہدے کے تحت پرائمری تعلیم کو عام کرنے کے لئے امریکہ ۲۸۰ ملین ڈالر اور منتخب تعلیمی اداروں کا معیار بہتر بنانے کے لئے ۸۰ ملین ڈالر فراہم کرے گا۔ جب کہ نجی شعبہ کے ذریعے رہائشی ضروریات پوری کرنے کے لئے ۵۰ ملین ڈالر کی امداد امریکہ دے گا۔ یہ پروجیکٹ پاکستان کی اقتصادی ترقی کے لئے امریکہ کے چھ سالہ ۲۸۰۲ بلین ڈالر کے امدادی پیکج کا ایک حصہ ہے اس دورہ کے موقع پر ہارورڈ یونی ورسٹی کی طرف سے محترمہ بے نظیر بھٹو کو ڈاکٹریٹ آف لاء کی اعزازی ڈگری بھی عطا کی گئی۔ اس موقع پر انہیں دنیا کی ایک حوصلہ مند ترین خاتون اور اپنی قوم کے لیئے امید کا "سمبل" قرار دیا گیا۔ بے نظیر بھٹو پہلی پاکستانی لیڈر ہیں۔ جنہیں امریکہ کی کسی بڑی یونی ورسٹی نے اعزازی ڈگری دی ہے۔

○

پاکستان اور چین کے تعلقات

عوامی جمہوریہ چین کو وزیر اعظم لیاقت علی خان نے اس کی آزادی کے صرف تین دن بعد تسلیم کر لیا تھا۔ اس کی بڑی وجہ پاکستان کی آزاد خارجہ پالیسی تھی ۱۹۴۹ء میں برطانیہ اور بھارت نے اپنے اپنے ملک کی کرنسی کی قدر میں کمی کی تو انہوں نے پاکستان کو بھی ایسا کرنے کو کہا لیکن پاکستان نے انکار کر دیا۔ ہندوستان نے پاکستان کا تجارتی بائیکاٹ کیا تو چین نے پاکستان کے ساتھ مال کے بدلے مال کا سمجھوتہ کر کے تعلقات کی ابتداء کی۔ ۱۹۵۰ء میں کوریا کی جنگ کا آغاز ہوا تو پاکستان نے امریکہ کی حمایت نہ کی۔ اس جنگ کی بدولت پاک چین تجارت میں کئی گنا اضافہ ہوا۔

۱۹۵۴ء میں پاکستان سیٹو اور سینٹو میں شامل ہوا۔ تو چین کو تشویش ہوئی بھارت نے ایک ہنگامہ برپا کر دیا۔ روس اور مصر کو پاکستان کے خلاف بھڑکایا۔ روس کے برعکس چین نے کوئی احتجاجی رویہ اختیار نہ کیا ۱۹۵۵ء کو بنڈونگ کانفرنس کے موقع پر پاکستان کے وزیر اعظم محمد علی بوگرہ نے چینی وزیر اعظم چو این لائی کو سیٹو اور سینٹو میں شامل ہونے کی حقیقت سے آگاہ کیا۔

فیلڈ مارشل ایوب خان نے اکتوبر ۱۹۵۸ء کو حکومت کی باگ ڈور سنبھالی تو اگلے سال یعنی ۱۹۵۹ء میں پاک چین تعلقات میں کچھ کشیدگی پائی گئی اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ حکومت پاکستان کو بھارتی ذرائع سے ایک نقشہ ملا۔ جس میں پاک چین سرحد کو غلط دکھایا گیا تھا۔

اور اس دوران گلگت کے مقام پر نامعلوم جہازوں کی پروازیں بھی دیکھی گئیں۔ یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ وہ چینی جہاز تھے ۱۹۶۱ء میں انقلابی حکومت نے اپنی خارجہ پالیسی کا از سر نو جائزہ لیا۔ جس کا مقصد دفاعی معاہدات میں رہتے ہوئے اشتراکی دنیا سے اختلافات کو دور کرنا تھا۔ پاکستان نے اقوام متحدہ کے اندر اور باہر اشتراکی چین کی حمایت کا اعلان کیا اور امریکی رویے پر نکتہ چینی کی جو اس نے چین کے بارے میں اپنایا ہوا تھا۔

۱۹۶۱ء میں ایوب خان نے امریکی قیادت سے صاف صاف کہہ دیا کہ چین

کو اقوام متحدہ کی رکنیت دی جائے۔ اسی سال ہند چینی کشمکش میں پاکستان نے
بھارت کو جارح قرار دیا۔

۱۹۶۲ء میں وزیر خارجہ مسٹر بھٹو پیکنگ تشریف لے گئے اور متنازعہ ۲۰۵۰
مربع میل علاقہ کا مسئلہ حل کر دیا اس معاہدے کی بدولت پاک چین تعلقات انتہائی خوشگوار
ہو گئے۔ اس سمجھوتے کے بعد ۱۹۶۳ء کو فضائی رابطہ اور تجارتی معاہدہ ہوا۔

۱۹۶۴ء میں ایوب خان نے چین کا تاریخی دورہ کیا۔ دورے کے بعد مشترکہ
اعلامیہ میں پہلی بار کشمیر میں استصواب رائے کی کھل کر حمایت کی گئی۔

ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ میں چین نے پاکستان کی بھرپور اقتصادی اور فوجی امداد
کی۔ جنگ کے بعد چینی صدر لیو شاؤ چائی نے پاکستان کا دورہ کیا۔ انہوں نے ایک موقع
پر کہا کہ اگر بھارت نے دوبارہ پاکستان پر حملہ کیا تو چین پاکستان کی بھرپور امداد
کرے گا۔ اسی سال شاہراہ ریشم کھول لی گئی۔

۱۹۷۰ء میں صدر پاکستان یحییٰ خان نے چین اور امریکہ کے تعلقات میں مفاہمت
پیدا کرانے میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔

۱۹۷۱ء میں پاک بھارت جنگ میں چین نے پہلے والے جوش و خروش کا مظاہرہ
نہیں کیا۔ کیونکہ وہ اس مسئلے کا حل سیاسی بنیادوں پر چاہتا تھا۔ بہرحال چین نے بنگلہ دیش
کو اس وقت تک تسلیم نہیں کیا جب تک پاکستان نے اسے تسلیم نہیں کر لیا۔

مسٹر بھٹو نے اسلامی ممالک کا دورہ کرنے کے بعد ۱۹۷۲ء کو ساٹھ رکنی وفد کے
ہمراہ چین کا دورہ کیا۔ سخت برف باری کے باوجود چینی عوام نے پاکستانی وفد کا شاندار
استقبال کیا۔ وزیر اعظم چو این لائی نے استقبالیہ تقریر میں ایک بار پھر پاکستان کو فوجی
امداد دینے کا وعدہ کیا۔ نیز یہ کہ چین کشمیری عوام کی جدوجہد کی حمایت کرتا رہے گا۔
لاڑکانہ شوگر مل، ٹیکسلا مشین سازی کا کارخانہ، فوجی ساز و سامان کی فراہمی پاکستان اور
چین کے درمیان سدا بہار دوستی کا ثبوت رہیں گے۔

۱۷ نومبر ۱۹۸۵ء کو وزیر اعظم پاکستان محمد خان جونیجو ۳۵ ارکان کے ہمراہ ہفت
روزہ دورے پر چین تشریف لے گئے۔ بیجنگ پہنچنے پر پاکستانی وفد کا شاندار
استقبال کیا گیا۔ اس دورے کے دوران سرکاری سطح پر ہونے والے مذاکرات میں تمام

اہم امور عالمی امور پر مکمل اتفاق رائے پایا گیا۔

۱۵ ستمبر ۱۹۸۶ء کو دونوں ملکوں کے درمیان پرامن ایٹمی تعاون کے سمجھوتے پر دستخط ہوئے۔ اس معاہدہ کا مقصد دھماکہ خیز مادہ کی تیاری اور فوجی مقاصد حاصل کرنا نہیں ہیں۔ بلکہ اس معاہدے کے تحت جو بھی ایٹمی آلات اور ساز و سامان فراہم ہو گا اس پر ایٹمی توانائی کے بین الاقوامی ادارہ کے تحفظات کا اطلاق ہو گا۔

جون ۱۹۸۷ء کو چین کا ایک وفد وزیر اعظم ژاؤ ژیانگ کی سربراہی میں پاکستان آیا۔ اس وفد نے ۲۲ جون کو وزیر اعظم پاکستان کے ساتھ مذاکرات کئے دونوں رہنماؤں میں عالمی اور علاقائی امور پر مکمل اتفاق رائے پایا گیا۔ رہنماؤں نے افغانستان اور کمپوچیا سے غیر ملکی فوجوں کی واپسی اور دونوں ممالک کی خود مختاری اور آزادانہ حیثیت کی بحالی کا مطالبہ کیا۔ مذاکرات کے نتیجے میں چین نے پاکستان کی اقتصادی اور فوجی امداد میں اضافے کا فیصلہ کیا۔ اس موقع پر اقتصادی و فنی تعاون کے ایک سمجھوتے پر دستخط ہوئے جس کے تحت چین پاکستان کو درمیانے اور چھوٹے منصوبوں کے لئے ۱۰ کروڑ یوآن (YUAN) کا بلاسودی قرضہ دے گا۔ اس سمجھوتے پر پاکستان کے وزیر خزانہ اور چین کے بیرونی اقتصادی تعلقات اور تجارت کے وزیر نے دستخط کئے۔ یہ قرضہ ۲۰ سال کے لئے ہو گا اور اس میں ۱۰ سال کی رعایتی مدت بھی شامل ہے۔

اس کے علاوہ یہ بھی طے کیا گیا کہ چین پاکستان کی بری فوج کے لئے تیزی سے حرکت کرنے والے ٹینک، توپیں اور بکتر بند گاڑیاں فراہم کرے گا۔ جب کہ فضائیہ کے لئے دنیا کے تیز رفتار ترین طیارے فراہم کئے جائیں گے۔ ایف۔ ۷ قسم کے یہ طیارے چین میں تیار ہوں گے۔ ان میں امریکی انجن نصب ہوں گے۔ ایف۔ ۷ قسم کے دو سو طیارے پاک فضائیہ میں شامل کئے جائیں گے۔

نومبر ۱۹۸۹ء میں عوامی جمہوریہ چین کے وزیر اعظم لی پنگ نے پاکستان کا چار روزہ دورہ کیا۔ ۱۵ نومبر کو پاکستان اور چین نے چار معاہدوں پر دستخط کئے۔ ایک معاہدے کے مطابق دونوں ممالک کے درمیان دوہرے ٹیکس سے اجتناب کا طریقہ کار طے کیا گیا۔ چین میں خدمات انجام دینے والے پاکستانیوں اور پاکستان میں خدمات انجام دینے والے چینی باشندوں کو اپنی آمدنی ٹیکس کے

ادائیگی نہیں کرنا پڑے گی۔ اس طرح چین اور پاکستان کے لوگ ایک دوسرے کے ساتھ تجارت سے جو آمدنی حاصل کریں گے اس پر بھی صرف ایک بار ٹیکس لیا جائے گا۔ باقی تین سمجھوتوں کے تحت چین پاکستان کو ۵ء۱۳ ملین ڈالر کا قرضہ بلا سود فراہم کرے گا۔ ایک پروٹوکول کا تعلق بلوچستان میں سڑکوں کی تعمیر کی مشینری کے لیے ۷ء۲ ملین ڈالر کے قرضے سے ہے۔ علاوہ ازیں افغان مہاجرین کے لیے جوتے، کمبل اور ڈبہ بند خوراک کی فراہمی کے لیے ۵ء۳ ملین یوان امداد دی جائے گی۔ بین الاقوامی امور پر دونوں لیڈروں محترمہ بے نظیر بھٹو اور لی پنگ کے نقطہ نظر میں مکمل یکسانیت پائی گئی۔ فریقین نے باہمی تجارت کا حجم بڑھانے کا فیصلہ کیا اور قابل تجارت اشیاء کی فہرست میں اضافے پر آمادگی ظاہر کی۔ پاک چین سیاحت کے فروغ کے لیے شاہراہ قراقرم کے اردگرد سیاحوں کے لیے سہولتوں کی فراہمی پر بھی اتفاق کیا گیا۔

وزیر اعظم لی پنگ نے ۱۶ نومبر کو ایک پریس کانفرنس کرتے ہوئے کہا کہ چین پاکستان کو ۳۰۰ میگا واٹ کا ایٹمی ری ایکٹر فراہم کرے گا۔ تاکہ پاکستان توانائی کے مسائل پر قابو پا سکے۔ یہ کینوپ کے بعد پاکستان کا دوسرا ایٹمی بجلی گھر ہوگا۔ چین یہ ایٹمی ری ایکٹر ۱۹۸۶ء کے معاہدے کے تحت دے رہا ہے۔ چشمہ کے مقام پر اس کی تنصیب کا کام آئندہ سال شروع ہوگا اور تقریباً ساڑھے پانچ سال بعد ۱۹۹۶ء میں مکمل ہو جائے گا۔ جو اس کام کے لیے کم از کم وقت ہوتا۔ یہ ری ایکٹر مکمل طور پر بین الاقوامی ایٹمی توانائی ایجنسی کے تحفظات کے تحت ہوگا۔

۳۱ دسمبر ۱۹۹۱ء کو پاکستان اور چین نے بیجنگ میں ایک سمجھوتے پر دستخط کئے۔ جس کے تحت چین پاکستان کو ۳۰۰ میگاواٹ کا ایٹمی ری ایکٹر فراہم کرے گا۔ یہ ایٹمی ری ایکٹر چشمہ کے مقام پر لگایا جائے گا۔ اور ۱۹۹۶ء تک مکمل ہو جائے گا۔ کینوپ کے بعد یہ پاکستان کا دوسرا ایٹمی بجلی گھر ہوگا۔ یہ پلانٹ ایٹمی توانائی کے بین الاقوامی ادارے کے تحفظات کے تحت کام کرے گا اور اسے پر امن مقاصد کے لئے استعمال کیا جائے گا۔ جس سے پاکستان میں اقتصادی ترقی کی رفتار بہت تیز ہو جائے گی اور توانائی کی ضرورت پورا کرنے میں مدد ملے گی۔ یہ سمجھوتہ پاک چین کے درمیان دیرینہ دوستی اور تعاون [illegible] کو ظاہر کرتا ہے۔

پاکستان اور فرانس کے تعلقات

فرانس سے اور پاکستان کے تعلقات ابتداء ہی سے بہت اچھے اور خوشگوار رہے ہیں۔ فرانس نے فوجی اور اقتصادی دونوں شعبوں میں ہمیشہ پاکستان کے ساتھ تعاون کیا۔ سابق صدر ایوب خان اور جنرل ڈیگال کے باہمی دوروں نے دونوں ممالک کے تعلقات خوشگوار بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔

جولائی ۱۹۷۲ء کو ذوالفقار علی بھٹو نے فرانس کے صدر پومپیدو کی دعوت پر فرانس کا سرکاری دورہ کیا۔ اس سے دونوں ممالک کے تعلقات مزید خوش گوار ہوئے ۱۹۷۴ء میں وزیر اعظم پاکستان جناب بھٹو صاحب صدر پومپیدو کے انتقال پر فرانس گئے تو نئے صدر ڈیسکاردیستان سے بھی ملاقات کی۔ اس ملاقات سے دونوں سربراہوں کو ایک دوسرے کو سمجھنے کا موقعہ ملا۔ دونوں ممالک کے مابین ایٹمی ری ایکٹر کے معاملے پر اکتوبر ۱۹۷۴ء میں ایک معاہدہ ہوا۔ فروری ۱۹۷۶ء میں انٹرنیشنل اٹامک انرجی ایجنسی نے اس معاہدے کی توثیق کی۔ گویا یہ ایک پکا بین الاقوامی معاہدہ ہے۔ لیکن امریکہ نہیں چاہتا تھا۔ کہ پاکستان یہ ری ایکٹر حاصل کرنے میں کامیاب ہو۔ لہٰذا امریکی صدر جمی کارٹر نے فرانس کی حکومت پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔

جولائی ۱۹۷۷ء میں جب پاکستان میں فوجی حکومت برسر اقتدار آئی اس وقت فرانس اور پاکستان کے درمیان تعلقات میں سرد مہری تھی۔ اس کی وجہ امریکہ کی یہ خواہش تھی کہ دونوں ممالک نیوکلر ری پروسیسنگ پلانٹ کا سودا منسوخ کر دیں۔ ۱۶ دسمبر ۱۹۷۷ء کو فرانس کی حکومت نے نیوکلیر پلانٹ کی فراہمی کو آئندہ نوٹس تک ملتوی کر دیا تاہم یہ اعلان بھی کر دیا کہ یہ التوا کنٹریکٹ کا خاتمہ نہیں ہے۔ ۱۰ فروری ۱۹۷۸ء کو فرانس کے وزیر اعظم ریمنڈ بارے RAYMOND BARRE نے کہا کہ فرانس اس معاہدے کی پاسداری کرے گا اور یہ سودا اسی صورت میں منسوخ کیا جائے گا۔ اگر پاکستان ایسا کرنا چاہے گا۔ تاہم فرانسیسی انتظامیہ امریکی دباؤ کے سامنے نہ ٹھہر سکی اور اس نے یہ معاہدہ ختم کرنے کے بجائے اس پر عملدرآمد روک دیا۔ اور اپنے آپ کو معاہدہ ختم کرنے کی زحمت سے بچا لیا۔ جس سے بین الاقوامی سطح پر اس کی آزادی اور خود مختاری پر حرف آتا۔

جنوری ۱۹۷۹ء میں سائنس اور ٹیکنالوجی کے وزیر مسٹر ارشاد چوہدری
نے فرانس کا دورہ کیا۔ ان کے مشن کے نتائج کو افشا نہیں کیا گیا۔ تاہم انہوں نے ایک
معاہدے پر دستخط کئے۔ جس کی رو سے پاکستان کو ۳۲ میراج III اور میراج V لڑاکا
طیارے ملے۔ ۳۲ کروڑ کا یہ معاہدہ زیادہ تر فرانسیسی قرضے پر مشتمل تھا۔

افغانستان میں روسی مداخلت کے بعد دونوں ممالک کے درمیان معاشی اور
سیاسی سطح پر تعلقات مزید بہتر ہو گئے۔ ستمبر ۱۹۸۰ء میں صدر ضیاء الحق نے فرانس کے
صدر سے مختصر ملاقات کی۔

مئی ۱۹۸۱ء میں فرانس میں سوشلسٹ حکومت نے اقتدار سنبھالا جنوری ۱۹۸۲ء
کو صدر ضیاء الحق دوسری بار فرانس گئے۔ اس کے بعد متعدد بار وفود کے تبادلہ کے نتیجہ
میں یہ واضح ہو گیا کہ دونوں ممالک کے خیالات میں بہت زیادہ مماثلت پائی جاتی ہے
فروری ۱۹۸۱ء میں فرانس نے افغانستان کے مسئلے پر ایک عالمی کانفرنس بلانے کی
تجویز پیش کی۔

فرانس پاکستان کو امداد دینے والے کنسورشیم کا ایک اہم ممبر ملک ہے کنسورشیم
کے ممبر کی حیثیت سے ۱۹۸۲ء تک فرانس نے پاکستان کو مختلف پروجیکٹس کے لئے
۵۲۰ ملین ڈالر کی امداد دی۔ ان پروجیکٹس میں تربیلا ڈیم اور چشمہ بیراج بھی شامل ہے
فرانس نے کھاد کے پلانٹ، کپڑے کے کارخانوں اور ایک سیمنٹ فیکٹری کی تعمیر میں بھی
مدد دی ہے۔

مئی ۱۹۸۷ء کو فرانس کے وزیر خارجہ مسیو جین برنارڈ ریمنڈ نے پاکستان کا دورہ
کیا۔ ایک پریس کانفرنس کے ذریعے اس نے تجویز پیش کی کہ ۱۹۷۸ء میں پاکستان کو چشمہ
ری پروسیسنگ پلانٹ کی فراہمی روک دینے کے فیصلے سے جو تنازعہ پیدا ہوا تھا اسے
عدالت سے باہرہ کر باہمی رضامندی سے حل کر لیا جائے تو پاکستان کو چشمہ کے مقام پر
چھ سو میگاواٹ کے ایٹمی بجلی گھر کے لئے امداد دی جا سکتی ہے اس پلانٹ سے ایٹمی
اسلحہ نہیں بنایا جا سکتا۔ اس موقع پر وزیر خارجہ نے صدر ضیاء الحق اور وزیر اعظم محمد خان
جونیجو سے ملاقات کے دوران بتایا کہ فرانسیسی صدر متراں اور وزیر اعظم ژاک شیراک
افغان مسئلے پر پاکستان کے جرأت مندانہ موقف کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اس خطے

میں استحکام کے لیے فرانس پاکستان کی متوازن پالیسی کی قدر کرتا ہے۔

جولائی ۱۹۸۹ء میں محترمہ بے نظیر نے فرانسیسی انقلاب کی ۲۰۰ ویں سالگرہ کے موقع پر صدر متراں کی دعوت پر چار روزہ فرانس کا دورہ کیا۔ وزیراعظم اور ان کے وفد کے اراکین کا فرانسیسی صدر اور وزیراعظم مائیکل روکارڈ نے انتہائی گرمجوشی سے استقبال کیا بے نظیر نے دورہ فرانس کے دوران فرانسیسی حکام کو پاکستان کے ایٹمی توانائی کے پروگرام سے بھی آگاہ کیا جس کے تحت پاکستان نے ۲۰۰۰ء تک ۴۰ ہزار میگاواٹ بجلی پیدا کرنے کا منصوبہ بنایا ہے فرانسیسی حکام نے اس کا مثبت جواب دیا اور کہا کہ فرانس پاکستان کو پراسیسنگ پلانٹ ضرور فراہم کرے گا اور اس سلسلے میں جملہ امور صدر متراں کے دورہ پاکستان کے دوران طے کئے جائیں گے۔ جو اگلے سال کے اوائل میں ہوگا۔ اس خیرسگالی کے دورہ کے دوران فرانسیسی صنعتوں کی کنفیڈریشن اور فیڈریشن آف پاکستان چیمبرز آف کامرس اینڈ انڈسٹری کے درمیان پاک فرانس کے نجی شعبہ میں اقتصادی تعاون اور مشترکہ تجارت کی کمیٹی کے قیام کے سلسلے میں ایک سمجھوتے پر دستخط ہوئے۔ اس سے دونوں ممالک کے درمیان تجارتی تعلقات اور پاکستان میں فرانسیسی سرمایہ کاری میں اضافہ سیاحت اور اطلاعات کے نتیجے میں باہم تبادلے کو فروغ حاصل ہوگا۔

پاکستان اور برطانیہ کے تعلقات

پاکستان نے ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو برطانیہ سے آزادی حاصل کی۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن پاکستان اور بھارت دونوں ممالک کا پہلا گورنر جنرل بننا چاہتا تھا۔ لیکن مسلم لیگ نے قائداعظم کی قیادت میں اس کی یہ خواہش پوری نہ ہونے دی۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے باؤنڈری کمیشن کے چیئرمین لارڈ ریڈکلف پر اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے بعض ایسے علاقے مثلاً ضلع گورداسپور اور بعض مسلم اکثریتی تحصیلیں بھارت کے حوالے کر دیں اگر یہ علاقے پاکستان کو مل جاتے تو بھارت کے لیے کشمیر تک رسائی کا کوئی راستہ باقی نہ رہتا وہ اپنی فوجیں کشمیر نہ بھیج سکتا اور مسئلہ کشمیر پیدا ہی نہ ہوتا۔

آزادی کے بعد پاکستان برطانوی دولت مشترکہ میں شامل ہو گیا۔ پاک بھارت کے اہم تنازعات مثلاً مسئلہ کشمیر، متروکہ املاک کا مسئلہ، مہاجرین کا مسئلہ، نہری پانی کا مسئلہ وغیرہ کو حل کرنے میں برطانوی دولت مشترکہ نے عملی طور پر کوئی کامیاب کوشش نہ کی [illegible] اور ۱۹۷۱ء کی پاک بھارت جنگوں میں بھی دولت مشترکہ کا کردار خاصا شرمناک رہا ۱۹۷۱ء کی جنگ میں مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن گیا تو برطانیہ اور دولت مشترکہ کے ممالک نے فوراً اسے تسلیم کر لیا ان حالات میں ۳۰ جنوری ۱۹۷۲ء کو پاکستان نے دولت مشترکہ سے علیحدگی اختیار کر لی۔ اس وقت کے سربراہ حکومت مسٹر بھٹو نے یہ وضاحت کر دی کہ دولت مشترکہ سے علیحدگی کا مطلب برطانیہ سے سفارتی تعلقات کو توڑنا نہیں ہے بلکہ ہائی کمشنر کی جگہ اب سفیر مقرر ہوں گے۔ پاکستان کے اس جرأت مندانہ فیصلہ سے دولت مشترکہ کے وقار کو ٹھیس پہنچی۔ دولت مشترکہ کے سیکرٹری جنرل مسٹر آرنلڈ اسمتھ نے ایک بیان میں کہا۔

"پاکستان نے دولت مشترکہ میں نمایاں کام کئے ہیں اور اس کی واپسی کا خیر مقدم کیا جائے گا۔"

۱۹۷۴ء میں برطانیہ نے پاکستان کے ساتھ خیرسگالی کے تعلقات بڑھانے شروع کیے۔ ترقیاتی پروگراموں کے لیے ۳۰ ملین پونڈ کا بلاسودی قرضہ دیا ۱۹۷۵ء میں ۵۴ ملین پونڈ کی امداد اور تربیلا ڈیم کی مرمت میں سہولت بہم پہنچانے کا اعلان کیا۔

۵ جولائی ۱۹۷۷ء کے انقلاب کے بعد برسر اقتدار آنے والی ضیاء گورنمنٹ نے پاکستان کی دولت مشترکہ میں دوبارہ شمولیت کا سوال اٹھایا۔ لیبر پارٹی کے برطانوی وزیراعظم جیمز کیلاہن نے پاکستان کا دورہ کیا۔ حکومت سے مذاکرات کے بعد ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے برطانوی وزیراعظم نے کہا کہ۔

"دولت مشترکہ میں پاکستان کی دوبارہ شمولیت کا فیصلہ تنہا پاکستان اور برطانیہ نہیں کر سکتے۔ دولت مشترکہ قوموں کی برادری کا ایک نام ہے اور اس میں کسی رکن کی شمولیت کا فیصلہ پوری برادری مشترکہ طور پر ہی کر سکتی ہے۔"

برطانوی وزیراعظم مارگریٹ تھیچر کی دعوت پر اپریل ۱۹۸۷ء میں پاکستان کا ایک وفد وزیراعظم محمد خان جونیجو کی سربراہی میں ایک ہفتے کے دورے پر برطانیہ تشریف لے گیا۔ ۸ اپریل ۱۹۸۷ء کو دونوں ممالک کے قائدین کے مابین مذاکرات ہوئے افغانستان کے مسئلے پر برطانیہ نے پاکستانی موقف کی مکمل حمایت کی۔ وزیراعظم جونیجو نے ایٹمی پروگرام کے سلسلے میں برطانوی وزیراعظم کو بتایا کہ پاکستان کا ایٹمی پروگرام قطعی پرامن ہے۔ پاکستان ایک غریب اور ترقی پذیر ملک ہے۔ اس لئے وہ ایٹمی دھماکہ یا ایٹمی اسلحہ نہیں بنانا چاہتا اور نہ ہی وہ اس کا متحمل ہو سکتا ہے۔ پاکستان کے لئے اقتصادی امداد اور دولت مشترکہ میں پاکستان کی دوبارہ شمولیت کے امور بھی زیر بحث آئے پاکستان کی اس وقت دولت مشترکہ میں شمولیت کی مخالفت صرف ہندوستان کی حکومت کر رہی تھی پاکستان میں بجلی کی فراہمی کے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے برطانیہ کی طرف سے ۴/۱ ۲ کروڑ پونڈ کی امداد دینے کے ایک معاہدے پر دستخط بھی ہوئے۔

جولائی ۱۹۸۹ء میں وزیراعظم محترمہ بے نظیر بھٹو وزیراعظم برطانیہ مسز مارگریٹ تھیچر کی دعوت پر برطانیہ کے آٹھ روزہ سرکاری دورے پر گئیں۔ دونوں خواتین قائدین کے درمیان اہم علاقائی اور بین الاقوامی معاملات پر مکمل ہم آہنگی اور اتفاق رائے پایا گیا مسز تھیچر نے پاکستان میں جمہوریت اور انسانی حقوق کی بحالی پر محترمہ بے نظیر بھٹو کو شاندار خراج تحسین پیش کیا۔ انہوں نے کہا کہ یہ دنیا بھر کی جمہوری قوتوں کی فتح ہے۔ انہوں نے پاکستان کی جرات مندانہ خارجہ پالیسی کو سراہا اور کہا کہ محترمہ بے نظیر نے بڑی پختہ کاری سے یہ پالیسی اختیار کی ہے انہوں نے افغان مسئلے اور سارک کے چیئرمین کی

حیثیت سے علاقائی تعاون کے سلسلے میں پاکستان کے کردار کی تعریف کی مسز بے نظیر نے اپنے یادگار دورہ برطانیہ پر شکریہ ادا کیا اور کہا کہ دونوں ملکوں کے درمیان دوطرفہ تعلقات کے امکانات زیادہ روشن ہو گئے ہیں۔

اس دورہ کے موقع پر برطانیہ اور پاکستان نے ۵۰ ملین پونڈ کے ایک اقتصادی امداد کے معاہدہ پر دستخط کئے۔ اس معاہدہ کے تحت برطانیہ کی طرف سے ۵۰ ملین پونڈ نجی شعبہ میں بجلی پیدا کرنے کے لئے فراہم کئے جائیں گے۔ یہ رقم آسان شرائط کے قرضوں کی صورت میں ہو گی۔ ایک دوسرے سمجھوتے کے تحت برطانیہ پاکستان کو ۲۵ ملین پونڈ کی امداد دے گا۔ اس امداد کو سماجی بھلائی کے منصوبوں پر خرچ کیا جائے گا۔

محترمہ بے نظیر کے اس دورہ کے موقع پر دولت مشترکہ کے تمام اراکین نے پاکستان کی دوبارہ دولت مشترکہ میں شمولیت کی متفقہ طور پر منظوری دی[1]۔ ۱۹۷۲ء میں پاکستان مشرقی پاکستان کے مسئلے پر دولت مشترکہ سے علیحدہ ہو گیا تھا۔ وقت نے ثابت کر دیا تھا کہ دولت مشترکہ سے علیحدگی کا فیصلہ جذباتی تھا اور محترمہ بے نظیر نے اپنے والد کی غلطی کا بڑی حد تک ازالہ کر دیا ہے۔ اس سے برطانیہ میں رہنے والے پاکستانیوں کے بے شمار مسائل کے حل میں مدد ملے گی۔

---

[1] یکم اکتوبر ۱۹۸۹ء میں پاکستان دوبارہ دولت مشترکہ کا ممبر بن گیا۔

پاکستان اور روس کے تعلقات

تمہید:۔ روس میں بالشویک پارٹی (کمیونسٹ پارٹی) کے قائد لینن کی سربراہی میں ۷ نومبر ۱۹۱۷ء کو اشتراکی انقلاب آیا۔ انقلابیوں نے روس کو سوویت یونین اشتراکی جمہوریہ (USSR) قرار دیا۔ روس پر تقریباً ۷۴ سال کمیونسٹ راج کا پرچم لہراتا رہا۔ دسمبر ۱۹۹۱ء میں گورباچوف کی پالیسیوں کی وجہ سے روس میں کمیونسٹ اقتدار کو زوال آیا اور سوویت یونین ختم ہو گیا اور اس کی جگہ "آزاد ریاستوں کی دولت مشترکہ" نے لے لی۔

پاکستان کے قیام سے قبل ہی سوویت یونین مسلم لیگ اور پاکستان کو سامراج کا پٹھو قرار دیا کرتا تھا۔ اسے پاکستان ایک مذہبی ریاست کے طور پر ہرگز قبول نہیں تھا۔ شاید اسے خطرہ تھا کہ اسلامی ریاست کا قیام اس کی مسلم ریاستوں میں علیحدگی کی تحریکوں کو ہوا دے گا۔ اس نے دونوں ممالک کے تعلقات سرد مہری سے شروع ہوئے۔

ابتدائی تلخیاں:۔ جولائی ۱۹۴۹ء میں وزیراعظم لیاقت علی خان کو پہلے روسی قائد اسٹالن نے اور بعد میں امریکی صدر ٹرومین نے اپنے اپنے ملک کا دورہ کرنے کی دعوت دی۔ لیاقت علی خان اسٹالن کی دعوت کو قبول کرنے کے باوجود امریکہ تشریف لے گئے۔ سوویت یونین کے ذرائع ابلاغ نے اس بات کو خاص طور پر تنقید کا نشانہ بنایا اور پاکستان کو مغربی بلاک کا حامی قرار دیا۔

۱۹۵۴ء میں پاکستان نے مغربی ممالک کے ساتھ دفاعی معاہدات سیٹو اور سینٹو میں شمولیت اختیار کی تو روس کو سخت تشویش ہوئی اسی اثناء میں بھارتی پروپیگنڈہ کی بناء پر بھارت روس کو اپنا ہمنوا بنانے میں کامیاب ہو گیا۔ ۱۹۵۵ء میں روسی رہنماؤں نے بھارت اور افغانستان کا سرکاری دورہ کیا۔ روسی رہنماؤں نے سری نگر میں کشمیر کو بھارت کا حصہ قرار دیا اور پختونستان کے مسئلے کو ایک حقیقت بتایا۔

تجارتی معاہدہ:۔ ۱۹۵۶ء میں فرسٹ ڈپٹی سوویت وزیراعظم نے پاکستان کا خیرسگالی کا دورہ کیا۔ اسی سال روس کے ایک وفد نے دورہ پاکستان کے موقع پر پاکستان کے ساتھ تجارتی معاہدہ کیا۔ ۱۹۵۸ء میں روس کے ایک پارلیمانی وفد نے بھی دورہ کیا اور پاکستان کو غیر مشروط امداد کی پیشکش کی۔

امریکہ کو فوجی اڈوں کی فراہمی:۔ ۱۹۵۸ء میں ایوب خان نے برسر اقتدار آنے کے بعد امریکہ کو فوجی اڈے فراہم کیے۔ اس سے پاک روس باہمی تعلقات کو سخت دھچکا لگا۔ ۱۹۶۰ء میں یو ٹو جاسوسی جہاز کا واقعہ پیش آیا۔ یہ جاسوسی جہاز پشاور سے اڑ کر روس کے علاقے میں تصویریں لے رہا تھا کہ اسے روس نے مار گرایا۔ پائلٹ پکڑا گیا اور اس نے سب کچھ اگل دیا۔ روس نے پاکستان کو دھمکی دی کہ اگر پھر ایسا ہوا تو پشاور کو صفحہ ہستی سے اڑا دیا جائے گا۔ اس واقعے نے تعلقات کو بہت ہی کشیدہ کر دیا۔

تعلقات میں بہتری:۔ پاکستان کی مغربی ممالک سے دفاعی معاہدے کرنے کے باوجود توقعات پوری نہیں ہو رہی تھیں کشمیر کا مسئلہ جوں کا توں تھا۔ مزید براں بھارت جو معاہدوں میں شریک بھی نہیں تھا اسے بڑے پیمانے پر فوجی اور معاشی امداد مل رہی تھی۔ ان باتوں کی وجہ سے پاکستان نے اپنی خارجہ پالیسی کا ازسرنو جائزہ لیا اور روس سے بہتر تعلقات استوار کرنے کی کوشش کی۔ دوسری طرف روس کو چین کی بڑھتی ہوئی طاقت اور بھارت چین جنگ ۱۹۶۲ء میں مغربی ممالک کی طرف سے بھارت کی امداد نے پاکستان کے ساتھ تعلقات کا دوبارہ جائزہ لینے پر مجبور کیا۔ دونوں ممالک نے تیل کی تلاش، فضائی سروس کا اجراء، ثقافتی وفود کے تبادلے، زرعی مشینری کا استعمال، بجلی کی تنصیب، سائنس اور ٹیکنالوجی کے فروغ اور باہمی تجارت کے معاہدے کیے۔

معاہدہ تاشقند:۔ ستمبر ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ میں روس نے بالکل غیر جانبدار پالیسی اختیار کی۔ جنگ کے بعد روس کی کوششوں سے پاکستان اور بھارت کے درمیان معاہدہ تاشقند ہوا۔ اس معاہدے کے تحت مسئلہ کشمیر کو رائے شماری

کے ذریعے حل کرنا قرار پایا لیکن افسوس کہ بعدازاں روس نے کشمیر کے مسئلے میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔

بھارت روس دفاعی معاہدہ:۔ ۱۹۶۹ء میں پاکستان اور روس کے تعلقات ایک بار پھر کشیدہ ہو گئے۔ اس کی بنیادی وجہ روس کا ایشیائی سلامتی کا منصوبہ (ایشین سکیورٹی پلان) تھا۔ پاکستان نے یہ سمجھ کر کہ یہ منصوبہ چین کے خلاف بنایا جا رہا ہے اس کی بالکل حمایت نہ کی۔ روس نے دوبارہ پاکستان کے خلاف جارحانہ رویہ اختیار کیا دسمبر ۱۹۷۱ء کی پاک بھارت جنگ سے قبل روسی قائد برزنیف نے اگرچہ پاکستان کی سالمیت سے دلچسپی کا اظہار کیا تھا لیکن دوسری طرف روس نے اگست ۱۹۷۱ء میں بھارت کے ساتھ ۲۵ سالہ دفاعی معاہدہ کیا اور دونوں ممالک کے گٹھ جوڑ کے نتیجے میں پاکستان دولخت ہو گیا۔

عوامی دور اور کشیدگی میں کمی:۔ ذوالفقار علی بھٹو نے برسراقتدار آتے ہی روس کے ساتھ دوطرفہ دوستی کی بنیادوں پر تعلقات قائم کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ انہوں نے بہت سے اشتراکی ممالک کے ساتھ تعلقات استوار کئے اور روس نے بھی پاکستان کی سیٹو سے علیحدگی کو قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ روس کی مدد سے جناب بھٹو نے ۳۱ دسمبر ۱۹۷۳ء کو پاکستان اسٹیل مل کا سنگ بنیاد رکھا۔ روس نے پاکستان میں اسٹیل مل قائم کر کے یقیناً پاکستانی عوام سے دوستی کا ثبوت دیا ہے۔

افغانستان میں روس کی فوجی مداخلت:۔ دسمبر ۱۹۷۹ء میں سوویت یونین نے اشتراکیت کے پھیلاؤ اور گرم پانیوں تک رسائی حاصل کرنے کے لئے اپنی ۸۰ ہزار فوج افغانستان میں داخل کر دی۔ اس کے نتیجے میں ۴۰ لاکھ مہاجرین نے افغانستان سے ترک مکانی کی ان میں سے ۳۰ لاکھ نے پاکستان میں اور ۱۰ لاکھ نے ایران میں پناہ لی۔ اقوام متحدہ، غیر جانبدار تحریک، اسلامی کانفرنس کی تنظیم اور پاکستان سمیت پوری انصاف پسند عالمی برادری نے روسی جارحیت کی مذمت کی۔ پاکستان کے صدر ضیاء الحق نے افغان مجاہدین کو ہر ممکن امداد باہم پہنچائی جس سے پاک روس تعلقات پھر کشیدہ

ہو گئے۔

جنیوا معاہدہ:۔ افغان مسئلے کے تصفیئے کے لئے اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل کی کوششوں سے جون ۱۹۸۲ء میں جنیوا میں مذاکرات شروع ہوئے۔ طویل مذاکرات کے نتیجہ میں بالآخر ۱۴ اپریل ۱۹۸۸ء کو جنیوا معاہدہ پر دستخط ہوئے اس معاہدے پر روس پاکستان اور افغانستان کے وزرائے خارجہ نے دستخط کئے۔ اس معاہدے کی رو سے روسی فوج افغانستان سے چلی گئی۔

سوویت یونین کا خاتمہ :۔ روسی کامریڈ گورباچوف نے اپنے دور اقتدار (۹۱-۱۹۸۵ء) میں ۷۴ سالہ پرانے اشتراکی نظام کے تحت چلنے والے معاشی، سیاسی اور سماجی نظام میں اصلاحات کی ضرورت محسوس کی۔ لیکن گورباچوف کی اصطلاحات نے سوویت یونین کی قوت کو منتشر کر دیا اور ۲۱ دسمبر ۱۹۹۱ء کو سوویت یونین کی تمام جمہوریاؤں نے سوویت یونین کے خاتمے کا اعلان کر دیا اور اس کی جگہ آزاد ریاستوں کی دولت مشترکہ کے قیام کے ایک معاہدے پر دستخط کئے۔ اب پاکستان ان جمہوریاؤں سے الگ الگ تعلقات استوار کرے گا۔

آزاد ریاستوں کی دولت مشترکہ میں رشین فیڈریشن سب سے بڑی ریاست ہے جو سابق سوویت یونین کے ۷۶ فیصد حصے (۶۵ لاکھ ۹۲ ہزار ۸ سو مربع میل) میں پھیلی ہوئی ہے اور جس میں سوویت یونین کی کل آبادی کا ۵۵ فیصد (تقریباً ۱۵ کروڑ) حصہ آباد ہے۔

پاکستان اور وسطی ایشیاء کی مسلم ریاستوں کے تعلقات

۲۱ دسمبر ۱۹۹۱ء کو سوویت یونین کے تحلیل کے بعد وسطی ایشیاء میں چھ آزاد مسلم ریاستیں آذربائیجان، ازبکستان، تاجکستان، ترکمانستان، قازقستان اور کرغستان ظہور پذیر ہوئیں۔ پاکستان کو وسطی ایشیاء کی ان ریاستوں سے اپنے تعلقات کی اہمیت کا پورا پورا احساس ہے۔ چنانچہ ان کی آزادی کے فوراً بعد پاکستان نے ایک اعلیٰ سطحی وفد وزیر مملکت برائے اقتصادی امور سردار آصف احمد علی کی سربراہی میں بھیجا۔ اس وفد میں اعلیٰ حکومتی عہدیداروں کے علاوہ ممتاز تاجر، اسکالر اور صحافی شامل تھے۔ اس وفد نے وسطی ایشیاء کے پورے علاقے کا ۲۴ نومبر سے ۸ دسمبر ۱۹۹۱ء تک دورہ کیا۔ (واضح رہے کہ اپریل ۱۹۹۰ء سے سوویت یونین کی ریاستوں نے کمیونسٹ اقتدار سے علیحدگی کا سلسلہ شروع کر دیا تھا) اور چھ مسلم ریاستوں کی اعلیٰ قیادت سے نہ صرف باہمی مفادات کے امور پر تبادلہ خیال کیا بلکہ ہر ریاست کے ساتھ مفاہمت کی ایک دستاویز پر دستخط بھی کئے۔ ان کی تفصیلات سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مسلم ریاستیں پاکستان سے کس نوع کی امداد چاہتی ہیں اور مستقبل میں پاکستان اور ان ریاستوں کے تعلقات کس نہج پر استوار ہوں گے

1 ۔ آذربائیجان اور پاکستان

آذربائیجان کی آبادی تقریباً ۷۰ لاکھ سے زیادہ ہے۔ اس میں ۸۰ فیصد مسلمان ہیں۔ اس کا کل رقبہ ۳۳ ہزار ۴ سو مربع میل ہے۔ دارالحکومت باکو ہے۔ آذربائیجان تیل نکالنے کا سامان بنانے والی سابقہ سوویت یونین کی سب سے بڑی ریاست تھی۔ اس ریاست کے سائنسدانوں کو تیل کی تلاش، کنوؤں کی کھدائی، تیل نکالنے اور اس سے متعلق تمام شعبوں میں غیر معمولی مہارت حاصل ہے۔ اس کی سرحدیں ایران اور ترکی سے ملتی ہیں۔

آذربائیجان اور پاکستان کے درمیان مفاہمت کی جس دستاویز پر دستخط کئے گئے

ہیں اس میں کہا گیا ہے کہ دونوں ممالک ایسے مؤثر اقدامات کریں گے جن سے باہمی تجارت اور تعاون میں اضافہ ہو۔ دونوں ملکوں کے درمیان سائنسی شعبہ میں تعاون کو فروغ دیا جائے۔ علاوہ ازیں دونوں ممالک فضائی اور مواصلاتی رابطے کریں گے اور ثقافتی تعاون کو فروغ دیں گے۔

2 ۔ ازبکستان اور پاکستان

ازبکستان کی آبادی تقریباً ۲ کروڑ ہے جس میں ۸۰ فیصد مسلمان ہیں۔ اس کا کل رقبہ ۱۰لاکھ ۴۹ ہزار دو سو مربع میل ہے۔ دارالحکومت تاشقند ہے۔ یہ ریاست کاٹن، لوہے، اسٹیل اور ٹیکسٹائل انڈسٹری کی وجہ سے مشہور ہے۔ اس کی سرحدیں ترکمانستان اور قازقستان سے ملتی ہیں۔

ازبکستان اور پاکستان کی باہمی دستاویز کے مطابق دونوں ممالک ایسے اقدامات کریں گے جن کے ذریعے پاکستان اور ازبکستان کے تعلیمی اداروں کے درمیان براہ راست تعلقات قائم ہو سکیں۔ جس کے بعد دونوں ممالک کے تعلیمی اداروں کے درمیان اسکالروں، اساتذہ اور طلبہ کا تبادلہ عمل میں آئے گا۔ یہ اسکالر، اساتذہ اور طلبہ مشترکہ تحقیقی منصوبوں پر کام کریں گے۔ اور دونوں ممالک مشترکہ تعلیمی تربیتی مراکز بھی قائم کریں گے۔

3 ۔ تاجکستان اور پاکستان

تاجکستان کی آبادی تقریباً ۵۲ لاکھ ہے۔ جس میں ۹۰ فیصد مسلمان ہیں۔ اس کا کل رقبہ ۵۴ ہزار ۱۹ مربع میل ہے۔ دارالحکومت دوشنبے ہے۔ یہ ریاست قیمتی معدنیات، مچھلی، ٹیکسٹائل، مشینری اور قالین سازی کی وجہ سے مشہور ہے۔ چاول اور پھل کثرت سے ہوتے ہیں۔ اس کی سرحدیں چین اور افغانستان سے ملتی ہیں۔

تاجکستان میں پاکستانی وفد نے مفاہمت کی دو دستاویزات، ایک پروٹوکول اور تعاون کے معاہدے پر دستخط کئے۔ مفاہمت کی پہلی دستاویز میں کہا گیا ہے کہ دونوں ممالک اقتصادی، تجارتی، سائنس اور ٹیکنالوجی، تعلیمی اور ثقافتی شعبوں میں قریبی

تعاون کریں گے۔ مفاہمت کی دوسری دستاویز کے مطابق تاجکستان کی وزارت ثقافت اور پاکستان کے درمیان باہمی تعاون کو فروغ دیا جائے گا۔ دونوں ممالک اس امر پر متفق ہوئے اور معاہدے پر دستخط کئے جس کے مطابق دونوں ممالک کا مشترکہ اقتصادی کمیشن قائم کیا جائے گا۔ دونوں ممالک کے درمیان جس پروٹوکول (ایک قسم کا معاہدہ) پر دستخط ہوئے اس کے تحت تاجکستان کی وزارت تعلیم اور پاکستان کے درمیان تعاون کو فروغ دینے کا عہد کیا گیا۔

4 ۔ ترکمانستان اور پاکستان

ترکمانستان یا ترکمانیہ کی آبادی تقریباً ۴۰ لاکھ ہے جس میں ۹۵ فیصد مسلمان ہیں۔ اس کا کل رقبہ ایک لاکھ ۸۸ ہزار ۴ سو ۱۷ مربع میل ہے۔ دارالحکومت اشک آباد ہے۔ سرزمین ترکمانیہ معدنی دولت، تیل، گیس، گندھک، پوٹاشیم اور نمک وغیرہ سے مالا مال ہے۔ اس کی سرحدیں ایران اور افغانستان سے ملتی ہیں۔

ترکمانستان اور پاکستان کی باہمی دستاویز کے تحت دونوں ممالک اقتصادی، تجارتی، سائنس اور ٹیکنالوجی، اطلاعات، ثقافت، سیاحت، ٹرانسپورٹ اور کھیل کے شعبوں میں قریبی تعاون کریں گے۔ دونوں ممالک نے ایک مشترکہ اقتصادی کمیشن قائم کرنے کا بھی فیصلہ کیا۔

5 ۔ قازقستان اور پاکستان

قازقستان کی آبادی تقریباً ایک کروڑ ۶۵ لاکھ ہے جس میں ۷۰ فیصد مسلمان ہیں۔ اس کا کل رقبہ ۱۰ لاکھ ۴۹ ہزار ۲ سو مربع میل ہے۔ دارالحکومت الماآتا ہے۔ یہ ریاست براعظیم ایشیاء اور یورپ کے درمیان واقع ہے۔ لیکن یورپی حصہ ایشیاء سے بہت کم ہے۔ معدنی دولت کے اعتبار سے یہ دنیا کا امیر ترین خطہ ہے۔ ایک اندازے کے مطابق دنیا کے کل معدنی ذخائر کا ۶ فیصد یہیں ہے۔ کوئلہ، لوہا، تیل اور گیس کے بڑے بڑے ذخائر ہیں۔ اس کی سرحدیں سائبیریا اور چین سے ملتی ہیں۔

قازقستان اور پاکستان نے مفاہمت کی دو دستاویزات پر دستخط کئے۔ مفاہمت

کی پہلی دستاویز میں کہا گیا ہے کہ دونوں ممالک اقتصادی تجارتی و مالیاتی شعبوں، سائنس اور ٹیکنالوجی نیز ثقافت اور دیگر شعبوں میں قریبی تعاون قائم کریں گے۔اسے فروغ دیں گے اور مستحکم تر بنائیں گے۔ علاوہ ازیں دونوں ممالک ایک مشترکہ اقتصادی مشن قائم کریں گے۔ مفاہمت کی دوسری دستاویز کے مطابق پاکستان "الماآتا میں ایک ہوٹل تعمیر کرے گا (ممکن ہے یہ ہوٹل نجی شعبہ قائم کرے) دونوں ممالک ادویہ سازی، ہلکی صنعتوں، مشین سازی، سیمنٹ کے کارخانوں اور بعض دوسرے شعبوں میں مشترکہ کارخانے قائم کریں گے۔ اور اقتصادی تعاون کی غرض سے ایک مستقل ورکنگ گروپ قائم کرنے کا فیصلہ بھی کیا گیا۔

6 ۔ کرغستان اور پاکستان

کرغستان یا کرغیزیہ کی آبادی تقریباً ۴۴ لاکھ ہے جس میں ۹۲ فیصد مسلمان ہیں اس کا کل رقبہ ۷۶ ہزار ۴ سو ۴۲ مربع میل ہے۔ دارالحکومت فرونزے ہے۔ یہ ریاست تمباکو، سوتی کپڑے، چاول، شکر، کیمیکلز، مشینوں اور آلات کی وجہ سے مشہور ہے۔ اس کی سرحدیں چین اور قازقستان سے ملتی ہیں۔

کرغستان اور پاکستان نے ایک "مشترکہ اعلامیہ" پر دستخط کئے۔ اس میں دونوں ملکوں کے درمیان تعاون کے شعبوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اعلامیہ کے مطابق دونوں ممالک تجارت اور اقتصادی شعبوں میں قریبی تعاون کریں گے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی میں بھی تعاون کیا جائے گا۔ دونوں ممالک نے اس امر پر بھی اتفاق کیا کہ دونوں ممالک کا ایک مشترکہ ورکنگ گروپ قائم کیا جائے گا جو دونوں برادر ممالک کے درمیان دوطرفہ تعاون کی ٹھوس تجاویز پیش کرے گا۔

پاکستان اور افغانستان کے تعلقات

افغانستان پاکستان کا پڑوسی اسلامی ملک ہے دونوں ممالک قدیم تاریخی ثقافتی اور اسلامی رشتوں میں منسلک ہیں لیکن بدقسمتی سے برصغیر کی تقسیم کے وقت ہندوستان پاکستان کے بارے میں غلط فہمیاں پیدا کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ افغانستان واحد اسلامی ملک ہے جس نے اقوام متحدہ میں پاکستان کی شمولیت پر اس کی مخالفت کی۔ افغانستان نے سب سے پہلے سرحدی تقسیم کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد پختونستان کا نعرہ لگایا اور اس کے لئے مختلف اوقات کار میں پروپیگنڈہ بھی کیا۔ اس کے باوجود پاکستان نے کئی بار تعلقات خوش گوار کرنے کی کوشش کی افغانستان کی معاشی حالت انتہائی خراب ہے۔ اس کے پاس کوئی بندرگاہ نہیں ہے جس کی وجہ سے اس کی درآمد برآمد کی ساری ضروریات کراچی بندرگاہ پوری کرتی ہے۔ ایوب خان اور ظاہر شاہ کے دور میں ایک ایسا مرحلہ بھی آیا کہ دونوں ممالک کے سفارتی تعلقات منقطع ہو گئے۔ ۱۹۶۵ء میں جب بھارت نے پاکستان پر حملہ کیا تو اس نازک موقع پر اعلیٰ حضرت ظاہر شاہ نے پاکستان کی حمایت ان الفاظ میں کی۔

"افغانستان ایک غیر جانبدار ملک ہے۔ وہ پاکستان اور بھارت کی کشیدگی میں دخل نہیں دیتا اور ہم پاکستان کے خلاف لشکر کشی کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے"

۱۹۷۰-۷۱ء کے نازک دور میں بھی افغانستان کی یہی پالیسی برقرار رہی بھٹو نے افغانستان کا دورہ کیا۔ ظاہر شاہ اور بھٹو کے درمیان خوشگوار ماحول میں بات چیت ہوئی۔ لیکن افغانستان کو ۱۹۷۲ء میں فوجی انقلاب کا سامنا کرنا پڑا۔ سردار داؤد خان نے اقتدار حاصل کرنے کے بعد پھر پاکستان کے خلاف پروپیگنڈہ شروع کر دیا اور پختونستان کے پردے میں اٹک تک کا علاقہ اپنے تصرف میں لانے کا خواب دیکھا۔ لیکن پاکستان نے اس چیز کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ اور افغانستان کے زلزلے میں متاثر افراد کے لئے ۲ لاکھ روپے کی ادویات ۲ سو خیمے اور چاول کی صورت میں امداد دی۔ ۱۹۷۵ء میں وزیر اعظم مسٹر بھٹو نے افغانستان کے ساتھ تعلقات پر

تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔

ہم افغانستان کے ساتھ اچھے ہمسایوں جیسے پرامن دوستانہ تعلقات قائم کرنا چاہتے ہیں ہماری خواہش ہے کہ افغانستان خوش رہے اور ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہو۔ اس لئے ہم نے افغانستان کو راہداری کی سہولتیں دے رکھی ہیں۔ جس سے پاکستان کو کوئی مالی فائدہ نہیں ہے بلکہ اس کا فائدہ صرف یکطرفہ ہے اور ہم یہ سہولتیں آئندہ بھی جاری رکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

اکتوبر ۱۹۷۵ء میں افغانستان نے پاکستان کے خلاف ایک اور غیر دوستانہ قدم اٹھایا نیپال میں منعقد ہونے والی یونیسکو کانفرنس میں افغانستان نے پاکستان کے داخلی معاملات میں مداخلت کی۔ افغان وفد نے اپنے مقالے میں ایک ایسا نقشہ بھی پیش کیا جس میں پاکستان کا کچھ حصہ پختونستان کے طور پر دکھایا گیا تھا۔ پاکستان کے شدید احتجاج پر چیئرمین کانفرنس نے معذرت کرنے کے ساتھ ساتھ یہ وضاحت بھی کر دی کہ قابل اعتراض دستاویز اور نقشے کا یونیسکو کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ افغانستان کا جھکاؤ ہمیشہ بھارت کی طرف رہا ہے ۱۹۷۵ء کر بھارتی وزیر خارجہ نے یہ اعلان بھی کیا کہ بھارتی امداد کی بدولت افغانستان اسلحہ اور فوجی ساز وسامان میں پاکستان کا ہم پلہ ہو گیا ہے۔

۱۹۷۶ء میں وزیراعظم مسٹر بھٹو نے پانچ روزہ افغانستان کا دورہ کیا تو امید پیدا ہو گئی کہ دونوں ممالک کے تعلقات استوار ہو جائیں گے۔ اسی اثناء میں سردار داؤد کی جگہ نور محمد ترہ کئی نے سردار داؤد اور اس کے قریبی ساتھیوں کو قتل کر کے اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ نئی اشتراکی انقلابی حکومت نے روس سے دسمبر ۱۹۷۸ء میں دوستی کا ایک معاہدہ کر کے روس کو افغانستان میں مداخلت کا موقع فراہم کیا۔ اکتوبر ۱۹۷۹ء میں نور محمد ترہ کئی کو قتل کر کے عنانِ حکومت کی باگ ڈور حفیظ اللہ امین نے سنبھالی۔ دسمبر ۱۹۷۹ء میں روسی فوجیں افغانستان میں داخل ہوئیں۔ عام خیال یہ تھا کہ روسی فوجیں امین کے اقتدار کو مستحکم کرنے آئی ہیں۔ لیکن ۲۹ دسمبر کو افغانستان میں ایک اور انقلاب آ گیا۔ کیمونسٹ لیڈر ببرک کارمل افغان حکومت کے نئے سربراہ مقرر ہوئے۔ روسی مداخلت کی وجہ سے تقریباً ۳۰ لاکھ افغان مہاجرین پاکستان میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے یہ دنیا بھر میں مہاجرین کی سب سے بڑی تعداد ہے۔ پاکستان افغان مہاجرین

کے فرائض خوش اسلوبی سے سرانجام دے رہا ہے۔ اس سلسلے میں پاکستان کو مغربی دنیا اور اقوام متحدہ کا تعاون بھی حاصل ہے۔

۱۴ اپریل ۱۹۸۸ء کو افغانستان کے تصفیہ کے سلسلے میں روس افغانستان اور پاکستان کے مابین "جنیوا سمجھوتہ" پر دستخط ہوئے۔ اس معاہدے کے تحت ۱۵ فروری ۱۹۸۹ء تک روس کی ایک لاکھ ۱۵ ہزار فوج افغانستان سے واپس چلی گئی۔ اب افغان مجاہدین ڈاکٹر نجیب اللہ کی حکومت کے خلاف لڑ رہے ہیں۔ ڈاکٹر نجیب اللہ کی حکومت کو پاکستان سمیت اسلامی دنیا نے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ اسلامی ممالک کا موقف یہ ہے کہ نجیب حکومت افغانی عوام کی خواہش کے خلاف ان پر مسلط ہے۔

پاکستان اور سعودی عرب کے تعلقات

پاکستانی عوام سعودی عرب کی مقدس سرزمین سے روحانی لگاؤ کی وجہ سے اس سے بے پناہ محبت کرتے ہیں اور یہی روحانی جذبہ دونوں ملکوں کے خصوصی تعلقات کا مظہر ہے۔ پاکستان کے قیام کے فوراً بعد دونوں ممالک کے مابین سفارتی تعلقات قائم ہو گئے ۱۹۵۱ء میں ایک دوستی و تعاون کا معاہدہ ہوا۔ ۱۹۵۴ء میں شاہ سعود نے پاکستان کا دورہ کیا۔ پاکستانی عوام کی بے پناہ محبت سے وہ اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے دونوں ممالک کے عوام کو یک جان اور دو قالب قرار دیا۔ پاکستانی پرچم دیکھ کر آپ نے کہا، "یہ جھنڈا میرا جھنڈا ہے۔ یہ میرے ملک کا جھنڈا ہے" کراچی کے نزدیک "سعود آباد" کے نام سے جو مہاجر بستی قائم ہے وہ السعود کی سعادت اور پاکستان کے عوام کے لیے ان کی محبت کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ سعودی عرب کو پاکستان کے اندرونی و بیرونی تعلقات سے خاص دلچسپی ہے ۱۹۵۴ء میں پاک افغان سفارتی تعلقات بحال کروانے میں سعودی عرب نے اپنی خدمات پیش کیں۔ ۱۹۶۰ء میں صدر ایوب نے سعودی عرب کا دورہ کیا جس سے تعلقات کو مزید تقویت ملی۔ ۱۹۶۴ء میں جب سعودی عرب نے نہر سویز کے بحران کے نتیجے میں برطانیہ اور فرانس سے اپنے سفارتی تعلقات منقطع کر لئے تو اپنے مفادات کی نگرانی کے لئے پاکستان کو اپنا نمائندہ منتخب کیا۔ پھر جب مغربی جرمنی نے اسرائیل کو تسلیم کیا تو سعودی عرب نے اس کے خلاف احتجاج کے طور پر سفارتی تعلقات منقطع کر لئے تو یہاں بھی پاکستان نے ہی سعودی مفادات کی نگرانی کی۔ اس سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ سعودی عرب کو پاکستان پر کتنا اعتماد ہے۔

نومبر ۱۹۶۵ء میں شاہ فیصل کے تخت نشین ہونے کے بعد دونوں ممالک کے تعلقات مزید مستحکم ہوئے۔ آپ نے برسر اقتدار آتے ہی مسئلہ کشمیر کے بارے میں پاکستان کی زبردست حمایت کی اور عالم اسلام کو پاکستان کی مدد کرنے کے لئے کہا۔ ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی پاک بھارت جنگوں میں سعودی عرب نے پاکستان کی ہر لحاظ سے مالی، سیاسی اور اخلاقی امداد کی۔ سقوط ڈھاکہ کی خبر سن کر شاہ فیصل رو پڑے۔ شاہ فیصل نے پاکستان کی تعاون سے فروری ۱۹۷۴ء میں لاہور میں اسلامی سربراہی کانفرنس کا انعقاد کیا۔ اس

کانفرنس کی کامیابی کے لئے مسٹر بھٹو سے ہر قسم کا تعاون کیا۔ شاہ فیصل کے زمانے میں ہی ایک ارب روپے کا بلا سود قرضہ دیا گیا۔ میر پور میتھیلو میں کھاد کا کارخانہ قائم کرنے کے لئے امداد دی۔ شاہ فیصل کے قتل کے بعد شاہ خالد نے عنان حکومت کی باگ ڈور سنبھالی۔ اکتوبر ۱۹۷۶ء میں پاکستان کا دورہ کیا جس میں پاکستان اور سعودی عرب کے مابین ایک بنک "بنک آف الجزیرہ" کے نام سے قائم ہوا جس سے مالی امداد میں بڑی سہولت ہوئی ۱۹۷۷ء کے سیاسی بحران میں شاہ خالد نے خصوصی دلچسپی لی اور ممکنہ حد تک سیاسی انتشار کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ یہ ایک الگ بات ہے کہ اس میں کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔

جولائی ۱۹۷۷ء کو جنرل محمد ضیاء الحق نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی تو سب سے پہلے سعودی عرب کا دورہ کیا۔ جس سے تعلقات کو مزید تقویت ملی۔ اپنے گیارہ سالہ دور حکومت میں صدر ضیاء الحق نے کئی بار سعودی عرب کا دورہ کیا اور باہمی تعلقات کو مزید مستحکم کیا۔ دونوں ممالک کی یونیورسٹیوں میں ایک دوسرے ملک کے طلباء تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور پاکستان کی دفاعی اکیڈمیوں میں سینکڑوں سعودی کیڈٹ زیر تربیت ہیں۔ پاکستان کی تینوں فوجوں کے لئے سعودی عرب کی حکومت کے تعاون سے الگ الگ فنڈ بھی قائم کئے گئے ہیں۔ جس سے دفاعی تربیتی اداروں کی از سر نو تنظیم کی جا رہی ہے۔ تربیت گاہوں کو وسیع کیا جا رہا ہے۔ اجتماعی اسلامی رجحان کو تقویت مل رہی ہے۔

اپریل ۱۹۸۴ء میں سعودی عرب کے ولی عہد شہزادہ عبداللہ نے پاکستان کا چار روزہ دورہ کیا۔ ایک انٹرویو کے دوران انہوں نے فرمایا۔ پاکستان اور سعودی عرب کے تعلقات کی بنیاد اسلام اور اسلامی اخوت پر ہے۔ پاکستان نے ہر موقع پر یہ بات ثابت کر کے دکھا دی ہے کہ وہ ایک مسلمان ملک ہے قرآن کریم اس کا دستور ہے اور ایک مسلمان ملک ہونے کی حیثیت سے اس نے ہر آزمائش کے موقع پر دنیا کے مسلمانوں کا ساتھ دیا ہے۔ نیز بین الاقوامی سطح پر فلسطین میں عربوں کے حقوق اور مسلمانوں کے مقدس مقامات کے دفاع کے لئے اس نے ہمیشہ آگے بڑھ کر اہم کردار ادا کیا ہے دونوں ممالک میں پائے جانے والے تعلقات مثالی ہیں۔

جنوری ۱۹۸۵ء میں ایک ثقافتی اور سائنسی معاہدے کے تحت دونوں ملکوں میں معاشرتی تہذیب اور سائنسی اداروں کے ذریعے سیمینار، نمائش اور ایسے ہی دوسرے طریقوں سے تعاون کو مزید بڑھانے پر اتفاق رائے ہوا۔ اس معاہدے کے تحت یونیورسٹیوں میں اساتذہ، کھلاڑیوں اور اسکاؤٹس کے تبادلے بھی شامل ہیں۔

۲ اگست ۱۹۹۰ء کو عراق نے کویت پر فوجی قبضہ کر کے اُسے عراق کا صوبہ قرار دیا۔ اقوام متحدہ اور امریکہ کے اتحادیوں نے عراق کو جارح قرار دیا۔ سعودی عرب نے عراق سے فوجیں واپس بلانے کا مطالبہ کیا۔ پاکستان نے اقوام متحدہ، امریکہ اور اس کے اتحادیوں اور سعودی عرب کے موقف کی تائید کی۔ ۱۵ جنوری ۱۹۹۱ء کو جب امریکہ اور اس کے اتحادیوں نے عراق کے خلاف فوجی کارروائی کی تو پاکستان نے سعودی عرب میں مقامات مقدسہ کی حفاظت کے لیے دس ہزار فوجی بھیجے۔ وزیر اعظم پاکستان نواز شریف نے خلیج کی جنگ بندی کے لیے ۳ امن فارمولا پیش کیا۔ لیکن عراق نے ایک نہ سنی۔ ۳۰ ملکوں کی مشترکہ جارحیت کے سامنے بالآخر عراقی صدر صدام حسین نہ ٹھہر سکے اور انہوں نے ۴۲ روزہ خونی جنگ کے بعد گھٹنے ٹیک دیئے۔ خلیج کی جنگ میں پاکستان کی پالیسی کو سعودی عرب نے بہت سراہا۔ دونوں ملکوں کے تعلقات اور زیادہ خوشگوار ہو گئے۔ سعودی عرب نے پاکستان کو تیل کے بحران پر قابو پانے کے لیے عملاً تعاون کیا علاوہ ازیں پاکستان کی بھرپور اقتصادی اور مالی امداد کی۔

پاکستان اور متحدہ عرب امارات کے تعلقات

متحدہ عرب امارات خلیج فارس کی سات ریاستوں کا وفاق ہے۔ اس وفاق میں شامل ریاستوں کے نام درج ذیل ہیں

۱۔ ابوظہبی ۲۔ دوبئی ۳۔ شارجہ ۴۔ راس الخیمہ ۵۔ فجیرہ

۶۔ عجمان ۷۔ ام القوین۔ جون ۱۹۷۱ء میں ان ریاستوں نے برطانیہ سے آزادی حاصل کرنے کے بعد پاکستان سے فوراً سفارتی تعلقات قائم کر لیے۔ یہ ملک تیل اور قدرتی گیس کی دولت سے مالا مال ہے۔ تیل کے معاملے میں متحدہ عرب امارات پاکستان سے ترجیحی سلوک کرتا ہے اور دوسرے ممالک کی نسبت انتہائی آسان شرائط پر پاکستان کو تیل فراہم کرتا ہے۔

فروری ۱۹۷۴ء کو پاکستان میں دوسری اسلامی سربراہی کانفرنس منعقد ہوئی۔ تو متحدہ عرب امارات کے صدر شیخ زید بن سلطان النہیان پہلی دفعہ پاکستان آئے کانفرنس کے اختتام پر دونوں ملکوں کے مابین اشتراک تعاون بڑھانے کے لئے مارچ ۱۹۷۴ء میں مشترکہ وزارتی کمیشن کا قیام عمل میں لایا گیا تاکہ دونوں ممالک کے مابین اقتصادی، تجارتی، فنی اور سائنسی امور میں خاطر خواہ تعاون کیا جا سکے۔

۹ مارچ ۱۹۷۴ء میں متحدہ عرب امارات کے صدر شیخ زید بن سلطان پاکستان کے سرکاری دورے پر اسلام آباد پہنچے تو وزیراعظم مسٹر بھٹو نے ان کا شاندار استقبال کیا، دونوں قائدین میں علاقائی صورت حال اور باہمی امور پر بات چیت ہوئی۔ ۱۱ مارچ کو دونوں ملکوں نے ایک پانچ سالہ ثقافتی معاہدے پر دستخط کیے۔ شیخ زید نے اس دورے کے موقع پر لاڑکانہ میں شیخ زید زنانہ ہسپتال کا سنگ بنیاد بھی رکھا، ۵۰۰ بستروں کا یہ ہسپتال پاکستان کا سب سے بڑا زنانہ ہسپتال ہے۔

جولائی ۱۹۷۷ء کو جنرل ضیاء الحق نے حکومت سنبھالنے کے بعد متحدہ عرب امارات سے تعلقات مزید بہتر بنانے کے لئے عرب امارات کا دورہ کیا۔ دسمبر ۱۹۸۱ء میں تربیلا ڈیم کی مرمت کے لئے متحدہ عرب امارات نے ۲۵ ملین ڈالر

کی رقم پاکستان کو بطور امداد فراہم کی۔

۱۹۸۶ء میں شیخ زید بن سلطان پاکستان کے دورے پر آئے تو انہوں نے صدر ضیاء الحق اور وزیراعظم محمد خان جونیجو سے دونوں ملکوں کے باہمی دلچسپی کے امور اور عالمی صورت حال پر تبادلہ خیال کیا۔

دسمبر ۱۹۸۷ء کو وزیراعظم مسٹر جونیجو اور شیخ زید کے مابین مذاکرات کے نتیجہ میں مشترکہ سرمایہ کمیشن کا قیام عمل میں آیا۔

اس وقت اقتصادی ترقی زراعت ٹیکنالوجی اور تعلیم وغیرہ کے میدانوں میں پاکستان اور عرب امارات کے مابین گہرا تعاون پایا جاتا ہے۔ مسٹر النہالی سے کراچی، لاہور اور پشاور میں اسلامی مراکز کے قیام کے لیے ذاتی طور پر رقوم فراہم کیں۔ نیز لاہور، لاڑکانہ، بہاولپور اور رحیم یار خان میں ہسپتالوں کی تعمیر کے لئے بھی سرمایہ فراہم کیا۔ ملتان میں تیل صاف کرنے اور کیمیاوی کھاد تیار کرنے کا ایک بہت بڑا کارخانہ لگایا گیا جسے پاک عرب کھاد فیکٹری کا نام دیا گیا۔ اس کے علاوہ ڈیری فارمنگ، شہری ہوابازی اور ٹیلی مواصلات کے شعبوں میں وسیع پیمانے پر مشترکہ منصوبے زیر عمل ہیں۔ پاکستان کے ڈاکٹر، انجینئر، فنی ماہرین اور مزدور ہزاروں کی تعداد میں عرب امارات میں ملازمت کر رہے ہیں اور اس کی ترقی کے لئے ان تھک محنت میں مصروف ہیں۔

پاکستان اور مصر کے تعلقات

مصر کو دنیائے اسلام اور عرب ممالک کی برادری میں ایک ممتاز اور منفرد مقام حاصل ہے اس کی آبادی تقریباً پانچ کروڑ ہے جن میں ۹۰ فیصد مسلمان ہیں۔ پاکستان اور مصر ماضی میں یکساں طور پر فرنگی اقتدار اور فرنگی تسلط کا شکار رہے ہیں اور یہ وہ قدر مشترک ہے جس نے آزادی کے بعد ابتدائی سالوں میں دونوں ممالک کے عوام کو ایک دوسرے کے بہت قریب لاکھڑا کیا تھا اور پھر پاکستان کی جانب سے فلسطینی عوام کی جدوجہد آزادی اور ایک آزاد فلسطینی مملکت کے قیام کے سلسلے میں اقوام متحدہ میں موثر کوششیں کی گئیں تو مصری قیادت اور مصری اخبارات نے پورے جوش و جذبے سے پاکستانی کوششوں کی پذیرائی کی اور اس وقت سے پاکستان اور مصر کے درمیان برادری اور اخوت کے ایسے لازوال روابط قائم ہیں جن پر گرم و سرد زمانے کا آج تک اثر نہیں پڑا۔

۱۹۵۶ء میں نہر سویز پر برطانوی حملے کے زمانے میں دونوں ممالک کے مابین کچھ غلط فہمیاں پیدا ہو گئیں۔ مصر پاکستان کے کردار سے مطمئن نہیں تھا۔ ہمارے مخالفوں نے خاص طور پر بھارتی وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے اس وقت کے مصری قائد جمال عبدالناصر کے دل میں پاکستان کے بارے میں غلط فہمیوں کی دیوار کھڑی کر دی اور انہیں یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ پاکستان اسلامی دنیا کی قیادت سنبھال کر اسلامی دنیا میں مصر کے وقار کو مجروح کرنا چاہتا ہے اور غالباً اسی وجہ سے غیر وابستہ ممالک کی تنظیم کے قیام کی آڑ لے کر یوگوسلاویہ کے مارشل ٹیٹو، مصر کے جمال عبدالناصر اور بھارت کے جواہر لال نہرو کے درمیان ایک ایسا اتحاد ثلاثہ قائم ہوا جو ان قائدین کی وفات تک قائم رہا۔ تاہم پاکستان نے عرب اسرائیل جنگوں اور بیت المقدس پر اسرائیلی قبضے کے خلاف اقوام متحدہ اور عالمی سطح پر اپنی کوششوں اور جدوجہد کا سلسلہ برابر جاری رکھا اس لئے مصری عوام کے دلوں میں پاکستان کی محبت قائم و دائم رہی۔

نومبر ۱۹۶۱ء میں پاکستان کے صدر فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے مصر کا سرکاری دورہ کیا۔ اس موقع پر پاکستان کی ان خدمات کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا گیا جو ہمارے ملک نے ملت اسلامیہ اور دنیا اسلام اور عرب برادری کے مفادات کے تحفظ کے لئے

سرانجام دی تھیں۔ خود صدر ناصر کو بھی ان کا برملا اعتراف کرنا پڑا۔ تاہم ہمارے دشمن برابر ہمارے خلاف ریشہ دوانیوں میں مصروف رہے اور صدر ناصر کو بار بار یہ باور کرانے کی کوشش جاری رکھی گئی کہ پاکستان مصر سے عرب دنیا اور عالم اسلام کی قیادت چھیننا چاہتا ہے اس لیے ان کے دور حیات میں پاکستان اور مصر کے درمیان تعلقات میں وہ گرمجوشی اور اخلاص پیدا نہ ہو سکا جس کی دو برادر ممالک اور اسلامی ممالک کے درمیان توقع کی جا سکتی تھی۔ صدر جمال عبدالناصر کے بعد مصر میں صدر سادات کے دور حکومت کا آغاز ہوا امریکی صدر جمی کارٹر کی کوششوں سے مصر اور اسرائیل کے مابین مارچ ۱۹۷۹ء کو کیمپ ڈیوڈ سمجھوتے پر دستخط ہوئے اس معاہدے کے نتیجے میں مصر کو اسرائیل سے اپنے علاقے جن میں نہر سویز سے ملحقہ علاقے بھی شامل تھے، واپس مل گئے۔ لیکن مصر و عرب برادری اور مصر و اسلامی برادری کے درمیان پھر اختلاف کی خلیج حائل ہو گئی پاکستان نے عرب ممالک اور اسلامی برادری کی خواہشات کی حمایت کرنے کی بنا پر کیمپ ڈیوڈ سمجھوتے کو اپنی پذیرائی سے نہیں نوازا۔ تاہم پاکستان اور مصر کے درمیان سفارتی تعلقات منقطع نہیں ہونے پائے۔ صدر سادات کے دور اقتدار میں مصر چونکہ اسلامی اور عرب برادری سے ماسوائے سوڈان کے تقریباً سب سے الگ تھلگ ہو گیا تھا اس لیے پاک مصر تعلقات بھی اس دور میں تقریباً منجمد رہے۔ اکتوبر ۱۹۸۱ء میں صدر سادات کے قتل کے بعد موجودہ صدر حسنی مبارک برسر اقتدار آئے تو خود انہوں نے بھی یہ محسوس کیا کہ مصر کو عرب اور اسلامی دنیا سے بکل الگ تھلگ رکھنے کی پالیسی جہاں خود مصر کے اپنے مفاد کے خلاف ہے وہاں اس سے عرب اور اسلامی دنیا کا اتحاد بھی مجروح ہو رہا ہے۔ چنانچہ انہوں نے امریکہ سے مصر کے تعلقات میں کسی قسم کا رخنہ ڈالے بغیر اور اسلامی دنیا کے معاملات میں دلچسپی لینا شروع کر دی اور جب مارچ ۱۹۸۳ء میں غیر وابستہ ممالک کا سربراہ اجلاس دہلی میں منعقد ہوا تو صدر حسنی مبارک اور صدر ضیاء الحق کے درمیان گرمجوشانہ تعلقات کو ایک نیا آہنگ ملا۔ جنوری ۱۹۸۴ء کی کاسا بلانکا اسلامی کانفرنس میں صدر ضیاء الحق نے اس تنظیم میں مصر کی دوبارہ شرکت و شمولیت کی نہایت موثر پیرائے میں حمایت کی تھی۔ جس کا خود حسنی مبارک نے بھی اعتراف کیا ہے اور تنظیم کے جس سہ رکنی وفد نے قاہرہ جا کر صدر حسنی مبارک کو اسلامی ممالک کی تنظیم

کے فیصلے سے آگاہ کیا۔ اس میں پاکستان کے وزیر خارجہ صاحبزادہ یعقوب بھی شامل تھے مصری صدر اور عوام نے اس تاریخی اقدام میں پاکستان کے موثر کردار کو بہت زیادہ پسند کیا۔

اپریل ۱۹۸۵ء میں صدر حسنی مبارک نے مشرق بعید کے دورے سے واپس لوٹتے ہوئے اسلام آباد میں مختصر قیام کیا اور دونوں سربراہان نے دوطرفہ تعلقات پر تبادلہ خیال کیا۔ اس سے دونوں ممالک کے درمیان رابطہ میں ایک اور مثبت انداز پیدا ہوا اور صدر ضیاء الحق کا نومبر ۱۹۸۵ء کا دورہ مصر ورا صل اسی مختصر دورے کی بازگشت سمجھا جا سکتا ہے۔ چنانچہ جب صدر پاکستان اپنے سہ روزہ دورہ مصر کے آغاز پر قاہرہ پہنچے تو خود حسنی مبارک نے ان کا خیر مقدم کیا۔ مصر کی تاریخی جامعہ "جامعہ الازہر" نے جو دنیا کی قدیم ترین جامعہ سمجھی جاتی ہے۔ صدر محمد ضیاء الحق کو ڈاکٹریٹ کی اعزازی سند پیش کی۔ یہ اعزازی ڈگری پیش کرتے وقت صدر ضیاء کی جن خدمات کا خاص طور پر ذکر کیا گیا۔ ان میں مصر کی اسلامی ممالک کی تنظیم میں دوبارہ شمولیت اور پاکستان میں نفاذ اسلام کے سلسلے میں ہونے والی کوششوں میں صدر ضیاء کے کلیدی کردار کی خاص طور پر نشاندہی کی گئی۔ پاکستان اور مصر کے درمیان اگر ایثار و اخلاص کی بنیاد تعلقات کی موجودہ نہج برقرار رہی تو اس سے نہ صرف دونوں ملکوں کے عوام کو فائدہ پہنچے گا۔ بلکہ اس سے عالم اسلام کے اتحاد کی وہ راہ ہموار ہو گی۔ جو ہر مسلمان کا مطمع نظر ہونا چاہیئے۔

Bader Sultana

پاکستان اور ایران کے تعلقات

پاکستان اور ایران کے درمیان تعلقات ابتدا ہی سے بہت خوشگوار رہے ہیں ایران پہلا اسلامی ملک ہے جس نے مملکت خداداد پاکستان کو سب سے پہلے تسلیم کیا۔ برادرانہ تعلقات نے ایسی نوعیت اختیار کی کہ دونوں ممالک کے عوام ایکدوسرے کو اجنبی محسوس نہیں کرتے بلوچستان کے سلسلے میں دونوں ممالک کے درمیان کچھ غلط فہمیاں پیدا ہوئی تھیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ دونوں ممالک ایک دوسرے کی علاقائی حدود و سالمیت کا احترام کرتے ہیں۔ ایران نے ہر بڑے وقت میں پاکستان کی مدد کی ہے۔ خاص طور پر ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ میں ایران کا کردار ہمارے لئے بڑا باعث فخر ہے۔ موجودہ حکومت سے قبل بھی ایران و پاکستان کے تعلقات خوشگوار رہے ہیں اور اب بھی دن بدن برادرانہ تعلقات میں اضافہ ہو رہا ہے۔ مئی ۱۹۷۳ء کو مسٹر بھٹو نے ایران کا دورہ کیا جس کی بدولت جولائی ۱۹۷۴ء میں ایران نے پاکستان کو اپنی ترقیاتی اور بیرونی ادائیگیوں کی ضرورت پوری کرنے کے لئے ۵۸ کروڑ ڈالر کے قرضے دیئے۔ جن پر ۲½ فیصد سالانہ شرح سود تھا اور ۵ سال میں یہ قرضے آسان قسطوں پر واپس کرنا تھے۔ ایران کی مدد سے بلوچستان میں پچاس ہزار تکلوں پر مشتمل کپڑے کا ایک بڑا کارخانہ اور ۲۲ ہزار تکلوں پر مشتمل دو کارخانے حکومت اور ڈیرہ اسماعیل خان میں قائم کئے گئے۔ نیز بلوچستان میں انجینئرنگ کالج اور بولان میڈیکل کالج کے قیام میں سات کروڑ روپے زرمبادلہ کی صورت میں امداد مہیا کی۔ اس کے علاوہ ایران کے تعاون سے بلوچستان میں ٹیوب ویلوں کی تنصیب اور زیرزمین پانی کو استعمال میں لانے کے لئے ایک منصوبے پر کام ہو چکا ہے۔

فروری ۱۹۷۹ء کے انقلاب کی کامیابی کے فوراً بعد کے زمانے میں دونوں ملکوں کے تاریخی تعلقات وقتی تقاضوں کے تحت کچھ دباؤ میں رہے پاکستان نے افغانستان میں روسی فوجوں کی آمد کے فوراً بعد شمال مغربی سرحدوں کی صورتحال پر پیدا ہونے والی تشویش کا علاج امریکہ کے ساتھ روابط کی تجدید اور دفاعی و اقتصادی امداد کے ایک سمجھوتے کو آخری تشکیل دینے کی کوشش شروع کی ہوئی تھی۔ لیکن اسی زمانے میں امریکہ اور ایران کے تعلقات کشیدگی اور تنازع کی آخری سرحدوں کو چھو رہے تھے

تہران میں امریکی سفارت خانے پر قبضہ اور امریکی سفارتکاروں کا یرغمالی بنایا جانا دونوں ملکوں کے تعلقات کے لیے خطرناک اور بگاڑ کا باعث بنا۔ سابق صدر جمی کارٹر کے عہد صدارت کے اختتام پر اگرچہ یہ مسئلہ حل ہوگیا مگر کشیدگی ہنوز برقرار ہے۔

صدر ریگن کے برسر اقتدار آنے کے بعد پاکستان اور امریکہ کے درمیان تعاون کی بات چیت زیادہ سنجیدہ ماحول میں آگے بڑھنا شروع ہوئی جس نے آخرکار ۲ء۳ بلین ڈالر کے معاہدے کی شکل اختیار کی۔ پاکستان تقریباً ۱۵ سال کی سرد مہری کے بعد ایک بار پھر امریکہ کے قریب ہوگیا۔ جب کہ ایران امریکہ تعلقات کا پنڈولم شاہ کے دور کے انداز روابط سے بالکل برعکس دوسری سمت جا رہا تھا۔ اس صورت حال نے پاک ایران تعلقات کی حکومتی اور سرکاری سطح پر اگرچہ کوئی ظاہری کشیدگی ظاہر نہ کی۔ لیکن ایرانی انقلابی قیادت اور رائے عامہ پاک امریکی پالیسی سے کچھ زیادہ خوش نہ تھے۔

ایران عراق جنگ کے حوالے سے پاکستان کے غیر جانبدار کردار کو اگرچہ بظاہر پسند نہیں کیا گیا۔ لیکن یہاں ایرانی دانشوروں کی ناراضگی صرف پاکستان تک محدود نہ تھی بلکہ وہ پوری اسلامی امن کمیٹی کی اپروچ پر ناراض تھے۔ اس طرح پاکستان ان ممالک میں شامل نہ تھا جن سے ایرانی بھائی بطور خاص ناراض تھے۔ جنگ کی وجہ سے ایرانی خاصی حد تک الگ تھلگ رہ گئے اور دونوں سپر طاقتوں کی ناراضگی ان کے لیے سنگین مسائل پیدا کرنے کا سبب بن رہی تھی، چنانچہ اس سیاق و سباق میں انہوں نے ان ممالک کے ذریعہ کو مناسب جاننا شروع کر دیا۔ جو غیر جانب دار تھے۔ پاکستان ان ممالک میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ پھر پاکستان نے ایران کے ساتھ تجارتی اور کاروباری دائروں میں خوشدلی سے تعاون کیا اور اس ضمن میں کسی دباؤ کو خاطر میں نہ لایا۔ اس طرح ایران کے ارباب اختیار اور عوام نے پاکستان کو زیادہ ہمدردانہ روشنی میں دیکھنا شروع کیا۔ اس زمانے میں خود ایران نے آر سی ڈی کی تجدید اور احیاد کی تجویز پیش کی۔ اور اسے نئے خطوط پر منظم کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔

ستمبر ۱۹۸۲ء میں دونوں ممالک کے مابین مفاہمت کی ایک دستاویز پر تہران میں دستخط ہوئے۔ جس کے تحت پاکستان نے ایران کو تین تین لاکھ ٹن چاول اور گندم برآمد کرنے کا معاہدہ کیا۔ نصف درجن کے قریب دیگر اشیاء برآمد کرنے کا بھی فیصلہ

کیا گیا. ایران یہ اشیاء کسی دوسرے ملک سے بھی درآمد کر سکتا تھا اور پاکستان کو اس کے دوسرے گاہک بھی مل سکتے تھے. لیکن یہ دونوں ممالک کے درمیان پائی جانے والی خیر سگالی اور بھائی چارے کا نتیجہ ہے۔

پاکستان اور ترکی کے تعلقات

ترکی اور پاکستان کے تعلقات نہایت ہی قدیم زمانے سے چلے آرہے ہیں پاکستان کے قیام سے پہلے جب انگریز برصغیر پر قابض تھے تو اس وقت بھی برصغیر کے مسلمانوں کے دل سلطنت عثمانیہ کے لیے دھڑکتے تھے ۱۹۴۷ء میں پاکستان قائم ہوا تو دونوں ممالک کے جلد ہی سفارتی تعلقات قائم ہو گئے۔ وزیراعظم لیاقت علی خان کے زمانے میں ترکی کے ساتھ پہلا دوستی و تعاون کا معاہدہ ۲۸ جولائی ۱۹۵۱ء کو انقرہ میں ہوا۔

۱۹۵۴ء میں پاکستان کے وزیراعظم محمد علی بوگرہ اور ترکی کے صدر جلال بایار نے دوستی و تعاون کے ایک معاہدے پر دستخط کئے۔ پاکستان اور ترکی کے درمیان تیسرا معاہدہ بغداد ستمبر ۱۹۵۵ء کو ہوا۔ اس کی نوعیت دفاعی تھی۔ لیکن پاکستان صرف ترکی کی وجہ سے اس معاہدہ میں شامل ہوا۔ ویسے برطانیہ اور امریکہ کا بھی تھوڑا بہت دباؤ تھا۔

ستمبر ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ میں ترکی نے پاکستان کی مالی، فوجی اور اخلاقی امداد کی۔ اس سلسلے میں ترکی نے عالمی رائے عامہ کی بھی کوئی پرواہ نہیں کی اور ایوب خان نے دسمبر ۱۹۶۵ء کو صدر جمال گرسل سے ملاقات کر کے ان کا تہہ دل سے شکریہ ادا کیا۔ ترکی ہمیشہ سے مسئلہ کشمیر کے سلسلے میں پاکستان کی حمایت کرتا رہا ہے۔ نومبر ۱۹۷۵ء کو دونوں ممالک کے وزرائے خارجہ نے ایک معاہدے پر دستخط کئے جس کی رو سے دونوں ممالک نے بھاری صنعتوں زراعت، تجارت اور فنی امداد میں ایک دوسرے کی مدد کرنے کا فیصلہ کیا۔

نومبر ۱۹۷۵ء میں ترکی کے صدر فخری کوروہ نے پاکستان کا دورہ کیا اس دورے کے اختتام پر دونوں ملکوں کی جانب سے جو مشترکہ اعلامیہ جاری ہوا اس میں بین الاقوامی مسائل علاقائی تعاون اور کشمیر و قبرص کے معاملات میں ایک دوسرے کی تائید و حمایت کا اظہار کیا گیا۔ دونوں ممالک کے رہنماؤں نے پانچ روز کی مختصر مدت میں جس قدر دیرپا اور دوررس نتائج کے حامل فیصلے کئے اس کی مثالیں بہ مشکل ہی پیش کی جا سکتی ہیں۔ مثلاً فنی اور اقتصادی تعاون کے لیے مشترکہ وزارتی کمیشن زراعت ودیہی صنعت کاری نئی صنعت مواصلات اور تجارت کے میدانوں میں امداد باہمی اور اشتراک کی بنیادوں پر منصوبے مرتب کرنے کے معاہدے پر دستخط کئے گئے۔ دونوں ملکوں کے درمیان گہرے

روابط صرف سرکاری سطح تک ہی محدود نہیں۔ بلکہ عوامی سطح پر دونوں ملکوں کے درمیان گہرے رشتے موجود ہیں۔ ۱۲ ستمبر ۱۹۸۰ء کو جب ترکی میں فوج نے اقتدار سنبھالا تو اس کے بعد صدر ضیاء الحق پہلے غیر ملکی صدر تھے۔ جنہوں نے ترکی کا دورہ کیا۔ انقرہ میں ان کا شاندار خیر مقدم کیا گیا۔ فریقین نے خارجہ پالیسی کے تمام امور پر اتفاق رائے کیا اور علاقائی و بین الاقوامی امور میں مربوط کوشش کرنے پر آمادہ ہوئے دونوں ممالک اسلامی امن کمیٹی کے فورم پر بھی متفق ہیں۔ یہ کمیٹی ایران عراق جنگ کا پُرامن تصفیہ کرانے کے لئے قائم کی گئی تھی۔

اگست ۱۹۸۳ء کو صدر ضیاء الحق نے ایک بار پھر ترکی کا دورہ کیا۔ ترک سربراہ جنرل کنعان ایورین سے علاقائی اور عالمی مسائل و معاملات پر تبادلہ خیال ہوا۔ جنرل ضیاء الحق اس سے پہلے ۱۹۸۱ء میں بھی جنرل کنعان ایورین سے مل چکے تھے۔ دونوں رہنماؤں میں ایران عراق جنگ مشرق وسطیٰ اور افغانستان کے مسئلے کے سیاسی حل کے لئے بات چیت ہوئی۔ علاوہ ازیں دونوں ملکوں کے مابین سائنسی، فنی، صنعتی اور زرعی شعبے میں مزید تعاون کے امکانات کا بھی صدارتی سطح پر جائزہ لیا گیا۔ دسمبر ۱۹۸۳ء کو ترکی میں دوبارہ جمہوریت بحال ہو گئی۔ ترکی کے نئے وزیر اعظم ترگت اوزال کے ساتھ آئے ہوئے صنعت کاروں نے ایک کروڑ ڈالر مالیت کے تجارتی معاہدے کئے۔ مشترکہ اعلامیے میں کہا گیا۔

"پاکستان اور ترکی کے مابین علاقائی و عالمی مسائل پر مکمل اتفاق رائے پایا جاتا ہے اقتصادی میدان میں ترکی پاکستان کو جہاز رانی، ٹرانسپورٹ ٹیلی مواصلات کی سہولتیں فراہم کرے گا اور ٹرانسپورٹ کے سامان کی برآمد کے لئے پاکستان کو ترکی پانچ کروڑ ڈالر کا قرضہ فراہم کرے گا۔ اس طرح ترک وزیر اعظم کا یہ دورہ نہایت ہی کامیاب رہا۔"

۱۴ نومبر کو ترکی کے سربراہ جنرل کنعان ایورین ایک بار پھر سہ روزہ سرکاری دورہ پر پاکستان تشریف لائے۔ ۱۵ نومبر ۱۹۸۵ء کو انہوں نے پاکستان کی مجلس شوریٰ (پارلیمنٹ) کے مشترکہ اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔ پاک ترک خارجہ پالیسی کا نصب العین امن کو فروغ دینا ہے۔ افغان بحران، ایران عراق جنگ مشرق وسطیٰ کے مسئلے اور لبنان کی خانہ جنگی کو علاقے کے امن کے لئے خطرہ قرار دیا اور دنیا سے

اسلام کے اتحاد پر زور دیا. تاکہ مسائل کے حل کے لئے موثر کردار ادا کیا جا سکے۔

ترک صدر نے کہا کہ دو عظیم مدبروں اتاترک اور قائداعظم کی قیادت میں قائم ہونے والے ترکی اور پاکستان کے باہمی تعلقات اتنی بلندی پر پہنچ چکے ہیں کہ انہیں اب پوری دنیا میں مثالی حیثیت ہو گئی ہے۔

پاکستان اور بنگلہ دیش کے تعلقات

۱۹۷۱ء میں پاک بھارت جنگ اور بین الاقوامی سازش کے نتیجے میں بنگلہ دیش وجود میں آیا۔ اس سے قبل یہ خطہ مشرقی پاکستان کہلاتا تھا۔ پاکستان نے بنگلہ دیش کو اسلامی سربراہی کانفرنس منعقدہ لاہور فروری ۱۹۷۴ء کے موقع پر تسلیم کیا ۱۹۷۵ء میں شیخ مجیب الرحمٰن کو قتل کر کے فوج نے اقتدار سنبھال لیا۔ پاکستان نے خیرسگالی کے طور پر بنگلہ دیش کے عوام کے لئے ۵۰ ہزار ٹن چاول اور ۲۵ لاکھ گز کپڑا تحفے میں دیا۔ اکتوبر ۱۹۷۵ء میں دونوں ممالک کے سفارتی تعلقات بحال ہو گئے ۲۸ اپریل ۱۹۷۶ء میں مواصلات کی بحالی اور تجارت کے فروغ کے لئے معاہدہ ہوا۔ دونوں ممالک نے ایک دوسرے کے ہاں بنک کی شاخیں قائم کیں۔

جنرل ضیاء الرحمان کے قتل کے پر پاکستانی عوام نے گہرے رنج و غم کا اظہار کیا بنگلہ دیش میں عام انتخابات کے نتیجے میں جسٹس عبدالستار کی جماعت نے بھاری اکثریت حاصل کی بنگلہ دیش کے حالات کے باعث بنگلہ دیش کی فوج نے قومی سلامتی میں اپنا کردار ادا کرنے کا مطالبہ کیا عبدالستار نے ایک قومی کونسل قائم کر دی جس میں مسلح افواج کو نمائندگی دی گئی لیکن جنرل ارشاد اس سے مطمئن نہ ہوئے بالآخر ایک پرامن انقلاب کے ذریعے جنرل ارشاد نے عنان حکومت سنبھال لی اور ملک میں مارشل لاء لگا دیا۔

جون ۱۹۸۵ء میں بنگلہ دیش میں سمندری طوفان کے متاثرین سے اظہار ہمدردی کے لئے صدر جنرل محمد ضیاء الحق وہاں تشریف لے گئے وہاں کے سربراہ جنرل حسین محمد ارشاد اور عوام نے صدر پاکستان کا شاندار استقبال کیا۔ صدر پاکستان نے طوفان کی لپیٹ میں آنے والے علاقے کا دورہ کیا اور متاثرین میں امدادی اشیاء تقسیم کیں تو لوگوں نے انہیں خلوص دل سے دعائیں دیں۔ وزیر اعظم جونیجو کی طرف سے مصیبت زدہ بنگلہ دیشی بھائیوں کے لئے ایک کروڑ روپیہ مالیت کے امدادی سامان کی بروقت ترسیل دونوں ملکوں کے عوام کے دکھ سکھ میں ایک دوسرے کے ساتھ دینے کی دلی جذبات کی عکاسی کرتی ہے۔

اکتوبر ۱۹۸۹ء میں وزیر اعظم پاکستان محترمہ بینظیر بھٹو بنگلہ دیش کے تین روزہ دورے

پر ڈھاکہ گئیں۔ بنگلہ دیش میں پاکستانی وفد کا فقید المثال استقبال کیا گیا وزیر اعظم پاکستان اور بنگلہ دیش کے صدر حسین محمد ارشاد نے دو طرفہ تعلقات کے علاوہ علاقائی اور بین الاقوامی معاملات پر باضابطہ بات چیت کی۔ دونوں رہنماؤں نے مختلف شعبوں میں تعاون کے فروغ کے امکانات پر بات چیت کی۔ دونوں لیڈروں نے سارک کی تنظیم کو مزید مستحکم کرنے کے مختلف پہلوؤں کا بھی جائزہ لیا۔

ملاقات میں دونوں ممالک کے درمیان ایک تین سالہ ثقافتی معاہدے پر بھی دستخط ہوئے۔ جس کے تحت دونوں ملکوں کے ادیبوں، صحافیوں، فن کاروں اور اساتذہ کے تبادلے ہو سکیں گے۔

بنگلہ دیش میں مقیم ۳ لاکھ محصور غیر بنگالیوں کی پاکستان منتقلی کے معاملے پر کوئی سمجھوتہ نہ ہو سکا اور نہ ہی اثاثوں کی تقسیم کے مسئلے پر اتفاق رائے ہو سکا لیکن دونوں قائدین نے تصفیہ کے لئے اپنی کوششیں جاری رکھنے پر اتفاق کیا۔

پاکستان اور تیسری دنیا کے تعلقات

انڈونیشیا کے جنت النظیر شہر بندونگ میں ہونے والی افرو ایشیائی کانفرنس ۱۸ تا ۲۴ اپریل ۱۹۵۵ء میں پاکستان سمیت افریقہ اور ایشیا کے ۲۹ ممالک نے شرکت کی تھی۔ تیسری دنیا کا بلاک بنانے کی جانب پہلا قدم تھا۔ ۱۹۷۶ء تک ۷۷ ممالک نے اپنا ایک مضبوط بلاک بنا لیا اور اسے "۷۷ ممالک کا گروپ" کہا جانے لگا۔ اس میں ایشیا، افریقہ اور جنوبی امریکہ کے بیشتر غریب ممالک شامل تھے۔ اب تیسری دنیا کے بلاک میں ۱۲۴ ممالک شامل ہیں۔ تیسری دنیا کے ممالک موجودہ بین الاقوامی اقتصادی نظام کو تبدیل کر کے اس کی جگہ ایک منصفانہ اقتصادی نظام چاہتے ہیں تاکہ صحت مند بین الاقوامی معاشرہ قائم ہو سکے۔ انسانیت کی تاریخ میں کبھی بھی اتنی زیادہ اقوام اتنی بھاری رقم کے لیے اتنی تھوڑی اقوام کی مقروض نہیں رہیں۔ بین الاقوامی سطح پر اس خوف کا بھی اظہار کیا جا رہا ہے کہ اگر اس بین الاقوامی اقتصادی نظام کو بدلا نہ گیا تو اس کے اثرات اتنے گہرے ہوں گے کہ پوری دنیا ایک لمبی کساد بازاری کی لپیٹ میں آ جائے گی۔ تیسری دنیا پر قرضوں کا یہ بوجھ غیر مساوی لین دین کے نتیجے میں اکٹھا ہو رہا ہے۔ یہ وہی غیر مساوی لین دین ہے جس کا سہارا لے کر صدیوں سے غریب اقوام کا استحصال کیا جا رہا ہے۔ تیسری دنیا کے ممالک پر یہ بوجھ نہ صرف بین الاقوامی افراط زر کی وجہ سے دن بدن بڑھ رہا ہے۔ بلکہ اس میں صنعتی ممالک کی "حفاظتی پالیسی" بھی شامل ہے۔ جس کے تحت وہ اپنی برآمدات کی نسبت بھاری برآمدات کی قیمتوں میں مسلسل کمی کر رہے ہیں۔

پاکستان نے ہمیشہ استعماریت، نسلی امتیاز اور اقتصادی استحصال کے خلاف تیسری دنیا کے موقف کی حمایت کی ہے۔ پاکستان خود بھی تیسری دنیا کے بیشتر ممالک کی طرح ایک طویل عرصہ برطانوی نوآبادی رہا ہے۔ اس وجہ سے وہ مغرب کے استحصالی رویہ سے خوب واقف ہے۔ پاکستان نے مظلوم قوموں کی تحریک آزادی میں ان کا بھرپور ساتھ دیا ہے ان میں انڈونیشیا، لیبیا، الجیریا، صومالیہ، انگولا، موزمبیق، زمبابوے اور برونائی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ پاکستان نے اسرائیل کے مظالم اور جارحیت کی پر زور الفاظ میں مذمت کی اور مطالبہ کیا کہ تمام عرب علاقے بشمول بیت المقدس فوری

طور پر عربوں کو واپس کر دیئے جائیں۔ پاکستان نے سلامتی کونسل میں جنوبی افریقہ کی نسل پرست اقلیتی حکومت کے خلاف ٹھوس اور موثر اقدام کرنے کا مطالبہ کیا۔ تیسری دنیا کے ممالک میں باہمی اتحاد پیدا کرنے کے لئے پاکستان نے تیسری دنیا کے ممالک کے سربراہوں کی کانفرنس بلانے کی سب سے پہلے تجویز پیش کی۔ تاکہ تیسری دنیا کا کوئی واضح اور متفقہ لائحہ عمل تیار ہو کر سامنے آئے اور اجتماعی طور پر ترقی یافتہ ممالک پر دباؤ ڈالا جائے کہ وہ تیسری دنیا کے ممالک کا استحصال بند کریں اور اپنے وسائل کو آسان شرائط پر ان ممالک کی معاشی ترقی کے لئے مخصوص کر دیں۔ اقوام متحدہ میں بھی پاکستان نے تیسری دنیا کے اس موقف کو بڑے موثر انداز میں پیش کیا ہے کہ تیسری دنیا کے ممالک موجودہ اقتصادی نظام کو تبدیل کرنا چاہتے ہیں تاکہ تیسری دنیا کے ممالک کو ۱۳۰۰ بلین ڈالر کے قرضے سے نجات مل سکے اور ایک منصفانہ بین الاقوامی اقتصادی نظام قائم ہو۔[۸]

تیسری دنیا کے ممالک (گروپ ۷۷) کا پہلا اجلاس ۱۹۶۷ء میں الجیریا میں منعقد ہوا تاکہ ۱۹۶۸ء میں ہونے والی اقوام متحدہ کی کانفرنس برائے تجارت و ترقی (منعقدہ دہلی) میں مربوط اور عملی منصوبہ پیش کر کے رکن ممالک کے معاشی امور کو فروغ دیا جائے۔ ۷ فروری ۱۹۷۶ء کو اس گروپ میں ۱۱۷ ممالک تھے اور اس نے منیلا (فلپائن) میں، اتفاقی اعلان منظور کیا۔ جس میں اقوام متحدہ کی کانفرنس برائے تجارت و ترقی کے چوتھے اجلاس کے لئے ایک مربوط عملی منصوبہ شامل تھا۔ تاکہ تیسری دنیا کے ممالک کے لئے ایک منصفانہ اقتصادی نظام قائم ہو سکے۔ اس اعلان کو "گروپ ۷۷" کی رابطہ کمیٹی نے تیار کیا تھا۔ جس کا پاکستان فعال رکن تھا اور اس اجلاس کے چیئرمین بھی اقوام متحدہ میں متعین پاکستانی سفیر اقبال احمد اخوند تھے۔ اس گروپ کی کوششوں کی وجہ سے اقوام متحدہ کی کانفرنس برائے تجارت و ترقی کے متعدد اجلاس ہوئے "گروپ ۷۷" کی کوششوں ہی سے ۲۸ مئی ۱۹۷۷ء کو پیرس میں امیر اور غریب ممالک کے درمیان ایک کانفرنس ہوئی۔ جس کے نتیجہ میں ترقی یافتہ صنعتی ممالک، ترقی پذیر ممالک کے اقتصادی مسائل کی اہمیت محسوس کرنے لگے تیسری دنیا کے ممالک کو کچھ مراعات بھی دی گئیں تاہم یہ مراعات انتہائی ناکافی تھیں۔[۹]

۸ـ روزنامہ جنگ کراچی ۱۱ ستمبر ۱۹۸۹ء

۹ـ سلطان احمد صدیقی، منتخب سیاسی نظام کراچی ۱۹۸۶ء صفحہ ۴۹۵

جنوری ۱۹۸۳ء میں دنیا کے دس بڑے صنعتی ممالک آپس میں اکٹھے ہوئے۔ اور انہوں نے ۹ بلین ڈالر کا ایک ہنگامی فنڈ تشکیل دیا۔ تاکہ بین الاقوامی مالیاتی فنڈ (IMF) کی مدد کی جا سکے اس سے کوئی خاطر خواہ نتائج اس لئے برآمد نہیں ہوں گے کہ تیسری دنیا کے ممالک کے قرضوں کی رقوم میں بھی مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ اس امر نے تیسری دنیا کے ممالک کے مابین اتحاد، یک جہتی اور مشترکہ جدوجہد کے احساس کو اجاگر کیا ہے

پاکستان اقوام متحدہ کے اندر اور باہر تیسری دنیا کے ممالک کو منظم کرنے اور منصفانہ بین الاقوامی اقتصادی نظام کے لئے مسلسل جدوجہد کر رہا ہے تاکہ ایسی دنیا تخلیق ہو۔ جہاں افراد بہتر انسانی برادری کے رکن ہوں۔

ضمیمہ جات

۱

براعظموں کی آبادی اور رقبہ

براعظم	آبادی تقریباً	رقبہ مربع میل	رقبہ فیصد
۱۔ ایشیاء	۳ارب	ایک کروڑ ۶۹لاکھ ۹۸ہزار	۲۹.۷
۲۔ افریقہ	۶۲کروڑ	ایک کروڑ ۱۶لاکھ ۸۲ہزار	۲۰.۴
۳۔ یورپ	۴۵کروڑ	۹۳لاکھ ۶۶ہزار	۱۶.۳
۴۔ شمالی امریکہ	۳۰کروڑ	۶۸لاکھ ۸۱ہزار	۱۲.۰
۵۔ جنوبی امریکہ	۸۰کروڑ	۴۰لاکھ ۷۱ہزار	۷.۰
۶۔ آسٹریلیا	۱۸کروڑ	۲۹لاکھ ۶۶ہزار	۶.۲
۷۔ انٹارک ٹیکا	-	۵۱لاکھ	۸.۹
	۵ارب ۵۳کروڑ	۵کروڑ ۷۰لاکھ ۱۰ہزار	

اقوام متحدہ کے رکن ممالک

۲۴اکتوبر ۱۹۴۵ء کو اقوام متحدہ کے قیام کے وقت اس کے بانی اراکین کی تعداد صرف ۵۱ تھی۔ آجکل (۲۴اکتوبر ۱۹۹۳ء) ۱۷۸ ممالک اقوام متحدہ کے رکن ہیں۔ براعظموں کے لحاظ سے ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۔ براعظم ایشیاء	۴۵
۲۔ براعظیم افریقہ	۵۳
۳۔ براعظم یورپ	۳۸
۴۔ براعظم شمالی امریکہ	۱۷
۵۔ براعظم جنوبی امریکہ	۱۸
۶۔ براعظم آسٹریلیا	۷
کل =	۱۷۸

II

اقوام متحدہ کے رکن ممالک

	ملک کا نام	رکنیت کا سال	آبادی تقریباً	رقبہ (مربع میل)	دارالحکومت
	براعظم ایشیاء				
۱	آذربائیجان	۱۹۹۲ء	۷۰لاکھ	۳۳۴۰۰	باکو
۲	ازبکستان	۱۹۹۲ء	۲کروڑ	۱۰۴۹۲۰۰	تاشقند
۳	افغانستان	۱۹۴۶ء	دوکروڑ	۲۵۱۷۷۳	کابل
۴	ایران	۱۹۴۵ء	۴کروڑ ۷۵لاکھ	۶۳۶۲۹۳	تہران
۵	اردن	۱۹۵۵ء	۳۵لاکھ	۳۷۷۳۷	امان
۶	انڈونیشیا	۱۹۵۰ء	۲۰کروڑ	۷۳۵۲۶۸	جکارتہ
۷	اسرائیل	۱۹۴۹ء	۴۵لاکھ	۷۸۴۷	تل ابیب / یروشلم
۸	برونائی	۱۹۸۴ء	۳لاکھ	۲۲۲۶	بندرسری بیگاوان
۹	بحرین	۱۹۷۱ء	۵لاکھ ۳۵ہزار	۲۵۸	ماناما
۱۰	بنگلہ دیش	۱۹۷۴ء	۱۳کروڑ	۵۵۵۹۸	ڈھاکہ
۱۱	برما / میاں مر	۱۹۴۸ء	۴کروڑ	۲۶۱۲۸۹	رنگون
۱۲	بھوٹان	۱۹۷۱ء	۱۶لاکھ	۱۸۱۴۷	تھمفو
۱۳	بھارت	۱۹۴۵ء	۸۷کروڑ	۱۲۶۶۵۹۵	نئی دہلی
۱۴	پاکستان	۱۹۴۷ء	۱۲کروڑ	۳۱۰۴۰۳	اسلام آباد
۱۵	تاجکستان	۱۹۹۲ء	۵۲لاکھ	۵۴۰۱۹	دوشنبے
۱۶	ترکمانستان	۱۹۹۲ء	۴۰لاکھ	۱۸۸۴۱۷	اشک آباد
۱۷	ترکی	۱۹۴۵ء	۶کروڑ	۳۰۱۳۸۱	انقرہ
۱۸	تھائی لینڈ	۱۹۴۶ء	۵کروڑ ۵۰لاکھ	۱۹۸۵۰۰	بنکاک
۱۹	جاپان	۱۹۵۶ء	۱۲کروڑ ۵۰لاکھ	۱۴۵۸۵۶	ٹوکیو

۲۰	چین	۱۹۵۳ء	ایک ارب ۱۵ کروڑ	۳۶۹۶۱۰۰	بیجنگ
۲۱	سعودی عرب	۱۹۴۵ء	ایک کروڑ ۷۵ لاکھ	۸۳۹۹۹۶	ریاض
۲۲	سنگاپور	۱۹۶۵ء	۳۰ لاکھ	۲۲۴	سنگاپور
۲۳	سری لنکا	۱۹۶۵ء	ایک کروڑ ۷۵ لاکھ	۲۵۳۳۲	کولمبو / کوٹی
۲۴	شام	۱۹۴۵ء	ایک کروڑ ۵۰ لاکھ	۷۱۴۹۸	دمشق
۲۵	عراق	۱۹۴۵ء	دو کروڑ	۱۶۷۹۲۴	بغداد
۲۶	عمان	۱۹۷۱ء	۱۴ لاکھ	۸۲۰۳۰	مسقط
۲۷	فلپائن	۱۹۴۵ء	۶ کروڑ	۱۱۵۸۳۱	منیلا
۲۸	قازقستان	۱۹۹۲ء	ایک کروڑ ۶۵ لاکھ	۱۴۹۲۰۰	الماآتا
۲۸	قطر	۱۹۷۱ء	۵ لاکھ	۴۲۴۷	دوہا
۳۰	کرغستان	۱۹۹۲ء	۴۴ لاکھ	۷۶۶۴۲	فرونزے
۳۱	کمپوچیا / کمبوڈیا	۱۹۵۵ء	۷۶ لاکھ	۷۰۲۳۸	فنوم پنہہ
۳۲	کوریا شمالی	۱۹۹۱ء	۲ کروڑ ۴۰ لاکھ	۴۶۵۴۰	پیونگ یانگ
۳۳	کوریا جنوبی	۱۹۹۱ء	۴ کروڑ ۵۰ لاکھ	۳۸۰۲۵	سیئول
۳۴	کویت	۱۹۶۳ء	۲۱ لاکھ	۶۸۸۰	کویت
۳۵	لاؤس	۱۹۵۵ء	۴۰ لاکھ	۹۱۴۲۸	وین ٹیان
۳۶	لبنان	۱۹۴۵ء	۳۵ لاکھ	۴۰۱۵	بیروت
۳۷	مارشل آئی لینڈ	۱۹۹۱ء	ایک لاکھ ۵۰ ہزار	۷۱۵۰۸	ماجورو
۳۸	مائیکرونیشیا	۱۹۹۱ء			کولونیا
۳۹	ملائشیا	۱۹۵۷ء	۲ کروڑ	۱۲۷۳۱۶	کوالالمپور
۴۰	مالدیپ	۱۹۶۵ء	۲ لاکھ	۱۱۵	مالے
۴۱	منگولیا	۱۹۶۱ء	۲۳ لاکھ	۶۰۴۲۴۷	الان باطر
۴۲	متحدہ عرب امارات	۱۹۷۱ء	۲۴ لاکھ	۳۲۰۰۰	ابوظہبی
۴۳	نیپال	۱۹۵۵ء	۲ کروڑ	۵۶۱۳۶	کھٹمنڈو
۴۴	ویت نام	۱۹۷۷ء	۷ کروڑ	۱۲۷۳۳۰	ہنوئی
۴۵	یمن	۱۹۴۷ء	ایک کروڑ ۲۵ لاکھ	۲۰۵۳۵۶	صنعاء

براعظم افریقہ

۴۶	اریٹریا	۱۹۹۳ء	۳۵لاکھ	۴۸۰۰۰	اسمارا
۴۷	الجزائر / الجیریا	۱۹۶۲ء	۳کروڑ	۹۱۸۴۹۷	الجیرس
۴۸	انگولا	۱۹۷۶ء	۹۰لاکھ	۴۸۱۳۵۳	لوانڈا
۴۹	ایتھوپیا	۱۹۴۵ء	۵کروڑ	۴۷۱۷۷۶	ادیس ابابا
۵۰	برکینافاسکو / اپروالٹا	۱۹۶۰ء	۹۰لاکھ	۱۰۵۸۶۹	واگاڈوگو
۵۱	بوٹسوانا	۱۹۶۶ء	۱۴لاکھ	۲۳۱۸۰۴	گبورون
۵۲	برونڈی	۱۹۶۲ء	۵۵لاکھ	۱۰۷۵۹	بوجم بورا
۵۳	بینن	۱۹۶۰ء	۵۰لاکھ	۴۳۴۸۳	پورٹونوا
۴۵	تنزانیہ	۱۹۶۱ء	۳کروڑ	۳۶۴۸۸۶	دارالسلام
۵۵	ٹوگو	۱۹۶۰ء	۳۵لاکھ	۲۱۶۲۲	لوم
۵۶	تیونس	۱۹۵۶ء	۸۲لاکھ	۶۳۱۷۰	تیونس
۵۷	جبوتی	۱۹۷۷ء	۵۵لاکھ	۸۹۹۶	ڈی جبوتی
۵۸	جنوبی افریقہ	۱۹۴۵ء	۴کروڑ ۲۵لاکھ	۴۷۲۳۵۹	کیپ ٹاؤن
۵۹	چاڈ	۱۹۶۰ء	۵۵لاکھ	۴۹۵۷۵۵	این ڈجمینا
۶۰	رونڈا	۱۹۶۲ء	۸۰لاکھ	۱۰۱۶۹	کیگالی
۶۱	زیمبیا	۱۹۶۴ء	۸۲لاکھ	۲۹۰۵۸۶	لوساکا
۶۲	زائر	۱۹۶۰ء	۴کروڑ	۹۰۵۵۶۳	کنشاسا
۶۳	زمباوے	۱۹۸۰ء	اکروڑ	۱۵۰۸۰۳	ہرارے
۶۴	ساؤتام اینڈ پرنسپ	۱۹۷۵ء	ایک لاکھ ۵۰ہزار	۳۷۲	ساؤٹوم
۶۵	سینگال	۱۹۶۰ء	۷۷لاکھ	۷۵۷۵۰	ڈاکار
۶۶	سیشلیز	۱۹۷۶ء	۷۵ہزار	۱۷۱	وکٹوریہ
۶۷	سیرالیون	۱۹۶۱ء	۴۲لاکھ	۲۷۸۲۵	فری ٹاؤن
۶۸	سوڈان	۱۹۵۶ء	۳کروڑ	۹۶۶۷۵۷	خرطوم
۶۹	سوازی لینڈ	۱۹۶۸ء	۸۰لاکھ	۶۷۰۴	بابین
۷۰	صومالیہ	۱۹۶۰ء	۹۰لاکھ	۲۴۶۳۰۰	موگادیشو
۷۱	کوسٹ ڈی آئیورے	۱۹۶۰ء	اکروڑ	۱۲۴۵۰۳	عابدجان

۷۲	کینیا	۱۹۶۳ء	۲کروڑ ۷۰لاکھ	۲۲۴۹۶۰	نیروبی
۷۳	کانگو	۱۹۶۰ء	۲۵لاکھ	۱۳۲۰۴۶	برازاویلے
۷۴	کوموروس	۱۹۷۵ء	۶لاکھ	۸۳۸	موورونی
۷۵	کیمرون	۱۹۷۰ء	ایک کروڑ ۵۰لاکھ	۱۷۹۷۱۴	یاؤنڈے
۷۶	کیپ ورڈے	۱۹۷۵ء	۳لاکھ ۵۰ہزار	۱۵۵۷	پرائیا
۷۷	گنی استوائی	۱۹۶۸ء	۴۰لاکھ	۱۰۸۳۲	مالابو
۷۸	گنی بساؤ	۱۹۷۴ء	۱۲لاکھ	۱۳۹۴۸	بساؤ
۷۹	گنی جمہوریہ	۱۹۵۸ء	۷۵لاکھ	۹۴۹۶۴	کوناکری
۸۰	گھانا	۱۹۵۷ء	۱کروڑ ۵۰لاکھ	۹۲۰۹۸	عکرہ
۸۱	گیمبیا	۱۹۶۵ء	۹لاکھ	۴۱۲۷	بنجول
۸۲	گیبون	۱۹۶۰ء	۱۲لاکھ	۱۰۳۳۴۶	لیبری ویلی
۸۳	لوسوتھو	۱۹۶۶ء	۱۸لاکھ	۱۱۷۱۶	ماسیرو
۸۴	لائبیریا	۱۹۴۵ء	۲۷لاکھ	۳۸۲۵۰	مون رویا
۸۵	لیبیا	۱۹۵۵ء	۴۵لاکھ	۶۷۹۳۵۹	ٹریپولی / بن غازی
۸۶	مڈغاسکر	۱۹۶۰ء	۱کروڑ	۲۲۶۶۵۷	انطناریو
۸۷	ملاوی	۱۹۶۴ء	۹۳لاکھ	۴۵۷۴۷	لیلونگ وے
۸۸	مالی	۱۹۶۰ء	۹۵لاکھ	۴۷۸۷۶۴	بماکو
۸۹	ماریطانیہ	۱۹۶۱ء	۲۲لاکھ	۳۹۷۹۵۴	نواک شوٹ
۹۰	ماریشس	۱۹۶۸ء	۱۲لاکھ	۷۹۰	پورٹ لوئیس
۹۱	مراکش	۱۹۵۶ء	۳کروڑ	۱۷۲۴۱۳	رباط
۹۲	موزنبیق	۱۹۷۵ء	ایک کروڑ ۵۰لاکھ	۳۰۳۷۶۹	ماپوتو
۹۳	مصر	۱۹۳۵ء	۵کروڑ ۵۰لاکھ	۳۸۶۶۵۰	قاہرہ
۹۴	نائیجر	۱۹۶۰ء	۸۰لاکھ	۴۸۹۱۸۹	نیامے
۹۵	نائیجیریا	۱۹۶۰ء	۱۲کروڑ	۳۵۶۶۶۷	لاگوس
۹۶	نمیبیا	۱۹۹۰ء	۱۵لاکھ	۳۱۷۸۱۸	ونڈہاک
۹۷	وسطی افریقہ	۱۹۶۰ء	۳۵لاکھ	۲۴۰۵۳۴	بنگوائی
۹۸	یوگنڈا	۱۹۶۲ء	۲کروڑ	۹۳۳۵۴	کمپالا

براعظم یورپ

۹۹	آرمینیا	۱۹۹۲ء	۳۵لاکھ	۱۱۳۰۶	یاریوان
۱۰۰	البانیہ	۱۹۵۵ء	۳۴لاکھ	۱۱۱۰۰	ترانہ
۱۰۱	آسٹریا	۱۹۵۵ء	۸۰لاکھ	۳۲۳۷۴	ویانا
۱۰۲	اسٹونیا	۱۹۹۱ء	۱۷لاکھ	۱۷۴۱۳	ٹالن
۱۰۳	آئس لینڈ	۱۹۴۶ء	۲لاکھ ۵۲ہزار	۳۹۷۶۹	ریکیاوک
۱۰۴	آئرلینڈ	۱۹۵۵ء	۳۷لاکھ	۲۷۱۳۷	ڈبلن
۱۰۵	اٹلی	۱۹۵۵ء	۶کروڑ	۱۱۶۳۰۳	روم
۱۰۶	بیلجیم	۱۹۴۵ء	۱کروڑ	۱۱۷۷۹	برسلز
۱۰۷	بلغاریہ	۱۹۵۵ء	۹۵لاکھ	۴۲۳۶۵	صوفیہ
۱۰۸	بائیلورشیاء	۱۹۴۵ء	۶۲لاکھ	۸۰۱۵۴	منسک
۱۰۹	برطانیہ	۱۹۴۵ء	۶کروڑ	۹۴۲۲۲	لندن
۱۱۰	بوسنیا ہرزیگوونیا	۱۹۹۲ء	۸۵لاکھ	۱۹۷۴۵	سراجیو
۱۱۱	پولینڈ	۱۹۴۵ء	۴کروڑ	۱۲۰۷۲۷	وارسا
۱۱۲	پرتگال	۱۹۵۵ء	۱کروڑ	۳۶۳۹۰	لسبن
۱۱۳	جرمنی	۱۹۷۳ء	۸کروڑ	۱۳۷۸۳۸	برلن
۱۱۴	چیک اینڈ سلواک	۱۹۴۵ء	۱کروڑ ۶۵لاکھ	۴۹۳۶۵	پراگ
۱۱۵	ڈنمارک	۱۹۴۵ء	۵۱لاکھ ۵۰ہزار	۱۶۶۳۳	کوپن ہیگن
۱۱۶	رشین فیڈریشن	۱۹۴۵ء	۱۶کروڑ	۶۵۹۲۸۰۰	ماسکو
۱۱۷	رومانیہ	۱۹۵۵ء	۲کروڑ ۴۵لاکھ	۹۱۶۹۹	بخارسٹ
۱۱۸	سپین	۱۹۵۵ء	۴کروڑ	۱۹۴۸۹۶	میڈرڈ
۱۱۹	سلوانیا	۱۹۹۲ء	-	-	-
۱۲۰	سویڈن	۱۹۴۶ء	۸۵لاکھ	۱۷۳۷۳۱	اسٹاک ہوم
۱۲۱	فن لینڈ	۱۹۵۵ء	۵۰لاکھ	۱۰۳۱۱۹	ہلسنکی
۱۲۲	فرانس	۱۹۴۵ء	۶کروڑ	۲۲۰۶۶۸	پیرس
۱۲۳	قبرص	۱۹۶۰ء	۷لاکھ	۳۵۷۲	نکوسیا
۱۲۴	کروشیا	۱۹۹۲ء	-	-	-
۱۲۵	لٹویا	۱۹۹۱ء	۲۸لاکھ	۲۴۵۹۵	ریگا

۱۲۶	لکسمبرگ	۱۹۴۵ء	۴ لاکھ	۹۹۸	لکسمبرگ
۱۲۷	لیتھونیا	۱۹۹۱ء	۳۸ لاکھ	۲۵۱۷۰	ویلنا
۱۲۸	مالٹا	۱۹۶۴ء	۴ لاکھ	۱۲۲	ویلیٹا
۱۲۹	مالڈویا	۱۹۹۲ء	۴۵ لاکھ	۱۳۰۱۲	کشی نیو
۱۳۰	مناکو	۱۹۹۳ء	۳۲ لاکھ	۰،۶	مونا کو ویلے
۱۳۱	نیدرلینڈ / ہالینڈ	۱۹۴۵ء	۱ کروڑ ۵۰ لاکھ	۱۵۷۷۰	ایمسٹرڈیم
۱۳۲	ناروے	۱۹۴۵ء	۴۴ لاکھ	۱۲۵۱۸۱	اوسلو
۱۳۳	ہنگری	۱۹۵۵ء	۱ کروڑ ۱۵ لاکھ	۳۵۹۱۹	بڈاپسٹ
۱۳۴	یوکرائن	۱۹۴۵ء	۵ کروڑ	۲۳۲۰۴۶	کیف
۱۳۵	یوگوسلاویہ	۱۹۴۵ء	۱ کروڑ	۳۹۰۰۰	بلغراد
۱۳۶	یونان	۱۹۴۵ء	۱ کروڑ	۵۱۱۴۶	ایتھنز

براعظم شمالی امریکہ

۱۳۷	السلواڈور	۱۹۴۵ء	۵۴ لاکھ	۸۱۲۴	سان سلواڈور
۱۳۸	امریکہ (یو ایس)	۱۹۴۵ء	۲۵ کروڑ	۳۶۱۸۷۷۰	واشنگٹن
۱۳۹	اینٹی گوا اینڈ باربوڈا	۱۹۸۱ء	۷۰ ہزار	۱۷۱	سینٹ جونس
۱۴۰	بہاماز	۱۹۷۳ء	۲ لاکھ ۵۰ ہزار	۵۸۳۰	ناسو
۱۴۱	بیلیز	۱۹۸۱ء	۲ لاکھ	۸۸۶۷	بیلموپان
۱۴۲	پانامہ	۱۹۴۵ء	۲۴ لاکھ	۲۹۲۰۸	پانامہ سٹی
۱۴۳	جمیکا	۱۹۶۴ء	۲۶ لاکھ	۴۲۳۲	کنگسٹن
۱۴۴	ڈومینیکا	۱۹۷۸ء	۹۰ ہزار	۹۲۰	روسیو
۱۴۵	ڈومینیکن جمہوریہ	۱۹۴۵ء	۸۰ لاکھ	۱۸۸۱۶	سنتوڈومینگو
۱۴۶	کوسٹاریکا	۱۹۴۵ء	۳۲ لاکھ	۱۹۵۷۵	سان جوز
۱۴۷	کیوبا	۱۹۴۵ء	۱ کروڑ	۴۴۲۱۸	ہوانا
۱۴۸	کینیڈا	۱۹۴۵ء	۳ کروڑ	۳۸۴۹۰۰۰	اوٹاوہ
۱۴۹	گوئٹے مالا	۱۹۴۵ء	۱ کروڑ	۴۲۰۴۲	گوئٹے سٹی
۱۵۰	میکسیکو	۱۹۴۵ء	۹ کروڑ	۷۶۱۶۰۴	میکسیکو سٹی
۱۵۱	نکاراگوا	۱۹۴۵ء	۳۷ لاکھ	۵۰۱۹۳	مناگوا

۱۵۲	ہیٹی	۱۹۴۵ء	۶۵ لاکھ	۱۰۵۷۹	پورٹ آؤ پرنس
۱۵۳	ہونڈوارس	۱۹۴۵ء	۵۵ لاکھ	۴۳۲۷۷	ٹیگوسی گالپا

براعظم جنوبی امریکہ

۱۵۴	ارجنٹائن	۱۹۴۵ء	۳ کروڑ ۴۰ لاکھ	۱۰۶۵۱۸۹	بیونس آئرس
۱۵۵	ایکواڈور	۱۹۴۵ء	۱ کروڑ	۱۰۹۴۸۳	کوئیٹو
۱۵۶	بولیویا	۱۹۴۵ء	۷۰ لاکھ	۴۲۴۱۶۵	سکری
۱۵۷	برازیل	۱۹۴۵ء	۱۲ کروڑ	۳۲۸۶۴۷۰	برازیلیاء
۱۵۸	بارباڈوس	۱۹۶۶ء	۳ لاکھ	۱۶۶	برج ٹاؤن
۱۵۹	پیرو	۱۹۴۵ء	۲ کروڑ ۲۵ لاکھ	۴۹۶۲۲۲	لیما
۱۶۰	پیراگوائے	۱۹۴۵ء	۴۷ لاکھ	۱۵۷۰۴۷	ایسن شین
۱۶۱	ٹرینی ڈاڈ اینڈ ٹوباگو	۱۹۶۲ء	۱۳ لاکھ	۱۹۸۰	پورٹ آف اسپین
۱۶۲	چلی	۱۹۴۵ء	۱ کروڑ ۵۰ لاکھ	۲۹۲۲۵۷	سان تیاگو
۱۶۳	سرینام	۱۹۷۵ء	۴ لاکھ	۶۳۰۳۷	پارامریبو
۱۶۴	سینٹ کیٹس اینڈ نیویز	۱۹۸۳ء	۵۰ ہزار	۱۰۱	بیسٹری
۱۶۵	سینٹ لوتسیا	۱۹۷۹ء	۱ لاکھ ۵۰ ہزار	۲۳۸	کیسٹرز
۱۶۶	سینٹ ونسنٹ اینڈ گریناڈینز	۱۹۸۰ء	۱ لاکھ ۱۵ ہزار	۱۵۰	کنگز ٹاؤن
۱۶۷	کولمبیا	۱۹۴۵ء	۳ کروڑ	۸۳۰۰۰	بوگوٹا
۱۶۸	گرنیاڈا	۱۹۷۴ء	ایک لاکھ	۱۳۳	سینٹ جارجز
۱۶۹	گویانا	۱۹۶۶ء	۹ لاکھ	۸۳۰۰۰	جارج ٹاؤن
۱۷۰	وینزویلا	۱۹۴۵ء	۲ کروڑ	۳۵۲۱۴۳	کاراکس
۱۷۱	یوروگوائے	۱۹۴۵ء	۳۲ لاکھ	۶۸۰۳۷	مونٹی ویڈیو

براعظم آسٹریلیا

۱۷۲	آسٹریلیا	۱۹۴۵ء	۲ کروڑ	۲۹۶۶۲۰۰	کینبرو
۱۷۳	پپوانیو گنی	۱۹۷۵ء	۳۷ لاکھ	۱۷۸۲۶۰	پورٹ مورس بائی
۱۷۴	سولومون جزائر	۱۹۷۸ء	۳ لاکھ	۱۰۶۴۰	ہونیارا

۱۷۵	سمواغربی	۱۹۷۶ء	۲لاکھ	۱۱۳۳	اپیا
۱۷۶	فجی	۱۹۷۰ء	۸لاکھ	۷۰۵۶	سوآ
۱۷۷	نیوزی لینڈ	۱۹۴۵ء	۳۵لاکھ	۱۰۳۷۳۶	ولنگٹن
۱۷۸	وانواتو	۱۹۵۱ء	ایک لاکھ ۵۵ہزار	۵۷۰۰	پورٹ ویلا

۱۱۱

اقوام متحدہ کے غیر رکن ممالک

	ملک کا نام	براعظم	آبادی	رقبہ	دارالحکومت
۱	تائیوان	ایشیاء	۲کروڑ	۱۳۸۸۵	تائی پائی
۲	بوفتھاٹسوانا	افریقہ	۲۰لاکھ	۱۶۹۸۸	مباتھو
۳	ٹرانسکی	افریقہ	۳۴لاکھ	۱۶۸۵۵	امتاتا
۴	وینڈہ	افریقہ	۵لاکھ	۲۷۷۱	تھوہویانڈر
۵	انڈورا	یورپ	۵۲ہزار	۱۸۵	انڈورہ لاویلا
۶	شمالی قبرص (ٹی آر)	یورپ	۲لاکھ	۱۲۹۵	نکسویا
۷	سان مارینو	یورپ	۲۴ہزار	۲۴	سان مارینو
۸	سوئٹزرلینڈ	یورپ	۶۷لاکھ	۱۵۹۴۱	برن
۹	لیچٹنس ٹین	یورپ	۲۸لاکھ	۶۱۱۸	وادوز
۱۰	ویٹی کن سٹی	یورپ	۱۵سو	۰٫۱۷	ویٹیکن سٹی
۱۱	ٹوالو	آسٹریلیا	۱۰ہزار	۱۰	فونافٹی
۱۲	ٹونگا	آسٹریلیا	۲لاکھ	۲۷۰	نکوالوفا
۱۳	کریباتی	آسٹریلیا	۶۵ہزار	۳۶۶	تاراوا
۱۴	ناؤرو	آسٹریلیا	۸ہزار	۸	یاران

17

نوآبادیات اور مقبوضات

	نوآبادیات / مقبوضات	انتظامی اتھارٹی	آبادی تقریباً	رقبہ مربع میل	دارالحکومت
۱	ہانگ کانگ	برطانیہ	۵۷ لاکھ	۴۰۹	ہانگ کانگ
۲	مکاؤ	پرتگال	۴ لاکھ	۵.۱۸	مکاؤ سٹی
۳	افریقہ ہسپانوی شمالی	اسپین	۷۰ لاکھ	۲۲	-
۴	ری یونین	فرانس	۶ لاکھ	۹۷۰	سینٹ ڈینس
۵	سسکی	جنوبی افریقہ	۸ لاکھ	۸۳۰۰	زویٹشا
۶	سینٹ ہیلنا	برطانیہ	۶ ہزار	۴۷	جیمز ٹاؤن
۷	مے اوٹی	فرانس	۲ ہزار	۱۴۶	ڈراؤڈی
۸	اروبا	ہالینڈ	۳ لاکھ	۱۱۱	ویلیم سٹاڈ
۹	بونیری	ہالینڈ	-	۱۷۱	ویلیم سٹاڈ
۱۰	کوراکائی	ہالینڈ	-	-	-
۱۱	نیدرلینڈ اینٹلیز	-	۳ لاکھ	۳۸۳	ولسیرڈ
۱۲	فروآئی لینڈ	ڈنمارک	۴۷ ہزار	۹۲۵۱	طورشیون
۱۳	جبرالٹر جبل الطارق	برطانیہ	۲۳ ہزار	۶.۵	جبرالٹر
۱۴	برموڈا	برطانیہ	۵۷ ہزار	۲۱	ہملٹن
۱۵	پیورٹو ریکو	امریکہ	۳۲ ہزار	۳۴۳۵	شان جوآن
۱۶	پٹکیرن آئی لینڈ	برطانیہ	۱۰۰	۱۸	
۱۷	ترک اینڈ کیکاوس جزائر	برطانیہ	۸ ہزار	۱۹۲	کاک برن ٹاؤن
۱۸	سموا امریکی	امریکہ	۳۴ ہزار	۷۶	پاگو پاگو
۱۹	شمالی مرینا	امریکہ	۲۰ ہزار	۴۲	سائیپان
۲۰	فاک لینڈ	برطانیہ	۲ ہزار	۴۷۰۰	پورٹ سٹینلے

۲۱	کیمین جزائر	برطانیہ	۲۰ہزار	۱۰۰	چارج ٹاؤن
۲۲	گرین لینڈ	ڈنمارک	۵۵ہزار	۴۸۰۰۰۰	نوک
۲۳	گوام	امریکہ	۱لاکھ	۲۰۹	آگنا
۲۴	گواڈی لوپ	فرانس	۳لاکھ	۶۸۸	بیزی ٹیری
۲۵	گویانا فرنچ	فرانس	۸۰ہزار	۳۴،۷۵۰	کینز
۲۶	مونٹ سیرت	برطانیہ	۱۲ہزار	۴۰	پلائی ماؤتھ
۲۷	مارٹینق	فرانس	۴لاکھ	۴۲۵	فورٹ ڈی فرانس
۲۸	ورجن آئی لینڈ امریکی	امریکہ	ایک لاکھ	۱۳۲	چارلٹی عمالی
۲۹	ورجن آئی لینڈ برطانوی	برطانیہ	۱۵ہزار	۵۹	روڈ ٹاؤن
۳۰	نیو کیلی ڈونیا	فرانس	۲لاکھ	۷۳۷۶	نومیا
۳۱	فرنچ پولینیسیا	فرانس	۲لاکھ	۱۵۲۲	پیپٹی

کتابیات

۱۔ پروفیسر محمد خلیل اللہ
پاکستان کی خارجہ پالیسی شعبہ تصنیف و تالیف اردو کالج کراچی۔

۲۔ پروفیسر محمد خلیل اللہ
دساتیر عالم مکتبہ فریدی کراچی

۳۔ پروفیسر محمد خلیل اللہ
فکر و افکار شعبہ تصنیف و تالیف اردو کالج کراچی

۴۔ ڈاکٹر ایم اے رزاق
پاکستان کا نظام حکومت و سیاست مکتبہ فریدی کراچی

۵۔ سید غفار مہدی
سوچ کی لہریں بی ۱۲/ ۵۸۸ فیڈرل بی ایریا کراچی

۶۔ محمد عبد الرشید
بین الاقوامی تعلقات و سیاست علمی کتاب گھر کراچی

۷۔ محمد عبد الرشید
قانون بین الاقوام مکتبہ فریدی کراچی

۸۔ محمد اعظم چوہدری
بین الاقوامی تعلقات دو عالمگیر جنگوں کے مابین طاہر سنز کراچی

۹۔ ای ایچ کار (مترجم م۔ رحستان)
بین الاقوامی تعلقات دو عالمی جنگوں کے درمیان شعبہ تصنیف و تالیف جامعہ کراچی

۱۰۔ شکیل الرحمن
عالمی سیاسیات مکتبہ فریدی کراچی

۱۱۔ سید راشد علی
تعارف سیاسیات کفایت اکیڈمی کراچی
۱۲۔ سلطان احمد صدیقی
جدید اصول سیاسیات جاوید اینڈ سنز اردو بازار کراچی
۱۳۔ غلام رسول مہر مترجم
انسائیکلو پیڈیا تاریخ عالم شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور
۱۴۔ غلام رسول مہر مترجم
تاریخِ تہذیب جلد دوم شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور
۱۵۔ غلام رسول مہر مترجم
فکر جدید کے سانچے شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور
۱۶۔ مشتاق احمد چوہدری
بین الاقوامی سیاسیات عزیز پبلشرز لاہور
۱۷۔ عارف علی
دو جنگوں کے مابین بین الاقوامی تعلقات ایک نظر میں منظور سنز اردو بازار لاہور
۱۸۔ نعیم اکبر لیسین
بین الاقوامی تعلقات نیو بک پیلیس لاہور
۱۹۔ صفدر حیات صفدر
نظری و عملی سیاسیات عالم نیو بک پیلس لاہور
۲۰۔ مظہر الحق
نظری و عملی سیاسیات بک لینڈ لاہور
۲۱۔ پروفیسر نثار احمد سلیمی
بین الاقوامی معاشیات مجید بک ڈپو لاہور
۲۲۔ ہمایوں ادیب
پاکستان کی خارجہ پالیسی عزیز بک ڈپو لاہور

۲۳۔ فضل کریم شیخ
ہماری خارجہ پالیسی نیو بک پیلس لاہور

۲۴۔ ممتاز لیاقت
تاریخ بیت المقدس سنگ میل پبلی کیشنز لاہور

۲۵۔ مزمل لیسین
فلسطین کا المیہ نیشنل بک فاونڈیشن پاکستان لاہور

۲۶۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی
اسلامی ریاست اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ لاہور

۲۷۔ پروفیسر خلیل احمد کلیم
بین الاقوامی تنظیمیں فاران بک ایجنسی حیدر آباد

۲۸۔ پروفیسر اقبال بھٹی
واقعات عالم بھٹی پبلشرز جہلم

۲۹۔ اسرار احمد آزاد
جدید بین الاقوامی معلومات مکتبہ برہان جامع مسجد دہلی

۳۰۔ ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی
یورپ کے عظیم سیاسی مفکرین ترقی اردو بیورو نئی دہلی

31. A.J.P.Taylor
How wars begin (London 1979)

32. A.L.Tibawi
The Anglo Arab Relation and the Question of Palestine London 1977 (1914-1921)

33. Ahmed Abdullah
The Middle East Crises, Cause and Consequences. (Karachi 1967)

34. Brerly Male
Revolutionary Afghanistan, (London 1982)

35. Charles Raynolds
Theory and Explaination in International Politics (London 1973)

36. Creg O. Leary
The shaping of Chinese Foreign Policy
(London 1980)

37. Christapher-D-Jones
Soviet Influence in Eastern Europe
(Newyork 1981)

38. Davić W. Zieglar
War, Peace and International Politics
Boston 1981

39. David. Co.Coyle
The U.N and How it works(New York 1966)

40. David-E-Albright
Africa and International Communism
(London 1981)

41. George;S. Masannal and Gilbert Abcarian
International Politics (New York 1970

42. George Modelski
Principles of World Politics(1)(London 1972)

43. S.Shwarzen Berger, Fried Eick. A Freeger
Power Politics New York(1964)

44. Gerald Seqal
The China Factor (London 1982)

45. Gerald Segal
The Great Power Triangle (London 1982)

46. Hans. J.Mcrgenthan
Pclitics Among Nations(Fourth Edition)
(Calcutta 1969)

47. H.L.Peacock
A. History of Modern Europe (London 1978)

48. Herbert Butlerfield and Martin Wight
Diplomatic Investigations,(London 1969)
III Edition

49. John. H.Herz
International Politics in the Atomic Age
(New York 1967)

50. Khalida Qureshi(Acting Editor)
Pakistan Horizon (Karachi 1981-82)

51. Kenneth A. Myers
NATO the Next Thirty Years(London 1980)

52. K.K.Kulshrestha

International Relations between the Two World Wars Dehli (INDIA) 1964

53. Karl. W.Dentsch

Nationalism and Social Communication (London 1968)

54. Leslic James

World Affairs Since 1939(Oxford 1965)

55. L.Oppenheim

International Law(Eighth Impression,London 1967)

56. Mushtaq Ahmed

Government and Politics in Pakistan (Karachi 1970)

57. Muhammad Ahsan Chaudhary

United Nations Peace Mechanisms and Rules (Karachi 1973)

58. Max. Beloff

The Balance of Power (London 1968)

59. Morton A. Kaplan

System and Process in International Politic s (New York, Sec, Edition 1967)

60. N.J.Padel Ford and G.A.Lincoln

The Dynamics of International Politics (Lee D. Olvcy, New York. 1976)

61. Norman J. Padel Ford and G.A.Lincoln

International Politics (New York 1954)

62. Polmer - Perkins

International Relations(Third Edition 1969)

63. Progress Publishers

Soviet Foreign Policy (Moscow 1967)

64. P. Daigman and A. Rabbushka

The U.S.in the 1980's(California 1980)

65. Peter Willetle

The Non-Alligned in Havana(London 1981)

66. Quincy Wright

The Study of International Relation (New York 1955)

67. Rais Ahmed Khan
Pakistan United States Relations (Islamabad 1983)

68. Robert H. Donaldson
The Soviet Union in the Third World Successes and Failures (London 1981)

69. Safdar Mahmood
Political Study of Pakistan(Lahore 1972)

70. Stephen S. Good Speed
The nature and Function of International Organisation (New York 1967)

71. Safdar Mahmood
International Affairs(Frozdons Lahore 1968)

72. V.D.Mahajan
History of Modern Europe Since 1789 Delhi 1980

73. V.D. Mahajan
International Politics Delhi(India)1964

74. W.F.Hanrieder and G.P.Auton
The Foreign Policies of W.Germany,France and Britain (New Jersey 1980)

75. W.Friedmann
World Politics(Fourth Edition,New York 1960)

76 The World Almanac and Book of Facts (New York 1985)

INTERNATIONAL RELATIONS IN THEORY AND PRACTICE

Mohammad Azam Choudhary

TAHER SONS KARACHI